بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

مَنْ عَرَفَ نَفْسَهٗ فَقَدْ عَرَفَ رَبَّهٗ

علم العرفان

تصنیف

جناب محمد نور الدین رحمۃ اللہ علیہ
اویسی، امینی، کشمیری

از خلفائے

جناب الحاج مولوی محمد امین رحمۃ اللہ علیہ
اویسی، کشمیری (قطب الاقطاب)

شعبہ نشر و اشاعت سلسلہ عالیہ اویسیہ
ایبٹ آباد (ہزارہ) پاکستان

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

مَنْ عَرَفَ نَفْسَهٗ فَقَدْ عَرَفَ رَبَّهٗ

عِلمُ العِرفان

تصنیف

جناب محمد نور الدین رحمۃ اللہ علیہ
اویسی، امینی، کشمیری

از خلفائے

جناب الحاج مولوی محمد امین رحمۃ اللہ علیہ
اویسی، کشمیری (قطب الاقطاب)

شعبہ نشر واشاعت، سلسلہ عالیہ اویسیہ
ایبٹ آباد (ہزارہ) پاکستان

سلسلہ اویسیہ پبلیکیشنز

(جملہ حقوق بحق ناشر محفوظ ہیں)

ایڈیشن :دوم

طباعت :جون ۲۰۱۴ء

سلسلہ عالیہ اویسیہ

۳۴۰۴ لنک روڈ ایبٹ آباد(ہزارہ)

پاکستان

فہرست مشمولات

نمبر شمار	مضمون	صفحہ نمبر
۱	دیباچہ ایڈیشن دوم	۳
۲	دیباچہ	۵
۳	باب اوّل	۹
۴	تمہید	۹
۵	حواس خمسہ اور انکے افعال قوت باصرہ۔قوتِ سامع۔قوتِ لامسہ ۔قوتِ ذائقہ۔قوتِ شامہ	۲۰
۶	دماغ کے حصص اور انکے عمل حصہ بصارت۔حصہ حرکت۔واہمہ۔ حافظ۔حس مشترک (عقل۔شعور)	۳۴
۷	باب دوم تخلیقِ آدم۔مقصد۔اس کی علمی خصوصیات	۹۸
۸	شریعت اسکے اجزا۔وحی جلی۔تفہیم وحی جلی۔وحی خفی۔تفہیم وحی خفی۔نتیجۂ عمل۔	۱۳۱
۹	نتیجۂ اعمال۔طریقت	۱۳۶
۱۰	خلافت اسلامی۔مقصد۔شرائط	۱۶۸
۱۱	نائب رسولؐ۔جذب۔ تصورولی اکمل	۲۱۸
۱۲	طریقت کے سلاسل۔طریق قرآت وتزکیہ	۲۶۷
۱۳	علم کی کیفیات عالم ملکوت۔مقامات اجلاس محمدیؐ ۔آسمان اول۔آسمان دوم۔ آسمان سوم۔حضرت عیسیٰؑ اور انکی پیدائش۔آسمان چہارم تاہفتم۔ کرسی تااحدیتِ مجرد	۲۸۱
۱۴	طریقت میں ولی کی اقسام ولی کامل۔ولی مکمل۔ولی اکمل	۳۲۲
۱۵	بیعت	۳۲۵
۱۶	تصور حافظہ کی قلب سے نسبت ورابط۔ دلی ارادہ۔تصور کی اقسام	۳۴۳
۱۷	تفکر فی الآفاق	۳۶۹

نمبرشمار	مضمون	صفحہ نمبر	نمبرشمار	مضمون	صفحہ نمبر
۱۸	شہید کی موت وحیات	۳۷۶	۲۵	حضرت علاؤالدین علی احمد	۴۷۶
۱۹	انسانی وجود تمثیلی اور اسکی اقسام	۳۸۹		صابر کلیریؒ	
۲۰	روح رحمانی	۴۰۰	۲۶	بانی سلسلہ اویسیہ	۴۸۰
۲۱	طریقت کے معتبر سلسلے اور طریقت	۴۲۳		حضرت خواجہ اویس قرنیؓ	
	کے سلسلہ میں چند ضروری باتیں		۲۷	حضرت شاہ عبداللطیف بھٹائیؒ	۴۸۳
۲۲	اولیا کے مدارج ومنصب	۴۳۹	۲۸	حضرت شاہ لونگ سندھیؒ	۴۹۱
	ابدال۔اوتاد۔قطب الابدال۔قطب		۲۹	حضرت شاہ محمد عارف اروڑویؒ	۴۹۴
	الاوتاد۔قطب سلاطین۔قطب		۳۰	حضرت مولانا سید نورالزمان شاہؒ	۴۹۶
	المدار۔قطب الارشاد۔قطب العالم		۳۱	حضرت الحاج مولوی محمد امینؒ	۵۰۳
	قطب الاقطابؒ		۳۲	نقشہ شجرہ سلسلہ اویسیہ	۵۱۴
۲۳	حضرت شیخ عبدالقادر جیلانیؒ	۴۵۱	۳۳	حاصلِ کلام	۵۱۴
۲۴	شرح قصیدہ غوثیہ	۴۵۴			

دیباچہ طبع دوم

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ○

اَللّٰھُمَّ صَلِّ عَلٰی سَیِّدِنَا وَ مَوۡلٰنَا یَا مُحَمَّدُ نِ النَّبِیُّ الۡاُمِّیُّ وَ اٰلِہٖ وَسَلِّمۡ

انسان کی تخلیق مقصودِ کائنات ہے۔ اسلئے اللہ رب العزت نے فرشتوں کے سامنے بڑے اہتمام سے اسکا ذکر فرمایا۔ اِنِّیۡ جَاعِلٌ" فِی الۡاَرۡضِ خَلِیۡفَۃً" ۔لیکن ملائکہ نے الارض کی سفلی خصوصیات کو مدّ نظر رکھ کر نہایت عاجزی سے عرض کیا۔ اَتَجۡعَلُ فِیۡھَا مَنۡ یُّفۡسِدُ فِیۡھَا وَ یَسۡفِکُ الدِّمَآءَ کہ اے پروردگار یہ سفلی زمین کی پیدائش اپنے مقصدِ حیات سے روگردانی کرتے ہوئے فساد و خونریزی پر اتر آئیگی۔ حالانکہ نَحۡنُ نُسَبِّحُ بِحَمۡدِکَ وَ نُقَدِّسُ لَکَ۔ ہم تیری حمد و تقدیس کر رہی رہے ہیں۔ تو اس پر اللہ رب العزت نے ارشاد فرمایا اِنِّیۡ اَعۡلَمُ مَالَا تَعۡلَمُوۡنَ کہ جو کچھ اس تخلیق کے بارے میں میں جانتا ہوں تم نہیں جانتے کہ یہ کسطرح مقصدِ تخلیق وَمَا خَلَقۡتُ الۡجِنَّ وَالۡاِنۡسَ اِلَّا لِیَعۡبُدُوۡنِ یعنی عبادت کے ذریعہ عرفان حاصل کریگا۔

اللہ تعالیٰ نے انسان کو خَلَقۡنَا الۡاِنۡسَانَ مِنۡ صَلۡصَالٍ مِّنۡ حَمَاٍ مَّسۡنُوۡنٍ زمین کے جوہر سے پیدا کیا۔ پھر فَاِذَا سَوَّیۡتُہٗ اسکو سنوارا۔ اور خَلَقۡنَا الۡاِنۡسَانَ فِیۡۤ اَحۡسَنِ تَقۡوِیۡمٍ۔ اسے متناسب اور خوبصورت انداز میں ڈھالا۔ اسے حصولِ سامان زندگی کیلئے جسمانی اعضاء۔ حصولِ علم کیلئے حواس خمسہ ظاہری۔ اور روح حیوانی عطا کی۔ اسی پر بس نہیں! بلکہ وہ شے جس کا فرشتوں کو علم نہ تھا۔ وَنَفَخۡتُ فِیۡہِ مِنۡ رُّوۡحِیۡ اس میں ''روحی'' اپنی روح یعنی روح رحمانی پھونکی۔ جس سے وہ آثار و اسرار الٰہی کا علم و مشاہدہ حاصل کر کے عرفان ـــــ معرفتِ حقیقی حاصل کریگا۔

یہ کچھ عطا کرنے کے باوجود جب یہ اپنے مقصدِ حقیقی کو فراموش کر کے فساد و خونریزی۔ ظلم و بربریت پر اتر آتا ہے تو اللہ رب العزت اس گم کردہ انسان کو راہ راست پر لانے کیلئے فَاِمَّا یَاْتِیَنَّکُمْ مِّنِّیْ هُدًی انہی لوگوں میں سے منتخب افراد کو مبعوث کرتا ہے۔ جو یَتْلُوْا عَلَیْهِمْ اٰیٰتِهٖ ۔صرف بھولا ہوا سبق یاد نہیں کراتے ۔ بلکہ یُزَکِّیْهِمْ اپنی توجہ روحانی اور تعلیم سے انکا تزکیہ کرتے ہیں۔ اور پھر یُعَلِّمُهُمْ تا قیامت تبلیغ و تربیت کا یہ سلسلہ جاری رکھیں گے۔

قبلہ و کعبہ محمد نور الدین اویسیؒ نصف صدی تک نائب رسول ۔ ولی اکمل کی حیثیت سے یَتْلُوْا عَلَیْهِمْ اٰیٰتِهٖ وَ یُزَکِّیْهِمْ وَ یُعَلِّمُهُمُ الْکِتٰبَ وَالْحِکْمَةَ کا فریضہ سرانجام دیتے رہے۔ "علم العرفان" بھی اسی سلسلہ کی کڑی ہے۔ اسکا پہلا ایڈیشن اگست ۱۹۹۳ء میں شائع ہوا۔ جو اب کمیاب ہو چکا ہے۔ اسلئے نیا ایڈیشن شائع کیا جا رہا ہے۔ جس میں گزشتہ ایڈیشن میں کتابت وغیرہ کی رہ جانے والی اغلاط کی تصحیح کر دی گئی ہے۔ قاری کی سہولت کیلئے کتاب میں آیات اور احادیث کا حوالہ۔ وضاحت کیلئے تمثیلی اشکال۔ عنوانات بھی شامل ہیں تا کہ فہم میں آسانی ہو۔

قبلہ و کعبہ کا ایک خوبصورت ۔ دلکش ۔ موثر اور منفرد طرز تحریر ہے جو انکی پہچان ہے۔ "علم العرفان" کا اکثر و بیشتر حصہ قبلہ و کعبہ کے جوانی کے دور کا تحریر کردہ ہے۔ جو بڑا پر جوش۔ آسان فہم ہے جس میں زور دیگر مختلف انداز۔ دلائل اور امثال کے ذریعہ تفصیلاً بیان کیا گیا ہے۔ جس سے ادراک میں بڑی سہولت ہوتی ہے۔ آپکی دلسوزی اور پر جوش اور موثر انداز ایک خاص کیفیت طاری کر کے قاری کو اپنے سحر میں لے لیتا ہے۔ اگر کسی طالبِ حقیقت کو وقتی طور پر ولی اکمل کی راہنمائی میسر نہ بھی ہو تو بلاشبہ یہ اسے مقصودِ حقیقی تک پہنچانے کیلئے مکمل راہنمائی کرتی ہے۔ وَمَا تَوْفِیْقِیْٓ اِلَّا بِاللّٰهِ۔

العارض

(۱) محمد بشیر اویسی (۲) ریاض احمد خیال اویسی

از غلامانِ حضرت محمد نور الدین اویسی رحمۃ اللہ علیہ

محررہ: ۲۶ رجب الرجب ۱۴۳۵ھ بمطابق ۲۶ مئی ۲۰۱۴ء

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ○

دیباچہ

واضح ہو کہ فی زمانہ طریقت (علمِ طریقت) میں ـــــ جملہ سلاسل میں جو کچھ حقائق پیش کیے جاتے ہیں۔ ان میں طریقت سے متعلق جو کچھ علم پیش کیا جاتا ہے۔ طالبانِ راہِ حقیقت میں راہنمائی کیلئے کافی نہیں ـــــ علمائے اسلام ـــــ اولیائے امت ـــــ محققینِ اسلام کے پاس وہ ٹھوس علم میسر نہیں۔ جس سے مخلوقِ انسانی کو حقیقی راہ ہدایت میں عرفان کی کلی تکمیل ہو سکے۔

اللہ تعالی نے اپنے علمِ الٰہی کو حضرت آدمؑ سے لیکر حضور ﷺ کی ذاتِ اقدس تک ـــــ ازل سے۔ ابد تک ایک مستحکم علم کی صورت میں انبیاءؑ کے ذریعہ۔ مخلوقِ انسانی کی فلاح و نجات کیلئے پیش کیا ـــــ خصوصاً حضور محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وساطت سے تمام مخلوق ارضی پر کائنات کی سب سے عظیم کتابِ الٰہی ''قرآن'' کی شکل میں پیش کیا۔

قرآن نے واضح طور۔ اعلان کیا۔ اِنَّکَ لَتَھۡدِیۡۤ اِلٰی صِرَاطٍ مُّسۡتَقِیۡمٍ۔ یارسول اللہ صلی اللہ علیک وسلم۔ آپؐ کی ذاتِ اقدس صلی اللہ علیک وسلم پر مخلوقِ انسانی کو راہِ ہدایت ـــــ صراط مستقیم تک پہنچانا منحصر کیا گیا ـــــ صراط مستقیم کیا ہے؟ ـــــ صراط اللّٰہ ـــــ اللہ کا راستہ (جس راہ سے اسکی ذات تک پہنچا جائے) صِرَاطَ اللّٰہ ـــــ اللہ کا راستہ کیا ہے؟ ـــــ وہی جہاں زمین و آسمان واقع ہیں۔ صِرَاطِ اللّٰہِ الَّذِیۡ لَہٗ مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَمَا فِی الۡاَرۡضِ ط اَلَاۤ اِلَی اللّٰہِ تَصِیۡرُ الۡاُمُوۡرُ○ (پارہ ۲۵ سورۃ ۴۲ آیت ۵۳)

حضور ﷺ کی ذاتِ اقدس نے جیسا کہ حق ہے۔ مخلوقِ انسانی تک اس قرآنی علم کو پہنچا کر

رسالت ونبوت کی تکمیل کردی۔ کہ اَلْيَوْمَ اَکْمَلْتُ لَکُمْ دِیْنَکُمْ وَاَتْمَمْتُ عَلَیْکُمْ نِعْمَتِیْ وَ رَضِیْتُ لَکُمُ الْاِسْلَامَ دِیْناً ط (پارہ ۶ سورۃ ۵ آیت ۳) اللہ تعالیٰ نے اسکی تائید وتصدیق فرمادی ـــــ یارسول اللہؐ ـــ بلاشبہ ہم نے جو قرآنی علم آپ پر پیش کیا ـــ اسکی کلی طور تکمیل کردی۔ کہ مخلوقِ انسانی کیلئے ایک ۔''دین'' (راہ مستقیم) کی صورت میں قیامت تک منضبط کردیا۔۔ کہ مخلوقِ انسانی کو کسی موقع پر حصولِ مقصد ـــــ حصولِ معرفت میں تشنگی باقی نہ رہے گی۔ ہاں! یہ طے پایا ـــــ کہ آپؐ کا مرتب کردہ علم وعمل ـــ اَلدِّیْنُ الْاِسْلَام کی شکل میں قیامت تک باقی وقائم رہے گا۔اس کا وعدہ خود اللہ تعالیٰ نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی ذاتِ اقدس کو دیا۔ وَرَضِیْتُ لَکُمُ الْاِسْلَامَ دِیْنًا ط ـــ اللہ پسند کرتا ہے آپؐ کی مرتب کردہ راہِ مستقیم کو اور ہمارے نزدیک اِنَّ الدِّیْنَ عِنْدَاللّٰہِ الْاِسْلَامُ۔ یہ علم وعمل (قرآن وحدیث) طریقِ عمل (شریعت وطریقت) اللہ کے نزدیک احسن اور محبوب طریقِ عمل تصور ہوتا ہے۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی ذاتِ اقدس نے خود اس طریق کی نشاندہی فرمائی ـــــ حضرت آدم علیہ السلام سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی ذاتِ اقدس تک جس علمِ الٰہی کو انبیاءِ بنی اسرائیل کی صورت میں ایک طویل زمانہ تک وسعت دی ـــ اب آئندہ ہمارے مرتب کردہ علم ـــــ راہ مستقیم کی قیامت تک وسعت دینے کیلئے امت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے علمائے امت ـــ اولیائے امت یہ فریضہ ہر زمانہ میں ادا کرتے رہیں گے۔ اسی کیفیت کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے۔ اَلْعُلَمَاءُ اُمَّتِیْ کَاَنْبِیَاءِ بَنِیْ اِسْرَآئِیْلَ کے بیان میں واضح فرمایا۔ــــ کہ ہماری امت کے علماء (اجرائے قرآن وحدیث میں) قوم بنی اسرائیل کے انبیاء کے مانند الدین الاسلام کا اجرا قیامت تک کرتے رہیں گے۔

اللہ تعالیٰ نے ''الدین الاسلام'' کو ایک خصوصی انداز میں بیان کیا۔ جس میں اس علم وعمل

___ قرآنی بیان کوخصوصیت سے بیان کیا گیا۔ فَتَهَجَّدْ بِهٖ نَافِلَةً لَّكَ ۖ عَسٰی اَنْ یَّبْعَثَكَ رَبُّكَ مَقَامًا مَّحْمُوْدًا ○ یارسول اللہ صلی اللہ علیک وسلم۔ اس علمِ الٰہی میں ایک مخصوص عمل۔ راتوں کو عبادت کرنا۔ مقرر کیا گیا۔ کہ یہ صرف آپؐ کی ذاتِ اقدس کیلئے مخصوص ہے۔ کہ وَابْعَثْهُ مَقَامًا مَّحْمُوْدًا کہ قیامت تک آپ صلی اللہ علیک وسلم کی تقلید میں یہ عمل ہمیشہ جاری رہے ___ اسلئے اس عمل میں وَطَآ ئِفَةٌ مِّنَ الَّذِيْنَ مَعَكَ۔ آپؐ کے عاشقوں ___ جاں نثاروں۔ تابعین کی شمولیت (اِنَّ رَبَّكَ یَعْلَمُ اَنَّكَ تَقُوْمُ اَدْنٰی مِنْ ثُلُثَیِ الَّیْلِ وَنِصْفَهٗ وَثُلُثَهٗ وَطَآ ئِفَةٌ مِّنَ الَّذِيْنَ مَعَكَ ط) سے ایک خاص الخاص اولوالعزم ___ اولیائے امت کی تشکیل ہوگی۔ جن کی وساطت سے آپؐ کا مرتب کردہ علم وعمل (علمِ طریقت) مثل انبیاء بنی اسرائیل علی الدوام قیامت تک جاری رہے گا ___ جس عمل میں قیامت تک آپ صلی اللہ علیک وسلم کی ذاتِ اقدس پر درود وسلام یٰۤاَیُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا صَلُّوْا عَلَيْهِ وَسَلِّمُوْا تَسْلِيْمًا ○ اور حمد ادا کیا جائیگا۔ جو تمام مخلوقِ انسانی میں کسی فرد کو یہ مقام حمد (مَحْمُوْدًا) عطا نہیں کیا گیا ___ ہاں! ___ اس وعدے کا اظہار ہم نے اَتْمَمْتُ عَلَيْكُمْ نِعْمَتِيْ کے اعلان میں قبل از وقت (وَابْعَثْهُ مَقَامًا مَّحْمُوْدًا میں) کیا ___ یہ امر ہمارے ارادۂ ازلی میں محفوظ رکھا تھا ___ وَكَانَ اَمْرًا مَّقْضِيًّا ○ کہ وَرَفَعْنَا لَكَ ذِكْرَكَ۔ کہ مخلوقِ کائنات میں آپؐ ہی کی حمد ___ محمود ہو ___ جانو! یہی وہ مقام (مقامِ حمد و محمود) ہے جو اس طائفہٗ مقربین کے سلسلہ سے تا قیامت جاری رہے گا۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی امت کے اولیائے کاملین ___ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے مرتب کردہ۔ علم وعمل ___ الدین الاسلام ___ علم ___ اجرائے علم ___ عمل سے ہر زمانہ میں زندہ رکھیں گے۔ جس سے۔ مخلوقِ انسانی کو قیامت تک راہ حقیقت میسّر آسکے گی۔ اس عطا میں امت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم شامل ہے۔ لہٰذا لازم ہے۔ کہ امت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اعلیٰ وادنیٰ فرد سے اس حمد کی تکمیل کیلئے عہد لیا جائے کہ احترامِ

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم میں ہر فردِ امت کیلئے اِس عہد کی پابندی میں اپنی شرعی ذمہ داری پوری کرنے کی سعی میں مستعد رہے۔

ترسم نہ رسی بہ کعبہ اے اعرابی
زین راہ تو مے روی بہ ترکستان است

العارض
محمد نور الدین اویسی امینی کشمیری
مکان نمبر 3404
لِنک روڈ ایبٹ آباد

محررہ: ۱۹ اگست ۱۹۹۳ء

بِسۡمِ اللّٰهِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِيۡمِ○

باب اوّل

کائنات کی ہر شے میں بناؤ اور بگاڑ کا ایک مسلسل نظام چلا آتا ہے۔ یعنی ہر شے اپنی ابتدائی ہیئت بدل کر ایک نئی صورت اختیار کرتی ہے۔ اس ہیئت کی تبدیلی میں ہر شے کی نشو و ارتقاء کیلئے ایک مستقل زندگی کا ہونا لازمی ہے۔ ورنہ بے جان اشیاء اپنی ہیئت تبدیل نہیں کر سکتی ہیں۔ اسلئے کائنات کی ہر شے میں زندگی کے آثار قائم ہیں۔ یہ زندگی اسکی ظاہری صورت سے نہیں بلکہ ازل سے چلی آتی ہے۔ زندگی کی ابتدا اسکے منبعِ حقیقی سے ہی ہوتی ہے۔ منبعِ حقیقی وہی شے ہو سکتی ہے۔ جو خود ایک مستقل و مجسم زندگی کی حامل ہو۔ ایسی کیفیت سے خواہ زندگی کا سلسلہ خود بخود جاری ہو یا اسکے ارادہ سے زندگی کا سلسلہ جاری ہو وہی ہر زندگی کی خالق کہلاتی ہے۔ گویا ہر شے کی زندگی کا آغاز اِسکے خالق سے ہی ہوتا ہے۔ دراصل زندگی ایک قوی روح [1] ایا نور ہے جو مختلف مراحل میں مختلف صورتوں میں ظاہر ہوتی ہے۔ یہاں تک کہ یہ صورت محسوسات کے احاطہ میں آجاتی ہے اور انسانی حواس اسے محسوس کرنے لگ جاتے ہیں۔

ہر شے جب اپنا ظاہری وجود اختیار کرتی ہے۔ تو اِسے آئندہ زندگی میں اپنی نشو و ارتقا کیلئے اور زندگی کے تسلسل کو قائم رکھنے کے لئے سامانِ زندگی حاصل کرنے کی ضرورت پڑتی ہے۔ ظاہری

---

[1] اس کی تشریح آگے تفصیلاً کی جائے گی۔

وجود سے قبل چونکہ ایک شے لطیف ہوتی ہے۔ لطیف ہونے کی صورت میں اسے وجود برقرار رکھنے کی ضرورت نہیں ہوتی۔ اسلئے یہ زندگی ایک مستقل ہیئت نوری میں قائم ہوتی ہے جو مجسم زندگی کہلاتی ہے۔

دنیا کی مخلوق میں ہر قسم کی مخلوق کو سامانِ زندگی حاصل کرنے کے لئے اسکی ہیئت کے مطابق ذرائع حاصل ہوتے ہیں یہ امر لازمی ہے۔ کہ دنیا کی ہر شے ایک ٹھوس جسم حاصل کرنے کے بعد زندگی کو برقرار رکھنے کیلئے زمین کی دیگر اشیاء سے اپنا سامانِ زندگی حاصل کرتی ہے۔ اور جب تک ہر شے کو اپنا سامانِ زندگی حاصل نہ ہو اسکی زندگی کا تسلسل قائم نہیں رہ سکتا۔ اور نہ ہی اس کائنات کا نظام چل سکے گا۔ اس لئے ہر شے مخلوق میں سب سے اہم کردار اپنی نشوو ارتقا کا سامان حاصل کرنا ہی ہے۔ اور وہ ذرائع جن سے سامانِ زندگی حاصل کئے جاتے ہیں ''حواس'' کہلاتے ہیں۔ یعنی ہر وجود میں فطری طور پر اپنی ضرورت کی اشیاء کو جاننے پہچاننے اور اسے حاصل کرنے کا مادہ موجود ہوتا ہے۔ وہ مادہ حواس کی شکل میں ہی محسوس کیا جاتا ہے۔ حواس کا کام بیرونی اشیاء کا علم حاصل کرنا ہوتا ہے۔ تاکہ ہر شے اپنی قوتِ لایموت (سامانِ زندگی) اپنی ضرورت کے مطابق آسانی سے پا سکے۔ اگر حواس کام نہ کریں تو کوئی شے اپنی ضرورتِ زندگی کو نہ پہچان سکے گی نہ اس سے فائدہ حاصل کر سکے گی۔

اس کائنات میں مختلف قسم کی مخلوق پائی جاتی ہے۔ جن میں نباتات۔ جمادات۔ حیوانات کی اقسام ہیں۔ نباتات میں ہر قسم کی زمین سے اُگنے والی اشیاء ہیں۔ اِنکی ابتدائی زندگی حقیقتاً اِنکی ظاہری شکل سے شروع نہیں ہوتی بلکہ انکی زندگی کا مواد ان کی ظاہری ہیئت سے قبل (یعنی ازلی) ہے۔ جب تک کسی شے کی زندگی اسکی ظاہری ہیئت سے قبل موجود نہ ہو تو اس شے کے وجود کا قائم ہونا ناممکن ہے۔ جب تک دانہ میں زندگی موجود نہ ہو تو دانہ اپنی نشوو ارتقا کی طرف ترقی کرتے ہوئے درخت نہیں بن سکتا۔ دانہ میں زندگی کے آثار کا پایا جانا اس امر کی دلیل ہے۔ کہ اس زندگی کا سلسلہ دانہ سے قبل موجود تھا۔ جس زندگی سے دانہ کا وجود قائم ہوا۔ دانہ اپنی ہیئت کے اعتبار سے مادی ہیئت کا پہلا وجود ہے۔ اس سے قبل کی ہیئت محسوس میں نہیں اسلئے وہ ہیئت لطیف ہیئت اور مجسم زندگی کہلائے گی۔ گویا یہ تسلسل بھی منبع حقیقی سے جا ملتا ہے۔ اور اس قدیمی تسلسل کا ظہور دانہ کی صورت میں قائم ہو جاتا

ہے۔ مادی صورت حاصل ہونے کے بعد دانہ کو زندگی کے تسلسل یا اپنے وجود کو قائم رکھنے کے لئے سامان زندگی کی ضرورت پڑتی ہے۔ اسکے لئے دانہ میں بھی اسکی ہیئت کے مطابق حواس کا ہونا ضروری ہے۔ لیکن یہ حواس محسوس نہیں کیے جاسکتے۔ لیکن دانہ کی نشو و ارتقاء اس امر کی خود دلیل ہے۔ کہ جب تک دانہ اپنی ہیئت کے مطابق زمین سے مواد قبول نہ کرے۔ دانہ ترقی نہیں کرسکتا۔ اسی طرح وہ اشیائے جماداتی جو ہمیں منجمد نظر آتی ہیں۔ بظاہر ان میں زندگی کے آثار محسوس نہیں کئے جاتے ہیں۔ لیکن اِنکی ہیئت کی تبدیلی اور نشو و نما سے معلوم ہوتا ہے۔ کہ ان میں بھی زندگی ہے۔ اور زندگی کو مسلسل قائم رکھنے کیلئے یہ بھی ذرائع حصولِ سامانِ زندگی حاصل کئے ہوئے ہیں۔ ایک پتھر زمین کی تہوں میں عرصہ رہ کر اپنی ہیئت تبدیل کر کے سونا بن جاتا ہے۔ اگر اس میں حواس موجود نہ ہوں تو پتھر اپنی ہیئت تبدیل نہیں کر سکے گا۔ گویا کائنات کے فطری نظام کے تحت ہر شے کو سامان زندگی حاصل ہونے کا ایک طریقہ ہی انکے حواس کہلاتے ہیں۔ دانہ میں پھلنے اور پھیلنے کیلئے جو قوتیں کام کرتی ہیں وہی اسکے حواس کہلاتے ہیں۔ پتھر میں یا جماداتی مرکبات میں زمین کی تاثیر اور سورج کی شعاعوں کے اثرات قبول کرنے کا مادہ ہی انکے حواس کہلاتے ہیں۔ اسی طرح تیسری قسم حیوانات کی ہے۔ حیوانات ایک متحرک مخلوق ہے۔ انکی حرکت سے ظاہر ہوتا ہے۔ کہ ان میں ایک محرک زندگی پائی جاتی ہے۔ اِنکی تبدیلیِ ہیئت اور زندگی کے قیام کا دار و مدار ان کی غذا (سامان زندگی) سے ہی ہے۔ ہر جانور اپنی ضرورت کی غذا خود حاصل کرتا ہے۔ اسے علم ہے کہ میری زندگی کو برقرار رکھنے کیلئے کس غذا کی ضرورت ہے۔ شہد کی مکھی کو علم ہے۔ کہ میری غذا پھولوں میں ہے۔ وہ اپنی حس شامہ (سونگھنے کی حس) سے بہت دور مقام پر اپنی حسبِ ضرورت پھولوں کو پہچان لیتی ہے۔ چیونٹی اپنی قوت شامہ و باصرہ[۲] (سونگھنے اور دیکھنے کی حس) کے ذریعہ چھ میل تک دانہ کو محسوس کر کے حاصل کرسکتی ہے۔ اسی طرح کائنات کی ہر مخلوق میں زندگی کا نظام چلانے کیلئے انکی ہیئت کے مطابق ذرائع (حواس) پائے

---

[۱] جماداتی اجزا کا مرکب۔ [۲] چیونٹی کے سر پر چھ آنکھیں ہوتی ہیں جن سے وہ اپنی ہر ضرورت کیلئے کام لیتی ہے۔

جاتے ہیں۔ حیوانات کی حرکت ہمیں محسوس ہوتی ہے ۔ انکے روزمرہ حصول کے طریقے ہمارے مشاہدے میں آتے ہیں۔ اور ہم سمجھتے ہیں کہ یہ مخلوق اپنے حواس کے ذریعہ ہی اپنی زندگی کے سامان حاصل کرتے ہیں۔ باقی اشیاء کی حرکت ہم محسوس نہیں کرتے اسلئے ہمیں انکے احساسات کا علم نہیں ہوسکتا۔ کہ یہ اشیاء کس طرح اپنی نشو ونما کیلئے حواس سے کام لیتی ہیں۔

حیوانی زندگی میں حواس کس طرح کام کرتے ہیں؟ اسکا تجربہ حیوانی زندگی سے ہی ہوتا ہے۔ کہ ہر حیوان یا تو سونگھنے کے ذریعہ (قوتِ شامہ) یا دیکھنے کے ذریعہ (قوتِ باصرہ) یا مس کرنے کے ذریعہ (قوتِ لامسہ) یا ذائقہ سے (قوتِ ذائقہ) اپنی خوراک پہچان کر حاصل کرلیتا ہے۔ انکے علاوہ انسان بھی ایک مجسم زندگی کا حامل ہے۔ اور اسکی زندگی بھی باقی مخلوق کی طرح ابدی ہے۔ اور اس زندگی کا اجرا بھی اسی منبعِ حقیقی سے ہوا ہے جو تمام کائنات کا خالق ہے۔ اسکی زندگی جب مٹی اور پانی کے اجزا کے مرکب میں نمایاں ہوئی تو اس صورت نے انسان یا آدم نام پایا۔ اور جہاں اسکی ہیئت مادیت کے مرکب میں قائم ہوئی۔ تو اسے بھی اپنی نشو و ارتقا اور زندگی کے تسلسل کو قائم رکھنے کیلئے سامانِ زندگی کی ضرورت رہی ـــــ اور باقی مخلوق کی طرح انسان بھی اپنا سامانِ زندگی اپنے حواس کی مدد سے حاصل کرتا ہے۔ باقی مخلوق کے مقابلہ میں انسان کا وجود اپنی تخلیق میں کامل ہے۔ اسکی حرکت اسکی تلاش اور اسکے مکمل وجود سے انسانی حواس بھی نمایاں طور محسوس کیے جاتے ہیں۔ انسان میں بھی قوت باصرہ (دیکھنے کی قوت) قوتِ شامہ۔ قوتِ سامعہ۔ قوتِ لامسہ۔ قوتِ ذائقہ پائی جاتی ہے۔ اور انسان اپنے حواس خمسہ کی مدد سے اپنا سامانِ زندگی دیکھ کر۔ چھوکر۔ سونگھ کر۔ چکھ کر پالیتا ہے۔

الغرض کائنات کی ہر مخلوق اپنے حواس کے ذریعہ ہی اپنا سامان زندگی حاصل کرلیتی ہے۔ گویا ہر شے اپنے حواس کے ذریعہ ہی اپنے سامان زندگی کی کیفیات اور ہیئتوں کا علم حاصل کر کے انہیں استعمال میں لاتی ہے۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ حواس بیرونی اشیاء کا علم حاصل کرنے کا ایک ذریعہ ہیں۔ جس سے آگاہی کی تکمیل ہوتی ہے۔ اگر حواس موجود نہ ہوں۔ تو کسی شے کیلئے علم حاصل کرنا۔ اور اپنے ماحول سے آگاہ ہونا ناممکن ہے۔ کائنات کی مخلوق میں حیوانات اور انسان مستقل

حرکت رکھتے ہیں۔اسلئے انہیں حواس کی زیادہ ضرورت رہتی ہے۔تاکہ وہ اپنی جستجو سے اپنا سامان زندگی حاصل کرسکیں۔ایسی حالت میں اگرانہیں بیرونی ماحول کی اشیاء کا علم نہ ہوتو وہ اپنی ضرورتوں کو پورا کرنے سے قاصر رہیں گے۔

حیوانات کی زندگی کا تجربہ کرنے سے معلوم ہوتا ہے۔کہ یہ اپنے حواس سے صرف اپنا سامان زندگی حاصل کرتے ہیں۔برعکس اسکے انسان اپنے ارادہ وعلم سے ایک مستقل فکر کا مادہ بھی رکھتا ہے۔حیوانات میں نفع ونقصان کی تمیز نہیں۔فکر کرنے اور سعی کرنے کا مادہ نہیں۔لیکن انسان اپنے ارادہ سے اپنے سامانِ زندگی کی فراہمی میں فکر(سوچ) سے نئی راہیں پیدا کرکے اپنے لیے ایجادات سے آسانی پیدا کرسکتا ہے۔وہ اپنی زندگی کو آرام دہ بنانے کے لیے مختلف طریقے اختیار کرتا ہے ــــ یہ تفکر۔یہ ارادہ۔حواس سے تعلق نہیں رکھتے بلکہ اسکا تعلق دل ودماغ سے ہے۔دل سے ارادہ پیدا ہوتا ہے۔اوراس ارادہ کی تکمیل دماغ کرتا ہے۔گویا حواسِ خمسہ سے حاصل کردہ علم کی تکمیل بھی دماغ سے ہی ہوتی ہے۔یہ دماغ حیوانات میں بھی ہے۔اورانسان میں بھی۔لیکن حیوانات کا دماغ صرف حواس سے حاصل کردہ علم محفوظ رکھتا ہےاوراسی جمع شدہ علم کی مدد سے ہر حیوان اپنی خوراک پہچان لیتا ہے۔ برعکس اسکے انسانی دماغ اپنے ارادہ اوراپنی دلی خواہشات کی بھی تکمیل کرتا ہے۔اگرچہ حیوانی دماغ اور انسانی دماغ کی ساخت ایک ہی ہے لیکن انسانی دماغ کے تمام قویٰ حیوانی دماغ کے مقابلہ میں مکمل اور کارآمد ہیں۔حیوانی دماغ کا مخزنِ علم (حافظہ) انسانی مخزنِ علم کے مقابلہ میں علم کو اپنی ہئیت میں جمع نہیں رکھ سکتا۔اورنہ ہی وہ اپنی مرضی کے مطابق اس مخزن سے کوئی نئی ترتیب پیدا کرسکتا ہے۔اسلئے دماغی حیثیت سے انسان باقی تمام مخلوق میں افضل پایا جاتا ہے۔اسکے علاوہ انسانی بناوٹ کچھ اسطرح واقع ہے۔کہ یہ اپنے وجود کی تمام قوتوں سے حیوانوں کے مقابلہ میں کام لے سکتا ہے۔اوراہم خصوصیت یہ ہے کہ انسان اپنے ارادہ وحرکت کا خود مالک ہےاوراپنی مرضی کے مطابق اپنے ہر ارادہ کی تکمیل کی قدرت رکھتا ہے۔اس سے معلوم ہوتا ہے کہ باقی مخلوق کے مقابلہ میں انسان کی پیدائش

اپنے میں ایک خصوصیت رکھتی ہے۔ وہ یہ کہ عام حیوانوں کے مقابلہ میں انسان کا وجود مکمل واعلیٰ ہئیت اختیار کیے ہوئے ہے۔ اسکے علاوہ انسان ہی ایک ایسی پیدائش ہے۔ جو تمام ارضی قوتوں سے فائدہ حاصل کرتا ہے۔ گویا کائنات کی ہر شے انسان کیلئے ہی بنی ہے۔ اور اس تمام کائنات کی ملکیت سے صرف انسان ہی پورا فائدہ حاصل کرسکتا ہے۔ یہ امر قابل غور ہے۔ کہ کائنات کی ہر مخلوق اپنی زندگی قائم رکھنے میں مصروف ہے۔ لیکن یہ تمام مخلوق انسانی زندگی کو برقرار رکھنے کیلئے کام میں لائی جاتی ہے۔

اس امر سے ظاہر ہوتا ہے۔ کہ انسان کی تمام قوتیں صرف سامانِ زندگی فراہم کرنے کے لیے ہی نہیں۔ بلکہ اسکے ودیعت کردہ خواص کے اعتبار سے۔ اس کا کام ''فکر'' وسعی بھی ہے۔ انسانی بناوٹ پر غور کیا جائے۔ تو اس میں عام حیوانوں کے مقابلہ میں دماغی قابلیت وصلاحیت زیادہ پائی جاتی ہے۔ ایک جانور اپنے حواس وعلم سے صرف خوراک حاصل کرتا ہے۔ لیکن فکر کا تقاضا یہ ہے۔ کہ انسان ہر شے کے وجود کی چھان بین میں فکر سے کام لیتا ہے۔ حیوانات کی وجودی ساخت ایک ترتیب میں پابند ہے۔ یعنی وہ ٹانگوں سے چل سکتا ہے۔ اور سوائے چلنے کے اور کوئی کام ان سے لے نہیں سکتا۔ برعکس اسکے انسان کے ہاتھ پاؤں۔ اسکا قد وقامت اس انداز کا ہے۔ کہ یہ اپنے اعضاء سے ہر کام میں فائدہ حاصل کرسکتا ہے۔ گویا انسان دماغ سے سامانِ زندگی کی فراہمی کے علاوہ اس سے تفکر بھی کر سکتا ہے۔ اور اپنے وجود سے تفکر کی تکمیل میں سعی بھی کرسکتا ہے۔ یہی وہ دو اہم خواص ہیں جن سے انسان نے ماسوائے حصولِ سامانِ زندگی۔ فکر وجہد کا کام لینا ہے۔ فکر سے مراد کائنات کی اشیاء کی تحقیق کرنی۔ اور جہد (سعی) سے مراد اس تحقیق کی تکمیل کرنی ہے۔ فکر کا تعلق دماغ سے ہے۔ جب تک کائنات کی اشیاء کی کیفیتوں اور ہیئتوں کا علم دماغ میں جمع نہ ہو۔ انسان کسی معاملہ میں تحقیق نہیں کرسکتا۔ اور جب تک حواس بیرونی اشیاء کی کیفیتوں کا علم دماغ تک نہ پہنچائیں دماغ میں علم جمع نہیں ہوسکتا۔ اسلئے حواس اور دماغ کا آپس کا تعلق ہونا ضروری ہے۔

ہم دیکھتے ہیں کہ انسان کے سوا کسی مخلوق میں یہ تحقیقاتی مادہ نہیں پایا جاتا۔ سوائے اسکے کہ وہ دن چڑھے اپنے مقام سے اٹھ کر دن بھر اپنے سامان زندگی کی تلاش کر کے رات پھر اپنے مقام پر

بسیرا لیں۔ بر عکس اسکے انسان زمانہ کی رفتار کے ساتھ ساتھ اپنی تحقیق میں مصروف ہر دور میں ترقی کرتا جارہا ہے۔ مختلف کیفیات کی تحقیقات اور کھوج میں لگ کر اپنے سامان زندگی کے لیے مختلف ایجادات مختلف راہیں پیدا کر چکا ہے۔ یہاں تک کہ انسان ان کیفیات کی تحقیق کے درپے ہے۔ جو اسکے حواس وتعقل کے احاطہ سے بہت دور ہیں۔ تو معلوم ہوتا ہے کہ انسان صرف سامان زندگی حاصل کرنے کیلئے نہیں پیدا ہوا۔ بلکہ اسکے ذمہ یہ خصوصی کام ہے۔ کہ وہ اشیائے کائنات کی بناوٹ میں تفکر (تحقیقات) کرے۔ اس سے کیا نتیجہ اخذ ہوگا؟ وہ یہ کہ انسان کو کسی شے کے علم حاصل کرنے کیلئے اسکی ابتدائی بناوٹ۔ اسکے ابتدائی وجود کا کھوج لگانا ہوگا۔ اور اسکا نتیجہ؟ ___ انسان اِن اشیاء کے نفع ونقصان سے آگاہ ہوگا۔ اور ان تمام اشیائے کائنات کو اپنے قبضہ میں لاکر ان سے فائدہ حاصل کرے گا۔ اور اسکا آخری نتیجہ یہ ہوگا۔ کہ انسان کو اس کائنات کا ابتدائی وجود معلوم ہوگا۔ کہ اس کائنات کی تمام مخلوق کی تخلیق کس چیز سے ہے اور اسکا خالق کون ہے۔ گویا انسان کی فطری بناوٹ اس امر پر دلالت کرتی ہے۔ کہ انسان کے ذمہ اسکی فکر وسعی میں ایک خالق کی پہچان اور اس تک رسائی حاصل کرنا ہے۔ اگر اِن خوبیوں کے ہوتے ہوئے انسان نے اپنے فکر وسعی کے خواص کو کام میں نہ لایا۔ تو انسان اور حیوان میں کچھ فرق نہ ہوگا۔

کائنات کی اشیا کا بغور مطالعہ کرنے سے معلوم ہوتا ہے۔ کہ یہ کائنات ایک منظم نظام کے تحت چل رہی ہے۔ ہر شے ایک ہیئت چھوڑ کر دوسری ہیئت اختیار کرتی ہے۔ ہر شے کے ایک عمل میں اسکا ایک اور نتیجہ قائم ہوتا جارہا ہے۔ وہ نتیجہ اسکی ترقی یا تنزل کی صورت میں ظاہر ہوتا ہے۔ ایک دانہ ایک مترتب نظام کے تحت اپنا عمل جاری رکھ کر اپنی ہیئت تبدیل کرکے درخت کی صورت میں آجاتا ہے۔ یہ عمل درخت کی صورت میں نتیجہ پیدا کرتا ہے۔ یہ عمل ترقی (نشوو ارتقا) کہلاتا ہے۔ درخت اس کا آخری نتیجہ ہے ___ درخت اپنا عمل جاری رکھتا ہے۔ اس کی قوتیں رفتہ رفتہ ختم ہو کر فنا ہو جاتی ہیں۔ اور درخت اپنی ہیئت ختم کر کے ایک نئی ہیئت اختیار کر لیتا ہے۔ درخت بوسیدہ ہو کر اجزائے زمین میں جذب ہو جاتا ہے۔ یا تو زمین کے مختلف اجزاء میں ابھر کر ایک نئی زندگی قائم کرتا ہے۔ یا

ہزاروں سال زمین میں دب کر کوئلہ کی شکل اختیار کرتا ہے۔ اسکی بوسیدگی اس کا تنزل ہوتا ہے۔ لیکن اسکا تنزل بھی اسے عدم نہیں ہونے دیتا بلکہ ایک اور زندگی میں اسے دوبارہ قائم رکھتا ہے۔ اسی طرح انسان کی بھی کیفیت ہے۔ کہ اسکی ابتدائی پیدائش کے ساتھ اسکا عمل جاری ہوجاتا ہے اور یہ اپنی قوتوں کو ترقی پر لے جاتا ہے۔ یہاں تک کہ یہ تمام کائنات پر حکمرانی کرنے لگ جاتا ہے۔ یہ اسکے عمل کا ایک نتیجہ ہے۔ آخر وہ وقت بھی آتا ہے۔ جب یہ تمام راحتوں سے محروم ہوکر یاس و ناامیدی کے مراحل سے گزرتا ہے۔ یہ یاس و ناامیدی اسکے قویٰ کی کمزوری کے باعث ہوتی ہے۔ یہ زندگی اسکے لیے کسی قدر تکلیف دہ ہوتی ہے۔ اور آخر یہ بھی موت کی آغوش میں آ کر اپنی ہیئت فنا کر جاتا ہے۔ فنا کے بعد اسکی نئی ہیئت کیا ہوگی۔ اسکا انحصار اسکے پیدائشی وجود پر ہی منحصر ہے۔ اگر فکر و سعی کو کام میں لاکر اپنی قوتوں میں اضافہ کیا۔ تو انسان ایک دائمی راحت و اطمینان کی زندگی ۔ ایک مستقل نہ مٹنے والی زندگی جو ہمیشہ شاداب رہتی ہے حاصل کر لیتا ہے۔[1] اسکا ثبوت بھی خود اسکی زندگی سے ملتا ہے۔ کہ کائنات کی ہر شے کا ابتدائی وجود ایک مستقل منبع حقیقی سے شروع ہوتا ہے۔ اور انسان کا وجود بھی اسی ابتداء سے شروع ہوتا ہے۔ یہی ابتداء اسکی خالق و علت ہوتی ہے۔ علت اپنے معلول کے مقابلہ میں معلول سے قوی ہوتی ہے۔ انسان خود تمام کائنات کی مخلوق کے جواہر کا مرکب ہے۔ مرکب ہونے کے اعتبار سے یہ کائنات کی تمام قوتوں سے غالب قوت کا حامل ہے۔ کائنات کی قوتوں میں تمام شمسی ۔ ایتھری ۔ ایٹمی وغیرہ قوتیں شامل ہیں۔ ان تمام پر وجود کے اعتبار سے انسان غلبہ وقوت حاصل کئے ہوئے ہے۔ اگر انسان اپنی سعی و جہد سے اپنی قوتوں کو روبہ کار لائے تو اس کی مادی قوتیں ترقی کرتے ہوئے ان کائناتی قوتوں کے مقابلہ میں ہر خاصیت میں فوقیت حاصل کر سکتی ہیں ۔ اور جہاں ایک حقیقی علت کا تعلق ہر پیدائش سے ہو۔ وہاں انسان اپنی فکر و جہد سے منبع حقیقی کے قریب ہو کر لازوال قوت کا حامل ہو سکتا ہے۔ اور برعکس اسکے اگر انسان نے اپنے مقصدِ زندگی سے کوتاہی کی تو

---

[1] اسکی تشریح آگے طریقت کے باب میں آئے گی۔

یہ اپنے حقیقی واشرف منصب سے گر کر ایک ایسی ہیئت اختیار کرے گا۔ جو اسکے لئے یقیناً باعث ذلت و تکلیف ہوگی۔ اسی نتیجہ کی تکمیل کیلئے انسان کے لئے لازم ہو جاتا ہے۔ کہ وہ کائنات میں اپنے خالق کو پہچان کر اس تک پہنچنے کی سعی کر کے لازوال زندگی حاصل کرے۔ بالفاظ دیگر انسان دنیا میں رہ کر اپنی قوتوں کو تقویت دیکر اپنی انسانی پوزیشن کو برقرار رکھے ورنہ انسان نے اگر تنزل کی طرف رجوع کیا۔ تو باقی مخلوق کی طرح یہ بھی ایک ادنیٰ حالت میں جذبِ زمین ہو کر فنا ہو جائے گا۔ اور اس کی حیثیت بھی عام حیوانی مخلوق کی سی ہوگی۔

یہ نظریہ من گھڑت عقیدہ کی بنا پر نہیں۔ بلکہ امرِ واقع ہے۔ کہ انسانی زندگی کے مقصد کا پتہ اسکی روزمرہ زندگی میں نشوو ارتقا کے سامان سے ملتا ہے۔ انسان کی شرافتِ نسلی اور اسکے وجود کی بناوٹ۔ اس امر کی بین شہادت ہے۔ کہ انسان کے ذمہ حواس خمسہ اور ذہن کے ذریعہ تحقیقات و تفکر کر کے کائنات کی اشیاء اور اپنی ذات میں ایک تخلیقی (پیدائشی) مواد اور خالق کا پتہ لگانا ہے۔ ہم انسانی کردار کا تجزیہ کرنے کے بعد آخر اسی نتیجہ پر پہنچتے ہیں۔ کہ انسان کے حواس خمسہ اور ذہن وقلب۔ خود بخود ایک ایسا عمل جاری رکھے ہوئے ہیں جو انسان کو فکر و جہد کی طرف لے جاتے ہیں جس سے انسان زمانہ کی رفتار کے ساتھ ساتھ تحقیقاتی معاملات میں مزید معلومات حاصل کر کے پوشیدہ اسرار فاش کرتا جارہا ہے۔ ایک طرف وہ انکی تحقیقات میں تکمیل کے ساتھ ان پر قابض ہوتا جارہا ہے۔ دوسری طرف وہ ایسے مرکباتِ مخلوقی کا علم حاصل کر رہا ہے۔ جو بظاہر اسکے حواس کے احاطہ سے کہیں دور (ماوراءِ ادراک) واقع ہیں۔

یہ ایک فطری قانون ہے۔ کہ جس شے کا ہمارے حواس احاطہ نہ کر سکیں۔ وہ شے ہمارے ادراک وعلم میں نہیں آسکتی۔ لیکن ہمارے ماحول میں کئی ایسی اشیاء ہیں۔ جو ہمارے حواس میں نہیں آتیں۔ اور ہم انکا احساس کر لیتے ہیں۔ مثلاً ہوا۔ ایتھر۔ گیس۔ لطیف ذرات وغیرہ۔ باوجود حواس کی قوت سے باہر ہونے کے ہمیں مختلف (دوربینی و خوردبینی آلات) ذرائع حاصل ہیں جن کی مدد سے ہم ان اشیاء کا علم حاصل کر لیتے ہیں۔ اس سے ثابت ہوتا ہے۔ کہ جس حد تک انسان تحقیق کائنات

کیلئے ذمہ دار ہے اسکے لئے علم حاصل کرنے کے تمام سامان کائنات میں موجود ہیں۔ اس فطری انتظام کا تقاضا یہی ہے کہ انسان کا مقصد زندگی تفکر وسعی ہی ہونا چاہیے۔ اور اسکے فکر وسعی کی حد زمین کی محدود کائنات تک نہیں بلکہ ماوراءِ کائنات بھی ہے۔

ہمارے حواس خمسہ اور ذہن ہمارے وجود میں ایک خصوصی درجہ رکھتے ہیں۔ بلکہ ہمارے تمام اعضا ہمارے حواس اور ذہن کے ہی تابع ہیں۔ اور انسانی وجود میں سب سے زیادہ عمل ہمارے حواس اور ذہن کا ہی ہے۔ ہمارے حواس علم حاصل کرنے کے سوا اور کوئی کام نہیں کرتے۔ تو حواس و ذہن کی بناوٹ کے اعتبار سے ایک تفکر وسعی ہم پر لازم ہو جاتی ہے۔ اب دیکھنا یہ ہے۔ کہ ہمارے حواس اور ذہن علم حاصل کرنے میں کس طرح عمل کرتے ہیں اور کہاں تک اپنی تحقیقات میں کام کر سکتے ہیں اور ان قویٰ سے ہمیں کس قسم کا علم حاصل ہو سکتا ہے۔ اسکے لیے ہمیں یہ دیکھنا ہے۔ کہ حواس خمسہ کی کیا کیفیت ہے؟ انکی وسعتِ علم کہاں تک ہے؟ کائنات کی وسعت کہاں تک ہے؟

سب سے پہلے ہم نے یہ دیکھنا ہے۔ کہ ہم حواس خمسہ کے ذریعہ کیسے علم حاصل کرتے ہیں۔ اور ہمارے دماغ سے انکا کس طرح رابطہ قائم ہے۔ اور دماغ تک علم کیسے پہنچتا اور جمع ہوتا ہے۔ جس علم کے ذریعہ ہم اپنے مقصدِ زندگی کی تکمیل کرتے ہیں۔

ہمارے حواس خمسہ میں علم حاصل کرنے کے پانچ آلات (قوتیں) ہیں:۔

(۱)	قوتِ باصرہ:	نظر	دیکھنے کی قوت
(۲)	قوتِ سامعہ:	کان	سننے کی قوت
(۳)	قوتِ لامسہ:	تمام اعضاء	چھونے کی قوت
(۴)	قوتِ شامہ:	ناک	سونگھنے کی قوت
(۵)	قوتِ ذائقہ:	زبان	چکھنے کی قوت

یہ قوتیں اپنے عمل میں یکتا ہیں۔ اور علم کے لیے لازم و ملزوم ہیں جب تک یہ تمام حواس بیک وقت ایک شے کی تحقیق میں اپنا عمل پورا نہ کریں۔ کسی شے کی اصلی ماہیت ہمارے ذہن تک

پورے انداز سے آ نہیں سکتی۔ آنکھ کے دیکھنے کے بغیر باقی حواس کے ذریعہ اشیاء کی اصلی کیفیت ذہن تک نہیں پہنچتی۔ کان کے بغیر ہم ایک شے کے نام کے سنے بغیر اسے جمع نہیں کر سکتے۔ اسی طرح تمام حواس کام کرتے ہیں۔ انہیں حواسِ خمسہ کی مدد سے ہم کائناتِ ارضی کی تمام مادی اشیاء کی ماہیت۔ انکا نام۔ انکا مزاج اور انکی ہیئت کا علم حاصل کر کے ذہن (دماغ) تک پہنچاتے ہیں۔ اور دماغ ہی تمام علم کی آگاہی کی تکمیل کرتا ہے۔ ہر قوتِ احساس کا تعلق دماغ سے ہوتا ہے۔ اور ہر کیفیت کا علم دماغ تک پہنچ کر ہی علم کی تکمیل ہوتی ہے۔

دماغ: دماغی تجزیہ زمانہ قدیم سے محققین کی بحث میں آتا رہا۔ چونکہ ہر زمانہ میں انسان فطری طور پر تحقیقات کی طرف مائل رہا۔ جس میں حواس دماغ کو خصوصی دخل رہا۔ اسلئے مختلف زمانوں میں محققین نے اپنی قوتِ علم کے مطابق کائنات کی پیدائش اور اسکی بناوٹ کیلئے مختلف نظریات پیش کئے۔ اس کے ساتھ ہی علم حاصل کرنے والے دماغ کی قوت کا بھی اندازہ کیا گیا۔ کہ یہ کیسے علم حاصل کرتا ہے۔

دورِ قدیم میں یونانیوں نے اس معاملہ میں کافی چھان بین کی۔ انکے مختلف قسم کے نظریات پائے گئے۔ وہ صحیح ہوں یا غلط لیکن انہوں نے اپنی بساط کے مطابق ضرور کچھ آثار بتائے۔ چنانچہ قدیم یونانی محققین نے دماغ کے مختلف حصے بتائے۔ جو علیحدہ علیحدہ علم حاصل کرنے کا کام کرتے ہیں۔ انہوں نے بتایا ہے۔ کہ دماغ کے تین حصے میں۔ پہلا حصہ واہمہ کہلاتا ہے۔ دوسرا حصہ حافظہ کہلاتا ہے۔ تیسرا حصہ متصرفہ کہلاتا ہے۔ واہمہ اشیاء کی کیفیت کو پہچانتا ہے۔ حافظہ ان کیفیات کو اپنے خزانے میں جمع (محفوظ) کر لیتا ہے۔ متصرفہ ان کیفیات کو دیکھ کر کیفیات کے وجود سے آگاہی کی تکمیل کرتا ہے۔ یعنی متصرفہ کے عکس پذیر ہونے سے ہی انسان کو کسی شے کی ماہیت کا علم ہو جاتا ہے۔ یونانی حکماء نے دماغ کے ان حصوں کے مقام اور نام بھی بتائے ہیں۔ لیکن مختلف حکماء کے مختلف اقوال ایک دوسرے کے نظریات سے اختلاف رکھتے رہے۔ اسلئے یہ فیصلہ نہ ہو سکا کہ کونسا حصہ واہمہ ہے۔ کونسا حصہ حافظہ ہے اور کونسا حصہ متصرفہ ہے۔ واہمہ کا فعل کیا ہے۔ حافظہ کا فعل کیا ہے۔ متصرفہ کا فعل کیا ہے۔ ان میں حکماء کا اختلاف ہونے کے باعث قطعی ترکیب کا فیصلہ نہ ہو سکا۔

اسکے بعد محققین مغرب نے اس بارے میں تحقیقات کی ۔ابتدائی دور میں محققین کے تجربات اور نظریات زیادہ تر قیاس پر مبنی تھے۔ انکے نظریات بھی یونانی نظریات سے ملتے ہیں ۔لیکن جدید تحقیقاتی (سائنس) ادارے کے تجربات بالعمل ہیں۔ یہ محققین ہر شے کا تجزیہ کر کے اسکے مرکبات کو عینی مشاہدے (چشم دید) میں لاتے ہیں اسلئے انکے نظریات بالمشاہدہ ہیں۔ سائنس دانوں کے تجربات سے (دماغ کا تجزیہ کرنے کے بعد) پتہ چلتا ہے۔ کہ دماغ کے تین حصے ہیں۔ ایک حصہ کا نام حصہ بصارت (Area of sight) ہے۔ دوسرے حصے کا نام حصہ حرکت (Motor Area) ہے۔ تیسرے حصہ کا نام واہمہ یا وہمی حصہ (Psychic Area) ہے۔ پہلے دو حصص کی تشریح تو انہوں نے پوری بتادی۔ لیکن تیسرے حصہ کی پوری ترکیب کا اندازہ نہیں کر سکے۔ البتہ ان کا کہنا ہے ۔کہ اس حصہ سے وہم۔ یادداشت (حافظہ) اور انسانی ارادہ (عقل) کا تعلق ہے۔

اسکے علاوہ اسلامی حکماء نے بھی دماغ کے متعلق حصص بتائے ہیں ۔اور ہر حصے کا ایک مقرر نام بتایا ہے۔ اور انسانی خواص اور حواس کے تعلق کے اثرات سے ان قویٰ کے صحیح مقام ونام کی تصدیق کی ہے۔ اسلامی نظریہ (تحقیق) کی رو سے واہمہ۔ حافظہ حسِ مشترک ہی ہیں۔ اگر مغربی تحقیقات میں مشاہدہ میں لائے ہوئے قوائے دماغی حصہ بصارت اور حصہ حرکت کو شامل کیا جائے تو دماغی ترتیب کی صحیح ترکیب حاصل ہوتی ہے۔ یہ ترکیبِ دماغی اسطرح ہوجاتی ہے:-

(۱) حصہ بصارت (۲) متصرفہ (حصہ حرکت) (۳) واہمہ (۴) حافظہ (۵) حسِ مشترک۔

اب انکے الگ الگ کام اور حواس سے تعلق کی وضاحت ضروری ہے۔ اسکے لیے حواسِ خمسہ سے ہی اس وضاحت کی ابتداء ہوتی ہے۔

قوت باصرہ: آنکھ کا دیکھنا۔ اس کے متعلق مغربی محققین کے تجربات مبنی بر حقیقت [1] ہیں کیونکہ وہ

---

[1] محققین اسلام نے بھی اپنے تجربات پیش کئے ہیں۔ گو انہیں عینی مشاہدہ کیلئے سائنسی آلات کے ذرائع حاصل نہ تھے پھر بھی ان کے تجربات عین الیقین کی حد تک پہنچتے ہیں۔

انسانی وجود کے تجزیہ میں عینی مشاہدات سے دلیل پیش کر چکے ہیں۔ چنانچہ ان کا تجزیہ یہ ہے۔ کہ اس ارضی فضا میں لطیف (ایتھری) ذرات موجود ہیں۔ جو اپنی وسعت میں اس تمام کائنات ارضی میں پھیلے ہوئے ہیں۔۔ ان ذرات کا وجود لطیف ہونے کی وجہ سے غیر محسوس ہے۔ لیکن دور بینی آلات سے ان کو دیکھا جا سکتا ہے۔ انہی ذرات کی مدد سے ایک شے کا عکس آنکھ کی پتلی تک آ جاتا ہے۔ اگر یہ ذرات اس فضا میں موجود نہ ہوں۔ تو انسان کسی شے کی ماہیت کو آنکھ کے ذریعہ نہیں دیکھ سکے گا۔ دونوں آنکھ کی پتلیوں سے یہ عکس گزر کر آنکھ کے پچھلے حصہ پر (اندر کی طرف جو ایک پردہ[1] کی صورت میں واقع ہے) اُلٹا آ جاتا ہے۔ مثال کے طور اگر آنکھ کے سامنے شمع ہو تو اس کا عکس اندرونی پردہ بصارت (RETINA) پر اُلٹی شمع کی شکل میں پڑتا ہے اس کی ہیئت اس طرح ہے۔

ملاحظہ ہو خاکہ دماغی

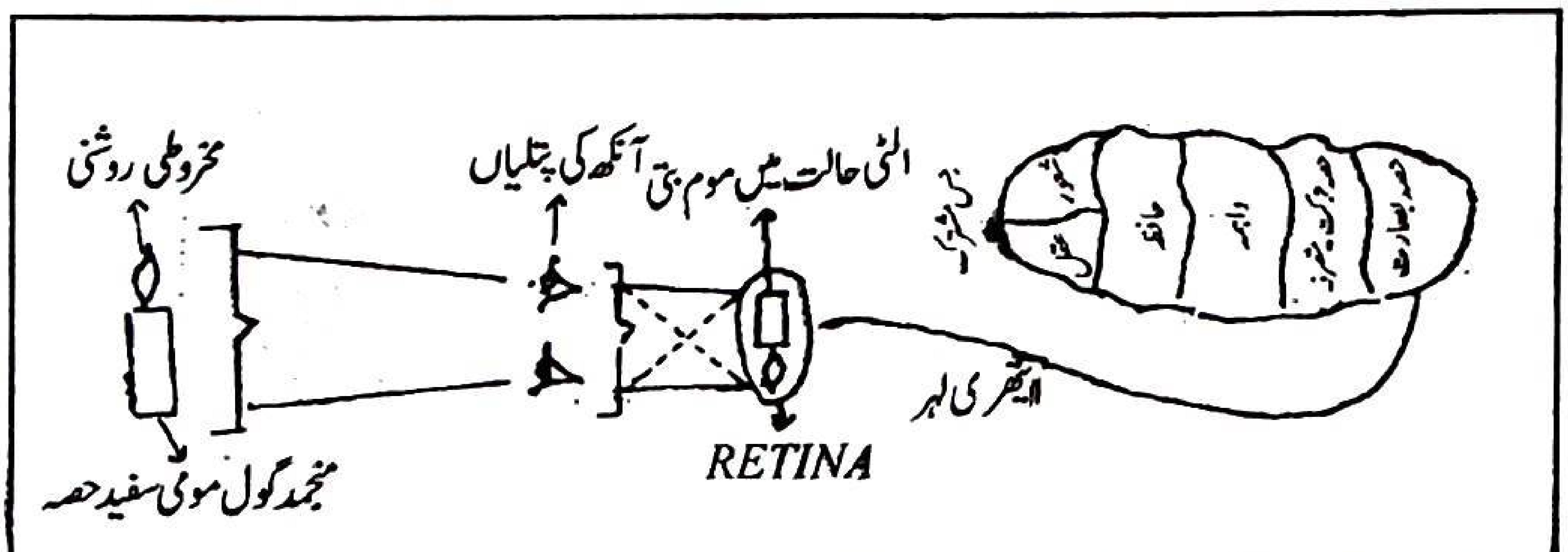

پردہ بصارت سے عکس گزرتا ہوا دماغ کے حصہ بصارت پر جا پڑتا ہے۔ دماغی حصہ بصارت پر عکس پھر سیدھا آ جاتا ہے۔ دماغی حصہ بصری سے یہ عکس متصرفہ میں منتقل ہوتا ہے۔ یہاں اس عکس کے آنے سے واہمہ عکس پذیر ہوتا ہے۔ واہمہ پر عکس منعکس ہو کر۔ واہمہ ہی شمع کی اصلی ہیئت کا نام و رنگ دیتا ہے۔ کہ یہ ایک گول سفید منجمد حصہ اور مخروطی روشن شے ہے۔ واہمہ سے حافظہ عکس پذیر ہو گا۔ تو یہ نقشہ حافظہ میں شمع کی شکل میں جمع (محفوظ) ہو جائے گا۔ اور اسی شکل کا عکس حس مشترک پر آ جائے گا۔ تب انسان کو یہ علم ہو گا کہ میرے سامنے ایک شے ہے۔ اگر شمع کی شکل عکس پذیر ہونے کے ساتھ کان کے

[1] یہ پردہ۔ پردہ نہیں بلکہ آنکھ کی اندرونی دیوار یا دہانے پر ایک لطیف تھیلی میں پانی کی شکل میں مائع کی صورت میں واقع ہے۔

ذریعہ اس کا نام بھی اسی ترکیب سے واہمہ۔ حافظہ تک پہنچا ہو۔ تو واہمہ شکل کے ساتھ شمع نام بھی دے گا۔ اور حافظہ بھی اسی طرح شمع کے نام سے کیفیت کو جمع کرے گا۔ اور حسِ مشترک (عقل) اس عکس جمع شدہ پر ہی اس ہیئت و نام سے آگاہ ہوگی۔ کہ یہ ہیئت شمع کی ہے۔ یہی صورت علم کے حصول کی ہے۔ کہ اب شمع اور اسکی ہیئت حافظہ میں جمع ہوگئی۔ اب آئندہ جب بھی اس قسم کی ہیئت دوبارہ آنکھ کے سامنے آئی۔ تو واہمہ فوراً شمع کا نام و رنگ دے گا اور حافظہ میں چونکہ یہ شکل قبل موجود ہے اسلئے یہ ہیئت اسی ہیئت میں سما جائے گی اور حافظہ پر ایک بار پھر شمع کا نقش ابھر آئے گا۔ جس سے عقل عکس پذیر ہوگی۔ دوسری بار بھی عقل اس کیفیت کو آسانی سے پالے گی۔ گویا علم کی اساس واہمہ و حافظہ تک ہی رہتی ہے۔ عقل صرف آگاہی کا ایک آلہ ہے۔ جیسا عکس حافظہ پر آیا وہی قبول کرلیا۔ اگر واہمہ و حافظہ پر حواسِ خمسہ کے ذریعہ کوئی عکس نہ آئے تو عقل بھی آگاہی سے محروم رہے گی۔

قوت سامع: سننے کی قوت۔ تجربہ سے یہ ثابت ہو چکا ہے۔ کہ اس کائناتِ ارضی کی فضا میں لطیف (ایتھری) ذرات موجود ہیں۔ جو اپنی وسعت میں تمام کائناتِ ارضی میں پھیلے ہوئے ہیں۔ ان ذرات کا وجود بھی غیر محسوس ہے۔ انہی ذرات کی لہروں کی مدد سے کان کے اندرونی حصہ (جو ایک پردہ یا ڈھول کی شکل میں واقع ہے) پر آواز کی لہر ٹکراتی ہے۔ یہی لہر کی ٹکر پردہ سے گزر کر حصہ حرکت پر آجاتی ہے۔ حصہ حرکت سے آواز کی لہر واہمہ پر آتی ہے۔ واہمہ سے۔ حافظہ پر اور حافظہ سے حسِ مشترک (یعنی شعور و عقل) اس آواز کو پاکر آواز کے الفاظ سے آگاہ ہوتی ہے۔

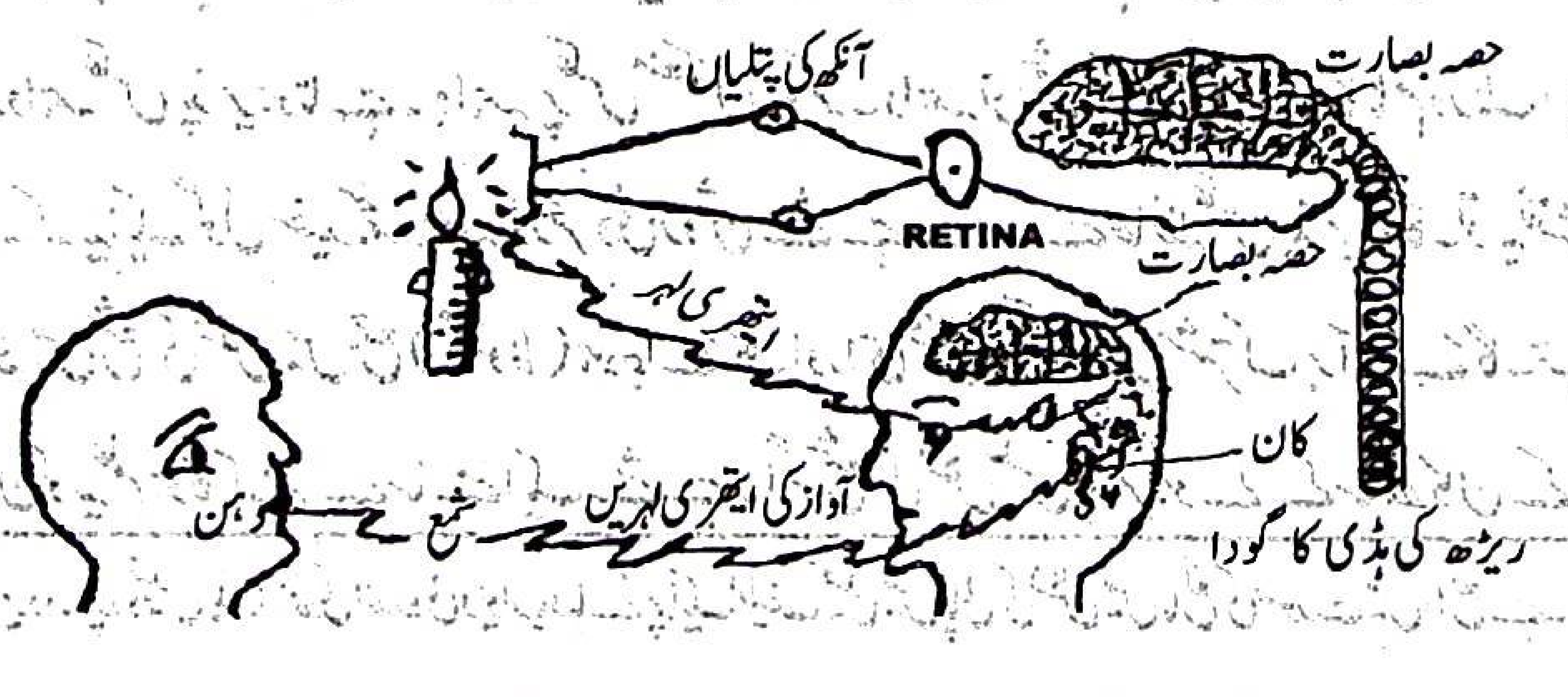

یعنی آنکھ کے عکس (شمع) کے ساتھ کان کے ذریعہ اسکا نام بھی بیک وقت شمع کی ماہیت کے ساتھ واہمہ تک پہنچتا ہے۔ اور واہمہ سے شمع اور نام مل کر حافظہ پر نام و ماہیت کا عکس آ جاتا ہے۔ اور اسی عکس سے عقل کو آگاہی حاصل ہوتی ہے۔ اگر کان کے ذریعہ نام شمع۔ شمع کے ساتھ نہ آئے۔ تو ہئیت کی اصلیت ادھوری رہ جائے گی تو اسے بجائے شمع کے صرف ہیئت ہی عقل پائے گی۔ کہ یہ ایک شے سفید گول منجمد اور دوسرا حصہ مخروطی روشن ہے۔ پر شمع نہیں سمجھ سکے گی۔

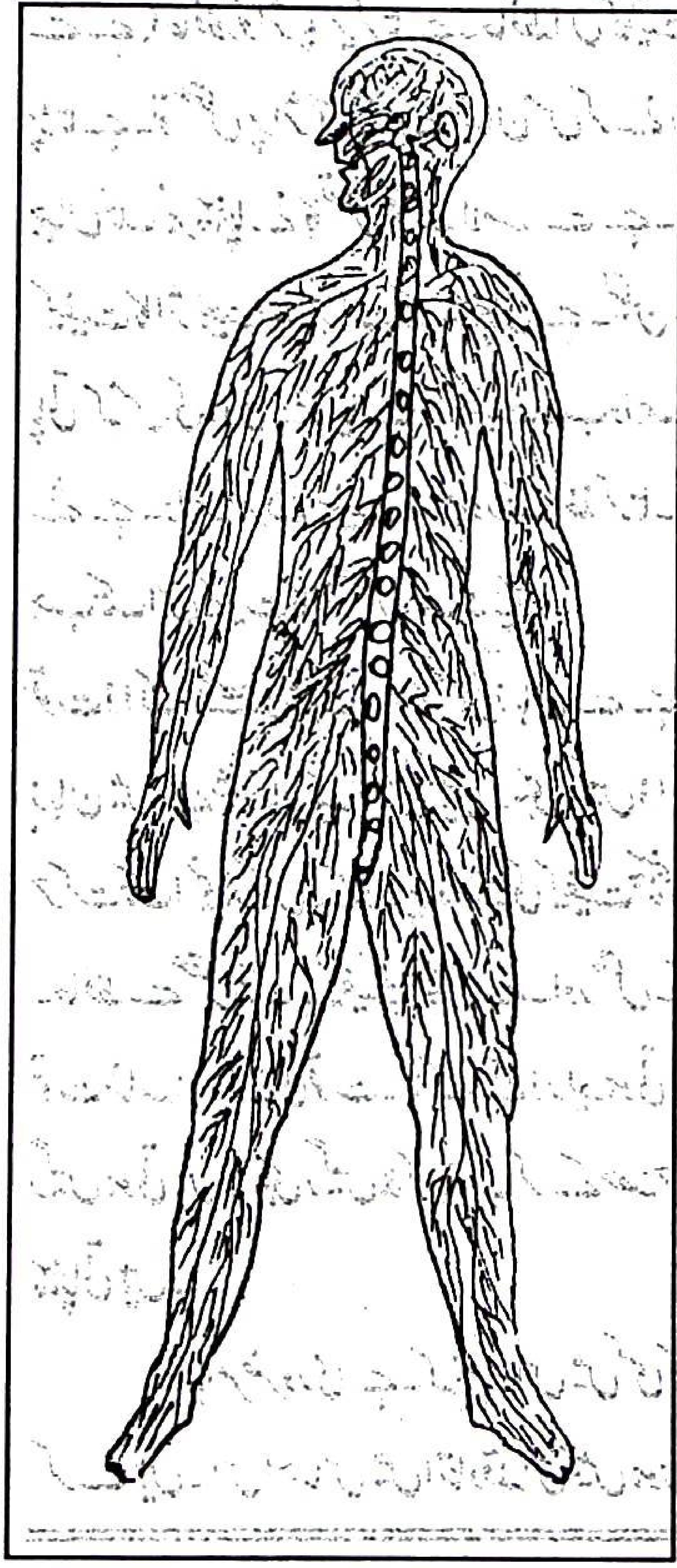

قوتِ لامسہ: چھونے کی قوت۔ مس کرنے کی قوت انسانی جسم کے تمام اعضا میں۔ اسکے اعصاب رگوں پٹھوں (Nerves) کے ذریعہ ہوتی ہے۔ ان اعصاب کا تعلق ریڑھ کی ہڈی میں ایک ملائم باریک غدود سے ہوتا ہے۔ یہ غدود ریڑھ کی ہڈی کے درمیان ہوتا ہے۔ ریڑھ کی ہڈی سر سے لے کر رانوں کی ہڈی کے جوڑوں (سرین) تک ہوتی ہے۔ اور اس کا غدود بھی سر کے پاس دماغ کے حصہ حرکت (Motor Area) سے ملا ہوتا ہے۔ دوسری طرف ریڑھ کی ہڈی کے خاتمہ کے ساتھ ختم ہو جاتا ہے۔ اسی غدود میں سے جسم کے ہر حصہ میں رگیں پھیلی ہوئی ہوتی ہیں یہ رگیں غدود کے ساتھ موٹی ہوتی ہیں اور جسم کے پھیلاؤ کے ساتھ باریک تار کی مانند گوشت اور پوست میں جال کی مانند پھیل جاتی ہیں انکا آخری سرا

گوشت میں جذب ہو جاتا ہے۔ یہی رگیں جسم میں اعضاء اور کھال میں خون پہنچا کر جسم کا گوشت و پوست بناتی ہیں۔ یہ رگیں چونکہ کھال کے ہر ذرہ میں پھیلی ہوئی ہوتی ہیں اسلئے ہر شے کے وجود کا مَس انہیں رگوں سے ہوتا ہے۔ چونکہ ان رگوں کا تعلق حصہٴ حرکت سے ہوتا ہے۔ اسلئے یہی حصہٴ حرکت انسان میں قوتِ لامسہ کو حاصل کر کے واہمہ کو (جو اسی حصہٴ حرکت کے ملحق ہوتا ہے) اثر پذیر کرتا ہے واہمہ جسم کے مس کرتے ہی وجود کی کیفیت و ہیئت پہچان کر اس کے مرکب کا نام دے کر (کہ یہ فلاں شے ہے) حافظہ کو اثر پذیر کرتا ہے۔ حافظہ اس کیفیت کا اثر محفوظ کر لیتا ہے۔ اسی کیفیت کا اثر عقل پر پڑتا ہے۔ تو عقل پر اثر آنے سے انسان مس کرنے والی شے سے آگاہ ہوتا ہے کہ یہ فلاں شے ہے۔ جہاں تک خبر پہنچانے کا تعلق قوت لامسہ سے ہے۔ یہ قوت شریانوں یا رگوں کے ذریعہ چھوتے والی کیفیت کا اثر بعینہٖ حصہ حرکت تک پہنچاتی ہے۔ لیکن یہ خود اس کیفیت کا اندازہ کرنے کی صلاحیت نہیں پاتی کہ مس کی ہوئی شے کیا ہے اور کیفیت جب واہمہ پر پہنچتی ہے۔ تب یہ اندازہ کیا جاتا ہے کہ یہ فلاں شے ہے۔ واہمہ صرف کیفیت کا نام و رنگ اخذ کرتا ہے۔ لیکن اس حالت میں بھی کیفیت کا علم نہیں ہوتا جب تک اس کیفیت کا اثر عقل تک نہ پہنچے۔

قوت ذائقہ: چکھنے کی قوت۔ اسکا تعلق زبان سے ہے۔ ذائقہ میں بھی مس کرنے کا عمل ہوتا ہے۔ کیونکہ زبان میں بے شمار باریک رگیں ہیں۔ یہی رگیں ذائقہ کو محسوس کرتی ہیں اور مس کرنے کی طرح حصہٴ حرکت تک انہی رگوں کے ذریعہ ذائقہ کی کیفیت پہنچتی ہے۔ حصہٴ حرکت سے واہمہ۔ واہمہ سے حافظہ ۔ حافظہ سے عقل تک یہ کیفیت پہنچتی ہے۔ اور عقل کے اثر پذیر ہونے سے ذائقہ کا علم ہو جاتا ہے۔

قوت شامہ: سونگھنے کی قوت۔ ناک کے ذریعہ ہوتی ہے۔ اور ناک کے اندر بھی زبان کی مانند باریک رگیں ہوتی ہیں۔ یہی رگیں بُو کو جذب کر کے حصہ حرکت، تک پہنچا کر واہمہ حافظہ اور عقل تک کیفیت پہنچاتی ہیں۔

یہ امر ضروری ہے۔ کہ ہم حواس میں کسی کیفیت کے آنے کے ساتھ ہی اس کیفیت کو محسوس کرتے ہیں۔ اس احساس میں اتنا وقفہ بھی نہیں ہوتا کہ ہم یہ محسوس کریں کہ عقل تک پہنچنے پر کسی شے

میں وقفہ کو محسوس کیا جائے۔ اسکی وجہ یہ ہے کہ ہمارے محسوس اور علم کا یہ عمل بیک وقت آناً فاناً برقی سرعت کے ساتھ ہو جاتا ہے۔ اِدھر حس نے محسوس کیا اُدھر اسی آن عقل بھی آگاہ ہو جاتی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ ہمارے جسم میں حواس اور دماغ کا اندرونی فعل تقریباً نیم روحانی (برقی) ہوتا ہے۔ کیونکہ یہ تمام عمل ہمارے جسم کی باریک رگوں سے ہی ہوتا ہے۔ وہاں آنکھ۔ کان۔ مس۔ ذائقہ۔ شامہ میں کوئی تار برقی نہیں۔ یا ہمارے جسم میں کوئی خلا نہیں کہ باہر کی کیفیت براہ راست دماغ تک پہنچے بلکہ ہمارے جسم کا ہر حصہ گوشت سے بھرا ہوا ہوتا ہے۔ اور اس گوشت میں باریک رگیں ہوتی ہیں ۔ان رگوں میں خون ہوتا ہے۔ اور خون ذرات کا مجموعہ ہوتا ہے۔ یہی ذراتِ خون حواس اور دماغ میں لطیف برقی ہیئت میں ہوتے ہیں۔ انہیں لطیف ذرات کے ذریعہ کیفیات دماغ تک پہنچتی ہیں۔ مثال کے طور پر اگر آنکھ ایک ہاتھی کو دیکھے تو ہاتھی کی جسامت آنکھ کی پتلی پر۔ پتلی کی گولائی پر اسی قد و قامت میں ہو جاتی ہے۔ جتنی آنکھ کی پتلی ہوتی ہے۔ جیسے کیمرہ ایک پہاڑ کی تصویر لیتے وقت اسکے عکس لینے والے آدھ انچ کے شیشے کی گولائی میں آدھ انچ سے کم جسامت میں پہاڑ کو اپنے احاطہ میں لیتا ہے۔ پتلی کے اندر کوئی خلا نہیں جس سے ہاتھی کی شکل گزر کر پردہ انعکاس (پردہ بصارت Retina) پر آجائے۔ پتلی سے پردہ پر اور پردہ سے حصہ بصارت (دماغ) تک انہیں باریک رگوں یا لطیف (برقی) ذرات کی لطیف موجوں (برقی لہروں) کے ذریعہ ہاتھی کی شکل آجاتی ہے۔ اور اس سے آگے بھی واہمہ کوئی شیشہ یا پردہ نہیں کہ اس پر عکس آجائے بلکہ نرم گودے کی شکل کا گوشت ہے جس میں بے شمار رگیں ہوتی ہیں۔ انہی رگوں اور خون کے ذرات کے ذریعہ واہمہ تک شکل پہنچ جاتی ہے۔ اور حافظہ تو دماغ میں تقریباً ایک انچ کا حجم رکھتا ہے یہ بھی کوئی صندوق نہیں۔ بلکہ واہمہ کی مانند نرم گودے کا لتھڑا ہے۔ پھر اس میں تمام زمانے کے واقعات کا جمع رہنا یعنی سمندروں کی پنہائی۔ پہاڑوں اور عظیم الجثہ ہیئتوں کے نقوش۔ طویل داستانیں غرض تمام کائنات کے نقوش جمع رہتے ہیں ۔اس کی صورت یہی ہوتی ہے کہ یہ تمام نقوش انہیں لطیف ذرات کے جسموں میں جمع رہتے ہیں۔ گویا اتنے سے قلیل حصہ میں اتنا وسیع نظام اس امر کی دلیل ہے۔ کہ ہمارے دماغ کا نظام تقریباً

روحانی[1] (لطیف سے لطیف) حالت میں پایا جاتا ہے اور ایسی حالت میں کسی کیفیت کے وجود کو دماغ میں پہنچنے کے لئے برقی رو کی مانند عمل ہوتا ہے۔ جیسے باہر فضا میں ایک آئینہ رکھا جائے اور اسی زاویہ پر

---

[1] ماہرین نفسیات۔ یورپ کے حکماء انسانی جسم کے ذرہ ذرہ کی چھان بین کر چکے ہیں اور ہر دور میں انہیں اس گوشت پوست کے وجود سے نئے نئے راز حاصل ہوتے جا رہے ہیں۔ انکی تحقیقات میں انسانی دماغ ابھی تک موضوع بحث چلا آ رہا ہے۔ باوجود سورج اور چاند کے ذرات کی تحقیق میں عبور حاصل کرنے کے ابھی تک ماہرین یورپ انسانی دماغ کی اس برقی کیفیت میں تحقیق کی تکمیل کرنے میں قاصر نظر آتے ہیں۔ حال ہی میں اخبارات میں دماغ سے متعلق ایک مختصر سی بحث شائع ہوئی ہے۔ جسکا خلاصہ ہم یہاں پیش کر رہے ہیں ماہرین نفسیات کا کہنا ہے۔

"انسانی دماغ کا حیاتیاتی مطالعہ بڑا پیچیدہ ہے۔ دماغ جس طرح کام کرتا ہے اس کو آپ کے دیگر جسمانی افعال ± سے جدا نہیں کیا جا سکتا۔ کیونکہ جو کام بھی آپ کرتے ہیں۔ دماغ کا اس سے گہرا تعلق ہوتا ہے۔ آپ کو اپنے دماغ کے افعال اور ان کی پیچیدگی اور اہمیت کا اندازہ مشکل سے ہی ہو سکتا ہے۔ کیا آپ تصور کر سکتے ہیں کہ آپکے چھوٹے سے دماغ میں دس ارب عصبی خلئیے موجود ہیں؟ یہ تعداد اگرچہ ان خلیات سے تعداد میں زیادہ نہیں جو آپ کے خون، جلد یا پٹھوں میں پائے جاتے ہیں۔ مگر دماغ کے خلیات باہم مل کر جتنی بار نقل و حرکت کرتے ہیں اس کی تعداد ان برقی ذرات سے بھی زیادہ ہے جو پوری کائنات میں موجود ہیں۔"

اس امر سے صاف عیاں ہوتا ہے۔ کہ اگر دماغ کے ایک قلیل حصہ کی تعداد کائنات کے ذراتِ برقی کے مقابلہ میں زیادہ اور قوی ہے۔ تو انسانی جسم کے ذرات کا کیا اندازہ ہو سکتا ہے۔ اور اسکے لئے یہ یقین کرنا لازمی ہے۔ کہ انسان اپنی برقی قوت کے اعتبار سے اپنے جسم میں کائناتی قوت کے مقابلہ میں زیادہ قوی قوت حاصل کئے ہوئے ہے۔ یہ انسان اگرچہ ٹھوس مادی وجود میں نظر آ رہا ہے لیکن اسکے عملی نظام میں قطعی روحانی قوت کارفرما ہے۔ آگے چل کر ماہرین نفسیات دماغ کی مختلف کیفیات کا تجزیہ کر کے مختلف قسم کے انکشافات کرتے جا (باقی حاشیہ اگلے صفحہ پر)

± اس کا مطلب یہ ہے کہ انسانی کردار میں جو مادہ اپنی نشو و ارتقاء کے لئے علم حاصل کرنے کا موجود ہے۔ اس میں انسانی جسم پورے کا پورا حرکت کرتا ہے۔ اور یہ حرکت اسکے حواس سے متعلق ہے۔ اور حواس کا رابطہ دماغ سے ہے۔ گویا انسانی حرکت و عمل کا زیادہ تر دارومدار اور تعلق حواس اور دماغ سے ہی ہے۔

اندر ایک کمرے میں دوسرا آئینہ رکھا جائے اسی طرح دوسرے کمرے میں۔تیسرے۔چوتھے ۔پانچویں کمرے میں ایک دوسرے کے عکس کے مقابلہ آئینے رکھے جائیں تو جسوقت باہر کے آئینہ پر

(بقیہ حاشیہ گزشتہ صفحہ) رہے ہیں۔

''دماغ کا دوسرے جسمانی افعال سے کیا تعلق ہوتا ہے؟ ماہرین نفسیات کا موضوع ہے۔وہ دماغ کے اندرونی نظام کے مطالعہ کے بعد چند مفید نتائج پر پہنچتے ہیں۔جن کا ماحصل یہ ہے۔کہ دماغ کے نظام کا عمل جذبات واحساسات اور حرکت سے گہرا تعلق رکھتا ہے۔۔۔۔ دماغ بھی دراصل برقی کیمیائی مشین سے مشابہت رکھتا ہے۔۔۔۔ چنانچہ اب یہ معلوم کرنا دشوار کام نہیں رہا کہ بجلی کی رو یا مخصوص کیمیکلز کے ذریعہ دماغی خلیہ کے انفرادی عمل کو ماپا جاسکتا ہے۔۔۔۔ مگر دماغ کی برقی روئیں اتنی تیز ہوتی ہیں کہ ان کا ادراک ہوتے ہوتے (معائنہ کرتے کرتے) وہ کروڑوں چکر کاٹ چکی ہوتی ہیں۔''

دوسری جگہ بیان کیا گیا ہے۔

''دماغ کے مطالعہ کے سلسلے میں سب سے زیادہ اندوہناک حقیقت یہ ہے۔کہ دماغ کی نفسیات کا کوئی ایک مکمل پہلو بھی اسکے برقی عمل کے مطالعہ سے پوری طرح واضح نہ ہوسکا۔۔۔

دماغی عمل کے بعض نتائج کا انکشاف ماہرین نفسیات نے اپنے گہرے مطالعہ کے بعد کیا ہے۔ان میں سے بعض برقی اثرات سمجھ میں آنے لگے ہیں۔۔۔۔ مشکل یہ درپیش آتی ہے۔کہ جب دماغ فعال ہوتا ہے۔تو برقی تال سُر ناپید ہوجاتے ہیں۔مثال کے طور پر جب ایک شخص آنکھیں بند کرلیتا ہے۔اور اس کے دماغ کا کوئی حصہ+ آرام کرنے لگتا ہے۔اس وقت برقی سروں کی رفتار تیز ہوجاتی ہے۔اور لہروں کا تناسب فی ثانیہ دس ہوجاتا ہے۔ان لہروں کو''الفائر'' کہتے ہیں۔

بالآخر اس دماغی نظام روحانی کا مطالعہ کرنے کے بعد ماہرین بھی اس نتیجہ پر پہنچے ہیں۔کہ اگر انسان مادی ذریعہ سے دماغ کے اس نظام پر عبور حاصل کرسکا تو اس دنیا کا وہ انسان یقینی طور پر مافوق الفطرت قوت وصلاحیت کا حامل ہوسکتا ہے۔

''دماغ کے حیرت انگیز نظام کا معمہ جس دن انسان پر پوری طرح منکشف ہوجائے گا۔انسانی تاریخ ایک نئے مرحلہ میں داخل ہوجائے گی۔'' (ماخوذ از اخبار کوہستان) +متصرفہ کا ایک حصہ

آفتاب کا عکس آتا ہے تو یہ عکس اسی آن ہر آئینہ پر آجاتا ہے۔ یہ عکس حقیقتاً فضا کے ان ذراتِ لطیف کے ذریعہ آجاتا ہے جو ذرات صرف [1] نظر کیلئے کیفیت کی ہیئت کو آنکھ تک پہنچاتے ہیں۔ اسی قسم کے

---

[1] حواس خمسہ سے کائنات کی کیفیات کی ہیئتیں پہچاننے کیلئے۔ انسان اور کائنات میں خصوصی نظام پایا جاتا ہے۔ یہ امر پایہ تحقیق کو پہنچ چکا ہے۔ کہ حواس خمسہ سے کیفیات کا عکس حاصل کرنے کیلئے فضا میں ایک لطیف ایثری قوت لطیف ذرات کی صورت میں پائی جاتی ہے۔ یہ قوت مثل ہوا کے دیکھنے میں نہیں آتی۔ اگر یہ ذراتِ لطیف فضا میں موجود نہ ہوں۔ تو حواسِ خمسہ کسی کیفیت کو محسوس نہ کر سکیں گے۔ نہ آنکھ دیکھ سکے گی نہ کان سن سکیں گے۔ گویا کیفیات کا علم حاصل کرنے کیلئے اس فضا کی لطیف قوت ہی اصل ذریعہ علم حاصل کرنے کا ہے۔ بغیر اس قوت کے علم حاصل نہیں کیا جا سکتا۔ جب آنکھ ایک وجود کو دیکھتی ہے۔ تو آنکھ تک اس وجود کا عکس اسی لطیف قوت کے ذریعہ لہروں کی شکل میں پہنچتا ہے۔ آنکھ سے لیکر دماغ تک یہ کیفیت کس طرح پہنچتی ہے۔ اسکا ذریعہ بھی یہی لطیف قوت ہوتی ہے۔ یعنی آنکھ کی پتلی (Eye Ball) آنکھ پر باریک جھلی۔ آنکھ کی پتلی کے پیچھے پردہ بصارت (Retina) یعنی پانی کی تھیلی۔ یہ سب قویٰ دراصل لطیف باریک رگوں (اعصاب) کا مجموعہ ہیں۔ آنکھ کی جھلی میں باریک اعصاب پائے جاتے ہیں۔ آنکھ کی پتلی باریک اعصاب کا مجموعہ ہے۔ ان اعصاب میں لطیف ہیئت میں خون کا دوران ہوتا ہے۔ یہ خون لطیف ذرات کا مجموعہ ہے۔ اسی طرح Retina پردہ بصارت میں، پانی جس پر آنکھ کی پتلی سے گذر کر کیفیت کا عکس آتا ہے۔ یہ پانی لطیف ذرات کا مجموعہ ہے۔ یہ لطیف ذرات وہی قوت ہے۔ جو فضا میں آنکھ تک کیفیت کا عکس لہروں کی شکل میں پہنچانے کا کام کرتی ہے۔ اور ایسا ہونا یقینی ہے۔ کیونکہ آنکھ سے آگے دماغ تک کیفیت کا عکس پہنچتا ہے۔ اسلئے اس مقام پر اس ایثری قوت کا پایا جانا ضروری ہے۔ اور بغیر اس قوت کے کیفیت آنکھ سے دماغ تک منتقل نہیں ہو سکتی ہے۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ حواسِ خمسہ میں اس لطیف قوت کا پایا جانا ضروری ہے۔

اسکی صورت یہ ہے۔ کہ کان۔ ناک۔ زبان۔ آنکھ میں کیفیات حاصل کرنے کا کام باریک اعصاب کے ذریعہ ہوتا ہے۔ اور ہر حِس میں یہ باریک اعصاب پائے جاتے ہیں۔ اور ہر مقام پر باریک اعصاب میں خون دوران کرتا ہے۔ اور اس خون میں انہیں لطیف ذرات کا وجود پایا جاتا ہے جو کیفیت کو دماغ تک منتقل کرتے ہیں۔ اور چونکہ دماغ خصوصی طور پر کیفیت کی آگاہی کا عمل پورا کرتا ہے۔ اسلئے ضروری ہے کہ دماغ میں بھی بہ طریق اعلیٰ یہی لطیف ذرات موجود ہوں۔ لہذا دماغ میں بھی یہی فضائی لطیف ذرات کیفیت کو منتقل کرنے اور احساس دلانے کا کام کرتے ہیں۔ گویا ہمارے علم کے حصول میں اول سے آخر تک یہی لطیف ذرات ہماری آگاہی و علم کا (باقی حاشیہ اگلے صفحہ پر)

ذرات بلکہ ان سے بھی لطیف ذرات (انہیں ذرات کی قسم) انسانی وجود (حواس و دماغ) میں موجود ہونے سے ہی علم و کیفیات کے پہنچنے کا ذریعہ قائم ہوسکتا ہے۔اس میں شک بھی نہیں کیونکہ خون ہمیں

(بقیہ حاشیہ گزشتہ صفحہ) کام انجام دیتے ہیں۔انسانی وجود میں دماغ انتہائی لطیف ہیئت و ساخت میں پایا جاتا ہے۔اس میں بے شمار باریک اعصاب پائے جاتے ہیں۔گویا دماغ باریک اعصاب کا مجموعہ ہے۔ان اعصاب میں دماغی لطیف ہیئت کے اعتبار سے خون دورہ کرتا ہے۔یہ خون لطیف ذرات ایثری کا مجموعہ ہے۔یہی ذرات عکس پاتے اور قبول کرتے ہیں۔انہی ذرات کا عکس قبول کرنا۔دماغ سے آ گاہی پانا تعبیر ہے۔یعنی انسان کا دیکھنا اسی لطیف قوت پر منحصر ہے۔تو یہ سمجھنا بہتر ہوگا کہ انسان میں کیفیت کا عکس پانے والی قوت اور دماغ میں دیکھنے اور آ گاہی پانے والی قوت یہی لطیف قوت ہے۔اس لطیف قوت کا دیکھنا۔پہچاننا ہی انسان کا دیکھنا۔پہچاننا کہلاتا ہے۔اسکا مطلب یہ ہے کہ حواس میں بجائے خود آنکھ کی ظاہری ساخت نہیں دیکھتی بلکہ یہی لطیف قوت دیکھتی اور دماغ کی طرف کیفیت منتقل کرتی ہے۔اسی طرح۔کان میں بجائے خود کان کی ظاہری ساخت سے سنا نہیں جاتا بلکہ یہی لطیف قوت سنتی اور آواز کو دماغ کی طرف منتقل کرتی ہے۔اسی طرح شامہ اور ذائقہ میں۔ناک اور زبان کے باریک اعصاب میں خونی ذرات سے چکھنا۔سونگھنا ہے۔اور اسی قوت کے ذریعہ چکھنے۔سونگھنے کی کیفیت دماغ تک منتقل ہوتی ہے۔اسی طرح قوت لامسہ کا عمل ہے۔بظاہر ایسا معلوم ہوتا ہے۔کہ جسم کا ٹھوس حصہ کسی کیفیت کو چھو کر محسوس کرتا ہے لیکن ایسا نہیں۔بلکہ جسم کے ہر ذرہ میں یہی باریک اعصاب پائے جاتے ہیں ان باریک اعصاب میں خون کا دوران ہوتا ہے۔اس خون میں بھی لطیف ایثری ذرات پائے جاتے ہیں۔مس کرنے سے یہی ذرات متاثر ہوتے ہیں۔یہی تاثر چھونے سے مراد ہے ــــــ گویا مس میں انگلی کا گوشت محسوس نہیں کرتا بلکہ انگلی کے اعصاب میں خون کے لطیف ذرات کیفیت کو جذب کر کے دماغ تک کیفیت کو منتقل کرتے ہیں۔قوتِ لامسہ میں جسم کا تمام حصہ شامل ہے اسلئے جسم کے تمام حصہ میں یہ لطیف ذرات برسرِ عمل رہتے ہیں۔

یہ ذرات ہمارے خون کی لطیف قوت ہے۔جسے خون کہا جاتا ہے یا یوں سمجھا جائے۔کہ خون لطیف ذرات کا مجموعہ ہے جو جسم کے ہر عضو میں موجود ہے۔اسی خون سے جسم ٹھوس مادی ہیئت میں بنتا رہتا ہے۔یہ لطیف ذرات ایک زندہ وجود ہیں۔یعنی انسان کی مانند روح و جسم کا مرکب ــــــ ہر ذرہ ایک لطیف جسم ہے جو زندہ ہے۔اس لطیف ذرہ کا ایک جسم ہے جسے زندہ ہونے کے لیے ایک روح کی ضرورت ہے۔وہ روح (باقی حاشیہ اگلے صفحہ پر)

ایک سرخ رنگ سیال مائع کی شکل میں نظر آتا ہے۔ حالانکہ خون کے ایک قطرہ میں لاکھوں ذرات کا

(بقیہ حاشیہ گزشتہ صفحہ) اس ذرہ کو زندہ رکھتی ہے گویا یہ روح لطیف ذرہ کے جسم سے بھی لطیف ہے جو قطعی غیر محسوس ہے۔ لیکن ایک مکمل قوی قوت ہے۔ یہی قوی قوت درحقیقت وجود میں علم کی آگاہی اور پہچان کا عمل پورا کرتی ہے۔ اسے روح حیوانی کہا جاتا ہے۔ اسی روح کے وجود سے انسان زندہ رہ سکتا ہے۔ یہ روح چونکہ مجسم زندگی اور پائیدار قوت ہے۔ اسلئے جسم کے مقابلہ میں یہ قوت ہر حال میں باقی وسالم رہتی ہے اور اپنا وجود ضائع نہیں کرتی باقی وجود اس روح کے علیحدہ ہونے پر مردہ ہو جاتا ہے۔ اور اس جسم کی حرکت وعمل ساقط ہو جاتا ہے جو انسانی موت سے تعبیر ہے۔ اس سے ثابت ہوتا ہے۔ کہ انسانی جسم بجائے خود متحرک وعامل نہیں بلکہ انسانی روح ہی دیکھتی ہے۔ سنتی ہے۔ سونگھتی ہے۔ چکھتی ہے اور محسوس کرتی ہے۔ اور دماغ میں بھی بذاتِ خود یہی روح کیفیات پہچانتی ہے۔ اور علم حاصل کرتی ہے۔ اس عمل میں ٹھوس جسم کا کوئی دخل نہیں۔ یہ روح ایک مکمل قوی جسم ہے۔ جو دیکھنے۔ سننے۔ محسوس کرنے اور سمجھنے کی صلاحیت پاتی ہے ـــــ چونکہ انسانی ہیئت جسم وروح کا مرکب ہے۔ اسلئے جسم سے ایک انسانی ہیئت کا احساس ہوتا ہے۔ اور انسان سے متعلق تمام حرکات وافعال جسم سے نہیں بلکہ روح سے تعلق رکھتے ہیں۔ بہ الفاظ دیگر انسان دراصل روح ہے۔ اور جسم انسانی ہیئت کا احساس دلانے والی ہیئت ـــــ روح کے عمل میں اسکا دیکھنا سننا وغیرہ روحانی حیثیت میں ہی ہوتا ہے۔ اسلئے یہ امر ثابت ہے۔ کہ روح اپنی روحانی ہیئت کے اعتبار سے ظاہری قویٰ کی محتاج نہیں۔ اگر آنکھ نہ ہو تب بھی روح۔ روحانی طریقہ سے دیکھ سکتی ہے ـــــ اسکا مطلب یہ ہے کہ روح وسیع وقوی کیفیت ہے۔ دماغ اسکا مرکز ہے۔ دماغ میں روح آگاہی حاصل کرتی ہے۔ اسلئے کسی بھی دور ونزدیک کیفیت کو بغیر آنکھ کی مدد کے بھی دیکھ سکتی ہے۔ البتہ روح کے روحانی طریقہ پر دیکھنے کا انسانی وجود میں ایک خاص طریقہ ہے۔ جس طرح آنکھ کی پتلی کے ذریعہ ایک کیفیت کا عکس دماغ کی روح تک پہنچتا ہے۔ اور دماغ کی روح عقل وشعور کے ذریعہ دیکھتی ہے ـــــ اور براہ راست نہیں دیکھتی۔ اسی طرح بغیر حواس خمسہ کے ذرائع کے اسکا دیکھنا دل کی قوت سے تعلق رکھتا ہے۔ اور دل اسی طرح کیفیت کو دماغ تک منتقل کرتا ہے۔ جس طرح۔ آنکھ کان یا قوتِ لامسہ وغیرہ ـــــ دل کی کیفیت میں اسکے کیفیت کے عکس حاصل کرنے کا طریقہ کیا ہے ـــــ؟ ـــــ وہی جو قوت لامسہ کا قوت لامسہ میں خون کے ذرات کی روح مس کی کیفیت حاصل کرتی ہے۔ اسی طرح جسم میں دل کی ہیئت بھی مثل دماغ کے لطیف ہے۔ بذاتِ خود جس طرح دماغ کی ہیئت باقی جسم کے مقابلہ میں لطیف ہے۔ اسی طرح دل کی ہیئت بھی باقی جسم کے مقابلہ میں لطیف ہے۔ اسلئے دل کے اعصاب۔ خون اور خون کے ذرات کی روح لطیف ہے۔ جس وقت دل خواہش یا ارادہ (باقی حاشیہ اگلے صفحہ پر)

وجود ہوتا ہے اسی طرح مادہ منویہ بھی ایک سفید قطرہ کی شکل میں نظر آتا ہے اسکا حجم بھی تقریباً 1/10 انچ

(بقیہ حاشیہ گزشتہ صفحہ) کرتا ہے۔ تو اسکا مطلب دل کے لطیف ذرات کی روح کسی کیفیت کی طرف توجہ کر کے اسکا عکس بغیر مس کے حاصل کرتی ہے۔ اسی طرح۔ جس طرح فضا کے ذرات میں کیفیت جذب ہو کر آنکھ تک پہنچ جاتی ہے۔ یہی طریقہ ہے جس سے بغیر مس کے دل کی روحانی قوت کیفیت کو جذب کرتی ہے۔ یہی کیفیت اس خون کے ذریعہ دماغ میں منتقل ہوتی ہے۔ جو خون دماغ سے دل کی طرف منتقل ہوتا ہے ـــــ لیکن یہ سمجھنا ضروری ہے۔ کہ دل ہر لحہ دماغ کی طرف خون منتقل کرتا رہتا ہے۔ تو لازمی ہے اسکے ساتھ مثل آنکھ کے کیفیات بھی منتقل ہوں ـــــ اسلئے دماغ کو روحانی حالات میں ہر لحہ روحانی کیفیات کا مشاہدہ کرنا چاہیے۔ لیکن ایسا نہیں ہوتا ہے ـــــ اس کی کئی نوعیتیں ہیں ـــ ایک یہ کہ امر واقع ایسا ہی ہے ـــ کہ دل کے ذریعہ دماغ کو ہر لحہ مشاہدہ کرنا چاہیے ـــ لیکن دماغ کی آگاہی میں انسانی جسم کے اعتبار سے ایک ضابطہ قائم ہے۔ وہ یہ کہ انسانی آگاہی میں حواس ہر لحہ کیفیات منتقل کرتے رہتے ہیں۔ اسلئے دماغ انہی کیفیتوں کی آگاہی میں مصروف رہتا ہے۔ اسکی ترکیب بھی باضابطہ ہے کہ۔ حافظہ کے ذریعہ جو کیفیت عقل تک پہنچے وہی کیفیت انسان دیکھ سکتا ہے۔ اور جو کیفیت حافظہ عقل کے سامنے نہ لائے اس کیفیت سے عقل آگاہ نہیں ہو سکتا۔ ایک نوعیت یہ ہے۔ کہ اگر دل سے کیفیت منتقل ہو وہ کیفیت بھی۔ حصہ بصارت۔ حصہ حرکت۔ واہمہ۔ حافظہ کے راستہ ہی عقل تک داخل ہوگی اسکے سوا کوئی بھی کیفیت کسی اور راہ سے عقل تک نہیں پہنچ سکتی ہے۔ کیونکہ ہر کیفیت کو پانے کے لئے دماغ کے لئے یہی ذریعہ قائم ہے۔ اسلئے دل کی کیفیت بھی انہیں ذرائع سے عقل تک پہنچ سکتی ہے۔ لہذا جب حواس سے کیفیات کا سلسلہ جاری ہو تو دل کی کیفیت کو اسوقت تک دماغ تک پہنچنے کا راستہ نہیں مل سکتا جب تک حواس خمسہ کی ترسیلِ کیفیت بند ہو کر دل کی کیفیت کے گزرنے کے لیے راستہ میسر نہ ہو۔ اسلئے دل کی کیفیت۔ حصہ حرکت۔ واہمہ کے ذریعہ حافظہ تک پہنچ سکتی ہے۔ لیکن حافظہ خود عقل کے آگے کیفیت منتقل کرتا ہے ـــ اسلئے دل کی کیفیت اس وقت تک حافظہ میں جمع رہتی ہے۔ جب تک حافظہ عقل کے آگے پیش نہ کرے اور جب حافظہ حواس کی کیفیت کو روک کر دل کی کیفیت کو عقل کے آگے کرے اس وقت فوراً عقل دل کی کیفیت کو پا سکتی ہے۔ لیکن عقل ٹھوس مادی اشیا کی کیفیت دیکھ سکتی ہے۔ لطیف کیفیات کو نہیں دیکھ سکتی اسلئے یہ کیفیت شعور میں منتقل ہوتی ہے۔ اور اس وقت شعور کے ذریعہ یہ کیفیت محسوس کی جاتی ہے۔ اس طرح انسان بیک وقت محسوس اور غیر محسوس کیفیات کو۔ محسوس اور غیر محسوس تصور میں دو کیفیتیں بیک وقت پا سکتا ہے۔ اسوقت انسان آنکھ بند کرے تو حواس کی اطلاع بند ہو جائے۔ تو دل کی کیفیت شعور کے ذریعہ عالم غیر جسمانی میں مشاہدہ کرتا (باقی حاشیہ اگلے صفحہ پر)

قطر ہوتا ہے لیکن اس قطرہ میں لاکھوں زندہ ذرات (برقی خلیئے) ہوتے ہیں۔ یہی کیفیت دماغ کی ہے

(بقیہ حاشیہ گزشتہ صفحہ) ہے۔ جس طرح۔ خواب کی حالت میں۔ یا آنکھیں بند کر کے تصور خیالی میں غیر مجسم کیفیتیں محسوس کرتا ہے۔ یہ بھی ایک نوعیت دل سے دیکھنے کی ہے۔ دوسری نوعیت یہ ہے۔ کہ جس طرح آنکھ کسی چیز کا عکس حاصل کرنے کیلئے کسی کیفیت کی طرف توجہ کر کے اپنی پتلی کے احاطہ میں لاتی ہے۔ تب ہی آنکھ کے ذریعہ کیفیت دماغ تک جاتی ہے۔ اگر کیفیت آنکھ کے احاطہ میں نہ آئے تو آنکھ سے کوئی کیفیت دماغ کی طرف منتقل نہیں ہوتی۔ اسی طرح ارادہ انسانی جب تک کسی غیر محسوس کیفیت کی طرف متوجہ نہ ہو دل کسی کیفیت کے عکس کو قبول نہیں کرتا ___ اگر فطری طور روح پر عکس آ بھی جائے جیسا کہ اسکی روحانی خاصیت ہے۔ کہ ہر حال میں روح پر کیفیات کا عکس اسی طرح طاری ہوتا ہے جس طرح آنکھ کی پتلی کی خاصیت ہے۔ یہ عکس بھی یا تو دل میں اسی طرح جمع رہتا ہے جس طرح حافظہ میں۔ یا دل سے منتقل ہو کر حافظہ میں جمع ہوتا ہے۔ لیکن انسانی دماغی روح پر شعور میں اس کا اثر نہ آنے سے انسان دل کی کیفیت سے بے خبر رہتا ہے۔ لیکن یہ کیفیت بھی۔ انسانی آگاہی میں شامل ہو کر حافظہ میں جمع رہتی ہے۔ ایسی کیفیت بھی انسانی مشاہدہ میں اس وقت آ سکتی ہے جب حافظہ حواس سے آمدہ کیفیات کا انتقال بند کر دے اور اچانک دلی کیفیت حافظہ سے شعور پر آ جائے۔ اسوقت انسان اس کیفیت غیر جسمانی کی شعور کے ذریعہ سے آگاہی حاصل کر سکتا ہے ___ گویا یہ مشاہدہ واقعہ کے صدور کے بعد بھی جبکہ واقعہ گذر چکا ہو اور بعد مدت حافظہ کے ذریعہ شعور تک آئے۔ جیسے کوئی کیفیت جو حافظہ میں جمع ہو اور بعد مدت کسی وقت عقل کے سامنے آ کر انسان گزشتہ واقعہ کو یاد کرتا ہے ___ اور واقع ہونے کے ساتھ ہی اگر حافظہ اس واقعہ یا کیفیت کو شعور کی طرف منتقل کرے تو اسی وقت بھی مشاہدہ میں آ سکتی ہے۔ یہ نوعیت دل کے ذریعہ کیفیات کے روحانی طور حاصل کرنے کی ہے۔ اسکے ساتھ ہی یہ بھی جاننا ضروری ہے۔ کہ اگرچہ دل کی ساخت میں اعصاب کے لطیف ذرات برسرِ عمل ہوتے ہیں جو ذرات دماغ اور جسم میں بھی پائے جاتے ہیں۔ اسکے ماسوئی دل میں ایک اور روح (لطیف ذرات) کا وجود پایا جاتا ہے۔ جو قطعی غیر محسوس ہے۔ اس روح کو صرف اسلام نے تسلیم کیا ہے۔ اور قرآن نے ہی اسکا ذکر کیا ہے جیسے قرآن پارہ ۱۴ سورۃ ۱۵ آیت ۲۸۔۲۹ میں تخلیقِ آدم میں اس قوت کا ذکر آتا ہے۔ وَاِذْقَالَ رَبُّكَ لِلْمَلٰٓئِكَةِ اِنِّيْ خَالِقٌ ۢ بَشَرًا مِّنْ صَلْصَالٍ مِّنْ حَمَاٍ مَّسْنُوْنٍ ○ فَاِذَا سَوَّيْتُهٗ وَنَفَخْتُ فِيْهِ مِنْ رُّوْحِيْ فَقَعُوْا لَهٗ سٰجِدِيْنَ ○ جب کہا آپ (ﷺ) کے رب نے ملائکہ سے میں زمین میں ایک خاکی انسان بنانے والا ہوں۔ زمین کے جواہراتی مرکب سے۔ پس جب میں اسے عقل و خرد سے مزین کروں اور اس جسم میں ایک نوری روح ودیعت کروں۔ تو اس جسم میں ایک نوری روح (باقی حاشیہ اگلے صفحہ پر)

کہ اس میں برقی لہریں پائی جاتی ہیں۔ جو حواس سے آمدہ اطلاعات وعلم کا احاطہ کر لیتی ہیں۔ گویا جسم کے اس ٹھوس مادی حصہ میں برقی ذرات کا پایا جانا اور لاکھوں ذرات کا ایک قلیل حجم کے قطرہ میں پایا جانا اس سے ثابت ہوتا ہے کہ انسانی جسم کے لطیف اعصاب میں لطیف ذرات کا ہونا یقینی ہے۔ انکی لطافت کے اعتبار سے انکا عمل بھی لطیف (مانند برق) ہوتا ہے۔

(بقیہ حاشیہ گزشتہ صفحہ) ودیعت ہونے سے تم اسکی جسمانی افضلیت تسلیم کرو۔ اللہ تعالیٰ نے دانستہ طور انسانی جسم میں اس نوری قوت کا حوالہ دیا۔ کہ یہ ایک نوری قوت ہے۔ جس کی وجہ سے ملائکہ نوری وجودوں نے (نوری اعتبار سے) آدم (انسان) کی فضیلتِ نوری (جو ملائکہ کی نوری قوتوں سے بالا صول برتر قوت کی حامل ہو سکتی ہے) تسلیم کی۔ قرآنی حوالہ کے مطابق اصولِ طریقت میں اس روح کو روح رحمانی سے موسوم کیا جاتا ہے۔ اتنی تفصیل روح رحمانی (نوری روح) کے متعلق اور کسی کلامِ الٰہی کے کسی کتاب سے واضح نہیں۔ علاوہ ازیں۔ نہ کسی محقق سے اس روح کی تصدیق ہو سکی۔ اسکی وجہ یہ ہے کہ اسکا وجود قطعی غیر محسوس اور انسانی عقل وعلم کے احاطہ سے قطعی باہر ہے۔ لیکن قرآن نے اسکے وجود کی نشاندہی کی ہے۔ کہ روح انتہائی لطیف ہے۔ اور اسکی وسعتِ مشاہدہ (قوتِ انعکاس) آسمانوں اور آسمانوں سے ماوراء کیفیات کا احاطہ کر سکتی ہے۔ اسی قوت کے ذریعہ دل ہر غیر مجسم محسوس کیفیت کا احاطہ کر کے دماغ تک پہنچا کر روحانی علم کی آگاہی کی تکمیل کرتا ہے۔ گویا علمی اعتبار سے انسان کائنات کی تمام محسوس اور غیر محسوس کیفیات کا مشاہدہ کرنے کی صلاحیت رکھتا ہے۔ چونکہ اسکا قریبی تعلق مادی ٹھوس اشیاء سے ہے جس کیلئے حواس ہر وقت برسر عمل رہتے ہیں۔ اسلئے انسان مادی اشیاء کی تحقیق وعلم میں مصروف رہ کر اس وقت تک غیر مادی کیفیات سے بے خبر رہتا ہے۔ جب تک کہ وہ ان کیفیات کی طرف خود توجہ نہ دے۔ البتہ ایسے مشاہدات ایک صحت منداور کامل انسان سے ہوتے ہیں۔ کیونکہ ان مشاہدات میں۔ دل ودماغ اور جسم کی مکمل صحت وقوت کا حامل ہونا لازمی شرط ہے۔ بیمار اور غیر صحت مند جسم ودماغ سے انسان ایسے مشاہدات حاصل نہیں کر سکتا۔ الغرض حواسِ خمسہ کی ہر قوت میں ایک روح حیوانی ہے۔ جو علم کی آگاہی کا اصل سبب ہے۔ اسی طرح ماورائے ادراک لطیف روحانی (آسمانی) قوتوں کیلئے انسان میں ایک اور عظیم روح بھی موجود ہے جسکا تعلق دل سے ہے۔ جس میں بغیر حواس کیفیات حاصل کرنے کی صلاحیت پائی جاتی ہے۔ اور دل کی اسی روح عظیم سے ہر غیر مادی لطیف شے کا ادراک کر کے دماغ کو آگاہی کا ذریعہ فراہم کیا جا سکتا ہے۔ اسلئے دماغ کی روح کا غیر مادی لطیف غیر جسمانی کیفیات مشاہدہ کرنا اسی دلی روح عظیم سے وابستہ ہے۔

ہمارے حواس خمسہ میں قوتِ باصرہ۔ سامعہ۔ لامسہ۔ ذائقہ۔ شامّہ کی ان باریک رگوں کا تعلق حصہ حرکت سے ملتا ہے۔ یعنی حصہ حرکت تمام حواس کا جنکشن ہے۔ اور یہاں سے پھر ایک ہی تار واہمہ۔ حافظہ۔ عقل تک جاتا ہے۔ تمثیلی خاکہ اسطرح ہے۔

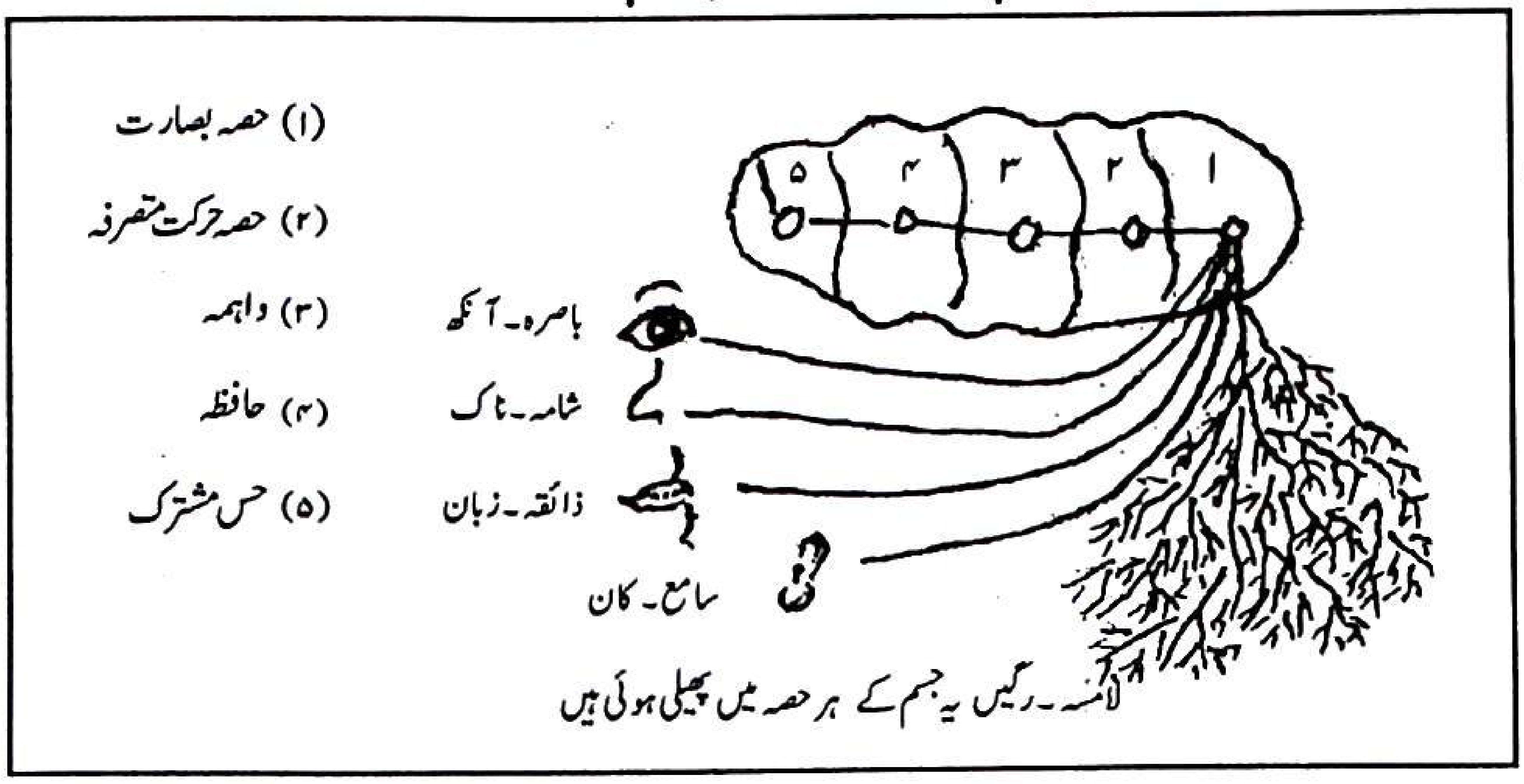

حواسِ خمسہ کے عمل کا بیان ہو چکا۔ اب یہ معلوم کرنا ہے۔ کہ دماغ کے ان پانچ حصص کا صحیح عمل کیا ہے؟

(۱) حصہ بصارت:- اس کا تعلق صرف نظر سے ہے۔ یعنی جو شکل آنکھ کی پتلی پر آئے وہی کیفیت حصہ بصارت پر آ جاتی ہے۔ دماغ میں حصہ بصارت کا پایا جانا اس وجہ سے ہے۔ کہ انسان کو بیرونی ماحول سے ہر لحہ آگاہ رہنے کی ضرورت رہتی ہے۔ اور یہ کام آنکھوں کے ذریعے پورا ہو جاتا ہے۔ چونکہ انسان کو ہر شے کے علم کیلئے اشیاء کی پہچان کی شدید ضرورت رہتی ہے۔ اسلئے اس ضرورت کو پورا کرنے کیلئے آنکھ وسیع پیمانہ پر اپنا عمل جاری رکھتی ہے۔ چونکہ آنکھ کا عمل دماغ سے ہی پورا ہوتا ہے۔ اسلئے اسکی خصوصیت کے اعتبار سے آنکھ کے عمل کی فوری تکمیل کیلئے ایک خصوصی حصہ بصارت ذہن میں پایا جانا لازمی ہے۔

(۲) حصہ حرکت:- عربی میں اس حصہ کو متصرفہ کہا جاتا ہے۔ یعنی تصرف کرنے والا دماغی حصہ۔ اس حصہ کو متصرفہ اس لیے کہا جاتا ہے۔ کہ دماغ میں حسِ مشترک سے تمام جسم میں۔ ریڑھ کی ہڈی کے گودے کے ذریعہ رگیں۔ پھیلتی ہیں۔ اصل میں جہاں ریڑھ کی ہڈی کا گودا دماغ کے گودے سے جا

ملتا ہے۔اس حصہ کو متصرفہ کہا جاتا ہے۔اسلئے کہ تمام جسم کی حرکت اسی دماغی گودے میں دماغی گودے کی رگوں کے پھیلاؤ۔کھچاؤ کے ذریعہ ہوتی ہے۔اوراس حصہ کے گودے میں حسِ مشترک سے نکلی رگیں ملی ہوتی ہیں۔چنانچہ جسم میں تمام رگوں (شریانوں) کا (جنکشن) ملاپ اسی دماغی گودے پر ہوتا ہے۔یہ رگیں اکٹھی ہو کر حسِ مشترک (عقل) کے گودے پر ملتی ہیں۔اسلئے۔انسانی ارادہ پر۔عقل متحرک ہوتا ہے۔تو عقل اپنی رگوں (شریانوں) سے متصرفہ پر اثر ڈالتا ہے (حرکت وعمل کیلئے) تو یہ اثر براہِ راست متصرفہ کے دماغی حصہ پر آتا ہے۔اسی حصہ سے جسم کے اعضا متاثر ہو کر۔حرکت کرتے ہیں۔اسلئے جبکہ انسانی ارادہ کا حرکت وعمل اس دماغی حصہ سے وابستہ ہوتا ہے۔جس وجہ سے محققین نے اس حصہ کو متصرفہ (یعنی جسم پر تصرف کرنے والا) کہا ہے۔

(۳) واہمہ:- جو کیفیت حصہ حرکت حاصل کرتا ہے۔تو واہمہ ہی سب سے پہلے اس کیفیت کا ایک مستقل ہئیت نام ورنگ مقرر کرتا ہے۔یعنی حصہ حرکت پر جب ایک شے کی شکل آنکھ کے ذریعہ پہنچتی ہے۔تو اسی وقت مس کے ذریعہ اسکے وجود کی ہیئت ٹھوس محسوس ہوتی ہے۔اور ساتھ ہی کان کے ذریعہ اسکا نام۔اور ذائقہ (زبان) اور شامہ (ناک) کے ذریعہ ذائقہ اور بُو بھی پہنچتی ہے۔اسطرح حواسِ خمسہ کی مختلف کیفیتیں حصہ حرکت پر جمع ہو جاتی ہیں۔لیکن حواس خمسہ یا حصۂ حرکت کے ذریعہ کسی شے کی ماہیت کا علم نہیں ہوتا۔جب تک واہمہ و حافظہ اسکی ہیئت مکمل بنا کر عقل تک نہ پہنچائیں یعنی اگر حصۂ حرکت کے بعد واہمہ موجود نہ ہو۔تو حصہ حرکت کی کیفیت صرف کیفیت ہی رہے گی۔اور اسکا علم انسان کو نہ ہو سکے گا۔واہمہ کے عکس لینے سے ایک شے کی مستقل ہئیت کا وجود اور نام پایا جاتا ہے۔لیکن اسطرح بھی یہ شے انسانی علم وآگاہی میں نہیں آتی۔البتہ واہمہ کیفیت کو حافظہ تک پہنچا دیتا ہے۔

(۴) حافظہ:- حافظہ سے مراد محفوظ کرنے والا۔اس حصۂ دماغ میں تمام زندگی کے واقعات جمع رہتے ہیں۔یعنی جو کیفیات حواسِ خمسہ سے محسوس کی جاتی ہیں وہ آخر اسی حصہ میں جمع ہو جاتی ہیں اور حافظہ ان واقعات کو اپنے میں ایک ترتیب کے ساتھ محفوظ کر لیتا ہے۔اس کی مثال ایسی ہے جیسے ایک کمرے میں بہت سی اشیاء جمع کی جائیں اور کمرے میں ہر شے ایک قرینے سے رکھی جائے تاکہ وقتِ ضرورت

آسانی سے مطلوبہ چیز لی جائے۔اسی طرح حافظہ میں تمام واقعات قرینے سے جمع رہتے ہیں جسوقت جس گزشتہ کیفیت کو یاد کرنا ہو۔تو حافظہ پر زور دیا جاتا ہے۔حافظہ اسی کیفیت کو عقل کے سامنے لاتا ہے۔ تو گزشتہ واقعہ یاد آ جاتا ہے۔بعض اوقات کسی گزشتہ واقعہ کو دہراتے وقت واقعہ کا کوئی حصہ یاد نہیں آتا۔ تو اسکا مطلب یہ ہوتا ہے۔کہ حافظہ اس حصہ کو عقل کے سامنے نہیں لاتا۔اور یا تو زور دینے سے وہ حصہ سامنے آ جاتا ہے۔یا حافظہ قطعی اس حصہ کو عقل کے سامنے نہیں لاتا تو وہ حصہ یاد آنے سے رہ جاتا ہے۔یہی کیفیت ہمارے علم کی ہے۔جو علم حواسِ خمسہ آنکھ۔کان۔مَس۔ذائقہ۔شامہ کے ذریعہ حاصل کرتے ہیں۔یہ علم حصۂ بصارت۔حصہ حرکت کے ذریعہ واہمہ تک پہنچتا ہے۔واہمہ ہر کیفیت کو اصلی ہئیت میں سجا (بنا سنوار) کر حافظہ تک پہنچاتا ہے۔حافظہ اسے ترتیب سے محفوظ کر لیتا ہے۔اور جس وقت ہم سابقہ علم کو استعمال کرنا چاہتے ہیں۔تو حافظہ پر زور دیتے ہیں۔حافظہ اسی علم کے مطلوبہ اجزا عقل کے سامنے لاتا ہے۔تو ہم علم کو استعمال کرتے ہیں۔یہ علم یادداشت کہلاتا ہے۔ یادداشت سے مراد جمع شدہ علم کو حافظہ سے لیکر عقل تک دوبارہ آگاہی میں لانا ہوتا ہے۔اسی علم کو علماء۔ محققین۔محترع (ایجاد کرنے والے) غرض ہر علمی طبقہ کے لوگ حافظہ سے لے کر علم کے مختلف اجزا اکٹھے کر کے۔اپنی تحقیق کی تکمیل کر کے ایک نئی مستقل شکل بنا کر ایک مسئلہ کی تکمیل۔ایک نظریہ کی تکمیل۔ایک اختراع۔ایک ایجاد قائم کرتے ہیں۔یہ تمام عمل (علم کے مختلف اجزا ملا کر مجموعہ سے ایک نئی کیفیت بنانا) حافظہ ہی میں تیار ہوتا ہے۔اس نئی کیفیت کے خاکہ کو حافظہ عقل کے سامنے لاتا ہے۔تو انسانی دماغ ایک ایجاد کا موجد بن جاتا ہے۔عقل اس خاکہ کو ظاہری صورت میں لانے کیلئے۔حکم دیتا ہے۔تو انسانی اعضاء اسی خاکہ کے مطابق عمل کر کے ایک شے تیار کرتے ہیں۔یہی شے ایجاد ہوتی ہے۔یا کسی عالم کی تقریر۔گویا عالم میں یہ قوت ہوتی ہے۔کہ وہ حافظہ پر زور دیتا ہے۔تو اپنے موضوع (تقریر) کے اپنے جمع شدہ علم سے الفاظ لے کر عقل کے سامنے کرتا ہے۔عقل یہی الفاظ زبان تک پہنچاتا ہے۔یہی ایک مقرر کی تقریر ہوتی ہے۔اسی طرح ہر طبقہ کے عالم سے عمل ہوتا ہے۔اور اگر حافظہ وقت پر اپنے جمع شدہ خزانہ سے مطلوبہ واقعات فراہم نہ کر سکے۔تو اُسے نسیان

(بھول۔یا حافظہ کی کمزوری) سے تعبیر دیا جاتا ہے۔گویا تمام ترعلمی قابلیت اور انسانی عروج کا حامل یہی حافظہ ہوتا ہے۔

(۵) عقل:۔ عقل انسانی وجود میں ایک حکمران کا درجہ رکھتا ہے۔کیونکہ علم کی تکمیل عقل ہی کرتا ہے۔یعنی حواسِ خمسہ سے حاصل کردہ علم پر عقل کے آگاہ ہونے سے ہی انسانی آگاہی کی تکمیل ہوتی ہے۔اگر عقل معطل ہو جائے تو باوجود حواس خمسہ اور واہمہ و حافظہ کے علم حاصل کرنے کے بھی انسان علم سے آگاہ نہیں ہوسکتا۔دوسرے یہ کہ یہی ہر علم کو عمل میں لانے کیلئے اعضاء کو حرکت کا حکم دیتا ہے۔حرکت کیلئے اس کا تعلق براہِ راست حصہ حرکت (متصرفہ) سے ہوتا ہے۔عقل چلنے کے لیے حصہ حرکت کو حکم دیتا ہے تو حصہ حرکت میں پھیلاؤ تناؤ کا عمل شروع ہوتا ہے۔جس سے رگوں پٹھوں میں بھی پھیلاؤ اور تناؤ کا اثر پہنچتا ہے۔اور رگوں اور پٹھوں کے پھیلاؤ اور تناؤ سے ہی اعضاء حرکت میں آجاتے ہیں۔اگر عقل حصہ حرکت پر دباؤ نہ ڈالے تو انسانی وجود حرکت وعمل سے محروم رہتا ہے۔یہی کیفیت عقل کو حکمران کا درجہ دیتی ہے۔

عقل کی مثال مانند بادشاہ کے ہے۔ایک طرف وہ تمام جسمانی حکومت پر قابض ہوتا ہے ۔دوسری طرف اپنی ہر ضرورت کے لئے نائی۔دھوبی۔موچی۔بھنگی کا محتاج بھی ہوتا ہے۔یہی کیفیت عقل (حسِ مشترک) کی ہے۔کہ ایک طرف ہر عضو اسی کے حکم کے تابع حرکت کرتا ہے۔لیکن دوسری طرف وہ اپنی آگاہی و علم کیلئے حواسِ خمسہ کا محتاج رہتا ہے۔اگر حواسِ خمسہ علم نہ پہنچائیں تو عقل بیکار رہ جاتا ہے۔یعنی اگر آنکھ نہ دیکھے تو عقل کسی شے کی ماہیت سے آگاہی کی تکمیل میں ناکام رہتا ہے۔اگر کان۔لامسہ۔ذائقہ اپنی ترسیل بند کردیں۔تو عقل کچھ بھی حاصل نہ کر سکے گا۔اور اگر حافظہ ہی اپنی یاداشت کھوڈالے تو عقل پھر بھی کسی شے کا علم حاصل نہ کر سکے گا۔اکثر دیکھا گیا ہے۔کہ ایک شخص ایک چیز کی تلاش میں اِدھر اُدھر مارا مارا پھرتا اور چیز ڈھونڈتا ہے۔لیکن چیز نہیں مل رہی۔حالانکہ وہ چیز اس کے سامنے ہوتی ہے۔مثال کے طور پر ایک شخص پیاس کی شدت میں پانی پینے کا گلاس ڈھونڈتا ہے۔وہ اضطراب میں گلاس کو نہیں پاتا۔حالانکہ گلاس اس کے قریب ہی ہوتا ہے۔آخر جب اضطراب

میں کمی ہو جاتی ہے۔تو لاحول پڑھنے لگتا ہے۔''اُفوہ! دماغ خراب ہو گیا۔گلاس سامنے پڑا ہوا ہے۔ میں کہاں تلاش کرتا رہا!'' اسکی وجہ یہ ہوتی ہے۔کہ پیاس کی شدت میں ہمارا ارادہ پانی کی خواہش کرتا ہے۔تو حافظہ سے پانی اور اسکی طلب کے آثار ابھر کر عقل کے سامنے آتے ہیں۔لیکن انسان گلاس کی تلاش میں ہوتا ہے۔آنکھیں گلاس کا عکس حافظہ تک پہنچاتی ہیں۔لیکن حافظہ اپنی ہی ترسیل ''آب وطلب'' پیش کرتا ہے۔نتیجہ یہ ہوتا ہے۔کہ عقل گلاس کا عکس حاصل ہی نہیں کرتا کہ گلاس محسوس کرے۔ نہ ہی حافظہ کی طلبِ آب کا عکس عقل سے ہٹتا ہے۔تو انسان اضطراب میں مفقود الحواس ہو جاتا ہے۔ جب اضطراب میں کمی ہو جاتی ہے۔تو طلب رک جاتی ہے۔حافظہ سے طلبِ آب کا عکس اٹھ جاتا ہے ۔تو آنکھ کا بھیجا ہوا عکس سامنے آ جاتا ہے۔تو یکلخت گلاس پر نظر پڑتی ہے۔حقیقتاً اب گلاس پر نظر نہیں پڑتی بلکہ بار بار پڑتی ہے۔صرف حافظہ کے سامنے واہمہ کے ذریعہ لایا ہوا گلاس عقل کے آگے آتا ہے تو حافظہ کے گلاس اور عقل کا رابطہ مل جانے سے گلاس کا پایا جانا محسوس کیا جاتا ہے۔دوسری محتاجی عقل کی یہ ہے کہ جو کچھ حواس یا واہمہ و حافظہ اسے بتائے یہ بھی اسی پر اصل ونقل کی تمیز کئے بغیر جی ہاں! کہہ کر قبول کر لیتا ہے۔تیسری کیفیت عقل کی یہ ہے۔کہ جو کچھ حافظہ اپنے خزانے سے عقل کے سامنے کرے۔عقل کا رجوع اسی کیفیت کی طرف ہوتا ہے۔یعنی انسانی آگاہی میں وہی کچھ آ سکتا ہے۔جو کچھ حافظہ کے درِ عقل کے سامنے آئے۔مثال کے طور۔ایک شخص لمبی سڑک پر جا رہا ہے۔سفر کی ابتداء پر وہ کچھ سوچ رہا تھا۔اثنا راہ حافظہ پر کسی معاملہ کے متعلق واقعات ابھر رہے تھے جو عقل کے سامنے آتے رہے۔لہٰذا عقل انہیں واقعات کے مطالعہ میں مصروف تھا۔یہ شخص اس سڑک پر اپنا سفر جاری رکھے ہوئے ہے۔راہ میں کسی شخص سے سلام کلام بھی ہوا۔ایک جگہ سڑک کے کنارے ایک گدھا بھی حادثہ سے مرا ہوا پڑا ہے۔یہ کیفیت بھی نظروں میں آ گئی۔لیکن یہ شخص اپنے ہی خیالات میں غرق ہے یعنی حافظہ اپنے واقعات عقل کے سامنے لاتا جا رہا ہے۔آخر سڑک پر ایک شخص واقف ملتا ہے۔اور وہ اس شخص سے تپاک سے ملتا ہے۔یہاں حافظہ کے واقعات کا سلسلہ ٹوٹ کر واقف شخص کی شکل اور بات چیت کا سلسلہ حافظہ تک پہنچتا ہے اور یہی کیفیتیں عقل کے سامنے آنے لگتی ہیں۔تو وہ

شخص مسافر شخص سے پوچھتا ہے۔ کہ ابھی فلاں شخص اس راہ سے گیا تھا۔ کیا راستے میں تم سے ملا۔ یا کوئی پوچھے کہ فلاں جگہ موٹر کی زد میں میرا گدھا مارا گیا۔ تو وہ شخص باوجود دیکھنے کے بھی راستہ کی ان کیفیتوں سے بے خبری ظاہر کرے گا۔ یا اسے بھولے ہوئے خواب کی مانند ان واقعات کے مٹے ہوئے نقوش یاد ہوں گے۔ لیکن وہ ضرور یہی کہے گا۔ کہ مجھے معلوم نہیں۔ یا یہ کہے گا کہ میں نے خیال نہیں کیا۔ اس کا مطلب یہ ہے۔ کہ یہ واقعات حافظہ تک پہنچے لیکن حافظہ اپنے ہی جمع شدہ واقعات عقل کے سامنے پیش کرتا رہا۔ اسلئے راستہ کے واقعات عقل تک نہ پہنچنے کی وجہ سے انسان ان واقعات وکیفیات سے پورے طور آ گاہی حاصل نہ کر سکا۔

اس سے ثابت ہوتا ہے۔ کہ حواسِ خمسہ علم حاصل کرنے میں ایک آلہ کا کام دیتے ہیں۔ کہ کیفیات کو دماغ تک پہنچاتے ہیں۔ ان میں کسی شے کی ماہیت پہچاننے کی خاصیت نہیں۔ بلکہ واہمہ حافظہ ہی اس شے کی ہیئت پہچانتے ہیں۔ لیکن یہ بھی صرف پہچان ہی کرتے ہیں۔ انکی پہچان پر بھی کیفیت آ گاہی میں نہیں آتی بلکہ عقل تک پہنچنے پر ہی ایک ہیئت آ گاہی میں آ جاتی ہے۔ ایک ہیئت تب ہی علم کے درجہ میں پہنچتی ہے جب یہ ہئیت عقل کے سامنے آ کر حافظہ کے خزانے میں جمع ہو جائے۔ یہی وجہ ہے کہ علم الاخلاق کی رو سے ''کسی شے کی اصلی ماہیت ذہن تک پہنچنے'' کو علم کہا جاتا ہے۔ اور یہ کیفیت درحقیقت ایک مکمل صحت مند انسان کی ہوتی ہے۔ کہ وہ ان لطیف قوتوں سے اشیاء کی اصلی ماہیت سے صحیح طور علم حاصل کرتا ہے لیکن انسان ہمیشہ صحت مند نہیں رہ سکتا۔ اس میں شک نہیں کہ پیدائشی طور انسان اکثر صحت مند وجود حاصل کئے ہوتا ہے۔ لیکن کچھ پیدائشی کمزوری بھی انسان میں ہوتی ہے۔ اور کچھ اسکی صحت ماحول سے بھی کمزور ہو جاتی ہے۔ اور اپنے ارادہ واختیار پر قدرت حاصل ہونے کے بعد (یعنی بالغ ہونے کے بعد) انسان اپنی خواہش کے پورا کرنے میں کبھی حد سے تجاوز کر جاتا ہے۔ اسطرح اکثر غیر فطری اقدام بھی اس سے سرزد ہوتے ہیں جس وجہ سے انسان بیمار ہو کر اسکے اعضاء میں کمزوری پیدا ہوتی ہے۔ بعض کمزوریاں ایسی ہوتی ہیں جس سے اسکے خصوصی اعضاء خاصتاً لطیف اعصاب پر بھی اثر پڑتا ہے۔ اور اسکے حواس خمسہ اور دماغ پر بھی اسکا اثر پڑ

جاتا ہے۔ایسی حالت میں حواس اور ذہن کے حصولِ علم میں فرق آجاتا ہے۔اور علم کی اصل ماہیت ذہن تک نہیں پہنچتی۔مثلاً جب آنکھوں میں کمزوری آجاتی ہے۔تو اسے نظر کی کمزوری کہا جاتا ہے۔ ایسی حالت میں رات کے وقت ایک شخص کی دور مقام پر ایک سفید ستون پر نظر پڑتی ہے۔تو یہ عکس آنکھوں سے ہوتا ہوا حصۂ بصارت پر آجاتا ہے۔وہاں سے یہ عکس واہمہ پر آجاتا ہے۔تو واہمہ بجائے سفید ستون کے اس کیفیت کو سفید لباس میں ملبوس ایک آدمی کی ہیئت کا نام دے دیتا ہے۔یہاں آنکھ کے ساتھ واہمہ (دماغ) میں بھی کمزوری آجاتی ہے۔واہمہ سے یہ عکس حافظہ پر آجاتا ہے۔اگر حافظہ صحت مند ہو اور اس کی تمام کیفیتیں ترتیب میں جمع (Set) ہوں تو یہ سفید آدمی کی ہیئت سے (جو کہ پیشتر حافظہ میں جمع ہوتی ہے) مشابہت دیتا ہے۔تو وہ خود اس میں فرق پیدا کر کے اس خبر کی تردید کرتا ہے۔یہ دونوں مختلف عکس جب عقل کے سامنے آجاتے ہیں۔تو وہ خود بھی آگاہی میں حافظہ کی تردید کی وجہ سے فیصلہ نہیں کر سکتا کہ آیا یہ سفید انسان ہے یا کیا ہے۔تو وہ واپس آنکھوں کو دوبارہ (حصۂ حرکت کے ذریعہ) دیکھنے کے لیے حکم کرتا ہے۔تو آنکھیں اصلی ہئیت کو پانے کیلئے اپنے Lens (پتلیوں) میں کھچاؤ ڈال کر ہیئت کا احاطہ کرنے کی کوشش کرتی ہیں۔اگر آنکھوں نے صحیح شکل (ستون) کی ہیئت حاصل کر لی تو پھر یہ عکس واہمہ تک پہنچتا ہے۔تو واہمہ اسی ہئیت کو اب ستون کی اصلی ہیئت میں پا کر حافظہ تک پہنچاتا ہے۔تو حافظہ ستون سفید سے مشابہت دے کر تائید کر کے عقل کو دے دیتا ہے تو عقل بھی آگاہ ہوتا ہے۔اگر اس حالت میں واہمہ کے ساتھ حافظہ بھی کمزور ہو تو وہ واہمہ کی اطلاع کو صحیح مشابہت نہیں دے سکتا۔اور وہ بھی سفید آدمی ہی سمجھتا ہے۔تو یہی کیفیت عقل کے سامنے آجاتی ہے۔تو عقل بھی بغیر تمیز کئے سفید آدمی ہی قبول کر لیتا ہے۔اسے واہمہ کی ابتدائی غلط اطلاع پر ''وہم'' سے تعبیر کیا جاتا ہے۔اسکا مطلب یہ ہے۔کہ در اصل صحت مند واہمہ ماہیت کی اصلی کیفیت کا نام ورنگ دینے کا ایک اہم دماغی حصہ ہے جس پر علم کی اصلیت کا دار و مدار ہے۔اور اسکی کمزوری پر غلط اطلاع کی بنا پر ہی اسکے عمل کو ''وہم'' سے تعبیر دیا جاتا ہے۔

اسی طرح حافظہ کا کام ہے۔کہ وہ واقعات کو جو حواس خمسہ کے ذریعے حاصل کئے گئے

ہیں عقل کے سامنے لاکر علم کی آ گاہی کی تکمیل کرے۔ اور پھر ہر واقعہ کو اپنے خزانہ میں ترتیب دے کر جمع رکھے اور جس وقت جس واقعہ کو یاد کرنے کی ضرورت ہو اسی واقعہ کو عقل کے سامنے فوراً لا سکے۔ یہی ایک صحت مند حافظہ کا عمل ہے۔ اگر اس میں کمزوری واقع ہو جائے تو اسکا نظام ترتیب منتشر ہو جاتا ہے۔ یہ واقعات پر قابو نہیں رکھ سکتا۔ اکثر واقعات محو ہو جاتے ہیں اور باقی بے قابو ہو کر بے ترتیب ہو جاتے ہیں۔ ایسی حالت میں اکثر واہمہ کی خبر کی تصدیق کیلئے ہم شکل کیفیت سے مشابہت دینے کی بجائے ملتی جلتی کیفیت سے ہی مشابہت دے کر واہمہ کی غلط ترسیل کی تائید کر کے عقل کو آ گاہ کرتا ہے۔ اور بعض اوقات ایک گزشتہ کیفیت کو یاد کرنے کیلئے وہ کیفیت عقل کے سامنے نہیں لا سکتا تو ایسی حالت کو حافظہ کی کمزوری یا نسیان سے تعبیر کیا جاتا ہے۔

اسی طرح عقل پر بھی اثر آ جاتا ہے۔ کہ اس کا کام حافظہ کی طرف رجوع ہونا۔ یا اطلاع کی آ گاہی میں مصروف ہونا ہوتا ہے۔ یہ حکمران ہونے کی حیثیت سے ایک طرف حکم دینے اور جسم کے نظام حرکت و عمل پر قابو رکھنے کے لئے تیار رہتا ہے۔ دوسری طرف حافظہ سے خبریں حاصل کرتا ہے۔ اسکی کمزوری پر یہ اکثر حافظہ کی طرف ہی رجوع ہو کر واقعات میں محو ہو جاتا ہے۔ یہ حواس خمسہ سے آمدہ اطلاعات حافظہ کے ذریعہ نہیں لیتا بلکہ ایک ہی کیفیت کی طرف رجوع رکھتا ہے۔ تو انسان گردو پیش سے بے خبر ہو جاتا ہے۔ اسطرح عقل حکم دینے میں کوتاہی کر جاتا ہے۔ ایسی حالت کو کھو جانا یا خیالات میں غرق ہو جانا کہتے ہیں۔ دراصل یہ قسمیں دماغ کی کمزوری کے باعث ہی ہوتی ہیں۔ لیکن صحت مند انسان ان قویٰ سے صحیح علم حاصل کرتا ہے۔ اسکے علاوہ ہم دیکھتے ہیں کہ انسان بعض اوقات کسی دقیق مسئلہ پر سوچتا یا فکر کرتا ہے۔ تو یہ کام بھی دماغ کا ہی ہے۔

اس فکر کی اساس ان واقعات پر ہوتی ہے۔ جو حواس خمسہ کے ذریعہ حافظہ میں جمع ہو چکے ہوں اگر کسی مسئلہ سے متعلق واقعات حافظہ میں پہلے سے جمع نہ ہوں تو اس مسئلہ کی تحقیق عقلی فکر کے ذریعہ ناممکن ہوگی۔۔۔ یعنی جب انسان کسی معاملہ کے متعلق سوچنا شروع کرتا ہے۔ تو اسکا مطلب یہ

ہے۔ کہ انسان اپنے جمع شدہ علمی مواد میں سے وہ اجزا تلاش کرتا ہے۔ جن مفرد اجزاء سے مل کر ایک نئی کیفیت کا مرکب وجود میں آئے۔ یہی مرکب اس مسئلہ کا حل ہوتا ہے۔ اسکی ترکیب یوں ہوتی ہے۔ کہ انسان حافظہ پر زور دیکر مسئلہ سے متعلق اجزاء یکجا کر کے عقل کے سامنے لانا شروع کرتا ہے۔ عقل ان اجزا کی کیفیت محسوس کرتا جاتا ہے۔ بالآخر ان اجزا کی ایک مکمل کیفیت عقل کے سامنے پیش ہو جاتی ہے۔ یہاں یہ سمجھنا ضروری ہے۔ کہ اگر حافظہ مختلف اجزاء کو ترتیب دے کر ایک مکمل کیفیت تیار کرے۔ اور عقل اس کیفیت سے آگاہ نہ ہو۔ تو یہ حل شدہ کیفیت علم کے احاطہ میں نہیں آئے گی۔ نہ انسان اس کیفیت سے باخبر ہو سکتا ہے۔ نہ ہی اس پر عمل کیا جا سکتا ہے۔ تو اسکا مطلب یہ ہوگا۔ کہ اگرچہ حافظہ اپنے جمع شدہ خزانے میں ایک مسئلہ کا حل مکمل بھی کر لے۔ جب تک عقل اس سے آگاہ نہ ہو تو فکر کی تکمیل نہیں ہوتی۔ اسکے ساتھ ہی یہ امر بھی قابلِ غور ہے۔ کہ اگر حافظہ اپنے جمع شدہ خزانے سے ایک مسئلہ کے اجزا کو ترتیب دیکر ایک مکمل کیفیت تیار نہ کرے تو حافظہ مسئلہ کی تکمیل کیلئے کوئی مواد خود فراہم نہیں کر سکتا۔ اس سے معلوم ہوتا ہے۔ کہ انسانی فکر میں کسی معاملہ کے طے کرنے میں اول اول حافظہ ہی کام کرتا ہے۔ اور عقل صرف آگاہ ہوتا ہے۔ گویا سوچنے کا کام حافظہ کا ہے عقل کا نہیں۔ عقل کا کام فکر کئے ہوئے مواد سے آگاہ ہونا ہے ــــ بالالفاظ دیگر فکر کیلئے حافظہ اپنے علمی مواد سے ایک کیفیت کو ترتیب دیتا ہے۔ بظاہر تو فکر کی تکمیل ہو جاتی ہے۔ لیکن یہ تکمیل انسانی علم وعمل میں تب ہی آسکتی ہے جب عقل اس ترتیب سے آگاہ ہو ــــ اس فکر کا تعلق ''حواس خمسہ کی امداد'' ــــ جن سے واقعات کا علم حاصل کیا جاتا ہے۔ اور ''حافظہ کی صحت''، جس میں یہ واقعات جمع ہوتے ہیں۔ اگر حواسِ خمسہ اور حافظہ علم مہیا نہ کریں۔ تو انسان فکر کرنے میں کوئی مستقل نتیجہ پیدا نہیں کر سکتا کیونکہ وہ ایک مسئلہ کیلئے اسکے اجزا کو حافظہ میں بغیر بیرونی امداد حواس کے فراہم نہیں کر سکتا جس پر فکر کی اساس ہوتی ہے۔ اگر کسی مسئلہ کیلئے علمی مواد حواس خمسہ اور حافظہ مہیا نہ کریں تو ایسے مسئلہ کو سوچنے کیلئے ایک ایسا ذریعہ ہونا چاہئے۔ جس ذریعہ سے بغیر حواسِ خمسہ کی امداد کے واقعات حاصل ہوں ــــ واقعات تو موجود ہوتے ہیں۔ لیکن حواسِ خمسہ کے احاطہ میں نہیں آتے اسلئے حافظہ میں جمع نہیں ہوتے۔ مثال

کے طور ایک بچہ چار اجزاء سے ایک کھلونا بنانا چاہتا ہے۔ اسکے چار اجزاء بانس کی باریک تیلیاں۔ کاغذ۔ لئی۔ دھاگا ہوتے ہیں۔ اگر بچے نے حواسِ خمسہ کے ذریعہ یہ چاروں اجزاء دیکھ لئے ہوں۔ تو یہ اجزاء حافظہ میں جمع ہونگے۔ تو یہ آسانی سے انکی ترتیب دیکر کھلونا بنا سکتا ہے۔ اگر یہ اجزا یا ان میں سے کوئی جز حواس خمسہ کے ذریعہ حافظہ میں نہ آچکے ہوں تو وہ اس جز سے بے خبر ہوگا۔ اور وہ جز اسکے ذہن میں نہ آسکے گی لہذا وہ اپنی فکر میں کھلونے کی تکمیل سے عاجز ہوگا۔ اسی طرح ہر انسان جسکی دماغی قوت مکمل ہو چکی ہو۔ ہر اُس مسئلہ کی تکمیل میں عاجز ہوگا جسکے اجزا حواسِ خمسہ اور حافظہ فراہم نہ کرسکیں۔ سوائے اس ذریعہ کے جو ذریعہ [1] ماسوائے حواسِ خمسہ کے اسے حاصل ہو۔

الغرض اس فکر میں خصوصی عمل حافظہ کا ہوتا ہے۔ عقل اس عمل سے صرف آگاہ ہوتا ہے۔ خود سوچتا نہیں۔ یہ تمام کیفیتیں عالمِ بیداری میں ہوتی ہیں۔ عالم بیداری سے مراد یہ ہے۔ کہ عقل حکمران کا درجہ رکھتا ہے۔ انسانی حرکت نفع ونقصان میں بچاؤ کا حکم ہر شے کے حصول میں تمام اعضاء کی حرکت کا حکم اسی کے ذریعہ ہوتا ہے۔ اور اس ذریعہ کی تحریک بھی حافظہ کے علم سے ہی پیدا ہوتی ہے۔ اسلئے جب تک انسان برسرِ عمل رہتا ہے۔ یہ ہر لحہ وجود کے ہر ذرہ کو حرکت کیلئے حکم اور ہر ذرہ کی نگرانی کا کام کرتا ہے۔ یہاں تک کہ زیادہ وقت چوکنا رہنے سے اس پر تھکاوٹ کے آثار آجاتے ہیں اور تھکاوٹ کا یہ اثر اس پر آجاتا ہے کہ اسکی گرفت حصہ حرکت (متصرفہ) سے ڈھیلی ہو جاتی ہے اور اس کا ذاتی عمل ساکن ہو جاتا ہے گویا بے خود ہو کر سو جاتا ہے۔ اسکے بے خود ہونے سے حصۂ حرکت (متصرفہ) سے جو حرکت اعضاء میں پیدا ہوتی ہے ڈھیلی پڑ جاتی ہے۔ تو آدمی تمام کا تمام استخوان ڈھیلے چھوڑ نیند کی حالت میں ہو جاتا ہے۔ دراصل نیند سے اسکے وجودی عمل (نشوو ارتقا) میں کچھ فرق یا رکاوٹ نہیں پڑتی۔ صرف عقل کی تھکاوٹ سے وہ کام کرنے سے رہ جاتا ہے۔ اسکی تھکاوٹ سے حصہ حرکت (متصرفہ) پر گرفت ڈھیلی ہو جاتی ہے۔ تو انسانی حرکت بند ہو جاتی ہے۔

---

[1] اس ذریعہ کی تشریح آگے بیان کی جائیگی۔ یہاں اس پر بحث قبل از وقت ہوگی۔

اس کے ساتھ ہی چونکہ آ گاہی کا تعلق عقل سے ہی ہوتا ہے اسکے معطل ہونے سے آ گاہی کا سلسلہ بند ہو جاتا ہے۔

لیکن اس حالت میں انسانی زندگی۔ حواس خمسہ۔ حصہٗ بصارت۔ متصرفہ۔ واہمہ۔ حافظہ کا عمل بدستور جاری رہتا ہے۔ یعنی معدہ غذا تحلیل کرنے کا کام جاری رکھتا ہے۔ دل۔ پھیپھڑے۔ جگر۔ گردہ۔ دورانِ خون اور خون و مادہ منویہ سے وجود کا بننا۔ جاری رہتا ہے۔ حواس بھی اپنا عمل پورا کرتے ہیں۔ یعنی کان میں ایک آواز برابر جا کر واہمہ حافظہ تک جا پہنچتی ہے۔ حافظہ اسے عقل تک پہنچاتا ہے۔ لیکن عقل کے معطل ہونے کی وجہ سے آواز انسانی آ گاہی میں نہیں آتی اور انسان آواز سے بے خبر ہوتا ہے۔ البتہ وہ قویٰ جو حصہٗ حرکت (متصرفہ) کی قید میں ہیں یعنی جو قویٰ حصہٗ حرکت کے پھیلاؤ اور تناؤ کے ذریعہ ہی عمل کرتے ہیں وہ عمل کرنے سے رہ جاتے ہیں جیسے آنکھ کی پلکوں کا کھلنا بند ہونا۔ ہاتھ پاؤں کا حرکت کرنا۔ آنکھ کی پتلی کام کر سکتی ہے۔ لیکن آنکھ کی پلکیں اور پتلی کا کسی شے کا عکس لینے کیلئے گھٹنا بڑھنا نہیں ہو سکتا۔ اسلئے آنکھ بیرونی اشیاء کو نہیں دیکھ سکتی اور ہاتھ پاؤں حرکت سے بند ہو جاتے ہیں۔ مگر کان کا سننا۔ ذائقہ۔ سونگھنا۔ مس کرنا برابر جاری رہتا ہے کیونکہ حواسِ خمسہ میں کیفیات کے اثرات قبول کرنے کے لئے آنکھ۔ کان۔ ناک۔ زبان۔ مس میں ایسی طاقتیں کام کرتی ہیں۔ جنکا تعلق لطیف خونی ذرات سے ہے۔ خون چونکہ ہر لمحہ دورہ کرتا رہتا ہے۔ اسلئے اس طاقت کے ذریعہ حاصل کردہ اثرات برابر دماغ تک پہنچ جاتے ہیں۔ مثلاً آواز ____ کان کے اندر ایک لطیف پردہ ہے۔ یہ جھلی لطیف اعصاب کا مجموعہ ہے آواز میں چونکہ ایثری لہر ہوتی ہے۔ یہ لہر براہ راست کان کی جھلی سے ٹکراتی ہے۔ جس سے جھلی اثر قبول کرتی ہے۔ یعنی یہ ضرب جھلی کے لطیف اعصاب سے ٹکراتی ہے۔ اور ان اعصاب میں جذب ہو کر خون کے ذرات سے مل کر دماغ کی طرف جا کر حصہ حرکت سے گذر کر واہمہ میں داخل ہوتی ہے۔ واہمہ سے گزر کر حافظہ میں داخل ہوتی ہے۔ حافظہ سے گزر کر عقل میں داخل ہوتی ہے۔ لیکن عقل چونکہ معطل ہے اسلئے کان کی آواز برابر عقل تک پہنچتی ہے۔ مگر عقل کے برسرِ عمل نہ ہونے کی وجہ سے انسان نیند میں آواز سے

بے خبر رہتا ہے۔

اسی طرح قوتِ لامسہ کا عمل ہے۔ کہ انسان نیند میں سردی محسوس کرتا ہے۔ سردی محسوس کرنے کا عمل بھی اسی طرح ہے۔ کہ انسان کے اعصاب اسکے تمام جسم میں پھیلے ہوئے ہیں۔ جب تک سردی کا اثر قوتِ لامسہ سے عقل تک نہ پہنچے سردی محسوس نہیں کی جاسکتی۔ لیکن انسان نیند میں سردی سے متاثر ہوکر جاگ جاتا ہے اسکا مطلب یہ ہے کہ قوت لامسہ سردی کے اثر کو عقل تک پہنچاتی ہے۔ یعنی جسم کے لطیف اعصاب میں بھی ایثری قوت پائی جاتی ہے۔ جو سردی کے اثر کو ہر حال میں قبول کرتی ہے۔ سردی کا اثر اعصاب اور خون کی ایثری قوت میں جذب ہوکر دماغ تک پہنچتا ہے۔ چونکہ ان کیفیات کا اثر حواسِ خمسہ کی لطیف قوت پر براہِ راست پڑتا ہے۔ جسکا تعلق دورانِ خون سے ہے۔ اسلئے عقل اور متصرفہ کے معطل ہونے سے اس عمل پر کوئی اثر نہیں پڑتا اور یہ عمل برابر جاری رہتا ہے۔ لیکن چونکہ عقل نیند میں معطل رہتا ہے۔ اسلئے انسان حواس خمسہ کی اطلاعات سے بے خبر رہتا ہے۔ حصہ حرکت کی گرفت ڈھیلی ہونے سے انکے عمل میں فرق نہیں آتا۔ اس سے ثابت ہوتا ہے۔ کہ انسان جاگتی حالت میں ہی علم سے آگاہ ہوسکتا ہے۔ اور سوتی حالت میں علم سے آگاہی نہیں ہو سکتی۔ یا یوں سمجھئے کہ عقل کے جاگنے کے بغیر انسان علم حاصل نہیں کرسکتا۔

لیکن۔ دیکھا گیا ہے۔ کہ انسان نیند کی حالت میں بھی واقعات دیکھتا سنتا ہے۔ اور آگاہ ہوتا ہے یعنی نیند کی کیفیت عقل کے سونے (معطل ہونے) سے پیدا ہوتی ہے۔ گویا نیند کی حالت میں عقل سے آگاہی کا فعل نہیں ہوتا۔ ایسی صورت میں جب عقل معطل ہو انسان کسی خبر سے آگاہ نہیں ہوسکتا۔ تو یہ ایک ایسی کیفیت ہوتی ہے۔ جس میں عقل کا دخل نہیں ہوتا ہے یہ ایک فطری قانون ہی ہے کہ انسان بغیر عقل کے علم حاصل نہیں کرسکتا۔ تو پھر نیند کی حالت میں بھی واقعات کو محسوس کرنا۔ اس امر کی دلیل ہے۔ کہ اگر انسان نیند کی حالت میں جاگتی حالت کی مانند آگاہ ہو۔ تو سوائے عقل کے کوئی اور قوت بھی اس میں کام کرتی ہے جو عقل کی جگہ آگاہی کا کام کرتی ہے۔ ہاں یہ امر طے شدہ ہے۔ کہ انسان میں بغیر ان قوائے لطیف (حواس خمسہ) کے اور کوئی ایسی قوت موجود نہیں جو علم حاصل

کرنے کا عمل کرتی ہو یعنی حواسِ خمسہ کے بغیر اور کوئی حس نہیں جو حواسِ خمسہ سے ماسوئی علم حاصل کر کے ذہن تک پہنچائے۔تو پھر یہ علم بھی انہی قویٰ سے حاصل ہوتا ہے۔اسکے لئے پھر انسان کے قوائے لطیف کا تجزیہ کیا جاتا ہے۔کہ حواس کے ذریعہ جو اطلاعات ذہن تک پہنچتی ہیں۔ان میں واہمہ۔حافظہ ہی اطلاع پہنچانے کے کام کی تکمیل کرتے ہیں اور آگاہی کا کام عقل ہی کرتا ہے۔اسکا مطلب یہ ہے کہ حافظہ تک نیند کی حالت میں بھی یکساں عمل ہوتا ہے۔کیونکہ یہ سب قویٰ آگاہی کا کام نہیں کرتے۔حافظہ نیند کی حالت میں بھی عقل کو ہی عکس دیتا ہے۔تو پھر نیند کی حالت میں خود عقل ہی آگاہ ہوسکتا ہے۔اس سے یہ معلوم ہوتا ہے۔کہ عقل تمام کا تمام معطل نہیں ہوتا بلکہ ایک حصہ معطل ہو جاتا ہے۔جسکا تعلق ظاہری اشیاء کی کیفیات سے ہے۔جو حواس کے احاطہ میں آتی ہیں۔اور جس سے حرکت کا عمل جاری رہتا ہے۔اسے عقل کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے۔اور دوسرا حصہ جو حواس خمسہ کی مدد کے بغیر غیر جسمانی کیفیات کی آگاہی حاصل کرتا ہے۔''شعور'' کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے۔دماغ کی اس کیفیت سے معلوم ہوتا ہے۔کہ جو حصہ عقل میں ظاہری حواسِ خمسہ کے ذریعہ کیفیات سے آگاہ ہوتا ہے۔وہ سالم عقل نہیں بلکہ عقل کا ایک حصہ ہے اور عقل کے ساتھ ایک اور عضو ہے جسے شعور کہا جاتا ہے۔اور عقل کے خفتہ ہونے کے ساتھ شعور پر نیند غالب نہیں۔بلکہ شعور کے ذریعے عقل کا کام۔اطلاع حاصل کرنا ہے۔لہذا عقل کی خفتگی پر نیند میں۔حسِ مشترک (عقل و شعور) کا یہ حصہ آگاہی کا عمل پورا کرتا ہے۔شعور نیند کی حالت میں غیر مادی کیفیات (جن کا ظاہری وجود نہیں ہوتا) کا ادراک کرتا ہے۔کیونکہ ٹھوس مادی اشیاء تو حواس خمسہ کے احاطہ میں آجاتی ہیں (اور غیر مادی کیفیات حواس کے احاطہ میں نہیں آتیں کیونکہ ان کا ٹھوس وجود نہیں ہوتا) اور حواس خمسہ کی یہ کیفیات تعقل کے بیدار ہونے پر ہی عقل کے ذریعہ حاصل ہوتی ہیں۔کیونکہ ہر وجود کی کیفیت میں آنکھ کا مشاہدہ ضروری ہوتا ہے۔آنکھ بھی نیند کی حالت میں کیفیات کو دیکھ نہیں سکتی۔اس لئے شعور جو کچھ نیند کی حالت میں دیکھتا (آگاہ ہوتا) ہے وہ آنکھ کے ذریعہ ٹھوس اشیاء کا نہیں بلکہ غیر مادی ہوتا ہے۔یہ کیفیات اگر ٹھوس نہیں اور حواسِ خمسہ کے ذریعہ نہیں حاصل ہوتی ہیں تو پھر انکا وجود کیوں نیند کی

حالت میں محسوس کیا جاتا ہے؟ اور نیند میں دیکھے ہوئے واقعات کیوں ظاہری واقعات کے مشابہ ہوتے ہیں؟ ان کیفیات کا مقام کہاں ہے؟۔ اوراس مقام کو کیسے (حواس خمسہ کی مانند) حاصل کیا جاتا ہے؟ یعنی خواب کی حالت میں ایک شخص باغات۔ مکانات۔ دریا۔ انسان۔ اور ہر قسم کے انسانی افعال کی کیفیات ہنسنا۔ رونا۔ مارنا۔ درد۔ خوشی۔ غم۔ خوف۔ دہشت۔ موت۔ زندگی۔ اوراپنے آپکو بھی محسوس کرتا ہے۔ تو یہ کیفیات کس نوعیت کی ہوتی ہیں۔ اگرانسان ان حالتوں میں بجائے خود نہیں ہوتا ہے وغیرہ؟ اسکے لئے ہمیں اپنے وجود کے ظاہری خواص کا ہی مطالعہ کرنا ہے۔

وہ خواب ہو یا بیداری انسان کے حواس خمسہ دونوں حالتوں میں بیرونی اطلاعات پہنچانے کا کام جاری رکھتے ہیں۔ اور یہ سب واقعات حافظہ میں جمع ہوتے ہیں۔ سوائے آنکھ کے کیونکہ آنکھ کی پتلی پر پلکیں بند ہونے سے بیرونی عکس نہیں آتا۔ اور باقی حواس سامعہ۔ شامہ۔ لامسہ۔ ذائقہ۔ اپنا فعل جاری رکھتے ہیں۔ جیسے ایک آواز کان میں داخل ہوکر جاگتی حالت کی مانند ذہن تک پہنچتی ہے۔ حافظہ عقل کے سامنے کیفیت کرتا ہے۔ مگر عقل خفتگی کے باعث خبر نہیں پاتی۔ اسی طرح مس کی قوت کسی جگہ چھونے کی کیفیت ذہن تک پہنچاتی ہے۔ مگر عقل کیفیت نہیں پاتی۔ اسی طرح شامہ۔ ذائقہ کا بھی حال ہوتا ہے۔ البتہ جاگتی حالت میں عقل کے بیدار ہونے اور آنکھ کے دیکھنے سے ذہن اور حواس خود بخود واقعات پالیتے ہیں۔ تو واہمہ۔ حافظہ اور عقل واقعات حاصل کرنے میں مصروف رہتے ہیں۔ لیکن نیند کی حالت میں آنکھ کے بند ہونے اور عقل کے معطل ہونے پر۔ اگر بیرون سے واقعات نہ آئیں تو حافظہ پھر بھی بیکار نہیں رہتا۔ یہ اپنے جمع شدہ واقعات کو تعقل کے سامنے دہراتا ہے۔ یہی کیفیت جاگتی حالت میں بھی رہتی ہے۔ اسکا مطلب یہ ہے۔ کہ انسانی ذہن جاگتی حالت میں فطری طور فارغ نہیں رہتا ہے۔ بلکہ حواسِ خمسہ سے واقعات کی ترسیل بند ہونے پر حافظہ اپنا فعل جاری رکھتا ہے۔ اور حافظہ کے جمع شدہ واقعات عقل کے سامنے آنے شروع ہوجاتے ہیں۔ ''اسے خیالات میں محو ہونا کہتے ہیں''۔ اس کیفیت کی کوئی ترکیب نہیں کہ حافظہ کیا کچھ پیش کرتا ہے۔ یہ چیز حافظہ کی صحت وکمزوری پر منحصر ہے۔ جس قسم کے رجحانات انسان میں پائے جائیں اسی قسم کے خیالات حافظہ پیش کرتا

ہے۔اور بعض اوقات طویل زمانہ گزشتہ کے واقعات بھی پیش آتے ہیں۔جیسے ایک تنہا جگہ پر جب کہ بیرونی اشیاء کا علم حاصل نہ ہوسکتا ہوتو آدمی اپنے ہی خیالات میں محو ہو جاتا ہے۔اسی طرح انسان جب ایک تنہا خاموش جگہ بیٹھ کر کسی معاملہ میں سوچنے لگ جاتا ہے۔تو یہ حافظہ کی جمع شدہ کیفیات کو تعقل کے سامنے کرنے کیلئے یکسوئی کرتا ہے۔یکسوئی سے مراد یہ ہوتی ہے۔کہ انسان حواس کے ذریعے بیرونی واقعات کو ذہن تک آنے سے روک دیتا ہے۔تاکہ کسی معاملہ کو سلجھانے۔یا ایک نئی ترتیب دینے کیلئے حافظہ کے جمع شدہ علم میں ترتیب دے کر مختلف کیفیات کو یکجا کر کے ایک نئی ہیئت دی جائے۔ایسی حالت میں انسان سوچ بچار کر کے ایک مسئلہ حل کر لیتا ہے۔یعنی حافظہ کے جمع شدہ واقعات سے چند اجزا املا کر اسکی ایک ہیئت قائم کرتا ہے۔ان تمام کیفیات کے نقوش انسان اپنے غیر جسمانی تخیل میں غیر جسمانی طور پر محسوس بھی کرتا ہے۔اسی طرح اگر انسان کسی معاملہ میں سوچنے کیلئے خاموشی اور تنہائی میں بیٹھ جائے اور اسکے قویٰ میں کچھ کمزوری ہو۔یعنی حافظہ میں واقعات ترتیب میں نہ ہوں اور حسب ضرورت واقعات تعقل کے سامنے نہ آسکیں تو انسان ایک کیفیت کی فکر میں کسی دوسری طرف بہک جاتا ہے اور یہ سلسلہ وسیع ہوتا جاتا ہے۔یہاں تک کہ انسان اصل معاملہ سے دور مختلف خیالات میں بہہ جاتا ہے۔مثال کے طور پر اگر ایک شخص لوہے کی ایک مشین کپڑا سینے کے لئے بنانے کا ارادہ کرتا ہے۔تو وہ اس بارے میں سوچتا ہے۔اسکے سوچنے سے مراد یہ ہوتی ہے۔کہ وہ حافظہ پر زور دے کر حافظہ کے جمع شدہ علم میں سے مختلف اجزا پیدا کر کے ایک مشین کی شکل قائم کرتا ہے۔اور اسی محفوظ خاکہ کو پھر عملی جامہ پہنا کر مشین ایجاد کرتا ہے۔اور کمزوری کی حالت میں یہ نوعیت ہو جاتی ہے۔کہ انسان مشین کے ایک پرزے کی ساخت کے لئے حافظہ سے مواد لینے کی کوشش کرتا ہے۔تو لوہے کی شکل آجاتی ہے۔پھر اسکی بناوٹ کا خیال آتا ہے تو پرزے ڈھالنے کی مشین سامنے آتی ہے۔مشین کا خیال آتے ہی انسان بہکنے لگتا ہے۔بجائے اسکے کہ وہ مشین کے پرزہ کی ساخت معلوم کرے وہ مشین ڈھالنے کی طرف متوجہ ہو جاتا ہے۔کہ یہ مشین جرمنی ہے یا ولائتی۔ولائتی کے ساتھ ولائت کے کارخانے کی طرف متوجہ ہوتا ہے۔کارخانہ یاد آتے ہی ولائتی سامان۔اور پھر فیکٹریوں

(کارخانوں) کی ایجادیں ۔ بندوق ۔توپ ۔ جہاز ۔ پیراشوٹ ۔ پیراشوٹ کے ساتھ جرمنی کی لڑائی ۔ لڑائی کے ساتھ جاپان پر ایٹم بم کا گرنا ۔ایٹم کے نقصانات ۔ پھر اسکی تفصیل میں ڈاکٹر کا بیان ۔ پھر ڈاکٹر کی تعریف غرض ہر خیال پر ایک نیا خیال سامنے آ کر اصل مشین کا پرزہ بننے کے بجائے انسان خیالات کی رو میں بہہ جاتا ہے ۔اسے انہماک ۔ یا خیالات میں کھو جانا (Chain of Thought) کہتے ہیں ۔ یہ سب کیفیتیں حافظہ تعقل کے سامنے پیش کرتا ہے ۔ چونکہ ان تخیلات کا ظاہری وجود تو ہوتا نہیں ۔اسلئے انسان ان کیفیات کو حافظہ کے عکس ڈالنے پر اسی قسم کا وجود محسوس کرتا ہے ۔جس حالت میں حافظہ میں واقعات جمع ہوتے ہیں ۔ یہ وجود غیر جسمانی ہوتے ہیں ۔اس سے ثابت ہوتا ہے ۔کہ انسان حواسِ خمسہ کی فراہمی کے سوائے ایک موہوم دنیا میں غیر جسمانی وجود کو بھی دیکھ لیتا ہے ۔ یہ کیفیات اگر جاگتی حالت میں حافظہ سے نکلیں تو تخیلات کہلاتے ہیں ۔ اور سوتی حالت میں حس مشترک کا ایک حصہ ''شعور'' بھی تعقل کی طرح آگاہی کا عمل کرتا ہے ۔اور نیند کی حالت میں معطل نہیں ہوتا ۔تو نیند کی حالت میں اگر حافظہ اپنے جمع شدہ واقعات عقل کی طرف ڈالے تو شعور نیند کی حالت میں غیر جسمانی کیفیات مثل بیداری کے دیکھ لیتا ہے ۔تو یہ کیفیت خواب کے نام سے تعبیر کی جاتی ہے ۔ عالمِ بیداری اور خواب میں فرق اتنا ہے ۔کہ اگر حافظہ نیند کی حالت میں بھی عقل پر واقعات کا عکس ڈالے تو آگاہی کا سلسلہ بند نہیں ہونا چاہیے ۔ کیونکہ شعور خواب اور بیداری کی دونوں حالتوں میں جاگتا رہتا ہے ۔اور دونوں کیفیتوں سے آگاہ رہتا ہے ۔تو نیند کی حالت میں یہ آگاہی موقوف نہیں ہونی چاہیے ۔ بلکہ نیند میں بھی انسان خیالات میں غرق رہنا چاہیے ۔لیکن انسانی فطرت کا تقاضا یہ ہے ۔ کہ انسان چند ساعت کے لئے اپنے تفکرات سے فراغت پا کر سکون حاصل کرے ۔ اسلئے سوتی حالت میں ہر قسم کی آگاہی سے بے خبر ہو جاتا ہے ۔اسکا مطلب یہ ہے ۔کہ سوتی حالت میں حافظہ کا رُخ تعقل کی طرف ہوتا ہے ۔ تعقل کے معطل ہونے کے ساتھ شعور بھی اپنی توجہ حافظہ سے ہٹا لیتا ہے ۔ چونکہ اسکے عمل میں آگاہی کا مادہ ہے ۔ اسلئے کبھی کبھی یہ حافظہ کی طرف متوجہ ہو جاتا ہے تو اسوقت جو کیفیت حافظہ میں ابھری ہوئی ہوتی ہے ۔ وہی کیفیت شعور کو حاصل ہوتی ہے ۔ یہی کیفیت خواب سے

تعبیر دی جاتی ہے۔اس حالت میں انسان کا علم وآ گاہی غیر مادی ہوتے ہیں۔جس سے تعقل بے خبر رہتا ہے۔انسانی علم کا تقاضا تو یہ ہے۔کہ جب تک تعقل بجائے خود علم حاصل نہ کرے انسان کی آ گاہی مکمل نہیں ہوتی۔لہذا یہ خواب کے واقعات تعقل کے معطل ہونے پر تعقل کی آ گاہی میں نہیں آتے اور جب تعقل بیدار ہوکر اپنا عمل جاری کرتا ہے۔تو انسان خواب کے واقعات کو دوبارہ دہراتا ہے۔تو حافظہ پرخواب کے واقعات دوبارہ ابھر آتے ہیں۔اوراب وہ واقعات تعقل کی آ گاہی میں آنے شروع ہوجاتے ہیں۔اسوقت انسان خواب کے واقعات سے آ گاہ ہوتا ہے۔اس حالت میں شعور کی آ گاہی اور تعقل کی آ گاہی مل کر خواب کی کیفیات حاصل کرتے ہیں۔تو انسان محسوس کرتا ہے۔کہ میں نے سوتے میں کچھ دیکھا۔بعض اوقات خواب کے واقعات دوبارہ حافظہ پر لانے میں اکثر واقعات دوبارہ نہیں آتے تو انسان یاد کرنے کی کوشش کرتا ہے۔کہ فلاں جگہ میں نے ایک آدمی دیکھا تھا پر یاد نہیں وہ کون تھا تو حافظہ پرزور دیتا ہے۔حافظہ زور دینے پر اسی آدمی کی شکل لاتا ہے۔تو خواب یاد آتا ہے کہ ہاں۔فلاں شخص تھا۔یہ اس وجہ سے کہ حافظہ خواب کے واقعات دوبارہ جاگتی حالت میں تعقل کے سامنے دہراتا ہے۔یعنی خواب اگرچہ شعور محسوس کرتا ہے۔لیکن انسانی مکمل آ گاہی میں تعقل کے برسرِ عمل ہونے پر ہی یہ خواب انسانی آ گاہی میں آجاتا ہے۔

اب دیکھنا یہ ہے۔کہ جب سوتی حالت میں حواسِ خمسہ بھی برسرِ عمل ہوتے ہیں اور حواس کے ذریعہ حافظہ تک واقعات پہنچتے ہیں۔تو کیا مادی حالت میں بھی واقعات حافظہ میں پہنچ کر شعور محسوس کرتا ہے؟ یہ ضروری ہے۔کہ جب حواس۔حافظہ کا عمل جاری ہو اور اچانک شعور بھی حافظہ کی طرف متوجہ ہو تو شعور کا محسوس کرنا لازمی ہوگا۔مثال کے طور۔اگر نیند کی حالت میں انسان کے جسم میں سوئی چُبھ جائے تو اسکی کیفیت لامسہ کے ذریعہ واہمہ تک پہنچے گی چونکہ سوئی کی چُبھن سے واہمہ پیشتر واقف ہو چکا ہے۔تو واہمہ اخذ کرلے گا کہ یہ چُبھن ہے۔اور سوئی کی ہے۔حافظہ بھی اپنے جمع شدہ خزانے سے سوئی کی چُبھن سے مشابہت دے گا تو آپس کی مشابہت سوئی کی چُبھن کے احساس کو مستقل شکل دیکر جمع کرلے گی۔چونکہ یہ واقعہ احتیاطی ہے۔اسلئے شعور متوجہ ہوگا۔تو حافظہ پر ابھرا ہوا

واقعہ چُبھن ۱ ہو گا۔ تو اس سے بچاؤ کی خاطر تعقل میں حرکت پیدا ہو گی تو پہلے تعقل بھی حافظہ کا مطالعہ کرے گا کہ سوئی چبھ رہی ہے۔ تو ساتھ ہی تعقل ہاتھ کو سوئی ہٹانے کا جاگتی حالت میں آنکھ کے ذریعہ حکم دے گا۔ اگر تعقل پر گہری نیند غالب ہو گی۔ تو تعقل کچھ حکم نہ دے گا اور سوئی کی چبھن اس وقت تک جاری رہے گی جب تک تعقل جاگ نہ جائے۔ یہ کیفیت ایک مستقل صحت مند انسان کی ہو گی۔ اور اگر کمزوری ہو تو لامسہ سوئی کی چُبھن کو واہمہ تک پہنچائے گا۔ واہمہ کمزوری کے باعث اسے اندازہ نہ کر سکے گا یا تو وہ کسی اور کیفیت کی شکل پیدا کرے گا یا وہ اس درد سے سانپ کے ڈسنے کی کیفیت اخذ کرے گا۔ واہمہ سے جب حافظہ عکس پذیر ہو گا تو وہاں سانپ اور ڈسنے کی کیفیت ابھر آئے گی تو شعور احتیاطی طور پر حافظہ کے نقوش کا مطالعہ کرے گا اس وقت انسان خواب کی حالت میں سانپ کا ڈسنا محسوس کرے گا۔ یہ کیفیت ظاہری حس سے حاصل کردہ ہو گی۔ اس سے معلوم ہوتا ہے۔ کہ نیند کی حالت میں جب کہ آگاہی پانے والا تعقل معطل ہوتا ہے۔ انسان کے پاس حواس اور شعور کے ذریعہ بیرونی واقعات کا علم حاصل کرنے کا ذریعہ بھی موجود اور جاری رہتا ہے البتہ اس ذریعہ حصول علم میں یہ فرق ضرور ہے۔ کہ اس حالت میں صحت و کمزوری کی حالتوں میں صحیح و غلط کا اندازہ نہیں رہ سکتا۔ کیونکہ انسان میں عینی مشاہدہ کرنے والی آنکھ ایسی حالت میں نہیں دیکھتی۔ جو ایک کیفیت کی صحیح شکل کو حاصل کر کے آگاہی کو مستحکم کر سکے۔ یعنی اگر آنکھ دیکھتی ہو تو پھر سوئی کی چُبھن صاف دیکھی جائے گی۔ اور اس حالت میں واہمہ حافظہ کی کمزوری آنکھ کی دیکھی ہوئی کیفیت میں خلل انداز نہیں ہو سکتی۔ بہر حال مادی اشیاء کا علم اپنی اصلی حالت میں حاصل ہو سکتا ہے۔ فرق صرف صحت و کمزوری کا ہو گا۔ اگر قویٰ صحت مند ہوں تو انسان اصلی ہیئت کا شعور کے ذریعہ علم حاصل کرے گا۔ اگر کمزور ہوں تو واقعات غلط ہیئتوں میں اخذ ہوں گے اسکے ساتھ ہی یہ خواب تک ہی محدود رہے گی۔ کیونکہ ظاہری آگاہی والا تعقل

---

۱ یہ کیفیت نیند کی حالت میں اپنے اصلی روپ میں محسوس کی جاتی ہے۔ اسلئے اسے رویائے صادقہ (نیند کی حالت میں اصلی کیفیت سے بعینہٖ آگاہی) کہتے ہیں۔ اس کی تشریح آگے آئے گی۔

معطل ہے۔ اسلئے اس خواب کے واقعات کی آگاہی بھی جاگنے یعنی تعقل کے بیدار ہونے پر تعقل واقعات حافظہ کے دوبارہ ابھرآنے پر آگاہی پائے گا۔ البتہ شعور حس مشترک کا حصہ ہی ہے۔ اسلئے خواب میں شعور کے آگاہ ہونے سے۔ یہ اثر ضرور رہتا ہے۔ کہ انسان یہ سمجھ لیتا ہے۔ کہ میں نے خواب دیکھا تھا۔ اس سے پتہ چلتا ہے۔ کہ مادی ذریعہ سے آمدہ اطلاعات مَس۔ کان۔ ناک۔ زبان سے (سوائے آنکھ کے) شعور بھی خواب کی حالت میں پالیتا ہے۔ اسلئے حواس کے ذریعہ بھی خواب کے آثار پیدا ہوتے ہیں جو شعور بھی محسوس کرتا ہے۔ اس کے علاوہ ایک اور ذریعہ بھی ہوتا ہے۔ وہ واہمہ کے تاثرات کے ذریعہ ہوتا ہے۔ (۱) ایک قسم کا خواب حواس سے پیدا ہوتا ہے۔ (۲) دوسری قسم کا خواب حافظہ سے پیدا ہوتا ہے جسے خیالی خواب کہا جاتا ہے۔ (۳) تیسری قسم کا خواب واہمہ سے ہوتا ہے۔

حواس کے ذریعہ خواب کا بیان ہو چکا۔ اور حافظہ کا خواب خود اسکے جمع شدہ واقعات سے پیدا ہوتا ہے مثلاً کسی شخص کے حافظہ میں نیند سے پہلے یا دن میں یا بلاتعین زمانہ یعنی دس سال قبل ایک خیال پیدا ہوا۔ اور وہ خیال حافظہ میں جمع ہے۔ اب کسی وقت بھی رات کو یا نیند میں یہ خیال ابھرآیا اور شعور نے پالیا تو اسے خیالی خواب کہا جاتا ہے۔

واہمہ کا کام بھی کیفیت کی شکلیں پیدا کرنے (یعنی ان کا نام اور رنگ بنانے) کا ہوتا ہے۔ اور نیند میں بھی صحت یا کمزوری کی حالت میں یہ واقعات کو اپنی قوت کے مطابق پیش کرتا ہے۔ البتہ حافظہ واقعات و کیفیات خود پیدا کرتا ہے۔ لیکن حواس اور واہمہ خود کیفیات پیدا نہیں کرتے بلکہ بیرونی کیفیات کو حاصل کر کے پیش کرتے ہیں۔

واہمہ سے جو خواب کی کیفیت پیدا ہوتی ہے۔ یہ کیفیت بھی حواس سے حاصل کردہ ہوتی ہے۔ لیکن واہمہ کی کمزوری کے باعث جب اصل کیفیت کمزوری واہمہ کے باعث دوسری مختلف شکلوں میں محسوس ہو تو یہ کیفیت وہمی خواب سے تعبیر ہوتی ہے۔ مثال کے طور پر ایک شخص کا گذر کسی جنگل سے ہوا۔ اس شخص کے حافظہ میں جنگل کے درندوں کی مضرت اور ہیبت جمع ہے۔ جنگل میں

داخل ہونے سے جنگل کا منظر دوبارہ حافظہ میں آ جائے گا۔ جنگل کا منظر آنے کے ساتھ ہی جنگل کے جانوروں۔ شیر۔ چیتا۔ بھیڑیا۔ سانپ وغیرہ کے نقوش ابھر آئینگے۔ یعنی یہ کیفیتیں جنگل کے نقشہ کے ساتھ مل کے ایک جگہ جمع ہو کر شعور کے قریب آ جائیں گی۔ چونکہ انکی کیفیت اسوقت غیر جسمانی ہو گی۔ لہذا یہ کیفیتیں شعور کے سامنے پھرنے لگیں گی تو اس وقت انسان کے ذہن میں کبھی شیر کا خیال آئے گا۔ کبھی بھیڑیے۔ کبھی سانپ اور کبھی کسی اور مضر درندہ کا تصور خیالی پیدا ہو گا۔ اس حالت میں انسان اگرچہ ظاہری طور پر ان چیزوں کو دیکھتا نہیں تاہم ان چیزوں کی مضرت کے نقوش حافظہ سے ابھرنے کی وجہ سے انسان کا دل ایک خفیف ڈر محسوس کرے گا۔ یہ ڈر اسکے دل کی کمزوری کے باعث ہو گا گویا خوف کا مقام ذہن میں نہ ہو گا بلکہ دل میں ہو گا۔ یعنی ادھر حافظہ میں جنگل کے مناظر ابھرے ادھر دل میں خوف کی کیفیت ابھر آئی۔ اب اثناءِ راہ میں جب تک اسکا سفر جنگل سے ہو گا۔ جنگل کا منظر حافظہ پر طاری ہو گا۔ ادھر دل پر بھی خوف کی کیفیت طاری رہے گی۔ اسی اثنا میں اگر یہ شخص کسی جگہ آرام کرنے بیٹھا اور اسی حالت میں سو گیا تو اسوقت اس شخص کی حالت میں کچھ فرق نہ ہو گا۔ یعنی اس شخص کی وجودی کیفیات میں سونے سے کچھ فرق نہ آئے گا حافظہ اور دل کی کیفیات کا ابھرنا اسی طرح جاری رہے گا۔ صرف سونے کی حالت میں تعقل معطل ہو جائے گا۔ تعقل کے معطل ہونے سے انسان پر یہ کیفیت ضرور طاری ہو گی کہ حصۂ حرکت کے ڈھیلا ہونے سے اس پر بے حسی و بے بسی کی کیفیت طاری ہو جائے گی۔ اس کیفیت کے طاری ہونے پر دل میں خوف کی کیفیت زیادہ ابھر آئے گی۔ خوف کی حالت میں انسان کو کسی خطرناک حملہ سے بچنے کے لئے قوتِ دفاع کو استعمال کرنے میں تعقل کے ساتھ حصہ حرکت کی ضرورت رہتی ہے۔ تاکہ انسان حملہ سے بچنے کیلئے یا تو بھاگے یا مقابلہ کے لئے اپنے اعضاء استعمال کرے۔ تو تعقل پوری نیند کی کیفیت حاصل نہیں کر سکتا۔ ایسی حالت میں اگر کسی درخت کی ٹہنی ٹوٹنے کی آواز یا کسی قسم کی بیرونی فضا کی کیفیت لامسہ اور سامعہ (مس اور کان) کے ذریعہ جنگل کے مناظر میں حافظہ تک پہنچ جائے تو انسان دہشت کے مارے فوراً جاگ جاتا ہے۔ جب کوئی شے نہیں پاتا۔ تو یہ اندازہ کر لیتا ہے۔ کہ یہ میرا وہم تھا۔ جس نے ایک مصنوعی آواز میں کسی شے

کے حملہ کا تصور دلایا۔ یہ وہم ہے۔

اور اسی حالت میں اگر انسان تھکاوٹ کی وجہ سے گہری نیند سو جائے۔ تو تعقل بے اختیار ہو کر قطعاً معطل ہو جائے گا۔ اب گہری نیند میں اگر ایک شخص قوتِ لامسہ یا سامعہ (مس۔ کان) کے ذریعہ کوئی چیز محسوس کرے گا۔ یعنی گھاس۔ درخت کی بیل۔ یا رسی۔ یا درخت کی ٹہنی اسکے وجود سے مس کر جائے تو اسکی خبر واہمہ تک پہنچے گی۔ یہاں اس بات کا خیال رکھنا ضروری ہے۔ کہ اگر یہ شخص صحت مند ہے۔ تو پھر ابتداء میں یہ جنگل کے مناظر سے متاثر نہ ہوگا۔ نہ اسے ڈر محسوس ہوگا نہ وہم اس پر اثر انداز ہوگا تو یہ بے خطر گہری نیند سو جائے گا اور اسے لامسہ یا حواس کے ذریعہ پہنچی ہوئی اطلاع کا بھی احساس نہ ہوگا۔ اور بے خوف ہونے کی وجہ سے اسے قوتِ دفاع کے استعمال کی ضرورت بھی نہ رہے گی اور اگر اسکا شعور ان اشیاء کو مس اور سمع کے ذریعہ محسوس کرے جو حافظہ پر ابھر آئیں گی۔ تو یہ ان اشیاء کو مس و سمع کی اصلی کیفیات سے واہمہ و حافظہ کے ذریعے شعور سے محسوس کرے گا۔ کہ گھاس یا ٹہنی یا رسی وغیرہ ہے۔ اور اگر صحت مند نہ ہو دل۔ واہمہ۔ حافظہ کمزور ہو تو دل کے خوف کی وجہ سے ہر آہٹ اور چھونے والی کیفیت کو محسوس کرے گا تو واہمہ خطرے کے تحت ان اشیاء کو غلط شکل دے کر حافظہ کو عکس پذیر کرے گا۔ حافظہ میں جنگلی درندوں شیر۔ سانپ کا عکس ابھرا ہی ہوگا تو حافظہ گھاس کو شیر۔ رسی کو سانپ سے مشابہت دے کر شعور کے سامنے لائے گا۔ یہ شکل واہمہ کی ہی بنائی ہوگی۔ تو انسان شعور کے ذریعے خواب میں دیکھے گا۔ کہ شیر حملہ کر رہا ہے یا سانپ جسم سے لپٹ گیا ہے۔ تو خوف میں اضافہ اتنا ہوگا کہ قوتِ دفاع کی تحریک سے تعقل متاثر ہوگا۔ اگر نیند زیادہ گہری ہوگی تو انسان خواب میں دیکھے گا کہ شیر آیا اور حملہ کیا۔ اور انسان کی قوتِ دفاع میں اضطراب آئے گا۔ خوف کے ساتھ دل ارادہ بھاگنے کا کرے گا۔ بھاگنے کی کیفیت پھر واہمہ حافظہ تک جائے گی تو انسان خواب میں بھاگنے لگے گا جس سے اسکی قوتِ دفاع یعنی لاتوں کی رگوں پر اثر ہوگا۔ لیکن حصہ حرکت کے معطل ہونے کی وجہ سے ظاہری طور وہ بھاگنے کی کیفیت کی تکمیل نہ کر سکے گا۔ اسلئے لاتوں پر زور آنے سے وہ جاگ جائے گا۔ اگر نیند گہری ہو تو لاتوں پر اثر پڑنے کی کیفیت اسے خواب میں نظر آئے گی اور انسان خواب

میں اپنی لاتوں کی حرکت محسوس کرتے ہوئے بھاگنا شروع کرے گا۔اور خوف کی زیادتی اور بھاگنے کی کیفیت سے بھی جاگ جائے گا۔تو چند ساعت کیلئے انسان اپنے حواس کو کام میں لاکر اپنے ماحول سے آگاہی حاصل کرنے کی کوشش کرے گا۔اسکی وجہ یہ ہے۔کہ حواس ماحول سے بے خبر تھے۔تعقل خفتہ تھا۔شعور وہمی خیالی دنیا کے واقعات میں مصروف تھا۔اس لئے از سرِ نو حواس و تعقل کو ماحول کا احاطہ کرنے میں رجوع کرنے کیلئے تھوڑی دیر لگ جاتی ہے۔جب حواس و تعقل یہ محسوس کرتے ہیں کہ واقعات اصلاً رونما نہیں ہوئے تو دل سے خوف کی کیفیت ختم ہو جاتی ہے۔اور انسان مطمئن ہو جاتا ہے۔بس خواب ختم ہوگئی اور انسان محسوس کرے گا کہ میں وہمی خواب سے متاثر ہوا ــــ ابھی تک اس قسم کے خوابوں کا تعلق انسان کے حواس خمسہ۔واہمہ۔حافظہ سے ہی ہوگا۔اسلئے انسان نیند کی حالت میں بھی وہی کیفیتیں محسوس کرسکتا ہے۔جو عالمِ بیداری میں ہوا کرتی ہیں۔عالمِ بیداری میں آنکھوں سے دیکھنے کی وجہ سے اور تعقل کی بیداری کی وجہ سے یہ خواب نہیں کہلاتی۔اور نیند کی حالت میں آنکھ۔حصہ حرکت اور تعقل کے معطل ہونے کی وجہ سے عالمِ بیداری کی یہی کیفیتیں خواب سے تعبیر کی جاتی ہیں۔یہ تمام کیفیتیں انسان کی وجودی اندرونی خاصیتوں سے ہی متعلق ہوتی ہیں۔ایسی کیفیتیں اگر عالم بیداری میں ہوں۔تو مشاہدہ کہلاتی ہیں۔اور نیند کی حالت میں ہوں۔تو خواب کہلاتی ہیں (یعنی خواب۔یا نیند کی حالت میں دیکھنا۔جسے عربی میں رئے فی المنام کہا جاتا ہے)۔

اسکے علاوہ خواب اور مشاہدہ کی ایک اور نوعیت بھی ہے۔بعض اوقات انسان تنہائی میں بیٹھ جاتا ہے۔اسوقت حواس خمسہ کے ذریعہ بیرونی ماحول کی کیفیات کی ترسیل ذہن تک آنی بند ہو جاتی ہے۔اور ذہن بیرونی کیفیات کی آمد سے فارغ ہو جاتا ہے۔لیکن ایسی حالت میں بھی تعقل و شعور فارغ نہیں رہتے۔اسوقت حافظہ میں جمع شدہ نقوش (کیفیات) شعور کے سامنے آجاتے ہیں۔وہ اسلئے کہ تعقل کی کیفیت یہ ہے۔کہ وہ ٹھوس مادی اشیاء کا ادراک کرتا ہے۔اور شعور کی کیفیت یہ ہے۔کہ وہ غیر جسمانی کیفیات کو محسوس کرتا ہے۔مثال کے طور پر انسان کی آنکھوں کے سامنے ایک انسان

ہے۔تو آنکھ دیکھتی ہے اور تعقل آگاہ ہوتا ہے کہ سامنے انسان ہے۔اگر سامنے انسان نہ ہو۔اور آنکھ انسان کو نہ پائے تو تعقل انسان کے وجود سے آگاہی نہیں پاتا۔لیکن اسی حالت میں انسان ایک غیر جسمانی انسان کا تصور کرتا ہے۔اگر چہ انسان نظروں کے سامنے نہیں تب بھی انسانی ذہن میں ایک انسان کا مجسمہ آجاتا ہے۔اسکا مطلب یہ ہے۔کہ حافظہ میں انسانی مجسمہ کا نقش موجود ہوتا ہے۔یہ اپنی لطیف حالت میں ہوتا ہے۔جسکا جسم نہیں ہوتا۔یہی کیفیت شعور کے سامنے آجاتی ہے تو انسانی تخیل میں ایک انسانی غیر جسمانی وجود آجاتا ہے۔اسی طرح ہر وہ کیفیت جو حافظہ میں جمع ہو غیر جسمانی ہیئت میں شعور کے سامنے آتی ہے اور وہ غیر جسمانی طور اسکا مشاہدہ کرتا ہے۔یہی حالت تنہائی میں ہوتی ہے۔کہ شعور کے سامنے حافظہ کے نقوش ابھرتے جاتے ہیں۔جس میں ہر ملک ہر شے کی کیفیت ہوتی ہے۔اس حالت میں انسان نہ اس مقام پر ہوتا ہے۔نہ کوئی شے اسکے پاس ہوتی ہے۔پھر بھی وہ ان کیفیات کو اپنے مقام پر اسطرح محسوس کرتا ہے۔کہ گویا وہ بمبئی۔انگلینڈ۔امریکہ یا وہ جگہ جو اسکے حافظہ میں آچکی ہو پاتا ہے۔گویا وہ خود نہیں جاتا۔بلکہ حافظہ اس جگہ کے نقوش شعور کے سامنے پیش کرتا ہے۔اسی حالت میں اگر انسان سو جائے تو یہ کیفیتیں اسی نوعیت کے ساتھ شعور کے سامنے جاری رہیں گی۔تعقل کے معطل ہونے پر حافظہ مختلف شکلیں مختلف کیفیات دہراتا رہتا ہے۔اگر نیند کی حالت میں شعور پر ان کیفیات کا عکس طاری ہو جائے۔تو یہی عالم بیداری کا تخیلاتی مشاہدہ خواب بن جاتا ہے۔اور خواب میں حافظہ مختلف کیفیات پیش کر کے ایک فلم کی صورت دے دیتا ہے تو انسان ایک بیرونی خواب کی دنیا محسوس کرتا ہے۔ان واقعات میں اپنی عمر کے چالیس سال۔تیس۔بیس۔دس سال قبل کے واقعات کے مختلف اجزاء حافظہ میں باہم مل کر ایک خواب کا افسانہ بن جاتے ہیں۔بعض ابتدائی عمر کے واقعات جو انسان بھول چکا ہوتا ہے۔جب سامنے آجاتے ہیں۔تو انسان جب بیدار ہو کر تعقل کے ذریعہ دوبارہ ان مترتب واقعات کا مطالعہ کرتا ہے۔تو سوچ میں پڑ جاتا ہے۔کہ میں نے یہ کیا خواب دیکھا۔یعنی یہ کون سے واقعات ہیں جو خواب کی صورت میں میرے علم و مشاہدہ میں آئے ہیں۔چونکہ انسان علم کا متلاشی رہتا ہے۔تو پھر خواب دیکھ کر سوچ میں پڑتا ہے۔کہ ان واقعات میں

کس قسم کا علم ہے۔ جو مجھے حاصل ہوا۔ اگر واقعات کو پہلے دیکھ چکا ہو اور ہر زمانہ کے واقعات اسے یاد ہوں تو کہتا ہے کہ یہ خیالی خواب ہے۔ اگر حافظہ میں موجود نہ ہوں تو پھر نئے واقعات کی چھان بین میں تجسس کرتا ہے۔ کہ خواب میں دیکھے ہوئے واقعات کی نوعیت کیا ہے۔ اکثر ایسا بھی ہوتا ہے۔ کہ بعض واقعات ایسے بھی ہوتے ہیں جو ماضی اور حال میں واقع نہ ہوئے ہوں۔ تو ایسے واقعات کا علم انسانی تفکر پر زور ڈالتا ہے۔ کہ وہ واقعات جو ابھی رونما نہیں ہوئے انکی نوعیت کیا ہوگی۔ اور مستقبل میں آنے والے واقعات کہاں تک حقیقت پر مبنی ہیں۔ اور جب وہ واقعات زمانہ حال میں پیدا ہوتے ہیں تو انسان کہتا ہے۔ کہ یہ واقعات تو میرے حافظہ میں نہیں تھے۔ اور انکے رونما ہونے سے قبل مجھے حاصل ہوئے ہیں۔ یہی ایک خواب ہے۔ جسکی بنیاد۔ جسکے نقوش نہ انسان کے قلب میں خواہشات کی صورت میں موجود ہوتے ہیں۔ نہ حافظہ میں ہوتے ہیں۔ نہ بیرونی ماحول (کائنات) میں موجود ہوتے ہیں۔ یہی ایک خواب ہے جس کی نوعیت انسانی علم میں اہمیت رکھتی ہے۔ اسکا تعلق مستقبل سے ہوتا ہے۔ یہ خواب کیسے حاصل ہوتا ہے۔ اسکے لئے دوبارہ انسانی خواصِ احساسی کا مطالعہ کرنا ہے۔

یہ امر لازمی ہے۔ کہ انسان کو انہیں واقعات و کیفیات کا علم ہوسکتا ہے۔ جنکا صدور اس کائنات میں ماضی و حال میں ہو چکا ہو۔ وہ جسمانی ہوں یا لطیف حالتوں میں ہوں۔ جہاں تک انسان کے پاس علم حاصل کرنے کے ذرائع ہوں۔ وہ مادی اور غیر مادی کیفیات کا علم حاصل کر لیتا ہے۔ لیکن ان کا تعلق زمانہ کے ساتھ ہوتا ہے یعنی یہ واقعات ماضی و حال میں پیدا ہوتے ہیں۔ اور جو واقعات مستقبل سے تعلق رکھتے ہیں انکا وجود کسی صورت میں پایا نہیں جاسکتا۔

کائنات کیا ہے؟ ماضی و حال (زمانہ) کے پیدا شدہ واقعات کا مجموعہ۔ ماضی و حال کیا ہے؟ صبح و شام ـــ چوبیس گھنٹے کی سورج کی رفتار۔ یعنی سورج کی رفتار میں سیکنڈ۔ منٹ۔ گھنٹے۔ دن (رات)۔ ہفتہ۔ ماہ۔ سال۔ صدی کا گزر جانا۔ اور سورج کی رفتار کا اندازہ اس زمین کی وسعت سے کیا جاتا ہے۔ کہ صبح سورج زمین کے ایک حصہ پر عکس پذیر ہوا۔ اور شام کو ڈھل گیا۔ گویا کائنات کے

ٹھوس وجود پر سورج کا عکس پڑنے سے جو وقت گزر گیا اسی سے ماضی و حال پیدا ہوئے ہیں اور جہاں ماضی و حال واقع ہوں وہاں پر جو واقعات رونما ہوں۔ انہیں واقعات سے انسان کو علم حاصل ہوتا ہے۔ اور جہاں کائنات کا وجود نہ ہو۔ سورج چاند کا وجود نہ ہو۔ ماضی و حال بھی پیدا نہیں ہو سکتے۔ جہاں ماضی و حال نہ ہو وہاں واقعات ماضی و حال کی قید میں نہیں رہ سکتے۔ واقعات کے ظہور پذیر ہونے کا تعین ماضی و حال سے ہی ہو سکتا ہے۔ اور ماضی و حال کا تعین سورج کی رفتار (دن رات گزرنے) سے ہوتا ہے۔ اگر واقعات رونما ہوں۔ اور سورج کی رفتار نہ محسوس کی جائے۔ تو ماضی و حال کا احساس نہیں پایا جا سکے گا۔ کہ واقعات کس وقت رونما ہوئے۔ البتہ ماضی و حال کا تصور واقعات کے پیدا ہونے اور مٹ جانے سے ہو سکے گا۔ مثال کے طور ایک آندھی آئی یا زلزلہ آیا اور گزر گیا۔ کیفیت پیدا ہوئی اور مٹ گئی تو اسکے مٹنے سے ماضی کا تصور قائم ہو جائے گا۔ اسی طرح اگر سمندر کی نچلی تہہ میں جہاں سورج کی رفتار کا احساس نہ ہوا ایک واقعہ ہوا۔ اور مٹ گیا۔ تو ایک طویل مدت سمندر میں رہنے سے ہم ماضی کا تعین وقت کے ذریعہ نہیں کر سکیں گے۔ سوائے اس کے کہ ایک واقعہ پیدا ہوا اور مٹ کر ماضی کی صورت اختیار کر گیا۔ اسی طرح اگر ایک کیفیت ظہور پذیر ہوئی ـــــ اور ہم نے آنکھوں سے دیکھ لی۔ تو ایسے مقام پر اسکا ظہور حال میں ہو گا اگر یہی کیفیت نیند کی حالت میں دیکھی جہاں سورج کی رفتار کا تعین نہیں۔ اگر چہ اس کیفیت کو حال میں ہی تصور کیا جائے۔ لیکن وقت کے تعین نہ ہونے کی وجہ سے ایسی کیفیت کو مستقبل سے بھی تعبیر دیا جائے گا۔ کیونکہ نیند کی حالت میں جو کیفیت غیر جسمانی پائی جاتی ہے۔ وہ تخیلی ہوتی ہے۔ جسکا وجود ابھی بنا نہیں لیکن تخیل نے اسکا غیر جسمانی وجود پیدا کر دیا۔ اور جب اس کیفیت کا ظہور ظاہر میں پایا جائے گا تب ہی حال کا اس پر اطلاق ہو گا۔ اسکا مطلب یہ ہے۔ کہ غیر جسمانی حالت میں ایک وجود غیر جسمانی مستقبل میں قائم ہوتا ہے۔ اور اسکے ظاہری ظہور سے ہی یہ کیفیت حال میں شمار کی جاتی ہے۔ اور جب اس کا ظہور ختم ہو جاتا ہے تو ماضی ہو جاتا ہے۔

مثال کے طور پر اگر ہم تنہائی میں بیٹھ کر ایک خیالی محل بنانے کا ارادہ کرتے ہیں۔ تو ہم ایک ایسی کائنات میں جسکا کوئی وجود موجود نہیں۔ حافظہ کے جمع شدہ نقوش سے ایک غیر جسمانی محل تیار

کرتے ہیں۔اس محل کے اجزا بھی لطیف ہوتے ہیں۔اس کا مقام بھی لطیف (موہوم) ہوتا ہے۔اور ہماراشعور بھی اسے محسوس کرتا ہے۔اسلئے ہم اسکے متعلق نہ ماضی کا تصور قائم کرسکتے ہیں۔نہ حال کا۔نہ مستقبل کا۔البتہ ہم اس موہوم محل کا جو نہ ماضی میں ہے نہ حال میں ہے۔مستقبل سے متعلق کرکے اسے ظاہری صورت میں لانے کے لئے جستجو کرتے ہیں۔اور ہم ماضی و حال کے ظاہری اجزاء میں سے ہی لکڑی پتھر لے کر اسے تیار کرکے حال کی کائنات میں قائم کردیتے ہیں۔اسکا مطلب یہ ہوا۔کہ وہ کیفیت جسکا وجود کائنات کے ماضی و حال میں نہ تھا۔اور نہ مستقبل میں تھا۔لیکن ہمارے ارادے نے اسے پیدا کرنے کی جستجو کے ساتھ ہی مستقبل سے وابستہ کردیا اور ماضی و حال کے پیدا شدہ اجزا میں سے ہی اسے ایک کیفیت میں ظاہر کردیا۔اس سے ثابت ہوتا ہے۔کہ اس کائنات کے ماسوا جو موہوم غیر جسمانی ماحول ہوگا اس میں ماضی حال و مستقبل کی تمیز نہیں ہر زمانہ یکساں صورت میں پایا جاتا ہے۔اس زمانہ کی جو کیفیت ہمارے علم میں (یعنی شعور میں) آئے وہ مستقبل ہی کہلائے گی۔اس میں ماضی و حال پیدا نہیں ہوسکتا۔اور کسی وقت وہ ماضی و حال کے ظاہری روپ میں واقع ہوسکتی ہے۔ یہی نوعیت اس خواب کی ہے۔جس کیفیت میں نہ ماضی کے کائناتی اجزاء کا وجود پایا جاتا ہے نہ حال کا۔کیونکہ ایسی کیفیت کا ظہور اس عالمِ ماضی و حال میں ابھی تک نہیں ہوا۔جس سے کہ کیفیت کو ماضی و حال سے نسبت دی جائے۔اگر ماضی و حال میں شمار نہیں۔تو لازمی اس کی نسبت مستقبل سے ہوگی۔

اوپر کے بیان سے یہ ثابت ہوتا ہے۔کہ اس غیر جسمانی کائنات کا اگرچہ کوئی وجود نہیں اور نہ ہی اسکا ماضی و حال ہے۔بلکہ ہمارے دل کی خواہش اور ارادہ۔اور حافظہ کے نقوش ہی ان کیفیات کو پیدا کرتے ہیں۔تو پھر بھی مستقبل کا کوئی وجود پایا نہیں جاتا۔لیکن ایک کیفیت کا غیر جسمانی عالم میں پایا جانا۔اور ظاہر میں رونما نہ ہونا۔اسکے مستقبل کی نشاندہی کرتی ہے۔کہ اسکا وجود غیر جسمانی قائم ہوا۔مگر جب تک اسکا ظاہری ظہور نہ ہو حال سے پیشتر مستقبل میں شمار کی جاتی ہے۔اس قسم کے واقعات نیند میں۔یا جاگتی حالت میں تنہائی میں خیال کرنے سے پیدا ہوتے ہیں۔یہ کیفیتیں اگرچہ موہوم شکل میں ہی ہیں۔لیکن انکا ایک وجود قائم ہو جاتا ہے۔جاگتی حالت میں اگر محل کیلئے مستقبل میں ایک

عمارت کا وجود قائم ہوا۔ تو اسکا ظہور ظاہر میں ہو جاتا ہے جب اسی قسم کا محل بنایا جاتا ہے۔ اور نیند کی حالت میں جو کیفیت دیکھنے میں آئی وہ حافظہ یا دل کی خواہش سے پیدا ہوتی ہے۔ اسلئے خود بخود اسکا ظاہر میں ظہور نہیں ہوتا۔ لیکن انسانی مشاہدات میں بعض ایسی خوابیں اور مشاہدات بھی پائے جاتے ہیں جنکا وجود بغیر دل کے ارادے اور خواہش اور حافظہ کے جمع شدہ خزانہ کی تخلیق ہوں۔ مثلاً انسانی پیدائش میں اعلیٰ کردار کی حامل ہستیاں جنہیں پیغمبروں کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے۔ یا عام آدمیوں میں بھی اعلیٰ اخلاق واعمال کی حامل ہستیاں جنکے وجود ہمیشہ صحت مند ہونے کی وجہ سے ذہن کی پوری صلاحیت میں ایسی خوابیں آتی ہیں۔ جنہیں رویائے صادقہ کہا جاتا ہے۔ یا دیگر عام آدمیوں میں بھی اکثر ایسے لوگ ہوتے ہیں جنکے اخلاق مکمل طور پاکیزہ نہیں ہوتے۔ البتہ انکی ذہنی صلاحیت برقرار ہوتی ہے۔ ایسی خوابیں دیکھتے ہیں جنکا ماضی وحال میں کوئی وجود نہیں ہوتا ہے۔ اور مستقبل میں خواب دیکھنے کے ساتھ ساتھ یا بعد مدت دس برس یا اس سے کم زیادہ وقت پر من وعن ظاہری صورت میں پیش آتی ہیں۔ ان میں پیغمبروں کی خوابیں خصوصی اہمیت رکھتی ہیں۔ اور عام آدمیوں کی خوابیں بھی پوری ہو جاتی ہیں۔ مثال کے طور پر ایک کیفیت کو ہم لیتے ہیں۔ کہ زمانہ حال کی رفتار میں ہم یہ اچھی طرح دیکھتے ہیں۔ کہ دنیا پر امن وسکون کا دور دورہ ہے۔ کسی خونریز جنگ کا احتمال نہیں۔ ایک شخص خواب دیکھتا ہے۔ کہ مستقبل میں مئی کا مہینہ ہے۔ اور دو بڑے ممالک میں خونریز جنگ ہو رہی ہے۔ اور یہ جنگ تین ماہ جاری رہی آخر ان میں ایک ملک شکست کھا کر تباہ ہو گیا۔ اور دوسری حکومت نے اس پر قبضہ کر کے اپنا تسلط جما لیا۔ اور اس جنگ میں بہت سے ملک بھی تباہ ہوئے۔ یہ شخص عام آدمیوں میں شمار ہوتا ہے۔ اسکی ذہنی قوتیں صحت مند ہیں۔ ہوسکتا ہے اسکے ذہن میں یہ نقوش پیدا ہوئے ہوں۔ اور جنگ کے واقعات سامنے آئے ہوں لیکن یہ امر مسلمہ ہے۔ کہ آئندہ آنے والے تصورات جو ابھی واقع نہیں ہوئے۔ انکا وجود نہ ماضی میں ہے۔ نہ حال میں۔ نہ مستقبل میں۔ البتہ ہمارے تصورات انہیں مستقبل سے متعلق کر دیتے ہیں۔ یہی کیفیتیں مستقبل سے (بوجہ غیر جسمانی ہونے کے) متعلق ہو گئیں۔ ایسا یقینی ہوسکتا ہے۔ لیکن اس کیفیت کی تصدیق نہیں کی جاتی کہ کیا جس ملک نے شکست کھائی وہی ملک

شکست کھائے گا۔ ایسا بھی ہوسکتا ہے کہ واہمہ کی کمزوری کی وجہ سے واہمہ جنگ کے نتیجہ پر غلط نقوش پیدا کر کے اس ملک کی شکست کا منظر دکھائے۔ تو اسکا فیصلہ واقعہ کے رونما ہونے پر تصدیق ہوگا۔ اگر یہ واقعہ واہمہ۔ حافظہ کے نقوش کی اختراع ہے۔ تو پھر آئندہ مئی کے مہینے میں واقع نہ ہوگا۔ کیونکہ اسکی کوئی حقیقت نہیں بلکہ تخیلی خواب ہے۔ اور اگر مستقبل میں واقعہ اچانک اسی طرح ہوا کہ دو ملکوں میں خونریز جنگ ہوگئی اور ایک ملک نے فتح پا کر دوسرے ملک کو شکست دے کر تباہ کر دیا اور باقی ملک بھی اس جنگ میں تباہ ہوئے تو یہ خواب تخیلی نہیں بلکہ رویائے صادقہ میں شمار ہوگا۔ کیونکہ موہوم کائنات کی موہوم کیفیات بغیر کسی کے ارادے اور خواہش کے خود بخود رونما ہوگئیں۔ اس سے معلوم ہوتا ہے۔ کہ یہ خواب نہ دل کی خواہش کی اختراع ہے۔ نہ واہمہ و حافظہ کے نقوش کی اختراع ہے۔ بلکہ ایسا سمجھنے میں غلطی اور دھوکہ ہے۔ رہا یہ کہ اگر یہ دل کی خواہشات اور واہمہ حافظہ کی تخلیق نہیں پھر کس ذریعہ سے یہ کیفیت شعور کو حاصل ہوئی۔ اور جو ذریعہ اس کیفیت کے حصول کا انسانی وجود میں موجود ہے۔ وہی ذریعہ مستقبل کے ہونے والے واقعات کے سچے ہونے کی تصدیق کرنے والا ہوگا۔ اسکے لئے ہم نے دیکھنا ہے۔ کہ حواس خمسہ۔ واہمہ۔ حافظہ کے علاوہ انسانی وجود میں کیا کوئی اور قوت ہے۔ جس کی کیفیت کا تعلق ہمارے ذہن سے ہے۔

ہم دیکھتے ہیں۔ کہ جب ہم ایک خوبصورت محل بنانے کا ارادہ کرتے ہیں۔ تو ہمارے شعور کے سامنے ایک غیر جسمانی محل آجاتا ہے۔ یعنی ہم دیکھتے ہیں۔ جسطرح ظاہری صورت میں ہم تعقل اور آنکھوں کے ذریعہ ایک محل دیکھتے ہیں۔ ہماری آنکھیں بند رہنے کے بعد اگر ہمارے سامنے کوئی محل آجائے تو اسکا مطلب یہ ہوتا ہے۔ کہ ہمارے حافظہ میں ایک جمع شدہ محل کا نقش ہمارے شعور کے سامنے ابھر آیا۔ لیکن جسوقت ہم اپنی خواہش کے مطابق ایک محل کا تصور کرتے ہیں۔ تو اسوقت حافظہ کے محل اور خواہش کے محل میں یہ فرق ہوتا ہے۔ کہ حافظہ کا محل دو منزلہ اینٹوں کی دیواریں اور چند کھڑکیاں ہوتی ہیں۔ لیکن خواہش والا محل چار منزلہ اونچے میناروں والا لوہے کی کھڑکیاں جن میں بلوری شیشے لگے ہوں اور پلستر سفید کی دیواریں ہوتی ہیں۔ گویا یہ محل حافظہ کا نہیں بلکہ دل کا محل ہے۔ جہاں سے خواہش

پیدا ہوئی اور اسی دل میں اس محل کی کیفیت بنائی گئی ہے۔ تو اس سے ثابت ہوتا ہے۔ کہ ظاہری محل کو حاصل کرنے والی قوت ہماری آنکھ ہے۔ جو محل کو حافظہ میں پہنچاتی ہے۔ اور آنکھ کے بند ہونے کے بعد دل سے کیفیت پیدا ہوتی ہے۔ اور دل کے ذریعہ بھی کیفیت اپنی لطیف ہیٔت میں حافظہ میں آجاتی ہے۔ اس میں شک نہیں کہ دل میں بھی وہی کیفیت پیدا ہوتی ہے۔ جو پہلے حافظہ میں آچکی ہو۔ ورنہ جو کیفیت انسانی علم میں نہ آئے وہ دل میں بھی نہیں آسکتی۔ لیکن اس محل کی کیفیت وہی ہوتی ہے۔ جو دل کے ارادہ سے حافظہ کے جمع شدہ اجزاء کو ترتیب دے کر ایک نئی کیفیت بنائی جاتی ہے۔ اور یہ نئی کیفیت اس سے پہلے حافظہ میں نہیں ہوتی۔ بلکہ دل کے ارادہ اور رابطہ سے پیدا کی جاتی ہے۔ اسلئے اسے دل کا محل ہی قرار دیا جائے گا۔ کہ اسکا بنیادی تصور دل کے ارادہ سے ہی پیدا ہوتا ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے۔ کہ جو کیفیت حواس اور حافظہ سے حاصل نہ کی گئی ہو۔ وہ دل کے ارادہ سے بنائی جاتی ہے۔ یہاں دل بھی بمنزلہ حواس خمسہ ایک کیفیت کو حافظہ میں لاتا ہے۔ گویا آنکھ بند کرنے کی حالت میں دل آنکھ کا کام کرسکتا ہے ــــــ دل کی کیفیت کیا ہے؟ یہ جسم کے اندر پردوں میں ملفوف ہے۔ اور آنکھ جیسی ہیٔت نہیں رکھتا۔ لیکن اسکی کیفیت یہ ہے۔ کہ یہ بھی لطیف ہیٔت میں ہے۔ کیونکہ حافظہ کے دو انچ حصہ میں بحر قلزم کی وسعت سما جاتی ہے۔ اسی طرح دل میں بھی ایسی خواہشات لطیف ہیٔت میں پائی جاتی ہیں جن میں کائنات ارضی جتنی وسعت ہوتی ہے۔ اگر ہم یہ خواہش کریں۔ کہ ہم اس کائنات کی سیر کریں تو اس خواہش کے ساتھ ساتھ ہم سیر کرنا شروع کرتے ہیں۔ تو جس طرح ہم محل بنانے کی خواہش میں دل کے محل کو حافظہ اور شعور تک پہنچاتے ہیں۔ اسی طرح ہم کائنات کے تصور کو دل کے ذریعہ حافظہ اور شعور تک پہنچاتے ہیں۔ گویا آنکھ کی جگہ دل کائنات کو دیکھ رہا ہے۔ اگر یہ دیکھنا اپنے حقیقی رنگ میں ہے تو یہ حقیقی تصور اور مشاہدہ ہوگا اور اگر اس میں کیفیات کی اصلی تصویر نہ پائی جائے تو یہ صرف خواہشِ باطل اور واہمہ حافظہ کی ملاوٹ ہوگی۔ مثال کے طور پر اگر ہم ارادہ کرتے ہیں کہ ہم سکندریہ کی بندرگاہ دیکھیں تو ہم اس خواہش کے تحت خواہش کا ایک تصور باندھتے ہیں۔ اسکا مطلب یہ ہوتا ہے۔ کہ ہم دل سے آنکھ کا کام لے کر سکندریہ کی بندرگاہ کا عکس حاصل کریں۔ چونکہ ہم سکندریہ

سے بہت دور ہونگے تو یہ کیفیت بھی غیر جسمانی حالت میں ہوگی۔ اسلئے ہم اپنے شعور کے سامنے ایک بندرگاہ کو محسوس[1] کریں گے۔ اگر یہ کیفیت اپنی اصلی حالت میں غیر جسمانی طور پر ہمارے شعور کے سامنے آجائے۔ تو ہم سکندریہ کی بندرگاہ کو اپنے واہمہ کے واہمی نقوش کے بالکل مخالف[2] پائیں گے۔ اس کی کیفیات وہ ہوں گی جو اس سے قبل ہمارے حافظہ میں جمع نہ ہوں گی۔ گویا سکندریہ کی اصلی ہیئت ہوگی یہ مشاہدۂ حقیقی ہوگا۔ اگر ہم واہمہ کے نقوش سے ملی جلی کیفیات دیکھیں گے تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ ہمارا قلب اس کیفیت کو اسکی اصلی ہیئت میں اخذ نہیں کرتا۔ بلکہ صرف خواہش ہے اور واہمہ۔ حافظہ اپنے جمع شدہ خزانے کے سرمایہ کے مطابق ہی اسکی ہیئت پیش کر رہا ہے۔ تو یہ کیفیت غیر معقول ہوگی اگر اس سے قبل ہم نے سکندریہ دیکھا ہو اور وہ تصور حافظہ میں ہو۔ اسی تصور کے عین مطابق اگر دل کا تصور بھی ہو تو بھی یہ تصور خیالی کہلاتا ہے۔ اسکی کوئی حقیقت نہ ہوگی۔ البتہ اگر دل ایسا تصور پیش کرے جو حافظہ کے تصور سے بھی ملتا ہو اور اس میں بعض اجزاء مختلف ہوں ان اجزء کی تصدیق کوئی شاہد کر دے اور اس کی تصدیق ہو جائے۔ تو یہ تصور حقیقی کہلائے گا۔ یہی صورت کیفیات کو دل سے حاصل کرنے کی ہے۔ اگر کیفیات اصلی ہیئت میں شعور کے سامنے آجائیں تو اس کیفیت کو کشف و الہام سے بھی تعبیر دیا جاتا ہے۔ فرق صرف یہ ہے۔ کہ ظاہری کیفیات جنکا وجود قائم ہے اور ماضی وحال میں موجود ہیں انہیں مشاہدہ کہا جاتا ہے۔ اور وہ کیفیات جنکا وجود غیر جسمانی عالم میں (جہاں ماضی وحال و مستقبل کا تعین نہیں پایا جاتا) واقع ہو۔ جب شعور کے سامنے قلب کے ذریعہ آجائیں تو انہیں کشف والہام کہا جاتا ہے۔ اب دیکھنا یہ ہے۔ کہ دل جو جسم کے اندر ایک گوشت کے لوتھڑے کی صورت میں پردوں میں ملفوف ہے۔ آنکھ کے مقابلہ میں آنکھ جیسی ہیئت نہ رکھنے کے باوجود کیسے غیر جسمانی عالم اور دور مقام کی کیفیات اخذ کرتا ہے؟

---

[1] ابھی ہم نے آنکھ سے سکندریہ کی بندرگاہ نہیں دیکھی ہوگی اور ہم نے اسکا علم حاصل کرنا ہوگا۔

[2] یہ اختلاف اس صورت سے ہوگا جو کسی شخص نے سکندریہ کی بندرگاہ حواس خمسہ اور حافظہ کے ذریعہ حاصل کی ہوگی۔

اس کی کیفیت بھی وہی ہے۔ کہ حافظہ سر کی ٹھوس دیواروں میں ایک نرم گودے کی شکل میں واقع ہے۔ حواس خمسہ کی ہر کیفیت کو اسکی اصلی ہیئت میں پالیتا ہے۔ حالانکہ آنکھ اور دماغ کے درمیان کوئی خلا نہیں جس راہ سے بیرونی عکس براہِ راست حافظہ تک پہنچے۔ آنکھ اور دماغ کے درمیان بھی گوشت اور رگیں ہوتی ہیں تو پھر ایک ہاتھی کا عکس آنکھ کے ذریعہ کیسے حافظہ وعقل تک پہنچتا ہے۔ یہ ایک لطیف ہیئت ہی ہے۔ جو دماغ میں لطیف صورت میں محسوس ہوتی ہے۔ اور پھر دل کی خواہش! ____ دل سینہ میں ہوتا ہے۔ اور دماغ سر میں بظاہر دل و دماغ کا کوئی ایسا رابطہ محسوس نہیں کیا جاتا۔ جس سے دل کی خواہش حافظہ تک پہنچ کر ایک شکل اختیار کرے جسطرح حافظہ بیرونی اشیاء کا حواس کے ذریعہ ادراک کرتا ہے۔ اسی طرح دل بھی اپنی لطیف حالت میں بیرونی کیفیات کا عکس حاصل کرتا ہے۔ سوال یہ ہے کہ بیرونی اشیاء ٹھوس ہوتی ہیں اور قریب ہوتی ہیں اسلئے یہ اشیاء ادراک میں آجاتی ہیں۔ لیکن دل کیلئے کونسا ذریعہ ہے جس سے دور مقام یا غیر جسمانی عالم کی مستقبل کی کیفیات اسے حاصل ہوتی ہیں۔

مادی تحقیقات سے یہ امر طے پا گیا ہے۔ کہ انسان کائنات کی تمام مخلوقی اشیاء کے جواہر کا مرکب ہے۔ اس کے وجود میں کائنات کے تمام انتہائی لطیف جواہر کے اجزاء پائے جاتے ہیں۔ اور یہ سب جواہر اسکے مادی وجود میں پائے جاتے ہیں۔ مثال کے طور پر ایتھر۔ ایمیبا۔ ایٹم (الیکٹران۔ پروٹان کا مرکب)۔ الیکٹرسٹی۔ ہائیڈروجن۔ نائٹروجن اور سب سے انتہائی قوت والے شمسی ذرات وغیرہ یہ سب انسانی وجود کے اجزاء ہیں۔ اگر ان اجزا میں کسی جز کی کمی انسان میں آجاتی ہے۔ تو اسکی جسمانی صحت وساخت میں کمزوری واقع ہوتی ہے۔ مثلاً اگر انسان کے جسم میں فولاد کم ہو جائے تو کمزوری آجاتی ہے۔ اگر انسان میں چونے کی کمی آجائے تو کمزور ہو جاتا ہے۔ اگر انسان میں ہائیڈروجن۔ نائٹروجن کی کمی آجائے تو کمزور ہو جاتا ہے۔ اگر انسان میں الیکٹرسٹی۔ ایتھر (جو کان میں بھی کام کرتی ہے) ایٹم اور شمسی ذرات کی کمی آجائے تو بیمار ہو جاتا ہے۔ اسکا ثبوت یہ ہے۔ کہ اس کا علاج۔ انہیں اجزا سے کیا جاتا ہے۔ فولاد کم ہو تو اسکا جوہر جسم میں داخل کیا جاتا ہے۔ چونا کی کمی ہو تو

اسکا جوہر داخل کیا جاتا ہے۔ الیکٹرسٹی کم ہو تو بجلی کے ذریعہ علاج کیا جاتا ہے۔ اور شمسی ذرات کا علاج تو عام Sun Bath کے ذریعے کیا جاتا ہے۔ اسی طرح ایٹم اور ایتھر بھی اسکا جسم قبول کر سکتا ہے۔ اور باقی اسکی زندگی کی نشوونما اس امر کی ظاہر دلیل ہے۔ کہ کائنات کی ہر شے اسکی جز وِ زندگی بن جاتی ہے۔ کھانا۔ مچھلی۔ انڈا۔ گوشت سب ہی کچھ کھا کر اسی سے اسکا جسم بنتا ہے۔ اس سے ثابت ہے کہ ایٹم۔ ایتھر۔ الیکٹرسٹی جیسی قوی ولطیف قوتیں انسان کے جسم میں پائی جاتی ہیں۔ اور انکی ہیئت کے اعتبار سے انکے جواہر میں وہ کیفیتیں بھی پائی جا سکتی ہیں۔ جو ایٹم۔ ایتھر میں پائی جاتی ہیں۔ اگر ہم بظاہر ان قوتوں کے تاثرات نہیں محسوس کرتے اسکا مطلب یہ نہیں کہ اس میں ایٹمی۔ ایتھری۔ الیکٹرسٹی کی خاصیت نہیں۔ نہیں۔ بلکہ ہیں فرق صرف اتنا ہے۔ کہ انسان اپنی سالمیت کو برقرار نہیں رکھ سکتا۔ اور نہ اسے موقع مل سکتا ہے کہ یہ اپنی قوتوں کو اجاگر کر سکے۔ اسکی وجہ یہ ہے۔ کہ انسان اپنی پیدائش کے بعد۔ اپنے قریبی ماحول اور اپنے والدین کا محتاج ہوتا ہے۔ وہ ابتدائی عمر میں اپنے خواص کی حفاظت نہیں کر سکتا بلکہ ماحول اور زمانہ کے تاثرات اس پر اثر انداز ہو جاتے ہیں۔ اور ایسا ہی ہوتا ہے۔ کہ یہ اپنے ارادہ اور تعقل کی پختگی کے وقت پر نیم بیمار ہو چکا ہوتا ہے۔ اور یہ بجائے اپنی خاصیتوں کے اجاگر کرنے کے یا تو اور کمزوری کی طرف جاتا ہے۔ یا سمجھ کر اپنی اصلاح کی طرف مائل ہو جاتا ہے۔ اسکی اصلاح کیا ہوتی ہے وہ قانون فطرت کی مطابقت ہے۔ فطرت نے اسے پیدا کیا۔ اور کائنات میں اسکے لئے انسانی حیثیت میں رہنے کیلئے فطری قوانین پیدا کئے ہیں۔ انہیں قوانین کے مطابق انسانیت کے دائرہ میں اگر انسان چلنے کی جستجو کرے تو اس عمل کو نیک کرداری۔ تزکیہ۔ مجاہدہ اور شرافت انسانی کے نام سے موسوم کیا گیا ہے۔ انہیں لوگوں میں اصلاح کے بعد وہ ودیعت کردہ ایٹمی۔ ایتھری قوتیں اجاگر ہو جاتی ہیں۔ جو اپنی قوت میں تمام کائنات کی ہر کیفیت کو احاطہ کئے ہوئے ہے۔ یہی جوہر روح جسمانی کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے۔ اسکا تعلق وجود میں کسی طرح بھی ہو۔ لیکن دل چونکہ جسم کے تمام اعضاء میں سب سے زیادہ لطیف ہے۔ اسلئے یہ جوہر زیادہ تر دماغ و دل میں اپنی لطیف ہیئت میں پایا جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے۔ کہ دل اور دماغ انسانی جسم میں لطیف کردار کے حامل ہیں۔

ایتھر اگر ایک آن میں مشرق کے مقام پر ویژن اور آواز کو جذب کر لیتا ہے تو دل میں بھی یہ قوت[1] ٹیلی ویژن اور آواز و کیفیات کو پانے کی ہے۔ یہ کوئی مبالغہ یا مشکل امر نہیں دل کی حالت ہر حال میں لطیف ہے۔ اسلئے دل کسی وقت بھی کسی شخص کا بھی اگر صحت مند ہو ان قوتوں کا حامل ہو سکتا ہے۔ یہ ضروری نہیں کہ انسان سے بھی بذاتِ خود تمام کا تمام ایتھری قوتوں کا صدور ہو۔

روح جسمانی انسانی فطری اور مادی قوت ہے۔ جس سے یہ ماوراء ادراک یعنی حواس میں نہ آنے والی قوتوں کا احاطہ کر سکتی ہے۔ مثال کے طور پر اسکا کوئی تعین نہیں کیا جا سکتا کہ ایتھر تمام کائنات میں مثل ہوا کے واقع ہے؟ اگر ایک گھر میں ریڈیو سیٹ لگا ہو تو اس پر ایتھری قوت کے ذریعہ ایک آن میں وہی کیفیت جو مشرق میں واقع ہوتی ہے مغرب میں بھی محسوس کی جائے۔ تو اس میں یہ کیفیت نہیں ہوتی کہ مغرب کی ایتھر مشرق میں پہنچ کر واقعات اخذ کرتی ہے۔ بلکہ ایتھر کا وجود ہی اس حیثیت سے ہے کہ مشرق کی کیفیت مغرب میں محسوس کی جاتی ہے اور اسکا احساس ہمیں ایسے محسوس ہوتا ہے جیسے ہم ہی وہاں موجود ہو کر کیفیت محسوس کر رہے ہیں۔ یہ روح ماضی و حال اور کائنات کا مشاہدہ کر سکتی ہے۔ اور یہ تمام قوتیں اس مادی دنیا کی پیدائش ہیں۔ اس سے معلوم ہوتا ہے۔ کہ اس دنیا اور اسکی مخلوق اور مخلوق میں انسان کی پوزیشن اتنی گری ہوئی نہیں جتنی ہم مادیت کے تصور میں لاتے ہیں۔ ہماری کائنات بھی اتنی قوت کی حامل ہے۔ کہ اسکی مادیت بھی مادہ پر ہی ختم نہیں ہوتی بلکہ اس میں حیرت میں لانے والا مادہ موجود ہے۔ جو اپنی ہیئت میں مادی بھی ہے۔ اور قوت میں لطیف بھی اور اسی طرح انسان بھی اتنا مٹی کا پتلا نہیں جتنا اسکی جسمانی ہیئت کو دیکھ کر اندازہ کیا جاتا ہے۔ بلکہ انسان کائنات کے مقابلہ میں اس تمام کائنات کا جوہر ہے۔ اور یہ حقیقت ہمیں مبالغہ آمیز اسلئے معلوم ہوتی ہے کہ ہم انسانی جسم کی ساخت کو پوری طرح اپنے علم کے احاطہ میں نہیں لا سکے ہیں۔ جیسے ہم۔ حافظہ کے دو انچ حجم میں ہاتھی کی صورت یا چیونٹی کی صورت کو نہیں پا سکتے۔ اسی طرح ہم دل میں ایٹمی ایتھری قوت کے ذرات کو

---

[1] دل کی اس قوت کی تفصیل صفحہ ۳۰ کے حاشیہ پر لکھی گئی۔

محسوس نہیں کر سکتے۔ حالانکہ تجربتاً ہم اس امر کو تسلیم بھی کرتے ہیں کہ ہم آنکھ کے ذریعہ دیکھی ہوئی شے حافظہ میں جمع رکھتے ہیں اور یہی کیفیت تعقل وشعور پا کر ہی آگاہی کی تکمیل کرتا ہے۔

اسقدر مترتب نظام اسقدر باریکی کہ ایک مادۂ منویہ کے قطرے میں کروڑوں ذرات اور پھر انسانی پیدائش کا نظام حیات محسوس کرنے کے بعد ہم یہ اندازہ کر سکتے ہیں۔ کہ انسان کی ذاتی پوزیشن اسکی ودیعت کردہ قوتوں کے اعتبار سے نہایت اعلیٰ وارفع ہے۔ اور جب یہ شرافت۔ یہ برتری۔ اور یہ انسانیت اسے حاصل ہے۔ تو لازمی طور انسان نے انہیں قوتوں کو اپنی نشو وارتقا میں استعمال کرنا ہے۔ جہاں تک انسانیت کا تقاضا ہے۔ اور واقعاتِ زمانہ کے مشاہدات ہیں۔ کوئی شخص یہ کہہ نہیں سکتا۔ کہ انسان کے پاس سامانِ زندگی حاصل کرنے کے ذرائع صرف اسکے انسانی عروج کے لئے ہیں۔ اور جب وہ اپنی قوتوں کو اپنے عروج کیلئے استعمال کرے تو سب سے پہلا قدم اسے تفکر کی طرف لاتا ہے۔ اور پھر یہ دنیا ہی اسکے ماحول میں نہیں۔ سورج۔ چاند۔ ستارے۔ سمندر۔ آسمان۔ آسمان کی کیفیتیں اور یہ سب اشیاء لطیف حالتوں میں ہیں تو پھر انسان بھی ان پر کمند ڈالے ____ کیونکہ تفکر اسے ان اشیاء کی تحقیق وتجسس کی طرف بھی مائل کرتا ہے۔ اور اگر انسان کیلئے یہ راہیں تحقیق کی کشادہ ہیں تو انکے لئے تحقیق کا سامان ضرور میسر ہونا چاہیے۔

جہاں تک مادی کیفیات کا تعلق ہے۔ انسان میں لطیف قوتیں موجود ہیں جن سے سورج پر راکٹ پھینک رہا ہے۔ اور چاند میں زمین الاٹ کرنے کے ارادے کر چکا ہے۔ تو پھر آسمانوں کی طرف بھی رجوع ہو سکتا ہے۔ کہ انسان ایک وقت ایک کیمیائی گولی سے چار سیر یومیہ اناج سے فارغ رہ سکتا ہے۔ یہ قوت انسان میں۔ ہر انسان میں ابتداء سے موجود ہے۔ تو پھر ایک وقت وہ ایک ایٹمی قوت سے بغیر کھائے بھی زندگی گزار سکتا ہے۔ یہ زندگی ایٹمی ہوگی۔ تو یہ چیز بھی تو اس میں ابتدأ ودیعت ہے صرف وہ طریق حاصل کرنا ہے۔ جس سے وہ اس سکیم میں کامیاب ہو سکے۔ انسانی ساخت کو دیکھ کر یہ اندازہ لگانا مشکل نہیں کہ انسان میں خود ایک قوت موجود ہے۔ جو اسکی نشو وارتقا میں ادنیٰ شے سے ترقی کر کے ایک اعلیٰ ہیئت میں آجاتی ہے۔ انسانی غذا میں زمینی پیداوار نباتات ہو یا حیوانات ہر

شے انسان میں داخل ہوکر ایک ادنیٰ مقام سے انتہا درجہ کا مقام انسانی حاصل کر لیتی ہے۔گندم کی ایک روٹی معدہ میں جا کر تحلیل ہوجاتی ہے۔اور پھر یہی ٹھوس مادہ خون کی ہیئت میں آجاتا ہے۔یہی خون پھرانسان کا جوہر(منی) بن جاتا ہے۔جہاں انسان میں ایک ٹھوس مادی شے کو تحلیل کر کے جوہر کی ہیئت میں لانے کا سامان پایا جاتا ہے۔وہاں جوہر میں لطافت پیدا کرنے کا ذریعہ بھی ہوسکتا ہے۔اور جب یہ جوہر لطیف سے لطیف ہیئت میں لایا جائے تو انسان کا جسم اسی لطیف قوت سے نشوونما حاصل کرے گا جب اسکا وجود خود لطیف ہو جائے تو اسکے لئے ماوراءحواس قوتوں کا عکس حاصل کرنا اسی قوت کے ذریعہ آسان ہوسکتا ہے۔اس طرح کائنات ارض وسماوات کا علم حاصل کرنے کیلئے انسان کو وہ تمام مادی اور لطیف ذرائع حاصل ہوسکتے ہیں۔جن سے وہ کائنات اور اسکے خالق کی جستجو میں تفکر کر کے ہر کیفیت مادی وغیر مادی کا مشاہدہ کرسکتا ہے۔

جہاں تک مادی اور قریبی کیفیتوں کا تعلق ہے۔انسان کے پاس حواس۔ذہن۔موجود ہیں۔جہاں تک لطیف قوتوں کا تعلق ہے۔اسکے پاس لطیف وقوی دل کی لطیف قوتیں (روح جسمانی) موجود ہیں۔اور جہاں ماوراءادراک کیفیتیں پائی جاتی ہیں یہ عالم بھی لطیف خالص لطیف ہے۔اسکی کیفیت یہ ہے کہ یہ کیفیت موجود ہے۔لیکن اپنی غیر جسمانی ہیئت کے اعتبار سے مادیت سے پاک۔ماضی وحال ومستقبل کے احاطہ سے باہر ہے۔یعنی یہاں زمان ومقام کا کوئی تعین نہیں۔قریب بھی ہے۔دور بھی ہے۔نہ کل ہے۔نہ آج جہاں جاؤ جو کچھ محسوس کرو وہ حال بھی ہے ماضی بھی ہے مستقبل بھی لیکن اس عالم کی اصلی کیفیت محسوس نہیں کی جاسکتی۔لطیف ہونے کی وجہ سے اس کا حواس کے احاطہ میں آنا ناممکن ہے۔اور اپنی لطافت کے اعتبار سے یہ کیفیتیں اپنے میں لاانتہا وسعت رکھتی ہیں۔اسکے لئے وہ غیر مادی ذریعہ حاصل کرنا ضروری ہے۔جس سے ان کیفیات کو علم کے احاطہ میں لایا جائے۔اسکے لئے فطرت نے جس طرح مادی جسم میں ایک روح مقرر کی ہے۔اسی طرح غیر جسمانی کیفیات کے علم حاصل کرنے کیلئے اسی قسم کا ذریعہ بھی موجود رکھا ہے۔اسے بھی روح کے نام سے تعبیر دیا جاتا ہے۔اسکی کیفیت اسکی روحانی کیفیات سے ایتھری قوتوں سے کہیں زیادہ قوی اور وسیع

ہے۔اور اس کا ٹرانسمیٹر[1] بھی دل ہی ہے۔چونکہ انسان کیلئے تفکر ایک لازمی چیز ہے۔اسلئے ان کیفیات کیلئے جو اسکی ادراکی قوتوں کے احاطہ میں نہیں آسکتی گھر بیٹھے وہ اس روحِ لطیف سے علم حاصل کرسکتا ہے۔یہی روح ہے۔جو ماوراءِ ادراک یعنی حواس میں نہ آنے والی کیفیات کا احاطہ کر کے دل پر عکس پذیر ہوتی ہے یہی عکس خواہشات کی طرح واہمہ۔حافظہ تک پہنچتا ہے۔لیکن براہِ راست تعقل اس لطیف کیفیت کو محسوس کرنے کی تاب نہیں لاسکتا۔اسلئے جاگتی حالت میں بھی شعور ہی محسوس کرتا ہے۔محسوس کرنے کے ساتھ ساتھ حافظہ اس کیفیت کو اپنے خزانے میں محفوظ کرلیتا ہے۔محفوظ کرنے پر یہ کیفیت تعقل بھی پالیتا ہے۔یہ کیفیت جاگتی حالت میں ہوتی ہے۔اس میں غیر جسمانی عالم (عالم روحانی) کے مستقبل کے واقعات بھی ہوتے ہیں تو اسے کشف والہام سے تعبیر دیا جاتا ہے۔یہ کیفیتیں جب انسانی روح سے متصل ہوتی ہیں۔تو ان کیفیتوں کی قوت اس قدر تیز ہوتی ہے۔ کہ واہمہ ان کیفیتوں کو روشن حالتوں میں پالیتا ہے۔اسلئے ان کیفیتوں کے (واہمہ کی کمزوری کے باعث) غلط ہونے کا احتمال نہیں رہتا۔چونکہ ایسی کیفیتیں پیشتر حافظہ میں جمع نہیں ہوتی ہیں۔اسلئے ان کیفیتوں کی تصدیق کے لئے جمع شدہ خزانے سے مشابہت دینے کی نوبت نہیں پہنچتی اور یہ کیفیتیں براہِ راست شعور کے سامنے آجاتی ہیں۔اسوقت انسان یہ سمجھتا ہے۔کہ میں عالمِ روحانی کا مشاہدہ کر رہا ہوں۔اور اگر یہی کیفیت نیند کی حالت میں آجائے تو اس میں کچھ فرق نہیں ہوتا اور ایسی کیفیت کو خواب سے بھی تعبیر نہیں دیا جاتا۔ بلکہ اسے کشف والہام سے ہی تعبیر دیا جاتا ہے۔فرق صرف تعقل کے معطل ہونے کا ہوتا ہے۔جس سے نینداور بیداری محسوس کی جاتی ہے۔ویسے بھی ایسی کیفیتیں خواب اور بیداری میں شعور ہی محسوس کرتا ہے۔اور تعقل کے معطل ہونے پر انسان چونکہ نیند میں یہ واقعہ دیکھتا ہے۔اسلئے نیند کی حالت میں (خواب) دیکھنے سے تعبیر دیتا ہے۔خواب کے معنی عالمِ

---

[1] ٹرانسمیٹر سے مراد اس روح کا تعلق لطیف قلب سے ہے۔اور یہی دل اپنی لطافت کی وجہ سے اس روح پر جذب شدہ کیفیات سے عکس پذیر ہوتا ہے۔

بیداری کے واقعات کو نیند میں محسوس کرنے کے ہوتے ہیں اور نیند کو فارسی میں خواب کہتے ہیں۔ یہ بیداری اور نیند کے الفاظ کا فرق ہے۔ واقعات کے محسوس کرنے کا فرق نہیں ہوتا۔ اور یہ لفظ عجمی ملک خاص کر ہندوستان میں استعمال ہوتا ہے۔ اور عرب ممالک میں اسے رویاء کہتے ہیں رویاء ارَیٰ سے مشتق ہے۔ رَیٰ کے معنی دیکھا اس میں بیداری اور نیند کی تمیز نہیں۔ تمیز اگر ہے تو صرف انسان کی حالتِ بیداری اور نوم کی وہ اس وجہ سے کہ عام انسانوں کو جاگتی حالت میں ایسی کیفیات حاصل نہیں ہوتیں لیکن نیند کی حالت میں اکثر لوگوں کو بلا تمیز افعال و کردار حاصل ہوسکتی ہیں۔ یہی وجہ ہے۔ کہ جاگتی حالت میں واقعات کے حاصل نہ ہونے کی وجہ سے خواب کو اہمیت دی جاتی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ عالمِ خواب اور بیداری کی کیفیت میں کچھ فرق نہیں ہوتا۔ اگر فرق کیا جاتا ہے۔ تو وہ مختلف واقعات کو مختلف حالتوں اور صورتوں میں دیکھنے کی وجہ سے کیا جاتا ہے۔ یہ ایک فطری خاصہ ہے۔ کہ انسان جب جاگتا رہتا ہے۔ تو حواس خمسہ کے ذریعہ اسے کیفیات ہر وقت حاصل ہوتی رہتی ہیں۔ اور یہ کیفیات براہِ راست حافظہ میں آجاتی ہیں اور حافظہ میں آنے سے ہی تعقل آگاہ ہوتا ہے۔ جتنی دیر حواس کے ذریعہ واقعات حافظہ میں آتے رہیں حافظہ بھی فارغ نہیں رہتا اور تعقل بھی انہیں مشاہدات کی طرف مشغول رہتا ہے۔ اب اگر حواس کے ذریعہ واقعات و کیفیات حافظہ کو نہ ملیں۔ تو اسکا کام پھر بھی جاری رہتا ہے۔ یعنی حافظہ اپنے جمع شدہ واقعات پیش کرنے میں مصروف رہتا ہے۔ اسی حالت میں اگر تعقل پر نیند طاری ہوجائے۔ تو حافظہ کا یہ کام بند نہیں ہوتا بلکہ جاری رہتا ہے۔ گویا انسان کا ہر عضو فطری طور اپنا عمل جاری رکھتا ہے۔ خواہ آگے اسکی تکمیل ہو یا نہ ہو۔ مثال کے طور کھانا کھانے کے بعد خواہ بیداری ہو یا خواب (نیند) معدہ برابر اپنا کام (غذا تحلیل کرنے کا) جاری رکھتا ہے۔ خواہ آنتیں کام کریں یا نہ کریں معدہ اپنے وقت پر تحلیل شدہ غذا آنتوں کی طرف پھینکتا ہے۔ آگے آنتیں جانیں انکا کام جانے۔ اسی طرح اگر آنتیں درست ہوں تو یہ اپنا کام پورا کرتی ہیں۔ آگے گردہ جگر وغیرہ کام

---

1 عربی میں رءیٰ فی المنام یعنی دیکھنا نیند میں۔ کہتے ہیں۔

کر سکتے ہوں یا نہ۔ یہ ایک فطری عمل انسان کے وجود میں پایا جاتا ہے۔اسی طرح آنکھ ایک کیفیت کا عکس ہر حال میں Area of Sight تک پہنچاتی ہے آگے حصہ بصارت دماغی کام کرے یا نہ کرے۔لیکن حصہ بصارت حسب عادت واقعات واہمہ حافظہ تک پہنچاتا ہے۔یا یوں کہیے کہ واہمہ۔ حافظہ خود بخود اس کیفیت کو پالیتا ہے۔اسی طرح حافظہ واقعات کو ہر حال میں تعقل کے سامنے لاتا ہے۔تعقل کام کرے یا نہ کرے۔اور جب حواس سے کیفیات بند ہوں۔تو حافظہ اس حالت میں بھی اپنے جمع شدہ واقعات تعقل کے سامنے لاتا ہے۔خواہ تعقل بیدار ہو یا خُفتہ ہو۔ یہ کیفیتیں اگر عالمِ بیداری میں آئیں تو اسے خیالات کی رو میں بہنا کہا جاتا ہے۔اور اگر کسی وقت نیند کی حالت میں یہی کیفیتیں شعور کے سامنے آجائیں تو اسے خیالی خواب سے تعبیر دیا جاتا ہے۔اور یہ امر واقع ہے۔کہ خواب کی حالت میں تعقل خفتہ ہوتا ہے۔اور شعور بیدار ہوتا ہے۔تو ایسی خوابوں کی حالت کا علم انسان کو نہیں ہوتا۔ایسی حالت میں اگر تمام رات حافظہ اپنے جمع شدہ واقعات پیش کرتا رہے اور تعقل خفتہ رہے اور شعور مشاہدہ کرتا رہے۔تو انسان کی تمام رات خواب دیکھنے میں گزر جاتی ہے۔اور اس حالت میں انسان اپنے خوابوں سے بے خبر رہے گا۔اس سے ثابت ہوتا ہے۔کہ انسان ایک خواب کو خواب کی حالت میں محسوس کرنے کے علاوہ ساری رات خواب ہی دیکھتا رہتا ہے۔لیکن اسے صرف تھوڑا حصہ خواب محسوس ہوگا باقی حصہ اس کے علم میں نہ آئے گا ـــــ اسکی کیا وجہ ہے۔کہ انسان باوجود تمام رات خواب (خواب دیکھنے) کی حالت میں گزارتا ہے لیکن اسے علم نہیں ہوتا؟ ـــــ اسکی وجہ یہ ہے۔کہ انسان کے وجود میں ماسوائے تعقل کی حکمرانی کے ایک مستقل قوتِ دفاع کا مادہ موجود ہے۔ اور خواب بھی اِسی قوتِ دفاع کے اثر سے دیکھا جاتا ہے۔مثال کے طور پر اگر ایک شخص کے زخم لگ جاتا ہے۔تو اگر انسان اس زخم کو بیرونی مضر جراثیم سے محفوظ رکھ سکے اور کوئی دوا استعمال نہ کرے تو یہ زخم اندرونی قوتِ دفاع (قوت تخلیق) کے ذریعہ خود بخود بھر جائے گا اور زخم درست ہو جائے گا۔ یعنی جس طرح خون کے ذرات انسان کے گوشت پوست۔ہڈیوں۔بال۔ناخنوں اور ہر اعضاء میں بناوٹ پیدا کرتے ہیں۔اسی طرح زخم پر بھی خراب ہوئی ہوئی جگہ کی بناوٹ دوبارہ کر کے پوری

کرتے ہیں یہی قوت قوتِ دفاع کہلاتی ہے۔ اسکی دوسری مثال یہ ہے۔ کہ اگر انسان پر اچانک ایک وزنی پتھر گرے اور آنکھ نے دیکھ لیا تو انسان اضطراری حالت میں غیر ارادی طور فوراً ہاتھ اوپر اٹھا کر پتھر کو ہاتھوں پر سنبھالنے کی کرتا ہے۔ لیکن پتھر ایک من یا دو من کا ہوتا ہے۔ غیر اضطراری حالت میں انسان یہ اندازہ کر سکتا ہے۔ کہ یہ پتھر میرے بازوؤں کی قوت سے زائد ہے۔ لہٰذا وہ سرک جاتا ہے۔ مگر اچانک مجبوری کی حالت میں وہ خواہ مخواہ ہاتھ ہی اٹھاتا ہے۔ یہ غیر ارادی حرکت قوتِ دفاع کے تحت ہی واقع ہوتی ہے۔ جو سوچے سمجھے بغیر ہوتی ہے۔ دوسری مثال ایک شخص کی لات میں اچانک حادثہ ہوتا ہے۔ تو انسان فوراً اس جگہ کو دیکھنے کی کوشش کرتا ہے۔ اس کا فوری طور دیکھنا قوتِ دفاع[1] کے تحت ہی ہوتا ہے۔ کہ حادثہ کو معلوم کر کے اس کا دفاع کیا جائے جب تک انسان جاگتا ہے۔ تو (تعقل اور حافظہ کے ذریعہ اگر حادثہ میں مجبوری ہو) اسکا تعقل و حافظہ شدید حادثہ کی صورت میں فوری طور علاج کی صورت پیش نہیں کر سکتا۔ اسلئے تعقل یا تو جلدی میں کوئی حرکت دے بیٹھتا ہے۔ لیکن یہ حرکت اضطراری ہوتی ہے۔ اسلئے ایسی حرکت میں کبھی بجائے نفع کے نقصان بھی ہو جاتا ہے۔ کیونکہ حافظہ جلدی میں صحیح تدبیرِ علاج کی کیفیت تعقل کو پیش نہیں کر سکتا۔ اسلئے غیر ارادی طور

---

[1] دراصل حواس خمسہ۔ اور دماغی قوتیں (حصہ بصارت۔ حصہ حرکت۔ واہمہ۔ حافظہ۔ عقل و شعور) اور قوتِ دفاع کا عمل ایک طرف حصولِ سامانِ زندگی کے لئے ہوتا ہے۔ کہ انسان آسانی سے اپنا سامان زندگی حاصل کرے۔ اور علم سے اپنے حصول میں آسانی پیدا کرے۔ دوسری طرف ان قوتوں سے انسانی حفاظت کا عمل بھی ہوتا ہے۔ کہ انسان ان قوتوں سے جسم پر کسی قسم کی ضرر رسانی سے اپنے آپ کو محفوظ رکھ سکے۔ چنانچہ حصولِ سامانِ زندگی کے ساتھ ساتھ انسان کو اپنی جسمانی حفاظت کا ہر لحہ احساس رہتا ہے۔ اسی احساسِ حفاظت خود اختیاری کے تابع ہر لحہ انسان اپنی جسمانی حفاظت کا شدید خیال رکھتا ہے۔ یہ کیفیت ہر جاندار میں پائی جاتی ہے۔ مثال کے طور ایک کتے کو دیکھا جائے۔ کہ نیند کی حالت میں کتا لاتیں ہلاتا اور بھونکتا رہتا ہے۔ اسکی وجہ یہ ہے۔ کہ کتے کو اپنی جسمانی حفاظت کا ہر وقت احساس رہتا ہے۔ جاگتی حالت میں کتا۔ کسی آدمی یا گیدڑ یا کسی درندے کو دیکھ کر بھونکنا شروع کر دیتا ہے۔ اسکے بھونکنے سے مراد یہ ہے۔ کہ وہ صرف مکان یا مالک کی رکھوالی نہیں کرتا۔ بلکہ اسے اپنی جان کا خوف پیدا ہوتا ہے۔ (باقی حاشیہ اگلے صفحہ پر)

عقل صرف دفاع کے تحت حرکت کر بیٹھتا ہے تو یہ کیفیت ایسی ہوتی ہے۔ جیسے ایک بچہ بغیر سوچے سمجھے کوئی حرکت کر بیٹھتا ہے۔ جو نقصان دہ ہوتی ہے۔ اور اگر حادثہ اس قدر شدید ہو کہ اس میں تعقل کی حرکت سے ہلاکت کا احتمال ہو۔ تعقل کوئی حرکت دینے سے مجبور ہوتا ہے۔ اور آدمی شدّتِ درد سے بے ہوش ہو جاتا ہے۔ اسکی بے ہوشی کا سبب اول تو یہ ہوتا ہے۔ کہ تعقل حافظہ کی راہنمائی کے بغیر دفاع کے لئے عاجز ہوتا ہے۔ دوسرے وجود میں شدید انقلاب کے باعث نظام تخلیق میں فرق آ جاتا ہے۔

(بقیہ حاشیہ گزشتہ صفحہ) کہ آدمی۔ یا درندہ اسے ہلاک نہ کر ڈالے۔ یعنی وہ اپنی جان کی حفاظت کا فطری طور احساس کرتا ہے۔ اور اسکا بھونکنا اپنی حفاظت اور درندہ سے مقابلہ کرنے کیلئے ہوتا ہے۔ جس سے مالک کی رکھوالی کا کام بھی ہو جاتا ہے۔ اسی طرح جب کتا تھک کر سو جاتا ہے۔ تو اسے اپنی حفاظت کا شدت سے احساس پیدا ہوتا ہے۔ یہ اس لئے۔ کہ حواس خمسہ میں آنکھ دشمن کو دیکھنے سے محروم ہو جاتی ہے۔ اور کتا دشمن کو دیکھ نہیں سکتا کہ کب اس پر وار کرے۔ ادھر عقل معطل ہو جاتی ہے۔ تو کتا حرکت سے محروم ہو جاتا ہے۔ اور دشمن سے مقابلہ کرنے کی قوت سے عاری ہو جاتا ہے۔ تو اس پر اپنی حفاظت میں مجبوری سے خوف طاری ہو جاتا ہے۔ لیکن نیند کی حالت میں بھی وہ اپنی حفاظت چاہتا ہے تو اسکی روح جسمانی اور قوتِ دفاع برسرِ عمل ہو جاتی ہے۔ اسی قوتِ دفاع کی تحریک سے کتا نیند میں خواب دیکھتا ہے۔ کہ شیر یا آدمی یا کوئی درندہ اسے نیند میں نظر آتا ہے۔ اور مثل جاگتی حالت کے وہ اپنی حفاظت کیلئے بھونکتا اور خواب میں چکر کاٹتا یا بھاگتا ہے۔ اسی تاثر کو نیند کی حالت میں کتے کے بھونکنے اور لاتیں ہلانے سے محسوس کیا جاتا ہے۔ یہی کیفیت انسان کی ہے۔ کیونکہ زمانہ میں حادثات رونما ہوتے رہتے ہیں۔ آندھی آتی ہے۔ زلزلہ ہوتا ہے۔ اچانک مکان گر جاتا ہے۔ یا کوئی دشمن حملہ آور ہوتا ہے۔ ایسے حادثات کے تاثرات انسان کے ذہن میں جمع رہتے ہیں۔ انہیں تاثرات کی بنا پر انسان ہر لحہ اپنی حفاظت چاہتا ہے۔ جاگتی حالت میں وہ بھی آنکھ اور عقل سے اپنی حفاظت کر سکتا ہے۔ لیکن نیند کی حالت میں انسان بھی آنکھ اور عقل کی بے بسی کو محسوس کر کے اپنی حفاظت کا احساس کرتا ہے۔ اسی احساس کے ساتھ وہ سو جاتا ہے۔ نیند طاری ہونے کے ساتھ ہی اسکی قوتِ دفاع (جو جاگتی حالت میں آنکھ اور عقل کی مدد سے اپنی حفاظت میں برسرِ عمل رہتی ہے) متحرک ہو جاتی ہے۔ اور جہاں انسانی جسم پر کوئی بیرونی اثر ایسا آئے جس سے جسم کو نقصان پہنچنے کا خدشہ ہو۔ قوتِ دفاع اس نقصان کے دفعیہ کے لئے کام کرتی ہے۔ یعنی انسان نیند کی حالت میں اپنی حفاظت کا عمل شروع کرتا ہے۔ وہ اسی طرح کہ اگر جسم پر آگ کی شدّت ہو۔ تو قوتِ (باقی حاشیہ اگلے صفحہ پر)

اسکا اثر یا تو قلب پر آجاتا ہے تو بعض حالتوں میں حرکتِ قلب بند ہو کر انسان مر جاتا ہے۔ اگر قلب میں قوت برداشت ہو اور دوران خون کو اس حالت میں بھی سنبھال سکے۔ تو اسکا اثر دماغ پر آجاتا ہے۔ تو دماغ بے قابو ہو کر کام کرنے سے رہ جاتا ہے۔ اور بے ہوش ہو جاتا ہے۔ اسکی بے ہوشی بھی ایک فطری قوتِ دفاع کے تحت ہوتی ہے۔ کہ وجود تعقل کی حکمرانی سے آزاد ہوتا ہے۔ اور فطری قوتِ دفاع خود بخود تخلیقی کام میں شدت سے برسرِ عمل ہو جاتی ہے۔ اور جسوقت قوتِ دفاع کے ذرات جائے وقوع کے انقلاب پر قابو پا لیتے ہیں تو تعقل کیلئے راستہ صاف ہو جاتا ہے۔ تو اسے خود بخود ہوش آجاتا ہے۔

یہی کیفیت خواب سے متعلق ہوتی ہے۔ اور اسی کیفیت کے تحت خواب دیکھا جاتا ہے۔

(بقیہ حاشیہ گزشتہ صفحہ) لامسہ واہمہ کو مطلع کرتی ہے۔ واہمہ حافظہ کو اور حافظہ عقل کو۔ مگر عقل خفتہ ہے۔ اور حصہ حرکت۔ حرکت کا کام نہیں کرتا۔ تو قوتِ دفاع روح حیوانی کے ذریعہ جسم کے متاثرہ حصہ پر نظر ڈالتی ہے۔ تو روحانی طور پر انسان کیفیت کا مشاہدہ کرتا ہے۔ قوتِ دفاع۔ یا روحِ حیوانی کا مشاہدہ قلب کی آنکھ کے ذریعہ ہوتا ہے۔ کہ مثل آنکھ جائے حادثہ کا عکس روح کے ذریعہ مثل آئینہ کے آجاتا ہے۔ یہ عکس واہمہ پر آجاتا ہے۔ واہمہ سے حافظہ پر آجاتا ہے۔ اور عقل کے معطل ہونے پر شعور اس کیفیت کو حاصل کر کے اصل واقعہ کا ادراک کر لیتا ہے۔ تو انسان نیند کی حالت میں آنکھ کی جگہ دل (روح) سے کام لے کر حادثہ سے آگاہ ہو جاتا ہے۔ اسکے ساتھ ہی قوتِ دفاع کے اثر سے۔ نقصان سے بچنے کیلئے۔ دلی ارادہ کے ساتھ حرکت کرنا چاہتا ہے۔ مگر حرکت عقل کے زیرِ اثر ہے۔ عقل معطل ہے۔ اسلئے ہاتھ ہلانے سے معذور رہتا ہے۔ اسکی معذوری کا تاثر ہی اس کیفیت کو خواب کی شکل دیتا ہے۔ اگر نقصان کا اثر معمولی ہو اور نیند ہلکی ہو تو انسان تکلیف کے اثر سے جاگ جاتا ہے یا نیند میں ہی بلا ارادہ ہاتھ سے جگہ کو مَسل دیتا ہے۔ اگر تکلیف میں شدت ہو اور نیند ہلکی ہو تو بوجہ معذوری کے عقل بیدار ہو جاتی ہے اور انسان جاگ جاتا ہے۔ اور اگر نیند گہری ہو تو انسان حرکت سے مجبور ہوتا ہے۔ تو یہ کیفیت جب شعور تک پہنچتی ہے تو مکمل خواب کی کیفیت طاری ہوتی ہے۔ یہ کیفیت خواب۔ حیوان (کتے) کے خواب جیسی ہوتی ہے۔ کہ وہ بھونکتا ہے۔ اور انسان خواب کی حالت میں۔ اگر کمزور دل ہو تو کوئی خوفناک شکل حافظہ سے ابھر کر شعور کے سامنے آتی ہے تو۔ شعور یہ دیکھتا ہے کہ سانپ نے کاٹا تو انسان نیند میں سانپ کے کاٹنے کو محسوس کرتا ہے یا دیکھتا ہے اور نیند ہی میں سانپ کو مارتا ہے یا بھاگتا ہے۔ تو اس سے ظاہر ہے کہ نیند کی حالت میں۔ خواب پیدا کرنے والی قوت ــــ قوتِ دفاع ہوتی ہے۔

خواب کی حالت میں انسان تعقل کی حکمرانی اور حفاظت سے محروم ہوتا ہے۔ایسی حالت میں قوتِ دفاع خود بخود برسر عمل ہو جاتی ہے۔مثال کے طور اگر نیند کی حالت میں منہ پر مکھیاں بیٹھتی ہیں۔تو انسان ہاتھ سے اڑاتا ہے۔لیکن نیند میں ہوتا ہے۔یہ قوتِ دفاع کے ذریعہ غیرارادی طور پر ہو جاتا ہے۔یا اگر کبھی بدن پر کھجلی آتی ہے۔تو نیند میں کھجاتا ہے۔یا ایک طرف تھک جانے سے کروٹ لے لیتا ہے وغیرہ اگر اس حالت سے زیادہ گہری نیند طاری ہو تو نیند میں بجائے ہاتھ ہلانے کے منہ ہی ہلاتا ہے۔کبھی ناک ہلاتا ہے۔کبھی ہونٹ ہلاتا ہے۔اسوقت ہاتھ میں حرکت نہیں رہتی نیند غالب رہتی ہے۔مگر قوتِ دفاع کے ذریعہ ناک ہونٹ ہلانے پر قادر ہو جاتا ہے۔اسی طرح اگر خواب میں بستر میں گرمی پیدا ہو جائے۔تو بدن گرم ہونے سے اعصاب[1] میں گرمی پہنچتی ہے۔تو اعصاب میں گرمی پہنچنے سے شہوت (قوت حیوانیت) میں جوش آ جاتا ہے۔جب اعصابی کیفیات دماغ سے گزرنے لگتی ہیں۔تو انسان اسی قوتِ دفاع کے تحت یکلخت ایک کیفیت دیکھنے لگ جاتا ہے۔تو جیسی خواہش اسکے دل میں ہوتی ہے وہی نقشہ حافظہ میں آ جاتا ہے۔اور قوتِ دفاع کے تحت ہی شعور حافظہ کی طرف متوجہ ہو جاتا ہے۔شعور کے متوجہ ہونے کا سبب یہ ہے۔کہ یہ بھی حسِ مشترک کا ایک حصہ (تعقل کے ساتھ کا) ہے۔بس یہ کیفیت خواب کی کیفیت پیدا کرتی ہے۔گویا جو کیفیت قوتِ دفاع کے اثر میں آ جائے۔وہ کیفیت شعور دیکھتا ہے تو خواب بن جاتا ہے۔اسے نفسانی خواہشات کا خواب کہا جاتا ہے۔اگر یہی کیفیت جاگتی حالت میں آ جائے تو اسکی صورت یہ ہوتی ہے کہ قوتِ دفاع برسر عمل نہیں ہوتی ہے۔کیونکہ اسوقت تعقل خود کنٹرول کئے ہوئے ہوتا ہے۔اور انسان کے وجود میں خواہشات ابھرتی ہیں حافظہ میں آتی ہیں اور اسوقت یہ کیفیت تعقل کے کنٹرول کی وجہ سے خود بخود ختم ہو جاتی ہے۔البتہ اگر جذبات کے ابھرنے کے ساتھ دِل کی کوئی نفسانی خواہش ابھر آئے۔تو وہ بھی (نیند کی طرح) حافظہ تک آتی ہے۔لیکن تعقل کے بیدار ہونے کی وجہ سے اسکی تکمیل نہیں ہوتی اور یہ

---

[1] بعض حالتوں میں یہ ایک کمزور انسان کی حالت ہوتی ہے۔

کیفیت بھی اپنی غیر مادی ہیٔت میں سامنے آ جاتی ہے۔مگر تعقل کی بیداری کی وجہ سے (خواب کی کیفیت جیسی) محسوس نہیں کی جاتی۔دوسری مثال۔

ایک شخص کے پاؤں پر کوئی چیز کاٹتی ہے۔تو حِس لامسہ [1] حافظہ تک یہ کیفیت پہنچاتی ہے۔ حافظہ تعقل تک پہنچاتا ہے۔تعقل آنکھ کو حرکت میں لاتا ہے۔آنکھ دیکھتی ہے۔پھر کیفیت کو حافظہ تک پہنچاتی ہے۔حافظہ تعقل تک پہنچاتا ہے۔تعقل ہاتھ کو دفاع کے لئے حرکت دیتا ہے۔بس قصہ ختم ــــــ یہ چیز آسانی سے علم کے احاطہ میں آتی ہے۔اسلئے اسکا فوری دفاع بھی ہو جاتا ہے۔لیکن نیند کی حالت میں جب حِسِ لامسہ کیفیت کو حافظہ تک پہنچاتی ہے۔تو تعقل خفتہ ہوتا ہے۔نہ تعقل آنکھ کو حرکت دے سکتا ہے۔نہ کیفیت علم میں آتی ہے۔اسوقت فطری طور دفاع کی ضرورت پیدا ہوتی ہے۔اسلئے قوتِ دفاع خود بخود حرکت میں آ جاتی ہے۔نیم خفتہ حالت میں غیر ارادی طور یا تو ہاتھ جگہ پر پہنچتا ہے۔اگر نیند گہری ہو اور آنکھ جگہ کا علم نہ پہنچائے تو قوتِ دفاع میں حرکت پیدا ہوتی ہے۔تو جس طرح دل جاگتی حالت میں آفت کو ٹالنے کے لئے خواہش کرتا ہے۔اسی طرح نیند میں بھی کرتا ہے۔یہاں جب پاؤں پر کاٹنے کی کیفیت حافظہ میں پہنچتی ہے۔تو اسے دوبارہ واقعہ کی اصلی ہیٔت سے علم حاصل کرنے کی ضرورت ہوتی ہے کیونکہ نیند میں ارادہ کام نہیں کرتا۔کہ تعقل کے ذریعہ آنکھ میں حرکت دی جائے۔ اسلئے انسانی خواص علم حاصل کرنے میں مجبور ہوتے ہیں۔ایسی حالت میں یہ کیفیت خواب کی صورت اختیار کر لیتی ہے۔تو اگر کاٹنا شدید ہو۔اور اسکے دفعیہ کی ضرورت محسوس ہو تو اس کیفیت کو پانے کیلئے دل ہی کام کرتا ہے۔دل میں روح رحمانی اپنی لطافت کے ذریعہ ٹیلی ویژن کا کام کرتی ہے۔تو یہ عکس

---

[1] یہاں یہ چیز لازمی ہے۔کہ بدن پر مجبوری کی حالت میں آفت آنے پر دل کی خواہش بھی کام کرنے لگ جاتی ہے۔اسکی یہ خواہش پیدا ہوتی ہے۔کہ آفت کو جگہ سے ٹالا جائے۔یہاں تحریک کا کام دل (کی خواہش) سے بھی ہوتا ہے۔اس سے معلوم ہوتا ہے کہ کیفیات کے واقع ہونے میں دل بھی کام کرتا ہے۔مثال کے طور اگر کسی شخص کا ہاتھ کسی چیز میں پھنس جائے۔تو دل میں خواہش پیدا ہوتی ہے۔کہ ہاتھ آفت سے نکل جائے۔اسی طرح نیند میں بھی یہ کیفیت واقع ہوگی۔

دل پر آ جاتا ہے۔ یہاں سے خواہش کی طرح یہ کیفیت حافظہ میں جاتی ہے۔ اور حافظہ میں قوتِ دفاع کے تحت شعور مشاہدہ کرتا ہے۔ اگر آدمی صحت مند کلی طور پر ہوتو واقعہ بعینہٖ نظر آتا ہے کہ کیا چیز کاٹنے والی ہے۔ اگر دماغ کمزور ہو اور دل بھی کمزور ہو۔ تو یہاں کیفیت دل کے تاثرات کے مطابق بن جاتی ہے۔ اگر دل کمزوری میں خوف محسوس کرے تو یہ خوفناک چیز محسوس ہوتی ہے۔ اسکے ساتھ ہی صحت مند قلب کی طرح ہر انسان قلب سے کیفیت کونہیں دیکھتا۔ صرف واقعہ کا اثر قلب پر پڑنے سے قوتِ دفاع متحرک ہو جاتی ہے۔ اسوقت اگر روح حیوانی کے ذریعہ واقعہ قلب کو حاصل نہ ہو۔ حسِ لامسہ کی آمدہ (کاٹنے کی) کیفیت واہمہ۔ حافظہ تک آجاتی ہے۔ اور واہمہ۔ حافظہ اسے اسی خوفناک ہیئت میں ہی (باوجودیکہ واہمہ۔ حافظہ کاٹنے کی کیفیت سے واقف ہوتا ہے) اخذ کرتا ہے۔ تو یہی کیفیت شعور کے سامنے خوفناک خواب کی صورت میں آجاتی ہے۔ اگر خوف نہ پیدا ہوتو قوت دفاع متحرک نہیں ہوتی اسلئے یہ کیفیت خواب کی صورت اختیار نہیں کرتی اس حالت میں حواس اور دل یہ کیفیت شعور تک پہنچائیں اور ایک معمولی حالت میں اسے دیکھا بھی جائے تو اسکی وقعت نہ ہونے کے باعث یہ کیفیت محو ہو جاتی ہے اور خواب کا علم قطعاً رہتا ہی نہیں۔ اگر اس میں کچھ قوی اثر ہوتو یہ خواب ''خواب'' کی حالت پیدا کر کے یا تو بیدار ہونے تک حافظہ میں جمع رہے گی۔ یا قوتِ دفاع کی شدید حرکت سے تعقل جاگ کر آ گا ہی اور فوری دفعیہ کا عمل کرتا ہے۔ کیونکہ تعقل کے خفتہ ہونے کی صورت میں اکثر اعضاء بے بس ہوتے ہیں۔ اور جب اعضاء کو بیرونی امداد کی اشد ضرورت ہوتو قوتِ دفاع کے انتہائی عمل سے تعقل جاگ کر اپنا بیرونی عمل شروع کرتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ انسان کے اکثر خواب باوجود ساری رات دیکھنے کے علم میں نہیں آتے کیونکہ اس میں قوتِ دفاع متحرک نہیں ہوتی اور وہی خواب نظر آتا ہے۔ جس میں قوتِ دفاع شدت سے برسرِ عمل ہوتی ہے۔ اور خواب کا دیکھنا بھی قوت دفاع کی شدت پر ہی منحصر ہوتا ہے۔

اس میں غور طلب یہ امر بھی ہے۔ کہ خواب یا کشف کے مشاہدات کا انحصار انسان کے قلب و روح اور دماغ کی قوت پر ہی ہوتا ہے۔ اگر ایک شخص کا قلب لطیف ہو اور دماغ قوی ہوتو اسکے خواب اور جاگتی حالت کے مشاہدات میں کوئی فرق نہیں رہتا۔ اور خواب کی حالت میں اسے قوتِ

دفاع کی تحریک کی ضرورت نہیں رہتی۔ کیونکہ اپنی لطافت کے اعتبار سے انسان روح حیوانی کی لطافت اور قلب و دماغ کی قوی قوت کے ذریعہ اسی طرح واقعات کا علم حاصل کرتا ہے۔ جس طرح بیداری میں۔ فرق خواب اور بیداری میں یہ ہوتا ہے۔ کہ بیداری میں آنکھ (حواس) دماغ (واہمہ۔ حافظہ۔ تعقل) علم حاصل کرنے پر قادر ہوتا ہے۔ اور خواب کی حالت میں انسان تعقل کی خفتگی کی وجہ سے حرکت اور حواس استعمال کرنے سے عاجز ہوتا ہے۔ تو یہ کمی روح حیوانی۔ قلب اور شعور پوری کرتے ہیں۔ اور انسان کیفیت کو حقیقی حالت میں حاصل کرنے میں عاری نہیں ہوتا۔ اور اس پر دل کی کوئی کمزور کیفیت خوف وغیرہ طاری نہیں ہوتے۔ اسلئے اسکے خوابوں میں نیند کی حالت میں حافظہ کی ترتیب (Setting) صحیح ہوتی ہے۔ اور حافظہ نیند کی حالت میں کوئی واقعہ پیش نہیں کرتا بلکہ ساکن بھی رہتا ہے۔ اگر کیفیت لائے بھی تو وہ کیفیت اسی طرح ہوتی ہے۔ جس طرح جاگتی حالت میں دل کے ذریعہ کیفیت حافظہ میں آتی ہے۔ گویا ساکن رہنے کی صورت میں ایک لطیف دل و دماغ رکھنے والا آدمی ساری رات خواب کی کیفیت حاصل نہیں کرتا بلکہ اسی وقت حاصل کرتا ہے۔ جب دل کے ذریعہ کوئی کیفیت حافظہ میں آئے۔ اور شعور اسے حاصل کرلے۔ گویا تمام رات خواب کی سی کیفیات کا پایا جانا حافظہ کی عدم ترتیب یا کمزوری کی بنا پر ہوتا ہے۔ کہ حافظہ صحیح کام نہیں کرتا یا پختہ نہیں ہوتا ہے یعنی حافظہ اپنے جمع شدہ واقعات کو ترتیب (Setting) میں نہیں رکھ سکتا ہے۔ اور واقعات کا دورہ بلا ارادہ چلتا رہتا ہے۔ اور ایک صحت مند حافظہ میں واقعات مترتب (Set) ہوتے ہیں۔ اور انکا دور ہر وقت نہیں چلتا۔ یہاں حافظہ کی صحت و کمزوری کا سبب انسانی کردار ہوتا ہے۔ اگر انسان صحیح قانون فطرت (یا دین) کے مطابق عمل کرتا ہو تو اسکا وجود خصوصاً دل و دماغ تندرست ہوتے ہیں۔ اور ایک کمزور شخص میں فطرت کی خلاف ورزی کمزوری پیدا کر کے دل و دماغ کی لطافت اور صحت کو کم کر دیتی ہے۔ گویا خواب اور بیداری کی حالتوں میں جب تک انسان علم حاصل کرنے کے ساتھ ساتھ جسمانی نظام کی خبر گیری اور حفاظت پر پوری طرح قادر ہو۔ تو انسان کو کسی مشاہدہ کی ضرورت نہیں رہتی۔ اور جب وہ کسی علم کو حاصل کرنے کیلئے اپنے حواس سے کام لینے میں عاجز ہو۔ اس وقت انسان کی روح

حیوانی اگر اپنی سالم ہیئت میں ہو(قوتِ دفاع کی تحریک سے) ماورائے حواس علم حاصل کر کے شعور تک پہنچاتی ہے۔اور یہی کیفیت اسی طرح جب انسانی حرکت وعمل سے بھی عاری ہو اسی قوتِ دفاع کی تحریک سے بیداری کی سی حالت میں روح حیوانی۔قلب۔واہمہ۔حافظہ اور شعور کے ذریعہ خود بخود حاصل کر لیتی ہے۔اور اس تمام واقع سے دراصل انسانی جسم کی محافظت کے ساتھ اس عالمِ بیخودی میں بیرونی ماحول سے واقفیت مقصود ہوتی ہے۔یہی تاثر (جسمانی نظام کی حفاظت اور حصول علم) مشاہدہ اور خواب کی کیفیت پیدا کرنے کا اصلی سبب ہوتا ہے۔

سوال پیدا ہوتا ہے۔کہ ہر انسان میں روح جسمانی پائی جاتی ہے۔اگر ایک شخص خواب میں ایک کیفیت روح جسمانی کے ذریعہ دیکھتا ہے۔تو اسے بیداری کی حالت میں بھی دیکھنا چاہئے حالانکہ بیداری میں خواب کے واقعات دیکھنے میں نہیں آتے ہیں۔کیونکہ خواب اور بیداری کے دیکھنے میں کوئی فرق نہیں۔فرق ہے تو انسانی کیفیت خواب اور بیداری میں ہے؟اس سوال کے جواب کیلئے ہمیں دیکھنا ہے۔کہ جب روحِ جسمانی سے کیفیات شعور تک پہنچتی ہیں۔تو اسوقت تعقل وشعور کی کیا حالت ہوتی ہے۔نیز نیند اور بیداری کی حالت میں شعور وتعقل کے افعال میں کچھ فرق ہوتا ہے یا نہیں؟اور جاگتی حالت میں اگر شعور کیفیات محسوس نہیں کرتا تو اسکی وجہ کیا ہے؟

پیشتر بیان ہو چکا ہے کہ دماغ کے حصص پانچ ہیں۔جن میں (۱)حصۂ بصارت ۔(۲)حصۂ حرکت ۔(۳) واہمہ۔(۴) حافظہ۔(۵) حسِ مشترک۔حسِ مشترک کے بھی دو جُز ہیں (ا) تعقل (ب) شعور۔عقل دماغ کا پانچواں حصہ ہے جسکے ان دو اجزاء (تعقل وشعور) کا فعل مشترک ہے یعنی یہ ایک ہی جُز کے دو نام ہیں۔ان میں تعقل کا کیا کام ہے۔اور شعور کا کیا کام ہے؟ پیشتر بیان ہو چکا ہے۔کہ تعقل حواس خمسہ کے ذریعہ حاصل کئے ہوئے علم کی آگاہی کا آلہ ہے۔یعنی تعقل ہی علم کی آگاہی کی تکمیل کرتا ہے۔اسکے علاوہ۔تعقل حکمران حصہ ہے۔یہ حصۂ حرکت کے ذریعہ تمام جسم کا کنٹرول (قابو) کرتا ہے۔یعنی اسکے حکم کے بغیر جسم کا کوئی حصہ نہ حرکت میں آسکتا ہے۔نہ اس سے کسی ارادے اور فعل کی تکمیل ہوسکتی ہے۔اور جب تک انسان جاگتا رہتا ہے۔تعقل انسان

کے کسی حصہ کو آزاد نہیں چھوڑ سکتا۔ مثال کے طور پر۔ انسان کی حرکت کا عمل انسان کے ارادے سے ہوتا ہے۔ جب انسان کوئی کام کرنا چاہتا ہے۔ تو وہ کام پہلے دل کے ارادے سے پیدا ہوتا ہے۔ دل چاہتا ہے کہ میں پلاؤ کھاؤں تو یہ ارادہ براہِ راست حافظہ میں آجاتا ہے۔ تعقل حافظہ سے عکس لیتا ہے۔ تو تعقل اسکے حصول کیلئے انسانی جسم میں حرکت دیتا ہے۔ لیکن یہ دیکھنا ہے۔ کہ آیا تعقل دل کی خواہش کے تابع ہوتا ہے۔ کہ ارادہ ہوا۔ اور تعقل نے حکم دیا! نہیں یہاں جس وقت حافظہ میں پلاؤ کا نقش پیدا ہوتا ہے۔ تو اسوقت پلاؤ کے لوازمات یعنی اسکی لذت۔ اسکا مرکب۔ اسکی مضرت تمام کیفیتیں تعقل کے سامنے آجاتی ہیں۔ لذت اور فائدہ کے ساتھ انسان پر لذت اور فائدے کے اثرات بھی آجاتے ہیں۔ اور دوسری طرف اسکی غذائیت اور اسکے اثرات بھی سامنے آجاتے ہیں۔ اگر پلاؤ انسانی وجود کے لئے فائدہ مند ہو تو تعقل پلاؤ کے حصول کیلئے جسم میں حرکت پیدا کرتا ہے۔ اگر انسان بیمار ہو اور پلاؤ اسکے لئے مضر ہو۔ تو یہ خواہش حافظہ میں ہی رہ جاتی ہے۔ اور تعقل جسم کو حرکت نہیں دیتا۔ یہی کیفیت انسان کو عام حیوانوں سے ممتاز کرتی ہے۔ اسی کیفیت کو علامہ اقبال نے اپنے ایک شعر میں ظاہر کیا ہے۔

اچھا ہے دل کے ساتھ رہے پاسبانِ عقل
لیکن کبھی کبھی اسے تنہا بھی چھوڑ دے

اگر حافظہ ہر نفع ونقصان میں تمیز نہ کر سکے۔ اور تعقل انسانی جسم پر کنٹرول نہ کر سکے تو انسان اکثر اپنی خواہشاتِ نفسانی کی تکمیل میں نفع ونقصان میں تمیز نہ کرنے کے باعث نقصان اٹھاتا رہے گا۔ ایسی حالت میں تعقل کی یہ کیفیت ہوتی ہے۔ کہ یہ جابر حکمران کی طرح اپنا حکم جاری کرنے پر شدت سے کاربند رہتا ہے۔ اور شعور سے لے کر جسم کے ایک ذرہ تک کو اپنے قبضہ میں پابند رکھتا ہے۔ اور جاگتی حالت میں یہ جسم کا تمام نظام اپنے قبضہ میں رکھتا ہے۔ ایک خصوصی کیفیت بھی غور طلب ہے۔ وہ یہ کہ جسوقت دل کی خواہش حافظہ پر آجاتی ہے۔ تو حافظہ میں اس خواہش کے تمام لوازمات (یا اجزا) شامل ہوتے ہیں۔ تو ان اجزا میں نفع یا نقصان کے تاثرات بھی شامل ہوتے ہیں۔ گویا حافظہ ہی تعقل کو نفع ونقصان پر عمل کرنے نہ کرنے کی تحریک پیش کرتا ہے۔ مثال کے طور دل سے خواہش اٹھتی ہے۔ کہ

میں زہر کھالوں۔تو یہ خواہش حافظہ میں آجاتی ہے۔حافظہ اس زہر کے کھانے کا عکس تعقل کے سامنے کرتا ہے۔لیکن ساتھ ہی زہر کی کیفیت۔نام۔رنگ۔اثر اور موت کے تمام لوازمات بھی زہر کھانے کے نقشہ کے ساتھ سامنے آجاتے ہیں۔یہاں زہر کھانے سے موت کی ہلاکت میں جو کھانے نہ کھانے کی کشمکش پیدا ہوتی ہے۔وہ دو چیزوں۔دل کہتا ہے کھا۔مگر زہر کی ہلاکت سے باز رہنے کی تحریک حافظہ سے نکلتی ہے۔وہ اسلئے کہ زہر سے ہلاکت واقع ہونے کیلئے۔زہر سے پرہیز ہی کیا جاتا ہے۔یہ پرہیز کی کیفیت بھی حافظہ میں ہی ہوتی ہے۔یہاں کشمکش دل کی ''ہاں'' اور حافظہ کی ''نہ'' سے پیدا ہوجاتی ہے۔اگر دل کی خواہش مضبوط ہوجائے تو تعقل بے خود ہوکر حکم کر بیٹھتا ہے۔جیسا کہ خودکشی کی موت سے ثابت ہوتا ہے۔کہ تعقل ہی زہر کھانے کا حکم دیتا ہے اس طرح دل کی خواہش پوری ہوتی ہے۔یہی حافظہ کی کیفیت ''نہ کھا'' ضمیر کی آواز کہلاتی ہے۔اسکی دلیل اس طرح ہے کہ ایک بچے کے ہاتھ میں زہر پہلی بار رکھا جائے وہ اس کیفیت سے واقف نہیں ہوسکتا ہے کہ وہ بغیر کسی ڈر کے کھالے۔اسکا سبب۔اسکی رنگت۔نام تاثیر اس کے حافظہ میں جمع نہیں۔اور اگر سب کیفیتیں جمع ہوں اور موت کی ہلاکت کا اثر جمع نہ ہو تو دل کی خواہش کے ساتھ اسے کھانے میں کسی قسم کی رکاوٹ کی تحریک نہیں ہوتی اگر یہ تاثر بھی حافظہ میں آجائے تو انسان زہر کا نام لینے کے ساتھ ہی موت کا تصور بھی کرنے لگ جاتا ہے۔تو وہ زہر کو ہاتھ لگانے میں بھی محتاط رہتا ہے۔

شعور۔بھی متصرفہ کا ایک جز مثل تعقل کے ہے۔اسکا کام بھی تعقل کے ساتھ مشترک ہے۔یہ بھی علم حاصل کرنے کا ایک آلہ ہے۔اور علم حاصل کرنا اسکا خصوصی عمل ہے۔یہ ظاہری (مادی) علم سے بھی واقف ہوتا ہے۔اور باطنی غیر مادی علم سے بھی واقف ہوتا ہے۔البتہ اس آگاہی میں یہ حصہ کسی حد تک تعقل کے تابع ہوتا ہے۔یعنی اسکا کام ہر اس علم کو حاصل کر کے تعقل کو آگاہ کرنا ہوتا ہے۔جس سے تعقل آگاہ نہ ہو یا نہ ہوا ہو۔یا نہ ہوسکتا ہو۔بالالفاظ دیگر اسکے حاصل کردہ علم کی آگاہی کی تکمیل بھی تعقل ہی کرتا ہے۔جیسے ایک شخص خواب دیکھتا ہے۔تو تعقل معطل ہوتا ہے۔معطل ہونے کی صورت میں یہ خواب کے واقعات سے آگاہ نہیں ہوسکتا۔لیکن جب تعقل جاگ جاتا ہے تو خواب کے

واقعات دوبارہ (حافظہ کے ذریعہ) تعقل کے سامنے ابھر آتے ہیں۔اسکا ثبوت یہی ہے۔کہ خواب کے بعض واقعات دہراتے وقت یادنہیں آتے تو اسکا مطلب یہی ہے۔کہ خواب کے واقعات تعقل کے سامنے دہرائے نہیں جاتے ہیں۔اگر خواب کے واقعات تعقل کے سامنے نہ آئیں۔تو باوجود شعور کے دیکھنے کے بھی انسان نہیں جان سکتا کہ میں نے کیا دیکھا۔البتہ اسے احساس ہوتا ہے کہ میں نے خواب دیکھا تھا۔اس احساس کا سبب یہی ہے۔کہ شعور کا فعل تعقل کے ساتھ مشترک ہوتا ہے۔اسلئے شعور کا دیکھنا مثل تعقل کے ہوجاتا ہے۔اور یہی خوابیدگی کا احساس باقی رہ جاتا ہے۔جس وجہ سے انسان یہ محسوس کرتا ہے کہ میں نے خواب دیکھا تھا۔اسکے علاوہ شعور جاگتی حالت میں ساکن رہتا ہے۔اور تعقل خود علم حاصل کرنے کا کام کرتا ہے۔ساکن ہونے کی صورت میں شعور۔تعقل کی مانند حکم نہیں دے سکتا کیونکہ تعقل خود اس کام پر شدت سے مامور رہتا ہے چونکہ ان کا فعل مشترک ہے۔اسلئے جب تعقل معطل ہوجائے۔تو پھر شعور بھی اپنی ہیئت کے مطابق جسم کے اعضاء کو حرکت دے دیتا ہے۔ لیکن یہ حرکت تعقل کے معطل ہونے کی وجہ سے انسان محسوس نہیں کرتا۔جیسے انسان نیند کی حالت میں تمام جسم ہلاتا ہے۔کروٹ لیتا ہے۔کھجاتا ہے۔سردی میں اگر کمبل جسم سے ڈھل جائے۔تو نیند میں ہی اسے اوپر کرلیتا ہے وغیرہ اور بعض اوقات نیند کی حالت میں اٹھتا بھی ہے۔لیکن اس حرکت میں خطرہ لاحق ہوتا ہے۔وہ یہ کہ تعقل کلی طور مادی حیثیت میں نفع ونقصان میں تمیز کرنے کی صلاحیت رکھتا ہے اور حصہ حرکت اس کے قبضہ میں ہوتا ہے۔جہاں حواس کے ذریعہ کسی خطرے کا علم ہوا تو تعقل حصہ حرکت کے ذریعہ خطرے سے محفوظ ہونے کا انتظام کرتا ہے۔اسکے مقابلہ میں شعور میں یہ قوت پوری نہیں ہوتی۔یہی وجہ ہے۔کہ اکثر لوگ نیند کی حالت میں حرکت کرتے ہیں۔گاتے ہیں۔باتیں کرتے ہیں لیکن انہیں علم نہیں ہوتا۔اسکی وجہ یہ ہوتی ہے۔کہ تعقل معطل ہوتا ہے۔ایسی حالت بعض اوقات نقصان دہ ہوتی ہے۔جیسے ایک شخص نیند کی حالت میں کروٹ بدلتا ہے۔اگر اسکے نزدیک آگ ہو تو یہ آگ کے قریب ہوجاتا ہے۔بلکہ اکثر آگ سے جل جاتا ہے۔بعض اوقات دیکھا گیا ہے کہ ایک شخص نیند کی حالت میں اٹھ کر چلنے پھرنے لگ جاتا ہے۔ایک دوسرے سے باتیں کرتا ہے۔لیکن اسکی حالت

دیوانے کی سی ہوتی ہے۔اور جب اُسے جھٹکا دے کر ہلایا جائے تو وہ ہوش میں آ جاتا ہے۔اسے اپنی حرکت کا علم نہیں ہوتا۔یہی کیفیت دیوانے کی ہوتی ہے کہ اسکا تعقل خراب ہو چکا ہوتا ہے۔یہاں ایک آدمی کا حرکت کرنا شعور کے ذریعہ ہوتا ہے۔اسکا مطلب یہ ہے۔کہ شعور کی بیداری میں انسان حرکت کر جاتا ہے۔لیکن نفع ونقصان کی تمیز نہیں ہوتی۔اور یہ امر ضروری ہے۔کہ بغیر حسِ مشترک کے ان دو اجزا کے انسان حرکت نہیں کر سکتا۔کیونکہ تعقل کے معطل ہونے کے بعد انسان کی حرکت یکسر بند ہو جاتی ہے۔مثلاً ایک شخص سو گیا۔شعور کے ذریعہ اس نے بازو ہلا کر نیچے رکھ دیا۔اب کوئی شخص اُسی وقت یہی ہاتھ اونچا اٹھا کر چھوڑ دے۔تو اس میں حرکت موجود نہ ہوگی اور یہ بے حس گر جائے گا۔

تعقل مادی کیفیات کا ادراک کرتا ہے۔اور شعور دونوں مادی اور غیر جسمانی کیفیات کا ادراک کرتا ہے۔لیکن جاگتی حالت میں تعقل کی حکمرانی کی وجہ سے یہ ساکن رہتا ہے۔بالفاظ دیگر شعور کا جاگتے رہنا قوتِ دفاع کیلئے ہوتا ہے۔کہ انسان کی نیند کی حالت میں جبکہ تعقل معطل ہوتا ہے۔اسوقت شعور کے ذریعہ علم وعمل کی تکمیل ہو جائے۔اور جاگتی حالت میں یہ کام تعقل کے سپرد ہوتا ہے۔اسلئے شعور ساکن ہو جاتا ہے۔اور تعقل خود علم حاصل کرتا ہے۔اور جب تعقل معطل ہو جائے تو پھر شعور خود بخود علم حاصل کرنے کا کام کرتا ہے۔یہی وجہ ہے۔کہ جاگتی حالت میں چونکہ واقعات غیر مادی ہوتے ہیں۔شعور انہیں حاصل نہیں کرتا۔اور تعقل خود غیر مادی کیفیات کا ادراک کرنے کی صلاحیت نہیں رکھتا اسلئے جاگتی حالت میں انسان کیفیات کو اگر روح جسمانی سے پالے تو شعور کے ساکن اور تعقل کے برسرِ عمل ہونے سے انسان دل سے حاصل کردہ کیفیات سے بے خبر رہتا ہے گویا روح جسمانی واقعات حاصل کر سکتی ہے۔مگر تعقل ان واقعات سے آگاہ نہیں ہوتا۔اسلئے خواب کی طرح شعور کے ساکن ہونے کی وجہ سے انسان کے تعقل کو علم نہیں ہوتا اور انسان بے خبر رہتا ہے۔اور اگر یہ واقعات جو روح جسمانی کے ذریعہ جاگتی حالت میں حافظہ تک آ جائیں تو انہیں شعور پالیتا ہے۔اور یہی مشاہدہ جاگتی حالت کا کشف کے نام سے موسوم ہوتا ہے ___ لیکن یہ کیفیت اسوقت حاصل ہو سکتی ہے۔جب ایک طرف روح حیوانی کے حاصل کردہ واقعاتِ غیر مادی (عالم باطن) قلب تک پہنچیں

اوراسوقت قلب ودماغ کارابطہ پیدا ہو۔ ورنہ ہر وقت قلب ودماغ کا رابطہ کیفیات حاصل کرنے میں نہیں ہوتا۔ جب رابطہ ہوا۔تو اسی وقت کیفیت حافظہ تک پہنچ سکتی ہے۔اورانہیں واقعات کوشعور پالیتا ہے۔ یہ واقعات بالارادہ اور بلاارادہ بھی حاصل ہوتے ہیں۔اور نیند کی حالت میں تعقل جب خود معطل ہوتا ہے۔تو شعور خود بخود ان کیفیات کو پاتا ہے۔اکثر لوگ خواب کی حالت میں چونکہ بے قابو ہوتے ہیں۔اسلئے شعور بھی تعقل کی پابندی سے آزاد ہوکر کیفیات پالیتا ہے۔اب رہا سوال یہ کہ کیا ہرانسان کی روح جسمانی کیفیات حاصل کرتی ہے؟ ــــــ اسکے لئے دیکھنا ہے کہ روح جسمانی کیا چیز ہے؟اور یہ کیسے کیفیات حاصل کرتی ہے؟

روح جسمانی سے مراد۔جسم کا جوہر ہے۔ یہ جوہر ہماری ابتدائی زندگی سے ہمیں حاصل ہے۔اور ہمارے اجداد سے پشت در پشت منتقل ہوتا ہے۔اسی جوہر پر ہماری زندگی کا دارومدار ہے۔ یہ ایک لطیف ذرّہ ہے۔جس ذرہ سے ہمارے وجود کی ابتدائی پیدائش کا سلسلہ جاری ہوتا ہے۔اور یہی ذرّہ مادی غذا حاصل کرکے بڑھ کر ایک انسان کی شکل میں آجاتا ہے۔اورانسان کی شکل میں آنے کی ترکیب یہ ہے۔کہ یہ ذرہ بیرونی ماحول سے اپنی نشوونما کیلئے غذا حاصل کرتا ہے۔جو غذا تحلیل ہوکر جوہر کی صورت اختیار کرتی ہے اور یہی جوہر استخوان کی صورت میں آجاتا ہے۔اورآخرایک انسان کی ہیئت میں قائم ہوجاتا ہے۔گویا انسان کا تمام جسم اسی جوہر کا مرکب ہے۔یہ ذرّہ کیا چیز ہے؟ یہ ایک بچے کے والدین کا مادۂ منویہ ہے۔یعنی انسان جب غذا کھاتا ہے تو یہ غذا جسم کے کئی مراحل سے گزر کر خون بن جاتی ہے۔اور یہی خون مادہ منویہ کی شکل میں آکر انسان کی باریک رگوں کے ذریعہ انسان کا جسم بناتا ہے۔یہی مادۂ منویہ عورت کے رحم میں آجاتا ہے۔یہ ایک قطرہ ہی نہیں بلکہ ایک قطرہ لاکھوں ذرات کا مجموعہ ہوتا ہے۔اورانہیں ذرات کا ایک ذرہ[1] انسانی شکل کے لئے مخصوص ہوجاتا ہے۔اور یہ

---

[1] یعنی رحم میں مرداورعورت کے مادۂ منویہ میں سے نر و مادہ ذرات یکجا ہوجاتے ہیں ایک دوسرے کوضائع کرتے ہیں آخر ایک وقت صرف وہ ذرّہ باقی رہ جاتا ہے جوتمام ذرّات میں سے نشوونما پانے کی پوری قوت وصلاحیت پاتا ہو۔

ذرہ رحم مادر میں خون (حیض) کے ذریعہ غذا حاصل کرتا ہے۔ یہ خون بھی غذا کا جوہر ہوتا ہے۔ اسی جوہر سے اس ذرہ کی نشوونما یہاں تک ہو جاتی ہے کہ نو ماہ کے عرصہ میں کئی ہیئتیں بدل کر ایک آخری ہیئتِ مستقل پر قائم ہو جاتا ہے۔ یہ ہیئت اس قدر نازک ہوتی ہے۔ کہ اگر اسے بیرونی ہوا بھی لگ جائے تو یہ اس ہوا کا بھی متحمل نہیں ہوسکتا آخر نو ماہ کے اختتام پر یہ اس قابل ہو جاتا ہے۔ کہ بیرونی فضا کے اثرات کو برداشت کرے اور پھر یہی ذرہ۔ یہی جوہر انسانی شکل میں پیدا ہوتا ہے۔ اور اسکے بعد اس کی نشوونما کا طریق بھی یہی ہوتا ہے۔ کہ غذا حاصل کرنے کے ساتھ اسکا خون بنتا جاتا ہے۔ اور وہ خون مادۂ منویہ میں تبدیل ہوتا ہے۔ اور مادۂ منویہ سے گوشت پوست جسم کا ہر حصہ بنتا جاتا ہے۔

بظاہر ہمیں یہ محسوس ہوتا ہے۔ کہ انسان کی ابتدا اسکی پیدائش سے ہی ہوتی ہے۔ لیکن اگر ہم اسکی پیدائش سے ایک قدم اور آگے بڑھیں تو ہمیں معلوم ہوگا۔ کہ ایک بچے کی پیدائش کی ابتدا ـــــ ابتدا نہیں۔ بلکہ ایک جوہر کا نیا روپ بدلنا ہے۔ دراصل یہ ابتدا والد کی پیدائش سے ہی شروع ہوتی ہے جہاں سے بچہ کی پیدائش کا ابتدائی وجود پیدا ہوتا ہے۔ اور اسی طرح اگر ہم اس ابتداء اور پیدائش کا پس منظر دیکھتے جائیں۔ تو ہم اس نتیجہ پر پہنچتے ہیں۔ کہ ہر انسان کی ابتدائی پیدائش کا وجود اس انسان کے وجود سے آیا ہے۔ جس انسان سے پیشتر کوئی انسان نہ تھا۔ یا جس انسان کا وجود سب سے پہلے ظاہر ہوا۔ جسے آدم کہا جاتا ہے۔ گویا انسان کی زندگی کی ابتدا آدم سے ہی شروع ہوئی اور اسی آدم کے ایک ذرّہ منویہ سے اسکا لڑکا اور اس سے اسکا لڑکا اور یہ تسلسل اسی طرح منتقل ہوتا جارہا ہے۔ اور ہر ذرہ نقل مکانی کے بعد مادی غذا سے اپنی ساخت بڑھا کر انسانی شکل میں آجاتا ہے۔ اب یہ دیکھنا ہے۔ کہ اگر اس کائنات کے ننانوے فیصدی پیدائش کی ترکیب ایک ہی مترتب نظام کے ساتھ چلی آرہی ہے۔ تو اسکا مطلب یہ ہے۔ کہ یہ ترکیب دراصل انسان کی پیدائش میں ودیعت کی گئی ہے۔ اسلئے ضروری ہے کہ اسکا ابتدائی سبب بھی اسی طرح ہونا چاہیئے۔ وہ خود آدم کی پیدائش ہے۔ کہ کائنات کے وجود کا جتنا بھی جوہر موجود ہے۔ اس جوہر کا وہ ذرہ جو کائنات کے تمام ذرات میں قوی اور نشوونما حاصل کرنے کی صلاحیت رکھتا ہے۔ اسی ذرہ سے آدم کا وجود پیدا ہوا۔ رہا یہ سوال کہ انسانی ذرہ رحم میں

پرورش پا کر غذا حاصل کرتا رہا تو آدم کا ابتدائی ذرہ کہاں سے قوت حاصل کرتا رہا۔ اِسکے لئے ہمیں ایک ماحول کا جائزہ لینا ہے۔اور کائناتِ ارضی کا مطالعہ کرنا ہے۔

یہ امر طے شدہ ہے۔کہ اگر ایک وجود کیلئے ایک ابتدائی وجود پایا نہ جائے تو وہ وجود پیدا نہیں ہوسکتا ہے۔یعنی جب تک ایک معلول کیلئے ایک علّت نہ ہو معلول پیدا نہیں ہوسکتا۔ ہم دیکھتے ہیں۔کہ اس کائنات ارضی میں بے شمار ایسی قوتیں بھی ہیں۔جو اپنی قوت کے اعتبار سے بیحد قوی ہیں جیسے الیکٹرسٹی (بجلی)۔ہوا۔گیس۔ایتھر۔ایٹم وغیرہ یہ قوتیں سب اسی کائنات ارضی کی پیدائش ہیں۔ بالفرض محال اگر ہم انہیں زمین سے خارج سمجھیں۔لیکن ان قوتوں کا سبب زمین ہی ہوسکتا ہے۔جبکہ ہم ان قوتوں کو اسی زمین میں پاتے ہیں تو اس سے ثابت ہوتا ہے۔کہ یہ زمین اپنی ابتدائی حالت میں ۔نہایت قوی اور نہایت روشن تھی۔زمین کی وہ قوتیں جو حواس میں نہیں آتیں لطیف حالتوں میں ہوتی ہیں۔اور اسی تناسب سے ان تمام لطیف قوتوں کی علّت لازمی طور اپنی ابتدا میں ان تمام قوتوں سے لطیف ہونی ضروری ہے۔لطیف قوت اپنی ابتدائی ہیٔت میں تمازت اور روشنی میں انتہائی تیز ہوتی ہے۔اسلئے اگر ہم زمین کی ابتدائی کیفیت کا تصور نورانی (روحانی) نہ کرسکیں تاہم۔ہم اسے نور سے کم درجہ ناری ضرور کہیں گے۔گویا زمین ایک وقت اپنی ابتدائی ہیٔت میں ناری تھی۔یہ ناری قوت ایسی نہ تھی جیسی ہم آگ کو سمجھتے ہیں۔ بلکہ یہ ناری قوت ایسی تھی جس میں تمام ایتھری۔ایٹمی وغیرہ قوتیں سمائی ہوئی تھیں۔اور اسی میں تمام ارضی مخلوق کی قوتیں سمائی ہوئی تھیں۔اس سے معلوم ہوتا ہے۔کہ اگر انسان تمام مخلوقِ ارضی کا جواہر مرکب ہے۔تو ان تمام ایتھری۔ایٹمی قوتوں کا اثر بھی انسان میں ہونا لازمی ہے۔زمین کی ابتدائی حالت جبکہ ابھی اس میں کوئی پیدائش نہ تھی اسی ناری کیفیت میں تھی۔اسکی مادی ٹھوس ہیٔت اس امر پر دلالت کرتی ہے۔کہ ناری وجود کے بعد اس پر ہوا اور پانی کے اثرات پیدا ہوئے ــــ یہ امر ثابت شدہ ہے۔کہ کائنات کی کوئی شے ایک ہیٔت پر ہمیشہ قائم نہیں رہتی بلکہ ہیٔت تبدیل کرتی ہے۔اسکا ہیٔت تبدیل کرنا اسکی فنا کہلاتا ہے۔کسی شے کی فنا اسکے تنزل پر ہی ہوتی ہے۔ مثال کے طور پر ایک دانہ ہے۔یہ مختلف ہیٔتیں بدلتا جاتا ہے۔دانہ تنزل میں آکر فنا ہو جاتا ہے۔تو پودا

بن جاتا ہے۔ پودا بڑھ کر درخت کی ہیئت میں آ جاتا ہے۔ درخت تنزل میں آ کر فنا ہو جاتا ہے۔تو کوئلہ بن جاتا ہے۔یا زمین کی مختلف صورتوں میں آ جاتا ہے۔اسی طرح زمین بھی تنزل کی طرف آئی اوراس پر ہوا کے آثار پیدا ہوئے۔ہوا سے پانی کا ظہور ہوا۔پانی کی کثرت نے زمین کی تمازت ختم کر دی۔ یہاں تک کہ زمین ٹھوس۔ مادی (ٹھنڈی) کیفیت میں آ گئی۔زمین پر پانی اسقدر آیا کہ تمام زمین کا احاطہ کرلیا۔اور پانی کے طلاطم نے زمین کے تمام ناری ذرات کواپنے میں سما کر جاندار شکلوں میں تبدیل کر دیا۔اور جب زمین کا تمام پانی خشک ہوکر زمین میں جذب ہوا۔تو یہ تمام ذرات بھی زمین میں جذب ہو گئے۔اب جو حصہ زمین کا خشک ہوا۔ یہاں سے نباتات کی شکل میں یہ ذرات اگنے لگے۔اور جہاں زمین کی گہرائیوں میں پانی ٹھہر گیا۔اس پانی سے جاندار حیوانات کی شکل میں یہ ذرات نشوو ارتقا کی طرف بڑھنے لگے۔اور ہر جاندار جوزمانہ میں پایا گیا۔اسی آبی پیدائش کی ارتقائی شکلوں میں نمودار ہوا۔اورزمین کے وسط میں ایک نشیبی (گہری) مقام پر جب پانی خشک ہونے لگا تو اس نے دلدل کی صورت اختیار کی یہ مہین گارے کی مانند زمین کے تمام جواہرات کا مرکب تھا۔اسی جوہر کے ایک ذرہ نے جس میں نشوو ارتقا کی صلاحیت تھی۔اسی جوہر سے اپنی وجودی ترقی کرنی شروع کی۔اسی جوہر سے آدم کی ابتدا ہوتی ہے یہی مجموعہ جوہر اسکی غذا تھی۔اسی جوہر سے اسکی نشوونما یہاں تک ہوئی کہ اسی نے رفتہ رفتہ (بتدریج) بڑھ کر انسانی ہیئت اختیار کی گویا انسان کی پیدائش اورنشوونما جوہمیں عام انسانوں میں نظر آتی ہے۔اسی ابتدائی پیدائش کا خاکہ ہےاور یہ دونوں پیدائشیں ایک ہی کیفیت کی ہیں صرف فرق مقام کا ہے۔یہ زمین کے جواہرات میں پلتا ہے۔وہ بھی رحم میں غذا کے جواہرات میں پلتا ہے۔حقیقت یہ ہے۔کہ انسان کا ابتدائی پیدائشی وجوداسی ابتدائی ذریعہ سے جاری ہوتا ہے۔اور ہر پیدائش کے بعد ہر ذرہ زمین کی غذا سے ایک علیحدہ وجود بنا تا ہے۔

اس حقیقت سے معلوم ہوتا ہے۔کہ روح جسمانی کی ابتدا ایک اسی جوہر سے ہے جو کائنات کے تمام جواہر کا مرکب ہے۔اب آئندہ پیدائش پر اسکی اصلیت کا برقرار رکھنا اسکی آئندہ غذا اور پرورش پر منحصر ہو جاتا ہے۔اگر غذا فطری حاصل ہوتو اس کی سالمیت برقرار رہے گی۔اگر غذا غیر

فطری حاصل ہوتو اسکی سالمیت[1] میں فرق ہوگا۔

انسان جب اپنی خوراک خود حاصل کرنے لگ جاتا ہے۔تو یہ اپنے ارادے کا خود مالک ہوتا ہے۔چاہے وہ غذا استعمال کرے جس سے اس کی روحانی سالمیت برقرارر ہے۔ چاہے وہ غذا حاصل کرے جو اسکے جوہر کو کمزور کرے۔انسان اگر صحیح انسانیت کے قوانین کے تحت اپنی زندگی گزارتا ہے۔تو یہ صحت مند کہلاتا ہے۔اسکی روح جسمانی لطیف حالت میں رہتی ہے۔اوراس روح میں وہ خواص مستقل ہیئت میں قائم رہتے ہیں۔جوخواص اسکے ابتدائی جواہراتی وجود میں تھے۔یہی کیفیت ہر انسان کی ہے جب تک یہ اپنی ابتدائی حالت میں قائم رہے تو لازمی طور۔اس میں لطیف خواص بھی پائے جائیں گے۔اور چونکہ اسکا مقام دل[2] ہی ہے۔اسلئے انسان اس دل سے اس روح جسمانی کے ذریعہ آنکھ کا کام لے کر۔ ہراس کیفیت کو پالیتا ہے جواس کائنات میں اپنا وجود (لطیف یامادی) رکھتی ہو۔ کیونکہ ہم دیکھتے ہیں کہ ایتھر لطیف حالت میں ہر کیفیت کو (جب کہ اس میں حواس بظاہر موجود نہیں) اپنے میں جذب کر لیتا ہے تو ہم ایک مقام سے دوسرے مقام تک سُن سکتے ہیں۔ دیکھ سکتے ہیں۔اگر ہمارے سننے دیکھنے کا سبب ایتھر نہ بنے تو ہم نہ سن سکتے ہیں نہ دیکھ سکتے ہیں۔اسی طرح ایکسرے۔ٹھوس مادہ سے گزر کرایک اندرونی کیفیت کو دیکھ لیتی ہے۔تو روح جسمانی جوانہیں میں کا ایک جوہر ہے۔بغیر ظاہری حواس کے اس میں سننے دیکھنے کی قوت پائی جاسکتی ہے۔البتہ۔چونکہ ان تمام کیفیتوں کا تعلق صرف انسان کے علم سے ہے۔اسلئے یہ قوتیں انسان کیلئے حواس کا کام دیتی ہیں۔اوران ذرائع سے انسان اپنے قلب ودماغ کی آگاہی سے علم کی تکمیل کرتا ہے۔اورروح حیوانی

---

1 یہی وجہ ہے کہ انسان کی کمزوری (تنزل) پراسکا علاج انہیں زمین کے کیمیاوی اجزا (فطری غذا) سے کیاجاتا ہے۔

2 یعنی دل ودماغ اسی روح جسمانی سے بنے ہیں جس طرح باقی تمام جسم خون اور مادۂ منویہ سے بنتا ہے۔اسی طرح دماغ اوردل بھی بنتے ہیں نیز ان دونوں مقامات میں یہ مادۂ منویہ (روح جسمانی) نہایت لطیف حالت میں ہوتا ہے۔ جسکا اثر یہ ہوتا ہے کہ یہ بیرونی مادی اشیاء کوایک لطیف کیفیت میں پاتے ہیں۔

بھی ایتھری قوت کے ذریعہ واقعات و کیفیات کو بجائے آنکھ کے قلب تک پہنچا کر دماغ کو کیفیات فراہم کرنے کا ذریعہ بنتی ہے۔ یہ روح جسمانی ہر شخص میں موجود ہے۔ لیکن اسکی کیفیت اسکی پرورش کے مطابق ہوگی جیسی غذا اسے حاصل ہوگی ویسی یہ کیفیتیں کم یا زیادہ حاصل کرے گی۔ بعض لوگ اپنی اس روح جسمانی کی صحیح پرورش نہیں کر سکتے۔ اسلئے ان میں یہ روح زیادہ تر مادی ہیئت میں آجاتی ہے۔ یعنی اسکی لطافت کم ہو جاتی ہے۔ اور پھر اسکا کام صرف زندگی کا تسلسل ہی قائم رکھنا ہوتا ہے۔ اور ہر انسان بیمار ہی پیدا ہوتا ہے۔ ایسے لوگوں میں کیفیات حاصل کرنے کی صلاحیت نہیں ہوتی۔ بلکہ انکی ہر کیفیت۔ خواہشات نفسانی (حیوانی) اور حافظہ کی تخیلاتی کیفیات ہی ہوتی ہیں۔ یہی وجہ ہے۔ کہ جاگتی حالت میں ہر انسان کیفیات حاصل نہیں کر سکتا۔ صرف وہی لوگ عالمِ بیداری میں روح جسمانی سے کیفیات حاصل کر سکتے ہیں جنکا وجود صحت مند ہو اور روح جسمانی اپنی اصلی ہیئت میں ہو۔ صحت مند ہونے سے یہ مراد نہیں کہ انکا جسم موٹا تازہ ہو۔ نہیں بلکہ وہ اگر چہ جسمانی طور پر دبلے پتلے بھی ہوں۔ لیکن انکے دل کی کیفیت یہ ہو کہ وہ اپنی ہر حیوانی خواہش پر قابو حاصل کئے ہوئے ہوں۔ انکی خواہشات تنزلی (حیوانی) نہ ہوں۔ ایسے لوگوں کی روح جسمانی اس حالت میں ہوتی ہے۔ جیسی کہ یہ اپنی ابتدائی حالت میں مادہ حاصل کرنے سے قبل لطیف اور زندہ تھی۔ اس حالت میں انسان اگر چہ مادہ سے بھی غذا حاصل نہ کرے تو یہ پھر بھی اپنی اصلی حالت میں قائم رہتی ہے۔ اور تمام وجود اسی لطیف قوت سے نشو و نما حاصل کر کے ہر عضو خود بھی لطیف ہو جاتا ہے۔ ایسی لطافت میں یہ ضروری نہیں کہ انسان کا جسم موٹا تازہ ہو جائے۔ بلکہ ایسی حالت میں انسان کا جسم جس قدر نحیف ہو اسی قدر اسکے وجود پر مادیت کا اثر کم ہوتا ہے۔ چنانچہ اکثر براہمن سادھو لوگ اپنی روح جسمانی کی لطافت حاصل کرنے کیلئے مدتوں تزکیہ کرتے ہیں۔ اور ان میں یہ قوت پیدا ہو جاتی ہے۔ کہ وہ غیر مادی یا حس میں نہ آنے والی قوتوں کا ادراک کرنے لگ جاتے ہیں۔ بلکہ انکی روح جسمانی سے حاصل کردہ قوت اس قدر غیر معمولی قوت حاصل کر جاتی ہے۔ کہ ان سے مافوق الفطرت واقعات کا صدور ہو جاتا ہے۔ جیسے کہ ایٹم یا الیکٹرسٹی بغیر کھائے (استعمال کئے) جسم انسانی کی کمی پوری کرتے ہیں۔ اسی طرح انکے ہاتھوں یا نظروں سے دوسرے

مریض انسانوں میں یہ قوتیں (ایٹمی۔الیکٹرسٹی) سرایت کرجاتی ہیں اور وہ صحت مند ہو جاتے ہیں۔

الغرض ہر ایک انسان روح جسمانی سے اسوقت تک عالمِ بیداری میں کیفیات حاصل نہیں کرسکتا جب تک کہ اسکی روح جسمانی اپنی سالمیت میں سالم نہ ہو ـــــ رہا یہ سوال کہ پھر ہر انسان خواب میں کیسے کیفیات دیکھ پاتا ہے۔تو اس میں بھی وہی شخص رویائے صادقہ (اصلی کیفیات) پاسکتا ہے۔ جسکی روح جسمانی صحت مند ہو۔اور باقی لوگ خواہشات نفسانی (حیوانی یادل کی خواہشات) کے نقوش ہی دیکھتے ہیں یا حافظہ کے جمع شدہ نقوش کے عکس دیکھتے ہیں۔البتہ روح جسمانی کسی میں بالکل سالم۔ کسی میں قدرے سالم۔کسی میں بالکل بیمار۔انہی حالتوں پر دیکھنے نہ دیکھنے کا انحصار ہوتا ہے۔وہ لوگ جو عالمِ بیداری میں نہیں دیکھتے اور نیند میں دیکھتے ہیں۔صحت مند لوگوں میں سے ہیں۔اور ایسے لوگ اگر چاہیں کہ وہ عالمِ بیداری میں کیفیات کو حاصل کریں۔تو اسوقت وہ اپنے ارادے سے عمل کرتے ہیں۔کہ تعقل ساکن ہو جاتا ہے۔اور شعور کو دل سے رابطہ رکھنے کی فرصت دے دیتا ہے۔خود کنٹرول بھی کرتا ہے۔اور شعور سے غیر جسمانی کیفیات بھی پالیتا ہے۔ایسی کیفیت کو صحیح مشاہدہ کہتے ہیں۔

یہ ایک طریق اور ایک کیفیت ہے۔جس سے حواس خمسہ میں نہ آنے والی کیفیات وہ دور ہوں یا نزدیک حاصل کی جاتی ہیں۔اور یہ کیفیات اس کائناتِ ارضی سے تعلق رکھتی ہیں۔یہ امر واضح ہو کہ روح جسمانی اس کائنات ارضی کی اشیاء کا ہی ادراک کرسکتی ہے۔یہ اشیاء کچھ تو لطیف ہیں اور حس میں نہ آنے والی ہیں۔اور کچھ ٹھوس مادی اشیاء ہیں۔ان تمام کیفیات کا خواہ وہ مشرق میں ہوں یا مغرب میں روح جسمانی احاطہ کرسکتی ہے۔اور جہاں کیفیات ماوراءادراک یا اس کائنات سے باہر روحانی عالم ۔ماسوائے [1] آسمان اور آسمانوں کے آگے نورانی عالم کے واقعات ہوں۔یہ کیفیتیں روح جسمانی کے احاطہ میں نہیں آسکتیں کیونکہ ان اشیاء کی لطافت اسقدر قوی ہے۔کہ ان کی ہیئت روح جسمانی ایسے نہیں

---

[1] اگر چہ یہ بھی کائنات میں شمار ہیں اور انکی کیفیات حاصل کرنے کیلئے بھی ذرائع مادی حاصل ہوسکتے ہیں۔لیکن ایسے ذرائع عام نہیں پائے جاتے اسلئے ایک شخص بغیر دوربینی ذرائع کے بھی روح کے ذریعہ دیکھ سکتا ہے۔

دیکھ سکتی جیسے آنکھ ہوا یا ایتھر وغیرہ کیفیات کو محسوس نہیں کر سکتی۔ اسکے لئے اس روح جسمانی کے علاوہ انسان میں ایک قوی نورانی روح ودیعت کی گئی ہے۔ جو آسمانی قوتوں کے مقابلہ میں انہیں جیسی قوت کی حامل ہے تا کہ انسان تفکر میں ہر کیفیت حاصل کرنے میں آسانی پا سکے۔ وہ روح انسان کی مکمل تکمیل پر اسے حاصل ہوتی ہے۔ وہ روح اسکی زندگی میں معاون نہیں بلکہ صرف تفکر ـــــ مشاہدہ۔ اور تلاشِ حقیقت کیلئے اسے حاصل ہے۔ یہ روح ـــــ روح جسمانی کے مقابلہ میں نہایت لطیف وقوی ہے۔ اور جو کچھ اس کائنات سے ماسوا روحانی عالم ہے۔ یہ روح ان کیفیات کو پا سکتی ہے اسے روح ربانی (رحمانی) کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے۔ روح ربانی اسے کیوں کہا جاتا ہے؟ اور اس روح کی اصلی کیفیت کیا ہے؟

اس کارگاہِ حیات میں دو چیزیں اپنے میں خصوصی اہمیت رکھتی ہیں۔ ایک ''دنیا'' (زمین) اور دوسری ''انسان'' اگر زمین کی اہمیت کو خصوصی نہ سمجھا جائے تو اس کائناتِ عالم کے تمام وجود (سورج۔ چاند۔ ستارے) بے معنی سمجھے جائیں گے۔ اور اگر انسان کی اہمیت کو خصوصی نہ سمجھا جائے۔ تو اس زمین کی تمام اشیاء۔ (خواہ وہ مادی ہوں یا لطیف) پہاڑ ہوں۔ یا سمندر۔ ہوا ہو یا ایٹم یہ سب بے معنی ہو کر رہ جائیں گے۔ زمین۔ کائنات کی تمام کیفیات سے اثر حاصل کرتی ہے گویا۔ یہ تمام اشیاء صرف اس کرۂ ارضی کی امداد میں ہی برسرِ عمل ہیں۔ اور انکا کام صرف زمین کیلئے اپنی قوتیں استعمال کرنا ہے۔ اسی طرح انسان۔ زمین کی تمام اشیاء سے مفاد حاصل کرتا ہے۔ یعنی کائناتِ عالم کی اشیاء کا عمل اور خود زمین کی اشیاء کا عمل جاری ہے وہ سب ایک خالص انسان کیلئے وقف ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے۔ کہ اس کارخانۂ عالم میں صرف انسان کا پیدا ہونا ہی مقصود ہے۔ اور کائنات کی جو اشیاء اسے آسانی سے میسر ہو سکتی ہیں وہ اس کی نشو وارتقا کے لئے پیدا ہوئی ہیں۔ اور وہ اشیاء جن تک اسکی رسائی نہیں انہیں قوتِ تفکر کے ذریعہ اپنے قبضہ میں لا کر ان سے نفع حاصل کرے۔ لیکن ایسی کیفیاتِ روحانی جن کی اسکے جسم کیلئے ضرورت نہیں۔ انکی پیدائش بھی اسی انسان کیلئے ہے۔ تو روحانی اعتبار سے۔ انسان پر یہ لازم آتا ہے۔ کہ وہ انہیں بھی استعمال کرے۔ ان کیفیات کا وجود اس امر پر دلالت کرتا ہے۔ کہ جہاں تک مادی اشیاء ہیں اسکے مقابل انسان کو مادی جسم حاصل ہے۔ اور جہاں روحانی

کیفیات کا تعلق انسانی جسم سے ہوسکتا ہے۔ تو اسکے لئے انسان میں روحانی وجود کا ہونا لازمی اور یقینی ہے۔ اسلئے روحانی اعتبار سے انسان کو روحانی ارتقاء کیلئے بھی قوتِ تفکر سے روحانی عروج حاصل کرنا ہے۔ یہی وجہ ہے۔ کہ اس کائنات میں سوائے انسان کے خواہ وہ روحانی قوتیں ہوں یا حیوانی۔ اور کسی شے میں قوت تفکر انسان کے مقابلہ میں موجود نہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ کائنات انسان کیلئے بنی۔ اور کائنات کے بننے کا مقصد صرف انسان کا پیدا ہونا ہی ہے۔

ہم دیکھتے ہیں کہ ماضی کی تمام ابتدائی کیفیتیں اس کائنات اور انسان کی موجود نہیں بلکہ سب فنا ہو چکی ہیں۔ لیکن گزشتہ کیفیات کی فنا کے ساتھ یہ نظام ختم نہیں ہوا۔ بلکہ ہر زمانہ میں اسکا ایک نیا روپ پیدا ہوتا جا رہا ہے۔ گویا ہر شے کی علت اگر چہ محسوس نہیں ہوتی۔ لیکن انکے معلول بدستور محسوس کئے جاتے ہیں۔ اس سے ثابت ہوتا ہے۔ کہ ہر شے معلول کا وجود تب تک پیدا نہیں ہوسکتا جب تک کہ اسکی ابتدائی علّت واقع نہ ہو۔ اسی طرح جب ہم کائنات اور انسان کی اہمیت کو یکجا کر کے مطالعہ (تفکر) کریں تو ہمیں یہ تسلیم کرنے میں چارہ نہیں۔ کہ اس کائنات کی علّت کا تسلسل اس کائنات سے قبل واقع ہوا ہے۔ اور جب ہم اسکی خصوصیت پر نظر ڈالیں تو یہ معلوم ہوتا ہے۔ کہ اس کائنات کی ابتدائی علتوں کی پیدائش میں بھی صرف زمین اور انسان کی پیدائش ہی مقصود تھی۔ کائنات کی علت زمین کی ہیئت کے اعتبار سے اپنے میں لا انتہا قوت (تمازت اور روشنی) کی حامل ہے۔ جسے بالفاظ دیگر مکمل روحانی (نورانی) کہا جا سکتا ہے۔ اور جب یہ ایک ایسے مقام پر پہنچ جائیں جہاں ان علتوں کی تمازت اور روشنی میں انتہائی وسعت پیدا ہو تو یہ سب علتیں ایک ایسے مقام پر پہنچ جاتی ہیں جہاں ایک ایسی علّت پائی جاتی ہے جو اپنی وسعت میں لا انتہا کا درجہ رکھتی ہے جسے علت لامحدود یا عربی محاورہ میں اللّٰہ کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے۔ اور جب ہم اللہ کی ہستی کا احساس کریں تو ہمیں یہ اندازہ کرنے میں کوئی مبالغہ نہ ہوگا کہ یہی علت ہر شے کا منبع حقیقی ہے۔ اور اسی کے ارادہ سے ہر شے وجود میں آئی اسلئے یہی ہر شے کی خالق ہے۔ اب ہم زمین اور انسان کی ذاتی خصوصیت کو اللہ کے ارادہ سے وابستہ کریں تو معلوم ہوگا۔ کہ اس تمام روحانی اور غیر روحانی عالم کی تخلیق میں اللہ کا بھی ارادہ

صرف زمین اور انسان پیدا کرنا تھا۔ یہ سوال پیدا ہوتا ہے۔ کہ اگر اللہ کو زمین اور انسان ہی پیدا کرنا تھا۔ تو پھر اتنے عالم پیدا کرنے کی کیا ضرورت تھی؟ کیوں نہ ایسا ہوا۔ کہ صرف زمین اور انسان ہی پیدا کیا جاتا جو اللہ کا واحد مقصود تھا؟ اسکا جواب یہ ہے۔ کہ اس کائنات عالم کی اشیاء میں ایک مترتب نظام پایا جاتا ہے۔ کوئی شے۔ کوئی واقعہ اٹکل پچو یا چھومنتر سے بنا ہوا معلوم نہیں ہوتا ہے۔ بلکہ ہر شے کی تخلیق میں ایک سبب ایک بنیاد محسوس ہوتی ہے۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے۔ کہ اُس اللہ کی کاریگری میں کوئی شے بلا اسباب نہیں واقع ہوتی۔ اسلئے یہ زمین اپنے اسباب کے ساتھ ہی پیدا ہوئی۔ زمین تو صرف اس کُرّے کا نام ہے۔ اور یہ کیفیت اپنے مقام کی ایک تخلیق ہے۔ جو اُس نورانی کیفیت کا آخری درجہ ہے۔ اسلئے قدرت نے اپنے معلولی انوار میں اسے اپنے مقام پر ہی پیدا کیا یا یوں کہیے کہ اللہ نے اپنے ابتدائی ارادہ میں زمین اور انسان بنانے کی سکیم کی تو اسکے لئے اپنے نور میں تخلیق کی تحریک پیدا کر دی۔ اب اس نور کی (مثل دانہ اور میوہ کے) تخلیقی ترتیب میں کیفیتیں بنتی آئیں۔ اور اسی ابتدائی نور میں زمین کا سمانا (یا زمین کا پیدا ہونا) پایا جاتا تھا۔ سو زمین نے اس حالت میں اپنے زمانہ اور مقام پر ہی پیدا ہونا تھا۔ اور اسکے ارادہ ازلی میں اسی مقام کا پیدا کرنا مقصود تھا۔

الغرض اس مقام کے پیدا کرنے میں اسکا ذاتی ارادہ کام کرتا ہے۔ کہ اسی مقام پر زمین بن سکتی ہے اور اسی زمین کی پیداوار انسان ہے۔ اب ہم دیکھتے ہیں۔ کہ کائنات کی ہر شے کے ذمہ ایک کام ہے۔ وہ یہ کہ زمین اور اسکی پیدائش کے لئے سرمایۂ حیات پیدا کریں۔ اور صرف ایک انسان ہے۔ جو اس تمام سرمایہ سے فائدہ حاصل کر رہا ہے۔ اور انسان کی کیفیت سے یہ معلوم ہوتا ہے۔ کہ وہ اس تمام سرمایہ سے صرف اپنی زندگی کو برقرار رکھ رہا ہے۔ چاہیئے تو یہ تھا کہ انسان صرف کھائے پیئے لُطف اندوز ہو اور اسے کسی اور کام سے سروکار نہ ہو۔ لیکن اسکی وجودی کیفیت میں جب ہم اسکے حواس۔ اسکے ذہن۔ اسکے قلب اور اسکی روح جسمانی کا مطالعہ کرتے ہیں تو ہمیں معلوم ہوتا ہے۔ کہ انسان خود تفکر کرنے پر مجبور ہے۔ اور کھانے پینے کے علاوہ یہ تفکر کی طرف بھی مائل ہوتا ہے۔ تو معلوم ہوتا ہے۔ کہ اسکی خصوصیت یہی ہے۔ کہ وہ عام مخلوق کی طرح (جو صرف اسکے لئے ہی پیدا کی گئی ہیں)

کھانے پینے کے علاوہ تفکر کرے۔ تفکر کس کا! کائنات عالم کا ـــــ کائناتِ عالم میں کس شے کا؟ کس خوبی کا؟ ـــــ صرف اسکی بناوٹ کا ـــــ یہ بناوٹ کہاں ختم ہوتی ہے؟ ـــــ ایک اللہ خالق وعلّت لامحدود پر۔ تو اس کائنات کی تخلیق میں تفکر کرنے کا پسِ منظر ایک خالق کو پہچاننے کے ساتھ ساتھ انسان کیلئے روحانی ترقی اور علم حاصل کرنا ہے۔

یہ ثابت ہو چکا ہے۔ کہ روح جسمانی ہمارے قلب میں بیحد لطیف حالت میں پائی جاتی ہے۔ اور وہ صرف کائناتِ ارضی کا مشاہدہ کر سکتی ہے۔ مگر ماورائے مادہ روحانی عالم تا علّتِ لامحدود (خالق) کا ادراک کرنے کی اس میں استطاعت نہیں۔ اور جب اس خالق کا مقصود یہی ہے۔ کہ منتہا تک تحقیق وادراک کیا جائے۔ تو ضروری ہے۔ کہ اس میں ایسی ہیئتوں کے ادراک کرنے کی قوت بھی موجود ہو ـــــ کائنات کی تحقیق کیلئے اسے ایسی قوت کی ضرورت تھی جو تمام کائناتِ ارضی کا ادراک کرے۔ تو اسی کائناتِ ارضی کی ابتدائی قوت سے اسکی روح جسمانی بنی تا کہ یہ کائنات کی ابتداء تک ادراک کرنے میں عاجز نہ ہو۔ ورنہ اگر اس کی قوت ابتدائی قوت سے پیدا نہ ہوتی تو اسکی رسائی اسکی ابتدا تک نہ ہوسکتی تو پھر انسانی وجود میں قوت تفکر کے ذرائع حواس۔ قلب۔ ذہن بیکار رہ جاتے۔ اسی طرح جب اس خالق کی پہچان کرنی مقصود ہوتو وہ قوت بھی اسی ابتدا کی قوت سے ہوتا کہ انسان اس تک ادراک کرنے میں مجبور نہ ہو۔ اسلئے یہ روح جو ماسوائے مادہ عالمِ روحانی کا ادراک کر سکے۔ اس خالق کے ذاتی نور کا ہی ایک جُز ہوگی جسے روح ربّانی (خالق) یا روح رحمانی سے موسوم کیا جاتا ہے۔ اور جس طرح روح جسمانی کا مقام انسان کے وجود کا لطیف عضو (دماغ) ہے۔ یہ روح بھی اسی عضوئے لطیف (دل) سے منسلک اسی طرح ہے جس طرح روح جسمانی دماغ سے تعلق رکھتی ہے۔ یعنی جس طرح قلب کے ایک قلیل حصہ میں آسمان کا تصور[1] آ سکتا ہے۔ اسی طرح روح بھی اپنی

---

[1] یہ تصور اسی طرح ہے جسطرح حافظہ میں ایک سمندر یا پہاڑ کا لطیف تصور ہے۔ دل اور آسمان بھی لطیف ہیں اسلئے یہ روحانی کیفیت دل میں سما سکتی ہے۔

لطافت کے اعتبار سے قلب میں سمائی ہوئی ہے۔اوراس روح کے سامنے سے قلب کی کیفیت ایک مجلاٗ آئینہ کی مانند کمرے یا صندوق کی مانند بن جاتی ہے۔کہ جب یہ قلب اپنی روح جسمانی کے ساتھ مکمل لطیف کیفیت میں اس حالت کو پہنچ جاتا ہے۔کہ اسکی اور روح رحمانی کی کیفیت یکساں ہو جائے تو پھر روح رحمانی اپنا ادراک شروع کر کے ماوراءِ مادہ ادراک کرنا شروع کرتی ہے۔اور یہ کیفیت نورانی روح رحمانی اور روح جسمانی کے اتصال (ملنے) سے دل [1] پر آجاتی ہے۔اور یہاں سے جو رابطہ قلب کا دماغ کے ساتھ ہے اسی واسطہ سے واہمہ پر یہ کیفیت عکس پذیر ہو جاتی ہے واہمہ اس کیفیت سے آگاہ نہیں ہوتا۔اسلئے وہ اس نورانی کیفیت یا جس تمثیلی کیفیت میں واہمہ پر اسکا عکس آجائے اسی کیفیت کا نام دیکر حافظہ پر عکس ڈالتا ہے۔حافظہ میں بھی پیشتر اس کیفیت کا نقش موجود نہیں ہوتا۔تو وہ بھی اسی حالت میں شعور کے سامنے پیش کرتا ہے۔شعور اسے محسوس کرتا ہے۔اور یہ کیفیت اب حافظہ میں جمع ہو جاتی ہے۔تو اسکے ساتھ ہی تعقل بھی اس کیفیت سے آگاہ ہو جاتا ہے۔لیکن اس کیفیت کا نہ نام ہوتا ہے نہ مقام کا علم ہوتا ہے۔تو تعقل اس کیفیت کا علم حاصل کرنے کی جستجو میں لگ جاتا ہے۔یہ جستجو کیا ہے۔کسی عالم سے اس کیفیت کا اصلی نام و مقام دریافت کرنا ـــــ سو اس کیفیت کو وہی جان سکتا ہے۔جو اس سے قبل ان کیفیات کو حافظہ میں جمع کر چکا ہو۔ایسے عالم کو راہنما کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے۔یہی عالم ماورائے ادراک کیفیتوں کی تصدیق کرتا ہے ـــــ اور ان کیفیتوں کی شناخت کراتا ہے۔جس کے ذریعہ ہم ان کیفیتوں کی ہیئتیں اور نام حافظہ میں جمع کر کے روحانی علم سے واقفیت حاصل کرتے ہیں۔اب اگر یہی کیفیتیں نیند کی حالت میں آجائیں۔تو اسکے حاصل کرنے کی ترکیب شعور تک بدستور ایک ہی رہتی ہے اور صرف تعقل اس کیفیت سے آگاہ نہیں ہوتا۔سو

---

[1] یہاں دل کو اسکی لطیف کیفیت میں استعمال کیا جاتا ہے۔یعنی روح جسمانی دل میں لطیف حالت میں ہوتی ہے۔اور دل بھی لطیف حالت میں ہوتا ہے۔گویا دل خود نہیں دیکھتا بلکہ دل کی روح حیوانی ہی عکس حاصل کر کے دماغ تک واقعات پہنچاتی ہے۔جسے دل کے دیکھنے سے تعبیر دیا جاتا ہے۔

تعقل عالمِ بیداری میں اس کیفیت کو پا کر علم کی تکمیل کرتا ہے۔اس کیفیت کو الہام کہا جاتا ہے۔البتہ یہ کیفیت خواب اور بیداری دونوں صورتوں میں ایک ہی نام سے موسوم کی جاتی ہے۔اور اسکے حاصل کرنے کا وہی طریق ہے۔جس طرح روح جسمانی کے ذریعہ بیداری اور خواب میں مشاہدات حاصل کیئے جاتے ہیں۔

یہ یاد رکھنا ضروری ہے۔کہ انسان کے ان مشاہدات والہام و مکاشفات میں ایک ہی طریقِ کار ہے۔کہ اگر انسان جاگتی حالت میں واقعات کو آنکھ سے دیکھے تو ذہن تک حواس کے ذریعہ پہنچ جاتے ہیں۔اگر آنکھ کام نہ کرتی ہو۔تو قلب کے ذریعہ ذہن تک کیفیات پہنچ جاتی ہیں۔مثلاً اگر انسان عالم روحانی تک بمعہ جسم کے آسمانوں میں جا کر آنکھ سے مشاہدہ کر سکے تو یہی کیفیات آنکھ سے دیکھ کر ذہن تک پہنچ جائیں گی لیکن عالم روحانی میں مادی جسم تب تک نہیں پہنچ سکتا جب تک مادی جسم بھی اسقدر لطیف نہ ہو کہ یہ عالم روحانی کی کیفیات کی تمازت اور روشنی کا متحمل ہو سکے۔ایسی حالت میں روح رحمانی جو رحمانی قوت کی حامل ہوتی ہے۔اور عالم روحانی کی کیفیات کا عکس حاصل کرنے کی صلاحیت رکھتی ہے۔قلب کے ذریعہ کیفیات کو ذہن تک پہنچاتی ہے۔گویا کیفیات حاصل کرنے میں کوئی فرق نہیں ہوتا ہے۔

روح جسمانی ـــــ روح رحمانی سے کیفیات حاصل کرنے کیلیئے انسانی قلب کی کیفیت کا لطیف ہونا لازمی ہے۔اور قلب کی لطافت حاصل کرنے کا طریق روح رحمانی کیلیئے بھی وہی ہے۔جو روح جسمانی کیلیئے ہے۔کہ انسان مادیت سے خالی ہو۔مادی خصائص سے پاک ہو۔تا کہ روح جسمانی مکمل ہو اور اپنی ابتدائی کیفیتِ نورانی میں واقع ہو۔اسکے بعد اس لطافت میں اتنا اضافہ اور ہو کہ روح جسمانی اور قلب کی حالت روح رحمانی کے عکس حاصل کرنے کیلیئے زیادہ لطافت پیدا کر سکے۔تو زیادہ لطافت پیدا ہونا انسانی کردار پر منحصر ہے۔جس قدر دل خواہشات حیوانی سے پاک ہو اسی قدر قلب لطیف ہو جاتا ہے۔خواہشات نفسانی سے مراد وہ ابخرات جو اس کے مادہ منویہ اور خون (جوہر) میں اس کی غذائیت اور نیک و بد افعال سے پیدا ہوں۔یہی مادہ خواہشات حیوانی (کمزور

ذرّات) پیدا کرتا ہے۔

انسان ابتداءِ پیدائش میں ایک مکمل انسان پیدا ہوتا ہے۔ جب تک اس سے ارادۃً غیر فطری افعال کا صدور نہیں ہوتا پیدائشی طور اس میں کسی حد تک قلب کی لطافت حاصل ہوتی ہے۔ دراصل قلب کی لطافت گویا روح حیوانی کی لطافت ہوتی ہے۔یعنی انسان میں روح حیوانی ہی لطیف ہو جاتی ہے۔ جسکا رابطہ دل کی روح رحمانی سے ہو کر عکس حاصل کیا جاتا ہے۔ اگر اسے اپنی لطافت محفوظ رکھنے کی قدرت حاصل ہو تو یہ عقل کی پختگی پر روح جسمانی اور روح رحمانی سے کیفیات ادراک کرنے کی صلاحیت رکھتا ہے۔لیکن ایسا شاذ ہی ہوتا ہے۔ کہ کوئی شخص اپنی پیدائش کے ساتھ ہی ایسی مافوق الفطرت قوتوں کا حامل ہو۔ ایسے مخصوص اشخاص کو عقائد کی رو سے مادرزاد ولی (بطن الولی) کے نام سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ اسکا مطلب ہی یہ ہے کہ ایسے لوگ چونکہ ہر خوبی کے حامل ہوتے ہیں اور انکی پیدائش سے لے کر سن بلوغ تک انکی خوبی محفوظ و برقرار رہتی ہے۔اور بعد ارادے کی قوت کے یہ خود اپنی حفاظت کرتے ہیں۔ یہ لوگ ہمیشہ تندرست اور سالم القوت رہتے ہیں۔ ایسے لوگ مادیت سے ہمیشہ پاک رہتے ہیں اسلئے ان سے مافوق الفطرت واقعات کا بھی صدور ہوتا ہے۔ جسے کرامت کہتے ہیں۔ یہ کوئی خصوصی ملکہ نہیں۔ بلکہ انسان کی ذاتی ابتدائی تخلیقی قوت ہوتی ہے۔ جو ہر شخص کو حاصل ہوتی ہے۔لیکن چند مخصوص انسانوں میں یہ قوت سالم رہتی ہے۔اور عام لوگ یہ ملکہ حاصل نہیں کر سکتے اسلئے انہیں عقل کی پختگی کے بعد دوبارہ اپنی مادیت کا تزکیہ کرنا ہوتا ہے۔ مادیت کا تزکیہ کیا ہوتا ہے۔ کیسے کیا جاتا ہے؟ تزکیہ کا علم کیسے حاصل ہوتا ہے؟ کس سے حاصل ہوتا ہے؟ اس کی مکمل تفصیل کی ضرورت ہے۔ جس کی ابتدا انسانی ابتدائی پیدائش اور اس کی علمی خصوصیات سے کی جاتی ہے۔ تاکہ معلوم ہو سکے کہ انسان کو اس کی پیدائش میں کیا خصوصیات حاصل ہے۔

باب دوم

کائنات میں جب سے انسانی پیدائش کا ظہور ہوا۔ کائنات کی پیدائش کا یہ تقاضا تھا۔ کہ اس کی ابتدائی پیدائش کا انسان صحیح سالم اور تندرست ہو۔ کیونکہ وہ ابتدائی طور تمام قوتوں کو اپنی تمام خوبیوں کے ساتھ حاصل کئے ہوئے تھا۔ اسلئے اسکے لئے یہ کہنا مبالغہ نہیں کہ اسے اپنی ذات سے لے کر ـــــ کائناتِ ارضی ـــــ عالم روحانی ـــــ اور ذات باری تعالیٰ تک کا عرفان حاصل تھا ـــــ وہ انسان اول آدم تھا ـــــ چنانچہ قرآن حکیم[1] آدم کی ابتدائی خصوصیات کی خود شہادت دیتا ہے۔

وَاِذْ قَالَ رَبُّكَ لِلْمَلٰٓئِكَةِ اِنِّیْ جَاعِلٌ فِی الْاَرْضِ خَلِیْفَةً ط قَالُوْٓا اَتَجْعَلُ فِیْهَا مَنْ یُّفْسِدُ فِیْهَا وَیَسْفِكُ الدِّمَآءَ ج

ترجمہ۔ جب کہا رب نے ملائکہ سے کہ میں زمین میں ایک خلیفہ بنانے والا ہوں۔ ملائکہ نے کہا کیا تو زمین میں اُس مخلوق کو پیدا کرتا ہے۔ جو زمین میں فساد و خونریزی کرے گا؟

---

[1] قرآن حکیم وہ کتاب ہے۔ جو حضرت محمدؐ رسول اللہ پر نازل ہوئی۔ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم آخری نبی ہیں جنھوں نے گزشتہ انبیاء کی طرح انسان کو اپنی اصلی انسانیت کا سبق اسی قرآن کے ذریعہ دے کر انسان کو اسکی گمراہی کے بعد دوبارہ اپنے مقصدِ تفکر کی طرف مائل کیا۔ اسکی اصلاح کی اور اللہ اور اسکے روحانی عالموں کا ادراک کرایا۔ اور قرآن خود اس بات کی دلیل ہے۔ کہ یہ کتاب تمام گزشتہ کتابوں کی تصدیق کرتی ہے۔ اور اس میں انسانیت کو اس کی شرافت دوبارہ عطا کرنے کا بدرجہ اتم مواد موجود ہے۔

وَنَحْنُ نُسَبِّحُ بِحَمْدِكَ وَنُقَدِّسُ لَكَ ط قَالَ اِنِّیْٓ اَعْلَمُ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ ○ وَعَلَّمَ اٰدَمَ الْاَسْمَآءَ كُلَّهَا ثُمَّ عَرَضَهُمْ عَلَى الْمَلٰٓئِكَةِ لا فَقَالَ اَنْبِـُٔوْنِیْ بِاَسْمَآءِ هٰٓؤُلَآءِ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِیْنَ ○ قَالُوْا سُبْحٰنَكَ لَا عِلْمَ لَنَآ اِلَّا مَا عَلَّمْتَنَا ط اِنَّكَ اَنْتَ الْعَلِیْمُ الْحَكِیْمُ ○ قَالَ یٰٓاٰدَمُ اَنْۢبِئْهُمْ بِاَسْمَآئِهِمْ ج فَلَمَّآ اَنْۢبَاَهُمْ بِاَسْمَآئِهِمْ لا قَالَ اَلَمْ اَقُلْ لَّكُمْ اِنِّیْٓ اَعْلَمُ غَیْبَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ لا وَاَعْلَمُ مَا تُبْدُوْنَ وَمَا كُنْتُمْ تَكْتُمُوْنَ ○

(پارہ اول سورۃ ۲ آیت ۳۰ تا ۳۳)

اللہ نے کہا جو کچھ اس بارے میں مَیں جانتا ہوں۔تم نہیں جانتے۔اور پھر ہم نے آدم کوتمام اسماء۔یعنی ہم نے آدم کو عالم روحانی (تا ذات باری تعالیٰ) کی تمام کیفیات سے آگاہ کر دیا۔پھر آدم کو فرشتوں کے سامنے لاکر۔فرشتوں سے پوچھا۔اب اگر تم اپنے دعویٰ میں سچے ہو۔تو تم اپنی پاکیزگی میں کیا کچھ علم رکھتے ہو بیان کرو۔ ہر فرشتہ کچھ کہنے سے عاجز رہا۔اور کہا تو پاک ہے (غلطی سے) ہم نہیں جانتے صرف اتنا ہی جتنا تو نے ہمیں دکھایا۔تو ظاہر اور باطن کا جاننے والا ہے۔کہا اللہ نے۔اے آدم بتا اِن فرشتوں کو تمام کیفیاتِ سمٰوٰت وارض! پس اس نے تمام کیفیات (فرشتوں کے ملکوتی عالم کی خبریں) بتا دیں۔اور اللہ نے کہا اے فرشتو۔(تم تو بات کر گئے) میں نے نہ کہا تھا؟ کہ میں آسمانوں (جو تمہارا مسکن ہے) اور زمین (جو آدم کا مسکن ہے) کے چھپے ہوئے واقعات کا علم رکھنے والا ہوں۔اور وہ بھی جانتا ہوں جو کچھ تم ظاہر میں کہتے کرتے ہو۔اور وہ بھی جانتا ہوں جو تم مجھ سے چھپاتے ہو۔

یہ وہ ارادۂ ازلی تھا جو صرف زمین اور انسان کی تخلیق کے لئے مخصوص کیا گیا تھا۔اِنِّیْ جَاعِلٌ فِی الْاَرْضِ خَلِیْفَةً ۔اور پھر فرشتوں کے مقابلہ میں انسانی عظمت وقوتِ ادراک کا مظاہر وَعَلَّمَ اٰدَمَ الْاَسْمَآءَ كُلَّهَا سے بتایا گیا۔کہ انسان کی ذاتی صفت اسوقت یہ تھی کہ یہ تمام کیفیاتِ ارضی وسماوی سے پورا واقف وآگاہ تھا۔اوران تمام خوبیوں کا حامل انسان۔انسانِ اول آدم ہی تھا۔اپنی ابتدائی پیدائش میں اسکے وجود میں کسی قسم کی کمزوری نہ تھی۔اور اسکے وجود (روح جسمانی اور روح رحمانی) کی سالمیت کے ساتھ ہی اللہ تعالیٰ راہنمائے ازلی وحقیقی نے اس پر واقعاتِ عالمِ روحانی منکشف کرائے اور اسی کیفیت کے ساتھ آدم کو تمام روحانی قوتوں سے بھی تسلیم کرایا۔کہ انسان محض مٹی کا بنایا ہوا پتلا ہی نہیں جس کی مادیت سے صرف شر وفساد ہی ظاہر ہو۔نہیں بلکہ اس میں ایک ایسی عظیم الشان قوت بھی موجود ہے۔جو

تمام روحانی قوتوں سے بالاتر قوت ہے۔ چنانچہ قرآن اس واقعہ کو تفصیل کے ساتھ بیان کرتا ہے۔

وَاِذْ قُلْنَا لِلْمَلٰٓئِکَۃِ اسْجُدُوْا لِاٰدَمَ اور جب اللہ تعالیٰ نے ملائکہ کو حکم دیا کہ آدم کی فَسَجَدُوْٓا اِلَّآ اِبْلِیْسَ ط اَبٰی وَاسْتَکْبَرَ ق بڑائی تسلیم کرو۔ تو سب نے آدم کی عظمت کو تسلیم کیا۔ صرف ابلیس اِنہ مانا۔ اور تکبر کیا۔

اللہ تعالیٰ نے جس وقت آدم کا ذکر فرشتوں سے کیا کہ اِنِّیْ جَاعِلٌ فِی الْاَرْضِ خَلِیْفَۃً تو اس وقت آدم بنا نہ تھا۔ لیکن فرشتے اس کیفیتِ ارض اور خلیفہ کو سمجھتے تھے کہ زمین (ارض) کسے کہتے ہیں۔ کیسی ہوگی۔ اسکا مرکب کیا ہوگا۔ اسکی پیدائش کیسی ہوگی اور خلیفہ کے لفظ سے خلیفہ کی صفات سے بھی واقف تھے۔ یہی وجہ تھی کہ انہوں نے قبل از تخلیقِ آدم الارض اور اس کی پیدائش کو سمجھتے ہوئے کہا اَتَجْعَلُ فِیْهَا مَنْ یُّفْسِدُ فِیْهَا وَیَسْفِكُ الدِّمَآءَ۔ کہ اس ارض اور انسان کا مادہ تو فساد و خونریزی ہے۔ اسکے بنانے کی کیا ضرورت ہے؟ اگر تیرا مقصد ایسا انسان بنانے کا ہے جو خلیفہ ہو اور تیری تقدیس و تسبیح کرے اور تیرا مقصد صرف تسبیح و تقدیس ہے۔ تو ہم اِس کام کو تیرے لئے پورا کرتے ہیں۔ یہ کام انسان پورا نہیں کرسکتا۔ مگر فرشتے اس بات سے واقف نہ تھے۔ کہ آیا آدم کے مرکب میں صرف مادیت ہی ہے۔ یا اسکی برتری کی کوئی اور وجہ ہے۔ چونکہ انہیں اس بات کا علم نہ تھا کہ آدم کے مرکب میں اور کیا چیز ہوگی اسلئے انکے اس حقارت آمیز کلام پر انکی سرزنش نہیں کی گئی۔ صرف اتنے پر ہی بات ٹل گئی کہ قَالَ اِنِّیْٓ اَعْلَمُ مَالَا تَعْلَمُوْنَ۔ جو کچھ آدم کے بارے میں میں جانتا ہوں۔ وہ تم نہیں جانتے۔ تم تو صرف اسکی مادیت کا ہی تصور کرسکتے ہو۔ اس کی خوبی سے واقف نہیں۔ بس یہاں معاملہ ختم ہوا۔

اس کے بعد زمانہ گزرتا گیا۔ روحانی تخلیق ہوتی رہی اور پھر وہ وقت آیا جب زمین وجود

---

[1] یہاں فَسَجَدُوْا سے مراد سجدہ کرنا ہے۔ اور سجدہ کرنے سے مراد آدم کی عظمت و برتری کو تسلیم کرنا ہی تھا۔ لیکن ابلیس نے اسکی برتری تسلیم کرنے سے انکار کردیا۔ اور تکبر کیا۔

میں آئی اور اس میں آدم بنا اور مکمل ہو گیا۔ تو پھر آدم اور فرشتوں کا سامنا[1] کیا اور کہا کہ اب میں آدم کو مکمل کر چکا ہوں۔ اور اب تم اسکی تکمیل پر اسکی برتری کو تسلیم کرو۔ تو سب ملائکہ نے آدم پر نظر ڈالی۔ جب اس میں ایک عظیم الشان نور دیکھا تو سب سجدہ ریز ہو گئے۔ اور اللہ تعالیٰ نے فرشتوں کا لاعلمی میں اعتراض کرنا اور ان کی لاعلمی کا امتحان کیا۔ کہا۔ بتاؤ تم میرے اسرار اور عالم روحانی کے متعلق کیا کچھ جانتے ہو؟ سب فرشتوں نے صرف اپنے ماحول کی خبر بتائی۔ اس سے علاوہ ایک فرشتہ دوسرے فرشتہ کی خبر بھی نہ دے سکا۔ کہا اللہ نے کیا اس سے زیادہ تمہیں کسی چیز کا عرفان اور رسائی ہے؟ تو فرشتوں نے کہا بیشک تیرا کہنا صحیح ہے۔ تو غلطی سے پاک ہے۔ ہمیں اتنا ہی علم ہے جتنا تو نے ہمیں دیا۔ اور اب آدم کی باری آئی یہ وہ آدم تھا جو اپنی شرافت مادی میں تمام مرکبات مادی میں اشرف المخلوقات تھا۔ اور اسکے ساتھ ہی اللہ تعالیٰ نے وہ روح بھی اسے عطا کی تھی جس سے یہ تمام کیفیات روحانی (آسمانوں اور اس سے علاوہ جو کچھ تھا) تا ذات احدیت تک پہچان چکا تھا۔ تو اس نے تمام کیفیات فرشتوں کے سامنے بتا دیں۔ تو پھر فرشتوں کے سجدہ نہ کرنے میں کون سی چیز مانع ہو سکتی تھی۔ وہ صرف ایک ہی چیز تھی۔ وہ تکبر تھا۔ جو شیطان نے کیا۔ یعنی اس حالت میں بھی ابلیس نے آدم کو ماننے سے انکار کر دیا کہ میں اپنے آپ سے آدم کو کسی صورت میں بہتر و برتر دیکھنا نہیں چاہتا۔ لہذا میں اسے تسلیم نہیں کرتا۔

ان واقعاتِ قرآنی سے صاف عیاں ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انسان کو خصوصی طور ایک عظیم الشان قوت عطا کر کے اسے تمام مخلوقِ نوری۔ ناری اور مادی میں برتری عطا کی۔ اور یہ اللہ تعالیٰ کے ارادۂ ازلی میں ابتدا میں تھا۔ کہ انسان کو بناؤں گا اور اسے عرفان عطا کروں گا۔ اس خصوصی مقصد پر بہ نظر غور سوچا جائے۔ تو معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کا ارادہ صرف اتنا ہی تھا۔ کہ انسان بنے اور اسکا کام صرف مجھے پہچاننا ہو۔ اسی مقصد کیلئے اللہ تعالیٰ نے واضح طور انسانی مقصد کی وضاحت کر دی کہ وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْاِنْسَ اِلَّا لِيَعْبُدُوْنِ ○ (پارہ ۲۷ سورۃ ۵۱ آیت ۵۶)۔ یعنی میں نے جنوں اور

---

[1] ثُمَّ عَرَضَهُمْ عَلَى الْمَلٰٓئِكَةِ ۔ یہ وہ وقت تھا جب بعد کئی مدتوں کے آدم مکمل بنا۔

انسانوں کوصرف اس لئے پیدا کیا کہ وہ میری عبادت کریں۔ اور اسی عبادت کی تکمیل کیلئے یہ ایک فطری قاعدہ بنایا۔ کہ ہرانسان اپنی پیدائش میں مکمل ہو۔ اسے روح جسمانی اور روح رحمانی مکمل حاصل ہوتا کہ یہ میرا عرفان حاصل کرنے میں کسی مقام پر عاجز نہ ہو۔ اللہ تعالیٰ نے انسان کو جو کچھ عطا کیا۔ یہ سب بلا معاوضہ اور غیر مشروط طور پر عطا کیا۔ البتہ انسان سے ایک عہد لیا۔ وہ عہد کیا تھا۔ اَلَسۡتُ بِرَبِّکُمۡ۔ اللہ نے پوچھا کہ میں نے تجھے تمام کائنات پر فضیلت بخشی۔ اب وعدہ کر کہ کیا تو اس فضیلت پر قائم رہتے ہوئے مجھے ہی اپنا مالک اور اپنا بنانے والا جانے گا۔ کیا تو اس بات کا ہمیشہ شکر گزار رہے گا کہ میں نے ہی تجھے یہ سب کچھ عنایت کیا؟ اس نے کہا کہ بَلٰی بے شک میں وعدہ کرتا ہوں۔ کہ تجھے اپنا محسن سمجھوں گا اور محسن سمجھتے ہوئے تیرا شکر گزار رہوں گا اور تجھ ہی سے محبت کروں گا اور ہر وقت تیرا ہی تصور رکھوں گا۔ تو اللہ نے اِسے زمین میں ایک ایسے مقام پر بسایا۔ جہاں ہر طرح کی دنیوی آسائشیں اسے حاصل ہوسکتی تھیں۔ لیکن یہ مقام انسان کیلئے ایک آزمائش گاہ بنا۔ ابتدا میں آدم بھول گیا دنیوی عیش و آرام اسے اسقدر حاصل ہوا۔ کہ یہ ہر مضرت کو بھول گیا۔ اللہ نے آزمائشاً اسے ایک ایسی غذا کھانے سے منع کیا جس میں مادیت کا غلبہ تھا۔ لیکن انسان اپنے عہد کو عیش وافر میں بھول گیا۔ نتیجہ یہی ہوا۔ کہ انسان (آدم) پر مادیت نے غلبہ کیا اور اسکے قلب کی لطافت کم ہو گئی۔ اِدھر عرفان کا تسلسل ٹوٹ گیا۔ انسان حقیقت سے دور ہوا۔ اُدھر اللہ تعالیٰ نے عتاب فرمایا۔ کہ ابھی سے تو نے میرے وعدے کو بھلا دیا؟ اس غفلت کا نتیجہ یہ ہوا۔ کہ انسان کیلئے ایک ایسا خارزار مقرر کیا۔ کہ جہاں ایک طرف اُسے چوکنا رہنا پڑا اور دوسری طرف اسکے حصولِ عرفان کو طویل اور کٹھن کر دیا۔ اور کہا وَقُلۡنَا اهۡبِطُوۡا بَعۡضُكُمۡ لِبَعۡضٍ عَدُوٌّ ۚ وَلَكُمۡ فِى الۡاَرۡضِ مُسۡتَقَرٌّ وَّمَتَاعٌ اِلٰى حِيۡنٍ ۝ (پارہ اول سورۃ ۲ آیت ۳۶)۔ جاؤ اب زمین میں پھرو اور خود اپنی روزی بناؤ اور کھاؤ اور اب تم اس روزی کیلئے لڑو گے اور ایک دوسرے کے دشمن بنو گے (جیسا کہ فرشتوں نے کہا تھا) اور تمہارے لئے ایک وقت مقرر رکھا گیا۔ اس وقت کے اندر اندر جس نے اپنی خوبیوں کی حفاظت کی اور

مجھ تک پہنچا۔وہ اپنی ذمہ داری میں کامیاب سمجھا جائے گا۔اور آئندہ زندگی میں اسے راحت واطمینان اور دائمی قربِ خداوندی حاصل ہوگا۔اور جو بھولا اور اس زمین کے خارزار میں اُلجھ کر رہ گیا۔اور مادیت کے حصول میں اپنا معین وقت کھوڈالا۔وہ آئندہ زندگی میں مجھ سے بھی دور اور دردناک عذاب میں رہے گا۔پھر انسان کی سفلی فطرت کا خیال کر کے اسکے حصول عرفان میں آسانی کردی اور کہا فَاِمَّا یَاْتِیَنَّکُمْ مِّنِّیْ هُدًی فَمَنْ تَبِعَ هُدَایَ فَلَا خَوْفٌ عَلَیْهِمْ وَلَاهُمْ یَحْزَنُوْنَ ○ (پارہ اول سورہ۲ آیت ۳۸)انسان اپنی غلطی پر اور اپنے نتیجۂ اعمال میں نادم۔خوف زدہ۔اور غمگین تھا۔اسکے ہاتھ سے ایک عظیم الشان نعمت کھو چکی تھی۔اللہ تعالیٰ نے رحم کیا اور انسان کو تزکیہ کی ترکیب سکھائی۔فَتَلَقّٰی اٰدَمُ مِنْ رَّبِّهٖ کَلِمٰتٍ (پارہ اول سورۃ۲ آیت ۳۷) آدم کا قلب کمزور ہو چکا تھا۔تو اللہ تعالیٰ نے خود اس کے دل پر القا کیا کہ تم اب اپنے گناہ کے لئے دوبارہ وعدہ کرو کہ اب ایسا نہیں کروں گا۔اور مادیت سے پاک رہو۔تاکہ یہ مادیت تم سے صاف ہو جائے سو آدم نے دوبارہ احساسِ گناہ کے ساتھ مادیت (مادی غذاؤں) سے اجتناب کیا یہاں تک کہ اسکے قلب میں دوبارہ قوت آگئی پھر اللہ تعالیٰ کا عرفان اسے حاصل رہا فَتَابَ عَلَیْهِ اور اللہ تعالیٰ اس سے خوش ہوا اور اسکی طرف رجوع کیا۔اب آدم اسی حال میں زندگی بسر کرتا رہا۔یہاں تک کہ اسکی اولاد کا سلسلہ شروع ہوتا گیا۔

آدم کے بعد اولادِ آدم میں کیا واقعات رونما ہوئے تو اریخ شاہد ہے۔قوموں میں فساد و خونریزی ہوئی۔انسان اپنے مقصد کو بھولا۔اسکا عرفان ختم ہوا۔اور یہ مادیت میں ملوث حقیقت سے دور ہوتا گیا۔لیکن وعدہ الٰہی پورا ہوا۔کہ اس نے انسان کیلئے ایک راہنما بھیجا جس نے انسان کا تزکیہ کیا۔اسے علم بتایا۔اور اللہ کی طرف سے بھیجا ہوا ہدایت نامہ لوگوں کے سامنے پیش کیا۔کہ وہ اس ہدایت نامہ پر چل کر پھر اپنے اصلی مقام کو جالیں۔یہ راہنما آدم کی اولاد میں ہی بنی آدم۔انسان۔اور بشر تھے۔لیکن انکی وہ قوتیں جو انسان کو ازل سے عطا کی گئی تھیں سالم تھیں انہیں قوتوں کی سالمیت کی وجہ سے انہیں اللہ کی طرف سے وحی حاصل ہوتی رہی۔یہ ہستیاں عام لوگوں کے مقابلہ میں ایک راہنمایانہ حیثیت رکھتی تھیں۔اسلئے اللہ نے اپنی تعلیمِ حقیقی کا اجرا۔انہیں ہستیوں کے ذریعہ کیا اسلئے

انہیں منتخب پیغمبر کے نام سے خطاب کیا گیا۔

دنیا میں پیغمبر آئے انہوں نے قوموں کی اصلاح کی لیکن ایک بار منزل سے گرا ہوا انسان دوبارہ اپنا مقام کلی طور حاصل نہ کر سکا یہاں تک کہ وہ وقت آن پہنچا جسکے لئے اللہ تعالیٰ نے کائنات کی تخلیق کی ابتدا کی تھی تا کہ کائنات میں ایک خلیفہ کا تقرر ہو۔ اور مشاہدہ الٰہی کی ارزانی ہو اور انسانیت کی تکمیل ہو۔ وہ زمانہ آ گیا۔ جس دن ہزار سالہ زرتشتی آگ ٹھنڈی ہو گئی! قیصر و کسریٰ کے ایوان میں زلزلہ آیا! ابلیس نے اپنا سینہ کوٹا کہ سب تاریکیاں یکسر نور میں بدل گئیں۔ یعنی حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مکمل ہدایت لے کر دنیا پر نازل ہوئے ـــــ یہی وہ خلیفہ ہیں جنکی خلافت کا اللہ تعالےٰ نے ابتدا میں ارادہ کیا۔ کہ اِنِّیْ جَاعِلٌ فِی الْاَرْضِ خَلِیْفَةً ۔ یہی وہ خلافت (قرآن) کے قوانین الٰہی تھے جو ایک خالق و مالک حکمران کے بعد اسکے قائم مقام نے کائنات پر جاری کئے۔ یہ قوانین دولت و حکمرانی کے نہ تھے بلکہ عرفانِ الٰہی کے تھے۔ اور یہی وہ خلیفہ تھے جنہوں نے بدرجہ اتم قوانین الٰہی ـــــ وعدہ الٰہی (اَلَسْتُ بِرَبِّکُمْ) کی تکمیل بَلٰی کہہ کر کی ـــــ حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ابتدا انتہا جب تک قرآن اور دنیا ہیں۔ خلیفہ ہیں۔ راہنما ہیں۔ عارف ہیں۔ بقا باللہ ہیں۔ اور انہیں کی حکومتِ روحانی قیامت تک جاری رہے گی۔

حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات مقدس اور آپکی شریعت پر بغور مطالعہ کرنے سے واضح ہوگا۔ کہ آپکی شریعت صرف اللہ تعالیٰ کا عرفان (روح جسمانی اور روح رحمانی کے ذریعہ) حاصل کرنے کیلئے تھی۔ اور حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم آپکے زمانہ سے لے کر قیامت کے آخری فرد تک کیلئے ایک راہنما ہیں جو ہر شخص کا تزکیہ کرانے والے ہیں۔ علم بتانے والے ہیں۔ اور حکمت (چھپی باتیں) بتانے والے ہیں۔

تواریخ سے حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کی مقدس زندگی کا مطالعہ کرنے سے معلوم ہوگا۔ کہ آپکی مقدس زندگی کی ابتدا اسی تزکیہ و عرفان سے ہوتی ہے۔ اور آپکی زندگی کا عمل ہی ہمارے لئے راہنمایانہ حیثیت میں مشعلِ راہ ہے۔ جس سے ہم تزکیہ۔ مشاہدہ اور عرفان الٰہی حاصل کر سکتے ہیں۔

حضور علیہ الصلوۃ والسلام کی مقدس زندگی کے ابتدائی واقعات پر مطالعہ کرنے سے معلوم ہوگا۔ کہ آپکی پیدائش ایک مجسم معجزہ تھی۔ اللہ تعالیٰ نے انسانِ اول حضرت آدمؑ کو مکمل انسان بنا کر بھیجا۔ اسی طرح حضور علیہ الصلوۃ والسلام بھی مکمل انسان کی حیثیت سے پیدا ہوئے۔ حضرت آدمؑ کو ایک زمانہ جنتِ ارضی میں مستقل اطمینان اور فارغ البالی کا حاصل ہوا۔ مگر حضور علیہ الصلوۃ والسلام کو انسان کا دوسرا مقام کٹھن خارزار اور وہ بھی انتہائی ظلمت کدہ میّسر ہوا۔ حضرت آدمؑ کو اللہ تعالیٰ نے تزکیہ سکھایا مگر حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مجسم تزکیہ تھے۔ اب دیکھنا ہے کہ آپکا تزکیہ کیا تھا۔ وہی تزکیہ کی تفسیر ہوگی۔ اور آپکو تزکیہ سے کیا حاصل ہوا۔ وہی ہمارے شریعت ہوگی۔

حضور علیہ الصلوۃ والسلام کی ابتدائی زندگی یہ تھی کہ فطرۃ نے آپکا اسم مقدس محمدؐ واحمدؐ رکھا سو تمام کائنات میں محمدؐ اور احمدؐ کے نام سے پکارے گئے۔ مکّہ کے فاضل عالم۔ فلسفی۔ شاعر۔ ادیب اس نام کو سُنکر تعجب میں آئے کہ آپکا نام مقدس آجتک کسی عامی۔ کسی نبی۔ کسی فرعون۔ کسی بادشاہ کا نہیں ہوا ہے۔ اور پھر اس نام مقدس کو جاننے والے یہ اچھی طرح سمجھ سکتے ہیں کہ محمدؐ کے معنی تمام کائنات میں تعریف کئے گئے۔ صمیم قلب اور عقل کی گہرائی سے اس تعریف کا سمجھنا ضروری ہے۔ کہ محمد۔ حمد۔ تعریف کے کیا معنی ہیں؟۔ اور اس بارے میں ہوش وخرد سے احتیاط کرنا لازمی ہے۔ کہ اس ہستی کیلئے جسکی پیدائش ارادہ ازلی میں تھی۔ اور جس خلیفہ کی پیدائش کے لئے اتنا وسیع نظام کائنات پیدا کیا گیا۔ اس ذاتِ گرامی کی شان میں کوئی شخص بھی گستاخی سے کام نہ لے۔ اور آپؐ کی شان مقدس پر کسی قسم کا حرف زبان پر نہ لائے۔

هزار بار بشویم دهن ز مشک و گلاب   هنوز نام تو گفتن کمال بے ادبیست

جس ہستی کا نام محمدؐ واحمدؐ ہو ان کی شان ایک معمولی آدمی سے بھی گرانا تمام خداوندی سے انحراف وروگردانی ہے۔ محمد سے مراد حمد کیا گیا۔ محمدؐ وہ ہے جس ہستی کی حمد ابتدائی مخلوق سے لے کر آخری مخلوقِ آسمان وزمین نے بدرجہ اتم کی ہو۔ محمدؐ سے مراد کائناتِ خلقت میں سب سے زیادہ خوبی والا۔ محمدؐ سے مراد۔ کائناتِ خلقت کی تمام خوبیوں کا مرکب۔ اور حمد سے مراد۔ قلب میں ان جذبات کا پیدا ہونا

جن میں کسی شے کی خوبی کا اثر اس قدر پیدا ہو کہ انسان پر بے خودی کی کیفیت طاری ہو جائے۔ جیسے جب ہم باری تعالیٰ کی مخلوق میں کسی شے پر غور کریں تو اس شے میں قدرت کی کاری گری دیکھ کر ہم پر ایک وجدانی کیفیت طاری ہو جاتی ہے اور یہ کیفیت ہمارے قلب پر اسقدر اثر پذیر ہو جاتی ہے۔ کہ ہم اسکی کاریگری اور اسکی قدرت کاملہ پر متحیر ہو کر بے خود ہو جاتے ہیں۔ حمد کی یہی اصلی کیفیت ہے۔ اسکے بعد اسکی دوسری کیفیت جب ہم اللہ تعالیٰ کی عنایت کردہ اشیاء کو (جو ہمارے لئے ہی وقف کی گئی ہیں) استعمال کرنے کے بعد ایک راحت حاصل کرتے ہیں۔ تو اللہ تعالیٰ کے اس بلا معاوضہ احسان پر ہمارے قلب میں تشکر کے جذبات پیدا ہو جاتے ہیں۔ ان جذبات میں بھی اسکی کاریگری اور اسکی عنایت کا متشکرانہ تاثر ہوتا ہے اور اس اثر میں بھی تحیّر اور بے خودی پائی جاتی ہے۔

اس میں شک نہیں کہ حَـمْـد کی صفت اللہ تعالیٰ سے ہی متعلق ہے۔ کہ وہ اس قابل ہے۔ کہ خالق ہونے کی حیثیت سے جتنی بھی مخلوق میں خوبیاں پائی جاتی ہیں۔ وہ سب اسی کی ذات احدیت سے ہیں۔ اور جسقدر مخلوق میں خوبصورت نظام اور ترتیب واقع ہے وہ اُسی کی صناعی کی خوبیاں ہیں۔ اور انہیں خوبیوں کے جذباتی تاثرات جب ہمارے قلب پر طاری ہوتے ہیں تو ہم بے ساختہ کہہ اٹھتے ہیں۔ کہ یہ سب تعریف اللہ کی ہے۔ اور یہ تعریف (حمد) خود قرآن نے ہمیں سکھائی ہے۔ کہ اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ۔ وَلِلّٰهِ الْحَمْدُ۔[1] یعنی کارخانہ عالم میں ہر شے مخلوق کی پیدائش میں ایک مترتب نظام کے تحت اسے اپنے سامانِ زندگی کا حاصل ہونا۔ یہ سب اللہ تعالیٰ کی کاریگری ہی سے حاصل ہے۔ اس کیفیت میں دو قسم کے جذبات ہوتے ہیں۔ ایک اس کی بہترین صناعی (کاریگری) پر تحیّر و بے خودی۔ دوسرا بلا معاوضہ احسان پر جذبۂ تشکّر۔ ان ہر دو کیفیات کا اثر جو ہمارے قلب پر طاری ہوتا ہے۔ حَـمْـدْ کہلاتا ہے۔ اور یہ امر مسلمہ اور حقیقت ہے۔ کہ اس حمد کا مستحق وہی اللہ ہے۔ جو کائناتِ ارض و سماوات کا واحد خالق ہے۔ اس جیسا خالق کوئی نہیں۔ اسلئے اسکی ذات

---

[1] اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِىْ لَهٗ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ۔ تمام تعریف اُسی اللہ کی ہے۔ جس سے یہ سب آسمان و زمین ہیں۔

کی تعریف ـــــ اس کی صفت ربوبیت اسی حمد سے ہوسکتی ہے۔اسکا مطلب بھی یہی ہے۔اللہ ہی ہے جسکی بدرجہ اتم حمد کی جائے۔اور تمام مخلوقِ ارضی پر واجب ہے کہ وہ اس اللہ کی حمد کرے جو خود اس حمد کا مستحق ہے۔

یہی حَمْدُ اسم مُحَمَّد میں بھی پائی جاتی ہے۔یعنی حمد کیا گیا۔اور حمد کی تعریف میں۔ جذبات وکیفیات۔تاثرات۔جب تک اپنی انتہا اور کمال کو نہ پہنچیں حمد نہیں کہلاتی۔اب دیکھنا یہ ہے۔جو صفت صرف اللہ کی ذات کیلئے ہو وہی صفت محمدؐ کے اسم مقدس میں کیسے آتی ہے؟

جہاں تک حقیقت کا تعلق ہے۔حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام اللہ کے نبی ہیں۔پیغمبر ہونے کی حیثیت سے حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کا ہر قول وفعل وحی سے تعلق رکھتا ہے۔یعنی حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کے اقوال وافعال ہر انسان کے لئے مشعلِ راہ ہیں۔تو عام آدمیوں کے مقابلہ میں کوئی شخص یہ گمان نہیں کرسکتا کہ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کا یہ نامِ مقدس رواجی طور رکھا گیا۔کیونکہ عرب میں اسوقت ہر شخص کا نام اسکی صفت کے مطابق رکھا جاتا تھا۔اور عربی زبان میں ہر نام کے معنی پائے جاتے ہیں۔اور لوگوں کی صفتوں کے مطابق ہی۔لقب۔کنیت۔اور نام پائے جاتے ہیں۔چنانچہ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کے نام رکھنے پر تواریخ شاہد ہے۔کہ لوگوں نے حضرت عبدالمطلب سے سوال کیا کہ آپ نے اپنے مستعمل ناموں میں سے کیوں آپکا نام نہیں رکھا۔بلکہ آپ نے انکا وہ نام رکھا جو آج تک کسی کا نہیں رکھا گیا؟ تو آپ نے جواب دیا۔کہ میں چاہتا ہوں۔کہ میرا بچہ تمام مخلوق میں حمد کیا جائے۔ہوسکتا ہے۔کہ حضرت عبدالمطلب کی یہ دلی خواہش ہو۔اور اسی لئے انہوں نے۔ اپنی مرضی سے یہ نام رکھا ہو۔لیکن باری تعالیٰ اپنے بندے (پیغمبر) کے ساتھ کوئی ایسی کمزوری نہیں رکھتا جس میں شُبہ یا اعتراض کی گنجائش ہو۔یا وہ چیز فطرت کے خلاف ہو۔اور خود حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام اس کام پر مامور ہوئے کہ جو صفت صرف اللہ تعالیٰ کے لئے مقرر کی گئی ہو وہ کسی غیر معبود سے متعلق نہ کی جائے۔تو حضورؐ خود اپنے نام مقدس میں اگر انہیں کسی قسم کی غیر فطری توصیف نظر آتی قبول نہ فرماتے۔چنانچہ اللہ تعالیٰ خود بھی اس نام مقدس کی تائید کرتا ہے۔وَمَا مُحَمَّدٌ اِلَّا رَسُوْلٌ" یہاں

باری تعالیٰ بھی خود حضور علیہ الصلوۃ والسلام کو اسی صفت سے پکارتا ہے۔ جس صفت کو وہ صرف اپنی ذات کیلئے مختص کرتا ہے۔ کہ اَلۡحَمۡدُ لِلّٰہِ رَبِّ الۡعٰلَمِیۡنَ اگر یہ صفت حضور علیہ الصلوۃ والسلام کی فطری اور حقیقی نہ ہوتی تو باری تعالیٰ اس نام سے حضور علیہ الصلوۃ والسلام کو نہ پکارتا۔ اس امر سے یہ ثابت ہوتا ہے۔ کہ جو مادہ باری تعالیٰ کی حمد میں اللہ تعالیٰ کی ذات کے لئے مقرر ہے۔ وہی مادہ محمد کی حمد میں حضور علیہ الصلوۃ والسلام کے لئے مقرر کیا گیا ہے۔ سوال یہ پیدا ہوتا ہے۔ کہ اگر حمد میں ایک خالق کی بدرجہ اتم خوبی پائی جاتی ہے۔ اور وہی خوبی محمد میں بھی پائی جائے۔ تو یہ امر خلاف فطرت ہوگا۔ کہ ایک مخلوق کے دو خالق نہیں ہو سکتے۔ یا دو ہستیاں ایک ہی خوبی کی بدرجہ اتم مالک نہیں ہو سکتیں۔ اور صفت کلی کیلئے جب تک ایک ہی ہستی نہ پائی جائے وہ درجہ اتم تک نہیں پہنچتی۔ لہذا اس طرح ایک خالق کی خالقیت اور اسکی خوبی میں فرق پیدا ہوتا ہے۔ اور ایک غیر خالق کو خلاف فطرت خالقیت کا درجہ دیا جاتا ہے۔ سوال اپنی جگہ پیدا ضرور ہوتا ہے لیکن اس سوال کی صحت پر ہم قطعیت کے ساتھ فیصلہ نہیں دے سکتے۔ وہ اسلئے کہ حمد کی تعریف (معنی) اگر ہم مندرجہ بالا کیفیت میں نہ دیں تو پھر ایک خالق کو ہم اسکی بدرجہ اتم خوبیوں میں کسی اور صفت سے موصوف نہیں کر سکتے ہیں۔ اسلئے ایسی کیفیت میں ہم اس خوبی کو پانے کی کوشش کریں جو دونوں ہستیوں میں مشترک ہو چنانچہ قرآن خود اس کی وضاحت کرتا ہے۔

جہاں اللہ تعالیٰ نے باطل معبودوں کے مقابلہ میں ایک اللہ کی اطاعت کا حکم دیا۔ کہ اَطِیۡعُوا اللّٰہَ وہاں اسی اطاعت کیلئے رسول کے لئے بھی حکم دیا۔ وَاَطِیۡعُوا الرَّسُوۡلَ ۔ یہاں اطاعت کا مواد ایک ہی ہے۔ لیکن ہر ہستی کیلئے اسکی ذات وہیئت کے مطابق ہی اطاعت کی جائے گی۔ ہم اللہ کو خالق۔ رب العٰلمین۔ تصور کرتے ہوئے اسی کے آگے سجدۂ بندگی کریں گے۔ لیکن حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کے لیے یہ طریق اختیار نہ کریں گے۔ بلکہ حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کیلئے ہمارا طریقِ اطاعت ایسا ہوگا جیسا ایک غلام کو آقا کے ایک قائم مقام (خلیفہ) کیلئے ہونا چاہئے۔ کہ حکم اُسی آقا کا چلتا ہے۔ لیکن کسی دوسرے وجود سے وہ احکام صادر ہوتے ہیں۔ اس نوعیت میں ہماری

اطاعت کا تاثر دونوں ہستیوں کیلئے ایک ہی کیفیت کا ہوگا۔ اللہ تعالیٰ کا حکم ہے۔ ورکعو۔ وسجد۔ اس حکم پر اطاعت یہ ہے۔ کہ رکوع وسجود اسی کیلئے مخصوص کیا جائے۔ یہ اطیعوا اللّٰہ ہے اور اس اطاعت کی ترکیب حضرت محمدؐ رسول اللہ نے بتائی۔ تو اطیعوا الرّسول یہ ہے۔ رکوع وسجود کے ادا کرنے کیلئے جو حکم رسول کرے من وعن وہی کرو۔ گویا حکم اللہ کا رکوع کرو۔ سجدہ کرو۔ مگر حضورؐ فرماتے ہیں کہ اس طرح کرو تو ہم اسی طرح کرتے ہیں۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ ہم اسوقت حضورؐ کی اطاعت کرتے ہیں۔ مگر مقصود ہمارا۔ اطاعت الٰہی ہے۔ اس طرح اطاعت کی نوعیت بالکل یکساں ہوگی مگر تاثر علیٰحدہ ہوگا۔ چنانچہ قرآن خود اس تاثر کا اظہار کرتا ہے۔ قُلْ اِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّوْنَ اللّٰهَ فَاتَّبِعُوْنِىْ يُحْبِبْكُمُ اللّٰهُ ۔ (پارہ ۳ سورۃ ۳ آیت ۳۱) اے نبی لوگوں سے کہہ دیں کہ اگر تم واقعی اللہ سے محبت رکھتے ہو تو میرا اتباع کرو اللہ تم سے محبت کرے گا۔ اس کیفیت میں اللہ تعالیٰ نے صاف طور حضور محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات مقدس کو خلیفہ کا درجہ دے کر ایک مومن کے لئے طریق اطاعت میں وہی تاثر پیدا کرنے کا طریق بتا دیا جو اسکی ذاتِ احد کے لئے مختص ہے۔ اور اس کیفیت میں کوئی فرق خلافِ فطرت محسوس نہیں کیا جاتا۔ کیونکہ حکم اور مقصود ـــــ دونوں کیفیتیں ذاتِ احد کے لیے ہی وقف ہو جاتی ہیں ـــ البتہ جو کیفیت دونوں ہستیوں کے لئے مشترک پائی جاتی ہے وہ حب میں سما جاتی ہے۔ یعنی اللہ کی محبت کیلئے جو چیزیں تم ترک کرتے ہو۔ وہی چیزیں تم نے رسول کی محبت کیلئے ترک کرنی ہیں۔ گویا ماسوائے رسول ہر شے ترک کرنا اور اتباع رسول ہی حُب کہلاتا ہے۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ کی اطاعت کے لئے بھی ماں باپ۔ اولاد۔ مال ہر شے ترک کرنے کا حکم ہے۔ اور رسولؐ کی محبت میں بھی یہی چیزیں ترک کرنے کا حکم ہے۔ ارشاد نبویؐ ہے۔

لَا يُؤْمِنُ اَحَدُكُمْ حَتّٰى اَكُوْنَ اَحَبَّ اِلَيْهِ مِنْ وَّالِدِهٖ وَوَلَدِهٖ وَالنَّاسِ اَجْمَعِيْنَ (متفق علیہ)

تب تک ایک شخص مومن (مسلمان) نہیں ہوسکتا جب تک محبت نہ کرے ہم سے ماں باپ اور ہر شخص سے زیادہ۔

اس سے ثابت ہوتا ہے۔ کہ دو ہستیوں سے متعلق مشترک صفات کا استعمال کرنا خلاف

فطرت نہیں۔ ان آیاتِ قرآنی کی روشنی میں جب ہم محمد کی حمد میں مواد کو تلاش کریں۔ تو اسکی ابتدائی کیفیتوں کا مطالعہ کرنا لازمی ہے۔ محمد اسم مقدس کے ساتھ حضور علیہ الصلوۃ والسلام کا اسمِ مقدس احمد بھی ہے۔ احمد کے معنی تمام مخلوقِ ارض وسمٰوٰت میں بدرجہ اتم حمد کرنے والا۔ اس اسم مقدس میں بھی حمد کا وہی تاثر ہوگا۔ جو ایک حمد کرنے والے کیلئے لازم آتا ہے۔ یعنی ایک خالق کی خوبیوں کو پانے میں اور اس کی عنایتوں کے حاصل ہونے میں قلب پر جو وجدانی کیفیت و بے خودی طاری ہو۔ اس کیفیت کا بدرجہ اتم مخلوقِ ارض وسمٰوٰت میں پانے والا۔ بالفاظ دیگر اللہ تعالیٰ کی خالقیت اور اللہ کو خالق ہونے کی حیثیت میں پہچاننے والا ـــــ پہچان سے مراد عرفان اور قرب کے ہوتے ہیں۔ گویا حضور محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس ذاتِ احد کو اپنی ابتدا سے پہچانا ـــــ اور سب سے زیادہ پہچانا۔ اور جب ہم حضور علیہ الصلوۃ والسلام کی اس خوبی کو ایک خلیفہ قائم مقام ہستی سے متعلق کردیں۔ تو اسکا مطلب یہ ہوگا۔ کہ حضور علیہ الصلوۃ والسلام ہی مخلوقِ کائنات میں سب سے پہلی ہستی ہیں۔ جنہوں نے اللہ کے عرفان کی ابتداء کی۔ اور نورِ محمدیؐ کی پیدائش کے ساتھ ہی (اسی نور سے) عرفانِ الٰہی کا سلسلہ جاری ہوا۔ اور یہ کیفیت عرفان آپؐ کے نوری وجود کے اعتبار سے تھی۔ اور یہی نور محمدیؐ آپکی روح رحمانی سے تعبیر ہے اور جسمانی طور خلیفہ کی حیثیت میں آپ نے ہی حضرت محمدؐ رسول اللہ کی شکل میں عرفان الٰہی وحمد کی بدرجہ اتم تکمیل کی۔ گویا ارادہ ازلی کی ابتدا بھی نور محمدیؐ سے ہی ہوئی۔ اور اسکی تکمیل کی ابتدا بھی آپؐ کی نوری پیدائش سے شروع ہوئی۔ خلیفہ الارض پر آکر اس ارادۂ ازلی کی تکمیل ہوگئی۔ اور عرفان کا تقاضا یہ ہے۔ کہ بدرجہ اتم عارف ہی اللہ کے زیادہ قریب ہوسکتا ہے۔

اسکے کارخانہ قدرت کے نظام پر جب ہم مطالعہ کرتے ہیں۔ تو معلوم ہوتا ہے کہ یہ تمام مخلوق کسی اور مواد سے نہیں بنی۔ بلکہ اسی نور ازلی سے بنی جسکی ابتداء کی وسعت نہیں پائی جاتی ـــــ اس وسعت اور لا انتہا قوت کو پہچاننے کیلئے اسی ہیئت کے مطابق وہی قوت بطریق اولیٰ پہچان سکتی ہے۔ جو اس نورِ حقیقی کی قریبی جُز ہو۔

جب ہم اس کائنات کی تخلیق پر تفکر کرتے ہیں۔ تو معلوم ہوتا ہے۔ کہ ایک لا ابتدا محیط

خالق کے نور سے ہی ہر شے کی ابتدا ہوتی ہے۔ اور جب ہم اس خالق کے ارادۂ ازلی کے ابتدائی کُن کا تصور کرتے ہیں۔ تو یہ امر لازمی ہے۔ کہ اس نے اپنے ہی نور کے حُکمِ کن سے اس مخلوق کی ابتدا کی۔ اور جب ہم حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی صفتِ حمد کا تصور کرتے ہیں۔ تو یہ امر صاف ظاہر ہوتا ہے کہ احمد۔ خلیفہ۔ اطاعت اور حُب کی تمام خاصیتیں اسی نور ابتدائی میں بدرجہ اتم سما سکتی ہیں۔ جو نور ارادۂ ابتدائی میں سب سے پہلے پیدا ہوا۔ یہ نور اپنی تخلیق میں محمد ہے۔ اور جب سوائے ایک اَحَدُ کے دوسرا خالق نہیں ہوسکتا! تو وہ نورِ احد اس احمد کی کیفیتِ نوری میں اپنا ہی بنیادی وجود رکھتا ہے۔ اور جتنی بھی خوبیاں تخلیق کائنات میں پائی جاتی ہیں وہ سب بنیادی حیثیت میں نورِ احد کی ہی ہیں۔ کیونکہ بنیادی وجود تو ذاتِ الٰہی کا ہی ہے۔ اور ابتدائی نور کی حیثیت میں۔ اسی نور محمدیؐ سے تمام مخلوق کا وجود ظہور پذیر ہوا۔ تو اب ہر خوبی دو مشترک ہیئتوں کی خوبی تصور کی جائیگی۔ ایک ذات کے اعتبار سے دوسری صفات کے اعتبار سے۔ اور خوبی سے مراد تو پہچان ہے۔ اسلئے حمد سے مراد یہ ہوگی۔ کہ پہچان تو اس ذاتِ احد کی ہے۔ لیکن نور محمدیؐ کی صفت میں۔ یعنی نورِ محمدیؐ کی حمد ہی ذاتِ الٰہی کی حمد تصور کی جائے گی۔ اسلئے ہر دو ہیئتوں کیلئے حمد ایک ہی کیفیت میں پائی جائے گی۔ اسکا مطلب یہ ہوا کہ کائنات کی تخلیق میں اس کی ہر شے میں جو خوبی پائی جاتی ہے۔ وہ متشکل بہ نور محمدیؐ ہے۔ اسلئے اسکی پہچان نور محمدیؐ ہی کی پہچان ہے۔ اور ان اشیاء میں بنیادی وجود ذات باری ہی کا ہے اسلئے یہ حمد دراصل ذات باری تعالیٰ کی بھی ہے۔ محمدؐ خود خالق نہیں بلکہ خلیفہ ہیں۔ اسلئے حُب کے زیر اثر جب بھی تفکر کیا جائے تو اس میں گویا نور محمدیؐ کی ہی پہچان ہوگی۔ اسلئے کائنات کی ہر خوبی میں نور محمدیؐ ہی جلوہ فگن ہے۔ اور قُلْ اِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّوْنَ اللّٰهَ فَاتَّبِعُوْنِیْ يُحْبِبْكُمُ اللّٰهُ کا اشارہ صاف ظاہر کرتا ہے۔ کہ محمدؐ رسول اللہ کی تابعداری میں آپکی محبت کو اسقدر وسعت دینی ہے۔ کہ کائنات کی ہر شے میں اسکی ظاہری شکل گم ہو جائے اسکی جگہ حقیقت محمدیؐ (نور محمدیؐ) کا تصور ہمارے قلب میں باقی رہے۔ یہی عرفان محمدیؐ فنا کی صورت میں حاصل ہو جائے۔ اسی کیفیت کو محمد سے تعبیر دیا جاتا ہے۔ اور اسی تصور میں جب جذب طاری ہو جائے گا۔ تو ہم اسی نور محمدیؐ میں فنا ہو جائیں

گے۔ جسے ہم اس ابتدائی مقامِ تخلیق نورِ محمدیؐ پر پہنچ کر عرفانِ الٰہی کی تکمیل کریں گے۔

محمدؐ کی حمد کا یہی مطلب ہے۔ کہ کائنات کی ہر شے میں نورِ محمدیؐ ہے۔ باالفاظ دیگر ہر شے نورِ محمدیؐ سے بنی ہے۔ جب ابتداء میں باری تعالیٰ نے ایک نور تخلیق کیا۔ تو اس تخلیق کی ترکیب میں کسی غیر شے یا غیر وجود کا پیدا کرنا نہیں تھا۔ بلکہ ایک لامحدود نورِ احد کی ایک جُز کو ایک ہیئت دیکر اس کا نام محمدؐ رکھا۔ یہ نام اس نور کی خوبی کے اعتبار سے تھا جو خوبیاں اس نور میں پائی جاتی تھیں۔ اور اس نور کا نام پایا جانا درحقیقت اس نور کی انتہائی خاصیت وصفت کے بنا پر محمد ہی ہونا چاہیئے۔ کیونکہ ارادہ ازلی کے اَلْاَرض وخلیفہ کی تخلیق کیلئے (جب کہ تمام کائنات کا وجود سوائے ذات الٰہی کے اور کہیں سے بھی میّسر نہیں ہوسکتا) ابتدائی حرکت کا پیدا کرنا اسی ترکیب سے ہوسکتا تھا۔ کہ ذات باری تعالیٰ اپنی ہی ذات سے ایک نور کو (تخلیق کے لئے) مخصوص کرے اور اسی سے منازل در منازل۔ پے در پے کیفیات بنا کر اسکی آخری ہیئت میں اَلْاَرض اور ارض میں خلیفہ کا ظہور ہو۔ تخلیقی اعتبار سے ابتدائی نور کیلئے سوائے محمد کے اور کوئی نام نہیں ہوسکتا ہے۔ جبکہ اس نور سے منازل ومراحلِ راہ عرفان بنے۔ اور انہیں راہوں سے اللہ تک پہنچنے کی ایک راہ قائم ہوئی۔ گویا ان مراحل سے گزرنا۔ اور انکی پہچان (صرف مقصود حقیقی مدنظر رکھتے ہوئے) کرنا مُحَمَّد سے تعبیر ہے۔ یہ امر عقیدہ کی بنا پر نہیں۔ بلکہ فطری طور ایک حقیقت کا اظہار ہے۔ اس کیفیت سے یہ مسئلہ آسان ہو جاتا ہے۔ کہ باری تعالیٰ نے حمد کو صرف اپنی ذات کے لئے وقف کیا۔ لیکن اس حمد کی تکمیل کلی طور تب تک نہیں ہوسکتی۔ جب تک اُس نورِ ابتدائی کے مراحل ومراتب کا عرفان (پہچان) حاصل نہ کیا جائے انسان ذاتِ باری کی حمد کی تکمیل نہیں کرسکتا۔ یہ حمد اپنی تمام خوبیوں کے ساتھ ہوگی۔ گویا اللہ کی حمد اور محمدؐ کی حمد میں حمد ایک مشترک کیفیت ہے۔ جس سے محمدؐ کی حمد کی تکمیل کرنے سے اللہ کی حمد کی تکمیل ہو جاتی ہے۔

محمد ذات باری سے لے کر الارض کے آخری ذرہ تک پھیلا ہوا ہے۔ اور اسی محمدؐ کی حمد کا وجود ایک ذرہ سے لے کر ذات باری تک ہے۔ جب محمدؐ کے وجود کو پہچانا گیا۔ تو اسکے ابتدائی

مقام پر اسکی ابتدائی تخلیق پر ذاتِ باری تعالیٰ کا وجود پایا جاتا ہے۔ جب اس عرفان کی تکمیل ہوگئی۔تو عرفان الٰہی کی بھی تکمیل ہو جاتی ہے۔اس طرح اللہ و محمد کی پہچان مشترک پہچان متصور ہوتی ہے۔

چونکہ اس تمام مخلوق کی تخلیق کا مقصد واحد ایک خلیفہ کا پیدا کرنا ہے تو۔خلیفہ کا مرتبہ۔اسکے مرتبۂ خلافت کے مطابق (قائم مقام اللہ) ہی ہونا چاہیئے ۔اور یہ مرتبۂ خالقیت نہیں۔ بلکہ یہ مرتبہ صرف پہچان (عرفان) کیلئے ہوگا۔ پہچان میں صفات اور خوبیوں کو پہچاننا۔اور یہ پہچان بھی مخلوق کی حیثیت سے۔ ورنہ ذاتی حیثیت میں وہ خود (اللہ) خالق ہے۔ معبود ہے۔ رب ہے۔ لاانتہا اور قیوم ہے۔اور قائم مقام کیلئے اس کی خوبیاں یہ ہیں کہ کائنات خلقت میں ایک حُسنِ نظام اور اسکی تخلیقی ترکیب میں ایک نور محمدی ؐ کا مختلف کیفیتوں میں اپنی خوبیوں کے ساتھ جلوہ گر ہونا ہے۔ کائنات ایک زندگی کا مسلسل نظام ہے۔اور یہ نظام اسوقت تک جاری رہے گا جب تک اس نورِ ابتدائی (نورِ محمدی ؐ) سے کیفیات پیدا ہوتی رہیں گی۔ مادی زندگی ایک ادنیٰ ہیٔت ہے۔اور بدلنے والی ہے لیکن مادہ سے قبل کی زندگی غیر مادی ہے۔جس میں تبدیلی واقع نہیں ہوتی۔ انہیں اپنی ہیٔت کے اعتبار سے دوام حاصل ہے۔اسلئے محمدؐ (ابتدائی نور) کی یہ کیفیتیں دائم ہیں۔ بالالفاظ دیگر محمد اپنی خوبیوں میں دائم و قائم ہے۔اور مادہ سے مابعد مادہ کے تبدیل ہونے کی ہیئتیں غیر مادی ہو جائیں گی۔تو انکا وجود نوری اعتبار سے قائم رہے گا۔محمد (نور) اپنی خوبیوں کے ساتھ کیفیتیں پیدا کرتا رہے گا۔ یہاں تک کہ اسکی آخری کیفیت کا ظہور ہو جائے گا مثال کے طور۔ عالم ملکوت میں ۔عرش۔ کرسی۔ سات آسمان۔ یہ مجسم (غیر مادی) زندگیاں ہیں۔اور وقت معین تک نہ بدلنے والی ہیں۔انکی زندگی کا بنیادی وجود نورِ ابتدائی (نورِ محمدی ؐ) سے ہی ہے۔اور پھر دنیوی زندگی کی بنیاد کا سلسلہ بھی قبل کی اسی ملکوتی زندگی سے آیا ہے۔تو اس دنیوی زندگی میں بھی بنیادی وجود اسی نورِ ابتدائی (محمدؐ) کا ہی ہے۔اور یہ سلسلہ ایک وقت معین تک جاری رہے گا۔یعنی اسوقت تک جاری رہے گا۔ جب تک اس نورِ ابتدائی سے مخلوق بنتی جائے گی۔ جب اس نورِ ابتدائی سے تخلیق کا مادہ ختم ہوا۔تو تخلیق کا ٹھہراؤ ہوگا۔ یہی ٹھہراؤ قیامت سے تعبیر دیا جائے گا۔اس سے ثابت ہوتا ہے۔ کہ محمد کا وجود نوری تب تک قائم ہے۔ جب تک اس میں تخلیق

(پیدائش) کاظہور ہوتا رہے گا۔یعنی یہ وجود ازل سے شروع ہوکر ابد تک قائم رہے گا۔اس ازلی اور ابدی دوام میں جبکہ اسی نور کو ہر شے میں پایا اور پہچانا جائے۔ایسی کیفیت کو ہی محمد سے تعبیر دیا جاتا ہے۔ کہ کائنات کی جس شے کو پہچانا جائے اس میں بنیادی وجود اسی ابتدائی (نور محمدیؐ) وجود کا پایا جاتا ہے۔ جب ازل سے لے کر ابد تک اسے دوام حاصل ہوتو اس وجود کا پایا جانا۔اور پہچانا جانا بدرجہ اتم حمد (محمد) سے تعبیر دیا جاتا ہے۔گویا تمام خوبیوں کا جو ازل سے ابد تک واقع ہیں محمد میں پایا جانا بدرجہ اتم حمد (محمد) کہلاتا ہے۔اور چونکہ کائنات خلقت کا تمام مواد اسی نور محمدیؐ کی حد میں واقع ہے۔اسکے بعد اسکی ازل میں اور ابد میں ایک احد ہی واقع ہے۔سو احد کے عرفان میں انہی کیفیات کے عرفان سے تکمیل ہوجاتی ہے۔جس کے نتیجہ میں ذاتِ احد کا قرب حاصل ہوجاتا ہے۔تو اس نوری ہیئت کے لحاظ سے اور قائم مقام (خلیفہ) کے لحاظ سے اور عرفان کے لحاظ سے حمد کی کیفیت مشترک کہلاتی ہے اس لحاظ سے اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ اور مُحَمّدُ کی حمد میں ایک ہی مادہ (بدرجہ اتم) کا تصور قائم ہوتا ہے۔

غور کرنے کا مقام ہے! کہ باری تعالیٰ نے اپنے ارادۂ ازلی میں زمین اور خلیفہ کے بنانے کا ارادہ کیا۔تو اس ارادے کا ابتدائی قدم محمد کی صورت میں ظاہر ہوا۔مگر مقصود اس وجود کا تھا۔جو زمین میں پیدا ہو۔اور خلیفہ کی حیثیت سے ہو۔زمین کی کیفیت پر بحث کرنے کی ضرورت نہیں۔کیونکہ یہ ہر حال میں خود محمد کے وجودِ نوری کی آخری تخلیق ہے۔سو اپنے مقام پر بن گئی۔مگر حقیقی مقصود زمین بھی نہیں بلکہ خلیفہ ہی ہے۔اب خلیفہ کے تصور میں کیا چیز پائی جاتی ہے۔؟ جبکہ اسکی مادی ہیئت کے مقابلہ میں اس سے بھی قوی قوتیں۔پیدا ہوچکی ہیں؟ سو وہ خلیفہ کے نام سے ہی معلوم ہوسکتی ہیں۔

اول ذاتِ الٰہی کو ضرورت تھی کہ ایک خلیفہ بنایا جائے۔تو اسکے بنانے کیلئے اسکا بنیادی وجود بھی خلیفہ بنایا۔یعنی محمد بنایا۔جس میں اللہ کے قائم مقام ہونے کی تمامی خوبیاں (حمد کی) پائی جاتی ہیں۔یہ ضروری تھا کہ ایک اپنا قائم مقام بنانے کیلئے جسطرح وہ خود لامحدود اور عظیم الشان قوت کا حامل ہے۔اِسکے برابر کوئی نہیں۔اسی طرح اسکا خلیفہ بھی اتنی قوت و وسعت کا حامل بنا جسکے مقابلہ میں باقی مخلوق عدم کی حیثیت رکھتی ہے۔اور محمد (نور ابتدائی) جیسی قوت و وسعت کسی شے میں پائی نہیں

جاتی ـــــ اگر خلیفہ اس ہیئت میں نہ بنتا تو پھر خلیفہ ارض بھی خلیفہ کا مقام حاصل نہ کرسکتا ـــــ بالفاظِ دیگر اگر خلیفہ ارض کا بنانا مقصود نہ ہوتا۔ تو اس نظام کائنات کی ترتیب بھی اس طرح نہ ہوتی۔ اور نہ ہی یہ سب کچھ بنتا۔ اسلئے جب خلیفہ ارض بننے کا وقت آئے گا تو خلیفہ ارض کیلئے باقی تخلیقی قوتوں کے مقابلہ میں سب سے اعلیٰ قوت کا پایا جانا ضروری ہے۔ تاکہ خلیفہ کی عظمت اسکی مدِّ مقابل تمام اشیاء میں افضل ثابت ہو سکے ـــــ سو قائم مقام اللہ کیلئے یہ لازمی ہے۔ کہ اس کا وجود مخلوق کی تمام ہیئتوں اور قوتوں سے بالاتر ہو۔ یہی ''قائم مقام'' انسان کہلاتا ہے۔

بظاہر ہم یہ دیکھتے ہیں۔ کہ اَلّارض کی پیدائش کے بعد اسکی تمام مخلوق میں ایک انسان ہی اپنی خاصیتوں اور قوتوں میں افضل پایا جاتا ہے۔ تو یہ فیصلہ کر لینا آسان ہے۔ کہ الارض کی سب سے بڑی اور افضل پیدائش تو انسان ہی ہے۔ لہذا یہی خلیفہ[1] کہلانے کا مستحق ہو سکتا ہے۔ جسکی تخلیق ارادۂ ازلی میں مقرر کی جا چکی تھی۔ مگر ہم دیکھتے ہیں۔ کہ اسکے مقابلے میں۔ سورج۔ چاند۔ ستارے اور آسمان اور انکی مخلوق یعنی ذراتِ شمسی۔ ملائکہ۔ ان ہیئتوں میں انسان سے زیادہ قوت ہے۔ انکے مقابلہ انسان ان قوتوں سے کمتر حیثیت رکھتا ہے۔ اگر سورج کا اثر انسان پر پڑے تو جل کر فنا ہو جائے گا کیونکہ نور مادہ سے قوی ہوتا ہے۔ تو پھر انسان کو کیسے خلیفہ ارض کہا جا سکتا ہے؟ اور ارادۂ ازلی میں اسکی کیا خصوصیت ہے۔ جس سے یہ خلیفہ کہلانے کا مستحق ہوتا ہے؟ قرآنی آیات میں خلیفہ کی خصوصیات کا مجملاً ذکر ہے۔ کہ وَاِذْ قَالَ رَبُّكَ لِلْمَلٰٓئِكَةِ اِنِّیْ خَالِقٌۢ بَشَرًا مِّنْ صَلْصَالٍ مِّنْ حَمَاٍ مَّسْنُوْنٍ ○ فَاِذَا سَوَّيْتُهٗ وَنَفَخْتُ فِيْهِ مِنْ رُّوْحِیْ فَقَعُوْا لَهٗ سٰجِدِيْنَ ○ (پارہ ۱۴ سورۃ ۱۵ آیت ۲۸۔۲۹) میں ایک بشر بناؤں گا۔ جب میں اسے انسانی ہیئت میں بنا سنوار کر تیار کروں اور اس میں روح

---

[1] یاد رہے کہ جہاں باری تعالیٰ نے قرآن کریم میں خلیفہ کا ذکر کیا ہے۔ وہاں صرف یہ بیان کیا گیا ہے۔ کہ اِنِّیْ جَاعِلٌ فِی الْاَرْضِ خَلِیْفَةً۔ مگر اس میں یہ نہیں بتایا۔ کہ میں انسان کو خلیفہ بناؤں گا۔ یا آدم کو خلیفہ بناؤں گا۔ یا بشر کو خلیفہ بناؤں گا۔ کیونکہ قرآن اس افضل مخلوق کو انہیں صفتوں سے یاد کرتا ہے۔ بشر۔ انسان۔ آدم (بنی آدم)۔

پھونک دوں تو تم اس کیلئے سجدے میں ہو جانا۔

یہ بھی آدمؑ کی تخلیق سے قبل کا اعلان ہے۔ معلوم ہوتا ہے۔ کہ یہ اطلاع فرشتوں کیلئے تھی۔ کہ آدم کی پوزیشن یہ ہوگی۔ کہ اسکی برتری مسلّم ہوگی۔ جہاں تک آدم کی ہیئت کا تعلق ہے۔ اس میں بشر کی حیثیت سے بنانا اور سنوارنا یہ ہیئت انسان کی مادی ہے۔ یہ کیفیت اسے ملائکہ سے ممتاز نہیں کرتی البتہ نفخ روح (وَنَفَخْتُ فِيهِ مِنْ رُّوْحِيْ) سے یہ ملائکہ سے برتری حاصل کر لیتا ہے۔ گویا خالی بشر ہونے سے اسے فضیلت نہیں بلکہ اسکے مرکب میں روح حقیقی (رحمانی) کا ودیعت ہونا وجہ فضیلت ہے۔ اس روح کی خصوصیت اور اسکے تاثرات کا ذکر بھی قرآن نے خود کیا ہے۔ جب ایک آدم کو روح ودیعت کر کے تیار کیا تو اسے اپنے عرفان وجذب کا مشاہدہ کرایا ـــــ وَعَلَّمَ[1] اٰدَمَ الْاَسْمَآءَ كُلَّهَا اور آدم کو تمام اسماءِ الٰہی کا مشاہدہ کرایا ـــــ اور اس تکمیل کے بعد ثُمَّ عَرَضَهُمْ عَلَى الْمَلٰٓئِكَةِ پھر اسے فرشتوں کے سامنے کیا۔ اس روح اور علم کی ہیئت کے اعتبار سے ملائکہ نے آدم کی برتری تسلیم کی۔ اس برتری سے یہ نتیجہ پیدا ہوتا ہے۔ کہ اگر چہ انسان باقی مخلوق کے مقابلہ میں اپنی مادی ہیئت کے اعتبار سے کمتر محسوس ہوتا ہے۔ لیکن اسکی روحانی ہیئت اسے کائنات کی تمام مخلوق میں ممتاز کرتی ہے۔

یہ تو واضح ہے۔ کہ ارادۂ ازلی میں۔ اَلْاَرض اور خلیفہ سے مراد زمین میں ایک انسان کا ایک خلیفہ کی صورت میں ہونا تھا۔ لیکن دیکھنے میں آیا۔ کہ آدم سے لے کر اس کی نسل کے اکثر انسان ـــــ باوجود اس خصوصی قوت (روح) حاصل کرنے کے بھی۔ ان سے۔ فساد وخونریزی اور انحراف ہی صادر ہوا۔ اور اس نتیجہ میں یہ قومیں تباہ و برباد ہوئیں۔ تو کیا اس روحانی عظمت حاصل کرنے کا نتیجہ یہی ہونا چاہیئے۔ کہ انسان دنیا میں خلیفہ بن کر فساد وخونریزی کا مرتکب ہو؟ نہیں ـــــ بلکہ قرآنی آیت وَعَلَّمَ اٰدَمَ الْاَسْمَآءَ كُلَّهَا یہ نتیجہ پیدا کرتی ہے۔ کہ اسے روحِ حقیقی صرف علم وعرفان حاصل کرنے

---

[1] عَلَّمَ ۔عِلْمٌ سے ہے۔ علم۔ کسی شے کی ماہیت کو ذہن میں لانا علم کہلاتا ہے۔ اَسْمَآءَ كُلَّهَا سے مراد تمام آثار الٰہی۔ یعنی انسان کی تخلیق سے لے کر ذاتِ باری تعالیٰ کی تمام تخلیقی کیفیتیں۔

کیلئے حاصل ہے۔ گویا۔ روح اور ابتدائی علم عطا ہونے کے بعد وہی شخص خلیفۂ ارض کہلانے کا مستحق ہوسکتا ہے۔ جو انسانوں میں بدرجہ اکمل عرفان و جذب[1] حاصل کرے۔ ہاں! یہ امر ضروری ہے۔ کہ ارادۂ ازلی کے تحت ہر انسان کو اس شرفِ اشرف علم و روح سے مزین کر کے بھیجا جاتا ہے۔ مگر اس کیلئے خلیفہ کے استحقاق تب ہی قائم ہو سکتے ہیں۔ جب یہ زمین پر اپنی ہیئت کے اعتبار سے اپنی سالمیت برقرار رکھتے ہوئے ارادۂ ازلی اور مقصودِ حقیقی کی تکمیل کرے۔ اس حقیقت کی تصدیق بھی قرآن کریم سے ہوتی ہے۔ کہ جب اللہ نے کہا اِنِّیْ جَاعِلٌ" فِی الْاَرْضِ خَلِیْفَۃً ۔ میں زمین پر ایک خلیفہ بنانے والا ہوں۔ تو فرشتوں نے کہا۔ اَتَجْعَلُ فِیْهَا مَنْ یُّفْسِدُ فِیْهَا وَیَسْفِكُ الدِّ مَآ ءَ کیا تو زمین میں مادی کیفیت و ہیئت پیدا کرے گا۔ جسکا کام فساد و خونریزی ہے؟ خلیفہ کیلئے تو اشرف المخلوقات ہونا لازمی ہے۔ تو ہم باقی مخلوق سے اشرف ہیں۔ تو وَنَحْنُ نُسَبِّحُ بِحَمْدِكَ وَنُقَدِّسُ لَكَ ! ہم تیری تسبیح و تقدیس کر ہی رہے ہیں۔ باری تعالےٰ نے جواب دیا۔ کہ اِنِّیْٓ اَعْلَمُ مَالَا تَعْلَمُوْنَ ۔ تم نہیں جانتے کہ میں نے خلیفہ کے لئے کونسی خصوصیت مقرر کی ہے۔ تم ازل سے ابد تک اپنے مقررہ مقامات پر تسبیحیں کرتے رہو گے۔ تمہیں اپنا ہی علم ہوگا۔ تم ایک مقرر و معین نوری مخلوق ہو۔ مگر یہ جان لو۔ کہ خلیفہ کی عظمت و برتری میں نہ فساد ہوگا۔ نہ تمہاری جیسی تسبیح و تقدیس بلکہ وہ ان صفات سے بالاتر ہوگا۔ اسکی خصوصیت یہ ہوگی کہ اول نَفَخْتُ فِیْهِ مِنْ رُّوْحِیْ ۔ وہ مادی ہوگا مگر میں اپنی روح اس میں ڈالوں گا دوسرے وَعَلَّمَ اٰدَمَ الْاَسْمَآءَ كُلَّهَا پھر وہ علم اسے عطا کروں گا۔ جو تم میں سے کسی کو عطا نہیں کیا۔ ان دو انعامات کے اعتبار سے انسان کیلئے اسکی خلافت کیلئے یہ شرط قائم ہو جاتی ہے کہ وہ ان دو قوتوں سے استفادہ حاصل کر کے عرفانِ الٰہی حاصل کرے اور یہی عرفان الٰہی حاصل کرنے سے انسان میں خلیفہ کی خوبیاں قائم ہو جاتی ہیں۔

قرآن کریم ہر ترتیب اور مقصد کو ایک خوبصورت پیرایہ میں بیان کرتا ہے۔ جس سے اسکے

---

[1] جذب کی تشریح آگے آئے گی۔

ہر بیان کی تائید ہوتی ہے چنانچہ اس کے آگے خلافتِ الٰہی کی مزید وضاحت کی گئی ہے۔ یٰۤاٰدَمُ اسۡکُنۡ اَنۡتَ وَزَوۡجُكَ الۡجَنَّةَ وَكُلَا مِنۡهَا رَغَدًا حَيۡثُ شِئۡتُمَا ص (پارہ اول سورۃ ۲ آیت ۳۵) اے آدم اب تم خلیفہ کی تمام خوبیوں سے مزین ہو۔ اب تم اس باغ میں رہو اور جو جی چاہے اس باغ سے کھاتے رہو۔ مگر یہ یادر ہے۔ کہ اسوقت تمہاری کیفیت فرشتوں سے بالاتر ہے۔ تم ایک روحانی مجسمہ[1] ہو۔ اب اپنی خلافت کا خیال رکھنا کہیں بھول نہ جانا۔ سو فَاَزَلَّهُمَا الشَّيۡطٰنُ عَنۡهَا فَاَخۡرَجَهُمَا مِمَّا كَانَا فِيۡهِ ص (پارہ اول سورۃ ۲ آیت ۳۶) پس شیطان نے دھوکہ دیا۔ عزم سے ڈگمگا دیا۔ کہ آدم۔ بُھول گیا اپنی شرافت وعظمت کی حفاظت کرنا۔ مادہ کی طرف مائل ہوا۔

فَاَكَلَا مِنۡهَا فَبَدَتۡ لَهُمَا سَوۡاٰتُهُمَا وَطَفِقَا يَخۡصِفٰنِ عَلَيۡهِمَا مِنۡ وَّرَقِ الۡجَنَّةِ ز وَعَصٰۤى اٰدَمُ رَبَّهٗ فَغَوٰى ۝ۖ (پارہ ۱۶ سورۃ ۲۰ آیت ۱۲۱) اور اپنی مادیت کا احساس کرنے کے بعد نادم ہوا پس اسکی خلافت چھینی گئی۔ اور اس پُرسکون ماحول سے نکالا گیا۔۔۔۔ فَقُلۡنَا اهۡبِطُوۡا اب جاؤ زمین میں اپنی روزی خود تلاش کرو۔۔۔۔ اب محنت کرو۔ اسکے بعد اب وہی خلیفہ ہوسکتا ہے۔ جو اپنی شرافت کو اپنے علم کو محفوظ رکھے گا اور اپنی روح رحمانی کو مجھ تک پہنچائے۔ ہاں ایک رعایت میری طرف سے یہ ہوگی۔ کہ میں تمہارے جیسا ایک خلیفہ منتخب کروں گا۔ جو میرا علم میرے طریق ہدایت تم تک پہنچائے گا۔ سو جس نے اسکی پیروی کی وہ پھر خلیفہ رہ سکتا ہے۔ اسکا مقصدِ زندگی پورا ہو جائے گا۔ لیکن انسان خلیفہ بن کر آیا۔ مگر خلیفہ نہ رہ سکا۔ آخر یہ مقام قائم مقام اللہ کا ہی تو ہے! خالقِ کائنات کا خصوصی مقصد وارادہ! اس منصب پر انسان نہ رہ سکا۔ تو اللہ نے حسب وعدہ اسکی راہنمائی کے لیے ایک پیغمبر بھیجا۔ تا کہ اسکی راہنمائی کی جائے۔ مگر تواریخ سے معلوم ہوتا ہے۔ کہ پیغمبروں کے آنے کے

---

[1] کیونکہ تمہاری روح حیوانی بھی اپنی نورانی ہیئت میں ہے۔ تمہارا وجود تمام مادی آلائشوں سے پاک ہے۔ اور تمہیں روح وعلم بھی عطا ہے۔ اب اس خوبی کی سالمیت کا خیال رکھو اور کوئی ایسی شے استعمال نہ کرنا جس سے تمہاری شرافت مادیت میں بدل جائے۔ سو جان لو فلاں فلاں چیز میں بھول نہ جانا۔ انہیں کھایا اور مقصد کو بھول گئے تو مجھ سے دور عرفان سے دور ہو جاؤ گے۔

بعد بھی انسان کلی طور یہ منصب حاصل نہ کر سکا اب ضرورت ہوئی کہ ایک ایسا پیغمبر بھیجا جائے جو اس مقصد کی پوری تکمیل کرے۔ اسکے لیے ایک ایسے پیغمبر کی ضرورت تھی جو ابتدائی قائم مقام کی ایک اعلیٰ جُز ہو۔ وہ اعلیٰ جز حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہیں۔ جو محمد کے نام سے اسی ابتدائی محمد کی جُزِ اولاً ہیں۔ اور ہوں کیوں نہ؟ اپنے وجود کو خود ہی انسان جان سکتا ہے۔ ایک انسان دوسرے کو نہیں جان سکتا۔ کُل ہی کُل کو جان سکتا ہے۔ جُز کُل کو جان نہیں سکتا۔

زمانہ شاہد ہے۔ کہ آپ کا اسمِ مقدس محمد ہے۔ اور کائنات کا ہر ذرہ آپ کو محمد صلی اللہ علیہ وسلم کہہ کر پکارتا ہے۔ جب آپ مُحَمَّدْ کہہ کر پکارے گئے۔ تو اس سے بھی انکار نہیں ہو سکتا کہ محمد کے معنی بدرجہ اتم خوبیوں والا۔ بدرجہ اتم اپنی خوبیوں کے اعتبار سے تعریف کئے گئے۔ وہ۔ جو ہر خوبی میں پہچانے گئے۔ یہ محمد اسی کُل سے ہیں۔ جو ابتدا میں محمد ہے۔ جب ہر شے اسی محمد کے نور سے بنیادی وجود حاصل کئے ہوئے ہے۔ نباتات کی ادنیٰ مخلوق۔ جمادات کی ادنیٰ مخلوق۔ حیوانات کی ادنیٰ مخلوق اور انسان بھی اسی نور کے جُز ہیں۔ تو محمد بھی اسی نور کے جُزءِ اولاً ہیں۔ جس طرح مخلوق کے اجزا میں فرقِ مراتب پایا جاتا ہے۔ تو انسان ہونے کی حیثیت میں جبکہ آپکا اسم مقدس محمد ہی پایا گیا۔ تو اسکا مطلب یہ ہے۔ کہ آپ تمام مخلوق میں سب سے اعلیٰ مخلوق ہیں۔ یہ عالی مرتبۂ محمد اس امر کی نشاندہی کرتا ہے۔ کہ ایک نور ابتدائی میں جس کا نام محمد تھا۔ جسقدر یہ اپنی وسعتوں اور عظمتوں میں اعلیٰ وارفع ہے۔ یہ "بشری محمدؐ" بھی اسی محمد کی ایک اعلیٰ وارفع جُز ہے۔ اسکا نام اسی نور اول کی نسبت سے محمد پایا گیا ہے۔ گویا اول نور بھی محمد۔ خوبیوں والا اور قائم مقام (مشترک حمد کے اعتبار سے) اور یہ محمد بھی ایک خلیفہ کے اعتبار سے (اِنِّیْ جَاعِلٌ فِی الْاَرْضِ خَلِیْفَۃً) ایک پیغمبر کی حیثیت سے قائم مقام اللہ ہے جیسا کہ الحمد للہ اور محمد کی حمد مشترک ہے۔ اسی طرح آپکے علم وروح کے اعتبار سے محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو ایک منتخب پیغمبر اور خلیفۂ ارض بنا کر بھیجا گیا۔ اور آپؐ کی اس خصوصی عظمت ورفعت کی تائید میں ایک مشترک عمل سے تائید بھی کر دی۔ قُلْ اِنْ کُنْتُمْ تُحِبُّوْنَ اللّٰہَ فَاتَّبِعُوْنِیْ یُحْبِبْکُمُ اللّٰہُ اگر تم اللہ کا عرفان چاہتے ہو۔ تو محمدؐ کی اتباع کرو

اتباع میں خصوصی عمل حُب کا ہی ہے۔ اور حب کا نتیجہ عرفان ہے۔ تو یہ کیفیت حمد سے مشابہ ہو جاتی ہے۔ کہ انسان جب اپنی خلافت حاصل کرنے کی خواہش کرے۔ تو پیغمبر کے علم و عمل۔ اور پیغمبر کی راہنمائی سے استفادہ کرے۔

اب دیکھنا یہ ہے کہ حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم میں خلیفۂ ارض کی کیا خصوصیتیں ہیں؟ وہ ایک تو آپؐ کے نام مقدس کی خصوصیت ہے۔ کہ آپ کو جسد کی حالت میں بھی محمدؐ کے نام سے پکارا گیا۔ تو یہ نام اس امر پر دلالت کرتا ہے کہ ابتدائی نورِ محمد سے جو مخلوق پیدا ہوئی۔ ان میں حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم وجودی حیثیت میں تمام مخلوق کے مقابلہ میں۔ سب ہیّتوں میں قوی[1] اور کل کی حیثیت رکھتے ہیں۔ کیونکہ سوائے آپؐ کے ابتدائے آدم سے قیامت تک محمد نام نہ کسی کا ہوا ہے۔ نہ ہوگا۔ دوسری خصوصیت آپؐ کی پیغمبرانہ حیثیت سے ہے۔ گزشتہ پیغمبروں میں اکثر پیغمبروں کو خلیفہ کے لقب سے پکارا گیا جیسے داوٴدؑ۔ سلیمانؑ وغیرہ۔ منتخب پیغمبر ہونے کی حیثیت سے انہیں خلیفہ کے لقب سے پکارا گیا۔ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام بھی مصطفٰے (منتخب) پیغمبر۔ آخری پیغمبر۔ دین کی تکمیل کرنے والے پیغمبر۔ وحی پانے والے پیغمبر___ اور تمام پیغمبروں کے دین کی تکمیل کرنے والے پیغمبر۔ اسکے بعد اب نہ کسی دین کی ضرورت رہی۔ نہ کوئی دین پیدا ہوگا۔ نہ کوئی پیغمبر پیدا ہوگا___ حصولِ علم و عرفان میں آپؐ کا اتباع۔ آپؐ سے علم سیکھنا۔ قائم مقام کی حیثیت رکھتا ہے۔

تیسری خصوصیت علم عطا ہونے کی حیثیت سے اور روح کی حیثیت سے۔ وہ علم جو عَلَّمَ اٰدَمَ الْاَسْمَآءَ میں آدم کو حاصل ہوا وہ ذات باری تعالیٰ کے نور سے لے کر تمام کائنات کے اسرار تھے۔ ذاتِ باری تعالیٰ سے ماسوائے اسکی صفات ہیں۔ وہ وہی نور ہے۔ جس سے تمام مخلوق پیدا ہوئی۔ اس نور کا نام محمد ہے۔ یعنی یہ نور محمد کی روح ہے۔ گویا مخلوق کے مقابلے میں محمد مجسم علم ہیں۔ چونکہ یہ نورِ محمدی ذات باری کے قریب ہے۔ اور محمد ہونے کی حیثیت سے نور ابتدائی۔ اور تمام مخلوق کا

---

[1] اس کی تشریح آگے آئے گی۔

وجود ہے۔اسلئے اس نور محمدی کو اپنا جسم پہچاننا نہیں ہے۔ بلکہ نور اول اور قرب الٰہی کی حیثیت سے ذات باری تعالٰی کا عرفان حاصل کرنا ہے۔ یہ عرفان روح اور جسم کے مرکب کی ہئیت میں حاصل ہوتا ہے۔جس طرح انسان اپنے جسم (حواس ۔تعقل ۔شعور وقلب) کے ساتھ روح رحمانی کے ذریعہ عرفان الٰہی حاصل کرتا ہے۔اسی طرح حضور علیہ الصلوۃ والسلام بھی خلیفۂ ارض (مرکب روح وجسم) کی حیثیت میں عرفان ذات الٰہی کریں گے۔چونکہ آپؐ کی روح (نور محمدی) کو ازلی قرب اور عظمت حاصل ہے۔اس قرب وعظمت کے اعتبار سے آپ کو تمام مخلوق سے زیادہ بدرجہ اتم عرفانِ ذات الٰہی حاصل ہوگا۔اس انتہائی اور بدرجہ اتم عرفان کی خصوصیت سے آپ کا نام احمد ہوگا۔احمد سے مراد کائنات کی تمام مخلوق سے زیادہ عرفان وجذب حاصل کرنے والا۔احمد کا تقاضا یہ ہے۔اسکا جسم بھی نوری ہوتا ہے۔اور روح مجسم نور ہی ہے۔دونوں وجود مل کر ایک ہی ہیٔت اختیار کر لیتے ہیں۔ اسلئے روح وجسم کی یکسانیت کے اعتبار سے محمد و احمد مخلوق کی تمام خوبیوں کا حامل ۔تمام مخلوق سے حمد کیا گیا اور تمام مخلوق سے زیادہ بدرجہ اتم حمد کرنے والا۔یہ دونوں صفتیں (روح وجسم کے مرکب کے اعتبار سے) آپؐ کی ذات مقدس (جسم مقدس) پر صادق آتی ہیں۔اس حیثیت میں محمد کی حمد کو آپکی ذات مقدس سے بھی نسبت ہے۔

چونکہ ارادۂ ازلی میں خلیفہ ارض کی خصوصیت بھی علم و روح کے ذریعہ عرفان الٰہی حاصل کرنے سے انسان کو حاصل ہوتی ہے۔اسلئے محمد و احمد کی دونوں صفتوں کے اعتبار سے ۔آپؐ انسان اعظم اور خلیفہ اعظم ہیں۔چونکہ آپؐ کی ذات سے ہی اللہ تعالٰی کے ارادۂ ازلی کی تکمیل ہوئی اسلئے درحقیقت اِنِّیْ جَاعِلٌ" فِی الْاَرْضِ خَلِیْفَۃً" سے مراد حضرت آدمؑ سے نہ تھی بلکہ حضرت محمد رسول اللہؐ ہی اس ارادہ کا اصلی مقصود تھے۔جنہوں نے بدرجہ اتم منصب خلافت حاصل کیا۔

یہاں پر ایک شبہ کا ازالہ ضروری ہے۔کہ وہ لوگ جو مادہ کے قدیم یا غیر قدیم۔متحرک یا غیر متحرک نظریہ میں اُلجھ کر رہ گئے ہیں۔مذہبی عقائد سے علیحدہ رہ کر بھی اپنے اسبابی (سبب یا Matter) عقائد کی رو سے اس کائنات کی قوت پر ہی یہ اندازہ لگائیں۔کہ ہر معلول کی ایک علت

ضرور ہے۔ ہر علّت معلول سے قوی ہے۔ مادہ[1] قدیم ہے۔ اور متحرک بھی ہے۔ لیکن اس علّت و معلول کے نظام میں مادہ ایک ہیئت سے دوسری ہیئت میں ضرور تبدیل ہوتا آیا ہے۔ یہی تبدیلئ ہیئت حرکت سے تعبیر ہے۔ اور یہ حرکت اس امر پر دلالت کرتی ہے۔ کہ ہیئت تبدیل کرنے میں کسی خالق کو اس ہیئت پر حکم کرنے کی ضرورت نہیں۔ اور اس امر کی بھی دلیل ہے۔ کہ حرکت کا پایا جانا اس قدیمی مادہ کی ایک قوت ہی ہے۔ جو خود بخود ایک وقت پر اسے حرکت میں لاتی ہے۔ اگر سبب (علت) اور حرکت مادہ کے لیے ضروری ہے تو ایک معلول کی علّت میں۔ علّت کا اسباب کی حیثیت میں پایا جانا بھی یقینی ہے۔ تو اس سے صاف ظاہر ہوتا ہے۔ ایک مادہ دوسرے مادہ سے پیدا ہوا۔ وہ مادہ دوسرے مادہ سے پیدا ہوا وہ مادہ دوسرے مادہ سے پیدا ہوا۔ اسی طرح ہر معلول ایک علّت سے پیدا ہوتا رہا۔ اور علّت بجائے خود علت نہیں بلکہ معلول ہی ہوتی ہے۔ ہر علّت خود قدیم کی حیثیت میں تب تک قائم نہیں ہو سکتی جب تک اسکی حرکت موقوف نہ ہو۔ کیونکہ جب ایک علّت ایک معلول پیدا کرتی ہے۔ تو اس میں حرکت موجود ہوتی ہے۔ حرکت علّت سے وابستہ ہے۔ یہی حرکت معلول کا باعث بنتی ہے۔ اور معلول ہی پھر علّت ہو کر ایک اور معلول کو پیدا کرتی ہے۔ گویا معلول و علت میں جب تک حرکت کو پابند نہ کیا جائے تب تک ہر معلول و علّت قدیم کی حیثیت میں واقع نہیں ہو سکتی۔ اسلئے قدیم اسی صورت میں ایک علّت ہو سکتی ہے جب وہ علت اپنی حرکت کو خود پیدا کرنے والی ہو۔ ورنہ علت سے پائی ہوئی حرکت معلول کو پھر حرکت میں لا کر ہیئت تبدیل کرنے پر مجبور کرے گی۔ اسلئے ہیئت کی تبدیلی کے اعتبار سے مادہ قدیم کی صفت میں نہ ہوگا۔ لیکن ہم کائنات ارض اور اسکے اردگرد کی اشیاء میں یہ محسوس کرتے ہیں کہ ہر علّت کے ساتھ ایک حرکت کا پایا جانا ضروری ہے۔ کیونکہ ہر علت سے ایک معلول ضرور پایا جاتا ہے۔ اگر ایک علّت سے معلول نہ پایا جائے تو اسکا مطلب یہ ہے۔ کہ اس میں زندگی کے نشان باقی نہیں۔ یا اس میں معلول کا مواد ختم ہے۔ یہی کیفیت ایک علت کو حرکت سے محروم کر دیتی

---

1 مادہ سے مادی جسم مراد نہیں بلکہ بنیادی وجود۔

ہے ـــــ ورنہ ہر علت میں حرکت کا پایا جانا لازمی ہوگا ـــــ مثال کے طور پر۔ جب زمین نہ تھی۔ تو سورج تھا۔ سورج قدیم نہیں۔ کیونکہ اس میں حرکت موجود تھی۔ اس حرکت کا تقاضا یہ تھا۔ کہ زمین پیدا ہوئی۔ اسلئے زمین خود معلول ہے۔ اور اس سے معلول کا پیدا ہونا ضروری ہے۔ اسکی حرکت سے چاند پیدا ہوا۔ اگر چہ یہ امر ثابت شدہ نہیں بلکہ قیاس ہی ہے۔ تو بھی زمین سے معلول پیدا ہوتے رہے۔ تو یہ زمین بھی قدیم نہیں کہلائے گی۔ اگر زمین کی حرکت ختم ہوگئی تو اس میں ٹھہراؤ ہوگا۔ یعنی اس میں معلول پیدا کرنے کی صلاحیت نہ ہوگی۔ تو اس صورت میں یہ زمین اپنی ہیئت کھو کر خود کو عدم کر ڈالے گی۔ تو اس سے ثابت ہوتا ہے۔ کہ ہر علّت جب ایک معلول پیدا کرتی ہے۔ تو اسکا وجود باقی بھی رہتا ہے۔ اور اس سے معلول بھی پیدا ہوتے رہتے ہیں۔ جب علّت سے معلول نہ پیدا ہوں۔ تو وہ خود فنا ہو جاتی ہے۔ دوسری نوعیت علّت کی یہ ہوتی ہے۔ کہ علت ایک قوی وجود ہوتا ہے۔ اور معلول پیدا کرنے کے بعد بھی یہ اپنے معلول سے قوی رہتی ہے۔ جیسے سورج سے زمین اور زمین سے چاند۔ یا زمینی اشیاء کی ہیئتیں۔ سورج خود موجود بھی ہے۔ قوی بھی ہے۔ معلول اس سے کمتر درجہ کی کیفیتیں ہیں۔ اگر سورج قدیم ہوتا تو اسکی حرکت میں معلول نہ پیدا ہوتے۔ چونکہ یہ معلول ہے اور ایک علّت سے قائم ہے۔ اسلئے اس میں حرکت باقی ہے۔ اسی طرح سورج کی علّت کا اندازہ کیا جائے تو وہ بھی متحرک ہے اور کسی علّت کا معلول ہے۔ اسباب کی رو سے یہ طریق علّت و معلول اور حرکت ختم نہ ہوگا اس سے ثابت ہوتا ہے۔ کہ اس دنیا (جس میں سورج۔ چاند۔ ستارے۔ زمین واقع ہیں) سے قبل بھی ایک ایسی علّت موجود تھی جسکا وجود باقی ہے۔ اور ان معلولوں سے قوی ہے۔ اس میں بھی حرکت موجود تھی۔ اگر قوت اور حرکت موجود نہ ہوتی تو یہ معلولی کیفیتیں پیدا نہ ہوتیں۔ اس سے ثابت ہوتا ہے۔ کہ اگر معلول اور حرکت نہ ہو تو علّت کوئی چیز نہیں۔ معلول اور حرکت خود علّت اور اسکی قوت و وسعت کی دلیل ہے۔ تو ہر علت کیلئے اسکا معلول اور حرکت ہی اسکے معلول ہونے کی دلیل ہے۔ اس کے ساتھ ہی یہ امر بھی پایہ ثبوت کو پہنچ جاتا ہے کہ ہر علّت میں معلول کی نسبت قوت غلبہ اور حرکت قوی ہوگی تو اس سے ایک غیر محسوس تصور یہ پیدا ہوتا ہے۔ کہ ابتدائی علتیں اپنی قوت و حرکت اور وسعت کے اعتبار سے سورج

کے مقابلہ میں ایک وسیع روشنی ایک وسیع جسامت ایک شدید تمازت کی حامل ہوں گی۔ اور یہ سلسلہ ایک غیر محسوس مدت تک چلا جائے گا۔ اور یہ بھی تسلیم کیا جاتا ہے کہ ہر ابتدائی علّت اپنی آئندہ تمام معلول در معلول کیفیتوں کا بنیادی وجود ہوگی۔ مثلاً ایک علت سے اسکا معلول۔ اس معلول سے دوسرا معلول۔ اس معلول سے دوسرا معلول یہاں تک کہ یہ معلول زمین تک پہنچ جائے۔ تو پہلی علّت میں ان تمام معلولوں کا سمایا جانا۔ یا ہر معلول کیلئے اسی علت کا بنیادی وجود پایا جانا لازمی امر ہے۔ اور اس علتِ ابتدائی کا خود وجود بھی اپنی ہیئت کے مطابق (ان معلولی قوتوں کے مقابلہ میں قوی تر علت کی حیثیت سے) قوی و وسیع ہوگا۔ اس سے یہ ثابت ہوتا ہے۔ کہ بظاہر کوئی علت جبکہ وہ کسی علّت کی معلول ہو قدیم نہیں کہلا سکتی نیز ہر معلول کی حرکت بھی ایک علّت کی ہی پیداوار ہے۔ اس اصول کے تحت ہم یہ کہہ سکتے ہیں۔ کہ ہمارا قریبی مادہ ایک معلول کی حیثیت سے ہے جو قدیم کی حیثیت نہیں رکھتا۔ اور اسکی حرکت بھی نہ قدیم ہے۔ نہ اس میں خود بخود پیدا ہوئی بلکہ یہ بھی ایک علت کی پیداوار ہے۔ اب ہم اپنے تصور میں ایک ایسی علّت کو لاتے ہیں جس سے یہ تمام علتیں (جو خود معلول کی حیثیت میں پیدا ہوئیں) پیدا ہوئیں۔ جہاں ہمارے تصور کو ان معلولوں کے بننے میں ایک طویل (غیر معین) مدّت گزرنے کا اندازہ محسوس کرنے میں بھی تھکان محسوس ہو۔ اور پھر جب ہم اس علّت کو اسکی قوت اور وسعت کے ساتھ تصّور میں لائیں تو اسکی وسعتیں غیر محدود ہیئت میں نہ ختم ہونے والی ہیئت میں آجائیں۔ تو اسکے بعد ایک ایسی علّت جسکی وسعت کی حدیں ختم نہ ہوں قدیم کہا جاسکتا ہے۔ اور حرکت کو بھی اسی علتِ لامحدود کی پیداوار کہا جا سکتا ہے۔ یہی تصور ایک اللہ کے لیے قائم کیا جاتا ہے۔ اور اسکا ابتدائی معلول جو خود علّت کی حرکت سے پیدا ہوا۔ اسکے لیے یہ نظریہ قائم کیا جاتا ہے۔ کہ یہی علّت تمام معلولوں کا بنیادی وجود ہے۔ سو ایک علّت کو اسکی لامحدودیت میں تصور کرنے سے ہر معلول کو اسکا بنیادی وجود تصور کیا جاتا ہے۔ جسکے لیے قرآن یہ نظریہ بتاتا ہے۔ لَہٗ مُلْکُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ زمین اور زمین سے ماسوٰی وسیع نورانی فضائیں سب اسی علّت لامحدود سے بنی ہیں۔ اسکی یہی ترکیب ہے کہ وہ خود لامحدود ہے اسکی لامحدودیت ختم نہیں ہوتی جبکہ اس علّت کیلئے کوئی اور علت نہ

پائی جائے تو یہ خود معلول نہیں کہلا سکتی اور جب یہ علّت بجائے خود ایک مستقل کیفیت میں پائی جائے۔ تو یہی امر اس کے قدیم ہونے کی دلیل ہے۔ اسکے ساتھ ہی معلول میں خود حرکت نہیں پائی جاتی۔ بلکہ علّت سے ہی وراثتاً حرکت منتقل ہوتی ہے۔ تو اس سے ثابت ہوتا ہے۔ کہ ہر علّت و معلول کی حرکت اسی علّتِ لامحدود سے ہے۔ جو ہر کیفیت کو اپنی تخلیق کے ساتھ منتقل ہوتی رہتی ہے۔ باالفاظ دیگر ہر علت و معلول کی کیفیت۔ قوت۔ حرکت کا اجراء اسی علّت سے ہوا ہے۔ اور یہی کیفیتِ علّت لامحدود ایک خالق سے تعبیر دی جاتی ہے۔ اور اس لامحدودیت میں اسکا معلول ایک نقطہ کی حیثیت رکھتا ہے۔ جس نقطہ سے تمام مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ کی معلول در معلول تخلیق ہوئی یہی نقطہ محمد کے نام سے تعبیر دیا جاتا ہے ___ کہ خود اپنی علّت کے اعتبار سے علّت لامحدود میں سمایا ہے۔ قریب ہے۔ اور اسی معلول سے باقی مخلوق کا وجود پیدا ہوا ہے۔

اب ہم دوبارہ اپنے موضوع کی طرف رجوع کرتے ہیں۔ وہ یہ کہ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام اپنے اسماءِ محمد و احمد کے اعتبار سے ایک واحد ہستی ہیں جنہوں نے عرفانِ الٰہی بدرجہ اتم حاصل کیا۔ جس طرح ایک انسان روح رحمانی اور روح حیوانی کا مرکب ہوتا ہے اسی طرح آپؐ کا وجود مقدس بھی محمد و احمد کا مرکب ہے۔ محمد آپؐ کی روح رحمانی ہے۔ اور احمد آپؐ کا جسد مقدس ہے۔ محمد کی ہیئت کی تو گزشتہ تشریح ہو چکی۔ اور احمد کی خصوصیت آپکے ذاتی کردار سے متعلق ہے۔ کہ آپؐ بشری حیثیت سے پیدا ہوئے جسکا اشارہ اس آیت سے واضح ہوتا ہے۔ قُلْ اِنَّمَآ اَنَا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ يُوْحٰىٓ اِلَيَّ (پارہ ۱۶ سورۃ ۱۸ آیت ۱۱۰)۔ سوائے اسکے نہیں کہ مثل تمہاری ایک بشر ہوں ___ البتہ تم میں مجھ میں فرق اس چیز کا ہے۔ کہ مجھے وحی (کلام الٰہی) حاصل ہے۔ یہاں بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ اور يُوْحٰىٓ اِلَيَّ دو کیفیتیں ہیں۔ بشر کا لفظ قرآن میں کئی جگہ پر آیا ہے۔ بظاہر ہم اس لفظ کے معنی خالص مادی انسان کے لیتے ہیں کیونکہ اس آیت میں مِثْلُكُمْ کا اشارہ عام انسانوں کی طرف ہے۔ جو مادی ہیئت میں پائے جاتے ہیں۔ اس میں وہ انسان بھی شامل ہے۔ جسکا جسم مادی ہے۔ اس میں روح حیوانی بھی ہے۔ روح رحمانی بھی ہے۔ لیکن اسے اپنے حواس و شعور سے کسی قسم کا مشاہدہ

حاصل نہیں یعنی اسکے وجود میں کوئی روحانی قوت ایسی نہیں جسے مشاہدہ حاصل ہوا سے بھی بشر کہا جاتا ہے۔ اسکے مقابل ایک ایسا شخص بھی ہے۔ جسے قلب وشعور اور روح حیوانی وروح رحمانی کے ذریعہ ماوراء ادراک[1] کیفیتوں کا مشاہدہ بھی حاصل ہے۔ ایسے شخص کی وجودی کیفیت روحانیت میں قوی ہوتی ہے یہ بھی بشر کہلاتا ہے۔ لیکن اس بشر اور اوپر بیان کئے گئے بشر میں فرق یہ ہے کہ جسمانی شکل میں دونوں کے اعضائے جسمانی ایک ہی ساخت کے محسوس ہوتے ہیں۔ مگر ذاتی کردار وعمل سے انہیں جسمانی تفوق (برتری) یہ حاصل ہوتا ہے کہ ایک کے جسم کی خاصیتیں (قوتیں) دوسرے کے مقابلہ میں قوی (لطیف یا روحانی) ہوتی ہیں۔ لیکن باوجود لطیف ہونے کے بھی انسانی جسم میں کوئی ظاہر فرق محسوس نہیں کیا جاتا ہے۔ اسلئے بشر کا اطلاق اسکی ظاہری شکل وشباہت پر ہوتا ہے۔ چونکہ ان میں جسمانی قوتیں کم زیادہ قوتوں میں پائی جاتی ہیں۔ اسلئے یہ قوتیں جو دراصل اسی جسم کی قوتیں ہیں بشر ہونے میں شامل نہیں۔ یہ امر بھی قابل ذکر ہے۔ کہ انسانی جسم کی خصوصیت کا انحصار اسکی قوی قوتوں[2] پر ہی ہوتا ہے۔ جسکے جسمانی مرکب میں اسکی جسمانی قوتیں اپنی سالمیت میں برقرار ہوں۔ اسے انسان یا خلیفہ کہا جاتا ہے۔ اوران قوتوں کی ظاہری شکل کو بشر کہا جاتا ہے۔ اسی لئے بشری شکل و شباہت کی یکسانیت کے لحاظ سے مِثْلُكُمْ کالفظ کہا گیا ہے۔ کہ مثل کا تعلق صرف صورت سے ہوتا ہے۔ خاصیت سے نہیں۔ اسکی دلیل اس قرآنی آیت سے ملتی ہے۔ کہ جب حضرت مریمؑ کے پاس فرشتہ آیا۔ تو وہ بشر کی شکل میں تھا۔ فَاَرْسَلْنَآ اِلَيْهَا رُوْحَنَا فَتَمَثَّلَ لَهَا بَشَرًا سَوِيًّا ○ (پارہ ۱۶ سورۃ ۱۹ آیت ۱۷)۔ پس ہم نے مریم کی طرف اپنا ایک فرشتہ بھیجا پس وہ مثل بشر (بشر کی صورت میں) اسکے پاس آیا۔ یہاں بشر کے ساتھ مثل کا لفظ استعمال کیا گیا۔ جسکا تعلق صرف شکل کے ساتھ ہی ہے۔ وجودی خاصیت سے نہیں کیونکہ وجودی خاصیت میں وہ فرشتہ (نوری پیکر) تھا۔۔۔ یہی کیفیت حضور محمدؐ

---

[1] جیسا کہ صفحہ ۹۹ پر بیان کیا گیا۔ کہ انسان کو ایک مکمل علم وروح دیکر بھیجا جاتا ہے۔ [2] اسکی تفصیلی بحث آگے انسانی وجود کی کیفیت میں آئیگی۔ یہاں مختصراً بیان کیا جاتا ہے۔

رسول اللہ کی اس آیت سے ظاہر ہوتی ہے۔ کہ آپؐ اپنی پیدائش میں ایک خلیفہ کی حیثیت میں ایک مکمل انسان تھے جنکے وجود میں شرافت انسانی کی (اپنی روح محمد کے اعتبار سے) انتہائی قوتیں موجود تھیں۔ البتہ ان خاصیتوں کے باوجود وہ بشر کی صورت میں ہی پیدا ہوئے کسی فرشتہ کی شکل میں نہیں آئے۔ اور اس بشر کی صورت میں آنے کی غرض وغایت کیا تھی؟ وہ یہ کہ آپؐ ایک خصوصی نور سے بنے ہوئے تھے اور خلیفہ ہونے کی حیثیت سے بشر کی شکل میں اپنی ہیئت کے روح وجسم سے عرفان وجذب کی تکمیل کرنی تھی۔ یہ تکمیل اسلئے تھی کہ ارادۂ ازلی کی خلیفۂ ارض کی حیثیت میں تکمیل ہو۔ اور یہ تکمیل اسلئے تھی کہ عام انسانوں کیلئے جو اپنی خلافت کو برقرار نہ رکھ سکے۔ راہنمائی علم وعمل کا ایک مکمل ضابطہ پیش کریں۔ وہ مکمل ضابطہ وہی علم ہوتا ہے۔ جس میں ایک انسان کو۔ علم۔ تزکیہ اور حقیقت (عرفان الٰہی) کا دوبارہ مشاہدہ ہو (وَعَلَّمَ اٰدَمَ الْاَسْمَآءَ كُلَّهَا) یہی کیفیت وحی سے تعبیر کی جاتی ہے۔ وحی سے مراد یہ ہے۔ کہ ذاتِ الٰہی کی طرف سے اس علم کا عطا کیا جانا۔ جس علم میں اللہ نے (جبکہ وہ اپنی مخلوق کی تمام کیفیتوں اور اسکے حصول کے ذرائع سے آگاہ ہے) تمام کیفیتوں کا علم (جو انسان اپنی شرافت کو کھو کر بھول گیا) اور دوبارہ علم وشرافت کو حاصل کرنے کا طریقہ جمع کیا ہے ــــ یہ علم اسی ہستی کو حاصل ہوتا ہے۔ جو اپنی انسانی (خلیفہ) شرافت کو برقرار رکھ کر جسم انسانی کے ساتھ علیٰ حالہٖ حاصل کئے ہوئے ہو ــــ اسکا حاصل کرنا جسم کی لطافت۔ قلب وروح۔ شعور کی صلاحیت پر ہی منحصر ہے۔ یہی خصوصیت يُوحٰى إِلَيَّ میں مضمر ہے۔ کہ بشر تو میں صورت کے لحاظ سے ہوں۔ مگر جسمانی روحانی خاصیتوں میں تم میں مجھ میں فرق ہے۔ یہی فرق آپ کو انسانیت کے مقام میں مرتبۂ عالی پر فائز کرتا ہے۔ اور یہ عالی مرتبہ آپ کو احمد کی حیثیت سے ہے۔ کہ آپؐ نے اپنی زندگی میں اپنی ذاتی قوتوں کو سالم رکھنے کیلئے انتہائی تزکیہ پر عمل کیا ــــ اور اپنی خاصیتوں کو اس قدر عروج دیا کہ خلیفہ اعظم کے مقامِ عالی پر ابدالآباد قائم رہے۔ کیونکہ جب تک کائنات باقی ہے۔ اللہ کے ساتھ اسکے خلیفۂ اعظم کی خلافت بھی باقی رہنی ضروری ہے۔

حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کی زندگی کا مطالعہ کرنے سے معلوم ہوتا ہے۔ کہ آپکی پیدائش

اس حالت میں ہوئی کہ آپ یتیم تھے۔ نہ کوئی آپکا نگران حال تھا۔ نہ حقیقی پرورش کنندہ تھا۔ نہ کوئی تربیت دینے والا تھا۔ اور جب آپؐ نے ہوش سنبھالا تو آپ گلہ بانی کرنے لگے۔ گلہ بانی میں آپکا اکثر وقت آبادی سے دور جنگلوں کی خاموش فضاؤں میں گذرا۔ جسکا نتیجہ یہ ہوا۔ کہ آپکو کسی فروعی دلچسپی کی طرف رجوع نہ رہا۔ بلکہ ہر وقت آپ تفکر کی طرف مائل رہے۔ آپکی جسمانی لطافت کو ایسے ہی ماحول کی ضرورت تھی جس میں ایک فطری ماحول کی تمام خوبیاں پائی جاتی تھیں۔ جہاں آپکے تفکر میں جولانی پیدا ہوئی۔ اس پر ایک غریب خاندان کی مختصر گذر اوقات میں آپکو ایک مختصر اور فطری غذا ہی میّسر تھی۔ گویا آپکا کھانا بھی فاقہ کے برابر تھا۔ ایک خاموش۔ تنہا اور قدرتی مناظر سے بھرے ہوئے ماحول میں آپکے تفکر کو پورا موقع ملا۔ چنانچہ آپؐ اس حالت میں ہمہ وقت انہماک و استغراق میں رہے۔ اور آپکی عمر کے ساتھ اس کیفیتِ جذب وانہماک میں ترقی ہوتی رہی۔ آپکی چالیس سال کی عمر کے واقعات کا مطالعہ کرنے سے معلوم ہوتا ہے۔ کہ آپؐ اکثر اوقات غارِ حرا کی تنہائی میں فاقہ کشی کی حالت میں محویت و استغراق میں مہینوں تک رہے۔ یہاں تک کہ آپکی روحانی اور جسمانی حالت اسقدر لطیف ہوگئی۔ کہ آپکو مشاہدات حاصل ہوئے اور اِن مشاہدات کے عروج پر آپکو وحی حاصل ہوئی۔ وحی حاصل ہونے میں (یُوحٰی اِلَیَّ میں) یہی خصوصیت تھی۔ کہ آپکا جسم۔ روح جسمانی۔ روح رحمانی ـــــ قلب وشعور۔ مجسم روحانی حالت میں پائے جاتے تھے۔ اور وحی حاصل ہونے کیلئے ان خصوصیتوں کا پایا جانا لازمی ہوتا ہے۔ اسی خصوصیت اور علم (وحی) سے آپؐ ایک پیغمبر راہنما کی حیثیت سے مخلوقِ انسانی کی راہنمائی پر مامور ہوئے۔

اب دیکھنا ہے۔ کہ انسان کو حواس۔ تعقل۔ شعور۔ قلب۔ روح جسمانی۔ روح رحمانی کے ذریعہ مشاہدات (عرفان الٰہی) حاصل کرنے کیلئے۔ پیغمبر کی راہنمائی سے کیا طریق حاصل ہوتا ہے۔

یہاں حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کی مقدس زندگی میں قبل از نبوت (پیغمبری) دور میں ایک خصوصی عمل حاصل ہوتا ہے۔ وہ ہے آپکی ابتدائی زندگی میں (وحی حاصل ہونے کی صلاحیت) تزکیہ اور مجاہدہ۔ جو آپکا خصوصی مشغلہ تھا۔ خصوصی عمل تھا۔ اسی عمل کے ذریعہ آپکو وحی حاصل ہوئی ـــــ اور

دوسری چیز وحی کے بعد کی زندگی میں خود وحی کا مادہ یعنی علمِ الٰہی جسے قرآن کہا جاتا ہے۔اس قرآن میں کیا ہے۔اس میں وہی کیفیات ہیں جو عرفانِ الٰہی کی راہ میں حقیقی راہ کے نشان۔اسکی تخلیق کی کیفیتیں۱ ہیں۔اور انہیں حاصل کرنے کے طریق ہیں۔کہ انسان کس طرح اپنی اشرف المخلوقاتی خاصیتوں کو حاصل کر کے عرفان الٰہی حاصل کر سکتا ہے۔

اَحْمَدُ صلی اللہ علیہ وسلم کی حیثیت میں آپکی زندگی کے دو دور پائے جاتے ہیں۔ایک قبل از نبوت (رسالت) کی زندگی کا دور۔دوسرا بعد از نبوت (رسالت) کی زندگی کا دور۔قبل از نبوت (رسالت) کی زندگی میں۔آپؐ کا عمل صرف تنہائی میں۔استغراق۔محویت۔تفکر۔یکسوئی اور ایک مقصود کے مشاہدہ کی جستجو ــــ اس کا تعلق آپؐ کی ذاتی زندگی کے عمل سے تھا۔اسکا نتیجہ صرف یہ ہوا۔کہ آپؐ کے جسم کی روحانی قوتوں کو ترقی حاصل ہوئی۔اور آپؐ کو حقیقی مشاہدات حاصل ہوئے۔یہ امر قابل ذکر ہے۔کہ ہر انسان میں جن میں پیغمبر بھی بشر ہونے کی حیثیت سے شامل ہے مشاہدہ کرنے کیلئے حواس۔تعقل۔شعور۔قلب موجود ہیں۔یہ خواص صرف علم حاصل کرنے کیلئے ہیں۔اگر پیغمبر کی تقلید میں ایک انسان پیغمبر کے احکام و شریعت کے تعمیل کرے۔تو کیا اسے اس عمل سے جو پیغمبر نے کیا مشاہدۂ حقیقی حاصل۲ نہ ہوگا؟ اسکا جواب ہر شخص خود سوچ لے!

مــحــمــد واحــمــد صلی اللہ علیہ وسلم کی حیثیت میں جب کہ آپؐ نے کائنات خلقت میں بدرجہ اتم عرفان حاصل کیا۔اور اس عرفان کا علم آپکے پاس جمع ہے ایک پیغمبر ہونے کی حیثیت سے علم و عرفان اور تفکر کے لیے آپکی ذات اقدس کے سوائے۔ایک مفکر کو کسی سے صحیح علم و راہنمائی حاصل نہیں

۱تخلیق کی کیفیتیں ارض و سمٰوٰت اور تمام وہ کیفیات جو نور محمدیؐ سے بنیں جو نورانی ہیئتوں میں واقعہ ہیں۔

۲یہ کیفیت ایک مفکر طریقت اور مشاہدات کو خواہش باطل سے تعبیر دینے میں ایک انسان کے مقابلہ میں پیغمبر کی حیثیت اس بات پر آمادہ کرتی ہے۔کہ وہ مشاہدات کا حقیقی ہونا صرف پیغمبر کیلئے مخصوص کرتا ہے۔اسکی ہٹ دھرمی صرف حقیقی علم سے ناواقف ہونے کے باعث ہے۔

ہوسکتی۔اوراس تقلید میں ہمارے لیے آپ کی زندگی کے انہیں دوادوار سے ایک علم حاصل کرنا ہے۔کہ آپ کی ابتدائی زندگی کے پہلے دور کا عمل۔ایک مجاہدہ۔تزکیہ کا عمل سکھاتا ہے۔اس عمل سے انسان کے حواس وتعقل وشعوراورقلب میں مشاہدہ کی صلاحیت پیدا ہوگی اور مابعد نبوت (رسالت) کی زندگی میں آپ ایک راہنمائے حقیقی (یعنی خود باری تعالیٰ) سے علم حاصل کر کے ایک راہنمائے حقیقی کے احکام پرعمل کرنے سے وہ مراتب حاصل کر لیتے ہیں۔جن میں مراتب ذات الٰہی تک اسکے صراط مستقیم (اللہ تک پہنچنے کی راہ) میں واقع ہیں۔اور چونکہ آپ کو قبل از نبوت (رسالت) طریقت (مشاہدہ) حاصل ہے۔اسلئے قرآن نے آپکی ابتدائی اور مابعد نبوت کی زندگی کے عمل کو یکجا کر کے انسان کے لیے ایک مکمل ضابطۂ علم پیش کیا۔اسی مکمل علم کو قرآن اور شریعت سے موسوم کیا گیا۔یہی دو کیفیتیں انسان کو قرآن سے مل سکتی ہیں کہ ذٰلِكَ الْكِتٰبُ لَا رَيْبَ ۛ فِيْهِ ۛ هُدًى لِّلْمُتَّقِيْنَ ۙ ۔یہ کتاب طالب کو اسکے مقصود تک پہنچاتی ہے۔انسان کائنات میں جس کیفیت کا علم حاصل کرنا چاہے۔اس کیفیت کے ہر پہلو سے آگاہ ہونے کیلئے قرآن میں ہرقسم کا مواد موجود ہے۔انسان دنیوی ترقی وعلم کا خواہش مند ہوتو کائنات کی ہر شے میں تحقیق وجستجو کر کے اُسے اپنے قبضہ میں کرسکتا ہے۔اوراگراپنے مقصد حقیقی میں تخلیق کائنات کی تحقیق کے ساتھ ایک خالق کی جستجو کا خواہشمند ہوتو اسکے لیے بھی قرآن میں ایک مکمل ضابطہ ایک مکمل علم موجود ہے۔

یہ بیان پیشتر کیا جاچکا ہے۔کہ ہرانسان اپنی تخلیق کے اعتبار سے کائنات کی ہر شے سے افضل قوت حاصل کیے ہوئے ہوتا ہے۔خصوصاً علم کے لحاظ سے اس میں ہر شے کی کیفیت سے آگاہ ہونے کی تمام قوتیں موجود ہوتی ہیں۔لیکن زمانہ کے تاثرات اورقریبی ماحول سے متاثر ہوکرانسان ایک وقت اپنی صلاحیتیں کھو بیٹھتا ہے۔اورفطری طوراپنی ابتدائی حالت میں انسان پراپنے ماحول کے تاثرات اثرانداز ہوتے ہیں۔یہی ماحول اسکی اشرف المخلوقاتی (خلیفہ) خاصیتوں کو پستی کی طرف لاتا ہے۔اسلئے انسان کو پھراپنے مقام پرلانے کیلئے ایک ایسے ماحول کی ضرورت ہوتی ہے۔جس ماحول میں انسان کی صلاحیتیں برقراررہیں دوسری طرف انہیں عروج کرنے کا موقع بھی میسر ہو۔اسلئے زمانہ

میں فطری طور ایک پیغمبر کا وجود پیدا ہوتا ہے۔ جو ایک فطری علم کے ذریعہ ایک خالص ماحول قائم کرتا ہے۔ یہی علم۔ شریعت کہلاتا ہے۔

شریعت کیا چیز ہے؟ شریعت قرآن ہے۔ جو براہِ راست اللہ کی طرف سے نازل ہوتا ہے۔ چونکہ انسان براہِ راست بغیر قوتِ مشاہدہ۔ یا بغیر خلیفہ ہونے کے یہ علم حاصل نہیں کرسکتا اسلئے ایک خصوصی خلیفہ کو منتخب کر کے اسکے ذریعہ عام لوگوں تک علم کو پہنچایا جاتا ہے۔ یہی عالم پیغمبر یا راہنما کہلاتا ہے۔ گویا شریعت اور عالم دو لازم وملزوم چیزیں ہیں جن سے انسان اپنی ذاتی شرافت وعظمت حاصل کرتا ہے۔ یہاں ایک عالمِ اجل حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات مقدس سے متعلق مختصر بحث ہو چکی ہے۔ اب شریعت کی کیفیت کا مطالعہ کرنا ہے۔ کہ شریعت ماحول سازگار بنانے کے لیے کیا علم پیش کرتی ہے۔

شریعت ایک قانون ہے۔ جس قانون کے اندر رہ کر انسان خلافِ فطرت عمل کرنے سے پرہیز کرتا ہے۔ تاکہ فطرت کی خلاف ورزی کرنے کا اسے موقع میّسر نہ ہو۔ شریعت ایک ایسا ماحول ہے۔ جس ماحول میں رہ کر انسان۔ گناہ۔ تنزل اور مادیت کے غلبہ سے محفوظ ہو کر مومن بن جاتا ہے۔ شریعت ایک ایسا طریق ہے جس طریق پر چلنے سے انسان کے اشرف المخلوقاتی خصائل جلا پا کر مادیت پر غلبہ حاصل کر لیتے ہیں۔

حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کی مقدس زندگی کا مطالعہ کرنے سے معلوم ہوگا کہ آپکو تزکیہ۔ مجاہدہ کا ملکہ اپنی پیدائش کے ساتھ فطری طور حاصل تھا۔ یہی فطری خصوصیت اس امر کی دلیل ہے۔ کہ انسان فطری طور ایک عظیم الشان قوت لے کر پیدا ہوتا ہے۔ اور اگر انسان میں اپنی شرافت وعظمت برقرار رکھنے کی صلاحیت ہو تو وہ ہر غیر فطری ماحول میں اپنی سالمیّت برقرار رکھتے ہوئے ایک خالص انسان رہ سکتا ہے۔ یہی کیفیت حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کی تھی۔ کہ باوجود غیر فطری ماحول۔ حد درجہ مسموم اور شر وفساد سے لبریز ماحول کے بھی آپؐ نے اپنے آپکو اس ماحول کے تاثرات سے محفوظ رکھا۔ تو آپکے پیغمبرانہ خواص بھی بدستور محفوظ رہے ــــ آپؐ نے عمر کے چالیس سال زمانہ کے شر سے ایک

طرف اپنے آپ کو محفوظ رکھا۔ دوسری طرف۔ جنگلوں کی خالص فضاء میں ایک تفکر واستغراق سے وہ قوت مشاہدہ و جذب حاصل کیا کہ آپؐ میں وحی پانے کی استعداد علیٰ حالہ موجود رہی۔ بلکہ ترقی پذیر ہوتی رہی۔ یہاں تک کہ آپؐ پر وحی کا نزول شروع ہوا ـــــ یہ ایک فطری قانون ہے۔ کہ جب تک انسانی خواص میں اسکے تعقل و شعور۔ روح و قلب لطیف کیفیت میں نہ ہوں اسے حواس کی حدود سے باہر کی اشیاء کا ادراک نہیں ہوسکتا۔ نہ ہی القائے ربانی حاصل ہوسکتا ہے۔ لیکن ایک ایسے زمانہ میں جب کہ ایک انسان کا ماحول سے متاثر ہونا لازمی تھا۔ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے ماحول کے کسی تاثر کو قبول نہ کیا۔ اور جب حضورؐ کو قبل از نبوت (رسالت) معراج حاصل ہوا۔ تو پھر انہیں کسی علم (وحی) کی ضرورت نہ تھی۔ جبکہ آپؐ اپنے مقصد کی تکمیل میں کامل ہو چکے تھے مگر آپکی وحی کا مقصد صرف انسان کیلئے ایک شریعت ایک سازگار ماحول پیدا کرنا تھا۔ اسلئے ایک علم الٰہی کی ضرورت تھی۔ کہ انسان اس علم سے اپنے اصلی مقام کو حاصل کرے۔ اسلئے انسان کی گمراہی وضلالت کے وقت ہمیشہ ایک ہدایت کا راستہ اور ایک راہنما بھیجا گیا۔ تاکہ اس بھٹکے انسان کو صحیح راہ پر لانے کے لیے اور صحیح مقصد کو پانے کیلئے اسے اس زہریلے ماحول سے نکال کر ایک خالص ماحول میں لایا جائے۔ انسان جب حقیقی قانون سے منہ پھیر کر اپنی خواہشات حیوانی کے تابع چلنا شروع کرتا ہے۔ تو لذتِ نفس سے اس میں آرام طلبی خودغرضی کا مادہ پیدا ہو جاتا ہے۔ ایسی حالت میں انسان فطرت سے بغاوت پر آمادہ ہو جاتا ہے اور زمانہ میں جب عمومیت کے ساتھ یہ کیفیت پیدا ہو جاتی ہے۔ تو ہر شخص ایسے ماحول میں رہ کر خود غرض آرام طلب اور فطرۃ کا باغی ہو جاتا ہے۔ اس حالت میں اگر انسان اپنی ابتدائی پیدائش میں صحیح انسان ہی پیدا کیوں نہ ہو۔ مگر ایسے غیر فطری ماحول سے ضرور متاثر ہو کر وہ بھی اسی رنگ میں رنگا جاتا ہے۔ اسے نیک و بد کی تمیز کرنے کا موقع ہی نہیں ملتا۔ اسلئے اسکے لیے ایک ایسے قانون کی ضرورت ہوتی ہے۔ جو اسے انحراف سے روکے۔ اور روکنے کا طریقہ یہی ہے۔ کہ ایک خالص ماحول کا اجرا کیا جائے۔ تاکہ انسان کو غلط ماحول کے اثرات سے سابقہ ہی نہ پڑے۔ اور ایسے غلط ماحول پر وہی ماحول اثر انداز ہوسکتا ہے جو خود ساختہ نہ ہو۔ بلکہ ایک خالقِ حقیقی کی طرف سے اجرا کیا گیا ہو۔ جو خالق خود

مخلوق کی ہر کیفیت سے کلی طور علم رکھتا ہے۔ یہی مقصد حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام پر وحی بھیجنے کا تھا۔ کہ تمام مخلوق کائنات بلا تمیز مذہب وملت اس شریعت کے دائرہ کے اندر رہ کر ایک محفوظ ماحول میں محفوظ و مامون ہو جائے۔ اور اس شریعت الٰہی کا مقصود یہی تھا کہ انسان کیلئے ایک حقیقی راہ عرفان کے حقیقی نشان قائم ہوں۔ ایک رسول کو بطور راہنما پیش کیا جائے۔ اور رسول کے عمل کو ایک علم کی حیثیت سے یا ایک علم کو رسول کے عمل کی حیثیت سے پیش کیا جائے۔ اور رسول کے اتباع وتقلید میں۔ انسان کو طریق تزکیہ ومجاہدہ حاصل ہو۔ تا کہ انسانی خاصیتیں جلا پا کر وہ اپنے منبع حقیقی کے قریب ہو جائے۔ شریعت میں اصلاحی احکام کیا ہیں۔ یہاں شریعت کے قوانین کو تفصیلاً بیان کرنے میں طوالت کا احتمال ہے۔ ہم صرف اس جز کو لیتے ہیں جس کا صرف علم العرفان سے تعلق ہے۔

سب سے پہلے انسان کو علم حاصل کرنے میں ایک حقیقی علم سے استفادہ کرنے کیلئے قرآن (شریعت) اور حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ایک راہنما کی حیثیت سے آپکا اتباع کرنے کی اہمیت کو خیال میں رکھنا ضروری ہے۔ کہ بغیر حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کی شریعت وراہنمائی (قول و فعل) کی متابعت کے علم وعرفان حاصل نہیں ہوسکتا۔ جب تک ہم قرآن اور حدیث (قول وعمل) پر اس طرح عمل نہ کریں۔ جس طرح آپؐ نے کیا۔ نہ ہم عارف (پہچان کرنے والا) کہلا سکتے ہیں۔ نہ ہمیں علم وعرفان حاصل ہوسکتا ہے۔ لہذا انسان پورے طور علم میں آپ کا اتباع کرے۔

محققین شریعت نے شریعت کے وجود کو چار اجزا میں تقسیم کیا ہے۔

(۱) وحی جلی (قرآن)

(۲) تفہیم وحی جلی۔ وحی جلی کے سمجھنے اور اسے عمل میں لانے کا طریق وہ عمل اسوۂ حسنہ حضرت محمد رسول اللہؐ ہے۔ کہ آپ نے وحی کو کیسے سمجھا اور اس پر کس طرح عمل کیا اور اس وحی کے سمجھنے میں یا تعمیل میں امت کو آپؐ کی طرف سے جو احکام حاصل ہوئے ہیں اور جو عمل آپؐ سے صادر ہوا اسے حدیث (وحی خفی) سے تعبیر دیا جاتا ہے۔

(۳) تفہیم وحی خفی۔ سے مراد حدیث کو سمجھنا اور اس پر عمل کرنا۔

(۴) نتیجۂ اعمال۔یعنی وحی جلی۔خفی۔ تفہیم وحی خفی پر عمل کرنے کا نتیجہ جسے ثواب کہا جاتا ہے۔

(۱) وحی جلی: سے مراد قرآن حکیم۔یعنی اللہ تعالیٰ کی طرف سے نازل کردہ وہ وحی جو لوگوں تک علی الاعلان پہنچائی گئی۔ جسے شریعت کہا جاتا ہے۔اسکے لیے یہ تسلیم کرنا ہے۔کہ قرآن اللہ کی طرف سے ہدایت کا ایک مکمل علم ہے۔ جو انسان کو اپنے مقصودِ زندگی تک پہنچانے والا ہے۔اس قرآن کے احکام پر عامل ہونے سے انسان کو مشاہدہ وعرفان الٰہی حاصل ہوتا ہے۔

(۲) تفہیم وحی جلی (وحی خفی): اس سے مراد حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے قرآن کے احکام پر جس طرح عمل کیا۔اور جس طرح سمجھا۔اور قرآنی احکام کے علاوہ علم وعمل کی تفہیم کیلئے جو کچھ اللہ تعالیٰ نے خفیہ طور طریق علم وعمل سمجھایا۔ یہ علم عام لوگوں سے متعلق نہ تھا بلکہ حضورؐ کو سمجھانے کیلئے تھا۔اسی علم کی روشنی میں آپؐ نے اپنے اصحاب کو انکی دینی دنیوی زندگی کے عروج وارتقا کیلئے جو طریق بتایا اسے وحی خفی (پوشیدہ وحی) یا حدیث کہتے ہیں۔

(۳) تفہیم وحی خفی: یعنی سمجھانا حدیث رسول اللہ کا۔ جہاں تک قرآن وحدیث کی فہم کا تعلق ہے۔زبان عربی میں۔حددرجہ فصاحت وبلاغت ہے۔اس میں صرف نماز۔روزہ۔حج۔زکوٰۃ کے ہی ظاہری احکام نہیں۔اس میں صرف مکہ کی طرزِ تمدن اور معاشرت کا خاکہ ہی نہیں۔اس میں صرف ایک ٹھوس زمین کے نشانات ہی نہیں۔ بلکہ اس میں ایک ایسے ماحول کے نظام کا نقشہ ہے۔جس میں زمین سے لے کر تمام آسمانی کرّوں سورج۔ چاند۔ستاروں ہفت سمٰوٰت تا ذات باری تعالیٰ تک کے تمام ماحول کا مجموعی حیثیت سے نقشہ ہے۔تاکہ تمام مذاہب کے نظریات وعقائد اور تمام اقوامِ عالم کے طرز تمدن۔ معاشرت کا خلاصہ پایا جائے۔اس میں باقی تمام عقائد ونظریات کے مقابلہ میں ایک ایسا نظریہ وعقیدہ پایا جائے جو ایک عالمگیر ماحول کی صورت میں تمام نظریات وعقائد پر حاوی ہو جائے۔اس میں دنیوی حصول کیلئے ہی ایک راہ نہیں۔ بلکہ کائناتِ عالم مادی وروحانی کے عروج کیلئے بھی ایک طریق ہے۔ جسکے لئے کلی طور سوائے رسول کے اور کوئی فہم (سمجھ) نہیں رکھ سکتا۔اسلئے جب تک اس علم کے سمجھنے کے لیے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی راہنمائی حاصل نہ ہو قرآن کا سمجھنا باوجود عربی عالم ہونے کے

بھی آسان نہیں۔اس میں شک نہیں۔کہ قرآن نے بتایا اِنَّآ اَنۡزَلۡنٰهُ قُرۡاٰنًا عَرَبِیًّا لَّعَلَّكُمۡ تَعۡقِلُوۡنَ ○ (پارہ۱۲سورۃ ۱۲ آیت ۲) تحقیق ہم نے یہ قرآن عربی زبان میں (اہل عرب کی زبان میں) نازل کیا تا کہ (اہل عرب) تم اس کی مادی آیات (تخلیق کائنات وخالق کے اقرار وتسلیم میں) اپنی ظاہری عقل (تعقل) سے بھی اللہ کی خالقیت کو تسلیم کرو۔نیز تم اسکے احکام کو آسانی سے سمجھ سکو۔لیکن اسکے باوجود قرآن ایک روحانی علم کا حامل ہے۔جسکے لیے شعور۔اور قلب کی فقہ کا بھی دخل ہے۔اسکے علاوہ بین الاقوامی معاملات کا علم بھی حاصل کرنا ہے۔اسلئے اس کیلئے ضروری ہے۔کہ اسکے فہم کے لیے ایک رسول کے احکام وعمل کے ذریعہ اسے حاصل کیا جائے۔اس لئے قرآن کے سمجھنے میں تفہیم وحی جلی کو وحی خفی[1] کے ذریعہ سمجھا جائے۔

اور وحی جلی کا سمجھنا بھی ان لوگوں کو حاصل ہو۔جنکے تعقل۔شعور اور قلب قوی وروشن ہوں تا کہ وہ ایک طرف قرآنی علم کو دیکھیں۔اسکے ساتھ حدیث رسول اللہ کو دیکھیں۔اور پھر اپنے اسی قوی علم کے ذریعہ ایک عام فہم تفسیر (دونوں اجزاء وحی جلی وخفی کی) کا اجرا کریں۔دوسری بات یہ علم چونکہ عربی زبان میں ہے اسلئے عجمی (غیر عربی) لوگوں کیلئے اسکے ظاہری احکام کو سمجھنا بھی مشکل ہے۔وہ اسلئے کہ عجمی نہ تو زبان سے واقف ہیں۔انہیں عربی تشبیہات۔استعارات اور دیگر صرف ونحوی علم سے واقفیت نہیں۔پھر عربی طرزِ معاشرت۔تمدّن اور الفاظ کے صحیح مفہوم سے آشنائی نہیں۔اسلئے عجمی لوگوں کیلئے جب تک قرآن وحدیث کی مکمل تفسیر نہ کی جائے تب تک عمومی حیثیت سے قرآنی شریعت کا سمجھنا انکے لیے ناممکن ہے۔اسکے لیے بھی فطرت نے ایسی ہستیاں اسلام میں پیدا کیں جنہوں نے قرآن وحدیث کی فہم کیلئے۔فلسفہ۔منطق۔معقول۔کلام وغیرہ کی کئی قسمیں پیدا کر کے قرآنی علم کو

---

[1] وحی خفی سے مراد کہ اللہ تعالیٰ خود رسول کو اس قرآن کے تمام رموز وآثار سے آگاہ کرتا ہے۔اور یہ ملکہ (صفت) عام آدمیوں میں نہیں اور پیغمبر اس چیز کا اہل ہوتا ہے کہ وہ اللہ سے علم حاصل کرتا ہے۔اسلئے رسول کے سوا قرآن کے رموز و اسرار کو عام انسان کے لیے سمجھنا ناممکن ہے۔

عجمیوں کیلئے آسان کر دیا۔ چنانچہ اسکا سلسلہ شروع حیاتِ نبوی سے ہی شروع ہوا۔ جس میں حضرت ابن عباسؓ۔ حضرت علیؓ۔ حضرت عائشہؓ۔ حضرت زید بن ثابتؓ۔ حضرت ابی بن کعبؓ۔ حضرت معاذ بن جبلؓ۔ حضرت ابن مسعودؓ ہوئے۔ اور یہ سلسلہ بدستور جب تک قرآن و حدیث ہے چلتا رہے گا۔ البتہ اسلام کے ابتدائی دور میں جو اس تفہیم کو عروج ہوا۔ اس نے قرآنی علم کے سمجھنے اور سمجھانے میں باقی کوئی گنجائش نہ چھوڑی جسکی اب ضرورت محسوس کی جائے۔ ایسے علماء کو فقیہ (فقہ کرنے والے) مجتہد (اجتہاد کرنے والے) اور مفسر (تفسیر کرنے والے) کہتے ہیں۔ ان حضرات نے اپنے تزکیہ و مجاہدہ اور قوت تعقل سے علم کے اصلی مقصد و معانی کو پایا۔ اگرچہ بعض علماء کو مشاہدہ حاصل نہ تھا۔ پھر بھی انکے قلب کی قوتِ فقہ اسقدر تیز تھی کہ انکے قلب پر صحیح آثار کا عکس آجاتا تھا۔ جسکے ذریعہ وہ ایک حقیقت کا اظہار کرتے تھے۔ اسکے علاوہ وہ ہستیاں بھی تھیں جنہیں علم کے ساتھ مشاہدہ بھی تھا۔ یہ جماعت خصوصی جماعت کہلاتی ہے یہی وہ لوگ ہیں جنہوں نے حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کے قبل نبوت (قبلِ رسالت) کے عمل سے تزکیہ و مجاہدہ پر عمل کر کے ایک روحانی قوتِ مشاہدہ حاصل کی اور اسی قوت کے ساتھ قرآنی اسرار و رموز کی تفسیر کی۔ انہیں علماءِ ربانی یا ولی کہا جاتا ہے۔ یہی علم تفہیم وحی جلی و خفی کہلاتا ہے۔

(۴) نتیجہ اعمال: تفہیم وحی جلی و خفی کی تفسیر دو طرح کی ہے۔ ایک تو ان علماء سے ہے جنہوں نے صرف قوتِ فقہ سے تفسیر کی۔ دوسرے وہ جنہوں نے شعور سے بالمشاہدہ قرآنی آثار و رموز کو مشاہدے میں بھی لایا۔ اول الذکر علم وہ علم ہے جو ہر انسان کے معمول میں آتا ہے۔ اور بالمشاہدہ علم کیلئے چونکہ تزکیہ و مجاہدہ کی ضرورت ہے۔ اسلئے عام انسانوں کیلئے یہ عمل کچھ کٹھن ہے۔ اور یہ علم بعض مخصوص لوگ ہی حاصل کرتے ہیں۔ جو علم کے ساتھ مشاہدہ بھی حاصل کرتے ہیں۔ انہیں ولی یا فقرا کہا جاتا ہے۔ فقرا کو مشاہدہ میں کیا حاصل ہوتا ہے۔ وہ نتیجۂ اعمال کہلاتا ہے۔ نتیجہ اعمال کیا ہے؟ اس کو عجمی اصطلاح میں فقیری یا درویشی کے نام سے منسوب کیا گیا ہے۔

نتیجۂ اعمال۔ شریعت کے احکام پر عمل درآمد کرنے سے مقصد یہ ہے۔ کہ انسان اپنے

مراتب سے گر کر شریعت کے ذریعہ دوبارہ اپنا اشرف المخلوقاتی مقام حاصل کر کے قرب وعرفانِ الٰہی حاصل کرے۔ یعنی جب انسان اپنا مرتبہ خلافت کھو بیٹھتا ہے۔ تو اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہدایت فَـاِمَّا یَـاْتِیَنَّکُمْ مِّنِّیْ ھُدًی ایک شریعت کی صورت میں آتی ہے۔ جس پر عمل کر کے انسان پھر خلیفہ ارض بنتا ہے۔ اور ساتھ ساتھ آئندہ اپنی خلافت کی حفاظت بھی کر لیتا ہے۔ یہی مقام انسانی اشرف المخلوقاتی مقام ہوتا ہے۔ تو اسکے لیے قرآن نے عام اصولوں میں چند خصوصی احکام نماز۔ روزہ۔ حج۔ زکوٰۃ کا اجرا کیا۔ ان احکام کی تعمیل اور تکمیل پر انسان میں دوبارہ اپنی انسانی قوتیں پیدا ہو جاتی ہیں۔ اور انسان ذات باری تعالیٰ کے راہِ عرفان میں مراتب (ترقی و عروج کے مقام) حاصل کرتا ہے۔ اگر اسکے قلب وشعور میں ان مراتب کے باطنی مقام کے مشاہدہ کی قوت ہو تو وہ دیکھ سکتا ہے۔ لیکن انسان کو اکثر ایسا ماحول حاصل نہیں کہ تمام مخلوق یکسر ایک حقیقت کی طرف رجوع ہو کر ایک خالص ماحول پیدا کرے۔ اسلئے دنیوی معاملات اسکے افعال۔ یکسوئی میں حائل ہو جاتے ہیں اور انسان مکمل طور تزکیہ حاصل نہیں کر سکتا ایسے لوگ مراتب حاصل کر لیتے ہیں۔ لیکن اپنے مراتب کا مشاہدہ نہیں کر سکتے۔ یہی طریق اسلام میں عام شریعت کی تابعداری کا ہے۔ جس میں ہر مسلمان نماز۔ روزہ وغیرہ کا پابند رہ کر چلتا ہے۔ اور وہ لوگ جو ایک حقیقی نصب العین کو ہی اپنی زندگی میں قابل تکمیل سمجھتے ہیں وہ زمانہ کے ماحول سے باہر ہو کر۔ دنیوی امور میں رکاوٹیں یا الجھنوں سے پیدا شدہ ہر تکلیف کو گوارا کر لیتے ہیں۔ انکا مقصد زندگی یہ ہوتا ہے۔ کہ اگرچہ ضروریات زندگی یا دنیوی معاملات ہمارے لیے اتنا وقت میسر نہ ہونے دیں کہ ہم ایک مقصدِ حقیقی (تفکر وعرفان بالمشاہدہ) کو حاصل کریں۔ تو ہم اپنے مقصد کی تکمیل میں اپنی وقتی تکالیف گوارا کر لیں گے۔ تو اسکا نتیجہ یہ ہوگا کہ دنیوی امور میں صرف کرنے کا وقت ہی۔ تنہائی۔ یکسوئی۔ استغراق کے لیے وقف کیا جائے تا کہ اس سنت نبوی کی تعمیل کی جائے جو قبل نبوت (رسالت) آپؐ نے جنگلوں۔ غاروں میں کی۔ یہ امر واضح ہو کہ یہ رہبانیت نہیں۔ بلکہ یہ چیز اپنی ضروریاتِ زندگی اور خواہشات کی تکمیل میں کم سے کم حاصل کرنے سے ہوتی ہے۔ اسکا مطلب یہ نہیں کہ خواہش دنیا نہ کی جائے۔ نہیں بلکہ زیادہ سے زیادہ حصول بھی ہو۔ اور پھر اس سے متمتع ہونے

کیلئے قلب میں ہوس اور خواہش نہ ہو۔تاکہ انسان حصول مال کی خواہش کو مقدم رکھ کر اپنے مقصدِ حقیقی سے کوتاہی نہ کرے۔البتہ یہ ضروری ہے۔کہ جسقدر مال دنیا زیادہ میسّر ہو انسان میں اسکی زیادہ حصول کی خواہش بڑھتی جاتی ہے۔اور اس خواہش کی تکمیل میں اسکا زیادہ وقت خرچ ہوتا ہے۔مال کی محبت بڑھنے سے انسان اپنے مقصد سے کوتاہی شروع کرتا ہے۔اسلام نے مال زیادہ حاصل کرنے کے ساتھ ایک اصول بتایا۔کہ مال جمع کرو۔لیکن اللہ اور رسول کے حکم کے ساتھ خلقِ خدا (انسانوں) پر خیرات کرتے رہو۔اور مال سے اس حد تک تعلق رکھو کہ اگر کسی وقت یہ مال تم سے چلا جائے تو تمہیں اسکے ضائع ہونے کا قطعاً افسوس نہ ہو۔بہتر یہی ہے کہ اس مال سے اسی قدر فائدہ حاصل کرو جس سے تمہارا دل اعتدال پر رہے۔تم اس سے اتنا ہی فائدہ اٹھاؤ جتنا تمہاری زندگی کو برقرار رکھنے کیلئے ضرورت ہو اور اس مال کو اس حال میں جمع کرو کہ تمہارے حقیقی مقصد میں کوئی خلل واقع نہ ہو اور ساتھ ساتھ مادیت کا زیادہ استعمال بھی نہ ہو۔اگر ممکن ہو سکے کہ انسان زیادہ سے زیادہ حاصل کرنے کے بعد اسے اپنا مقصد حقیقی پورا کرنے کا وقت میسر ہو سکتا ہے۔تو پھر انسان کو وقت حاصل کرنے میں دقت ہی نہیں اور وہ زیادہ سے زیادہ حاصل کر سکتا ہے مگر شرط یہ ہے کہ زائد مال سے باقی مخلوق کو فائدہ پہنچائے۔اور اگر اسکی دنیوی ضرورت اسکے مقصد حقیقی میں حائل ہوتی ہے۔تو ایسی ضرورتیں ترک کرنا بہتر ہیں۔کہ اس طریق سے انسان کو تزکیہ و مجاہدہ حاصل ہوتا ہے۔اور ترک موالات سے تزکیہ میں مدد ملتی ہے۔کہ اسکا وجود لطیف ہیئت اختیار کر لیتا ہے۔یعنی مادیت کا غلبہ کم ہونا۔اور جسم پر تکالیف کا وارد ہونا۔جسمانی مادیت کے غلبہ کو کم کر کے زائل کر دیتا ہے۔ایسے لوگ زمانہ میں بہت کم ہوتے ہیں۔اور انسانی اکثریت میں سے چند افراد کا ترک موالات کرنا۔دنیوی نظام میں کوئی فرق پیدا نہیں کرتا۔ایسے لوگ تزکیہ و مجاہدہ کے ساتھ شریعت پر عامل ہونے سے اپنے مراتب کا مشاہدہ بھی کرتے ہیں۔مراتب کا مشاہدہ کرنا ہی نتیجۂ اعمال کہلاتا ہے۔باقی عام لوگ جو بغیر تزکیہ و مجاہدہ شریعت پر عمل کرتے ہیں انکے عمل کا بھی نتیجہ قائم ہوتا ہے۔

لیکن بغیر تزکیہ وہ اپنے عمل کے نتیجہ کا مشاہدہ نہیں کر سکتے کہ ہمارے عمل کے نتیجہ کی کیا کیفیت ہے۔

نتیجۂ اعمال گویا شریعت کی روح ہے۔کیونکہ انسانی مقصد زندگی عرفان و مشاہدہ ہی ہے۔

جسکے لیے قرآن نازل ہوا۔ جسکے لیے محمدؐ رسول اللہ بحیثیت راہنما مبعوث ہوئے۔ اور آپ نے بھی اپنے عمل کی تکمیل میں عرفان الٰہی بدرجہ اتم (معراج) حاصل کیا اور یہی طریق انسان کے لیے جاری کیا۔ نتیجہ اعمال سے مراد۔ عمل کا نتیجہ۔ یا عمل کا باطن۔

قرآن نے واضح طور نتیجہ اعمال کے متعلق ایک خصوصی لائحہ عمل کا اعلان کیا۔ جو اعلان کسی پوشیدہ اسرار میں نہیں بلکہ کھلے الفاظ میں بیان کیا گیا ہے۔ الٓمّٓ ۚ ذٰلِكَ الْكِتٰبُ لَا رَيْبَ ۛ فِيْهِ ۛ هُدًى لِّلْمُتَّقِيْنَ ۙ الَّذِيْنَ يُؤْمِنُوْنَ بِالْغَيْبِ وَيُقِيْمُوْنَ الصَّلٰوةَ وَمِمَّا رَزَقْنٰهُمْ يُنْفِقُوْنَ ۙ یہ کتاب (قرآن) اس میں شک نہیں کہ اس کے مواد پر عمل کرنے سے ــــ یہ ایک ڈرنے والے کو اپنے مطلوب تک پہنچاتی ہے۔ وہ ڈرنے والا۔ بغیر دیکھے جب کائنات خلقت پر تعقل سے تفکر کرتا ہے۔ تو جان لیتا ہے۔ کہ اس تمام مخلوق کا خالق وہی اللہ ہے۔ جس نے اپنے نبی محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعہ یہ قرآن صرف اسلیئے بھیجا کہ انسان اپنے مقصد حقیقی کی تکمیل کرے۔ اور اس اللہ کو بغیر مشاہدہ ابتداء میں اپنا خالق و معبود تسلیم کرے۔ دوسرے۔ نماز قائم کرے۔ اور جو کچھ اسے مال و متاع دیا گیا ہے۔ وہ اللہ کی راہ میں خرچ کرے۔ یہاں نماز۔ اور صدقات دو چیزیں ہیں۔ جنکے ادا کرنے سے انسان اپنے مطلوب کو پہنچ جاتا ہے۔ یعنی اسے قرب خداوندی حاصل ہوتا ہے۔ اب قرب خداوندی دو طرح سے ہوتا ہے۔ ایک بغیر مشاہدہ کے ایک انسان نماز۔ صدقات پر قائم رہتا ہے۔ اور اُسے اپنی آئندہ زندگی میں۔ یہ ڈر ہوتا ہے۔ کہ اگر میں اپنے مقصد حقیقی کو نہ پا سکا تو اسکے برعکس میری ہیئت خلاف فطرۃ تنزلی (ذلیل) ہوگی اسکا نتیجۂ عمل ظلمت اور عذاب ہوگا۔ سو ایسا انسان اس قرآنی حکم کی تعمیل کرتا ہے۔ اور مقصود کو پہنچ جاتا ہے۔ ڈر چونکہ عاقبت کا ہے۔ اسلیئے اگر انسان کو مشاہدہ نہ بھی ہو۔ تو وہ صرف ایک علم ہی حاصل کرنے سے رہ جاتا ہے۔ مگر وقتِ ضرورت وہ مامون و محفوظ ہو جاتا ہے اور اسکی ظاہری زندگی کے مقصد کی تکمیل ہو جاتی ہے۔ یہی شریعت کا عام طریق ہے۔ کہ انسان قرآنی احکام پر سادہ طریقہ پر عامل ہوتا ہے۔ اور قرآن کے اس فارمولا (قانون) کے مطابق وَلَكُمْ مَا كَسَبْتُمْ ۔ تمہارے لیے آخرت میں وہی چیز ہوگی جو تم دنیا میں عمل کرو گے۔ تو انسان

اپنے لئے عرفانِ الٰہی میں کوئی مقام حاصل کر کے ڈر سے بےخوف اور بےغم ہو جاتا ہے۔ اسی ڈر اور غم کا حوالہ قرآن کی اس آیت میں ہے۔ فَاِمَّا یَاْتِیَنَّکُمْ مِّنِّیْ ھُدًی فَمَنْ تَبِعَ ھُدَایَ فَلَا خَوْفٌ عَلَیْھِمْ وَلَاھُمْ یَحْزَنُوْنَ ○۔ پس جب گمراہی کے بعد تمہارے پاس میری طرف سے ایک لائحہ عمل ہدایت کا آئے گا۔ سو جس نے اپنی گمراہی کا احساس کیا اور اپنے عمل کے نتیجہ سے ڈرا اور اس ہدایت کے احکام پر عمل کیا۔ تو پھر اسے آخرت کی خرابی اور ذلّت کا نہ ڈر ہوگا نہ غم ہوگا۔

دوسرا طریق قرب خداوندی۔ یہ ہے۔ کہ جس شخص نے نماز۔ صدقات ادا کئے۔ تو یہی حالت اسکی بھی ہوتی ہے اسکے ساتھ انسان اپنی عبادتوں میں اضافہ کرتا ہے۔ تو اسکے مراتب کے مدارج اونچے ہوتے جاتے ہیں۔ اور وہ اللہ کے بالکل قریب ہو جاتا ہے۔ اس طرح ایک انسان مراتب و مدارج کے لحاظ سے اپنی زندگی میں اپنے مقصد زندگی کی تکمیل کرتا ہے۔ لیکن اسکے ساتھ ہی انسان کو علم حاصل کرنے کیلئے۔ حواس۔ تعقل۔ شعور۔ قلب بھی عطا کیا گیا ہے۔ اسلئے وہ اپنے ان قویٰ سے بھی کام لیتا ہے۔ کہ اسے کائنات خلقت کی اشیاء کی بناوٹ اور اسکے خالق کی تخلیق کا بھی علم ہو جائے۔ اسلئے وہ شریعت کی تعمیل میں اسی سنت کا عامل ہو جاتا ہے۔ جس عمل سے حضور علیہ الصلوٰۃ و السلام کو قبل نبوت (رسالت) مشاہدات حاصل ہوئے۔ وہ۔ اکثر اوقاتِ فاضلہ میں۔ تنہائی۔ یکسوئی۔ استغراق میں مصروف رہتا ہے۔ ایک طرف قرآنی احکام کی پابندی۔ نماز۔ روزہ۔ صدقات اسکے لیے خالص ماحول پیدا کرتے ہیں۔ اسکے اعمال کی اصلاح ہو جاتی ہے۔ اور یہ چیزیں اسکے قلب سے خواہشات نفسانی کو کم کر کے اسکی قوتِ ارادی کو مستحکم کر دیتی ہیں۔ دوسری طرف تزکیہ۔ فاقہ کشی۔ تنہائی۔ یکسوئی اسکی قوت ادراک میں جلا پیدا کرتے ہیں۔ یہ کوئی غیر آئینی۔ یا من گھڑت بات نہیں۔ قرآن خود بھی اس ترکیب کی تائید کرتا ہے۔ کہ

وَمِنَ الَّیْلِ فَتَھَجَّدْ بِہٖ نَافِلَۃً لَّکَ ۖ عَسٰٓی اَنْ یَّبْعَثَکَ رَبُّکَ مَقَامًا مَّحْمُوْدًا ○ (پارہ ۱۵ سورۃ ۱۷ آیت ۷۹) اور خصوصی احکام نماز سے علاوہ رات کو نماز پڑھ یہ زائد عبادت ہے۔ اسی عبادت سے تجھے مقام حمد (مقبولیت) حاصل ہوگا۔

اور دوسری جگہ

یَآ اَیُّھَاالْمُزَّمِّلُ ۙ۝ قُمِ اللَّیْلَ اِلَّا قَلِیْلًا ۙ۝ (پارہ ۲۹ سورۃ ۷۳ آیت ۱ تا ۲) اے کملی اوڑھ کر سونے والے رات کے قلیل حصہ میں اٹھ کر زائد عبادت میں مشغول ہو۔

ایک اور جگہ ایک اور ترکیب بھی بتاتا ہے۔

اَقِمِ الصَّلٰوۃَ لِدُلُوْكِ الشَّمْسِ اِلٰی غَسَقِ الَّیْلِ وَقُرْاٰنَ الْفَجْرِ ؕ اِنَّ قُرْاٰنَ الْفَجْرِ كَانَ مَشْهُوْدًا ۝ (پارہ ۱۵ سورۃ ۱۷ آیت ۷۸) سورج ڈھلنے کے وقت نماز پڑھ۔ اور فجر (صبح) کے وقت قرآن پڑھ۔ تحقیق صبح کا پڑھنا مشاہدہ کیا جاتا ہے۔

یعنی رات کو سونے کے وقت جب انسان کے جسم کو دنیوی الجھنوں سے فرصت ملتی ہے۔ دن کی تھکاوٹ کے بعد رات کی خاموشی میں آرام ملتا ہے۔ اسی آرام کے وقت میں پھر اٹھ کر فاضل عبادت نماز (نفل) کا ادا کرنا اور اسی رات کی خاموشی۔ تنہائی۔ میں انسان قرآن میں سے پڑھے۔ اس طرح کہ اس تنہائی۔ خاموشی۔ میں یکسوئی۔ و استغراق حاصل ہو تو یہی طریق اس سنت نبوی کی تعمیل ہو جاتی ہے۔ جس سے حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کو معراج و عرفان حاصل ہوا ــــ یہی وہ طریقِ زائد ہے۔ جس سے انسان کو بالمشاہدہ عرفان و قربِ خداوندی حاصل ہو جاتا ہے۔ گویا قرآن کے احکام ہی شریعت ہیں۔ اور شریعت کے احکام سے ہی یہ دونوں قسم کے قرب حاصل ہوتے ہیں۔ اور یہی احکام ہیں جنکا نتیجۂ عمل قرب و عرفانِ الٰہی بالمشاہدہ و بلا مشاہدہ حاصل ہوتا ہے یعنی نماز۔ صدقات۔ روزہ کے عمل کرنے سے اسکا بدلہ اس کی جزا ہی ــــ باری تعالیٰ کی راہ عرفان کی منازل و مقامات ہیں۔ جو نتیجہ (ثواب) کے طور پر انسان پاتا ہے۔

اس طرح۔ نماز۔ روزہ۔ صدقات۔ نفل۔ قرآن کا پڑھنا۔ ان احکام پر عمل درآمد کرنے سے جو کچھ اسکی جزا ہے وہی اللہ تعالیٰ کے قرب و عرفان کے نوری مقامات ہیں۔ اور جب شب بیداری۔ نفل اور قرآن کا عمل بھی جاری رکھا تو انسان اپنے نتیجۂ عمل کو اپنی زندگی میں ہی مشاہدہ کر کے عرفان الٰہی کے علم سے آگاہ ہو جاتا ہے۔ گویا۔ قرآن و حدیث و فقہ پر عمل کرنے سے انسان کو جو جزا (ثواب) حاصل

ہوتی ہے۔ اگر انسان مشاہدہ نہ کرے تب بھی نتیجۂ عمل اسے حاصل ہو جاتا ہے۔ اور اگر مشاہدہ ہو جائے تو بھی نتیجۂ عمل حاصل ہو جاتا ہے۔ اول الذکر کو شریعت (بلا مشاہدہ راہ پر چلنا) کہتے ہیں۔

اور موخر الذکر کو چونکہ اس میں مشاہدہ کیلئے ایک طریق خصوصی بھی پایا جاتا ہے۔ اسلئے شریعت کے نتیجۂ اعمال کے مشاہدہ کرنے کے طریق کو طریقت کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے (یعنی مشاہدہ کرنے کا طریقہ)۔ مشاہدہ میں جو اعمال کا نتیجہ ہیں۔ وہی عرفان الٰہی کی راہیں ہیں۔ اس سے کائنات اور خالق کی حقیقت کا علم ہو جاتا ہے۔ حقیقت سے آگاہ ہونے کو حقیقت[1] سے موسوم کیا جاتا ہے۔ کہ ماوراء ادراک عالم میں کیا کیا اسرار الٰہی ہیں۔

اور جب انسان اپنے مقصد کی تکمیل کلی طور کر کے اپنے خالق کے نور کو پہچانتا ہے تو اسے کائنات اور خالق کی تخلیق کی ترکیب کا علم ہو جاتا ہے۔ تو اس کیفیت کو معرفت[2] کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے۔ نتیجۂ اعمال ہی ایک ایسی جز ہے۔ جس سے قرآن و حدیث پر عمل کی تصدیق و تکمیل ہوتی ہے۔ اسلئے دیکھنا یہ ہے کہ نتیجۂ اعمال میں۔ عمل کا نتیجہ کس طرح حاصل ہوتا ہے۔ اسکی کیفیت کیسی ہوتی ہے۔ اور کس عمل کی کیفیت کیا ہوتی ہے۔ تا کہ انسان جب بھی اس طریق کی طرف رجوع کرے۔ تو اسے کم از کم اتنا علم ہو سکے۔ کہ طریقت کیسے حاصل ہوتی ہے۔ کس سے حاصل ہو سکتی ہے۔ اور نتیجہ اعمال میں جو کچھ مشاہدہ میں آتا ہے۔ اس کی حقیقت کیا ہے؟

واضح ہو کہ۔ انسان وحی جلی (قرآن) کی راہنمائی کے بغیر نہ کوئی طریق حاصل کر سکتا ہے۔ نہ علم حاصل کر سکتا ہے۔ چونکہ قدرت نے اس علم کو بھی ایک فطری طریق پر جاری کیا اسلئے اسکی راہنمائی کیلئے جب تک ایک رسول کا اتباع نہ کیا جائے تب تک علم سے انسان بہرہ مند نہیں ہو سکتا۔ اور جب تک قرآنی حکم کے مطابق قُلْ اِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّوْنَ اللّٰهَ فَاتَّبِعُوْنِیْ یُحْبِبْكُمُ اللّٰهُ کے ساتھ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کے اتباع میں آپؐ سے انتہائی محبت نہ کی جائے تب تک ہمیں اپنے مقصود

---

[1] حقیقت۔ اسرار کی اصل [2] معرفت اصلی کی پہچان

میں کامیابی نہیں ہوسکتی۔ چنانچہ قرآن کی آیت اس کی شاہد ہے۔

قُلْ اِنْ كَانَ اٰبَآؤُكُمْ وَاَبْنَآؤُكُمْ وَاِخْوَانُكُمْ وَاَزْوَاجُكُمْ وَعَشِيْرَتُكُمْ وَاَمْوَالُ نِ اقْتَرَفْتُمُوْهَا وَتِجَارَةٌ تَخْشَوْنَ كَسَادَهَا وَمَسٰكِنُ تَرْضَوْنَهَآ اَحَبَّ اِلَيْكُمْ مِّنَ اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ وَجِهَادٍ فِىْ سَبِيْلِهٖ فَتَرَبَّصُوْا حَتّٰى يَاْتِىَ اللّٰهُ بِاَمْرِهٖ ط وَاللّٰهُ لَا يَهْدِى الْقَوْمَ الْفٰسِقِيْنَ ○ (پارہ ۱۰ سورۃ ۹ آیت ۲۴)

ان سے کہیں اگر ہوئیں تمہارے ماں باپ۔ بیٹے ۔بھائی۔عورتیں۔اور قبیلہ کنبہ اور مال جو کمایا ہے تم نے اور سوداگری (تجارت) جسکے لیے مندا ہو جانے سے ڈرتے ہو (کہ گھاٹا نہ پڑے) اور گھر (محلات) جنہیں تم پسند کرتے ہو۔ بہت پیارے ہیں تمہیں اللہ سے اور اسکے رسول سے اور جہاد سے۔ پس انتظار کرو کہ آئے اللہ کی طرف سے حکم اسکا تحقیق اللہ نہیں پہنچا تا مقصود تک ایسے فاسقوں کو۔

اور اسکے ساتھ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کی حدیث بھی اس حب کی تائید کرتی ہے۔ لَا يُؤْمِنُ اَحَدُكُمْ حَتّٰى اَكُوْنَ اَحَبَّ اِلَيْهِ مِنْ وَّالِدِهٖ وَوَلَدِهٖ وَالنَّاسِ اَجْمَعِيْنَ۔ کوئی تم میں سے ایماندار نہیں ہوسکتا جب تک کہ وہ اپنے والدین۔ اولاد اور تمام لوگوں سے زیادہ ہم سے حب (محبت) نہ کرے۔ یعنی جس شخص کو اپنے مال وجان۔ اولاد سے زیادہ ہم سے محبت نہیں وہ ہم سے نہیں۔

اس سے صاف ظاہر ہوتا ہے۔ کہ اگر حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام سے راہنمائی حاصل کرنی ہے۔ کہ انسان ایک اللہ کی محبت کا مقصود حاصل کرے۔ تو اسکا طریق یہی ہے۔ کہ انسان حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کی محبت پیدا کرے اور محبت کا تقاضا یہ ہے۔ کہ انسان کسی شے کی محبت میں۔ اس شے کے تصور کے سوا اور کچھ بھی اپنے قلب و دماغ میں نہیں رکھ سکتا۔ اسکا مطلب ہی یہی ہے۔ کہ اگر انسان اللہ کو پہچاننا اور اسکا قرب چاہتا ہے۔ تو پہلے نور محمدی کو پہچانے۔ پہلے محمدؐ کی حمد کرے یہی حمد گویا اللہ کی حمد کے مصداق ہوگی اسی حمد سے حقیقت محمدی تک پہنچے گا۔ حقیقت محمدؐ گیا ہے۔ اَوَّلُ مَاخَلَقَ اللّٰهُ نُوْرِىْ بس یہاں حقیقت الٰہی کا علم ہو جائے گا۔ بغیر اس راہ کے انسان کسی اور طریقے سے اللہ تک نہیں پہنچ سکتا۔ سطحی طور انسان ایسے نظریہ پر اعتراض کرسکتا ہے۔ کہ ایک بندہ کو

اللہ کا درجہ دیا جاتا ہے۔ ایسا نہیں ہوسکتا۔ اعتراض کرنے سے پیشتر اس امر کا لحاظ ضروری رکھنا ہے۔ کہ ایک انسان کو قرآنی آیات اور واقعات پر پورے طور عبور حاصل ہو اور اسکی نظر سے حقیقت کی ہر کیفیت گذر چکی ہو۔ اسکے لیے شریعت نے ہر مقام پر ایک دلیل اور مثال پیش کی ہے۔

اصحاب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم۔ امت کے اوّلین متبعین (تابعدار) ہیں۔ اور قرآن و حدیث کی انہوں نے اولیٰ طریقہ پر تعمیل کی۔ اور انہیں حضرات نے شریعت کے احکام کی ظاہری شکل اپنے علم وعمل سے دی۔ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے محبتِ رسول میں اپنا مال و جان آپؐ پر نثار کر دیا۔ ہجرت کے پُر خطر موقع پر حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کا ساتھ دیا۔ اور آپ نے حضور علیہ الصلوٰۃ و السلام کے سوائے کسی اور دنیوی جاہ و آرام کو پسند نہ فرمایا۔ یہ جذبہ محبت ہی تھا۔ اور آپ کا نظریہ و عقیدہ خدا کے معبود ہونے میں محبت رسولؐ کے ساتھ یہ تھا۔ کہ آپ نے حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کے انتقال کے بعد یہ اعلان کیا کہ وَمَا مُحَمَّدٌ اِلَّا رَسُوْلٌ ج قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِهِ الرُّسُلُ ط اَفَاْئِنْ مَّاتَ اَوْ قُتِلَ انْقَلَبْتُمْ عَلٰى اَعْقَابِكُمْ ط وَمَنْ يَّنْقَلِبْ عَلٰى عَقِبَيْهِ فَلَنْ يَّضُرَّ اللّٰهَ شَيْئًا ط (پارہ ۴ سورۃ ۳ آیت ۱۴۴) اے لوگو جو محمدؐ رسول اللہ سے محبت رکھتے ہو۔ تمہاری حالت یہ نہ ہونے پائے کہ تم گزشتہ امتوں کی طرح پیغمبر کو خدا کا درجہ دو۔ محمد صلی اللہ علیہ وسلم وفات پا گئے۔ یعنی وہ اب تمہارے حواس میں نہیں آسکتے۔ تمہیں مل نہیں سکتے۔ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے شریعت پیش کی۔ جس میں اللہ تعالیٰ کو معبود ماننا ہے۔ سو اللہ ہمیشہ زندہ ہے۔ جسکے لیے تمہاری جستجو جاری رہنی چاہیئے۔ تمہارا مقصود ابھی قائم ہے۔ یہی عقیدہ خدا اور رسول کے لیے ہونا چاہیئے۔ لیکن بلال رضی اللہ عنہ کی محبت رسول سے طریق سیکھنا ہے۔ کہ آپ نے محبت رسول میں حضورؐ کے بعد کبھی اذان نہ دی۔ ایکبار جب آپ نے اذان دی تو حالت بدل گئی۔ یہاں مقصود وہی ہے۔ جو ایک اللہ کے لیے ہونا چاہیئے۔ لیکن محبت کے تاثرات بھی اپنی اصلی کیفیت میں خود نمایاں ہوتے ہیں۔ یہ تو ظاہری علامات ہیں۔ جہاں عرفانِ الٰہی حاصل کرنا ہو وہاں وہی کیفیت ہوگی۔ جو اسم محمدؐ میں مضمر ہے۔

جنگ احد میں ایک عورت کے بچے شہید ہوتے ہیں۔ لیکن وہ پکارتی ہے۔ کہ مجھے محمد صلی

اللہ علیہ وسلم کی خیریت بتاؤ ـــــــ ہجرت کے موقع پر ایک عورت کا شیر خوار بچہ چھینا جاتا ہے۔ اور اسے حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام سے ملنے سے روکا جاتا ہے۔ لیکن وہ بچہ کو چھوڑ کر حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کی خدمت میں پہنچ جاتی ہے۔ غزوات (جہاد) میں مسلمان باپ کافر بیٹے کو قتل کرنے سے گریز نہیں کرتا۔ اور وقت پر اپنی جان حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام پر قربان کرنے کے لیے ہر شخص تیار ہے۔ اندازہ کیجئے کہ جب حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کو اپنی ہر عزیز شے سے زیادہ عزیز رکھا جائے۔ تو اس حُب کا تقاضا یہی ہے۔ کہ ہر شخص کے تصور میں حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کی شبیہ مبارک ہی بسی رہے گی۔

اصحابِ رسول اللہؐ نے محبت رسول کی بدرجہ اکمل تکمیل کی تو اسکا لازمی نتیجہ انہیں دو صورتوں میں ظاہر ہوگا۔ کہ انہیں بدرجہ اکمل قرب خداوندی حاصل ہوا۔ اور جس شخص نے طریق طریقت پر عمل کیا تو اسے عرفان و علم بھی حاصل ہوا۔ شریعت کی تکمیل کرنے والے کو ظاہری علم میں کمال حاصل ہو گا۔ اور طریقت کی تکمیل کرنے والے کو باطنی علم میں کمال حاصل ہوگا۔ چونکہ مقصد الٰہی میں ہر شخص کیلئے علم حاصل کرنا ہے۔ اسلئے رسول کے بعد یہی صاحبِ علم لوگ قائم مقام رسول کے اس شریعت کو جاری کریں گے۔ یہ لوگ اپنے حاصل کردہ علم سے آئندہ آنے والے لوگوں کو علم سے آگاہ کرتے رہیں گے۔ وہ علم کیا ہوگا۔ جبکہ شریعت کی تکمیل ہو چکی اور قرآنی علم رسول کے ذریعہ ظاہر ہو چکا۔ وہ علم فقہ ہے۔ یعنی قرآنی علم کی تشریح حدیث کے ذریعہ سمجھائیں گے۔ اور حدیث کی تشریح فقہ اور اپنے عمل سے بتائیں گے۔ یہ لوگ عالم۔ فقیہ۔ مجتہد کہلائیں گے۔

اور بالمشاہدہ عرفان کرنے والے لوگ بھی چونکہ ایک مکمل علم حاصل کر چکے ہیں۔ یہ بھی شریعت پر عامل رہ کر اپنے تزکیہ و مجاہدہ سے مشاہدہ حقیقی حاصل کر چکے ہیں۔ اسلئے عرفان الٰہی میں مشاہدہ و علم حاصل کرنے کیلئے مجاہدہ و مشاہدہ کا طریق انہیں سے حاصل ہوگا۔ انہیں ولی کے نام سے منسوب کیا جاتا ہے۔ اور یہ طریق تزکیہ و مجاہدہ بھی وہی طریق ہوگا جو حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کی راہنمائی میں انہیں حاصل ہوا۔ اور حضورؐ کے بعد ایک ولی حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کے خلیفہ (نائب رسول اللہ) کی حیثیت سے ایک راہنما کی حیثیت سے امت کو علم بتائے گا۔ مقصود حاصل کرنے کیلئے۔

چونکہ قرآن نے عمل کا ایک طریق بتا دیا کہ قُلْ اِنْ کُنْتُمْ تُحِبُّوْنَ اللّٰہَ فَاتَّبِعُوْنِیْ یُحْبِبْکُمُ اللّٰہُ اسلئے رسول اللہؐ کے بعد آپکے عالموں سے فیض حاصل کرنے کیلئے رسول اللہ کی محبت کا طریق یہی ہوگا۔ کہ خلیفۂ رسول اللہ سے محبت کی جائے۔ اور اس حب کی کیفیت وہی ہوگی جو کہ اللہ تعالیٰ کے عرفان حاصل کرنے کیلئے رسول اللہ سے محبت کرنے میں ہوتی ہے۔ اور جب تک ہم نائب رسول اللہ یا مجتہد سے علم حاصل کرنے کیلئے رجوع نہ کریں تب تک نہ ہمیں علم حاصل ہوسکتا ہے۔ نہ ہمارا علم حقیقت پر مبنی ہوسکتا ہے۔ چنانچہ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کی حدیث اس حقیقت کی تصدیق کرتی ہے۔

اِنَّ مَثَلَ اَھْلِ بَیْتِیْ کَمَثَلِ السَّفِیْنَۃِ نُوْحٍ مَنْ رَکِبَھَا نَجَاوَمَنْ تَخَلَّفَ عَنْھَا غَرَقَ ۔ تحقیق مثال میرے اہل بیت[1] کی مانند مثالِ کشتی نوح کے ہے۔ جو اس کشتی میں سوار ہوا۔ نجات یافتہ ہوا۔ اور جس نے ان سے مخالفت کی وہ غرق ہوا۔

اسلئے شریعت وطریقت کے عالم سے رجوع کرنا۔ انسانی نصب العین اور مقصود کے لیے لازمی ہے۔ یعنی ہمیں رجوع الی اللّٰہ (عرفان قرب الٰہی) قرآنی علم حاصل کرنا ہوگا۔ کہ کیسے ایک خالص روحانی ماحول میسر ہوسکتا ہے۔ اور اس ماحول میں ہم کس طرح اپنے وجود کے روحانی خواص میں اپنی کھوئی ہوئی قوتیں دوبارہ پیدا کرسکیں اور ہمارے لئے وہ کونسے طریق ہیں جن سے ہماری اشرف المخلوقاتی قوتیں اپنی اصلی حالت پر آجائیں۔ یہ طریق سب قرآن میں موجود ہیں۔ اور اسکا نمونۂ عمل حدیث (اقوال وافعال) رسول اللہؐ میں موجود ہیں اور حدیث رسول اللہ کا نمونۂ عمل ایک ولی سے ہی حاصل ہوتا ہے۔ قرآن وحدیث وفقہ پر عمل ہی شریعت ہے۔ اور ہر شخص کیلئے یہی طریقِ عمل حاصل کرنا لازمی ہے۔ جس سے انسان عرفان الٰہی میں مراتب حاصل کرلیتا ہے۔ اور شریعت کی روح اسکا نتیجہ عمل ہے۔ یعنی قرآن وحدیث وفقہ پر عمل کرنے سے عمل کا ایک ثواب (اجر) مقرر ہوتا ہے۔

---

[1] اہل بیت سے مراد امت کے علماء وولی۔ کیونکہ مَنْ رَکِبَھَا اور مَنْ تَخَلَّفَ کا اشارہ ہر انسان پر آتا ہے۔ اہل بیت کا ہر جگہ ہر زمانہ میں پایا جانا ممکن نہیں۔ ولی کا ہر جگہ ہر زمانہ میں پایا جانا یقینی ہے۔

جو ہمارے حواس کے احاطہ میں نہیں آتا۔ اسلیئے شریعت پر عمل کرنے سے انسان کو جو ثواب حاصل ہو گا۔ اسکا مشاہدہ کرنا کہ ہمارے عمل کا نتیجہ (جزا) کس ہیئت میں ہوتا ہے۔ فقر کہلاتا ہے۔ اور یہ مشاہدہ سنت نبویؐ پر عامل ہونے سے حاصل ہوتا ہے۔ مثال کے طور اگر ایک شخص نماز پڑھتا ہے۔ تو اسکا مقصود عرفان الٰہی ہوتا ہے۔ تو نماز پڑھنے سے نماز کا ایک اجر (نتیجہ) قائم ہوتا ہے۔ بظاہر نماز کے عمل کا ظاہری نتیجہ ہمارے حواس میں نہیں آتا لیکن اس عمل کا ایک نتیجہ ضرور ہے۔ چونکہ یہ اجر محسوس میں نہیں اسلیئے اسکا وجود غیر جسمانی عالم میں پایا جائے گا۔ اور اس کیفیت کی ہیئت روحانی (نورانی) ہو گی۔ اب ہر شخص نماز پڑھتا ہے۔ لیکن وہ اپنے نتیجۂ عمل کو دیکھ نہیں سکتا ــــــ اگر چہ دیکھ نہیں سکتا لیکن اسکے لیے وہ اجر یقیناً قائم ہو جاتا ہے۔ اسی طرح اگر ایک شخص نماز پڑھتا ہے۔ اور وہ علم حاصل کرنے کیلیئے اپنے نتیجۂ عمل کو دیکھنا چاہتا ہے۔ تو وہ تزکیہ مجاہدہ سے اپنے قوت ادراکی۔ روح۔ قلب۔ شعور کو تقویت دے کر انہیں قوائے ادراکی سے مشاہدہ کرتا ہے۔ تو وہ اس نورانی عالم و کیفیت سے آگاہ ہو جاتا ہے (روح کے ذریعہ) جو نماز کے اجر میں دونوں کو مساوی حیثیت سے حاصل ہوتا ہے۔ گویا شریعت کا عمل دونوں کیلیئے یکساں ہے اور ماوراء ادراک علم حاصل ہونے کی حیثیت سے ایسا شخص عالم اور ولی کہلاتا ہے۔ چونکہ دونوں کا مقصد قربِ خداوندی ہوتا ہے۔ ایک صرف مراتب حاصل کرتا ہے۔ دوسرا مشاہدہ و علم بھی حاصل کرتا ہے۔

انسانی زندگی میں دین سے متعلق تمام اعمال کا نتیجہ ہر انسان کو اسکے عمل کے ساتھ ہی ملتا ہے۔ روحانی عالم اور مادی دنیا کی روحانیت اور مادیت میں مناسبت نہیں۔ روحانی عالم اور اسکے اجر کی وسعت مادیت میں سما نہیں سکتی۔ اسلیئے مادی دنیا میں یہ اپنے وجود کے ساتھ اپنے عمل کی جزا کا بدل حاصل نہیں کرتا۔ مثال کے طور ایک نماز کا اجر ایک وسیع نورانی کیفیت ہے۔ تو انسان اسکا مشاہدہ ایک وسیع نور میں ہی کرے گا۔ اور علم حاصل کرنے کیلیئے اس نور کی کیفیت (اگر وہ علم میں پوری مہارت رکھتا ہوتو) کو اپنی اصلی ہیئت میں پائے گا۔ اور وہ اس نور کی کیفیت کو اچھی طرح پہچان لے گا۔ اگر علم میں مہارت تامہ (تکمیل اولیٰ) نہ ہوتو یہ کیفیت تمثیلی شکل میں دیکھے گا کہ ایک عظیم الشان خوبصورت باغ

ہوگا جس میں ہر قسم کی نہریں مصفیٰ نظر آئیں گی۔ تو یہ اس باغ کو حاصل کر کے اسکی کیفیت سے حظ حاصل کرے گا۔ کیونکہ یہ کیفیت روح کے ذریعہ قلب پر منعکس ہوگی اور قلب کے ذریعہ واہمہ۔ حافظہ پر آئے گی۔ اور حافظہ سے شعور حاصل کرے گا۔ تو اس حظ (لطف) کی کیفیت ویسی ہوگی جیسے ایک شخص خواب کی حالت میں کسی خوبصورت باغ میں ہو اور وہاں دودھ۔ شہد اور قسم قسم کے میوہ جات لذیذ کھاتا ہو۔ تو اس لذّت کا اثر قلب پر آئے گا۔ اور قلب سے۔ واہمہ۔ حافظہ میں آئے گا اور حافظہ سے شعور حاصل کرے گا۔ چونکہ حواسِ خمسہ خود کیفیت محسوس نہیں کرتے بلکہ تعقل وشعور ہی محسوس کرتے ہیں اسلئے انسان مثل بیداری (حواس کے ذریعہ) کے ان کیفیات سے حظ حاصل کرے گا۔ البتہ فرق یہ ہوگا کہ جسمانی وجود مادی اشیاء سے قوت حاصل کر لیتا ہے۔ یہاں ان روحانی اشیاء کے کھانے یا پینے سے اس کے وجود پر کوئی اثر نہ ہوگا اسی طرح ان باطنی تاثرات کا اثر ظاہری دنیا میں محسوس نہیں کیا جا سکتا البتہ اگر انسان تزکیہ ومجاہدہ میں اپنے جسم کو لطیف کر چکا ہو۔ تو جسم کی لطافت ایسی کیفیتوں کو حاصل کر لے گی۔ اسکا نتیجہ یہ ہوگا کہ انسان کا خود تو اپنا جسم لطیف ہوگا۔ اور روحانی غذا اس وجود کو مزید تقویت دے گی۔ اور جسم کی قوت ایک طرف زیادہ لطیف ہوگی۔ اور دوسری طرف انسان مادی غذا کا محتاج نہ رہے گا۔ کیونکہ مادی غذا صرف زندگی کے قائم رکھنے اور نشوونما کیلئے ہوتی ہے۔ اور جب انسان مجسم زندگی (لطیف ہیئت) میں ہو جائے تو پھر اسکی نشوونما اور زندگی کے قیام کیلئے مادہ کی ضرورت نہیں رہتی بلکہ یہی نتیجہ عمل (روحانی غذا) زندگی کو برقرار رکھنے کا کام دیتا ہے۔ ایسی حالت میں انسان بغیر کھائے سالہا سال زندہ رہ سکتا ہے۔ اور انسان شریعت کے عمل۔ تزکیہ۔ مجاہدہ اور مشاہدہ میں عروج پاتا جائے گا ایک طرف وہ نماز۔ روزہ۔ صدقات۔ اور زائد عمل نوافل۔ قرأت قرآن کے نتیجۂ اعمال میں انکی باطنی (نورانی) کیفیات کو حاصل کرتا جائے گا اور یہی کیفیات حقیقتاً عرفانِ الٰہی کی منازل ومراحل ہیں جو راہ حقیقت میں مشاہدہ میں لائے گا۔ اور دوسری طرف اگر انسان کو جسم لطیف کرنے کی قدرت حاصل ہو تو وہ اپنے باطنی قرب کے ساتھ جسم میں بھی اپنی باطنی حیثیت کے اعتبار سے لطیف ہو جائے گا۔ اور اگر روح رحمانی اور روح جسمانی میں مناسبت آگئی۔ تو

انسان بظاہر انسان محسوس ہوگا لیکن بہ باطن انسان کی جسمانی قوت (روح حیوانی) بھی اپنی روح رحمانی کے برابر لطیف ہوگی اور انسانی مشاہدہ میں اسکے ظاہر و باطن میں کوئی پردہ (روکاوٹ) حائل نہ ہوگا۔ لیکن یہ کیفیت محدودے چند کو حاصل ہوتی ہے۔ کہ وہ لوگ اپنی ابتداء میں دنیوی رجحانات اور دنیوی مشاغل سے فارغ ہوتے ہیں۔اور باقی لوگ اپنے نتیجہ عمل سے اپنی زندگی میں فائدہ نہیں اٹھا سکتے۔

انسان کو دنیا میں اپنے مادی جسم کے ساتھ دو کام درپیش ہیں۔ایک طرف تفکر یعنی شریعت کی پابندی دوسری طرف سامانِ زندگی کی فراہمی۔ان دونوں کے دو علیحدہ نتائج اسکے لیے مقرر ہیں۔شریعت کی پابندی میں اسکا نتیجہ عمل محفوظ ہو جاتا ہے۔اور حصول سامان زندگی کے عمل سے انسان اپنی جسمانی نشوونما کر لیتا ہے۔ مادی عمل سے اسکے وجود کو تقویت مل جاتی ہے۔اور روحانی عمل سے اسکے جسم کو فائدہ حاصل نہیں ہوتا۔ بلکہ جب تک اسکی زندگی برقرار رہتی ہے۔اسکا روحانی عمل محفوظ رہتا ہے۔اور موت کے بعد چونکہ اسکی روح (رحمانی) باقی رہتی ہے اور دنیا میں بھی روح رحمانی مراتب پاتی ہے۔موت کے بعد بھی مادیت ختم ہونے پر روح رحمانی مادیت سے خالی ہو جاتی ہے۔اور یہی روح رحمانی اپنے زندگی کے مراتب کو محسوس کرتی ہے۔ دنیا (مادہ) کے باقی رہنے کی وجہ سے انسان ان مراتب کو کلی طور نہیں پا سکتا اسلئے اسکی روح کا مقام مادہ اور اسکے مراتب کا درمیانی مقام ہوتا ہے۔ جسے برزخ (پردہ) کے نام سے منسوب کیا جاتا ہے۔ وہ اسلئے کہ اس کائنات عالم کی تخلیق میں اللہ تعالیٰ نے ایک نظام کے تحت ایک وقت مقرر کیا ہے۔ جس وقت ہر انسان کو اپنے عمل کے مطابق جزا ملے گی وہ وقت قیامت (ٹھہراؤ یعنی تخلیق کا ٹھہراؤ) اور یوم الحشر (تمام مخلوق کے ایک مقام روحانی میں جمع ہونے کا دن) اور یوم الجزا (یعنی اپنے نتیجۂ اعمال کی کیفیت پانے کا دن) کے نام سے منسوب کیا جاتا ہے۔البتہ جو شخص اپنی زندگی میں اپنے نتیجۂ اعمال کے مشاہدہ میں منازل راہ عرفان طے کرتا جائے گا۔اسے ان کیفیات کا حظ۔اثر اور قیام اسی روح رحمانی سے حاصل ہوگا جس روح رحمانی سے غیر شاہد یوم جزا کے دن اثر حاصل کرے گا۔ اور اسکی موت کے بعد اسکی زندگی اور موت میں کوئی تمیز نہ رہے گی اور اسکا مشاہدہ علیٰ حالہ برقرار رہے گا اور جو مقام قرب الٰہی میں اسے اپنی زندگی میں حاصل ہوگا وہی مقام اسکی موت کے بعد بدستور اسے

حاصل ہوگا۔ کیونکہ اسکا مشاہدہ عمل زندگی میں جاری تھا۔ اسلئے اسکا برزخ اس کا وہی انتہائی حاصل کردہ مقام ہی ہوگا۔ اور جب انسان اپنے عرفان کی تکمیل کر لیتا ہے۔ تو اسکا مطلب یہ ہوتا ہے۔ کہ اس نے قرب الٰہی میں خود ذات الٰہی کے نور کو حاصل کیا۔ اور قرب سے مراد وصال یا فنا ہوتی ہے۔ کیونکہ انسان اسوقت تک کسی نورانی ماحول میں داخل نہیں ہوسکتا جب تک اسکی روح رحمانی میں اسی ماحول جیسی ہیئت حاصل نہ ہو۔ مثال کے طور پر ایک شخص سورج کو دیکھ لیتا ہے۔ لیکن قریب نہیں ہوسکتا۔ لیکن اسکا دیکھنا اس وقت تک حقیقی نہیں ہوسکتا۔ جب تک کہ سورج میں خود نہ پہنچے (کیونکہ انسان کا واہمہ۔ حافظہ ایسی صورت میں غلط نقوش پیدا کرسکتا ہے) اور سورج میں وہی پہنچ سکتا ہے۔ جو سورج کے ماحول جیسی ہیئت حاصل کرے۔ ورنہ اگر اس سے کم قوت ہو تو جل جائے گا یا اس تک پہنچ نہ سکے گا اور سورج میں پہنچنے کی نوعیت یہی ہوگی کہ وہ بھی سورج کے وجود کی ہیئت میں ہوگا اور جب سورج کے وجود میں داخل ہوگا تو دونوں وجود ایک دوسرے میں جذب (فنا) ہو جائیں گے یہی کیفیت ہر ماحول اور خود ذات الٰہی کی ہے۔ کہ قرب الٰہی حاصل کرنے والا نور خداوندی میں جذب (فنا) ہو کر ذات حقیقی کی ہیئت میں گم ہو کر اپنی ہر مادی اور غیر مادی قوت سے عدم ہو جائیگا۔ کیونکہ ایک ہیئت اپنے منبع حقیقی (علّت) میں فنا ہو کر اپنی معلولی کیفیت عدم کر جاتی ہے۔ ایسی حالت میں ایک عارف کیلئے موت اور زندگی کی قید نہیں رہتی۔ روحانی حیثیت میں اور زندگی میں بھی انسان جب اس مقام کو حاصل کر لیتا ہے۔ تو روحانی حیثیت میں اسکی مادی ہیئت اس پر اثر انداز نہیں ہوتی بلکہ روح کے اعتبار سے جب وہ جذب کی کیفیت میں آ جاتا ہے۔ تو اسکی روح روح رحمانی نہیں ہوتی بلکہ وہ روح ذاتِ الٰہی میں جذب ہو کر ایک حقیقی وجود حاصل کر لیتا ہے (سما جاتی ہے) اس کا تاثر وہی ہوتا ہے۔ جو ذات الٰہی کا ہوتا ہے۔ اور جسمانی ہیئت میں حواس و تعقل کے ساتھ انسان بظاہر انسان ہی ہوتا ہے۔ اور اسکا جسمانی وجود روحانی کیفیت سے اثر قبول کر کے خود فنا نہیں ہوتا بلکہ اسکے اجزا (مرکب) وہی اجزا ہوتے ہیں جو مادہ میں قائم ہوتے ہیں اسلئے انسان جب عالمِ مشاہدہ میں شریعت کے عمل سے اپنے نتیجۂ عمل کو پاتا ہے۔ تو اسکا اثر اسے دنیا میں اسکے وجود پر طاری نہیں ہوتا۔ گویا انسانی عمل میں اسکے عرفان میں اگر فرق اور خصوصیت پیدا ہوتی ہے۔ تو وہ تزکیہ۔

مجاہدہ۔اور مشاہدہ سے ہی ہوتی ہے۔اب دیکھنا یہ ہے۔کہ اس خصوصیت کیلئے شریعت (قرآن) نے کیا طریق اور کیا عمل بتایا۔جس سے تزکیہ کیا جاتا ہے۔جس سے مشاہدہ کیا جاتا ہے۔

شریعت کی تابعداری ہی دراصل عرفان کی روح ہے۔وہ یہی عمل ہے۔جس پر حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے ایک روحانی راہنما کی حیثیت سے عمل کیا۔وہ خصوصی احکام۔الصلوٰۃ[1] (نماز)۔الصوم (روزہ)۔زکوٰۃ وصدقات اور حج ہیں۔اسکے علاوہ ماحول اسلامی سازگار رکھنے کیلئے۔باقی احکام سچ بولنا۔احسان کرنا۔انسانوں کی آپس میں اعانت۔اور اسکے ساتھ معاشرت کے بُرے اعمال جھوٹ۔دغا۔فریب۔حسد۔لالچ۔بغض۔ناجائز حصول ایسے عام احکام ہیں جو معاشرہ اور ماحول میں اچھائی اور برائی پیدا کرتے ہیں۔ان برائیوں سے انسان کو ماحول سازگار نہ ہونے کے باعث نیکی کرنے کی ترغیب نہیں ملتی نہ موقع ملتا ہے۔اسکے علاوہ نوافل (زیادہ عبادت) بھی ہیں جن سے تزکیہ ومجاہدہ حاصل ہوتا ہے۔چنانچہ قرآن کا ارشاد ہے۔فَتَهَجَّدْ بِهٖ نَافِلَةً لَّكَ ۔ قُرْاٰنَ الْفَجْرِ اور اسکی تاکید میں فَاقْرَءُوْا مَا تَيَسَّرَ مِنَ الْقُرْاٰنِ۔

اَقِمِ الصَّلٰوةَ لِدُلُوْكِ الشَّمْسِ اِلٰى غَسَقِ اللَّيْلِ وَقُرْاٰنَ الْفَجْرِ ؕ اِنَّ قُرْاٰنَ الْفَجْرِ كَانَ مَشْهُوْدًا ○ قائم کر نماز سورج ڈھلنے سے رات کے اندھیرے تک ___ اور قرآن پڑھ صبح کو ___ تحقیق صبح کا قرآن پڑھنا۔حاضر کیا جاتا ہے۔

وَمِنَ الَّيْلِ فَتَهَجَّدْ بِهٖ نَافِلَةً لَّكَ ۖ عَسٰۤى اَنْ يَّبْعَثَكَ رَبُّكَ مَقَامًا مَّحْمُوْدًا ○ اور رات کے وقت تہجد (نماز) پڑھ۔یہ عبادت زائد ہے واسطے تیرے۔کہ اللہ تجھے جلدی پہنچائے حمد[2]

---

[1] الصلوٰۃ۔سے مراد جملہ عبادات ہیں۔لیکن نماز کی طرف خصوصی اشارہ ہے کہ نماز میں عبادت کے تمام مراسم (اطوار۔ڈھنگ) پائے جاتے ہیں۔[2] مقام محمود۔جسد مقدس محمدؐ رسول اللہ کی طرف اشارہ ہے۔کہ جہاں آپؐ کے ابتدائی نور میں حمد کی خاصیت ہے۔وہاں آپؐ کے جسد مقدس کو بھی لا انتہا روحانیت حاصل ہوتا کہ روح وجسد کی یکساں حمد کی جائے۔ورنہ محمدؐ کو ازل سے حمد حاصل ہے۔

والے مقام پر۔ دوسرے مقام پر حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کی طرف ایک مکمل طریق مجاہدہ بیان کیا گیا ہے۔ یٰٓاَیُّھَا الْمُزَّمِّلُ ۙ قُمِ الَّیْلَ اِلَّا قَلِیْلًا ۙ نِّصْفَہٗٓ اَوِ انْقُصْ مِنْہُ قَلِیْلًا ۙ اَوْ زِدْ عَلَیْہِ وَرَتِّلِ الْقُرْاٰنَ تَرْتِیْلًا ؕ اے (رات کے وقت استراحت میں لیٹے ہوئے) کپڑا اوڑھنے والے (محمدؐ) کھڑا رہ رات کو مگر تھوڑا۔ رات کا آدھا یا اس میں کم کر یا زیادہ (تجھے اختیار ہے) اور آہستہ آہستہ پڑھ قرآن۔

اِنَّا سَنُلْقِیْ عَلَیْکَ قَوْلًا ثَقِیْلًا ○ تحقیق عنقریب ڈالیں گے (القا کریں گے) ہم اوپر تمہارے ایک بھاری بات (ایک قوی نور)۔

اِنَّ نَاشِئَةَ الَّیْلِ ھِیَ اَشَدُّ وَطْاً وَّاَقْوَمُ قِیْلًا ؕ تحقیق اٹھنا رات کا وہ بہت سخت ہے نفس (جسمِ مادی) کے کچلنے میں۔ اور انتہائی سیدھا کرنے والا ہے بات کو۔ یعنی قرآن پڑھنے (عبادت کرنے) میں حقیقی جذباتِ وجدانی پیدا ہو جاتے ہیں۔

اِنَّ لَکَ فِی النَّھَارِ سَبْحًا طَوِیْلًا ؕ تحقیق دن میں تمہارے لیے ایک طویل مصروفیت (شغل تبلیغ ور اہنمائی) ہوتی ہے۔

وَاذْکُرِ اسْمَ رَبِّکَ وَتَبَتَّلْ اِلَیْہِ تَبْتِیْلًا ؕ اور یاد کر نام اپنے پروردگار کا اور منقطع ہو جا طرف اسکے (اللہ کے) قطعی منقطع ہو جانا۔

پھر ایک تنبیہ ہے۔ اور ایک تحریک ہے۔

اِنَّ ھٰذِہٖ تَذْکِرَةٌ ۚ فَمَنْ شَآءَ اتَّخَذَ اِلٰی رَبِّہٖ سَبِیْلًا ۧ پس یہ ایک نصیحت (ایک طریق راہنمائی) ہے۔ پس جو کوئی چاہے (کہ میں اللہ کا عرفان حاصل کروں) پکڑے اپنے پروردگار کی طرف (جانے والی) راہ کو۔

اب حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کے عمل کی تائید و تصدیق۔ اور صحابہؓ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اتباع کا نقشہ پیش کیا جاتا ہے۔

اِنَّ رَبَّكَ يَعْلَمُ اَنَّكَ تَقُوْمُ اَدْنٰى مِنْ ثُلُثَيِ الَّيْلِ وَنِصْفَهٗ وَثُلُثَهٗ وَطَآئِفَةٌ مِّنَ الَّذِيْنَ مَعَكَ ط تحقیق اللہ جانتا ہے۔ یہ کہ تم کھڑے رہتے ہو تھوڑا تین چوتھائی رات سے۔ اور اس کے نصف سے اور تہائی اسکے۔ اور (آپؐ کے اتباع میں) وہ لوگ بھی کھڑے رہتے ہیں (عبادت میں) جو جماعت (اصحاب) آپکے ساتھ ہیں۔

وَاللّٰهُ يُقَدِّرُ الَّيْلَ وَالنَّهَارَ ط عَلِمَ اَنْ لَّنْ تُحْصُوْهُ فَتَابَ عَلَيْكُمْ اور اللہ اندازہ کرتا ہے رات کو اور دن کو۔ اور جانتا ہے۔ کہ ہرگز تم نہ بنا سکو گے (اپنی پوری عبادت کی قدرت۔ دن کی مصروفیت اور قوتِ جسمانی کی برداشت پر) پس پھر آیا تمہارے اوپر۔ یعنی رجوع ہوا مہربانی اور رعایت سے تمہاری طرف تا کہ تمہارے حصول عرفان و مشاہدہ میں وقت کے تعین کے ساتھ آسانی پیدا کردے۔ فَاقْرَءُوْا مَا تَيَسَّرَ مِنَ الْقُرْاٰنِ ط عَلِمَ اَنْ سَيَكُوْنُ مِنْكُمْ مَّرْضٰى لا وَاٰخَرُوْنَ يَضْرِبُوْنَ فِي الْاَرْضِ يَبْتَغُوْنَ مِنْ فَضْلِ اللّٰهِ لا وَاٰخَرُوْنَ يُقَاتِلُوْنَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ۖ فَاقْرَءُوْا مَا تَيَسَّرَ مِنْهُ لا وَاَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتُوا الزَّكٰوةَ وَاَقْرِضُوا اللّٰهَ قَرْضًا حَسَنًا ط (پارہ ۲۹ سورۃ ۷۳ آیت ۲۰) پڑھ جو میّسر ہو سکے (جتنا پڑھ سکو) قرآن میں سے۔ اللہ جانتا ہے۔ کہ البتہ تم میں سے اکثر بیمار ہوں گے۔ اور لوگ کاروبار (تلاش سامان زندگی میں) میں اللہ کے فضل سے تلاش معاش کریں گے۔ اور بعض لوگ اللہ کی راہ میں جہاد کرتے ہوں گے (ایسے لوگوں کو پورا مجاہدہ و ریاضت کا موقع حاصل نہ ہوگا) اسلئے پڑھو اتنا ہی جتنا میّسر ہو سکے قرآن میں سے۔ اور نماز ضروری پڑھو۔ اور زکوٰۃ بھی دو۔ اور لوگوں کی اعانت (امداد) کیلئے انہیں (بلا معاوضہ و بلا مطالبہ) قرض (ضرورت کی چیزیں) دو۔ اچھا قرض دو۔ بس اس عبادت و مجاہدہ سے تمہاری شریعت کی تکمیل اور تزکیہ و مجاہدہ کی تکمیل ہو جائے گی۔ اور وَمَا تُقَدِّمُوْا لِاَنْفُسِكُمْ مِّنْ خَيْرٍ تَجِدُوْهُ عِنْدَ اللّٰهِ هُوَ خَيْرًا وَّ اَعْظَمَ اَجْرًا ط اور جو کچھ تم آگے بھیجو گے (اپنے عمل سے) اپنی جانوں (آئندہ زندگی) کیلئے بہتری (اچھے عمل) وہی پاؤ گے (کل) اللہ کے نزدیک۔ یہ (مندرجہ بالا عمل) بہتر ہے۔ اور اس عمل کا (نتیجہ) اجر بہت بڑا ہے۔

اب انسان کو آخر میں دوبارہ بازگشت کیلئے تحریک دی گئی ہے۔ کہ انسان اگر گمراہی و

ضلالت اور تنزل میں گر چکا ہے۔ اور اب اگر اسے خوف پیدا ہو رہا ہے۔ تو وَاسۡتَغۡفِرُوا اللّٰهَ ط اِنَّ اللّٰهَ غَفُوۡرٌ رَّحِيۡمٌ ع تو پھر حقیقی عمل کی طرف متوجہ ہو کر عبادت کر تحقیق اللہ تمہاری گزشتہ بیماریوں کا خود علاج کر کے تمہیں صحت و سلامتی کی طرف لائے گا۔ اور اپنے نور۔ اپنی توجہ سے تمہاری ظلمت کو روشنی میں بدل دے گا۔

یہ طریق تمام آیاتِ قرآنی ہیں۔ اور قرآنی احکام شریعت کہلاتے ہیں۔ اور تزکیہ مجاہدہ سے متعلق آیات بھی شریعت ہی کہلاتی ہیں۔ قرآن نے اپنے اپنے وقت میں زمانہ کی ہر ضرورت کیلئے ایک مخصوص اندازِ عمل بتایا ہے۔ جہاں تمدنی و معاشرتی استحکام کیلئے ایک قانون کی ضرورت ہے۔ اسکے لیے ایک مخصوص طریق کے احکام ہیں۔ جہاں انسانی شرافت و عظمت کو حاصل کرنے کی ضرورت ہے۔ وہاں نماز۔ روزہ وغیرہ احکام بتائے گئے ہیں۔ اور چونکہ ان سب احکام کے اجرا سے مراد صرف عرفانِ الٰہی ہی ہے۔ اسلئے عرفان کی راہوں کے طے کرنے کیلئے بھی شریعت نے خصوصی احکام بتا دیئے ہیں۔ یہ تمام قرآنی قانون کی حدود میں لائے ہوئے احکام خواہ معاشرتی ہوں۔ یا تمدنی۔ مادی ہوں یا روحانی۔ ان سب پر بطریق شریعت عمل پیرا ہونے سے مقصد صرف انسانی تفکر کیلئے ایک خالص ماحول کا پیدا کرنا اور عرفان کیلئے ایک خالص راہ کا استوار کرنا ہے۔

واضح ہو کہ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے اپنی ابتدائی زندگی میں جو مجاہدہ و ریاضت کی وہ آپکا ایک فطری ملکہ تھا جس میں صرف اللہ کی طرف سے ایک غیر محسوس تحریک کام کر رہی تھی۔ کہ وہ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کی اعلیٰ شرافت کی حفاظت کیلئے آپکے قلب میں ایسی تجلیات ڈالے۔ جس سے آپکی توجہ صرف ایک خالق حقیقی کی تلاش و تفکر میں رہی۔ اور اس ذاتی عمل سے حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام میں اپنی ذاتی ہیئت کی تمام خوبیاں محفوظ رہیں۔ اور پھر انہیں خوبیوں میں استغراق و تفکر سے جلا پیدا ہوئی۔ کہ آپؐ نے بغیر کسی راہنما کی اصلاح و تعلیم کے ایک روشن قلب و شعور حاصل کیا۔ یہاں تک کہ آپؐ پر وحی کا نزول ہوا۔

وحی کے نزول کے بعد اب اللہ تعالیٰ کی راہ عرفان سے آگاہ ہونے کیلئے باری تعالیٰ نے

ایک مستقل طریق عمل بتایا۔وہ یہی آیات بالا ہیں۔جن پر عمل کرنے سے انسان کو(شریعت پر کاربند ہونے سے)جومراتب حاصل ہوں۔انکا مشاہدہ تا ذاتِ باری تعالیٰ حاصل کرے۔

یوں تو شریعت کے خصوصی احکام نماز۔روزہ۔زکوۃ۔حج ہیں ان پر عمل کرنے سے ایک کلمہ لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰہِ کا اقرار کرنے والا مومن بن جاتا ہے۔بس ایک مومن کیلئے ان احکام کی پابندی کے بعد کوئی خصوصی پابندی نہیں۔کہ وہ رات کو عبادت کرے۔صبح کو قرآن پڑھے یا نہ پڑھے۔لیکن باری تعالےٰ نے حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام پر ایک خصوصی حکم بھیجا کہ زائد عبادت نَافِلَۃً لَّکَ آپؐ کے لیے مقرر کی گئی ہے۔اوراس عبادت کا مقصد صرف یہی ہے جو قرآن کی اس آیت اِنَّ نَاشِئَۃَ الَّیْلِ ھِیَ اَشَدُّ وَطْاً وَّ اَقْوَمُ قِیْلاً ؕ سے صاف ظاہر ہوتا ہے۔کہ رات کی نیند ترک کر کے جاگنا اوراس حالت میں خصوصی نماز سے زائد نماز پڑھنے سے انسان کے جسم کی مادیت کچل کرفنا کی جاتی ہے۔تو اسکا نتیجہ یہ ہوتا ہے۔کہ انسان کو اپنے روح۔قلب وشعور کے ذریعہ ایک حقیقت کا پتہ مل جاتا ہے۔اور انسان کے جسم میں روحانیت کا غلبہ اسقدر قوی ہو جاتا ہے کہ اس سے مافوق فطرت واقعات کا صدور ہونے لگ جاتا ہے۔اورشریعت میں عام احکام کی پابندی کے علاوہ زائد عبادت پر مداومت پیروان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی عدم صلاحیت پر۔شریعت وطریقت کی یہ تخصیص واضح طور بیان کردی کہ عَلِمَ اَنْ لَّنْ تُحْصُوْہُ فَتَابَ عَلَیْکُمْ اللہ جانتا ہے کہ تم اس قدر تزکیہ ومجاہدہ کے متحمل نہیں ہوسکو گے اسلئے جتنا تمہاری برداشت میں ہے فَاقْرَءُوْا مَا تَیَسَّرَ مِنَ الْقُرْاٰنِ جتنا ہی قرآن سے پڑھو۔کیونکہ انسان خالصتاً ایسا ماحول نہیں پا سکتا کہ وہ اپنی ضروریاتِ زندگی کے حصول میں فارغ رہ سکے۔اور پھر وقتی تکلیفیں اس پر طاری ہو جائیں گی۔وہ جانتا ہے۔

عَلِمَ اَنْ سَیَکُوْنُ مِنْکُمْ مَّرْضٰی لا وَاٰخَرُوْنَ یَضْرِبُوْنَ فِی الْاَرْضِ یَبْتَغُوْنَ مِنْ فَضْلِ اللّٰہِ لا وَاٰخَرُوْنَ یُقَاتِلُوْنَ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰہِ اوراب شریعت کے طریق میں عمل کی دو اقسام کردیں۔ اسلئے تکرار فرمائی کہ فَاقْرَءُوْا مَاتَیَسَّرَ مِنْہُ یہ عام لوگوں کیلئے عمل مقرر کیا گیا کہ ہر شخص کیلئے تفکر وعرفان لازمی ہے۔اسلئے جتنا ہوسکے قرآن پڑھو تا کہ نفس کی اصلاح کا سلسلہ جاری رہے۔اور کام ہلکا کرنے

کی خاطر صرف وَاَقِیۡمُوا الصَّلٰوۃَ وَاٰتُوا الزَّکٰوۃَ وَاَقۡرِضُوا اللّٰہَ قَرۡضًا حَسَنًا ط نماز۔ زکوٰۃ اور بہتر قرض کا عمل مقرر کر دیا کہ اسکا نتیجہ عمل بھی عرفان الٰہی ہے۔ یعنی اس کے مراتب بھی عرفان الٰہی تک ہیں۔ اور تزکیہ مجاہدہ کی کلی طور اگر تکمیل نہ ہو سکی تو بھی انسان اپنی آئندہ زندگی میں کامل ہو کر مامون و محفوظ ہو جائیگا۔ اور اسکے مقابل ابتدائی احکام۔ وَمِنَ الَّیۡلِ فَتَهَجَّدۡ بِهٖ نَافِلَةً لَّكَ۔ کی زیادتی اور اِنَّ قُرۡاٰنَ الۡفَجۡرِ كَانَ مَشۡهُوۡدًا ○ اور اِنَّ نَاشِئَةَ الَّیۡلِ هِیَ اَشَدُّ وَطۡاً وَّ اَقۡوَمُ قِیۡلًا ○ کی خصوصیت اس امر کی شاہد ہے۔ کہ ان زائد احکام کی تعمیل سے انسان کو اپنے نتیجہ اعمالِ شریعت میں مراتب (عرفان الٰہی) کا مشاہدہ حاصل ہوتا ہے چونکہ یہ عمل خصوصیت کے ساتھ حضور محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے متعلق ہے۔ اسلئے آپکے اتباع میں وَطَآئِفَةٌ مِّنَ الَّذِیۡنَ مَعَكَ کا خصوصی اشارہ ان اصحاب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ہے جنہوں نے آپکی اتباع فَاتَّبِعُوۡنِیۡ یُحۡبِبۡكُمُ اللّٰہُ کے آئین کے تحت محبت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم میں آپکی مکمل تابعداری سے کی اور آپ سے طریق طریقت کا علم حاصل کر کے اپنے مراتب و عرفانِ الٰہی کے مشاہدہ کی تکمیل کی۔

طریق شریعت میں زائد عبادت، میں خصوصی دو احکام ہیں۔ ایک رات کی عبادت اور قرأتِ قرآن۔ یہی دو چیزیں ہیں جن سے تزکیہ۔ مجاہدہ کیا جاتا ہے۔ اور انہیں دو احکام کی تکمیل سے انسان کو مشاہدہ ہوتا ہے۔ اسکے علاوہ کوئی ایسا عمل نہیں جو قرآن (شریعت) نے بتایا ہو۔ یا حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے بتایا ہو۔ یہی دو عمل طریق مشاہدہ (طریقت) سے تعبیر دیئے جاتے ہیں۔

اسکا مطلب یہ ہے۔ کہ انسان کو اپنی ابتدائی حالت میں کائنات اور ایک خالقِ حقیقی کیلئے یہ تسلیم کرنا (ایمان بالغیب کے ساتھ) ضروری ہے۔ کہ وہ اللہ ہی اس کائنات کا خالق ہے اور زبان سے اقرار کرنا ہے۔ کہ لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰہُ مُحَمَّدٌ رَّسُوۡلُ اللّٰہِ۔ صلی اللہ علیہ وسلم۔ اس اقرار کے ساتھ وہ خالق کو معبود کی حیثیت میں تسلیم کرتے ہوئے اس کی تلاش و تفکر کیلئے اس کی عبادت کرے۔ وہ

---

1 قرأت قرآن کی تشریح آگے آئیگی۔

عبادت نماز۔ روزہ۔ زکوٰۃ وغیرہ ہے۔ اور اگر وہ مشاہدہ کیلئے طریقِ طریقت کا عامل ہوسکتا ہے۔ تو اسے لازم ہے کہ نَافِلَةً لَّكَ پر اتباع کر کے مشاہدہ وعرفان حاصل کرے اس سے ثابت ہوتا ہے۔ کہ کلمہ کے بعد اگر ایک شخص شریعت کے احکام نماز۔ روزہ۔ زکوٰۃ کا عامل نہ ہو۔ تو اسکے لیے عرفان الٰہی کا نتیجۂ عمل قائم نہیں ہوسکتا ہے۔ اور اگر وہ اس حالت میں نَافِلَةً کا عامل ہو جائے تو یقینی طور اسے مشاہدہ حاصل ہوگا لیکن نماز۔ روزہ۔ زکوٰۃ۔ تہجد۔ قرأت قرآن کا نتیجۂ عمل جو کہ عرفانِ الٰہی کی بنیادی راہیں ہیں اسے حاصل نہ ہوں گی بلکہ اس حالت میں اس کا قلب وشعور اپنی خواہشات نفسانی کا مشاہدہ کرے گا۔ چونکہ خواہشاتِ نفسانی مادیت سے تعلق رکھتی ہیں۔ اور مادیت کا باطن بھی اپنی روحانیت میں قوی ہے۔ اسلئے ایسے شخص کو قوی انوار کا ادراک ہوگا لیکن یہ انوار اور یہ راہیں اسے مقصدِ حقیقی تک نہ پہنچا سکیں گی۔ اور انسانی فطرت میں تنزل اور حیوانیت کا مادہ بھی ہے۔ اسلئے ایسا شخص گم کردہ راہ ہو گا۔ اور حقیقت سے دور رہے گا۔ ایسی کیفیت کو استدراجی قوت وکیفیت سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ باالفاظ دیگر اس قسم کی قوتیں جس میں شریعت کی پابندی نہ کی جائے شیطانی قوت سے تعبیر دیا جاتا ہے۔ اسلئے عرفان الٰہی کے مراتب کیلئے لازمی ہے۔ کہ نماز۔ زکوٰۃ۔ صدقات پر ہی اسکی بنیاد قائم کی جائے۔ اور قرأت قرآن۔ تہجد (رات کو جاگنا اور عبادت کرنا) یہی دو چیزیں مشاہدہ۔ یا تزکیہ کہلاتی ہیں۔

واضح ہو کہ شریعت وطریقت کے احکام کی تعمیل میں جب تک عرفان وقربِ الٰہی مقصود نہ ہو تو انسان کا ہر عمل بے مقصد و بے روح ہے۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ نے خود اس امر کی وضاحت کی کہ انسان صرف ایک خصوصی نصب العین کی تکمیل کیلئے پیدا کیا گیا ہے وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْإِنْسَ إِلَّا لِيَعْبُدُوْنِ○ کہ انسان کی زندگی (پیدائش) کا مقصد صرف یہ ہے۔ کہ وہ عبادت کرے اور اسکی عبادت کا مقصد سوائے اسکے کچھ نہ ہو کہ عبادت کے ذریعہ اپنے خالق ومعبود کا عرفان وقرب حاصل کرے۔ چنانچہ قرآن انسان کے عمل اور اسکے انجام کے متعلق اسکے مقصد کی وضاحت کرتا ہے۔ كُلُّ نَفْسٍ ذَآئِقَةُ الْمَوْتِ (پارہ ۴ سورۃ ۳ آیت ۱۸۵)۔ ثُمَّ إِلَيْنَا تُرْجَعُوْنَ (پارہ ۲۱ سورۃ ۲۹ آیت ۵۷) یعنی ہر شخص نے اس مادی جسم کی موت کو حاصل کرنا ہے۔ اور پھر ایک معین وقت پر پھر میرے سامنے

حاضر ہونا ہے۔ چونکہ میں نے ہر انسان کیلئے یہ مقرر کر دیا ہے۔ کہ اسے مجھ تک ہر حال میں پہنچنا ہے۔ اسلئے اپنی زندگی میں تم نے مجھ تک پہنچنے کی کوشش نہ کی اور گمراہ رہے تو پھر بھی تم نے مجھ تک بعد موت کے پہنچنا ہے۔ تو پھر موت کے بعد تمہارا تزکیہ کیا جائے گا۔ جو عذاب کی صورت میں ہوگا۔ اور پھر جب تمہاری روح رحمانی میں اس عذاب کے بعد صلاحیت ہو جائے گی تو پھر تم اس منبع حقیقی میں جا ملو گے۔ اور جو لوگ یکسر منحرف ہو گئے۔ انکے لیے موت کے بعد ابدی عذاب ہے انکا تزکیہ انہیں اپنی منزل تک نہ پہنچائے گا بہر حال انسان کے لیے یہ مقرر کیا گیا ہے۔ کہ وہ خواہ اپنی مرضی سے عمل کر کے مقصد کو پالے۔ یا اس سے عمل کرایا جائے۔ انسانی زندگی کا یہ نصب العین ہے کہ وہ اپنے رب سے ملے اَفَحَسِبْتُمْ اَنَّمَا خَلَقْنٰكُمْ عَبَثًا وَّاَنَّكُمْ اِلَيْنَا لَا تُرْجَعُوْنَ ○ (پارہ ۱۸ سورۃ ۲۳ آیت ۱۱۵) کیا تم یہ گمان کرتے ہو کہ ہماری پیدائش بے مقصد ہے اور تم نے اللہ تک نہیں پہنچنا ہے؟ نہیں بلکہ تمہاری پیدائش صرف اسلئے ہے۔ کہ تم اپنے خالق کو پہچانو اور اسکا قرب حاصل کرو۔ اس حقیقت کی تائید بھی اللہ تعالیٰ اس واقعہ کی اطلاع سے ظاہر کرتا ہے کہ قَالُوْٓا اَتَجْعَلُ فِيْهَا مَنْ يُّفْسِدُ فِيْهَا وَيَسْفِكُ الدِّمَآءَ ج وَنَحْنُ نُسَبِّحُ بِحَمْدِكَ وَنُقَدِّسُ لَكَ ط آدم کی تخلیق کے بارے میں فرشتوں نے کہا۔ کہ تو اس شخص کو پیدا کرنا چاہتا ہے۔ جو فساد کرے اور خون بہائے۔ اگر تیرا مقصد اپنی حمد اور تقدیس کرانا ہے۔ تو پھر ہم اس مقصد کو پورا کر رہے ہیں۔ تو باری تعالیٰ نے آدمی کی خصوصیت کو ظاہر کرنے کیلئے اتنا بتایا۔ کہ جس مقصد کیلئے میں اسے بنانا چاہتا ہوں۔ اسکا علم ابھی تمہیں نہیں ہوا ___ اور کہا قَالَ اِنِّیْٓ اَعْلَمُ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ ○ اے فرشتو تمہیں تو زمین کی کیفیت اسکے نام سے معلوم ہوتی ہے اسلئے کہتے ہو کہ وہاں صرف فتنہ اور خون ریزی ہوگی۔ اور تم یہ سمجھ رہے ہو کہ ایسے فتنہ پرور شخص سے میں اپنی حمد و تقدیس کرانا چاہتا ہوں۔ لیکن تمہیں علم نہیں کہ اسکی تحمید و تقدیس میں کیا خوبی۔ کیا نزاکت اور کیا شان ہوگی ___ تو پھر اس خوبی کو ظاہر کرنے کیلئے مقابلہ ہوا۔ تو معلوم ہوا۔ کہ فرشتے بجبر و اکراہ اپنی حمد و تقدیس میں برسرِ عمل ہیں۔ اور پھر انکے عمل کے مطابق انہیں وہ کچھ حاصل نہیں جو آدمی کر سکتا ہے۔ تو آدم کی شان ظاہر کرنے کیلئے دکھلا دیا کہ فَلَمَّآ اَنْۢبَاَهُمْ بِاَسْمَآئِهِمْ یعنی اس نے وہ کچھ بتا دیا

جوخود فرشتوں کو علم نہ تھا۔ یہاں آدم کی پوزیشن بتا دی کہ اس نے بجبر عبادت نہیں کرنی اس نے اپنے اختیار سے باوجود مُفتن ہونے کے اللہ کی محبت میں ہر شے کو ترک کر کے عرفان وقرب حاصل کرنا ہے جسکی پرواز تک فرشتے نہیں پہنچ سکتے ہیں۔ اور اس بیان سے اللہ تعالیٰ نے انسانی تخلیق کی خصوصیت بتائی تھی کہ اِنِّیْ جَاعِلٌ" فِی الْاَرْضِ خَلِیْفَةً ط میں کیا مقصد پنہاں ہے اس مکالمہ کو جب وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْاِنْسَ اِلَّا لِیَعْبُدُوْنِ ○ سے متعلق کیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ انسانی حمد وتقدیس میں صرف زبانی الحمد للہ نہیں بلکہ انسان کی ہر نماز میں ایک حقیقت کا افشاء کرنا ضروری چیز ہے ـــــ وہ بدرجہ اتم عرفانِ الٰہی حاصل کرنا ہے ـــــ چنانچہ کائنات کا ذرّہ ذرّہ گواہ ہے۔ کہ اس مقصد کی تکمیل بدرجہ اتم حضور محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کی اور آپکی تکمیل پر اللہ تعالیٰ نے سَرٹیفکیٹ کے کے طور ایک الہامی اور حقیقی سند عطا کی کہ اَکْمَلْتُ لَکُمْ دِیْنَکُمْ وَاَتْمَمْتُ عَلَیْکُمْ نِعْمَتِیْ (پارہ٦ سورة ۵ آیت ٣)۔ یعنی میں نے اب تمہارے لئے اپنے بھیجے ہوئے طریق حصول عرفان کی تکمیل کر دی۔ اب کوئی ایسا طریق نہیں جو باقی رہا۔ اب کوئی ایسا طریق نہیں جو اس قرآن میں نہیں اور اس طریق کی بھی تکمیل ہو چکی۔ یہ سب طریق آپؐ سے عمل میں لائے گئے اور آپؐ نے اپنی تبلیغ وانداز میں اس طریق کو اپنے پیرووں سے اَلَّذِیْنَ مَعَكَ سے پورا کرایا۔ چنانچہ قرآن حکیم نے اپنے رسول کی راہنمایانہ عظمت کا واضح طور اعلان کیا لَقَدْ مَنَّ اللّٰهُ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ اِذْ بَعَثَ فِيْهِمْ رَسُوْلًا مِّنْ اَنْفُسِهِمْ يَتْلُوْا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِهٖ وَيُزَكِّيْهِمْ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ ج وَاِنْ كَانُوْا مِنْ قَبْلُ لَفِيْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ ○ (پارہ٤ سورة ٣ آیت ١٦٤) البتہ تحقیق اللہ نے ان لوگوں پر احسان کیا جو اب مومن بنے ہوئے ہیں۔ کہ اِن کی لاعلمی اور گمراہی میں ان میں سے ہی ایک رسول کو اٹھایا۔ جو اللہ کی آیتیں پڑھتا ہے اللہ کی کلامِ حقیقت سناتا ہے جس میں انسانی فلاح وسعادت اور منتہا کو حاصل کرنے کا علم ہے۔ اور اس پر انہیں عمل کی ترغیب دیتا ہے۔ پھر وہ طریق تزکیہ بتاتا ہے۔ جس سے اِنکے مادیت میں ملوث وجود (جو ایک اندھیرے میں پڑے ہوئے تھے) کو مادیت سے پاک کر کے خالص روحانیت بخشتا ہے۔ جس سے وہ کلام الٰہی اور شریعت کے احکام کے اصلی مطلب اور ساتھ ساتھ اسکے نتیجہ عمل کو

انکے شعور و تعقل تک پہنچا تا ہے۔ اور اس کائنات اور عرفان کی راہِ حقیقت میں جو کیفیتیں انکے قلب و شعور سے پوشیدہ ہیں انہیں ان پر انکے قلب و شعور اور تعقل کے ذریعہ آگاہی میں لاتا ہے۔ یہاں حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کی راہنمایانہ حیثیت واضح ہوتی ہے۔ کہ آپکو صرف انسان کی دوبارہ اصلاح کرنے کیلئے آیات۔ تزکیہ۔ علم۔ حکمت دیکر بھیجا۔ اور راہنما پیغمبر کی حیثیت سے ایک اکمل عالم احمدؐ بنا کر بھیجا اور آپکو تمام مخلوقی کیفیات کا تمام علم دیا گیا۔ اسلئے اللہ نے بھی تمامی نعمتوں کو عرفان و قرب کی صورت میں آپؐ پر بدرجہ اتم عنایت کر دیا۔ اور یہی آخری سند اللہ کی آخری وحی تھی جسکے بعد وحی کیلئے اب کچھ باقی نہ رہا۔ اور اسی مقام پر حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے آخری وصیّت فرمائی۔

کہ اے لوگو تم نے سُنا کہ انسانیت اور عرفان کی تکمیل ہو چکی۔ جو کچھ عرفان و قرب کیلئے انسان کو ضرورت تھی وہ سب کچھ اس قرآن میں آ گیا! ـــــ اب جس شخص نے اس قرآن کے طریق پر عمل کیا وہ اپنے مقصد کو پا لے گا۔ اور اسکے ساتھ یہ نہ سمجھو کہ تلاوت کرنے والا۔ تزکیہ کرنے والا ـــــ علم سے آگاہ کرنے والا اور حکمت سے آگاہ کرنے والا رسول ظاہراً موجود نہیں۔ نہیں میں تمہارے لئے اپنے اہل بیت[1] کو مقرر کرتا ہوں جنہوں نے میرے ذریعہ میری محبت میں اس علم کو پالیا۔ لہذا تم

---

[1] اہل بیت۔ اہل بیت سے مراد گھر کے لوگ۔ وہ لوگ خاندان کے لوگ ہوتے ہیں۔ لیکن اہل کو مختلف صورتوں میں استعمال کیا جاتا ہے۔ اہل اللہ اللہ کے لوگ۔ اہل مصر مصر کے لوگ۔ اور پیغمبر کے ساتھ وہ لوگ بھی شامل ہوتے ہیں جو آپکے حقیقی پیرو ہوں۔ اسکے ساتھ ہی آپؐ کے اہل بیت حضرت علی۔ حضرت حسن و حسین رضی اللہ عنہم بھی آتے ہیں۔ لیکن یہ بھی پیرو کی حیثیت سے آتے ہیں۔ کیونکہ حضرت علیؑ۔ حضرت امام حسنؓ و حسینؓ کی اہل کا سلسلہ خاندانی تو ہر زمانہ میں پایا جاتا ہے۔ مگر ان میں اکثر لوگ ایسے بھی پائے جاتے ہیں۔ جنکے لئے نام و نسب کے لحاظ سے تعظیم و تکریم لازمی ہے۔ مگر انکے علم و عمل کے لحاظ سے یہ لوگ قابل تقلید نہیں۔ مثلاً زمانہ میں ایسے لوگ بھی پائے جاتے ہیں۔ جو سیّد کہلاتے ہیں۔ مگر انکے کردار کا مطالعہ کیا جائے۔ تو وہ لوگ نماز بھی نہیں پڑھتے بلکہ رسول اللہؐ کے احکام کے بالکل برخلاف چلتے ہیں۔ سیّد نام کہلانے کے لحاظ سے صرف نام محمدؐ ہی کا احترام ہے۔ ورنہ یہ لوگ قابلِ تقلید ہو ہی نہیں سکتے۔ اسلئے یہاں اہل بیت کا اطلاق ہر زمانہ کے لیے ہونا چاہیے۔ جو صرف ولی اکمل۔ اہل اللہ و اہل رسول اللہ کے زمرہ میں ہر زمانہ میں آتے ہیں۔

ان دونوں چیزوں کی طرف رجوع کرو۔ یہ قرآن اللہ تعالےٰ کی طرف سے ایک ہدایت ہے۔ اسکے ہم تک براہ راست نہ پہنچنے کی صورت میں یہ علم رسول کے ذریعہ لوگوں تک پہنچا۔ اللہ بھی موجود ہے۔ اسکا حکم بھی موجود ہے۔ اب رسول کے بعد اللہ کا حکم رسول کی تعمیل اس کے پیروؤں کے ذریعہ ہر زمانہ میں قائم و دائم جاری رہے گی۔ سو یہی وہ لوگ ہیں جنکے متعلق اللہ نے کہا کہ انکے متعلق جو کچھ میں جانتا ہوں تم نہیں جانتے اور فرشتوں نے بھی وقت پر جان لیا۔ کہ عاشقانِ رسول اللہ نے کیا کچھ کیا۔ اس کی یہاں گنجائش نہیں۔

الغرض۔ انسان کیلئے اسکی عبادت میں عرفانِ الٰہی کا مقصود خصوصی طور پیش نظر رکھنا لازمی ہے۔ اور گزشتہ قرآنی بیانات میں یہ بات آچکی ہے۔ کہ انسانی فطرۃ کے مطابق اللہ تعالیٰ نے اسے رعایت بھی دے دی۔ وہ رعایت یہی ہے۔ کہ اگر تم نماز۔ روزہ۔ زکوٰۃ وغیرہ پر ہی عامل رہے۔ اور اگر تمہارا مقصود عرفان وقربِ خداوندی ہو۔ تو تم اپنے انجام میں نتیجہ کے طور اپنا مقصد پالو گے۔ گویا یہی عمل طریقت بھی کہلا سکتا ہے۔ اس میں فرق کچھ بھی نہیں۔ اب جو شخص اپنے مقصد کی مکمل تکمیل کرنے کی قدرت رکھتا ہے۔ تو وہ نماز۔ روزہ کے نتیجۂ عمل کو بالمشاہدہ پالیتا ہے۔ مراتب وہی ہیں فرق ہے تو مشاہدہ کا۔ اور مشاہدہ سے صرف علم حاصل ہوتا ہے۔ اور علم سے راہنمائی کا ممتاز درجہ حاصل ہوتا ہے۔ اور راہنمائی سنت رسول ہے اسلئے ایسے شخص کی خصوصیت یہ ہوتی ہے۔ کہ وہ نائب (خلیفہ) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کہلاتا ہے۔ اور یہی شخص آئندہ زمانہ میں نائب رسول کی حیثیت سے ہر شخص کی راہنمائی کر کے اسے۔ تلاوت۔ تزکیہ۔ علم۔ اور حکمت بتاتا ہے۔ ایسے شخص کیلئے یہ ضروری ہوتا ہے۔ کہ اس نے اپنے مقصد حقیقی کی تکمیل بدرجہ اکمل کی ہوتی ہے۔ اسلئے اسے ولیِ اکمل کہا جاتا ہے۔ ولی اکمل کے پاس علم بھی ہوتا ہے۔ مشاہدہ بھی ہوتا ہے اور اسے عرفان بھی حاصل ہوتا ہے۔ اسکے مقابلہ میں قرآنی علم کا بدرجہ کمال عالم بھی ہوتا ہے۔ جو شریعت (قرآن وحدیث) کی تفسیر وتشریح کرنے والا ہوتا ہے۔ اسکے پاس اگر مشاہدہ نہ ہو پھر بھی نماز۔ روزہ۔ زکوٰۃ وغیرہ کا عمل اس میں لطافت پیدا کرتا ہے۔ اسے متقی (ڈرنے والا) بھی کہتے ہیں۔ اور فقیہ ومجتہد بھی کہا جاتا ہے۔ فقیہ ومجتہد

سے مراد یہ ہے۔ کہ اگر ایک باکمال عالم کو مشاہدہ نہ ہو۔ تو بھی اسکی لطافتِ قلبی میں اسقدر صلاحیت ہوتی ہے۔ کہ قرآن وحدیث کے حقیقی مطلب ومعانی اسکے قلب پر القاہوتے ہیں۔ بلا مشاہدہ قلب پر القاہونے کو فقہ کہتے ہیں۔ یعنی قلب کی روحانیت کے ذریعہ قرآن کے حقیقی معنی کو محسوس کر کے علم کے احاطہ میں لانا جیسے قرآن خود اس کیفیت کا ذکر کرتا ہے۔ وَلَهُمْ قُلُوْبٌ لَّا يَفْقَهُوْنَ بِهَا انکے دل ہیں لیکن مسخ ہو چکے ہیں۔ اور وہ حقیقی معانی نہ حاصل کر سکتے ہیں۔ نہ انکا دل حقیقت کو قبول کرنے کی صلاحیت رکھتا ہے اور دل سے فقہ کرنے والے شریعت کے عالم وراہنما ہوتے ہیں۔

عرفان میں قربِ الٰہی کیا چیز ہے اِنَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لا اُولٰٓئِكَ هُمْ خَيْرُ الْبَرِيَّةِ ۞ جَزَآؤُهُمْ عِنْدَ رَبِّهِمْ جَنّٰتُ عَدْنٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ فِيْهَآ اَبَدًا ط رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُمْ وَرَضُوْا عَنْهُ ط ذٰلِكَ لِمَنْ خَشِيَ رَبَّهٗ ۞ (پارہ ۳۰ سورۃ ۹۸ آیت ۷۔۸)

تحقیق وہ لوگ کہ ایمان لائے اور کام کئے اچھے یہ بہتر خلق ہیں۔ انکے اعمال کی جزا (نتیجہ عمل) اللہ کے پاس کیا ہیں؟ وہ ہمیشہ[1] رہنے والے باغ ہیں۔ ان باغوں میں نہریں جاری ہیں اور یہ لوگ اس میں ہمیشہ کی زندگی حاصل کر کے ہمیشہ رہیں گے۔ ان لوگوں کے عمل سے کہ انہوں نے صرف ایک اللہ اور اس کے رسول کی محبت اور اسکی تابعداری میں اپنے مقصود کو حاصل کرنے کیلئے عمل جاری رکھا اسلئے اللہ ان سے راضی ہوا۔ اور جو کچھ (نعمتیں) انہیں اللہ سے حاصل ہوا وہ اس پر اللہ سے راضی ہوئے۔ یہ اس شخص کے لیے ہوتا ہے۔ جو کہ اپنے رب سے ڈرتا ہے۔ یعنی یہ سب کیفیت عرفان الٰہی کے ابتدائی انوار کی ہے۔ جو جنت کی تمثیلی شکلوں میں محسوس کئے جائیں گے اور اسی طرح بدرجہ اکمل تعمیل کرنے والا نورالٰہی میں جو ہمیشہ دائم وقائم ہے اس میں رہے گا اور ہمیشہ کی زندگی حاصل کر کے نورالٰہی میں رہے گا۔ اسکا نتیجہ یہ ہوگا۔ کہ نورالٰہی میں سما کر وہی کیفیت ہو جائے گا اور چونکہ اللہ کی ذات ہمیشہ زندہ ہے اسلئے اس میں سمانے کا نتیجہ یہی ہوگا۔ کہ نورالٰہی میں غرق ہونے والا بھی اسی کیفیت سے متصف ہو

---

[1] ہمیشہ رہنے والے مراد (نورانی) جو ہمیشہ رہنے والا ہے۔

گا جونورِ الٰہی میں ہے۔اسکا مطلب یہ نہیں کہ بندہ ہوتے ہوئے خدا بن جائیگا۔نہیں بلکہ وہ اپنی روحانی قوت (روحِ رحمانی) کے اعتبار سے جب اسکی روحِ رحمانی اللہ کے نور میں سما جائیگی تو وہ خود کو محسوس نہ کرے گی۔ بلکہ اللہ میں جذب ہو کر اپنی ہیئت کھوا بیٹھے گی۔ جیسے قطرہ سمندر میں گر کر اپنی ہیئت کھو بیٹھتا ہے۔اسی طرح ایک ولی اکمل کی روح جب اپنے مشاہدہ میں اللہ کے نور کے اتنی قریب ہو جاتی ہے۔ کہ وہ اسی نور کے احاطہ میں آجائے تو اس وقت چونکہ اس روح کا تعلق قلب سے ہوتا ہے۔جیسی کیفیت روح پر طاری ہو وہی عکس قلب پر آجاتا ہے۔اور جب نورِ خداوندی کا عکس براہ راست قلب پر آجائے تو اسوقت انسانی شعور وہی کیفیتیں پاتا ہے جو نورِ الٰہی میں پائی جاتی ہیں۔ایسی حالت میں اگر عالمِ بیداری ہو تو تعقل بھی اس کیفیت کا مشاہدہ کرتا ہے۔ چونکہ تعقل اپنی وجودی کیفیتوں کا علم حاصل کئے ہوئے ہوتا ہے۔ اسلئے اس تعقل کی آگاہی میں ایک طرف وہی کیفیتیں آجاتی ہیں جو ذات و صفاتِ خداوندی میں ہوتی ہیں۔اور دوسری طرف وہ اپنے وجود سے باخبر ہوتا ہے۔اسلئے روح کے اعتبار سے انسان فناء الٰہی کو محسوس کرتا ہے اور ساتھ ہی اپنی وجودی کیفیت کا احساس کرتے ہوئے اپنے بندہ ہونے سے بے خبر نہیں رہتا ـــــ یہ دونوں کیفیتیں تعقل کے قوی ہونے پر اعتدال میں رہتی ہیں ۔ایسی صورت میں روح فنافی اللہ کے مقام پر اپنی ہئیت کھو جانے کی وجہ سے صرف ایک ذاتِ خداوندی رہ جاتی ہے۔ دوسری طرف تعقل کے مستحکم اور حکمران ہونے کی صورت میں انسان دائرہ بشریت میں رہتا ہے۔اور یہی صورت اگر خواب کی حالت میں ہو تو تعقل کے معطل ہونے کی صورت میں مادی وجود کا احساس نہیں رہتا۔تو انسان خواب کی صورت میں خود اپنی ہیئتِ وجودی کا احساس

---

[1] یعنی انسان کی روحِ رحمانی جب تک نورِ خداوندی میں فنا نہ ہو۔وہ روحِ رحمانی انسان کی کہلاتی ہے۔لیکن جب نور خداوندی میں فنا ہو جائے تو اسکی ذاتی (انسانی) ہیئت عدم ہو جاتی ہے۔ عدم ہونے کی صورت میں خود باقی نہیں رہتی۔ بلکہ نورِ باقی میں بقا ہو جاتی ہے۔ یہاں اسکا وجود خود غیر کی ہیئت و شکل میں قائم نہیں رہتا۔ بلکہ نورِ الٰہی میں جذب ہو کر غیریت ختم ہو جاتی ہے۔

کرنے سے رہ جاتا ہے۔ یہ چیز غیر اختیاری ہوتی ہے۔ اسلئے ایسی حالتِ خواب میں روح کے اعتبار سے عالم غیر جسمانی میں روح کا وجود نہ رہنے کے باعث صرف ذات الٰہی کا اثر ہی قائم رہتا ہے۔ لیکن ایسی حالت میں بوجہ بیداری اور تعقل کے حکمران (برسرِ عمل) ہونے کے انسان خود کو اگر چہ خدا محسوس کرتا ہے۔ لیکن اسکے تعقل کے بیدار نہ ہونے کے باعث وہ خود کو اللہ نہیں کہتا۔ کیونکہ ظاہری طور انسان تعقل کی آ گاہی۔ علم اور اسکی مدد سے ہی اپنے وجود کا نام دیتا ہے۔ اسلئے اگر خواب کی حالت میں وہ خود کو اللہ محسوس کرے تو اسکی صورت یہی ہوتی ہے۔ کہ اسکا مشاہدہ روح کے ذریعہ ہوتا ہے جو اسوقت نورِ الٰہی میں فنا ہو چکی ہوتی ہے۔ اور روح کے اعتبار سے اسکا خدا محسوس کرنا جائز اور مبنی بر حقیقت ہوتا ہے۔ اور اگر بیداری کے عالم میں جبکہ اس کا تعقل وجود سے باخبر ہوتا ہے۔ تو اسکا وجود کے پاتے ہوئے اللہ کہنا (اگر چہ اسکے تعقل میں مستحکم قوت ہو) تو یہ کہنا اسکے ذاتی ارادہ سے ہوتا ہے۔ گویا وہ اپنے وجود کو پاتے ہوئے اسے بھی اللہ کی صفت سے متصف کرتا ہے۔ یہ کیفیت غیر آئینی ہوتی ہے۔ اسلئے انسان خود اس کا ذمہ دار ہوتا ہے۔ تو اسکے غلط تصور کی بنا پر کہ وہ انوار الٰہی اور قرب الٰہی کا متحمل نہ ہوا۔ اسکی روح ذاتِ الٰہی سے علیحدہ ہو کر اپنی ابتدائی کیفیت پر آ جاتی ہے۔ اور وہ قرب سے بُعد میں اسوقت تک آ جاتی ہے۔ جب تک کہ تعقل میں استحکام نہ پایا جائے۔ اور وہ وجود کو بھی صفاتِ باری تعالیٰ سے متصف کرنے میں تمیز اور تعین کرے۔ اسکے علاوہ حالتِ بیداری میں بھی جب یہ کیفیت طاری ہو جاتی ہے۔ تو چونکہ نورِ الٰہی اپنی تمازت اور روشنی میں لا انتہا کا درجہ رکھتا ہے۔ اور نور الٰہی انتہائی لطافت اور خوبصورتی کا حامل ہوتا ہے۔ تو اسوقت تعقل بھی اسکے مشاہدہ میں حافظہ کی طرف اسقدر محو ہو جاتا ہے۔ کہ یہ اپنے جسمانی نظام سے اسقدر بے خبر ہو جاتا ہے گویا اسے اپنے وجود کا احساس نہیں رہتا۔ باوجود احساس نہ رہنے کے پھر بھی اپنے جسم میں حرکت پیدا کرنے کی صلاحیت بدستور ہوتی ہے۔ اور نور الٰہی کی محویت میں جب اسے مشاہدہ ہوتا ہے۔ تو دل کا عکس (جس پر روح کا عکس ذاتِ الٰہی کی فنا کی کیفیت میں ہوتا ہے) وہی تاثرات دہراتا ہے جو روح پر طاری ہوتے ہیں ایسی صورت میں انسان سُبْحَانِیْ مَا اَعْظَمُ الشَّانِیْ پکارتا ہے گویا تعقل اپنے وجود سے ایک طرف

محویت کی وجہ سے بے خبر ہوتا ہے۔ دوسری طرف وہ اپنی حکمرانی پر بیدار ہونے کی حیثیت سے زبان پر قابو حاصل کیے ہوئے ہوتا ہے۔ اور زبان عالمِ استغراق میں سبحانی ما اعظم الشانی پکار جاتی ہے۔ یعنی وہ اس کا کہنا نہیں ہوتا بلکہ شعور و تعقل کے مشاہدات کا تاثر ہوتا ہے۔ جو کہ مبنی بر حقیقت ہے ___ اسکی مثال ایسے ہے۔ کہ ایک شخص کی روح کسی دور مقام کا عکس حاصل کرتی ہے۔ تو وہ محسوس کرتی ہے۔ کہ میں آگ میں جل رہی ہوں۔ تو انسان خواب کی حالت میں غیر اختیاری طور پر یہ محسوس کرتا ہے کہ میں آگ میں جل رہا ہوں۔ یہ تاثر ہے۔ نہ روح آگ میں جلتی ہے۔ نہ انسان جلتا ہے۔ لیکن نور باری تعالیٰ میں روح سما جاتی ہے۔ اسلئے اسکا حقیقت بن جانا یقینی اور حقیقی ہوتا ہے۔ تاہم انسان خود کو آگ میں جلتا محسوس کرتا ہے اگر اس وقت یہ تاثر پایا جائے کہ میں جل رہا ہوں تو یہ چیز اصولی اور آئینی ہے۔ اور اگر بیداری میں یہی چیز مشاہدہ میں آئے تو تعقل پر کبھی یہ تاثر پایا نہ جائیگا کیونکہ تعقل اسوقت اپنے وجود سے باخبر ہوتا ہے کہ میں اپنے مقام پر قائم ہوں جہاں آگ کا نشان موجود نہیں۔ اگر ایسے وقت میں انسان پکارے کہ میں آگ میں جل گیا تو اسے وہم سے تعبیر کیا جائیگا گویا یہ کیفیت ذہن کی کمزوری کے باعث ہوگی اسلئے اس کیفیت کے طاری ہونے سے اسکا مشاہدہ آئندہ کیلئے تب تک صاف نہ ہوگا جب تک یہ دماغی کمزوری رفع ہو کر ذہن میں صلاحیت نہ پیدا ہو۔ اور اسی طرح اگر عالمِ بیخودی میں اس کیفیت میں تعقل پر محویت طاری ہو جائے تو انسان کے پکارنے سے اسے اسکی محویت پر محمول کیا جائیگا۔ جیسے ایک شخص خواب میں تعقل کے بیدار نہ ہونے پر خوف کے مارے چلاتا ہے۔ تو اسے جگایا جاتا ہے۔ تاکہ تعقل کو اپنے وجود کا احساس ہو۔ اسی طرح ایک دیوانہ کی حالت جب تعقل کی خرابی اس میں پائی جاتی ہے اسوقت بھی وہ حرکت کرتا ہے۔ یا نہیں کرتا ہے۔ ایک طرف وہ صحیح علم سے آگاہی حاصل نہیں کر سکتا۔ لیکن اسکے باوجود اسکا تعقل حکمرانی پر مامور رہتا ہے اور وہ غیر ارادی طور پر بولتا ہے۔ حرکت کرتا ہے۔ یہی کیفیت اس شخص کی ہوتی ہے جو عالمِ بیداری میں تعقل کی محویت کی وجہ سے اپنے روحانی تاثرات کا اظہار زبان سے کرتا ہے۔ البتہ یہ چیز ضروری ہے۔ کہ جب یہ کیفیت انسان پر طاری ہوتی ہے۔ تو عرفان وفنا کی خاصیت یہ ہوتی ہے۔ کہ اسکی روح حیوانی بھی اسقدر قوت پذیر

ہوتی ہے کہ اس میں روح رحمانی جیسی قوت پیدا ہوتی ہے وہ اسلئے کہ انسان تزکیہ ومجاہدہ سے ہی یہ مقام حاصل کرتا ہے۔اور تزکیہ ومجاہدہ کا اثر جسم پر ہی طاری ہوتا ہے۔جوں جوں اسکی جسمانی قوتوں میں روحانیت (لطافت) پیدا ہوتی ہے۔اسکی روح رحمانی بھی اسی قدر پرواز کر کے اسے حسب طاقت مشاہدہ الٰہی کراتی ہے ایسی حالت میں انسان کے وجود میں یہ روحانی خاصیت بھی پائی جاتی ہے۔کہ بظاہر اسکا وجود محسوس ہوتا ہے۔لیکن لطافت کی خاصیت کی بنا پر یہ مادی اثرات کی زد سے باہر ہو جاتا ہے۔اسلئے ایسے وقت میں جبکہ انسانی روح پر فنا کی کیفیت طاری ہو جاتی ہے روح حیوانی (جسم) پر بھی اسکا اثر طاری ہوتا ہے۔کہ اگر اسے کاٹا جائے تو کٹ نہیں سکے گا بلکہ جسطرح ہوا میں تلوار تیرتی ہے۔ اسی طرح اسکے وجود میں تیرتی ہوئی نکل جائیگی یہ لطافت کا اثر ہوگا اور یہ امر بھی مبنی برحقیقت ہے۔

یہ کیفیت ایک ولی اکمل کی ہوتی ہے۔اسکا علم بھی بدرجہ اتم واکمل ہوتا ہے اسلئے اسکا منصب انسان کی راہنمائی ہوتا ہے۔اور اس منصب کے لحاظ سے جبکہ یہ نائب رسول اللہ ہوتا ہے۔ وہی طریق استعمال ہوتا ہے۔جو حُبِ اللہ اور محبتِ رسول میں ہوتا ہے۔حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کی حدیث ہے اَصْحَابِیْ کَالنُّجُوْمِ فَبِاَیِّهِمُ اقْتَدَیْتُمْ اِهْتَدَیْتُمْ (رَوَاہُ رَزِیْن") میرے اصحاب مانند ستاروں کے ہیں یعنی ان میں جو ہدایت کی روشنی ہے۔وہ میرے ہی علم سے ہے۔اسلئے مطلوب کو پہنچنے کیلئے انکے پیچھے چلو۔اور یہ اشارہ بعد از رحلت حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام ہی ہے۔کہ آپؐ کے بعد ان لوگوں سے علم حاصل کیا جائے۔جنہوں نے آپؐ سے علم حاصل کیا۔

اس سے معلوم ہوتا ہے۔کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد آپکی اُمت میں ایک ولی اکمل کا قیام راہنمائی کیلئے ضروری ہوتا ہے۔اور یہ سلسلہ ایک ولی اکمل کے بعد اسکا خلیفہ ہر زمانہ میں جاری کئے رکھتا ہے۔اور ایک ولی اکمل کی راہنمائی میں اسوقت تک ایک خلیفہ کا ولی اکمل کی حیثیت میں قائم مقام ہونا یقینی ہے۔جب تک کہ ایک ولی اکمل کو اسکا خلیفہ (مرید) میسّر نہ ہو۔یعنی جب تک کہ اللہ اور اسکے رسول کے احکام کی تابعداری کرنے والا نہ رہے۔لیکن اللہ تعالیٰ اپنے دین کو جاری رکھنے کی خود ضمانت دیتا ہے۔اِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّکْرَ وَ اِنَّا لَہٗ لَحٰفِظُوْنَ ○ (پارہ ۱۴ سورۃ ۱۵ آیت ۹)

یعنی میں خود اپنے قرآن کی حفاظت کرتا ہوں۔ کہ دنیا میں وہ عالم وفقیہ پیدا کرتا ہوں جو قیامت تک اسکے علم کو تازہ کرتے رہیں گے اور وہ ولی اکمل بھی پیدا ہوتے رہیں گے جو اسکے باطنی علم کو بھی قیامت تک جاری رکھیں گے۔ اسلئے ہر زمانہ میں ایک ولی اکمل راہنما کا ہونا ضروری ہے۔ اور اسکے ساتھ ہی ہر انسان کو تلاش وجستجو الی اللہ کیلئے اس کے آگے جھکنا ہوگا۔ ورنہ کوئی شخص بغیر اس تعلیم وعلم کے اپنی ذاتی قوت سے علم حاصل نہ کرسکتا۔

جیسے اللہ نے اپنے قرب اور حمد کیلئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت۔ اتباع۔ اور حب کا طریقہ بتایا۔ اس طرح اللہ کا قرب حاصل کرنے کیلئے محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا پہچاننا بھی ہم پر لازم ہو جاتا ہے۔ وہ اسلئے کہ اول محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہی کے نور سے یہ تمام مخلوق بنی ہے۔ جن کا مرتبہ محمد و احمد ہے۔ دوسرے یہ کہ اللہ کے پہچاننے کیلئے یہ ایک لازمی طریق ہے کہ انسان براہ راست اللہ کو نہیں پہچان سکتا جب تک کہ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کی راہنمائی حاصل نہ ہو۔ اس راہنمائی کا طریقہ ہی یہ ہے۔ کہ آپکے وجود اقدس میں اس قدر وسعت وصلاحیت ہے (ایک ابتدائی تخلیق کے اعتبار سے دوسرے آپکے ذاتی عمل وعرفان سے) کہ آپکا وجود انوار الٰہی کا متحمل ہوسکتا ہے۔ اس لیے محمدؐ کی حمد وعرفان سے یہ مراد ہے۔ کہ ہر انسان پہلے محمدؐ کے نور میں جذب ہوتا کہ یہ انوار الٰہی کی تجلیات کا متحمل ہو سکے۔ گویا ایسی حالت میں بھی انسان نور محمدیؐ میں ہی اپنی روح رحمانی کو جذب کرتا ہے۔ جب یہ روح خود کو فنا کر کے مجسم محمد ہو جاتی ہے۔ تو پھر محمدؐ ہی نور الٰہی کی تجلیات کا مشاہدہ کرتے ہیں بالفاظ دیگر محمد صلی اللہ علیہ وسلم ہی اللہ کے انوار کا مشاہدہ کرتے ہیں۔ وہاں انسان کی ذاتی حیثیت قائم نہیں رہتی بلکہ اپنے منبع وعلّت میں جذب ہو جاتی ہے۔ اسے فنا کہتے ہیں۔ یعنی فنافی اللہ کا مقام صرف حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کو ہی ہوتا ہے۔ اور انسان کو فنافی اللہ حاصل کرنے کے لئے فنافی الرسول کا مقام حاصل کرنا ہوتا ہے۔

مقام فنافی الرّسول آپکی امت میں اصحاب رسول اللہ کو حاصل ہوا۔ جنہوں نے حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کی بدرجہ کمال اطاعت۔ اتباع۔ محبت کی۔ چنانچہ تواریخ ظاہری طور گواہ ہے۔ کہ حضرت

ابوبکر صدیق۔ حضرت عمر۔ حضرت عثمان۔ حضرت علی۔ بلال حبشی۔ عبداللہ ابن عباس۔ سلیمان فارسی ۔وغیرہ اصحاب رضی اللہ عنہم نے اپنے اس عمل سے علم وعمل میں وہ درجہ حاصل کیا جو کوئی اور انسان حاصل نہیں کرسکتا۔ ان میں وہ ہستیاں بھی ہیں۔ جنھوں نے اپنے قلبی القا کے ذریعہ قرآن وحدیث کی وہ تفسیر کی جس سے قیامت تک علم القرآن زندہ رہیگا۔ ان میں وہ ہستیاں ہیں جنھوں نے اپنے علم مشاہدہ کے ذریعہ قرآن وحدیث کی وہ تفسیر کی جس سے عرفانِ الٰہی کی راہیں ہر انسان پر آسان ہو گئیں۔ چنانچہ حضورؐ نے خود فرمایا کہ اَنَـا مَـدِيْـنَةُ الْعِلْـمِ وَعَلِیٌّ بَابُهَا ۔ہم علم کا شہر ہیں۔ اور شہر کا دروازہ جہاں سے علم خارج ہوتا ہے وہ علیؓ ہیں۔ یعنی پیغمبر ورا ہنما ہونے کی حیثیت سے اللہ نے جو علم۔ انسانی ہدایت کیلئے ہمیں دیا۔ اسکے جاری کرنے کیلئے ہم نے حضرت علیؓ کو دروازہ کی حیثیت سے رکھا۔ کہ آپکے ذریعہ تمام انسانوں کو علمِ معرفت پہنچے۔ یعنی حضرت علیؓ ہی حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کے بعد خلیفہ یا نائب رسول اللہ ہیں۔ چونکہ یہ علم عرفان الٰہی کیلئے آپکو ایک راہنماءِ حقیقی کی حیثیت سے عطا ہوا۔ اسکے لیے ضرورت تھی کہ آپ دنیوی مشاغل سے فارغ رہیں۔ یہی وجہ تھی کہ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے۔ آپکی خلافتِ اسلامی کیلئے وصیّت نہ فرمائی۔ کیونکہ خلافت اسلامی کا مقصد اعرفان الٰہی کے لئے انسان کیلئے زمین کا ہموار کرنا (ماحول سازگار بنانا) تھا۔ جو شریعت ظاہری کی صورت

---

1 یعنی۔ حقیقتاً ___ اسلام۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ظہور ___ (بعثت) محض فَاِمَّا یَاْتِيَنَّكُمْ مِّنِّیْ هُدًی۔ اللہ تعالیٰ کے احکام مخلوقِ انسانی کے لیے نازل کرنا تھا۔ کہ رسول (محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم) کی وساطت سے ایک عمل۔ ایک طریق عمل نازل کیا جائے۔ اس عمل کو قرآن نے اِنَّ الـدِّيْـنَ عِـنْـدَ الـلّٰـهِ الْاِسْلَامُ کی صفت سے پیش کیا۔ یعنی ___ مخلوقِ انسانی کی ضلالت وگمراہی پر۔ انسان کو اس صفتِ آدمیت ___ صفتِ انسانیت پر لایا جائے۔ جسکا حوالہ قرآن نے پیدائش آدم۔ پیدائش انسانیت میں وَعَـلَّـمَ اٰدَمَ الْاَسْـمَـآءَ كُلَّهَا ۔واضح کیا۔ کہ دنیا پر انسانی پیدائش کا واحد مقصد معرفتِ الٰہی۔ معرفتِ کائنات کا حامل ہونا تھا ___ لہذا۔ ایک رسول کے ظہور پر۔ ایک رسول کے لیے فَاِمَّا یَاْتِيَنَّكُمْ مِّنِّیْ هُدًی ___ کے احکام مخلوقِ انسانی کے لیے پیش کرنا تھا۔ اسی عمل کو قرآن نے الدین الاسلام سے تعبیر کیا ___ یہی عمل۔ یہی الـدیـن الاسـلام۔ ہر رسول مخلوق کے لیے پیش کرتے رہے۔ یہی عمل۔ (باقی حاشیہ اگلے صفحہ پر)

میں قائم ہوتا تھا۔اور اس میں اصل مقصد یہ تھا۔کہ انسان کو عرفانِ الٰہی حاصل کرنے میں کوئی مادی قوت حائل نہ ہو۔اور خالص ماحول میں انسانی اصلاح کا کام جس سے مشاہدہ کی صلاحیت پیدا ہو عالمِ طریقت کے لئے مقرر کیا گیا۔گویا ان دونوں ہستیوں (خلیفہ شریعت اور خلیفہ طریقت) کا مقام ایک مقصود کے لحاظ سے

(بقیہ حاشیہ گزشتہ صفحہ) الدین الاسلام۔حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے وقف ہوا۔ہاں اس عمل کو قرآن وحدیث کے تصور میں "شریعت" کے نام سے پکارا گیا۔جس میں کسی اور فروعی تصور کی گنجائش نہ تھی ــــ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد نبوت ورسالت میں۔اسی شریعت کو مخلوقِ انسانی میں پیش کیا۔جسکا مطلب۔عبادات سے تھا۔اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد رسالت کے بعد آپؐ کے بعد اُمت محمدیؐ میں۔لازمی طور۔آپ صلی اللہ علیہ وسلم۔کے ایک خلیفہ کی ضرورت محسوس ہوئی۔کہ آپکے بعد۔ھدیٰ ــــ احکامِ الٰہی کی اتباع واطاعت کا عمل مخلوقِ انسانی میں جاری رکھا جائے جسے خلیفة الرّسول کے نام سے پکارا گیا۔اور اس خلیفة الرّسول کیلئے۔اجرائے۔قرآن وحدیث رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اور کوئی عمل مقرر نہ تھا ــــ جس کے لیے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے خود حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کا انتخاب فرمایا۔لہذا۔حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کو۔خالص اجرائے دین رسول اللہ کیلئے منتخب کر کے۔ایک خلیفہ کا خطاب عطا کیا گیا۔ہاں۔اس خلیفہ میں۔خلافت ــــ یا خلافت اسلامی میں۔ایک ہی تصور پایا جاتا ہے۔کہ رسول کے بعد ایک خلیفہ کیلئے۔اجرائے قرآن وحدیث۔عملِ رسالت کی تکمیل کرنی ہے۔جس میں کسی حکومت۔سلطنت کا کوئی تصور موجود نہیں۔جس کیلئے تمام امت مسلمہ میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے نزدیک۔حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کا انتخاب۔مناسب تھا۔

جہاں تک اطاعت واتباع۔اور اطاعتِ احکام کا تعلق ہے۔وہ اَطِيْعُوا اللّٰهَ ۔اور وَاَطِيْعُوا الرَّسُوْلَ کے احکام کی اطاعت کرنے سے پورا ہوا۔جو امتِ مسلمہ میں۔حکم قرآنی کے مطابق نافذ ہوتا رہا۔جس کے بعد۔کسی حکم کی اطاعت لازم نہیں آتی لیکن قرآنی حکم کے مطابق۔قرآن نے وَاُولِي الْاَمْرِ مِنْكُمْ کی اطاعت بھی لازم کردی۔جس میں حکم اللہ۔حکم رسول اللہؐ کے ساتھ حکم اولی الامر (یعنی صاحب حکم) کے احکام بھی تسلیم وقبول کرنا لازمی ہے۔اس حال میں کہ اولی الامر کے احکام کی قرآن وحدیث سے تائید ہوتی ہو۔اولی الامر ذاتی طور الدین الاسلام میں سوائے حکمِ الٰہی۔سوائے حکم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم (حدیث) اپنا حکم جاری نہیں کرسکتا۔البتہ یہ خیال رکھنا ضروری ہے کہ احکامِ الٰہی محض قرآن کی صورت میں۔اور حکم رسول اللہ بھی محض وحیِ حدیث کی صورت میں تعمیل کئے جاتے ہیں۔جو صرف اجرائے الدین الاسلام کیلئے ہوتے ہیں۔ان احکام کا محض اللہ ورسول کی طرف سے ہونا (باقی حاشیہ اگلے صفحہ پر)

مساوی اور مشترک تھا۔ وقتی طور پر ایک شخص کے لیے صرف ایک ہی کام مقرر کیا گیا۔ کہ حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ دنیوی ۱ امور کی اصلاح کریں۔ اور چونکہ مشاہدہ کے لئے دنیوی امور سے زیادہ تر فارغ رہنا بہتر و لازمی ہے۔ اس لئے حضرت علی کرم اللہ وجہہ کے سپرد صرف انسانی اصلاح میں مشاہدہ حقیقی کا کام ۲ سپرد کیا گیا۔ ایسی صورت میں دونوں ہستیاں نائب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے عہدہ پر مامور تھیں۔ صرف طرفین میں ایک دوسرے کے مقابل افضلیت یہ تھی کہ ایک ہستی کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے انکی زائد صلاحیت کی بنا پر خلافت اسلامی کے منصب پر فائز کیا۔ اور دوسری ہستی کو انکی زائد صلاحیت پر عرفان و مشاہدہ کے منصب پر مامور کیا۔ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام میں تو دینی دنیاوی تمام خوبیاں موجود تھیں لیکن امت پر زیادہ بوجھ پڑنے کی وجہ سے یہ سلسلہ دو طریقوں (شریعت و طریقت) میں تقسیم ہو گیا۔ حقیقتاً طریق ایک ہی ہے۔ لیکن علیٰحدہ منصب کے لحاظ سے یہ دو طریقے محسوس کیے جاتے ہیں۔ خلفاءِ شریعت کا سلسلہ خلیفۂ اسلام کی صورت میں ظاہر ہوا۔ چونکہ

(بقیہ حاشیہ گزشتہ صفحہ) شرط ہے۔ مگر اولی الامر سے مراد صرف اللہ و رسول کے حکم کا اجراء کرنا ہے۔ جو اللہ کی طرف سے قرآن کی صورت میں نازل ہوتے ہیں ـــــ یہ احکام صرف اجرائے الدین کیلئے ہی نازل (وحی) ہوتے ہیں۔ یہاں اولی الامر سے مراد یہ ہے کہ ایک فردِ امتِ مسلمہ میں صاحب علم القرآن و حدیث۔ اور صاحب عمل متقی ہو ـــــ اور خلیفۃ الرّسول کی حیثیت میں۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد خلیفۃ الرّسول کا مقام رکھتا ہو۔ اسکے ساتھ ہی۔ اقتدارِ اعلیٰ یعنی حکومتِ اسلامی کی حیثیت میں۔ خلیفہ کی حیثیت میں خلافتِ اسلامی کا سربراہ ہو۔ کہ الدین الاسلام سے سوا امور سلطنت اسلامی سرانجام دینے کی صلاحیت رکھتا ہو۔ اس حیثیت میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد۔ حضرت ابو بکر صدیق۔ حضرت عمر فاروق۔ حضرت عثمان غنی۔ حضرت علی رضی اللہ عنہم کی حیثیت بھی خلیفہ اقتدار اعلےٰ کے۔ ہوتی ہے۔ اس اعتبار سے۔ جبکہ اقتدار اعلےٰ کی قوت پر ہی الدین السلام کا تحفظ و استحکام منحصر ہوتا ہے۔ تو الدین الاسلام کے ساتھ اقتدار اعلےٰ ـــــ کو بھی خلافتِ اسلامی تصور کیا جاتا ہے۔ گویا۔ خلافتِ اسلامی کو بھی الدین الاسلام کے تصور میں سمجھا جاتا ہے۔ (حاشیہ صفحہ ھذا)

۱ اجرائے رسالت اجرائے قرآن و حدیث۔ اور اقتدارِ اعلیٰ کا استحکام۔ ۲ اجرائے طریقت۔ معرفت الٰہی۔

مجموعی حیثیت میں انسان کو ایک اسلامی ماحول کی ضرورت تھی اسلئے اسلام نے ایک اجتماعی ہیئت حاصل کی۔اور عرفان و مشاہدہ جماعت کے ہر فرد کیلئے ذاتی عمل تھا اسلئے یہ عمل مخفی رہا۔وہ اسلئے کہ جماعت اسلامی کے فرد کیلئے ہی یہ ماحول درکار تھا۔کہ اُسے ایک سازگار ماحول بنا کر دیا جائے۔یہ کام حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ نے کیا۔اور اسکے بعد انسانی اصلاح کیلئے جس طریق کی ضرورت تھی وہ حضرت علی کرم اللہ وجہہ نے پورا کیا۔یہی وجہ ہے کہ اسلام میں صرف شریعتِ اسلامی کو ہی محسوس کیا گیا۔جس میں خود حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے الدین الا سلا م اجرائے قرآن میں اپنے بعد یہ منصب حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کو عطا فرمایا کیونکہ تمام امت مسلمہ میں آپکی اعلیٰ صلاحیتوں کے مقابل کوئی فرد نہ تھا۔جو منصبِ خلیفہ (خلافت) کے لائق تھا۔چنانچہ حضرت ابو بکر صدیقؓ اسلام میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے پہلے خلیفة الرّسول مقرر ہوئے۔

حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کے بعد خلافت اسلامی کا ایک سلسلہ جاری ہوا۔جو خلیفہ اسلام (خلیفۂ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم) کے نام سے منسوب ہوا۔عرفان و مشاہدہ چونکہ ذاتی اور مخفی طریق تھا۔اسلئے۔اس سلسلہ کو انہیں لوگوں نے محسوس کیا۔جنہیں شریعت کی تعمیل میں مشاہدہ بھی حاصل تھا۔مشاہدہ چونکہ باطن (عالمِ غیر جسمانی) سے تعلق رکھتا ہے۔اسلئے ایک شخص کے علم سے بظاہر دوسرا شخص واقف نہیں ہوسکتا تھا۔لہذا یہ سلسلہ باطنی سلسلہ کہلایا ـــــ اور اس طریق مشاہدہ کا علم بھی مخفی رہا۔گویا یہ علم طریقت۔شریعت کی روح ہے۔لیکن یہ علم چونکہ باطن سے تعلق رکھتا ہے اسلئے یہ علم سینہ بسینہ چلنے لگا۔درحقیقت ہر خلیفہ (خلیفہ شریعت و خلیفہ طریقت) کا مقصد دونوں صورتوں میں ایک ہی مقصود عرفانِ الٰہی تھا ـــــ صرف خلافت ظاہری تواریخ کے احاطہ میں آئی۔اور طریقت براہِ راست سینوں میں منتقل ہوتی رہی۔کیونکہ خلافتِ اسلامی میں۔الدین الاسلام تین صورتوں میں تقسیم ہو چکا تھا۔اول اقتدارِ اعلےٰ۔جسے خلافتِ اسلامی سے موسوم کیا گیا۔دوئم علمائے اسلام کے ذمہ اجرائے قرآن وحدیث جسے شریعت کے نام سے پکارا گیا۔جس میں قرآن وحدیث وفقہ کے تمام علوم شامل ہیں۔جو علمائے امت۔علمائے شریعت کے ذمہ ہوا ـــــ تیسری صورت طریقت (علمائے

طریقت)۔جوعلم شریعت کے ساتھ خلافت سے علیٰحدہ ہوئی۔مگراس علم میں دیرپا عمل قائم نہ رہ سکا۔جو کچھ رہاوہ حقیقی مستقل نہ رہا۔اسلئے علمِ طریقت زمانہ میں اپنے حقیقی اسلامی تصور کے ساتھ باقی نہ رہ سکا۔یہ زمانہ خلافتِ عباسی سے خلافتِ عثمانی کا ہے کہ دنیاپر الدین الاسلام خلافت اسلامی کی شکل میں قائم رہا۔اورعلم شریعت بھی۔دین الاسلام کے علمائے امت کے ذریعہ مسلسل جاری رہا۔مگرعلمائے شریعت میں۔طریقت۔کاعلم وعمل باقی نہ رہا۔سوتاریخ اسلامی میں الدین الاسلام کی حقیقتِ قرآنی کے اجراء کاتصور خلافتِ اسلامی۔شریعتِ اسلامی کی شکل میں محسوس کیا جاتا رہا۔کہ اسلامی حیثیت خلفائے اسلام کی سلطنتوں کی شکل میں ایک عظیم طاقت کے دنیاپر چھائی رہی۔

جہاں تک الدین الاسلام میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت ونبوت کاتعلق ہے۔ یہ اجرائے کلام الٰہی۔خالص کلام الٰہی تصور کیا جاتا ہے۔جس حکم میں کسی فروعی حکم کادخل نہیں۔جوحضور صلی اللہ علیہ وسلم سے اور خلفاءِ اسلام سے الدین الاسلام کے تصور میں جاری ہوا۔حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی ذاتِ اقدس (عہد رسالت) کے ساتھ ہی الدین الاسلام میں۔کفار۔اور باطل قوتوں کی مزاحمت ومخالفت کے نتیجہ میں اقتدار اعلیٰ کی ہیئت نمایاں ہوتی رہی۔اس عہدِ رسالت میں بذات خود حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات موجود تھی۔اسلئے ان احکام کے آگے کسی اور کے احکام کی ضرورت نہ تھی۔اس اقتدار اعلیٰ کی ہیئت میں۔الدین الاسلام کی وسیع قوت اوراجرائے الدین وسیع ہوتے رہے۔اور ہر خلیفہ اسلام کی خلافت میں اس قوت میں اضافہ ہوتا رہا۔بعدرسول اللہؐ رسالت میں ایک خلیفہ کیلئے وسیع فتوحات کی صورت میں۔انتظام ملکی میں احکام کی ضرورت محسوس ہوئی چنانچہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے عہد خلافت میں۔الدین الاسلام ایک عظیم۔قوی۔سلطنت۔مملکت اسلامی۔کی شکل اختیار کر چکا تھا۔جسکے انتظام کیلئے احکامات کی ضرورت پیدا ہوئی۔وہ یہ کہ قرآن وحدیث کے استحکام اور عمل میں لانے کی تدبیر۔کہ شریعت اسلامی پر کاملاً عمل جاری رہے۔اسکے ساتھ ہی۔اقتدار اعلیٰ میں وسیع قوت اور ملکی انتظامات کی تکمیل بہ طریقِ احسن جاری رہے۔جبکہ انتظامِ ملکی میں۔خلافت اسلامی میں۔بدلتے حالات کے مطابق مسائل حل طلب ہوں۔اسکے لئے۔جبکہ احکامِ قرآن وحدیث

صرف الدین الاسلام سے تعلق رکھتے ہوں۔ انتظامِ ملکی کے اجرا میں خلافت اسلامی کی ہیئت مسلمہ کو ملحوظ رکھا جائے۔ جسکے لئے۔ ایک مومن۔ متقی۔ صاحبِ قرآن۔ صاحبِ علم۔ اعلیٰ ذہنی حکمران صلاحیت رکھنے والی شخصیت ہونا ضروری ہے۔ جسکا خلافتِ اسلامی میں۔ ایک خلیفۃ المسلمین کی حیثیت میں ایک اولوالعزم ہستی کا انتخاب ہونا ضروری ہے۔ تاکہ اللہ ورسول (رسول اللہ) کے احکام کے بعد۔ ایک فرد۔ خلیفة الرّسول۔ خلیفہ کی حیثیت میں۔ اولی الامر کی حیثیت میں احکام جاری کرنے کی صلاحیت رکھتا ہے۔ ہاں۔ جن احکام میں قرآن وحدیث سے تائید حاصل ہو۔ جو محض اقتدار اعلیٰ (خلافت اسلامی) کی اصلاح واستحکام سے تعلق رکھتے ہوں۔ ایسے اولوالعزم خلیفہ کے احکام اولی الامر کی حیثیت میں۔ جو اقتدارِ اعلیٰ۔ خلافتِ اسلامی کے نظام سے تعلق رکھتے ہوں۔ ''اجتہاد'' سے تعبیر دیئے جاتے ہیں۔

حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے عہد خلافت میں اجرائے الدین الاسلام ۔یعنی اجرائے قرآن وحدیث بطریق عملِ رسالت حضور صلی اللہ علیہ وسلم علیٰ حالہ جاری رہا۔۔۔ اسکے ساتھ کفارِ مکہ کی مزاحمت پر الدین الاسلام (تبلیغ دین) کے خلاف محاذ آرائی پر آپ نے انتہائی دانشمندی سے دشمنانِ اسلام کو شکست فاش دی۔ اور تبلیغِ اسلام کو بھی وسعت دی۔ یہاں تک کہ آپکا انتقال ہوا۔ اور آپ نے بذاتِ خود اسلام کی اعلیٰ ترین صلاحیتوں کے مالک دنیا کے عظیم ترین انسان ہمہ صفات شخصیت حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا انتخاب ـــــ اپنے بعد فرمایا۔ یہ زمانہ تھا کہ اسلام کی حیثیت الدین الاسلام میں اور اقتدار اعلیٰ کی ترقی ووسعت میں ترقی کی طرف قدم بڑھا رہے تھے۔ الدین الاسلام میں لوگ برابر شامل ہوکر نجات آخرت حاصل کررہے تھے۔ اور اقتدار اعلیٰ میں بھی اپنی قوت کے لحاظ سے استحکام انہیں حاصل ہورہا تھا کہ کسی مخالفِ اسلام کو اسلام (امت مسلمہ) پر یورش کرنے کی جرأت نہ ہوسکی۔ جبکہ آپؓ نے اپنے بعد حضرت عمر فاروقؓ کو منصبِ خلافت عطا کیا۔ اور اللہ تعالیٰ نے قوتِ اسلامی کو حضرت عمر فاروقؓ کے ہاتھوں عظیم وسعت وسطوت عطا فرمائی۔ ہاں۔ مقصدِ

خلافت (خلیفۃ الرّسول) میں چونکہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی ذاتِ اقدس کے بعد ایک قائم مقام خلیفہ کا منتخب ہونا اشد ضروری تھا۔ اسلئے اس مقامِ خلافت پر۔ کسی فردِ امت مسلمہ کے انتخاب میں اختلاف محسوس کیا گیا ــــ ہاں یہ خیال رہے کہ ابتدائے رسالت ۔ ہیئت مسلمہ ایک الدین الاسلام میں متعارف تھی ۔ مگر کفار کی مزاحمت میں جب اقتدار اعلیٰ کی ضرورت پیدا ہوئی ۔ تو الدین الاسلام میں اقتدار اعلیٰ کی ہیئت ۔ سلطنت کی شکل میں ظاہر ہونے لگی جسکے لیے شرائط دینی ۔ شرائط خلافت میں اسلام کو ایک متقی ۔ عالم و راہنما کیلئے امور سلطنت کے لیے احکامات ــــ اصلاحی احکامات وضع کرنے کی ضرورت محسوس ہوئی۔

دراصل حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کے انتقال کے بعد زمانہ نے یکلخت رُخ بدل دیا۔ کیونکہ آپ پیغمبر تھے۔ اور آپکی انتہائی خوبیاں کسی شخص میں پائی جانی ممکن نہ تھیں ۔ جو اس عظیم الشان مملکت اسلامی کا بار اٹھا کر اس کے استحکام کو قائم رکھ سکے ۔ لوگوں میں شریعت کی تعمیل تو تھی ۔ لیکن اب یہاں تبلیغ رسالت نے ایک جماعت اور مملکت کی شکل اختیار کر لی تھی ۔ اسکے لیے ضروری تھا کہ ایک ایسی ہی ہستی خلیفہ ہونے کے لیے مقرر کی جائے ۔ جو اجرائے دین کے ساتھ مملکت اسلامی کے استحکام کی صلاحیت رکھتی ہو۔ حضورؑ کے انتقال سے مخالفین اسلام کو دوبارہ فساد پیدا کرنے کا موقع ملا۔ اور ضروری تھا۔ کہ وہ اندرون و بیرون سے مملکت اسلامی پر دھاوا بول دیں۔ تو اسکے لیے مملکت اسلامی کے استحکام اور اسکی ظاہری حفاظت کی بھی اشد ضرورت تھی۔

مملکت اسلامی کا اجرا صرف حصول دولت اور ملک گیری نہ تھا۔ جسکے لئے کسی شخص کو خلافت حاصل کرنے کی خواہش ہوتی ۔ یا کوئی جماعت اپنی برتری کی خاطر جماعت کے کسی فرد کو خلیفہ منتخب کرنا چاہتی تھی ۔ یہاں خلافت کے بنیادی وجود کو اسکی اصلی ہیئت میں سمجھنے کی ضرورت ہے ۔ کہ خلیفہ کا کام مومن بننا۔ اور دنیوی اغراض سے نفی کرنی ہے ۔ اسکی شہادت حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی خانگی زندگی کے مطالعہ سے ملتی ہے ۔ کہ آپ نے کاروبار دنیوی کو ترک کر دیا۔ مگر اسکے بدل میں خلافت سے ایک پائی بھی حاصل نہ کی ۔ جب انتظام سلطنت نے معمولی کاروبار کی فرصت بھی نہ دی تو آپ نے

قوم سے صرف دووقت معمولی روٹی کیلیئے وظیفہ مانگا جو آپکو بیت المال سے ملنے لگا۔اس پر بھی ایک بار جب آپکی اہلیہ نے چند درہم بچت کر کے کسی کھانے (حلوے یا کسی اور چیز) کی فراہمی کیلیئے زائد رقم دی۔تو آپ نے اسے ضرورت سے زائد سمجھ کر بیت المال میں جمع کر دیا۔اور آئندہ اصلی وظیفہ سے یہ رقم وضع کی گئی۔اگر حصول دولت کی خواہش ہوتی تو آپ مکہ کے بڑے متمول سرمایہ داروں میں شمار ہوتے تھے۔تجارت سے امیر کبیر بن سکتے تھے۔یا خلیفہ ہونے کے بعد بھی بیت المال یا اپنے ذرائع سے امیر بن سکتے تھے۔لیکن انہوں نے اسلام کے بعد دنیا کے مقابلہ میں تقویٰ اور محبتِ رسول کو مقدم سمجھا۔اور خلافت میں بھی آپ نے دووقت روٹی کے لیے بھی پوری رقم حاصل نہ کی۔بلکہ ہر وقت اسی فکر میں رہے۔کہ کیا ہم سے خلیفہ ہونے کی حیثیت سے اجرائے دین اور حفاظتِ خلق کی ذمہ داری پوری ہوسکی کہ نہیں۔کیونکہ اسلام کے خلیفہ کیلیئے یہ ایک شرط تھی کہ وہ خلیفہ بن کر نہ اپنے آپکو حاکم تصور کرسکتا ہے۔نہ خلافت کو اپنی ذاتی ملکیت بنا سکتا ہے۔خلافت اللہ کی ملکیت ہے۔اور حکم بھی اللہ کا ہے۔اور خلیفہ صرف ظاہر طور اس کا اجرا کرنے والا۔امین کی حیثیت سے ہے۔اس حالت میں خلافت ایک فریضہ تھا جس کے لیے ہوس یا خواہش کو دخل نہ تھا۔اسی طرح حضرت عمرؓ کی زندگی کے حالات کا مطالعہ کیا جائے کہ کسریٰ کے سنہری کنگن سراقہ غلام کو پہنائے گئے۔لیکن بیت المقدس کے راہب ہیبت وتعجب میں آ گئے۔کہ وہ خلیفہ اسلام اور غلام میں فرق نہ کر سکے۔حضرت عمر فاروقؓ کے اصحاب کا بیان ہے۔کہ حضرت عمر فاروقؓ کی جلالت کا یہ عالم ہے۔کہ ہم اگرچہ دربار خلافت سے دور ہیں لیکن ہمیں یہ معلوم ہوتا ہے کہ حضرت عمرؓ کے ہاتھ ہمارے دونوں جبڑوں کے درمیان ہیں۔اگر ہم سے اجراء دین اور اصول خلافت میں کوتاہی ہوئی تو ہمارے جبڑے چر جائیں گے۔انکا کہنا ہے۔کہ جب ہم حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے پیچھے چلتے۔اگر وہ پیچھے کی طرف مڑ کر دیکھتے۔تو ہم آپکے جلال کی تاب نہ لا کر لرز جاتے۔لیکن باوجود اس جلالت کے بارِ خلافت کا یہ اثر ان پر تھا۔کہ جب جلال الٰہی اور قیامت کی آیات انکے سامنے پڑھی جاتیں۔تو ایسا رُعب طاری ہوتا۔جیسے کسی نے اوپر اٹھا کر زمین پر زور سے پٹخ دیا ہو۔زاروقطار روتے اور بیہوش ہو جاتے کئی کئی دن تک بیمار صورت رہتے۔اور فرماتے

اللہ تعالیٰ کے سامنے قیامت کے دن ہم اپنے عمل اور بار خلافت کی جوابدہی سے کیسے بری ہو سکتے ہیں۔ آپکا معمول تھا۔ کہ راتوں کو گشت کرتے۔ اور آپکی ذاتی زندگی یہ تھی کہ باوجود شہنشاہ عرب وعجم ہونے کے پیرہن میں کئی پیوند ہوتے۔ اور انکے لیے کھانا اور سونا غرض ہر قسم کی راحت حرام ہو چکی تھی۔ یہ تھا خلافت کا حقیقی تصور۔ اور اصحابِ رسول اللہ میں ہر صحابی کے قلب میں خلافت کیلئے یہی تصور تھا۔ ایسی حالت میں کسی شخص کا حصول خلافت کیلئے زبردستی خلافت پر قبضہ کرنا یا خلافت کی خواہش سمجھنا ایک لغو اور بے بنیاد نظریہ ہے۔

اس میں شک نہیں کہ اصحاب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم میں خصوصی اصحاب حضرت ابوبکر صدیقؓ۔ حضرت عمر فاروقؓ۔ حضرت عثمان غنیؓ اور چند دیگر صحابہؓ میں حضرت علی کرم اللہ وجہہ کی شخصیت بھی مسلمہ تھی۔ اور اسی بنا پر حضور علیہ الصلوۃ والسلام کے انتقال پر بھی جماعتِ اسلامی میں تھوڑی دیر کیلئے خلیفہ کے قیام میں اختلاف ہوا۔ کہ مختلف جماعتیں اپنے اپنے قبیلہ کی سرکردہ ہستی کو اس بنا پر خلیفہ بنانا چاہتی تھیں کہ وہ کوئی تو انصار میں سے تھا۔ کوئی مہاجرین سے تھا۔ کوئی خاندانِ نبوت سے قریبی تعلق رکھتا تھا۔ کوئی غزوات میں کارہائے نمایاں کر چکا تھا۔ یہ تو رائے عوام کی تھی۔ کہ انہوں نے حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کے انتخاب کی رو سے ایسی ہستیوں کو فضیلت دینا چاہی۔ لیکن یہاں ایک مستقل نظام اسلامی کے استحکام اور تمام مسلمانوں کی فلاح و بہبود کیلئے ایک عالمگیر صلاحیت رکھنے والی شخصیت کی ضرورت تھی جسکا انتخاب عوام سے ہونا مشکل تھا۔ اس میں بھی شک نہیں کہ خلیفہ ہونے کے لیے از روئے قرآن ایک مکمل عامل شریعت کو خلافت کا مستحق سمجھا جانا ضروری تھا۔ لیکن اسکے ساتھ یہ بھی ضروری چیز تھی کہ وہ امور مملکت میں دینی جز کے ساتھ نئے نظامِ مملکت کو کلی طور سنبھالنے کی بھی صلاحیت رکھتا ہو۔ مثال کے طور ایک کامل عاملِ شریعت (جسکا تقویٰ انتہا کو پہنچ چکا ہو) شریعت کے علم میں کامل ہوتا ہے۔ لیکن باقی امور سیاست مثلاً نظامِ اسلامی کے پھیلاؤ کے ساتھ نئے اسلامی مفتوحہ علاقوں پر کنٹرول اور لوگوں کے معاشی انتظامات میں اصلاح۔ اور ضروری انتظام کیلئے لوگوں کی ضروریات کے مطابق اصلاحات۔ مخالفین اسلام پر کنٹرول کرنا۔ باقی جرائم کے دفعیہ کیلئے اصلاحات

اور لوگوں کے دنیوی معاملات میں ترقی کی اصلاحات وغیرہ کا ایک عابد میں پایا جانا ضروری نہیں۔ اسکے لیے ایسے شخص کی ضرورت ہوتی ہے۔ کہ اگر چہ وہ کامل عاملِ شریعت نہ بھی ہو۔ تب بھی اس میں یہ خوبیاں پائی جاسکتی ہیں۔ ان خوبیوں کا کسی شخص میں جاننا عوام کے عقل سے نہیں بلکہ ایسے شخص ہی سے ہوسکتا ہے۔ جو اس قسم کے واقعات سے خود واقفیت رکھتا ہو۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا۔ کہ جماعتوں نے۔ اکثر صحابہ کو منتخب کرنا چاہا۔ لیکن حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے جو ان تمام خوبیوں کے حامل تھے۔ اسوقت نہ انصار کی فضیلت کو لیا۔ نہ مہاجرین کی فضیلت کو لیا۔ نہ خاندانِ نبوت کی قربت کو لیا۔ بلکہ اس نظام اسلامی کیلئے جو اُس وقت ایک پُر خطر ماحول سے گزر رہا تھا۔ بجائے اپنے ایک ایسی ہستی کو منتخب کیا۔ جو انکی دانست میں دونوں خوبیوں کے حامل تھے کہ آپؓ شریعت میں بھی کامل عامل تھے۔ اور دنیوی امور میں نظام مملکت کو پورے طور سنبھالنے کی صلاحیت رکھتے تھے۔ اور انہوں نے یہ جان لیا۔ کہ اگر انکے بغیر کسی اور صاحب فضیلت شخصیت کو خلیفہ مقرر کیا گیا تو ممکن ہے۔ کہ اسلامی سلطنت کے تمام لوازمات اس سے پورے نہ ہوسکیں گے۔ لہذا انہوں نے اسکے لئے حضرت ابوبکر صدیقؓ کے ہاتھ پر پہلے خود بیعت خلافت کی۔ یہی وجہ تھی کہ حضرت علی کرم اللہ وجہہ۔ باوجود جملہ صفات دینی حاصل ہونے کے جماعت کی رائے پر خلیفہ مقرر نہ ہوئے۔ اس فرقِ نصب کیلئے اتنی دلیل کافی ہوسکتی ہے کہ اسوقت ایک سازگار ماحول قائم کرنے کی غرض سے خلیفہ کا تقرر ہونا تھا۔ جو اسلامی مملکت کو اپنی جُملہ خصوصیات کے ساتھ مستحکم کرتا۔ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ حضورؐ کے وقت میں بھی عمر رسیدہ تھے۔ اسلام سے قبل بھی ایک ممتاز درجہ رکھتے تھے اور جاہلیت کے زمانہ میں بھی وہ قوم کی لاقانونی زندگی سے متنفر تھے۔ تجربہ کار بھی تھے۔ اسکے مقابلہ میں حضرت علی کرم اللہ وجہہ آپ سے عمر میں کم تھے۔ اسلئے دنیاوی امور میں جن تجربات کی ضرورت ہوتی ہے۔ عمر کے اعتبار حضرت ابوبکرؓ سے ان تجربات میں کم تھے ورنہ حضرت علیؓ قرب رسول اللہؐ میں باقی صحابہ کے مقابلہ میں مساوی تھے۔ لیکن جس ضرورت کو حضرت عمرؓ کی ذہانت نے محسوس کیا اسکا نتیجہ ظاہر ہے۔ کہ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے حکومت اسلامی کو کس طرح فروغ دیکر مخالفین اسلام کی تمام طاغوتی قوتوں کو پامال کر دیا۔ اور

حضرت عمر فاروقؓ کی اخلافت کی بھی یہی کیفیت رہی کہ ایک مکمل قانون دان نے ایک ایسی ہستی کو خلیفہ مقرر کیا جسکی اسوقت مملکتِ اسلامی کو ضرورت تھی چنانچہ حضرت ابو بکر صدیقؓ نے انہیں صلاحیتوں پر۔ حضرت عمرؓ کو خلافت کے لیے منتخب فرمایا۔ جنہوں نے اپنے تقویٰ۔ مومنانہ صفات اور سیاست و تدبر سے۔ اسلام کو۔ عظیم الشان تقویت دی۔ جس سے رہتی دنیا تک اسلام کا نام زمین پر ثبت ہو گیا۔ الدین الاسلام نے۔ (حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد رسالت سے ہی) ایک سلطنت کی ہیئت اختیار کر لی تھی۔ ایسے وقت میں دنیا کے ایک مدبر حکمران کی حیثیت میں۔ ایک عظیم جرنیل کی حیثیت سے۔ ایک عظیم عالم قرآن کی حیثیت میں۔ حضرت عمرؓ ہی کی بدولت اسلام کو دنیا پر فروغ حاصل ہوا۔ یقیناً۔ اتنی عظیم وسعت و استحکام کسی فرد امت سے حاصل ہونا۔ ممکن نہ تھا۔ آپ نے ایک قلیل مدت میں اسلام کی عظمت کو عرب کے چپہ چپہ پر روشن کر دیا۔

اب اجرائے قرآن وسنت و تبلیغ رسالت کے لیے الدین الاسلام میں اقتدارِ اعلیٰ (یعنی کفار کے مقابلہ میں اجرائے اسلام میں دفاعی صورت) لازم ہو گیا۔ جس عمل نے الدین الاسلام سلطنت (حکمرانی) کی حیثیت اختیار کی۔ ضروری تھا۔ کہ حصولِ اقتدار اعلیٰ کیلئے۔ اجرائے قرآن

---

۱ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی خلافت خود اس امر کی دلیل ہے۔ کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے اجرائے دین پر حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے اسلام میں شمولیت پر (قبول اسلام سے)۔ الدین الاسلام ــــ اہل اسلام۔ کو خطۂ عرب میں ایک جوش۔ ایک ولولہ پیدا ہو کر ایک نئی زندگی حاصل ہوئی۔ اور آپ کی بروقت خلافت پر اسلام کے ستون مضبوط ہو کر۔ اسلام کو فروغ حاصل ہونے میں مستحکم راہیں حاصل ہوئیں۔ یقیناً اس وقت حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی ذات منشاءِ الٰہی کے تحت۔ اگر چہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت ختم ہو چکی تھی۔ منتخب ہو کر۔ اسلام کو عظیم قوت بخشی۔ اس کے مقابل۔ تمام امت مسلمہ۔ خصوصاً نامور اصحاب سے آپؓ کی کمالیت کی ہمسری نہ ہو سکتی ــــ بلاشبہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی بنا کردہ الدین الاسلام میں۔ علمائے امت موجود تھے۔ اور کچھ حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے قرابتداری۔ میں عظیم ہستیاں۔ حضرت علیؓ۔ حضرت عثمان غنیؓ اور دیگر اولوالعزم اصحاب موجود تھے۔ مگر فی الوقت۔ الدین الاسلام کو (جس نے سلطنت کی ہیئت اختیار کر لی تھی) ــــ اسی اولوالعزم ہستی سے۔ عظیم وسعت و استحکام۔ اور قوت میسر آسکتی تھی۔

___ احکامِ قرآنی ___ یا حدیث و احکام رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے علاوہ۔ وحی۔ حدیث سے علاوہ اجتہاد کو شامل کیا جائے۔ کیونکہ اقتدارِ اعلیٰ میں فروعی احکام کا نفاذ لازمی تھا۔ جو احکام خلیفۃ الرّسول کے ذریعہ نافذ ہوں۔ چونکہ یہ احکام قرآن و حدیث سے نافذ نہ ہوتے۔ یعنی احکامِ الٰہی سے نازل ہونا لازم نہ تھے۔ اسلئے ایسے احکام اجتہادی ایک خلیفہ کے احکام سمجھ کر ان احکامات سے امت مسلمہ میں بعض لوگوں نے اختلاف کیا۔ جیسے۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے عہد خلافت میں۔ امت کے ایک اولوالعزم صحابی۔ ابوذر غفاری رضی اللہ عنہ نے آپؓ کے اجرائے احکام (اجتہادی) سے اختلاف کیا۔ جنہیں اس اختلاف کے باعث۔ زبدہ کے مقام پر نظر بند کیا گیا۔

درحقیقت صورت یہ تھی۔ کہ ابتدائے ظہورِ اسلام پر۔ اطاعت اسلام میں۔ خصوصاً امت مسلمہ میں محض اطاعت واتباع۔ حکمِ الٰہی کے قرآنی حکم فَمَنْ تَبِعَ هُدَایَ ۔ پر عامل ہونا۔ اسلام میں داخل ہونا شرط تھا۔ کہ اللہ تعالیٰ کے حکم کی اتباع واطاعت (پیروی) لازم ہے۔ جس اتباع میں ایک رسول ۔ کی رسالت۔ صرف پیغام رسانی (پیغمبری) تک مختصر تھی۔ چنانچہ اکثر مواقع پر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے جاری کردہ احکام۔ میں۔ اگر کسی موقع پر کسی حکم کے اجرا میں کسی صحابی کو محسوس ہوتا۔ کہ یہ حکم قرآن میں نہیں۔ تو اصحاب استفسار فرماتے۔ کہ یا رسول اللہؐ یہ حکم آپ کا ہے۔ یا اللہ تعالیٰ کی طرف سے ___ اس استفسار سے واضح ہوتا ہے۔ کہ امت مسلمہ اتباع واطاعت میں اللہ کے حکم کی پابند ہے۔ اور رسول کے حکم کا پابند ہونا ان کیلئے لازم وضروری نہیں۔ جس پر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق مَآ اٰتٰکُمُ الرَّسُوْلُ فَخُذُوْهُ کا قرآنی حکم ہوا۔ اللہ کے حکم کے ساتھ (قرآنی آیات کے سوا)۔ رسول اللہؐ جو حکم فرمائیں۔ اسکی بھی اتباع واطاعت کرو۔ لہذا اسلام میں داخل ہونے کیلئے۔ اللہ کے حکم کے ساتھ رسول کے ذاتی اجراء کردہ احکام کی بھی اطاعت کرنا لازم ہوگیا۔ اس طرح اصحاب رسول اللہؐ ___ امت مسلمہ ___ کیلئے قرآنی حکم سے سوا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے احکام قبول کرنا ضروری ہوا۔ یہ احکام محض قرآن۔ احکام الٰہی۔ فَمَنْ تَبِعَ هُدَایَ کے زمرہ میں لائقِ تسلیم و عمل ضروری ہوئے۔ جس پر کسی قسم کے اعتراض و اختلاف کی گنجائش نہیں۔ اسی کے ساتھ حدیث

رسول اللہ کا اتباع۔ مَـآ اٰتٰـكُـمُ الـرَّسُوْلُ فَخُذُوْهُ ۔ کے حکم کے تحت لازم ہے۔ جسکے اتباع و اطاعت میں۔ اختلاف و اعتراض کی گنجائش نہیں۔ اسکے بعد چونکہ اسلام میں داخل ہونے کیلئے کسی اور کے حکم کی اتباع و اطاعت ـــــ الـدیـن الاسـلام میں لازم نہیں۔ کہ یہ احکام بنیادی طور۔ قرآن و حدیث سے ماخوذ ہیں ـــــ اسلئے۔ اسی جذبہ کے تحت افراد امت مسلمہ۔ ہر اس حکم کی مخالفت کرتے۔ جو اللہ و رسول (قرآن و حدیث) سے ثابت نہ ہوتے۔ لہٰذا الـدیـن الاسـلام۔ انہیں اصول و ضوابط پر منحصر تھا۔ جس کی تمام امت مسلمہ اطاعت کرتی۔ یہ ضروری تھا۔ کہ امت مسلمہ میں کسی فرد کو اجازت نہیں۔ کہ وہ اللہ و رسول کے احکام کے سوا۔ نہ اپنی طرف سے کوئی حکم شامل کرے۔ نہ ان احکام میں اضافہ کرے۔ کیونکہ یہ احکام قرآن کی صورت میں۔ تمام مخلوقِ انسانی کیلئے۔ ہر زمانہ میں واجب التسلیم و مسلم ہوں گے۔ لہٰذا یہ احکام محض اور صرف اللہ و رسول اللہ کی طرف سے نازل ہوتے ہیں۔ جو احکم الحاکمین۔ حّی و قیوم ذات ہے۔ اس لحاظ سے ان احکام کی اطاعت الـدیـن الاسـلام کی حیثیت سے ہوگی۔ کہ انسان اپنے مقصد حقیقی۔ مقصد تخلیق کے ضابطہ پر عبادات کی صورت میں پورے کریں گے۔ اور رسول بھی محض الـدیـن الاسلام کی حیثیت میں۔ مخلوقِ انسانی میں ایک رسول و النبی کی حیثیت میں ـــــ مخلوقِ انسانی کی راہنمائی۔ اور نجاتِ آخرت کیلئے یہ احکام پیش کر کے روبہ عمل لائیں گے۔ اس لیے ضروری ہوا۔ کہ رسول کی اطاعت میں قرآنی احکام کے سوا۔ رسول کے احکام پر اطاعت کرنا بھی لازم ہے ـــــ رسول کے بعد امت مسلمہ میں رسول کے احکام۔ اور احکامِ قرآنی پر عمل اَلـدِّیْـنَ الْاِسْلَامَ کا ایک اہم اور لازم ضابطہ قرار دیا جاتا ہے لیکن رسول کا وجود ایک معین مدت تک رہتا ہے۔ اسلئے ضروری ہے۔ کہ مخلوقِ انسانی کیلئے قرآن و حدیث کا حکم۔ بعد رسالت جاری رہنا ضروری ہے۔ جسکے لیے امت مسلمہ میں ایک اولوالعزم ہستی کا انتخاب کیا جائے۔ جو قائم مقام رسول۔ رسول کے بعد خلیفہ (خلیفۃ الرسول) کی حیثیت میں رسول کے منصب پر۔ رسول کا (مشن) عمل جاری رکھے۔ اسکی صفت میں۔ یہ خصوصیت ہونا لازمی ہے۔ کہ بحیثیت خلیفۃ الرّسول۔ بحیثیت راہنما ہادی ان تمام صفات سے متصف ہو۔ جو ایک رسول میں ہونا چاہیں۔ بحیثیت رسول جیسے اللہ تعالیٰ نے ایک رسول کا

انتخاب کیا۔ کہ رسول تمام قرآن۔ قرآن کے جُملہ علوم سے کماحقہ علم رکھتا ہو۔ کہ ایک حرف بھی اس کے احاطۂ علم سے باہر نہ ہو اسکے ساتھ ہی۔ اس انتہائی علم پر عبور کے ساتھ۔ اس پر کلی طور امت مسلمہ کے مقابل عمل بھی رکھتا ہو۔ تاکہ رسول کسی موقع پر کسی علم کی راہنمائی ــــ حصولِ علم میں مجبور نہ ہو۔ اس طرح ناقص علمیت کی بنا پر مخلوقِ انسانی۔ حصولِ معرفت میں عاجز و ناقص نہ ہو۔ لہٰذا اس انتخاب میں ایک طریق وضع ہوتا ہے۔ کہ اللہ تعالیٰ اپنے اجرائے علم کیلئے۔ ایک اولوالعزم۔ عامل و عالم خود منتخب کرتا ہے۔ جسے النبی ــــ رسول کہا جاتا ہے۔ اور رسول کا منتخب کردہ فرد۔ خلیفۃ الرسول کہلاتا ہے۔ اس حال میں کہ اس فرد کا منصب صرف اجرائے قرآن اور حدیث کے سوا کچھ نہیں ہوتا۔ جو مقصدِ انسانی کی تکمیل۔ بنیادی مقصد معرفت الٰہی اور عبادات مخلوقِ خدا سے روبہ عمل لانا ہوتا ہے ــــ اور ہر فرد انسانی کیلئے ایسے منتخب کردہ خلیفۃ الرسول کی کلی طور اطاعت کرنی واجب ہوتی ہے۔

اسی اصول کے تحت اسلام میں۔ ایک قرآنی ــــ الٰہی احکام کا ضابطہ مرتب ہوا۔ کہ انسان کیلئے۔ ابتداءِ پیدائش انسانی پر اللہ تعالیٰ نے اس مقصد کو خود پیش کیا۔ کہ مخلوقِ انسانی کی اول پیدائش۔ آدم کو پیدا کر کے حکم دیا۔ وَعَلَّمَ اٰدَمَ الْاَسْمَآءَ كُلَّهَا۔ کہ آدم کو تمام کائنات میں افضلیت دیکر تمام اسرارِ کائنات کا علم دیا۔ یہی اسکا علم۔ یہی اسکا عمل (مشاہدہ و معرفت الٰہی) یہی اسکی عبادت مقرر ہوئی۔ آدم کے بعد مخلوقِ انسانی میں منتخب۔ النبی۔ اور الرّسول بھی اسی مقصد۔ معرفت و عبادت۔ کا عمل۔ خود پورا کرنا۔ اور مخلوقِ انسانی کو ہدایت سے۔ انکے مقصد۔ علم و عمل کی تکمیل کرانی ــــ جسکے لیے خود انبیاء و رسل نے اپنے منتخب خلفاء مخلوقِ انسانی کی راہنمائی کیلئے مخصوص کئے۔ یہ ایک ضابطہ تھا۔ جو اسلام نے مخلوقِ انسانی کی راہنمائی کیلئے وضع کیا۔ اسی ضابطہ پر آئندہ اسلام کی ہیئتِ مسلمہ قائم ہوئی۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت صرف اسلام ــــ اجرائے احکام الٰہی (قرآن) کیلئے ہوئی۔ اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے بعد ایک خلیفہ (ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ) کا انتخاب فرمایا ــــ یہ انتخاب خالصتاً اجرائے قرآن و حدیث اور عبادت و معرفت کیلئے ہوا۔ لہٰذا آئندہ ہر خلیفہ کیلئے یہی عمل مقرر ہونا لازمی تھا ــــ لیکن حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے عہدِ رسالت پر کفار مکہ نے قوتِ اسلام

پر ناجائز یورش کر کے اسلام اور رسول کی قوتِ اسلامی کو مٹانے کی کوشش کی جس وجہ سے اسلام کو کفار کے مقابلہ میں اپنی اسلامی قوت۔ حاصل کرنا ضروری ہوا۔ اس قوت کو اقتدارِ اعلیٰ سے تعبیر دیا گیا۔

اسی ضابطہ پر امتِ مسلمہ میں ایک رسول۔ ایک خلیفة الرّسول کی اطاعت کو ہر فردِ امت نے سوائے احکامِ الٰہی۔ احکامِ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کسی غیر کی اطاعت کو تسلیم نہیں کیا۔ البتہ قرآنی حکم کے مطابق ایک خلیفۃ الرسول کے بعد کسی فرد کی اطاعت ضروری تھی۔ جو قائم مقام کی حیثیت میں۔ خلیفۃ الرسول کے بعد اس مقام و منصب کو پورا کرے۔ جسکے لیے اس قرآنی حکم کے تحت۔ ایک قائم مقام خلیفۃ الرسول کی اطاعت کو لازم سمجھا گیا۔ جو ہر زمانہ میں امت مسلمہ کی راہنمائی۔ اور اجرائے قرآن کی صفات سے متصف۔ ومنتخب ہوتا۔ چنانچہ قرآن نے اس انتخاب کا ذکر کیا۔ اَطِیۡعُوا اللّٰہَ۔ وَاَطِیۡعُوا الرَّسُوۡلَ۔ وَاُولِی الۡاَمۡرِ مِنۡکُمۡ۔ ایسے منتخب افراد اصحاب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے منتخب ہوئے۔ جیسے حضرت عمرؓ۔ حضرت عثمانؓ۔ حضرت علیؓ وغیرہ خلیفۃ الرسول میں سے ہوئے۔ البتہ اجرائے قرآن وحدیث۔ ان حضرات خلفاء کا واحد مقصد رہا جس میں سوائے احکام قرآنی۔ اور احکام رسول اللہؐ۔ الدین الاسلام میں۔ کسی دوسرے کے حکم کو تسلیم وقبول نہ کیا گیا۔ البتہ قرآنی حکم کے مطابق لازم ہوا۔ کہ اولی الامر کی حیثیت میں۔ امت محمدیؐ میں۔ منتخب اصحاب خلیفۃ الرسول بھی۔ قرآنی حکم ___ رسول اللہؐ کے ذاتی وضع کردہ حکم کی اطاعت کے بعد یعنی رسول اللہؐ کے بعد۔ ایک راہنما۔ ایک ہادی کیلئے۔ قائم مقام کی حیثیت میں الدین الاسلام ___ جسکا اللہ تعالیٰ نے فَاِمَّا یَاۡتِیَنَّکُمۡ مِّنِّیۡ ہُدًی کے وعدے میں اظہار کیا۔ یعنی الدین الاسلام کی حیثیت میں قرآن کی شکل میں دیئے گئے احکام۔ جنکا رسول اللہؐ اجرا کرتے تھے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات اقدس کے بعد آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے خلفاء (خلیفۃ الرسول) اس حکم الٰہی کا اجراء کریں گے۔ اولی الامر سے خاص مراد۔ کہ ایک رسول کے قائم مقام۔ بھی حکم الٰہی کا ہی اجرا کرنے والے ہوں گے۔ اسکے ساتھ مَآ اٰتٰکُمُ الرَّسُوۡلُ کے حکم کے مطابق۔ ایک رسول جو اپنی طرف سے حکم کرے اسکو بھی تسلیم کیا جائے۔ یہی مطلب اَطِیۡعُوا اللّٰہَ۔ اللہ کے حکم کی تعمیل سے ہے۔ اور وَاَطِیۡعُوا الرَّسُوۡلَ سے بھی۔

رسول کے حکم کی تعمیل کرنا مراد ہے۔اب قرآن نے الدین الاسلام کے قیامت تک جاری رہنے کے لیے۔امت محمد رسول اللہؐ میں منتخب افراد (اصحاب) کی اطاعت اس غرض سے قائم کی۔ ہر موقع۔ ہر زمانہ میں امت محمد رسول اللہؐ میں اولوالعزم۔علمائے امت کا وجود ہوگا۔ جنکے ذریعہ الدین الاسلام ـــ صرف الدین الاسلام یعنی قرآن وحدیث کا رائج علم قیامت تک جاری رہیگا۔جس میں خالص تصور۔علمِ الٰہی۔اور ہدایتِ رسول اللہ۔پر عمل کیا جائیگا۔ہاں یہ خیال رہے۔کہ اس عمل کو الدین الاسلام ہی ہر زمانہ میں موسوم کیا جائیگا۔جس میں سوائے۔عبادات۔نماز۔روزہ۔زکوٰۃ۔تہجد کے اور کوئی فروعی علم وعمل شائع شامل نہ ہوگا۔یہی صورت الدین الاسلام [1] کی ہوگی۔

---

[1] حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد۔اس الدین الاسلام کے اجرا کیلئے از روئے قانون شریعت۔حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کو۔خود ایک رسولؐ نے منتخب کیا۔اس بناً واصول شریعت پر۔خلافت کیلئے۔شرائط خلافت کے اصول وضع کیے گئے۔

(۱) ایک فرد امت۔قرآن۔حکمِ الٰہی کا (بحدِ کمال) علم رکھنے والا ہو۔

(۲) ایک فرد امت قرآن کے علم پر بحدِ کمال درک رکھنے والا۔اور اس پر بحد کمال عمل کرنے والا ہو۔

(۳) اجرائے قرآن وحدیث میں بحد کمال اعلیٰ صلاحیت کا حامل ہو۔

(۴) الدین الاسلام کی ہیئت مسلمہ کو بحدِ کمال قائم رکھنے والا ہو۔یعنی اجرائے قرآن وحدیث میں اعلیٰ تبلیغی صلاحیت رکھنے والا ہو۔

(۵) عوام المسلمین ـــ اور مخلوق خدا تک علم پہنچانے۔اور اس علم پر عمل پیرا ہونے کی بحد کمال ـــ بدرجہ اتم صلاحیت رکھنے والا ہو۔اس حال میں قرآن وحدیث کے علم پر بحدِ کمال عبور رکھتا ہو۔

ہاں یہی وہ اصول وشرائط مقرر ہیں۔جن پر الدین الاسلام کی اساس قائم ہوئی ـــ ان اصول وشرائط کی کمالیت کے بغیر کسی فرد کو خلیفہ۔خلیفۃ الرسول کے منصب پر فائز نہیں کیا جاسکتا ـــ اسلئے کہ خلیفۃ الرسول بمنزلہ اولی الامر کے ہوتا ہے۔بمطابق حکم قرآن۔ایسے فرد۔خلیفہ کا حکم ہر فرد امت کیلئے بلا دلیل قبول وتسلیم کیا جانا۔لازم ہے۔جسکا انکار ـــ حکم قرآنی سے انکار ـــ جسکا تسلیم حق کا تسلیم تصور کیا جاتا ہے۔جس سے انکار ـــ حق (قرآن) کا انکار تصور کیا جاتا ہے۔حضور صلے اللہ علیہ وسلم کی ذات اقدس سے ایک خلیفہ ـــ (باقی حاشیہ اگلے صفحہ پر)

لہذا۔ یہ واضح ہے کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت آدمؑ کے بعد۔ ہر زمانہ میں۔ ہر نبی کو منتخب کر کے اسی وعدہ فَاِمَّا یَاْتِیَنَّکُمْ مِّنِّیْ ھُدًی کے وعدہ کے مطابق۔ ہر نبی ورسول کے ذریعہ۔ محض عبادات ۔نماز۔روزہ۔زکوٰۃ کی صورت میں احکام بھیجے۔اور احکام کی صورت میں۔جو بھی احکام بھیجے قیامت کی نجات کیلئے صرف احکامِ عبادات بھیجے۔اسی بنیاد پر۔ ہر نبی کو محض الدین الاسلام کی صورت میں۔ اقتدارِ اسلامی عطا ہوا۔ یہاں تک کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی بعثت تک یہ سلسلہ اسی

(بقیہ حاشیہ گزشتہ صفحہ) حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کا انتخاب ہوا۔ کہ آپ تمام امتِ مسلمہ (مخلوقِ انسانی) میں۔ ہر شرائط خلیفہ کے اعتبار سے افضل الخلائق قرار دیئے گئے۔لہذا اولی الامر کی حیثیت سے آپکا ذاتی حکم بھی واجب التسلیم ہوتا ہے۔لیکن حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے خالص احکامِ قرآنی پر خلافت استوار کی۔اپنا حکم کسی موقع پر شامل نہ فرمایا۔ اسلئے کہ سب سے افضل قرآنی حکم کو ہی افضلیت دی جاتی ہے۔ جیسے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے قرآنی احکام کا ہی نفاذ فرمایا۔اور اپنا ذاتی حکم نزول قرآن کے مقابلہ میں۔صرف راہنمایانہ طور پر استعمال فرمایا۔جیسے قرآن نے عبادات کی صورت میں وَاَقِیْمُوا الصَّلٰوۃَ کا مجمل حکم دیا۔مگر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اس حکم پر ـــــ اجتہادِ نبوت سے۔اس الصلوٰۃ کی تشریح فرمائی۔ جس میں تمام ارکان صلوٰۃ میں آپؐ ہی کا حکم جاری ہوتا ہے۔" اس کے بعدِ مابعد زمانہ" مخلوقِ انسانی۔ یا امت مسلمہ میں اگر حکم رسول اللہ سمجھنے میں دشواری پیدا ہو۔تو آپ کے خلیفہ چونکہ قرآن وحدیث کے علم پر (سمجھنے میں) عبور رکھتے ہوں۔تو ایسے مقام پر خلیفۃ الرسول کے حکم کی تقلید واتباع سے ہی حکم قرآنی کی تکمیل کامل ہوتی ہے۔اس عمل کو اجتہاد ـــــ یا فقہ سے تعبیر دیا جاتا ہے۔ہاں! یہ عمل صرف الدین الاسلام ـــــ شریعت ـــــ اور حکم قرآن وحدیث کی تعمیل میں لائق عمل ہوتا ہے۔جو صرف الدین الاسلام میں۔اتباع شریعت۔عبادات۔اصلاح نفس کے لیے استعمال کرنا لازم ہوتا ہے۔البتہ اللہ تعالےٰ نے اس حکم۔فَاِمَّا یَاْتِیَنَّکُمْ مِّنِّیْ ھُدًی کا حضرت آدمؑ سے وعدہ کیا تھا۔کہ جب مخلوقِ انسانی۔گمراہی۔نافرمانی۔قتل وغارت گری میں اپنے منصبِ انسانیت سے گر کر لائق جہنم (قیامت میں) ہو جائے۔تو اسی مقام سے محروم ہونے پر اللہ تعالیٰ نے فَاِمَّا یَاْتِیَنَّکُمْ مِّنِّیْ ھُدًی کا وعدہ کیا تھا۔جسے حکم الٰہی ـــــ قرآن سے موسوم کیا گیا۔لہذا سمجھو قرآن کا ہر حرف۔انسان کی ہدایت۔اور مرتبۂ انسانی پر۔دوبارہ فائز ہونے پر ہر عبادت کی تکمیل کرنی ہے۔جس میں کسی دنیوی فروعی عمل کا تصور قائم نہیں ہوسکتا۔کیونکہ اللہ نے ہی فرمایا۔وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْاِنْسَ اِلَّا لِیَعْبُدُوْنِ۔(لیعرفون) (باقی حاشیہ اگلے صفحہ پر)

حال میں جاری رہا۔اس حال میں کہ۔ان نبیوں اور قوموں کو دنیوی بادشاہتیں حاصل ہوتی رہیں۔جو اسی الـدیـن کے نام سے قائم رہیں۔لیکن یہ واضح ہو۔کہ اس اقتدار میں۔ الـدیـن الاسـلام کی ہیئت ایک شرعی ہیئت رہی۔اور اقتدار اعلیٰ میں دنیوی حیثیت بھی الگ حالت میں قائم رہی ـــ جو احکام الٰہی سے سوا۔حکومتوں کے سربراہوں یا قانونی دانشوروں اور علماء کے ذریعہ وضع ہوتے رہے۔یعنی سلطنتیں چونکہ الـدیـن الاسلام میں شامل نہ تھیں۔اسلئے۔ایسے نظام کیلئے۔الٰہی احکام کا نزول لازم نہ

(بقیہ حاشیہ گزشتہ صفحہ)

لازم ہے۔کہ فطری طور جب مخلوقِ انسانی میں۔معرفت الٰہی۔عبادات میں۔حصول دنیا میں رغبت کی وجہ سے۔کوتاہی آنے لگے۔تو بمطابق حکم قرآنی۔انسان قتل وغارت گری۔اور حرص و ہوا پر مائل ہو کر۔اپنی صفاتِ انسانی سے محروم ہو جاتا ہے۔اسی مقام پر اللہ تعالیٰ نے وعدہ دیا۔کہ جب انسان حصولِ دنیا میں ایک دوسرے کے دشمن بنیں گے۔تو میں ایک ہدایت بھیجوں گا ـــ یہ ہدایت کلام الٰہی (قرآن) اور کلام کے ساتھ ایک ہادی (محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم) کی ذاتِ اقدس تھی۔ظاہر ہے۔اس اصلاحی۔دینی عمل میں گمراہ۔باغی مخلوق کا خاتمہ ضروری تھا۔تو طاغوتی طاقتیں۔الـدیـن اسلام کی مخالفت میں۔اسلام کو مٹانے کی کوشش میں۔اہل اسلام سے برسرِ پیکار ہو گئیں۔جسکے نتیجہ میں۔ایک رسول کے عمل میں ـــ اجرائے دین ـــ سے علاوہ۔طاغوتی قوتوں سے دفاع کیلئے اپنی مادی قوت کا استعمال۔اور مادی قوت کا حصول لازم ہوا۔جسے الـدیـن الاسـلام کے اجرا کے ساتھ اقتدار اعلیٰ کی قوت کہا جاتا ہے۔یہ ایک اضافی عمل (تصور) الـدیـن الاسلام ئیں لازم وقائم ہوا ـــ اور یہ عمل الـدیـن الاسلام میں باطل قوتوں کے دفاع۔اور جہاد میں لازم رکھا گیا۔کہ الدین الاسلام کی حفاظت کے لیے اقتدار اعلیٰ کو ضروری سمجھا گیا۔تاکہ اجرائے الـدیـن الاسـلام ـــ اجرائے قرآن وحدیث کے لیے راہ ہموار اور آسان ہو کر مخلوقِ الٰہی تک بغیر کسی مزاحمتِ کفار۔الـدیـن الاسـلام۔کا عمل جاری ہو سکے۔اس مقام پر کفار کی مزاحمت اور جنگ وجدل سے۔اجرائے الدین الاسلام میں ایک لازمی عمل کا اضافہ ہوا۔

الـدین الاسلام میں ابتدائے اجرائے احکام الٰہی وعبادات میں۔ابتداء سے ہی حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی تبلیغ پر کفار مکہ نے اس اجرائے دین کی شدید مخالفت کی۔جسکے نتیجہ میں خود حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی ذاتِ اقدس سے اس اقتدارِ اعلیٰ کی ابتدا ہوئی۔یہ ابتداء حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے عہدِ رسالت سے ہی ہوئی۔(باقی حاشیہ اگلے صفحہ پر)

تھا۔ البتہ۔ ایسے قوانین اور احکام کی حصول دنیا کیلئے ضرورت تھی۔ اسلئے ہر زمانہ میں۔ ہر قوم کیلئے وقت کی ضرورت کے تحت دنیوی امور میں ردو بدل ہونا لازمی تھا۔ اسلئے ایسے قوانین وقت اور قوموں کی ضرورتوں کے مطابق احکام وضع کرنے کی ضرورت رہی ـــــ ہاں یہ امر قابل غور ہے۔ کہ اقتدار اعلیٰ (سلطنت) چونکہ الـــدیـــن الاســـلام کے دفاع کیلئے ضروری تھا۔ اسلئے۔ اقتدار اعلیٰ کو اقتدار اسلامی کی صورت میں۔ الـدین الاسلام میں شامل کیا گیا۔ اس حال میں کہ اسی اقتدار اعلیٰ کی قوت پر۔ الـدین الاسلام کا اجراواشاعت منحصر رہی۔ اسلئے اقتدارِ اسلامی کے نام سے محسوس کیا گیا۔ لیکن قوانین الٰہی جو الدین الاسلام کیلئے ضروری تھے۔ انکا نفاذ دنیوی حیثیت میں الدین الاسلام کی

(بقیہ حاشیہ گزشتہ صفحہ) جسکے لیے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اولین معرکہ بدر میں۔ کفار مکہ کے ساتھ اقتدارِ اعلیٰ کو استعمال کیا ـــــ لیکن اس معرکہ کے شکست وفتح کے نتیجہ میں۔ فتح کی صورت میں۔ اقتدار اعلیٰ کو استعمال نہ فرمایا۔ کہ اپنی ذات سے۔ کسی مملکت یا سلطنت کی شکل میں۔ نفاذ فرماتے۔ سوائے اسکے کہ مدینہ کو اپنا مسکن بنا کر اجرائے قرآن و سنت میں الـدیـن الاسلام کو وسعت فرمائی۔ کہ بیشتر مکہ ومدینہ کے لوگوں نے الـدیـن الاسلام قبول کر کے۔ اسلامی اصول وضابطۂ ہدایت پر۔ عبادات اور تعلیم قرآنی پر عمل کیا ـــــ البتہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کیلئے اجرائے الدین الاسلام میں اقتدارِ اعلیٰ کی تشکیل کا عمل شامل ہونا ضروری ہوا۔ کہ اجرائے الدین الاسلام (تبلیغ قرآن) کیلئے۔ کفار کی طرف سے کسی مزاحمت ومخالفت کا موقع نہ آئے۔ جسکے لیے اقتدارِ اعلیٰ کی شکل میں ایک دفاعی حیثیت حاصل کرنا ضروری ہوا۔ چنانچہ دفاعی حیثیت میں۔ کفار مکہ کی لشکرکشی سے۔ اہل اسلام۔ اور اجرائے الـدیـن الاسلام کا خاتمہ ہونا۔ باطل قوتوں کا غلبہ حاصل کرنا تھا۔ اس جنگ وجدل کے نتیجہ میں۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم (اہل اسلام) کی مادی قوت سے اقتدار اعلیٰ کی قوت نے۔ ایک سلطنت (یا حکومت) کی شکل اختیار کی۔ اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی رحلت کے بعد۔ خلفائے اسلام۔ اور امت مسلمہ میں۔ اطاعت واتباع میں قرآن وحدیث کے احکام سے استفادہ حاصل کیا جانا لازم تھا۔ لیکن اقتدارِ اعلیٰ میں کفار کی مزاحمت شدید ہوگئی۔ جسکے لیے اب امت مسلمہ کیلئے اجرائے قرآن وحدیث۔ اور دفاعی حیثیت میں اقتدارِ اعلیٰ کو وسعت دینی تھی۔ جسکے نتیجہ میں اقتدارِ اعلیٰ نے سلطنت کی حیثیت اختیار کی۔ اسلئے کہ اجرائے قرآن وسنت کیلئے۔ باطل قوتوں کی جنگ ویلغار کی وجہ سے اجرائے قرآن وسنت اور مخلوقِ انسانی کیلئے راہیں کشادہ کرنا ضروری تھا۔

عبادات پر ہی ہوسکتا۔ اور اقتدار اسلامی پر موزوں نہیں ہوسکتا تھا۔

اللہ تعالیٰ نے قرآن میں اس عمل کو مقصدِ انسانی میں واضح کر دیا۔ جو انسان کی زندگی کا واحد پیدائشی مقصد ہے۔ فَاِمَّا یَاْتِیَنَّکُمْ مِّنِّیْ ھُدًی ۔ جب عدم تعمیل عبادات سے انسان آپس میں فساد و خونریزی پر اتر آئیں گے (تو ملائکہ کا قول پورا ہوگا) تو میں عبادات کی صورت میں اپنی کلام ایک رسول (محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم) کے ذریعہ مخلوقِ انسانی کو احکام کی صورت میں بھیجوں گا۔ یہی۔ ایک حکم ہے جس میں عبادات اصل عمل ہے۔ اسی عمل کو الدین الاسلام سے منسوب کیا جاتا ہے۔ گویا۔ دین الاسلام (الدین الاسلام) اسلام کی روح قرار دی جاتی ہے۔ اور جب الدین الاسلام پیش کیا جاتا ہے۔ تو اس میں عبادات۔ نماز۔ روزہ۔ زکوٰۃ۔ حج اصل عمل و مقصد ہوتا ہے۔ اور یہ جو رسول کے ذریعہ پیش کیا جاتا ہے۔ یہ امر منصوبۂ الٰہی میں شامل ہے۔ کہ اللہ کے احکام مخلوقِ انسانی کی تعمیل کیلئے ایک رسول کے ذریعہ پیش کئے جائیں۔ ایک منتخب رسول کے ذریعہ اللہ کے احکام پیش کرنا۔ رسول کے ذریعہ۔ الدین الاسلام۔ یا رسالت سے موسوم کیا جاتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے جو الدین الا سلام کے احکام حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعہ تمام مخلوق کائنات (ارض) کیلئے بھیجے ان احکام کو ایک دین و شریعت (الدین الاسلام) کی صورت میں پیش کیا۔ ان احکام میں۔ بمطابق وعدہِ الٰہی فَاِمَّا یَاْتِیَنَّکُمْ مِّنِّیْ ھُدًی میں خالص عبادات۔ نماز۔ روزہ۔ زکوٰۃ۔ حج کی تعمیل کرنا ہے۔ اسکے سوا کچھ نہیں۔ یہی الدین الاسلام کی اصل ہے۔ جو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعہ۔ قرآن کی صورت میں نازل ہوا۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد رسالت میں۔ الدین الاسلام کی یہی حالت رہی۔ کہ نفاذ احکام۔ اجرائے قرآن محض الدین الاسلام کے اجرا کیلئے مخصوص تھا۔ اور جب کفار مکہ کی یلغار اور جنگ کا زمانہ شروع ہوا۔ تو تابعین رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو دفاعی ضرورت کیلئے۔ اقتدار حاصل کرنے کی ضرورت ہوئی ــــــ ہاں جب تک حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ظہور کا زمانہ رہا۔ تو صرف الدین الاسلام کے اجرا کو اولیت اور فوقیت رہی۔ گو آپؐ کے زمانہ میں کفار مکہ کی لشکر کشی (اسلام کی

قوت و وسعت کو ختم کرنے کی غرض سے) شروع ہوئی ــــ تاہم اسلام کے اقتدارِ اعلٰی پر اتنی توجہ نہ رہی ۔ اور ہیئت مسلمہ کو الدین الاسلام کے تصور پر ہی سمجھا گیا ۔ بعد میں عہد خلفائے اربعہ ۔ حضرت ابوبکر صدیقؓ کے زمانہ میں ۔ اگر الدین الاسلام کی ہیئت بھی (جہاد فی سبیل اللہ کی صورت میں) قوی تر ہوتی گئی ۔ اور الدین الاسلام میں جہاد کو لازم قرار دیا گیا ۔ تو اقتدار اعلٰی کو بھی قوت حاصل ہوئی ۔ اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد رسالت سے ہی ۔ اسلام کو دنیوی حیثیت میں فتوحات حاصل ہوئیں ۔ تو الدین الاسلام میں ــــ اقتدار اعلٰی کی ہیئت بھی الدین الاسلام کی شکل میں ــــ خلافتِ اسلامی سے موسوم ۔ ایک سلطنت کی حیثیت میں نمایاں ہوئی ۔ یہی قوت بالآخر ۔ خلفائے اسلام کی خلافتوں میں ــــ خلافتِ اسلامی ــــ یا الدین الاسلام کی مشترک ہیئت میں خلافت اسلامی سے موسوم ہوئی ۔ جسے آج الدین الاسلام کی شکل میں سمجھا جاتا ہے ۔

حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے بعد حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے زمانہ میں خلافت اسلامی کو بے انتہا غلبہ و وسعت حاصل ہوئی ۔ یہ خیال رکھنا ضروری ہے ۔ کہ اسلام میں ۔ فوج کشی ۔ یا حکومتوں پر غلبہ حاصل کر کے زیر کرنا خاص مقصد نہ تھا ۔ سوائے الدین الاسلام کی وسعت و استحکام خلافت سے حاصل کیا گیا ۔ چونکہ دنیوی اقتدار اعلٰی کی یہی صورت ہوتی ہے ۔ کہ افراد یا شہنشاہوں ۔ قوموں کو مغلوب کر کے ۔ اسلام کے احکام کے تحت لا کر انہیں عبادات پر لانا ــــ اور ایمان الدین کے احکام پر عامل بنا کر دارالآخرت میں کامیاب زندگی اصل مقصد ہے ۔ لیکن قوموں ۔ یا مخلوق انسانی کو اپنے غلبہ میں لا کر آسان ہوتا ہے ۔ کہ کسی کو اپنی مرضی کا تابع بنا کر اسکی راہنمائی کی جائے ۔ اس حال میں ۔ کہ کسی فردِ انسانی کو کسی مقصد کے حصول میں ۔ اپنا محکوم بنا کر اپنی ذات کیلئے اسکو استعمال کیا جائے ۔ جبکہ اللہ کے نزدیک ایسا فعل گناہ اور بغاوت تصور کیا جاتا ہے ۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت پر قرآن اپنا ابتدائی حکم ۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعہ پیش کرتا ہے ۔ قُمْ فَاَنْذِرْ ۔ یا رسولؐ اس قوم کو عذاب جہنم سے ڈرائیں ۔ چنانچہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ۔ اپنے ابتدائی اقدام پر قوم کو کوہِ صفا پر بلا کر کہا ۔ قیامت (ہماری دو انگلیوں کے درمیان وقفہ)

نزدیک ہے۔ اللہ کے عذاب سے ڈرو یہی فرمان۔ الـدین الاسلام کی صورت میں پیش فرمایا۔ کیونکہ مقصدِ رسالت یہی تھا حضور کی تبلیغ واجرائے قرآن پر۔ کفار۔ باطل قوتوں نے۔ اجرائے الـدیـن الاسلام پر مزاحمت کی جسکے لیے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو الـدین الاسلام کے تحفظ و وسعت کیلئے۔ اپنا اقتدار اعلیٰ۔ اپنا تحفظ کرنا پڑا۔ گویا کفار کی مزاحمت کے مقابلہ میں اپنی۔ اسلامی۔ دینی قوت کوتقویت دینے کا ایک جامع منصوبہ مرتب فرمایا۔ کہ کفار کے مقابلہ میں۔ اپنی قوت۔ تلوار استعمال کرنی پڑی۔ جسے اقتدارِ اعلیٰ سے موسوم کیا گیا۔ اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ۔ عہد رسالت میں اسلام کی ایک وسیع قوت کی بنا پڑی۔ جو الدین الاسلام کی اشاعت وتبلیغ کے ساتھ۔ اشاعت اسلام میں شامل کی گئی۔ اس صورت میں۔ رسالت میں۔ تبلیغ و اشاعت کے ساتھ۔ اقتدارِ اسلامی کو شامل رکھنا پڑا جبکہ یہ عمل الـدیـن الاسلام کی جزو نہیں۔ بلکہ ضرورت کے تابع۔ اسلام کو یہ قوت شامل رکھنی پڑی۔ کہ اس اقتدارِ اعلیٰ سے تبلیغ اسلام میں۔ آسانی حاصل ہو۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات پر۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے۔ خود۔ اپنے بعد ایک خلیفہ (حضرت ابو بکر صدیقؓ) کا انتخاب فرمایا۔ اور اپنے قائم مقام اشاعت الدین۔ اور تحفظ الـدیـن الاسـلام کیلئے موزوں سمجھا اور آپکو امت مسلمہ کی راہنمائی کے لیے۔ ایک قائم مقام رسول۔ خلیفۃ الرسول کی حیثیت میں۔ بحیثیت خلیفۃ الرسول مقرر فرمایا۔ حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ نے وقت کے تقاضا کے مطابق۔ الـدیـن الاسلام کی اشاعت واجرائے قرآن میں۔ دین اسلام کی وسعت فرمائی۔ اور ساتھ ہی اقتدارِ اعلیٰ۔ اقتدارِ اسلامی کی مستحکم بنیاد رکھی۔ جس میں۔ اشاعت دین کے ساتھ۔ اقتدار اعلیٰ کو عظیم وسعت واستحکام حاصل ہوا گویا خلیفۃ الرسول کی حیثیت میں۔ الـدیـن الاسـلام کی وسعت وطاقت کے ساتھ۔ دونوں قوتوں اسلام اور اقتدار اعلیٰ کو ترتیب فرمایا۔ اسطرح اشاعتِ دین کے ساتھ۔ اقتدارِ اعلیٰ کو ایک سلطنت کی ہئیت حاصل ہوئی۔ گویا ایک خلیفۃ الرسول۔ اشاعت الـدیـن الاسلام۔ خلیفۂ سلطنت بھی قرار پائے۔ اس حال میں کہ اب اشاعت الـدین دو ہیئتوں میں وجود پانے لگی۔ یہ ایک اضافی عمل ہے جو الـدین الاسلام کے ذریعہ۔ اسلام میں شامل ہو

کر۔ خلافت اسلامی سے منسوب ہوا۔ حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کے دورِ خلافت میں۔ اشاعت الـدیـن کے ساتھ یہ دو الگ حیثیتوں میں۔ اجرائے قرآن (احکام الٰہی) عبادات کی صورت میں۔ اور اقتدارِ اعلٰے۔ ایک سلطنت کی شکل میں قائم ہوئے۔ اس حال میں کہ اشاعت اسلامی (قرآن) کیلئے۔ قرآنی احکام عمل میں لائے گئے۔ جس میں خصوصیت کے ساتھ۔ نماز۔ روزہ۔ زکوٰۃ۔ حج (ارکان دین) نیکی کی تلقین۔ گناہوں سے پرہیز لازم تھا۔ دوسری طرف۔ اقتدارِ اعلٰے کی ہیئت (سلطنت کی شکل میں) جس میں دنیوی نظام کی توسیع اور استحکام کے امور شامل تھے۔ یہ احکام الـدین الاسلام کی صورت میں۔ ضروری نہ تھا کہ احکام الٰہی کے تحت نماز۔ روزہ۔ زکوٰۃ کی شکل میں استعمال ہوتے ہوں۔ اسلئے کہ یہ امور و احکام دنیوی معاملات سے تعلق رکھتے تھے۔ جنکے لیے الٰہی احکام نازل ہونا ضروری نہ تھا۔ سوائے اسکے۔ خلفاء (خلیفہ اسلام)۔ یا دیگر اصحاب امت اپنی عقلی استطاعت سے۔ احکام وضع کریں۔

حضرت ابوبکر صدیقؓ کے زمانہ خلافت میں۔ الـدیـن الاسـلام کی قوت وسیع ہوتی گئی۔ یہاں تک کہ بہت سے ممالک الـدیـن الاسـلام (خلافتِ اسلامی) کے زیرِ تسلط آئے۔ جس سے الـدیـن الاسـلام میں۔ خلافت اسلامی۔ اقتدارِ اسلامی کی شکل میں وسعت پیدا ہوئی۔ اس زمانہ میں الـدیـن الاسـلام نے۔ سلطنت کی شکل میں۔ ایک سلطنت (حکومت) کی ہیئت حاصل کرلی۔ اس مقام پر خلافتِ اسلامی میں پیدا ہونے والے حقائق پر نظر رکھنا ضروری ہے۔ کہ خلافتِ اسلامی میں۔ ایک خلیفہ کا تقرر بمطابق شرائط خلیفہ (خلافت) ضروری ہوا۔ کہ ایک رسول کے قائم مقام میں کیا خصوصیات پائی جانی چاہیں۔ جنہیں شرائط خلافت سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ وہ یہ ہیں۔ خلیفہ کے لیے ضروری شرائط:

(۱) ایک فردِ امت مسلمہ کے لیے۔ قائم مقام ہونے میں۔ سب امت میں اعلٰے فرد ہو۔ جو قرآنی علم پر بحد کمال۔ بدرجہ اتم علم رکھتا ہو

(۲) ایک منتخب خلیفہ کیلئے ضروری ہے۔ کہ وہ افرادِ امت میں بدرجہ اولٰی قرآنی علم پر عمل کرنے والا ہو۔

متقی ہو۔

(۳) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے احکام (حدیث) پر اطاعت کرنے والا ہو۔

(۴) امور اشاعت دین۔ اجرائے قرآن وحدیث میں بدرجہ اولیٰ صلاحیت رکھنے والا ہو۔

(۵) امورِ سلطنت کی انجام دہی میں حکمران حیثیت۔ اعلےٰ صلاحیت رکھنے والا۔ تدبر وسیاست میں کامل ہو۔

(۶) محاسبہ الٰہی۔ یوم قیامت پر کامل یقین کے ساتھ۔ خوف رکھنے والا ہو۔

بغیر ان خصوصی شرائط کے کسی کو خلیفہ مقرر کرنے کا حق نہیں۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم چونکہ خود النبی۔ رسول تھے۔ اس خطاب کے ہوتے۔ خلیفہ کا لقب رسول کے لیے لازم نہ تھا۔ رسول اللہ خود اللہ کے احکام پر عمل کرتے اور لوگوں (مخلوقِ انسانی) تک اللہ کے احکام پہنچانے کے ذمہ دار تھے۔ کیونکہ اللہ تعالےٰ نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو خود رسول منتخب کیا تھا۔ اور آپؐ کے بعد رسول منتخب نہیں ہوسکتا۔ سوائے اسکے۔ کہ حضورؐ کی عدم موجودگی میں۔ آپؐ کے قائم مقام ایک فرد کا بحیثیت خلیفہ (خلف) انتخاب ہو۔ جسکے لیے شرائط خلافت کا ہونا لازم ہے۔ کہ اپنی ذات سے شرائط خلافت کا اہل ہو۔ اسکے ساتھ ہی ایسے فرد کی نشاندہی عام انسانوں کی عقلوں سے نہیں ہوسکتی۔ سوائے اسکے کہ ایک رسول تمام امت میں رسول کی حیثیت میں عقل کل کی خوبی رکھنے والا ہو۔ کسی اعلےٰ فرد کی خوبیوں کا موازنہ کر کے خلیفہ کا انتخاب لازمی ہے۔ چنانچہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے بذاتِ خود (ایک رسول کی حیثیت میں) حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کا ایک خلیفہ کے لیے انتخاب فرمایا۔ چنانچہ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کی خلافت میں سربراہی اظہر من الشمس ہے۔ کہ فی الواقع حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا انتخاب برحق اور صحیح انتخاب ثابت ہوا۔ حضرت ابوبکر صدیقؓ کے عہد خلافت میں اسلام کو تقویت حاصل ہوئی اور خلافت اسلامی (اقتدارِ اسلامی) کو وسیع سرزمین پر اقتدار حاصل ہوا۔ جس سے الدین الاسلام کو استحکام ووسعت حاصل ہوئی۔ اور الدین کی اشاعت کے ساتھ۔ آپکی اعلےٰ صلاحیتوں اور حکمرانؐ خصوصیت سے الدین الاسلام۔ اور خلافت اسلامی کو قوت

حاصل ہوئی کہ الدین الاسلام کو بھی اقتدارِ اعلیٰ حاصل ہوا۔

حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی خلافت میں۔ جبکہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات مقدس میں ہی اقتدارِ اعلیٰ کی ہیئت قائم ہو چکی تھی۔ مگر حضور ﷺ الدین الاسلام (قُمْ فَأَنذِرْ) اجرائے قرآن کیلئے مبعوث ہوئے تھے۔ اسلئے اقتدارِ اعلیٰ کی سلطنت کی ہیئت محسوس نہ کی گئی۔ اسی طرح حالات کے مطابق حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی ذات گرامی کو اقتدارِ اعلیٰ۔ سے قوت حاصل کرنی پڑی۔ لیکن آپؓ نے بھی حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی اقتداء منصبِ رسالت کی وجہ سے اقتدارِ اعلیٰ۔ یا حکمران حیثیت کے بجائے اپنا مطمع نظر الدین الاسلام کی قوت پر رکھا۔ اور آخر حضرت ابوبکر صدیقؓ کے بعد ایک خلیفہ اسلام مقرر کرنا ضروری ہوا۔ اسلئے حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے ذاتی انتخاب پر حضرت عمرؓ کا انتخاب ہوا۔ واضح ہو کہ اس عہد (صدیقی) میں۔ الدین الاسلام کی ہیئت میں۔ جبکہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے کلامِ الٰہی۔ فَإِمَّا يَأْتِيَنَّكُم مِّنِّي هُدًى کا وعدہ کے مطابق کلامِ الٰہی نازل ہونا۔ اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات اقدس کا بحیثیت رسول مبعوث ہونا اصل مقصد تھا۔ اللہ و رسول کے نزدیک کسی اقتدارِ اعلیٰ۔ کسی سلطنت۔ کسی دنیوی امارت کی تعمیر کا مقصد یا منصوبہ نہ تھا۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد رسالت میں۔ کفار کی بے جا مزاحمت کے نتیجہ میں اقتدارِ اعلیٰ کی ضرورت پڑی۔ تو یہ ضرورت مقصد رسالت میں لازمی نہ تھی۔ اسلئے۔ الٰہی احکام صرف الدین الاسلام کیلئے نازل ہوتے۔ نہ کہ اقتدارِ اعلیٰ کی تعمیر کیلئے۔ کیونکہ اقتدارِ اعلیٰ بھی الدین الاسلام کا جز بنا اسلئے الدین الاسلام۔ اور اقتدارِ اعلیٰ کو ایک ہی خلیفہ کے زیر اطاعت رکھا گیا۔ اسلئے ان ہر دو ہیئتوں کو خلافت اسلامی سے موسوم کیا گیا۔ جس میں احکامِ الٰہی۔ (قرآن و حدیث) الدین کیلئے مخصوص کئے گئے اور خلافتِ اسلامی کی دوسری جز۔ مملکت۔ سلطنت اسلامی کیلئے بھی احکام کا نفاذ لازمی تھا۔

احکام بغیر رسول کے خلیفہ پر نازل نہیں ہو سکتے۔ اسلئے ایک اولوالعزم خلیفہ باہمہ صفات اولیٰ مجاز تھا۔ کہ اپنی ذات سے خلافت اسلامی کی صورت میں اقتدارِ اعلیٰ کے استحکام و وسعت کے

لیے احکام وضع کرے۔ جنکا الدین الاسلام کے احکام پر کوئی اثر نہیں آسکتا ـــــ یہی وجہ ہے۔ کہ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے عہدِ خلافت میں۔ جبکہ الدین اسلام کی اشاعت میں اقتدار اعلیٰ کو زیادہ استعمال کرنے کی ضرورت رہی۔ آپؓ نے اقتدارِ اعلیٰ کی حیثیت سے خلافتِ اسلامی میں زیادہ تر اجتہادی ـــ احکامات جاری فرمائے۔ اس حال میں کہ الدین الاسلام کی ہیئت مسلمہ اس حال میں بھی نمایاں رہی ایسے احکامات بھی۔ چونکہ قرآن وحدیث رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے احکامات کی حد میں ـــ موزوں مناسب سمجھے جاتے تھے مگر چونکہ خلیفہ ابوبکر صدیقؓ کے عہد خلافت میں الدین الاسلام کی حیثیت دینی اس حال میں قائم اور نمایاں رہی اسلئے حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے بھی خلافتِ اسلامی میں اسلام کی ہیئت دینی کو برقرار رکھنے کی کوشش کی اس حال میں کہ اب خلافت اسلامی میں ہرقل۔ قیصر وکسریٰ اور دیگر عظیم بادشاہتیں فنا ہو کر۔ اسلام کے زیرنگیں آ چکی تھیں۔ جنکا انتظام ملکی اب خلافت اسلامی کے ذمہ آچکا تھا ـــــ واضح ہو کہ مخلوقِ انسانی کا دین میں شامل ہونا۔ اس امر کا ذمہ دین کیلئے نہیں۔ کہ تابعین کے روٹی۔ کپڑے۔ رہائش الدین کے ذمہ ہو۔ الدین کی ذمہ داری سوائے اسکے نہیں۔ کہ بھٹکی انسانیت کو فَاِمَّا یَاْتِیَنَّکُمْ مِّنِّیْ هُدًى۔ کلام۔ احکامِ الٰہی سے قیامت میں نجات دلا کر جنت کا حقدار بنایا جائے۔ بس۔ بقیہ امور دنیوی خود انسان کے اپنے ذمہ ہیں ـــ اقتدارِ اعلیٰ ایک فرد۔ ایک قوم کو اپنا مطیع بنا کر اس کی ہدایت ونجات کا ذمہ دار ہوتا ہے ـــ مگر اقتدار وقوت سے غلبہ حاصل کرنے میں۔ ایک انسان کے ارادے۔ خواہشات پر بھی قابض ہوا جاتا ہے۔ کہ اپنی ضروریات زندگی کے حصول میں۔ انسان غیر اختیاری ہو جاتا ہے۔ تو لازم ہے۔ ایسے شخص پر قوت غلبہ ہونے کی صورت میں اسکی ضروریات زندگی۔ اسکی خواہشات پوری کرنے میں۔ غالب قوت۔ غالب طاقت ذمہ دار ہوتی ہے۔ کہ اسکی ضروریات پوری کی جائیں۔ جسکے لیے ایک غالب حکومت۔ یا سربراہ حکومت (یا خلیفہ) ہر انسان کی ضروریات پوری کرنے کا ذمہ دار ہوتا ہے خاص کر ایک ذمہ دار۔ سربراہِ حکومت قوم۔ اور مخلوق کی ضروریات پوری کرنے کا قدرتی طور ذمہ دار ہوتا ہے۔ اسی تصور پر خلافت اسلامی میں۔ الدین الاسلام۔ یارسول

امت مسلمہ کی ضروریات کا ذمہ دار نہیں۔ کیونکہ ایسی صورت میں۔ انسان کو آزاد رکھا گیا۔ کہ وہ الدین الاسلام میں۔ داخل ہو یا نہ ہو۔ سوائے اسکے کہ عقلاً مخلوقِ انسانی کو ناجائز خواہشات پورا کرنے میں آزاد رکھا جائے۔ اس حال میں۔ کہ ایسے اعمال سے انسان اللہ کی اطاعت سے دور و انحراف کی صورت میں جہنم کا حقدار بن جائے۔ وہ اگر اپنی عقل سے حق کو نہ سمجھے۔ بہ جبر۔ اسے حق کے دائرے میں لا کر لائق جنت بنا دیا جائے۔ ایسا عمل و فعل دائرہ اسلام میں۔ کسی فرد کیلئے باعث نجات ہو سکتا ہے۔ البتہ۔ ماسوائے الدین الاسلام تب تک جائز نہیں ہو سکتا جب تک کہ اسکا عمل۔ الدین الاسلام کے اصول پر انسان کے نجات کا ذمہ نہ لینے کی صورت میں۔ اگر انسان کے حقوق پورے نہ کئے جائیں۔ ایسی حکومت ایسا غلبہ۔ جبر و ظلم کے مترادف ہوگا۔ جسکے لئے ایک حکومت۔ ایک سربراہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک مجرم ہوگا۔ کہ اللہ کے بندوں کو ظلم کی قوت سے اپنا مطیع بنائے اور انکے حقوق پورے نہ کرے۔

حضرت عمر فاروقؓ کا زمانہ۔ عہد خلافت۔ اسلام میں قوت کے اعتبار سے انتہائی سربلندی اور عروج کا زمانہ سمجھا جاتا ہے۔ جنکی خلیفانہ صلاحیتوں سے۔ الدین الاسلام۔ عظیم وسعتوں تک پہنچا۔ اور اقتدار اعلیٰ کی قوت نے عرب کی عظیم سلطنتوں کو زیر کر کے۔ خلافت اسلامی (الدین الاسلام۔ اور اقتدار اعلیٰ) کے زیر کر دیا۔ اللہ تعالیٰ نے اسلام کو حضرت عمرؓ کے طفیل عزت و عروج بخشا۔ اسی خلافتِ اسلامی کا آپؓ کو سربراہ بنایا۔ یہ خیال رکھنا لازم ہے۔ کہ اسلام کی کس اولوالعزم ہستی کو منتخب کیا گیا۔ یہ انتخاب ایک فرد کا امت مسلمہ میں ایک متقی۔ صاحب علم۔ صاحب عمل ہستی کے اعتبار سے کیا گیا۔ جنکی ہر طور اہلیت و صلاحیت مسلم تھی۔ یہ انتخاب از روئے شریعت۔ شرائط دینی ــــ شرائط خلافت کے تحت ہوا۔ لہذا۔ اس ہستی کے مقابلہ میں کسی اور ہستی۔ یا امتِ مسلمہ کا انتخاب جائز نہیں ہو سکتا۔ ایسی صورت میں۔ خلافتِ اسلامی میں انتخاب کی دو نوعیتیں واضح تھیں۔ کہ بحیثیت خلیفۃ الرسول۔ ایک خلیفہ کیلئے شرائط دینی کی رُو سے۔ ایک عالمِ امت۔ جو قرآن کا تمام امت میں اکمل علم رکھتا ہو۔ اور قرآن و حدیث پر بدرجہ اولیٰ عمل کرنے والا۔ ہونا لازمی تھا۔ اور اللہ و رسول کی اطاعت

کرنے والا ہو۔جیسا قرآن نے واضح کیا کہ اَطِیۡعُوا اللّٰہَ ___ اور ایک ہادی۔سر براہ کی حیثیت میں رسول کے احکام کی اطاعت لازم ہے۔مَآ اٰتٰکُمُ الرَّسُوۡلُ فَخُذُوۡہُ ہے۔اللہ کے حکم کے ساتھ۔اللہ کے احکام پر عمل کرنا۔رسول کے ذریعے ہوتا ہے۔لہذا دین کی ہدایت پر عمل کرنے میں رسول کی اطاعت کرو۔اور رسول کی وفات کے بعد رسول کے منتخب فرد کی اطاعت کرو۔کیونکہ انتخابی عمل کے لحاظ سے۔خلیفۃ الرسول کی اطاعت سے۔اللہ و رسول کے احکام کی تعمیل میں ایسے منتخب فرد کی راہنمائی بہتر ہوسکتی ہے ایسے فرد کو قرآن نے اولی الامر کے خطاب سے پکارا۔کہ ہدایت و راہنمائی کے لیے صاحب امر کی اطاعت لازم رکھی گئی جس سے مراد۔اَطِیۡعُوا اللّٰہَ۔ وَاَطِیۡعُوا الرَّسُوۡلَ وَاُولِی الۡاَمۡرِ مِنۡکُمۡ یہ اطاعت محض الدین الاسلام کیلئے۔قرآن وحدیث کیلئے مخصوص کی گئی۔کہ رسول کے ذریعہ ہی اللہ کا حکم میسر ہوسکتا ہے اور رسول کی منتخب حیثیت اللہ کی طرف سے ہوتی ہے۔اسلئے اللہ و رسول کے احکام پر عمل اور اطاعت ضروری ہوتا ہے۔رسول کی وفات کے بعد اللہ کا حکم حاصل نہیں ہوسکتا۔نہ رسول کے احکام حاصل ہوسکتے ہیں۔لہذا رسول کے بعد ایک صاحب علم ہستی۔اگرچہ اللہ و رسول سے احکام حاصل نہیں کرسکتی۔مگر ایسی ہستی پر (روحانی طور) ایک تو اللہ و رسول کے احکام القا ہوتے ہیں۔دوسرے ذاتی طور یہ ہستی اپنی قابلیت پر قرآن وحدیث کی روشنی میں احکام مرتب کرسکتی ہے۔جو عین شریعت کے مطابق ہوتے ہیں۔لہذا الدین الاسلام۔اجرائے قرآن وحدیث میں ایسے فرد کی اطاعت لازم ہے۔ایسے فرد کی سربراہی شرائط دین کے مطابق ہوتی ہے۔اور جب الدین الاسلام میں ___ خلافت اسلامی (حکومت اسلامی) شامل ہو۔اور خلافت اسلامی کے اجرا کی وسعت لازم ہو۔تو شرائط دینی کے مطابق۔اجرائے سلطنت۔رسول کی وفات کے بعد احکام نہ حاصل ہونے کی صورت میں۔ایک خلیفہ۔ذاتی طور (اعلیٰ صلاحیت کی بنا پر) علمی حیثیت میں اجتہادی صورت میں خود ذاتی احکام کا اجرا کرنے کا مجاز ہوتا ہے۔کہ سوائے نازل شدہ احکام الٰہی کے۔خلافت اسلامی میں محض دنیاوی (حکومت کے) امور کیلئے احکام جاری کرسکتا ہے۔جس سے حکومت کو استحکام و تحفظ ہو اس حال میں۔کہ عوام المسلمین کو اجرائے قرآن وحدیث کی روشنی میں علم فراہم ہوسکے۔یہی الدین

الاسلام کی ہیئت مسلمہ۔خلافت اسلامی سے تعبیر ہوتی ہے۔

حضرت ابو بکر صدیقؓ کی وفات پر آپؓ نے خلافت اسلامی کیلئے حضرت عمرؓ کا ذاتی طور انتخاب فرمایا۔ کہ اپنے قائم مقام خلیفہ منتخب کیا لہذا اصول شریعتِ اسلامی کے تحت انتخاب خلیفہ میں۔ شرائط دینی کا ایک ضابطہ مرتب ہوا۔ کہ اللہ تعالیٰ خود ایک رسول کا انتخاب کرتا ہے۔ اور رسول کے بعد۔ رسول کی موجودگی میں رسول خود ایک خلیفہ ــــ قائم مقام کا انتخاب کرنے کا مجاز ہے جیسے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت ابو بکر صدیقؓ کا بحیثیت قائم مقام خلیفہ انتخاب فرمایا۔ امت مسلمہ میں کسی فرد سے انتخاب ہونا جائز و لازم نہیں ــــ اور خلیفہ کے بعد خلیفہ اپنی زندگی میں امت مسلمہ کے کسی اولوالعزم کا بحیثیت خلیفہ انتخاب کرنے کا مجاز ہوتا ہے جیسے حضرت ابو بکر صدیقؓ نے خود حضرت عمرؓ کا انتخاب فرمایا یعنی خلیفہ ہی خلیفہ منتخب کرنے کا مجاز ہوتا ہے۔ لہذا خلیفہ مقرر کرنے کا یہ ایک شرعی ضابطہ مرتب ہوتا ہے۔ ایسے موقع پر شرائط دینی۔ شرائط خلافت کے ضوابط میں۔ ہر دو نوع۔ الــــدیــــن الاســـلام ۔اور خلافت اسلامی کے لیے ایک ہی خلیفہ مقرر ہوتا ہے۔ البتہ احکام پر عمل دو صورتوں سے ہوتا ہے۔ ایک الــدیــن الاسلام میں اطاعت کے لیے قرآن و حدیث و فقہ (احکام خلیفہ) پر مکمل عمل ہوتا ہے۔ کہ یہ احکام محض اجرائے دین اجرائے قرآن کیلئے اللہ کی طرف سے مقرر ہوتے ہیں۔ جن میں قیامت تک کسی ترمیم و اختلاف کا موقع نہیں ہوتا۔ سوائے اسکے کہ خلافت اسلامی میں۔ امور سلطنت میں۔ دنیوی معاملات میں احکام قرآنی۔ احکام الٰہی پر عمل نہیں کیا جا سکتا۔ لہذا اکثر مواقع پر مختلف قسم کے مختلف معاملات میں الٰہی حکم نہ نازل ہو سکتا ہے نہ کوئی رسول میسر آ سکتا ہے۔ جسکے ذریعہ احکام نازل ہوں۔ اسلئے ایک اولوالعزم ہستی کے فہم و تدبر سے وقت کے تقاضوں کے ساتھ۔ (خلیفہ سے) احکام صادر کیے جاتے ہیں جو امور سلطنت (خلافت اسلامی) کے لیے کارآمد ہوتے ہیں اور جن سے خلافت اسلامی کا نظام قائم ہو سکتا ہے۔

حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے عہد خلافت میں۔ اقتدار اعلیٰ سے بیشتر ممالک اور شہنشاہوں کو زیر کر کے خلافت اسلامی میں شامل کیا گیا تھا۔ اسلئے ایسے ممالک میں اقتدار اعلیٰ کا نظام

قائم ہونا ضروری تھا جن میں الـدیـن الاسلام کا اجرا بھی کرنا تھا۔ایسی صورت میں۔جب خلافت اسلامی میں اقتدارِ اعلیٰ کی ہیئت شامل کی گئی تو۔خلافتِ اسلامی میں۔احکام الٰہی کے نفاذ کے ساتھ خلافت اسلامی کیلئے بھی احکام وضع کرنے ضروری تھے۔جو ایک خلیفۃ الرسول۔(منتخب خلیفہ) کے ذریعہ نافذ ہوں۔اسلئے ایسے موقع پر خلیفہ اسلام کیلئے۔اجتہادی صورت میں اپنے وضع کردہ احکام جاری کرنا ضروری تھا۔اسلئے کہ اب الـدیـن الاسلام کی ہیئت مسلمہ کے استحکام و وسعت کا مدار۔اقتدار اعلیٰ کی قوت پر منحصر تھا۔ایسی صورت میں ایک خلیفہ (بحیثیت اولی الامر) اجتہاد کی صورت میں ذاتی احکام نافذ کرنے کا مجاز ہوسکتا ہے۔اسلئے کہ خلیفہ کے احکام۔الـدین الاسلام کے لیے الٰہی احکام قرار نہیں دیئے جاتے۔سوائے اسکے کہ خلیفہ کے وضع کردہ احکام۔خواہ وہ عبادات (الـدین) کی حیثیت میں ہوں۔یا خلافت اسلامی کے استحکام کیلئے ہوں۔خلافت اسلامی کیلئے استعمال کئے جاسکتے ہیں ـــــ حضرت عمرؓ کے بعد اب ایک خلیفہ کی ضرورت رہی۔آپکے قائم مقام کا انتخاب۔شرائط دینی کے تحت ہوتا ہے جس میں ایک خلیفہ کیلئے۔سب سے اعلیٰ عالم۔اور امت میں سب سے زیادہ اولیٰ علم حاصل کرنے والا۔متقی۔سنت نبوی پر مکمل عمل کرنے والا ہونا چاہیے۔لیکن اقتدارِ اعلیٰ کی شمولیت سے ایک خلیفہ کیلئے چند اضافی خصوصیات کا ہونا لازم ہوا کہ خلیفہ زمامِ اقتدار سنبھالنے کیلئے مدبر۔سیاست دان حکمران ذہن و خصوصیت رکھنے والا ہوتا کہ خلافتِ اسلامی میں۔خلافت (حکومت) کے لئے تحفظ و استحکام بھی قائم رکھ سکے۔

جیسا کہ شرائط خلافت میں ایک خلیفہ (سابق) ہی نئے خلیفہ کا انتخاب کرسکتا ہے۔اسلئے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے بعد آپ سے ہی ایک خلیفہ منتخب کیا جانا لازم تھا۔لیکن اس زمانہ میں امت مسلمہ میں کئی اصحاب ایسے عالم موجود تھے جنکا خلیفہ ہونے کے لیے انتخاب ہوسکتا تھا۔ایسی صورت میں ان افراد کے درمیان خلیفہ کے ذریعہ انتخاب کرنا دشوار امر تھا۔اسلئے حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے چھ ایسے اصحاب کو انتخاب کے لیے نامزد کیا۔جن میں (۱) حضرت عثمانؓ (۲) حضرت علی کرم اللہ وجہہ (۳) حضرت عبدالرحمٰن بن عوفؓ (۴) حضرت طلحہؓ (۵) حضرت زبیرؓ (۶) حضرت سعد بن ابی

وقاصؓ۔ایسے اصحاب تھے جواس وقت خلافت اسلامی کے خلیفہ ہونے کے قابل تھے ـــــ ان اصحاب میں آپؓ نے ایک فرد کا انتخاب۔انہیں حضراتِ صحابہ کے ذمہ کیا۔ چنانچہ ان اصحاب نے متفقہ طور حضرت عثمانؓ کو خلیفہ اسلام منتخب کیا۔اور تمام امتِ مسلمہ نے۔حضرت عثمانؓ کے دستِ مبارک پر بیعت (بیعتِ خلافت) کی ـــــ بیعت خلافت سے مراد۔ایک خـلـیـفة الرّسـول کی اطاعت۔جو الدین الاسلام ۔شریعت۔میں خلیفہ منتخب ہو۔وہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے دین۔اجرائے قرآن کے لیے عوام المسلمین سے اطاعت کی بیعت لے۔جو اَطِیۡعُوا اللّٰہَ ـــــ وَاَطِیۡعُوا الرَّسُوۡلَ ـــــ کے حکم کے مطابق وَاُولِی الۡاَمۡرِ مِنۡکُمۡ۔ خلیفہ ءِرسول اللہﷺ کی اطاعت کریں۔اس حال میں کہ خلیفة الرسول خلافتِ اسلامی کے خلیفہ ہونے کی صورت میں۔اللہ ورسول اللہ کے احکام کے سوا۔ذاتی وضع کردہ احکام پر بھی امت مسلمہ سے اطاعت کرائے۔جو احکام۔استحکام حکومت میں ایک خلیفہ سے وضع کئے جائیں۔لہذا ضروری ہوا۔کہ حضرت عثمانؓ کے ذاتی وضع کردہ احکام بھی قبول وتسلیم کئے جائیں۔اس حال میں کہ اب حضرت عمرؓ۔خلیفة المومنین کے ذریعہ منتخب کردہ اصحاب کی حیثیت مجلس شوریٰ ہوئی اور آئندہ خلیفہ کی عدم موجودگی میں۔یا اگر خلیفہ سے انتخاب کرنے کا موقع نہ ہو۔تو مجلسِ شوریٰ کے ذریعہ۔خلیفہ کا انتخاب ہوگا۔اور منتخب خلیفہ کا حکم بحیثیت اَطِیۡعُوا اُولِی الۡاَمۡرِ مِنۡکُمۡ قابلِ تسلیم وقبول ہوگا۔اور خلیفہ سے صادر احکام پر کسی فرد کو اعتراض کرنے کی گنجائش نہ ہو۔

حضرت عثمانؓ کے عہد خلافت میں اب الـدیـن الاسـلام کے ساتھ اقتدار اعلیٰ بھی خلافت اسلامی میں شامل کیا گیا تھا۔تاکہ باطل قوتوں کی طاقتوں کے ساتھ مقابلہ کر کے انہیں شکست دیکر اجرائے قرآن وسنت کیلئے راہ ہموار کی جاسکے۔حقیقتاً یہ امر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے عہدِ رسالت سے شروع ہوا۔اور قرآن سے اس حکم کی تائید وَقَـاتِـلُـوۡھُـمۡ حَتّٰـی لَاتَـکُوۡنَ فِتۡنَة" وَّیَـکُـوۡنَ الـدِّیۡنُ کُلُّه' لِلّٰهِ ج (پارہ ۹ سورة ۸ آیت ۳۹)اور قتل کروان کفار کو یہاں تک کہ الدین الاسلام تمام مخلوقِ انسانی تک پہنچایا جائے ـــــ اس حال میں کہ عرب کی تمام قوموں تک حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعہ تعلیم قرآن وحدیث پہنچے ـــــ اور کسی کافر کو کسی قسم کی مزاحمت کی جراٴت نہ ہو

سکی۔ اور خلفاءِ اسلام۔ خلفاءِ اربعہ نے اپنی خلافتوں میں۔ اقتدارِ اعلیٰ کی قوت سے۔ تمام مخلوقِ انسانی میں غلبہ حاصل کرلیا۔

دورِ خلافت حضرت عثمانؓ میں۔ حضرت عمرؓ کی خلافت میں اقتدارِ اعلیٰ کی شمولیت سے۔ الدین الاسلام کی ہیئت ایک سلطنت کی ہوگئی۔ جس میں الدین الاسلام کے الٰہی احکام کے ساتھ خلفاءِ اسلام کے اجتہادی احکام کا بھی اجرا ہوتا رہا۔ اور حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے زمانہ خلافت میں۔ ایک وسیع مملکت۔ مملکت اسلامی کی ہیئت میں خلافت اسلامی کے قبضہ میں آگئی تھی۔ جسکے لیے ماسوائے احکام الٰہی۔ الدین الاسلام۔ ضروری تھا کہ حکومت کی حیثیت میں اجتہادی اصلاحات جاری کی جائیں۔ چنانچہ اس سلسلہ میں حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے وقت کے تقاضا کے مطابق اپنی طرف سے خلافت اسلامی کے آئین کی صورت میں۔ اپنے احکامات جاری کئے۔۔۔۔ ہاں۔۔۔۔ وقت کے مطابق۔۔۔۔ آپؓ کے جاری کردہ احکامات چونکہ سلطنت کی اصلاح کیلئے کئے گئے۔ جو قرآن وحدیث میں جاری نہ تھے حالاتِ زمانہ کے مطابق دورِ جدید میں حکومت کے استحکام کیلئے اجتہادی اصلاحات ضروری تھیں جس بنا پر امتِ مسلمہ نے ایسے احکامات پر اعتراض کا رویہ رکھا۔ چنانچہ حضرت ابوذر غفاریؓ کا حضرت عثمانؓ کے خلاف اعتراض اسی قبیل سے تھے۔ کہ آپؓ نے قرآن وحدیث کے احکامات سے سوا۔ اپنے احکام کے اجرا سے استفادہ کیا۔۔۔۔ لیکن یہ احکام الدین الاسلام کے اجرا کیلئے نہ تھے۔ بلکہ ان احکام پر غور کیا جائے۔ تو سنتِ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے قول وفعل کے مطابق۔ (محض اقتدارِ اعلیٰ کے استحکام کے مدنظر) یہ احکام اقتدارِ اعلیٰ سے تعلق رکھتے تھے۔ اور حضرت ابوذرؓ کا اعتراض بجا تھا۔ مگر جہاں تک الدین الاسلام کے اجرا کا تعلق تھا۔ جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی ذاتِ اقدس نے اقتدارِ اعلیٰ کے عمل کو اجرائے الدین الاسلام کے تحفظ و وسعت کیلئے (اجتہادِ نبوت میں) استعمال کیا۔ تو خلفاءِ اسلام کیلئے ایسا اجتہادی عمل جاری ہونا جائز تھا۔ البتہ اس امر کا خیال رکھنا ضروری ہے۔ کہ الدین الاسلام کا اجرا براہِ راست خلفاءِ امت پر منحصر ہے۔ اور جہاں قرآن وحدیث پر صرف خالص الدین الاسلام پر مدار رکھا جاتا ہے۔ اسکے ساتھ ایک

اضافی عمل جو اقتدار اعلیٰ سے متعلق ہو۔ خلفا کی صوابدید پر۔ چھوڑا جاتا ہے۔ جسکے لیے خلیفہ کی ذاتی ــــ خصوصی رائے ومشورہ اور مجلس مشاورت کی رائے تسلیم کی جاتی ہے ــــ اسی اصول پر حضرت عثمانؓ کے عمل پر غیر ضروری تنقید درست نہیں ہوسکتی۔ البتہ حالات کے مطابق خلافتِ اسلامی میں۔ شرعی حیثیت میں ہر فرد کو تنقید کا حق حاصل ہے۔ کہ ہر شخص بجائے خود شریعت کے خلاف کسی اقدام پر اعتراض کرسکتا ہے۔۔ جیسے حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے آگے ایک شخص نے۔ آپکے لباس پر اعتراض کیا جو تاریخ اسلامی کی ایک حقیقت بن گیا۔ اس موقع پر امت مسلمہ کے اولوالعزم ارباب کے نزدیک اسلام کے اجرا اور استحکام کیلئے۔ ذاتی خیال رکھنا لازم سمجھا جاتا ہے۔ اس سلسلہ میں امت مسلمہ کے ارباب فہم کے نزدیک الـدیـن الاسـلام کی حیثیت کو برقرار رکھنے میں مداخلت کرنا ــــ خلیفۂ وقت کی مخالفت کرنے کا بھی موقع فراہم ہوتا ہے ــــ وہ یہ کہ الـدیـن الاسـلام کی ہیٔت مسلمہ۔ میں ابتدائی اقدام قرآن وحدیث (فقہ) پر مختصراً عمل لازم رکھا گیا۔ مگر اقتدار اعلیٰ کی ہیٔت پیدا ہونے کی صورت میں (جہاں تک حکومتی ہیٔت کا تعلق ہو) قرآن وحدیث سے ہٹ کر مادی حیثیت قائم رکھنا قرآن و حدیث کے احکام سے سوالازم ہوتا ہے۔ ابتداءِ اجرائے اسلام (قرآن) میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات اقدس نے مکہ میں تبلیغ واشاعت کے دوران شدید مصائب برداشت کر کے سوائے تبلیغ وارشاد کسی قسم کی جوابی کاروائی نہ فرمائی۔ یہ عملِ رسالت کے تابع تھا۔ لیکن جنگ اُحد کے موقع پر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے محض استحکام اسلام اور امت مسلمہ کی بقا کیلئے اقتدار اعلیٰ کی ہیٔت قائم کرنے میں مادی وسائل کے حصول کیلئے اقدام فرمایا۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ابتدائی اقدام۔ الـدین الاسلام کیلئے تھا۔ اور مدینہ ہجرت کے بعد کفار مکہ کی مخالفت میں اقتدار اعلیٰ کی صورت میں اسلام ــ الـدیـن الاسـلام کی بقا کے لیے اقدام تھا۔ لیکن اس اقدام میں جوابی دفاع۔ اور جہاد کا عمل شامل تھا۔ انہیں دو نظریات پر امتِ مسلمہ میں دو طرزیں۔ دو خیالات پیدا ہوئے۔ ایک فرقہ کا نظریہ تھا کہ مثل جنگ بدر نصرت الٰہی پر بغیر کسی مادی وسیلہ کے جہاد۔ تبلیغ کی

جائے۔ جبکہ دوسروں کا خیال تھا کہ اجرائے الدین کیلئے مادی وسائل سے قوت حاصل کی جائے۔ ان میں حضرت علی کرم اللہ وجہہ ابتدائے عمل رسالت پر۔ الدین الاسلام کا اجرا کرنے کے حامی تھے۔ کہ بغیر مادی ذرائع حاصل کئے الدین الاسلام کا اجرا کیا جائے۔ جس میں الدین الاسلام کی اشاعت میں حکومت کی شکل پیدا ہوتی ہے جسے خلافت اسلامی سے موسوم کیا گیا۔

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے واقعہ شہادت۔ میں یہی امر وجہ فساد رہا۔ جو شام کے یہود ونصاریٰ اور منافقین کی سازش سے ہوا۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی شہادت کے بعد خلافتِ اسلامی میں۔ خلیفہ کا وجود نہ رہا۔ اور امت مسلمہ میں انتشار کی وجہ سے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی تشکیل شدہ مجلس شوریٰ کی حیثیت بھی کمزور ہوگئی۔ لہذا بروقت خلیفہ کے تقرر پر کسی انتخاب کا موقع نہ آسکا۔ ان حالات کے بعد ایک مقرر کردہ شرعی دستور یہ تھا کہ اگر ملّتِ اسلامی میں خلیفہ منتخب ہونے کی گنجائش نہ ہو۔ تو امت مسلمہ۔ یا امت مسلمہ کا جو بھی بااثر معتمد فرد ہو۔ خود اپنی ذات سے اس حال میں کہ شرائط دینی شرائطِ خلافت میں لائقِ انتخاب ہو۔ بجائے خود خلیفہ کے مقام پر خلافت کا دعویٰ کرے تو جائز ہوسکتا ہے۔ اس حال میں۔ کہ امتِ مسلمہ ایسے خلیفہ کو تسلیم کر کے۔ بیعتِ (بیعتِ خلافت) کرے۔ ان حالات میں ایک خلیفہ کی صفات ہونے پر ایسے فرد کی بیعت کی جاسکتی ہے۔ جس پر کسی کا اعتراض یا اختلاف نہیں ہوسکتا۔

جیسا کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے شہادت کے موقع پر چھ افراد کا (بحیثیت مجلس شوریٰ) انتخاب فرمایا۔ لہذا ضروری تھا حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے بعد۔ کوئی فرد۔ خلیفہ ہونے کا دعویٰ کرے۔ جائز تھا۔ جن میں حضرت علی کرم اللہ وجہہ کا مقام بقیہ اصحاب میں ممتاز تھا۔ اور اس امر پر تمام امتِ مسلمہ کا اتفاق تھا ـــــ لیکن یہ امر شہادت عثمانؓ کی بنا پر متنازعہ ہوگیا۔ کہ حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ (ایک اولوالعزم صحابی ـــــ اور امیر شام) نے قاتلانِ عثمانؓ کا مطالبہ کیا۔ کہ دشمنانِ اسلام کے آزادانہ خلافت اسلامی کے خلاف اقدام (فتنہ) کو مستقل روکنے کیلئے ضروری ہے۔ کہ اس موقع پر دشمنانِ اسلام کا محاسبہ کر کے انکے عزائم کو کامیاب ہونے کا موقع نہ دیا جائے۔ کہ

اسلام کو کسی قسم کا زک اٹھانا پڑے۔ حضرت علی کرم اللہ وجہہ کی مصلحت تھی۔ کہ دشمنان اسلام کا قلع قمع کرنے کیلئے ضروری ہے۔ کہ الدین الاسلام کی ساکھ بحال کر کے۔ انکا محاسبہ کیا جائے۔ اس حال میں کہ امت مسلمہ ایسے موقع پر ایک عمل پر متفق ہو۔ حقیقتاً (سادہ دل) مسلمان منافقوں کی سازش کا شکار ہو کر فتنہ کا شکار دو فریق میں تقسیم ہو کر محض۔ الدین الاسلام۔ (خلافتِ اسلامی) کے تحفظ کے خیال سے ایک دوسرے سے برسرِ پیکار ہو گئے۔ یہ فتنہ یا یہ اختلافِ نظریہ۔ آخر حضرت علی کرم اللہ وجہہ اور حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کے درمیان جنگ کی صورت میں نمایاں ہوا۔ حقیقتاً۔ یہ اختلافات۔ یہ تضادات۔ یہ فسادات۔ صرف ایک نظریہ کی شکل میں۔ تحفظ و اجرائے الدین کی خاطر رونما ہوئے۔ جس میں الدین الاسلام کا اجراء۔ طریق نبوی پر ہونا۔ یا اقتدار اعلیٰ کے ذریعہ وسعت واستحکام الدین الاسلام ہونا۔ شرائطِ دینی ــــ شرائطِ خلافت ــــ کے مطابق ہونا۔ شرائطِ خلافت میں شامل کیا جانا ضروری ہوا۔ جس میں احکام الٰہی ۔ احکام رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم۔ اور خلفاء (خلیفۃ الرّسول) کے احکام پر الدین الاسلام کی ہیئت مسلمہ کو (طویل زمانہ تک) استوار کرنے کا اصل مقصد تھا۔ جبکہ حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کی خلافت سے اسی نظریہ پر خلافت اسلامی کا اجرا ہوا۔ اور خلافت عثمانی۔ ترکیہ پر زوال پذیر ہوئی۔ اسی عمل پر الدین الاسلام کی ہیئت کو خلافتِ اسلامی (حکومتِ اسلامی) سے موسوم کیا گیا۔

حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے خود انتخاب خلیفہ کو ایک مستقل شکل دی تھی۔ کہ آپؐ نے باوجود قریب اور افضل ہونے کے حضرت عمرؓ یا حضرت عثمانؓ یا حضرت علیؓ کو نماز میں امامت کیلئے مقرر نہ فرمایا۔ بلکہ حضرت ابو بکر صدیقؓ کو ہی امامت کیلئے مقرر فرمایا۔ اور دوسرا فرمان اس امر کی شہادت ہے کہ حضرت علیؓ کیلئے انتہائی قرب کی بشارت دے دی۔ کہ آپ کا وجود میرا وجود۔ دَمُكَ دَمِی لَحْمُكَ لَحْمِیْ ــــ اور جو علم نبوت مجھ سے جاری ہوا۔ وہ حضرت علیؓ کے ذریعہ جاری ہوگا۔ اَنَا دَارُالْحِکْمَةِ وَعَلِیٌّ بَابُهَا۔ یہ تخصیص مابین حضرت ابو بکرؓ و حضرت علیؓ ان لوگوں کے لیے پیشگوئی ہے جو حضرات صحابہ میں مملکت اسلامی کو زبردستی قبضہ میں لانے کیلئے ان حضرات پر حرف لاتے ہیں۔ انکے لیے اتنا

سوچنا کافی ہے۔ کہ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام دنیا میں صرف انسان کو خلیفۂ ارض بنانے کیلئے تشریف لائے کہ انسان کو ذات الٰہی کا عرفان وقرب حاصل ہو۔ چنانچہ اس خلافت ارضی کو حضرت علی کرم اللہ وجہہ کیلئے بذات خود مخصوص فرمایا۔ نظام مملکت میں تو ایک شرعی ماحول کو قائم کر کے عرفانِ الٰہی کے لیے راستہ ہموار کرنا ہے۔ اور دنیوی امور میں ضروریات زندگی کی فراہمی کیلئے آسانی پیدا کرنا ہے۔ ورنہ مقصود تو عرفان ہے جسکا منصب حضرت علی و آل علی کرم اللہ وجہہ کو عطا ہوا۔ تو پھر خلافت اسلامی میں گویا خلافت حضرت علی کرم اللہ وجہہ ہی کی ہے۔ اور حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کے خصوصی منصب نبوت یعنی علم العرفان کیلئے حضرت علی کرم اللہ وجہہ نائب رسول قائم مقام خلیفہ مقرر ہوئے۔ جس میں کسی

---

۱ یہ ضروری ہے۔ کہ واقعات ـــــ کسی واقعہ کے مطالعہ میں۔ ماضی حال کے بنیادی اسباب کو زیر نظر رکھنا لازمی ہوتا ہے ـــــ اول یہ کہ مخلوقِ انسانی میں۔ انسان کا پیدائشی مقصد کیا ہے؟ ـــــ جس کا قرآن میں واضح ذکر کیا گیا وَمَاخَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْاِنْسَ اِلَّا لِيَعْبُدُوْنِ نہیں پیدا کیا جنوں اور انسانوں کو مگر اللہ تعالیٰ کی عبادت کیلئے۔ یہ تو واضح ہے۔ کہ جنوں اور انسانوں کو اللہ کی عبادت و معرفت کیلئے پیدا کیا گیا مگر۔ اللہ تعالیٰ کا اس عبادت سے مقصد کیا تھا؟ جو حقیقت ظاہر و واضح نہیں۔ لہذا یہ حقیقت حاصل کرنی ہے ـــــ وہ یہ کہ اللہ تعالیٰ نے تمام کائنات میں انسان کو افضلیت عطا کی۔ اس افضلیت کیلئے عبادت کو ذریعہ حصول فضلیت قرار دیا۔ کہ عبادت ہی کے ذریعہ انسان کو فضلیت عطا ہو گی۔ اس تصور میں۔ عبادت اللہ کی عظمت کی نشاندہی کرتی ہے۔ لیکن یہ اظہارِ عظمت بھی۔ انسان کی فضلیت کا سبب بنتا ہے۔ ظاہر ہوا۔ کہ اللہ کی عبادت کا مقصد اللہ کیلئے نہیں۔ بلکہ انسان کی عبادت خود اسکی ذات کیلئے ہے البتہ اس عبادت سے اللہ کی عظمت کا مظاہر ہوتا ہے۔ لہذا انسان نے اپنی تمام خواہشات۔ حصول خواہشات میں بغیر کسی۔ غیر تصور کے اپنی تمام خواہشات کو محض اس ذات ہی کیلئے متحرک کرنا ہے۔ جس میں انسانی ذہن میں اللہ کی اطاعت وعبادت کو ہر حال میں تقدم دینا ہے۔ اس حال میں۔ کہ (سوائے ایک نبی و رسول کے فوق کے) اپنے ماں باپ۔ اپنی جان۔ اپنی قرابت۔ اپنی عزیز شے کے۔ کسی شے کو خاطر میں نہ لایا جائے ـــــ یہی ایک تصور ہے۔ جو امت محمد رسول اللہؐ میں۔ ہر شخص (حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ سے لے کر امت کے آخری فرد تک) کیلئے قائم رہنا ہے۔ جس میں اپنے باپ۔ ماں۔ بھائی۔ رشتہ دار غرض ہر فرد امت کو خصوصیت دینا خلافِ ضابطۂ اسلام ہوتا ہے۔ یہی تصور ہے۔ جس میں سوائے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے۔ آپ کے عزیز واقربا۔ قرابتداروں کی خصوصیات کو خاطر میں نہ (باقی حاشیہ اگلے صفحہ پر)

قرابت داری کو درمیان میں نہ لایا گیا۔

ہر واقعہ کی اہمیت کو سمجھنے کیلئے زمانہ کی کیفیت وحالات کا خیال رکھنا بھی ضروری ہوتا ہے یعنی ایک وقت زمانہ کی حالت یہ ہوتی ہے۔ کہ ہر شخص مومن کامل ہے۔ اسکا عمل انتہائی خلوص وتقویٰ پر مبنی ہے۔ لیکن یہ ضروری نہیں کہ وہ دنیوی امور میں مملکت کے نظام کو برقرار رکھنے کی ہر قسم کی سیاسی۔ معاشرتی۔ تمدنی اصلاح کی صلاحیت بھی رکھتا ہو۔ ایک ولی (مومن) بعض اوقات معمولی لین دین بھی نہیں کرسکتا۔ ایسے وقت میں حکومتِ اسلامی پر اغیار کا دباؤ ہو۔ نظام میں برہمی پیدا ہونے کا احتمال ہو۔ تو ایسے وقت میں اس مقام پر ایک ایسے شخص کی ضرورت محسوس ہوتی ہے۔ جو اگرچہ عام مومنوں کے مقابلہ میں عمل کے لحاظ سے کمتر ہو۔ لیکن دنیوی معاملات کو سلجھانے میں پوری صلاحیت رکھتا ہو۔

(بقیہ حاشیہ گزشتہ صفحہ) لایا گیا۔ یہی تصور ہے۔ جس میں حضرت علیؓ۔ حضرت عثمانؓ۔ اور دیگر قرابتداران حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خصوصیت کو خاطر میں نہ لایا گیا۔ کہ قرابتداری میں۔ حضرت علی۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہما اور دیگر رشتہ داران قربت میں سب سے افضل تھے۔ لیکن اس مقام پر عظمتِ الٰہی کے تصور کو کائنات کی ہر شے پر مقدم سمجھنا ہے۔ جو حقیقی مقصد الٰہی قرار دیا جاتا ہے۔

ایک بار حضرت عبدالرحمٰن بن ابوبکر رضی اللہ عنہ نے مجلس نبویؐ میں۔ اپنے والد حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے بارے میں اس بات کا اظہار کیا۔ کہ اسلام قبول کرنے سے قبل آپ دوران جنگ کئی بار میری تلوار کی زد میں آئے۔ مگر محبتِ پدری میں میں آپ کو شہید کرنے سے باز رہا۔ تو حضرت ابوبکر صدیقؓ نے انتہائی جذبہ کے ساتھ فرمایا۔ اللہ کی قسم تم اگر میری زد میں آتے تو میں تمہیں قتل کیے بغیر نہ چھوڑتا۔ حقیقتاً امتِ محمدیؐ میں۔ جہاں تک اجرائے قرآن و حدیث کا عمل سامنے آتا ہے۔ وہاں کسی صحابی یا امت محمدیؐ کے ہر فرد نے۔ ذاتی اغراض کو پسِ پشت ڈال کر۔ آئین محمدیؐ کے مطابق۔ خواہ اجرائے احکام الٰہی ہو یا تبلیغ دین ہو۔ یا انتخاب خلیفۃ الرّسول ہو یا انتخابِ خلافتِ اسلامی۔ اور اسی بنیادی تصور پر امت مسلمہ میں کسی انتخاب میں۔ محض رضائے الٰہی ـــــ رضائے رسول کو سامنے رکھا گیا۔ اور امت میں اختلاف یا آپس کی جنگ وجدل کی بنا کسی فرد کی اپنی کسی خواہش کی تکمیل پر نہ تھی۔ بلکہ ہر فردِ امت حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے غلام جانثار کی حیثیت میں۔ صرف عظمت الٰہی کے لیے اپنی جانیں قربان کرتا رہا۔ اور حقیقتاً۔ اجرائے قرآن وحدیث اور تبلیغ اسلام کا ایک حقیقی۔ اہم بنیادی تصور قرار دیا جاتا ہے۔ جس پر الدین الاسلام کی بنیاد رکھی جاتی ہے۔

تو وقتی طور(جب تک سلطنت کا استحکام مضبوط ہو جائے) ایسے شخص کو سر براہ بنایا جائے تا کہ (الدین الاسلام) سلطنت کا نظام قائم رہ سکے۔اس میں شک نہیں کہ نظامِ اسلامی کی بنیاد انتہائی تقویٰ پر رکھی گئی ہے۔لیکن تقویٰ کے ساتھ ساتھ مادی حیثیت سے نظام مملکت کو سنوار نے کی صلاحیت کا ہونا بھی ضروری ہے۔اس کیفیت کی ضرورت زمانہ خود پیدا کرتا ہے۔بانیٔ اسلام حضرت محمد رسول اللہ ﷺ کے واقعاتِ نبوت کا بغور مطالعہ کیا جائے تو نظامِ اسلامی کی بنیاد میں یہ دونوں کیفیتیں نظر آتی ہیں۔

حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کی بعثت کا مقصد اول یہ تھا کہ دنیا کا ہر شخص کفر و ظلمت کے اندھیرے سے نکل کر نور ہدایت کی طرف رجوع کرے۔اور اسکا نتیجہ یہ تھا کہ انسان اپنی عاقبت میں نجات یافتہ ہو۔اور انسانی نصب العین کی تکمیل ہو۔چنانچہ اپنے ابتداء زمانہ بعثت میں حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے اس مقصد کے تحت قدم اٹھایا مکہ کی خونخوار فضا میں آپؐ نے کسی نظامِ مملکت کا اجرا نہیں کیا۔حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کی تبلیغ و انداز سے بظاہر یہی معلوم ہوتا ہے کہ آپؐ نے لوگوں کو انکی نجات کی طرف بلایا۔لیکن یہ نجات اسوقت تک حاصل نہیں ہوسکتی۔جب تک ایک ربانی قانون کے احاطہ میں نہ آیا جائے۔یہ ربانی قانون قرآن تھا۔جسکے حکم کی تعمیل کرنی ہر انسان کیلئے فرض قرار دیا گیا۔اسکا مطلب یہ ہوا کہ حصول نجات کا طریق قانون خداوندی کی تعمیل ہے۔اور قانون خداوندی کے اجرا نے خود بخود نظام اسلامی کی شکل اختیار کی۔قانونِ خداوندی کا اجرا ایک پیغمبر سے ہوا۔اسلئے پیغمبر ہی خلیفۃ اللہ کی حیثیت سے سر براہ نظام اسلامی ہوگا پیغمبر کا کام یہاں صرف یہ ہے۔کہ ہر انسان سے قرآن کی تعمیل کرانی ہے۔سو اس تعمیل کیلئے کسی مادی طاقت کی ضرورت نہیں صرف بَلِّغْ مَآ اُنْزِلَ اِلَیْكَ (پارہ ۶ سورۃ ۵ آیت ۶۷) چاہے مانیں یا نہ مانیں لوگوں تک قانون الٰہی پہنچاؤ۔وہ خوشی سے مانیں تو انکی مرضی۔نہ مانیں تو بجبر انہیں منانے کی ضرورت نہیں۔اسلئے حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے اپنی ابتدائی تبلیغ میں بغیر کسی نظام کے ذریعہ تبلیغ شروع کر دی۔کسی نے مانا۔کسی نے نہ مانا۔جس نے مانا اس نے حضورؐ کا ساتھ دیا۔جس نے نہ مانا۔حضورؐ کی مخالفت کی۔مخالفت اسلئے کی کہ وہ سمجھتے تھے۔کہ اس تبلیغ کے پس منظر میں ایک نظام اسلامی کا وجود پوشیدہ ہے۔جو ہمارے لادینی۔غیر آئینی نظام کا

خاتمہ کردے گا۔ ورنہ مخالفین اسلام اللہ کے قائل بھی تھے۔ رسولؐ کی عظمت (صادق وامین کی حیثیت میں) کے قائل بھی تھے۔ صادق ہونے کی حیثیت میں انہیں یہ پورا یقین تھا کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم بے شک اللہ کے رسول ہیں۔ لیکن وہ آپؐ کی تبلیغ کے پس منظر سے خائف تھے۔ کہ اسطرح ہمارے ذاتی اختیارات ختم ہو جائینگے۔ اور ہمیں ایک معبود کی عبادت کے ساتھ۔ اپنے آپکو اس نظام کے ایک فرد کی حیثیت سے پابند قانون رہ کر رہنا پڑے گا_____ حضورؐ کے واقعات رسالت سے معلوم ہوتا ہے۔ کہ حضورؐ نے سوائے تبلیغ کے کوئی ایسا فروعی ذریعہ اختیار نہ کیا جس میں کسی نظام مملکت کو محسوس کیا جائے۔ چنانچہ آپؐ نے مکہ کے مخالفین کی ہر قسم کی تکالیف اور جبر و تشدد کو برداشت کیا۔ لیکن اسکے رد اور اسکی حفاظت کیلئے کوئی سامان نہ کیا۔ یہاں تک کہ جماعتِ اسلامی کی ایک کثیر جماعت بھی پیدا ہوئی۔ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام ہجرت سے قبل بھی ہجرت کر سکتے تھے۔ یا کوئی ذریعہ پیدا کر سکتے تھے جس سے آپؐ اپنی جماعت کو محفوظ کر لیتے یا طائف کے مقام پر وہ کسی خصوصی انتظام کے ساتھ تشریف لے جاتے۔ حفظ ما تقدم کا سامان کرتے۔ لیکن آپؐ نے انتہائی زخم اور تکلیف کی شدت میں بھی اس چیز کی ضرورت محسوس نہ کی۔ کیونکہ یہ وقت صرف تبلیغ کا تھا۔ ہجرت کے حکم کے ساتھ ہی۔ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے۔ صرف ایک حفاظتی قدم اٹھایا۔ کہ لوگوں کو ہجرت کر کے کسی محفوظ مقام پر پہنچنے کی تلقین فرمائی۔ اور خود بھی بحفاظت تمام مدینہ منورہ پہنچنے کا انتظام فرمایا۔ گویا ہجرت کے حکم میں بہ باطن ایک ایسا حکم بھی پایا جاتا تھا جس میں ایک جماعتی اقتدار کو لازم رکھا گیا۔ چنانچہ واضح ہے۔ کہ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے مدینہ پہنچ کر غیر اسلامی لوگوں سے معاہدات شروع کر دیئے۔ اور مسلم اقتدار کو جماعت کی شکل میں تشکیل دیا۔ اسی وقت سے دیگر حکومتوں کو دعوتِ اسلام کے نامہ جات بھیجے۔ گویا یہ ایک نئی طرز تبلیغ تھی جس میں قرآنی احکام کی تبلیغ کے ساتھ نظام الٰہی کی ایک ظاہری شکل بھی پائی جاتی تھی۔ ادھر مکہ کے مخالفین اسلام نے اس اسلامی اجتماع کو ایک مخصوص نظام اسلامی سمجھ کر یورش کر دی۔ اور انکے مقابل اسلامی جماعت اسی طرح مقابل ہوئی جسطرح ایک مملکت یا ایک حکومت دوسری حکومت کو زیر کرنے کیلئے برسر پیکار ہو جاتی ہے۔ اندازہ کرنے کا مقام ہے کہ ایک فریق دوسرے

فریق سے صرف اس لئے برسرِ پیکار ہے۔ کہ ایک فریق کو یکسر ختم کر دیا جائے۔ قتل فریق کا ہے۔ مگر اسکے پسِ پردہ مقصد اصلی یہ ہے۔ کہ فریق کے ختم ہونے سے نظام الٰہی کا اجرا نہ ہوگا۔ اور نظام الٰہی کا تسلط ہمیشہ کیلئے ختم ہو جائیگا۔ اور یہی نظریہ دونوں طرف کارفرما تھا۔ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے اسی نظریہ کے تحت اندرون مدینہ یہود ونصاریٰ سے معاہدات کئے۔ اور اسی نظریہ کے تحت جہاد شروع کیا۔ معاہدات اور ترتیب مجاہدین۔ نظامِ اسلامی کے تحت اور جنگی اصولوں کے تحت ہوئے۔ یہ کیفیت زمانہ نے پیدا کی۔ تواریخ کے مطالعہ سے معلوم ہوگا کہ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے ہجرت سے قبل۔ ہجرت کے بعد مدینہ میں خلافت اسلامی قائم کرنے کے وقت۔ اور کفار مکہ پر اقتدار کلی حاصل کرنے سے قبل۔ اور مابعد کیا طریق اختیار کیا۔ تو پتہ چلے گا کہ پیغمبر ہونے کی حیثیت میں آپؐ نے بغیر کسی فروعی نظریہ کے صرف تبلیغ فرمائی اور جماعت کے قائم ہونے پر ایک مخصوص نظام تشکیل دیا۔ اور اقتدار اسلامی کے بعد ایک مستحکم مملکت یا حکومت اسلامی کو قائم کیا۔ اس دور میں آپؐ نے نظام مملکت اسلامی سے متعلق تمام امور کو اسطرح نبھایا۔ کہ عالم کی تمام حکومتیں ایسے انتظام کا بدل پیش نہیں کر سکتیں۔ گویا حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کی ذاتی خوبیوں میں۔ نبوت کے ساتھ دنیوی معاملات سے متعلق ہر شعبہ ہر مد کی صلاحیت کا مادہ بھی بدرجہ اتم موجود تھا۔

جنگ احد۔ بدر۔ حنین کے واقعات کا مطالعہ کرنے سے اس امر کی تائید ظاہر ہے۔ کہ خواہ انسان میں دنیوی لحاظ سے امور مملکت کے بہتر انتظام کی صلاحیت ہو یا نہ ہو لیکن تائید و نصرت الٰہی پر ہی نظام اسلامی کا مدار ہے۔ کیونکہ ان واقعات میں باوجود قدرت کے مسلمانوں نے شکست کھائی۔ اور باوجود قوت نہ ہونے کے بھی فتح حاصل کی اس میں شک نہیں۔ یہ امر قابل تسلیم ہے۔ سوائے تائید الٰہی کے جب کہ دین ہی اللہ کا ہو حکمرانی ہی اللہ کی ہو وہ اپنی حکومت کا ہر طریق سے تسلط جما سکتا ہے۔ لیکن اس کے ساتھ ہی حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کے ان واقعات کو بھی مدنظر رکھنا ضروری ہے۔ جن میں آپؐ نے قبل ہجرت کوئی فروعی ذریعہ اختیار نہ کیا۔ اور کفار مکہ نے انتہائی ظلم وستم کے ساتھ مسلمانوں کو تکلیفیں دیں اور شہید کر دیا ـــــ اور تبلیغ میں کس قدر دشواریاں پیدا ہوئیں۔ اسی زمانہ میں

حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کو شعب ابی طالب کے مقام پر تین سال محبوس رہنا پڑا ـــــ اور ہجرت کے بعد۔ معاہدات۔ غزوات اور جماعتی شکل میں دیگر اصلاحات کا اجرا۔ ملکی معاملات کے تمام شعبوں اور معاشرتی تنظیم کی اصلاحات کا نفاذ۔ جنگی اسکیموں وغیرہ کا اجرا کیا۔ دوسرے مندرجہ بالا واقعات بھی ایک معین وقت کی پیداوار تھے۔ جن میں مصلحتِ الٰہی کے تابع مسلمانوں کے قلوب میں صرف اللہ تعالیٰ کی قدرت کاملہ اور اسی کے اقتدار کا تسلط قائم کرنے کا نظریہ اور انسانی قلوب کا تزکیہ منظور تھا۔ ان واقعات سے معلوم ہوتا ہے۔ کہ نظام الٰہی کی بنیاد انتہائی تقویٰ پر ہی ہے۔ جس میں انسانی نجات ہی مقصود حقیقی ہے۔ اور مقصود حقیقی حاصل کرنے کیلئے ایک ایسے نظام کی ضرورت ہے۔ جس میں اسلامی جماعت کو ایک مستقل اقتدار حاصل ہو اور طاغوتی قوتیں جماعت کو فنا نہ کر سکیں۔ جماعتی اقتدار سے دنیا میں ایک خالص ماحول میسر ہوگا۔ جس ماحول میں انسانی نجات حاصل کرنے کا سامان آسانی سے فراہم ہو سکے گا۔ جماعت اسلامی کے اقتدار اور استحکام کی صورت یہ بھی ہے۔ کہ طاغوتی قوتوں کو ہر ممکن طریقہ سے فنا کرنے کے مستقل اور کارآمد منصوبے تیار کئے جائیں ـــــ يَـٰٓأَيُّهَا الَّذِينَ اٰمَنُوا خُذُوا حِذْرَكُمْ فَانْفِرُوا ثُبَاتٍ اَوِ انْفِرُوا جَمِيعًا ○ (پارہ ۵ سورۃ ۴ آیت ۷۱) ـــــ وَاَعِدُّوا لَهُمْ مَّا اسْتَطَعْتُمْ مِّنْ قُوَّةٍ وَّمِنْ رِّبَاطِ الْخَيْلِ تُرْهِبُوْنَ بِهٖ عَدُوَّ اللّٰهِ وَعَدُوَّكُمْ (پارہ ۱۰ سورۃ ۸ آیت ۶۰) ـــــ وَقَاتِلُوْهُمْ حَتّٰى لَا تَكُوْنَ فِتْنَةٌ وَّيَكُوْنَ الدِّيْنُ كُلُّهٗ لِلّٰهِ ج (پارہ ۹ سورۃ ۸ آیت ۳۹) ـــــ یعنی تم ہر اس ہتھیار سے لیس ہو کر جہاد کیلئے تیار ہو جاؤ جو تم سے میسّر ہو سکے۔ ایک طاغوتی قوت کیلئے ہر ہتھیار میں ہر ادنیٰ اور کمتر ہتھیار سے لے کر ہر بہتر سے بہتر جنگی منصوبہ شامل ہو سکتا ہے۔ اور اسی ذریعہ سے مخالفین اسلام کو جو اسلامی جماعت کو مٹانے کیلئے برسر پیکار ہوں شکست دی جائے۔

ابتدائے اسلام میں خود ذات مقدس حضرت محمد رسول اللہؐ موجود تھی۔ جو ظاہری باطنی۔ روحانی مادی خوبیوں میں بدرجہ اتم واکمل تھے۔ اور آپؐ نے اسلام کو ایک اسلامی نظامِ مملکت کی شکل میں قائم کیا۔ آپؐ کے بعد۔ آپؐ کے قائم مقام نائب رسول خلیفۂ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے

ایسی ہی مثل کی صفات کا ہونا لازمی تھا۔حضورؐ کے وصال کے وقت کے زمانہ کا اندازہ کرنے سے معلوم ہو گا کہ مملکتِ اسلامی ایک مستقل صورت اختیار کر چکی تھی۔لیکن یہود و نصاریٰ کا فتنہ موجود بھی تھا۔ حضورؐ کے وصال کے ساتھ ہی ایک عظیم الشان فتنہ کے پیدا ہونے کا احتمال تھا۔

اس میں شک نہیں کہ مملکت اسلامی کے قیام کے بعد خلیفۃ المومنین کو ایک عظیم الشان خلافت یا حکومت کے تمام نظامِ حکومت کو سنبھالنا تھا۔جس میں لوگوں کی ضروریات زندگی کا انتظام۔ چوری۔ڈاکہ۔شر و فساد کا انسداد۔عدل و انصاف اور دنیوی امور سے متعلق دیگر ضروریات کا انتظام کرنا ایک اہم چیز تھی۔لیکن۔یہ خلافت اسلامی صرف قانون الٰہی۔شریعت اسلامی کے نفاذ کیلئے تھی۔ تا کہ ہر شخص احکام خداوندی کی تعمیل میں۔نماز۔روزہ۔صدقات اور دیگر خصوصی احکام شریعت کا پابند ہو کر نجاتِ اُخروی حاصل کر لے۔اسکے لیے ہر فرد کیلئے۔ہر فرد کا عمل و سعی صرف عبادت الٰہی کا مقصد ہی لازم تھا۔یہ چیز بغیر حکومت اسلامی کے بھی ہر فرد کو حاصل تھی۔لیکن دیکھنے میں آیا۔کہ مخالفین اسلام نے حکومت اسلامی کو درہم برہم کرنے کی کوشش کی جسکا مطلب یہ تھا۔کہ جماعت اسلامی کو منتشر اور پسپا کیا جائے۔تا کہ نظامِ اسلامی کا خاتمہ ہو جائے۔اور اسی طریق سے شریعت اسلامی پر عمل ختم ہو کر قانونِ الٰہی بیکار ہو جائے۔اس سے معلوم ہوتا ہے۔کہ ایسے وقت میں نظامِ اسلامی کی محافظت لازمی اور ضروری سمجھی جائے۔مخالفین اسلام جنگی چالوں کی آڑ میں حملہ آور ہوتے ہیں۔انکے مقابلہ میں جنگی منصوبے ہی عمل میں لائے جاسکتے ہیں۔ایسی حالت میں لازمی طور وہی شخص نظام حکومت سنبھال سکتا ہے۔جو اگرچہ تقویٰ کے لحاظ سے باقی لوگوں میں کمتر بھی ہو۔لیکن ایک مستقل نظام حکومت سنبھالنے کیلئے۔حملہ آور مخالفینِ اسلام کے جنگی منصوبوں کے مطابق انکے ہر حربے کو بیکار کر دے۔اور اپنی حکومت کی ظاہری شکل کو محفوظ کر سکے۔اور اس صورت میں وہی شخص تمام امت مسلمہ میں افضل ہو سکتا ہے جو تقویٰ کے لحاظ سے بھی افضل ہو۔اور ظاہری نظام مملکت کے سنبھالنے کی بھی صلاحیت رکھتا ہو۔ زمانہ شاہد ہے۔کہ حضرت عمر فاروقؓ کے عہد میں حکومت اسلامی کو مشرق مغرب شمال و جنوب فروغ حاصل ہوا۔آپکی نئی اصلاحات کا زمانہ قائل ہے۔ابتدا سے انتہا تک ایسا حکمران۔ایسا عادل۔ایسا

فاتح۔اور ایسا مصلح دنیا پیدا نہیں کرسکتی۔لیکن اسکے باوجود حضرت عمرؓ نے حضرت ابوبکرؓ کو خلیفہ منتخب کرلیا۔ وہ اسلئے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی نکتہ شناس نگاہوں نے حضرت ابوبکر صدیقؓ میں دونوں قسم کی خوبیوں کو محسوس کرلیا۔چنانچہ تواریخ خود شہادت دیتی ہے۔کہ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کے وصال کے بعد جب ابوبکر رضی اللہ عنہ نے عہدۂ خلافت سنبھالا۔تو حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کے تمام احکام کو علیٰ حالہٖ جاری رکھا۔اس سلسلہ میں وقت کی نزاکت کو محسوس کرتے ہوئے حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے بھی بعض احکام کی واپسی کا مشورہ دیا۔کہ زمانہ کی نزاکت بدل چکی ہے اسلئے جب تک اندرونی نظام کا استحکام نہ ہو،ہمیں بعض احکام رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو واپس لینا چاہیے۔مگر یہ رسول اللہؐ کے بعد اوّل خلیفۃ المسلمین تھے جو اپنے تقویٰ اور دنیوی معاملات کی بہترین صلاحیت کے حامل تھے۔ آپ نے باوجود وقت کی شدید خطرناک حالت کے بھی اپنی ذات اور تائید الٰہی ومنصوبۂ رسول اللہؐ پر اعتماد رکھتے ہوئے۔نظام مملکت کو اس نہج پر ڈھال لیا کہ تین سال کے قلیل عرصہ میں ایک متزلزل جماعت کے خروج سے تمام مملکت اسلامی کی دیواریں اور مضبوط کر کے اسی مملکت اسلامی کو مزید وسعت دی۔یہ واقعہ اس امر کی بین شہادت ہے۔کہ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ میں نائب رسول۔خلیفہ رسول کی حیثیت سے بہ مثل حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام تقویٰ اور دنیوی لحاظ سے حکمرانی کی صلاحیت موجود تھی۔آپ نے تقویٰ کے ساتھ دنیوی اصلاحات کو بھی مستحکم کر دیا۔اگر حضرت ابوبکر صدیقؓ میں دونوں صلاحیتیں نہ پائی جاتیں تو ممکن تھا کہ مخالفین اسلام اپنی مکروہ چالوں سے اسلامی مملکت کو نقصان پہنچانے میں کامیاب ہو جاتے۔اس حالت میں نتیجہ یہی نکلا کہ ایک طرف حکومت اسلامی میں ہر شخص کو امن وسکون اور اسکی دنیاوی ضروریات کی فراہمی کا کلی طور سامان مہیا ہوا۔اور دوسری طرف دین الٰہی کے اجرا میں بھی وسعت اور استحکام حاصل ہوا۔دنیوی نظام تو افراد کو امن وحفاظت میں رکھتا ہے اور یہی امن ومحافظت مقصود حقیقی کے حاصل کرنے میں راستہ ہموار کر دیتی ہے۔

حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کا زمانہ تو اظہر من الشمس ہے۔کہ یہ زمانہ اسلام کی ضیاباری کا نصف النہار ہے۔تمام جابر حکمران قوتیں فنا ہوگئیں۔تمام طاغوتی قوتوں کا خاتمہ ہوگیا۔کائنات پر

صرف اسلام ہی کی روشنی چمکنے لگی۔ اب ضرورت نہیں رہی کہ کسی شیطانی قوت کے مقابلہ میں کسی ظاہری منصوبے کو استعمال کیا جائے۔ تمام اطراف عالم کو اب صرف تبلیغ کی ضرورت تھی۔ جیسا کہ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے اپنے ابتدائی دورِ رسالت میں قدم اٹھایا۔ فرق یہ ہے۔ کہ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے اپنے بعد ایک مکمل ضابطہ قائم کیا۔ جسے آپؐ کے عظیم الشان وزراء اور جرنیلوں نے بدرجہ کمال تکمیل تک پہنچا کر ابتدائی زمانہ کی کیفیت کو بدل کر نئی کیفیت پیدا کی کہ اب جماعت اسلامی کو کوئی طاغوتی قوت مٹانے کیلئے باقی نہ رہی۔ اب تقویٰ کا ہی دور دورہ رہا۔

خلفاء راشدین کے بعد۔ خلافت رسول اللہؐ کے قائم مقام کون تھے؟ ان میں بعض ایسے تھے جو کلی طور متقی نہ تھے۔ مگر نظام حکومت کو سنبھالنے کی صلاحیت رکھتے تھے۔ چنانچہ ایک طویل زمانہ تک دنیا میں اسلامی سطوت کی دھاک بیٹھی رہی۔ اور واقعات خود شاہد ہیں۔ کسی نااہل خلیفہ یا حکمران کے عہد میں مملکت اسلامی میں رخنہ اندازی ہوئی۔ اس حالت میں بھی اندرونی خلفشار پیدا ہوا۔ مسلمان آپس میں ایک دوسرے سے برسرِ پیکار ہوئے۔ مگر کسی یہودی۔ کسی نصرانی۔ کسی کافر کو اسلام کے مقابلہ میں اٹھنے کی جرأت نہ ہوئی۔ اسکی وجہ یہ تھی۔ کہ خلفاء میں ضابطۂ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے استعمال اور ذاتی قابلیت کی صلاحیت نہ رہی۔ اور ساتھ ہی بنیادی مقصد سے توجہ ہٹ گئی۔ کہ مملکتِ اسلامی کا مقصد شریعت اسلامی۔ احکام خداوندی کی تعمیل ہے۔

زمانہ شاہد ہے کہ عہد اموی اور عہد عباسی میں اگرچہ خلفاء میں تقویٰ موجود نہ تھا۔ لیکن سلطنت اسلامی کا عروج انتہا کو پہنچ چکا تھا۔ قرآن و حدیث کی اشاعت اور تبلیغی وسعتوں نے علم القرآن کو عظیم الشان لامحدود علمی ذخیروں میں جمع کیا جس علم پر آج دنیا کی عظیم محقق ہستیاں عبور حاصل کرنے پر عاجز ہیں ـــــ

ان تمام واقعات کا بغور مطالعہ کرنے سے معلوم ہوتا ہے۔ ابتدائے اسلام سے آخر تک اسلامی مملکت کو مختلف زمانوں میں مختلف واقعات سے دوچار ہونا پڑا۔ اور ہر زمانہ میں۔ اسی طریق کو محسوس کیا گیا جس طریق کی زمانہ کے ساتھ اسلامی مملکت کو عروج واستحکام حاصل ہونے کی ضرورت

رہی۔لیکن مقصد ہر طریق میں قانون الٰہی کا نفاذ۔اور انسان کی نجات اُخروی کالازمی رہا۔

انہیں واقعات کی بنا پر نظام اسلامی میں خلافت پر اختلاف پیدا ہوتے رہے۔حالانکہ بہ باطن ہر شخص کا مقصد حقیقی قانون الٰہی کے استحکام کا ہی تھا۔اگرچہ بعض اوقات بعض خلفاء بذات خود تقویٰ کے لحاظ سے کمزور بھی تھے ــــــ یہی وجہ تھی کہ ابتدائے خلافت پر عمومی کثرت رائے میں اختلاف پایا گیا ــــــ اور آخر موخر خلفاء حضرت عثمان رضی اللہ عنہ اور حضرت علی کرم اللہ وجہہ کے عہد خلافت میں عمومی کثرت رائے نے یا بعض اکابر صحابہ کے نظریات میں اختلاف ونزاع کا مادہ سامنے آیا۔اور یہود و نصاریٰ کی فتنہ پروری نے عوام کے اختلاف سے فائدہ اٹھا کر اسلام میں ایک عظیم الشان فتنہ برپا کیا۔

سوال یہ پیدا ہوتا ہے۔کہ ایسی مستحکم مملکت اسلامی میں قریب ترین زمانہ میں کیوں اتنی جلدی فساد پیدا ہوا؟

ان واقعات پر عمیق ترین انداز سے غور کرنے کی ضرورت ہے۔سب سے پہلے دیکھنا یہ ہے۔کہ جماعت اسلامی کیلئے شریعت اسلامی نے کون سالائحہ عمل کون ساطرز زندگی پیش کیا۔وہ یہ کہ انسان کی دنیوی زندگی میں اسکا واحد نصب العین عرفان وقرب الٰہی اور نجات اُخروی مقدم رکھا گیا۔ اس نظریہ کو اپنانے کے لیے ہر شخص ہر انسان فرداً فرداً ذمہ دار ہے۔اس نظریہ کے تحت انسان کی زندگی کا مقصد حصول دنیا نہیں بلکہ خالصتاً حصولِ آخرت ہے۔انسان دنیا میں ایک عظیم المرتبت سرمایہ دار ہو۔یا ادنیٰ درجہ کا مفلس و فاقہ کش وہ اس ذمہ داری سے فارغ نہیں رہ سکتا۔اسکا مطلب یہ ہے۔کہ انسان دنیا میں نہ اپنے مال وزر کو خاطر میں لاسکتا۔نہ اپنے عزیز واقرباء کو خاطر میں لاسکتا۔نہ اپنی فاقہ مستی کا اسے احساس ہوسکتا ہے۔اس اسلامی نظریہ کی رو سے۔وہ انسان واحد کی حیثیت رکھتا ہے۔ جسے صرف اللہ اور اسکے رسول سے قریبی تعلق رکھنا ہے۔جس تعلق میں کسی فروعی دنیوی تعلق کو درمیان میں نہیں لایا جاسکتا ہے۔اسی نظریہ کے تحت اصحاب رسول اللہ نے ایک متمول زندگی کو ترک کرکے فاقہ کشی اختیار کی۔لیکن فاقہ کش ہونے کی صورت میں بھی انہوں نے فاقہ کشی کا احساس نہ کیا۔انکی نظر

میں امیرانہ زندگی اور فاقہ کشی کی کوئی اہمیت یا وقعت یا اسکا احساس نہ تھا۔ اس نظریہ کی بنیاد کُلُّ مُؤْمِنٍ اِخْوَۃٌ ۔ وَمَاھٰذِہِ الْحَیٰوۃُ الدُّنْیَآ اِلَّا لَھْوٌ وَّلَعِبٌ ط (پارہ ۲۱ سورۃ ۲۹ آیت ۶۴) پر تھی۔ اصحاب رسول اللہؐ اور جُملہ جماعت اسلامی کا نظریہ اسلام میں آ کر بدل گیا۔ کہ قوم قبیلہ قرابت داری کوئی شے نہیں یٰٓاَیُّھَا النَّاسُ اِنَّا خَلَقْنٰکُمْ مِّنْ ذَکَرٍ وَّاُنْثٰی وَجَعَلْنٰکُمْ شُعُوْبًا وَّقَبَآئِلَ لِتَعَارَفُوا ط اِنَّ اَکْرَمَکُمْ عِنْدَاللّٰہِ اَتْقٰکُمْ ط (پارہ ۲۶ سورۃ ۴۹ آیت ۱۳) تم ایک قبیلہ تھے ہم نے صرف اسلئے تم میں قومیں پیدا کیں کہ تم پہچانے جاسکو ورنہ انسانی نصب العین میں انسان بحیثیت انسان اپنے خصوصی مقصود کیلئے کوئی کسی کا رشتہ دار و مددگار نہیں۔ ہر شخص فرداً فرداً اپنے اعمال شریعت کی تکمیل کا ذمہ دار ہے۔ لَنْ تَنْفَعَکُمْ اَرْحَامُکُمْ وَلَآ اَوْلَادُکُمْ ج (پارہ ۲۸ سورۃ ۶۰ آیت ۳) کوئی شخص کسی کا اسکے عمل میں مددگار نہ ہوگا۔ چنانچہ اسلام نے رشتہ داری کے جذبہ کو ختم کر کے اصحاب رسول اللہؐ کو اس مقام پر پہنچایا۔ کہ مسلمان باپ کافر بیٹے کو قتل کرنے پر آمادہ ہوا۔ مسلمان بیٹا کافر باپ اور تمام رشتہ داروں کو قتل کرنے پر آمادہ تھا۔ اُس وقت انہیں کسی قریبی رشتہ کا احساس نہ تھا۔ کہ میں اپنے باپ یا بیٹے کو قتل کروں گا نہیں بلکہ قرابت سے خالی ایک دشمن خدا کو قتل کروں گا۔ اسی جذبہ کے تحت مسلمانوں نے ہر اس شخص کو اپنا قریبی جانا جو ان کی نظر میں ظاہر طور شریعت اسلامی کا پابند نظر آتا۔ یہ جذبہ یہاں تک پہنچا کہ مسلمانوں نے بلا تمیز کئے ہوئے۔ کہ مسلمان ہے۔ یا منافق ایک ظاہر طور شرعی عامل کو اپنا بھائی بنالیا۔ یہ جذبہ کُلُّ مُؤْمِنٍ اِخْوَۃٌ کے اصول کے تحت تھا چنانچہ اس جذبہ کو اعتدال پر لانے کیلئے قرآن نے اصل و نقل کی تمیز کردی وَمِنَ النَّاسِ مَنْ یَّقُوْلُ اٰمَنَّا بِاللّٰہِ وَبِالْیَوْمِ الْاٰخِرِ وَمَاھُمْ بِمُؤْمِنِیْنَ ۝ یُخٰدِعُوْنَ اللّٰہَ وَالَّذِیْنَ اٰمَنُوْا ج وَمَا یَخْدَعُوْنَ اِلَّآ اَنْفُسَھُمْ وَمَا یَشْعُرُوْنَ ۝ط (پارہ اول سورۃ ۲ آیت ۸۔۹) اور لوگوں میں سے جو کہتے ہیں ہم بھی تمہارے عزیز مومن ہیں ہم بھی اللہ پر اور عقیدہ آخرت پر ایمان لائے۔ یہ دراصل ایمان نہیں لائے۔ بلکہ اللہ کو اور مومنوں کو دھوکہ دیتے ہیں۔ کہ ہم انکے جماعتی شیرازہ کو مستحکم نہ ہونے دیں۔ لیکن یہ خود دھوکہ میں ہیں۔ کیونکہ وہ اللہ کو دھوکہ

نہیں دے سکتے اور مومنوں کو بھی دھوکہ دیکر نقصان نہیں پہنچا سکتے۔ کیونکہ اگر یہ انکے جماعتی رنگ کو بکھیرنے کی کوشش کریں تو انہیں معلوم ہونا چاہیے کہ مومن کو اسکے ذاتی عمل سے نجات اُخروی ہر حال میں مل سکتی ہے۔ جس فائدے کو یہ کسی طرح بھی ضائع نہیں کر سکتے۔ اور مومن دنیوی زندگی کی کچھ قیمت سمجھتا ہی نہیں۔ اگر دنیوی زندگی میں اسے ہمیشہ کیلئے مصائب ہوں۔ اور اسے قتل کر دیا جائے۔ تو یہ چیز اسکے نفع کو پامال کر نہیں سکتی۔ نہ اسے اس چیز کا احساس ہی ہوگا تو اسطرح دھوکہ دینے میں مومن کو دھوکہ دیکر حاصل کچھ نہیں بلکہ انکی اپنی اُخروی زندگی تباہ و برباد ہو رہی ہے۔ مگر یہ کیفیتیں ایسی ہیں۔ کہ یہ اپنے اور مومنوں کے نتیجۂ عمل سے آگاہ نہیں۔ ورنہ اگر انہیں اپنے اس کردار کے نتیجۂ عمل کا پتہ چل جائے تو یہ ایسا کرنے پر ہرگز آمادہ نہ ہوں۔

یہی ایک جذبۂ اخوت اسلامی تھا۔ جس نے انہیں ہر اس شخص کا اعتبار دلایا جو بظاہر مومن صورت تھا۔ لیکن بہ باطن شقی ازلی اور دشمن اسلام تھا۔ مابعد اسلامی عہد میں بلکہ ابتدائے اسلام میں اُبی بن خلف منافق جیسے انسان تھے۔ یہود و نصاریٰ میں بھی کئی منافق تھے جو صرف اپنی ذاتی اغراض اور حصول ناجائز کی خاطر اسلام کے دشمن بن گئے ان کے دل اتنے سیاہ تھے۔ اُولٰٓئِكَ الَّذِيۡنَ طَبَعَ اللّٰهُ عَلٰى قُلُوۡبِهِمۡ وَاتَّبَعُوۡۤا اَهۡوَآءَهُمۡ ○ (پارہ ۲۶ سورہ ۴۷ آیت ۱۶) خواہ انہیں اسلام کی روشنی میں غرق بھی کیا جائے یہ مومن نہیں بن سکتے۔ اور اسلامی اقتدار نے انہیں اپنے حربہ چلانے سے عاجز کر دیا۔ ورنہ یہ اور انکی شقاوت قلبی برابر باقی رہی۔ اور مسلمانوں نے بوجہ اپنی نیک طینتی کے ایک انسان سمجھ کر زیادتی نہ کی حالانکہ انکے ساتھ زیادتی کرنا۔ اور انہیں دنیا سے نیست و نابود کرنا۔ جائز تھا۔

ایسے ہی لوگ مابعد زمانہ منافقانہ خصلتوں کے ساتھ مومنانہ لبادہ پہن کر عوام المسلمین کو دھوکہ دیتے رہے۔ چونکہ عوام میں ہر شخص انہیں پہچان نہ سکا۔ اسلئے انکے مکروہ حربے خلافت اسلامی میں فساد پیدا کرنے کیلئے کامیاب ثابت ہوئے۔ میں کہتا ہوں۔ کہ زمانہ سطحی طرز پر چل رہا ہے۔ قرآن کے ہر لائحہ عمل کو سطحی طور استعمال کر رہا ہے۔ حالانکہ قرآن صرف مومن کیلئے ہے۔ اور خصوصاً اصحاب رسول اللہؐ کیلئے ہی ہے۔ اسلئے قرآن نے صرف رسول اللہؐ کی جماعت اسلامی کو اُمّۃً

وَّسَطًا سے خطاب کیا۔ یہ خطاب انہیں کیلئے مختص تھا۔ ورنہ مابعد زمانہ رسالت کے مسلمانوں کی جو حالت رہی اور فی زمانہ امت مسلم کہلانے والی جماعت پر اُمَّةً وَّسَطًا کا خطاب لازم نہیں آسکتا۔ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے آخری خطبہ میں جو اعلان فرمایا وہ صرف خصوصی طور مومن کیلئے ہی نہ تھا۔ بلکہ تمام روئے زمین کے انسان کیلئے تھا۔ یعنی جو مومن بن چکا اسکی حفاظت قرآن سے ہوسکتی ہے۔ اور جو انکے بعد دنیا آئیگی اس میں مسلمان کے گھر پیدا ہونے کی تخصیص نہیں۔ بلکہ ہر مسلمان۔ کافر۔ یہود۔ نصاریٰ ہر انسان مشترک طور پر بحیثیت انسان اس قرآن کی طرف رجوع کرے۔ ان میں جو مومن بنا وہ عالم بنے اور باقی انسانوں کو قرآن کی طرف دعوت دے۔ سو جس نے اپنی پوری صلاحیت کے ساتھ۔ رجوع کیا اور شریعت کی کلی طور تعمیل کی وہی مومن ہوسکتا ہے۔ ورنہ وہ اگر مسلمان کے گھر ہی کیوں نہ پیدا ہوا ہو مومن کہلانے اور نجات کا حقدار نہیں ہوسکتا۔ یہی تاثیر ایک مومن کیلئے مقرر ہے۔ جو مومن من کل الوجود شریعت اسلامی کا تابع ہے۔ فطرۃ کو انسانی نجات مقصود ہے۔ وہ ہر حال میں حاصل ہوسکتی ہے جہاں انسان کے مومنانہ طرز عمل میں فرق آئے۔ ایک منافق اسے آسانی سے دھوکہ دے سکتا ہے ــــ یہاں پر اسلامی کثرت رائے کا لحاظ بھی اسی نظریہ کے تحت ہے۔ کہ کثرت رائے ایک ایسے مومن کیلئے جائز ہے۔ جو شریعت کی تعمیل سے اللہ کی حفاظت میں آیا ــــ اور عوام میں کسی شخص کی خوبیوں کا اندازہ کرنے کا عمومی طور مادہ نہیں ہوسکتا جب تک کہ وہ خود دین کی تکمیل کے ساتھ دنیوی امور کی اصلاح کے اصولوں کو مدنظر نہ رکھتے ہوں۔ قرآن کا روئے سخن بھی انہیں لوگوں کی طرف ہے جو دینی دنیوی زندگی میں ہر معاملہ کے نشیب وفراز سے آگاہی رکھنے والے ہوں۔ اسی حقیقت کو نظر انداز کرنے میں مابعد زمانہ مسلمانوں میں کئی مسائل میں اختلاف پائے گئے۔ جو آجتک جاری ہیں مثال کے طور پر۔ مسائل تو بے شمار ہیں۔ لیکن اسوقت ایک مسئلہ جو اکثر عوام کے زیر بحث ہے۔ یہی مسلہ کافی ہے۔ یعنی مسلمانوں میں سود کے حلال کرنے اور زمین وجائیداد رہن کرنے کا مسئلہ زیرِ بحث ہے۔

بعض علماء اسلام اسے اجتہادی طور یا حدیث کی رو سے جائز قرار دینے کی کوشش کرتے ہیں۔ اور بعض اسے ناجائز قرار دیتے ہیں۔ لیکن قرآن کے تخاطب پر کسی کی نظر نہیں۔ قرآن وحدیث

کاروئے سخن صرف مومن کیلئے ہے۔اور مومن کیلئے قَرۡضًا حَسَنًا حکم دیا گیا۔اور کُلُّ مُؤۡمِنٍ اِخۡوَۃ" کا جذبہ انہیں دیا گیا ہے۔ بھلا اندازہ کرنے کا مقام ہے۔ جہاں اخوت۔اور قرض حسنہ کا جذبہ ہو۔وہاں ہر غریب کو بیت المال یا صدقہ۔خیرات سے اسکی مدد کی جاتی ہے۔ یہاں رہن کا سوال ہی پیدا نہیں ہوسکتا۔ یہ کب ہوسکتا ہے۔کہ مومن کو مومن پر اعتماد نہیں۔ جہاں مومن منافق پر بھی اعتماد کر رہا ہے۔اسے جب اپنی دو وقت کی بجائے ایک اور ایک وقت کی روٹی پر بھی سائل کے سوال کو پورا کرنے کا جذبہ عطا ہوا ہے۔تو وہ مومن کیسے ایک غریب کی ملکیت سے کسی قسم کا منافع حاصل کرسکتا ہے۔ یا اس پر عدم اعتماد کی صورت میں اسکی ملکیت کو تا ادائے قرض اپنی تحویل میں رکھنے کی نوبت آتی ہے۔ اگر یہ واقع ہوسکتا ہے۔تو اسی صورت میں کہ یا تو دونوں میں سے ایک غیر مومن ہو یا دونوں غیر مومن ہوں۔تو یہاں رہن یا سود کے جائز کرنے کا سوال نہیں بلکہ مومن ہونے یا نہ ہونے کا سوال ہے ـــــ ایسے ہی واقعات پر عمیق غور نہ کرنے سے اصلی واقعات الجھ کر فتنہ وفساد کا باعث بن جاتے ہیں۔ کہ عوام میں اصل وفرع میں تمیز کرنے کی صلاحیت نہیں وہ واقعات کا سطحی طور مطالعہ کرتے ہیں یہی حالات زمانہ خلافت میں بھی رونما ہوئے۔یعنی عوام میں کثرت رائے کا مادہ قوی نہ تھا ـــــ ادھر ہر مسلمان کو ذاتی رائے استعمال کرنے کا اختیار تھا۔ چنانچہ عوام میں ہر شخص نے اپنی رائے کو استعمال کرنے کی کوشش کی ہر قبیلہ نے اپنی رائے کے مطابق اصول شریعت کی آڑ میں اپنے ہی سربراہ کو خلیفہ بنانے کی کوشش کی آخر جماعت کی عظیم المرتبت شخصیتوں نے ہی اسکا فیصلہ کردیا۔اور سب نے اسی پر اتفاق کیا ـــــ اندازہ کرنے کا مقام ہے۔کہ کثرت رائے عوام کی رائے نے مختلف اشخاص کو خلیفہ کے لیے منتخب کیا۔اور قریب تھا کہ عظیم فساد ہو جاتا ـــــ لیکن ایک عظیم المرتبت ہستی حضرت عمر فاروقؓ نے اپنی ذاتی رائے استعمال کر کے خلیفہ کو منتخب کر کے بڑھتے شعلوں پر پانی ڈالدیا۔ حالانکہ ہر شخص اطاعت رسولؐ پر پورے طور کاربند تھا۔اور اپنی رائے کے استعمال کو بھی شریعت کے تحت ہی استعمال کرتا تھا۔ اسکا مطلب یہ ہے کہ کسی مملکت کے نظام کو سنبھالنے کیلئے جب کسی سربراہ کا انتخاب کیا جائے۔تو اول اسکی سب سے اولین شرط مومن ہونا اشد ضروری اور لازمی ہے۔اگر جماعت مومن نہیں

تو خلافت اور انتخاب اور کثرت رائے کا سوال بیکار ہے۔ جماعت میں صرف ان لوگوں کو رائے دینے کا حق ہے جو عوام میں صالح اور صحیح الدماغ اور مصلح افراد ہوں۔ اور ہر شخص اِنکی جُملہ خوبیوں کی تائید کرتا ہو۔ لیکن اس میں مومن ہونے کی شرط اولین ہے۔ کہ ہر شخص بغیر کسی ذاتی غرض یا جماعت بندی۔ یا حصول دولت وعزت کیلئے اپنی خدمات پیش نہ کرنے والا ہو۔ بلکہ اپنی ذات سے زیادہ عوام الناس کی فلاح اُخروی و دنیوی کا خواہاں ہو۔ یہی اشخاص ایک ایسے شخص کا انتخاب کر سکتے ہیں۔ جو وقت کے لحاظ سے اگر تقویٰ اور ظاہری امور دنیوی کی تکمیل کی صلاحیت رکھتا ہو۔ اور زمانے کو اسی چیز کی ضرورت ہو تو یہ افضل انتخاب ہے۔ یہ فیصلہ کرنا اسی جماعت کی اہلیت پر منحصر ہے۔ اگر حالات زمانہ مملکت اسلامی کیلئے سازگار نہیں تو تقویٰ کے مقابلہ میں ظاہری اصلاحات اور جماعتی منصوبہ بندی کی صلاحیت کو مقدم رکھ کر سربراہ کا انتخاب ہو۔ اس امر کی تحقیق بھی اسی جماعت پر منحصر ہے۔ اب رہا سوال اگر جماعت بھی مومن نہ ہو۔ شریعت پر عمل بھی نہ ہو۔ اور منافقین کے فتنہ کا بھی احتمال ہو؟۔ تو ایسی صورت میں جماعت اسلامی (جو صرف نام کی مسلمان ہو) کو اپنی حفاظت کے احساس کے ساتھ ان اسباب کا حل بھی تلاش کرنا ہوگا۔ جن سے مسلمان کو تنزل ہوا۔ وہ یہی شریعت کی عدم تعمیل ہے۔ جو انسان کی حفاظت کی ذمہ دار ہے۔ تو علماء اسلام خود شریعت پر مکمل تزکیہ کے ساتھ مسلمانوں میں جذبہ اسلامی و اخوت پیدا کریں تاکہ صالح جماعت کی تشکیل ہو۔ لیکن اس اصلاح میں شریعت اسلامی کی اصلی روح ہو۔ کہ عالم خود سنت نبوی کا عامل ہو۔ اس میں يَتْلُوا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِهٖ وَيُزَكِّيْهِمْ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ کا حقیقی ملکہ ہو۔ تاکہ لوگوں میں تقویٰ پیدا ہو۔ اور مومنانہ صفات پیدا ہوں۔ جس جذبہ سے ہر مسلمان اپنی ذاتی اغراض کو پس پشت ڈال کر صرف جماعت اِسلامی کے اقتدار کا خواہاں ہو۔ اور ساتھ ہی ایسے لوگوں کا مجموعی طور انتخاب ہو جو اگرچہ متقی نہ ہوں۔ لیکن ان میں بغیر ذاتی اغراض کے انسانی ہمدردی کا جذبہ کارفرما ہو۔ اگر یہ نہ ہوگا تو کوئی انتخاب اور کوئی سربراہ صحیح معنوں میں منتخب ہو سکتا ہے۔ نہ ہی جماعت اسلامی کا اقتدار پیدا ہو سکتا ہے۔

الغرض یہی اسباب زمانہء خلافت راشدہ اور مابعد زمانہ اسلامی میں فساد کا باعث ہوئے۔

کہ مسلمان زمانہ کی نازک حالت کا اندازہ کرنے سے قاصر رہے۔ اپنے حق خود ارادیت کو براہ راست اسوقت استعمال کیا جب ان میں ایک مصلح اکابر صحابہ کی جماعت بھی موجود تھی۔ انہوں نے خلیفہ کا انتخاب انکے سپرد نہ کیا۔ بلکہ منافقین کے اکسانے پر براہِ راست خلیفہ کا انتخاب کرنا چاہا۔ ادھر منافقین نے دو جماعتیں بنالیں۔ ایک تقویٰ پر اسلامی بنیاد رکھنے پر زور دینے لگی۔ دوسری ظاہری اسباب کی صلاحیت پر زور دینے لگی ان منافقین نے کثیر جماعت مسلمین میں شامل ہوکر ایسے حربے چلائے کہ وقتی طور کسی کو بنیادی نظریہ پر سوچنے کا موقع میسّر نہ ہوسکا آخر جماعت کا غلبہ قلیل جماعت صحابہ پر غالب آگیا اور وہ بھی خلیفہ منتخب کرنے سے مجبور رہے۔ اور فساد کی آگ بھڑک اٹھی اور یہ فساد شہادت حسینؓ پر ہی ختم ہوا۔ کیونکہ حقیقی اسلامی وجود کے یہی آخری خلیفہ تھے جن کے ذریعہ نظام حکومت کا اقتدار قائم رہ سکتا تھا ـــــ یہ زمانہ تو خالص اسلامی روشنی کا تھا یہاں۔ کسی مخالفِ اسلام کے خروج کا خطرہ نہ تھا۔ اس لئے اندرونی خلفشار ہی مملکت اسلامی کے انتشار کا باعث بنا ـــــ اسکے بعد جو خلفاء آئے تواریخ کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ باوجود بعض خلفاء کے صحیح متقی نہ ہونے کے بھی اسلامی سطوت بدستور قائم رہی۔

یہ واقعات حضرت عثمان غنیؓ کے عہد خلافت سے ہی ظہور میں آنے لگے۔ اسلئے زمانہ عثمانی میں ہی خلافت میں نزاع پیدا ہوا۔ اور آپکے بعد حضرت علی کرم اللہ وجہہ افضل صحابہ میں تھے لیکن انکے مقابل جبکہ خلافت اسلامی کی حالت بیرونی فتنوں کی زد میں آچکی تھی۔ حضرت امیر معاویہؓ یا دیگر صحابہؓ کی خلافت کیلئے۔ کچھ خود صحابہ نے اور کچھ عوام کی حمایت نے خلافت کے لیے کئی فریق پیدا کئے۔

یہاں چونکہ تواریخ بیان کرنے کی ضرورت نہیں اسطرح بیان میں مزید طوالت کا احتمال ہے۔ اور ہمارے مخصوص بیان علم کا یہ خصوصی موضوع نہیں البتہ خلافت نبوی کے موضوع کا ایک جز ہے۔ اسلئے ہم اختصار کے ساتھ اس مضمون کو ختم کرتے ہیں۔ یہاں سے نائب رسول کے سلسلہ کو پھر سے جاری کرتے ہیں۔

حضرت علی کرم اللہ وجہہ کو از روئے حدیث قدسی عَلِیّ " بَابُھَا نائب رسول اللہ خود حضور

علیہ الصلوٰۃ والسلام نے مقرر کیا۔ اور حضرت علیؓ کی خلافت میں حضرت حسن بصری۔ حضرت امام حسن وحسین رضی اللہ عنہم آپکے نائب ہوئے۔ اور ان حضرات نے علم العرفان کا سلسلہ جاری کیا اور یہ سلسلہ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کی رحلت کے بعد جاری ہوا۔ جبکہ شریعت اور نظام حکومت کے لیے ایک خلیفہ مقرر ہوا اور سلسلہ طریقت کیلئے نائب رسول اللہ کی حیثیت سے حضرت علیؓ مقرر کئے گئے۔ ان حضرات کے طریقِ مشاہدہ میں وہی کچھ عمل تھا۔ جو انہیں حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے وحی جلی (قرآن) کی روشنی میں تعلیم دیا اور اسکے ساتھ ہی قرآن (قرأت وتہجد) کی تفسیر میں جو وحی خفی [1] حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کو حاصل ہوئی وہ طریق بھی انہیں بتایا۔ لیکن یہ نہیں کہا جا سکتا۔ کہ باقی اصحاب میں سے کسی اور کو اس طریق سے آگاہ نہیں کیا۔ نہیں۔ بلکہ اپنے قریبی اصحاب میں سے اکثر اصحاب کو بھی بتایا۔ البتہ جن میں اطاعت۔ اتباع۔ اور حُب کا مادہ جسقدر رشدت سے موجود تھا۔ اسی قدر ہر شخص کو بتایا گیا۔ چنانچہ یہ واقعہ اس امر کی شہادت ہے۔ کہ بظاہر حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے متعلق۔ حضرت علی کرم اللہ وجہہ جیسی سند (اَنَا دَارُ الْحِکْمَةِ وَعَلِیٌّ بَابُهَا) نہیں پائی جاتی۔ اسکے باوجود حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے خطبہ کے وقت یَا سَارِیَہ اِلَی الْجَبَلِ پکار کر ساریہ کو (جو کہ ایک دور مقام پر جہاد میں مخالفین اسلام کے ساتھ برسر پیکار تھے۔) میدان جنگ میں اطلاع پہنچا دی۔ یہ کیفیت مشاہدہ سے تعلق رکھتی ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے۔ کہ اگرچہ ان اصحاب کے متعلق حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کا کوئی ظاہری فرمان نظر نہیں آتا۔ تاہم ان میں سے اکثر حضرات خصوصاً حضرت ابو بکرؓ۔ حضرت عمرؓ۔ حضرت عثمانؓ اور کئی دیگر صحابہ کو بھی علم دیا گیا۔ فرق صرف ذاتی فکر

---

[1] وحی خفی سے مراد۔ جو عالم مشاہدہ میں باری تعالیٰ کی طرف سے ظاہر وحی (وحی جلی قرآن) کے ماسوا تعلیم ملتی رہی۔ یہ تعلیم حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کے ذاتی عمل سے تعلق رکھتی ہے۔ اس میں سے ایک حصہ آپکا اسوۂ حسنہ ہے۔ اور ایک حصہ وہ علم اور مشاہدات ہیں جو حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کے قلب وشعور سے تعلق رکھتے ہیں۔ عام استطاعت (مشاہدہ) نہ ہونے کے باعث یہ علم صاحب مشاہدہ (علماء) کو ہی حاصل ہوا۔

تجسس اور عمل کا تھا۔ اطاعت۔ اتباع حب سے مراتب حاصل ہوتے ہیں۔ البتہ مشاہدات میں انسان میں جسقدر قلب و شعور میں وسعت ہواسی قدر کم و زیادہ مشاہدہ حاصل ہوتا ہے۔ چونکہ یہ طریق اخفا سے تعلق رکھتا ہے۔ اسلئے باقی دیگر احکام و عمل کی طرح محسوس نہیں کیا جاتا۔

الغرض حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کے بعد آپ کی امت میں خلافت کا جو سلسلہ چلا اس میں طریق مشاہدہ کی راہنمائی حضرت علی کرم اللہ وجہہ کے سلسلہ سے جاری ہوئی۔ اور آپ سے حضرت حسن۔ حضرت حسین۔ حضرت حسن بصری رضی اللہ عنہم کو خلافت ملی جن میں حضرت حسن رضی اللہ عنہ سے ایک سلسلہ چلا۔ حضرت حسین علیہ السلام سے دوسرا۔ اور حضرت حسن بصریؒ سے تیسرا چلا۔ یہ تینوں سلسلے طریقت کے خصوصی سلسلے ہیں۔ اور ان تینوں حضرات کو حضرت علیؓ کے ذریعہ وہی منصب عطا ہوا جو ایک ولی اکمل کیلئے ہونا چاہیے۔ یعنی ولی اکمل وہ ہستی ہوتی ہے۔ جو خود عرفان الٰہی اور قربِ الٰہی میں بدرجہ اکمل مشاہدہ و مراتب میں تکمیل کر کے علم حاصل کر چکا ہو۔ اسلئے آئندہ انسان کیلئے ہر زمانہ میں اب اسی سلسلہ سے عرفانِ الٰہی اور مشاہدہ حاصل کرنے کیلئے وقت کے پیر اکمل یا عالمِ شریعت کی طرف رجوع کرنا۔ گویا شریعت کی تکمیل ہوتی ہے۔

اللہ کا قرب حاصل کرنے کیلئے۔ رسول کی اطاعت۔ اتباع۔ حب کرنا ہی جب طریق عرفان ہے۔ تو رسول کے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت۔ اتباع۔ حب کیلئے ضروری ہے۔ کہ پیر اکمل کیلئے جو قائم مقام رسول ہے نائب رسول اللہ کی حیثیت سے یہی کیفیت قائم کی جائے۔ یہ طریق مشاہدہ و عرفان کیلئے ایک خصوصی طریقہ ہے۔ کیونکہ مشاہدہ میں جب تک فنا حاصل نہ ہو۔ تب تک انسان کیلئے واصل الی اللہ کا کوئی اور ذریعہ نہیں ہوسکتا ہے۔ اور جو ولی فنافی الرّسول کا مقام حاصل کر چکا ہو وہی فنافی اللہ کا مقام حاصل کرسکتا ہے۔ چونکہ ولی اکمل اپنے مقصد کی تکمیل کر چکا ہوتا ہے۔ اسلئے عام انسانوں کیلئے جن میں اپنی ذاتی مشاہدہ کی صلاحیتیں مسخ ہو چکی ہوتی ہیں انہیں پیر اکمل سے علم ہی حاصل کرنا ہوتا ہے۔ اسکا طریق یہی ہے۔ کہ انسان اول پیر اکمل کی ہدایت پر اطاعت کرے۔ پیر اکمل راہنما ہوتا ہے۔ وہ علم شریعت کی تفسیر کر کے تابع و مطیع کو بتاتا ہے۔ يَتْلُوْا عَلَيْهِمْ

ایتہ ۔پھر طریق تزکیہ بتا کر تزکیہ کرتا ہے۔وَیُزَکِّیۡھِمۡ ۔اور تزکیہ کے بعد جو علم مطیع کو حاصل ہوتا ہے۔ اسکے صحیح وغلط مشاہدہ کی تصحیح اور اصلاح کے ساتھ اصل مشاہدہ کراتا ہے۔وَیُعَلِّمُھُمُ الۡکِتٰبَ ۔اس علم میں ان اسرار ورموز سے آگاہ کراتا ہے جو عرفان راہ حقیقت میں واقع ہوں۔وَالۡحِکۡمَۃَ۔اس طریق میں سب سے پہلے اطاعت واتباع کے ساتھ پیر اکمل کی حب بطریق سنت نبوئ ہوتی ہے۔جیسی اللہ کی حب کیلئے رسول کی حب کی جائے۔اوراسی طرح رسول کی حب کیلئے ایک وسیلہ (پیر اکمل) کو ہی اپنے تصورات کا مرکز بنایا جاتا ہے۔کیونکہ پیر اکمل کا وجود فنافی رسول اور فنافی اللہ میں جذب ہو چکا ہوتا ہے۔اسلئے مطیع کی اپنے مشاہدہ میں جب نظر کھل جائے تو وہ اپنے تصور کو ہی پائیگا۔اور یہ مقام خود بخود رسول کے نور سے پیوست ہوگا لہذا۔یہی ذریعہ (پیر اکمل کا تصور) اسے فنافی شیخ کی صورت میں پیر اکمل کے نوری وجود میں جذب ہو کر رسول سے فنا حاصل کرائے گا۔جب رسول کے فنا کا مقام حاصل ہوا۔تو پھر طریقت کے ابتدائی مقام کی کیفیت حُب رسول کے مقام پر فنافی الرّسول کا درجہ حاصل ہوگا۔اسی طرح فنافی اللہ میں ذاتِ باریٔ تعالیٰ کی ہی حب مقصود ہوگی اوراسی کا عرفان حاصل ہوگا ــــ اس سے ظاہر ہوتا ہے۔کہ پیر اکمل کا تصور طریق عرفان میں ضروری ہوتا ہے۔

تصور کیا چیز ہے؟ تصور سے مراد ایک ہیئت کی صورت کو حافظہ کے ذریعہ تعقل وشعور کے سامنے لانا۔ جو ہیئت تعقل کے سامنے آئے وہ تصور خیالی کہلاتا ہے۔یعنی حواس (بصر) کے ذریعہ حاصل کردہ ہیئت جب حافظہ میں جمع ہو جاتی ہے۔تو کسی وقت اس ہیئت کو دوبارہ تعقل کے سامنے لانے سے یہ مراد ہوتی ہے۔کہ ہم اس ہیئت کی صورت سے دوبارہ آگاہ ہوں۔یہ ہیئت جبکہ اسکا وجود ہمارے سامنے دوبارہ نہ ہو۔اپنی غیر جسمانی ہیئت میں پہلے شعور کے سامنے آجاتی ہے۔پھر تعقل اس سے آگاہ ہو جاتا ہے۔ لیکن اس ہیئت میں اسکے مادی وجود کی تمثیلی صورت ہی ہوتی ہے۔اور چونکہ یہ صورت حافظہ سے ہی نکلتی ہے۔اسلئے اسے تصور خیالی سے تعبیر دیا جاتا ہے ــــ اور جب ہم اس ہیئت کا احساس کرتے ہیں تو ہمیں اس کی وہی صورت نظر آتی ہے۔جو اس کی مادی ہیئت کی صورت حافظہ میں جمع ہوتی ہے۔اسلئے یہ تصور حقیقی نہ ہونے کے باعث قابلِ توجہ نہیں ہوتا ہے۔اور نہ اس تصور کی ضرورت ہوتی

ہے۔اسکے علاوہ ایک ہیئت کی صورت جب ہمارے حافظہ میں موجود نہ ہو صرف کان کے ذریعہ اسکا نام سُنکر صرف نام ہی حافظہ میں جمع ہو۔تو اس ہیئت کا تصّور جب کیا جائے۔تو اس وقت بھی ایک ہیئت ہمارے شعور کے سامنے آئیگی۔یہ صورت بھی تمثیلی اور غیر جسمانی ہوگی۔اسکا وجود حافظہ سے نہیں نکلے گا بلکہ واہمہ سے پیدا ہوگا جو ایک شے کا نام اور رنگ پیدا کرتا ہے۔(کیونکہ واہمہ کی یہ خاصیت ہے کہ بعض اوقات ایک غیر مجسم شے کا بھی وجود پیدا کرتا ہے جسے وہم کہتے ہیں)اس حالت میں یہ اپنی قوت اور گزشتہ نقوش جو اسکے ذریعہ حافظہ تک پہنچ چکے ہیں انہیں نقوش کے مطابق (نام سے مطابقت کرنے والے اجزا کا) ایک مجسم وجود پیدا کر کے حافظہ تک پہنچائے گا۔اور حافظہ سے شعور منعکس ہو کر ایک وہمی تصور کا احساس کرے گا۔مثال کے طور پر ہم نے سکندریہ کی بندرگاہ کا نام سُن لیا۔کہ یہ سمندر کے کنارے ایک جگہ ہے۔جہاں سمندری جہاز جمع ہوتے ہیں۔اس جگہ کے تصور میں اس سے پیشتر نہ سمندر دیکھا ہے۔نہ جہاز دیکھا ہے۔نہ بندرگاہ دیکھی ہے۔تو اب ہمارا حافظہ دریا سے بڑا پاٹ۔کشتی سے بڑی کشتی اور ہمارے واہمہ اور حافظہ سے گزری ہوئی سب سے بڑی عمارت کے نقوش کا ایک منظر سامنے لائے گا۔چونکہ ہم خیالی طور سکندریہ سے آگاہ نہیں اسلئے یہ تصور ایک طرف واہمہ اور حافظہ کے جمع شدہ نقوش کے مختلف اجزا کا مجسمہ ہوگا۔اسلئے یہ تصور بھی واہمی اور خیالی سمجھا جائیگا۔اسکی بھی کوئی حقیقت نہ ہوگی۔کیونکہ اصل وخیالی تصور کے تقابل پر یہ چیز اصل کے بالکل برعکس ہوگی۔اسلئے یہ تصور بھی قابلِ توجہ نہیں ہوگا۔یہ بھی غیر حقیقی تصور کہلائیگا۔

اسکے علاوہ جب ایک ہیئت کی صورت ہمارے شعور کے سامنے مشاہدہ میں آئے۔جس میں واہمہ کا دخل بھی نہ ہو۔اور اس میں حافظہ کے جمع شدہ اجزا کی ملاوٹ بھی نہ پائی جائے۔تو وہ ہیئت ان کیفیات سے مختلف بلکہ اپنی اصلی روحانی (غیر جسمانی) ہیئت میں واقع ہوگی۔اور اصل کے ساتھ مقابلہ میں ہو بہو ہوگی۔تو یہ تصور تصور حقیقی کہلائیگا۔اس ہیئت کی صورت کا علم حاصل کرنے کیلئے دو چیزوں کا ہونا ضروری ہے۔ایک یہ کہ یہ کیفیت واہمہ۔حافظہ سے حاصل شدہ نہ ہو۔دوسرے ایک عالم کی تصدیق بھی اسکی حقیقت کیلئے حاصل ہو۔ایک ہیئت اگر واہمہ۔حافظہ سے حاصل نہ کی جائے۔

اور حواس میں بھی آنے والی نہ ہو۔ تو اسکے حصول کا ذریعہ صرف قلب و روح (روح جسمانی اور روح رحمانی) ہی ہو سکتا ہے۔ اور اس ہیئت کو حقیقی ماننے کیلئے اس عالم کی تصدیق بھی ہونی ضروری ہے جسے اس کیفیت کا حقیقی علم حاصل ہو چکا ہو۔ یہی کیفیت تصور حقیقی کہلاتی ہے۔ اور اسکا تصدیق کنندہ ایک عالم یا پیر اکمل کہلاتا ہے۔ لیکن اس تصور اور عالم (پیر۔ راہنما) کی بھی دو نوعیتیں (قسمیں) ہیں۔ ایک قسم یہ ہے۔ کہ جہاں تک مادیت کا تعلق ہے۔ یہ اشیاء حواس میں آسکتی ہیں۔ اور حواس کے ذریعہ[1] علم حاصل کرنے والا بھی مادی اشیاء کا عالم کہلائیگا۔ اسکا علم مادی ہوگا۔ اور مادی ہونے کی صورت میں اسکے علم کی وقعت روحانیت کے مقابلہ میں کچھ نہیں سمجھی جائے گی۔ اسکی دوسری قسم یہ ہے۔ کہ ایک شخص اپنی جسمانی قوت کے ساتھ روح حیوانی کی قوت کے ذریعہ (حواس میں نہ آنے والی اشیاء کا) مشاہدہ کرے تو وہ بھی ان مادی قوتوں کا ہی مشاہدہ کرے گا جو حس کے احاطہ میں آسکتی ہیں اسلئے ایسے عالم کو بھی پیر اکمل کے نام سے موسوم نہیں کیا جائیگا۔ نہ اسکے مشاہدات و تصورات کو مشاہدات حقیقی کہا جائیگا۔ البتہ ان مشاہدات میں یہ ضروری ہے کہ دونوں حالتوں میں مشاہدہ کئے ہوئے مقام کا قرب و عرفان (یعنی مقام تک پہنچنا) حاصل ہو ورنہ بغیر پہنچے اور پہچاننے کے ان کی تصدیق قابلِ قبول نہیں ہو سکتی نہ ایسے شخص کو عالم کہا جائیگا۔ ایسے اشخاص میں بعض ایسے بھی ہوتے ہیں کہ وہ بغیر دیکھے پہچانے (حواس کے ذریعہ) بغیر مشاہدہ (روح حیوانی کے ذریعہ) اگر انہیں کسی عالم کے ذریعہ صرف سننے (واقعات کے پڑھنے یا سننے) سے واقعات کا علم حاصل ہو چکا ہو۔ تو کسی طالب علم کی راہنمائی یا تصدیق کریں۔ تو یہ طریق گمراہ کن ہوگا کیونکہ بذاتِ خود واقعات مشاہدہ نہ کرنے کی صورت میں اگر کسی طالب علم نے ایسے مقامات کا صحیح ایسا نقشہ پیش کیا۔ جو بعد میں بدل چکا ہو۔ تو لازمی طور ایسے عالم نے اسکی نفی کرنی ہے۔ ایسی حالت میں ایک صحیح مشاہدہ کی غلط تائید طالب علم کے مشاہدہ کو غلط راہ کی طرف لے جائیگا۔

---

[1] حواس کے ذریعہ سے مراد یہ ہے۔ کہ ایک شخص نے مادی اشیاء کو خود دیکھا ہو اور ان کیفیتوں سے واقف ہو۔ خواہ اس نے اشیاء کو آنکھ سے دیکھا ہو۔ یا دیگر ذرائع دوربین خوردبین وغیرہ سے دیکھی ہوں۔ یہ عالم مادی عالم کہلاتا ہے۔

جو گمراہ کن ہوگا۔ یہ کیفیات چونکہ مادی ہیں اسلئے ان میں اسقدر گمراہی کا احتمال نہیں۔ کیونکہ یہ کیفیات حواس میں آتی ہیں اور ذاتی حواس کی مدد سے انکی تصحیح و تصدیق ہوسکتی ہے۔ لیکن جہاں عالم ارواح ماوراء مادہ کی کیفیات ہوں وہاں سوائے قلبی روحی مشاہدہ کے علم حاصل نہیں کیا جا سکتا۔ یہ قسم تصور اور عالم کی دوسری ہے۔ یہاں کا تصور جب آئیگا تو حقیقی صورت میں ہوگا اور اسی تصور کا مالک پیر اکمل کہلانے کا مستحق ہوگا۔۔۔۔ یعنی جب تک ایک شخص اپنی روح رحمانی کے ذریعہ روحانی عالم میں نہ پہنچے اسے وہاں کے حالات کا علم نہ ہو سکے گا۔ نہ اسکا تصور ان کیفیات کا کوئی خیالی نقشہ پیش کر سکے گا۔ روح رحمانی کا ماوراء ادراک غیر مادی عالم تک پہنچنا ہی ایک حقیقی تصور کو پیدا کر سکتا ہے۔ اور غیر مادی کیفیات میں پہنچنا اور اسکا مشاہدہ بغیر کیفیات میں جذب ہونے کے نہیں ہوسکتا۔ اور جذب ہونے والے شخص کو ہی عارف [1] اور شاہد کہا جاتا ہے۔ اور جب یہ اپنے عرفان و مشاہدہ کی بدرجہ اتم تکمیل کرے تو اسکے جذب کی تکمیل اسکی روح کے مشہود میں فنا سے ہی ہو جاتی ہے۔ تصور ۔۔۔۔ پیر اکمل کی اصلی نوعیت یہی ہے۔ کہ حقیقت کا تصور ہو اور پیر اکمل کی روح ذاتِ باری تعالیٰ (نورِ الٰہی) میں جذب ہو چکی ہو۔ تو ایسی صورت میں جبکہ مقصود صرف پیر اکمل کی روح رحمانی کا تصور ہی ہوتا ہے۔ تو پیر اکمل کی روح رحمانی کے منازل میں ہی اس روح کا تصور کیا جائیگا۔ گویا یہ تصور پیر اکمل کے مادی وجود کا نہیں بلکہ اسکے روحانی وجود کا ہے۔ اسلئے پیر اکمل کے تصور میں جب ہمارے حافظہ واہمہ میں اسکے روحانی وجود کا کوئی نقشہ موجود نہیں۔ تو ہمیں صرف قلب و روح رحمانی کے ذریعہ ہی اسکا حقیقی تصور حاصل ہوگا تو جس حالت میں اسکا وجودِ روحانی قائم ہوگا۔ ہمارا تصور (منزل و کیفیات کے ساتھ) اسی حالت کا تصور سمجھا جائیگا۔

مثال کے طور اگر ایک عالم شریعت احکام کی تعمیل کے ساتھ۔ تزکیہ۔ مجاہدہ کے ذریعہ نور محمدیؐ (تصور محمدیؐ) کی منازل طے کر چکا ہوگا تو ہمیں اسکے روحانی تصور میں نورِ محمدیؐ حاصل ہوگا۔ گویا پیر اکمل کی روح نور محمدیؐ کے حاصل کرنے کا وسیلہ (ذریعہ) ہوگی۔ اسلئے جب ہم پیر اکمل کا تصور کریں۔ تو اسکا

---

[1] جذب و مشاہدہ کی تشریح آگے آئیگی۔

مطلب یہ ہوگا کہ ہمیں قرب الٰہی حاصل کرنے کیلئے پہلے نور محمدیؐ کی فنا حاصل کرنی ہے۔اور چونکہ نور محمدیؐ کی فنا پیر اکمل کو حاصل ہوتی ہے۔تو ہم اسی ہیئتِ روحانی کے اعتبار سے پیر اکمل کا تصور اسلئے کرتے ہیں کہ ہمیں پیر اکمل کے روحانی وجود کی کیفیت حاصل ہوتا کہ اسی کیفیت کے ذریعہ ہم نور محمدیؐ کی کیفیت حاصل کریں اور اسی نور محمدیؐ کی کیفیت کے وسیلہ ہم نور الٰہی حاصل کریں ___ یہی تصور کی تین کیفیتیں فنافی شیخ۔فنافی الرّسول اور فنافی اللہ کے نام سے موسوم کی جاتی ہیں۔

تصور اور فنا کی کیفیت حاصل ہونے کا ذریعہ۔حُب ہی ہے۔اور حُب سے مراد ایک راہنمائے اکمل کے ان احکام کی تعمیل کرنی۔جو احکام قرآنی ہوں۔جو احکام رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے ہوں۔اور وہ احکام جو طریق مشاہدہ میں پیر اکمل کو تزکیہ۔مجاہدہ اور مشاہدہ حاصل ہونے کیلئے حاصل ہوں۔ان میں کچھ تو ظاہر شریعت سے تعلق رکھتے ہیں۔کچھ تزکیہ و مجاہدہ (زائد عبادت) سے تعلق رکھتے ہیں۔اور کچھ وہ علم ہے۔جو علماء طریقت نے طالبانِ حقیقت کیلئے ہر زمانہ میں ان کی حصول کی سہولت کے لیے اختراع کئے ہوں۔یہ اختراع اگرچہ ظاہر شریعت سے ماسوائے محسوس ہوتی ہے۔لیکن اس عمل سے انکار نہیں ہوسکتا کیونکہ یہاں واقعات کا حاصل کرنا شعور و قلب سے ہے۔اسلئے انکی تحقیق حصول علم کی پختگی اور قلب و شعور سے ہی ہوتی ہے۔اور جب قلب و شعور اس عمل کے نتائج کو پالیتا ہے۔تو یہ عمل بھی شریعت کے احاطہ میں لازمی طور آجاتا ہے۔

اب دیکھنا یہ ہے۔کہ شریعت کے احکام۔نماز۔روزہ۔صدقات اور تزکیہ مجاہدہ۔رات کا جاگنا۔نوافل تہجد۔قرأت قرآن کے نتائج کیا ہیں اور کیا کیفیتیں تصور اور پیر اکمل کی راہنمائی میں حاصل ہوتی ہیں۔

قرآن کریم نے شریعت کے احکام کی تعمیل کا ایک واضح بیان بتادیا ہے کہ وَاَنِ اعْبُدُوْنِیْ ط هٰـذَا صِرَاطٌ مُّسْتَقِیْمٌ ○ (پارہ ۲۳ سورۃ ۳۶ آیت ۶۱) اور یہ کہ میری عبادت کرو یہی سیدھا راستہ ہے۔عبادت سے مراد اللہ تعالیٰ کے احکام (شریعت کے احکام) کی تعمیل کرنا۔یعنی نماز قائم کرنا

وَاَقِیْمُوا الصَّلٰوۃَ ۔ روزہ رکھنا کُتِبَ عَلَیْکُمُ الصِّیَامُ ۔ تم پر روزہ رکھنا فرض کیا گیا وَاٰتُوا الزَّکٰوۃَ ۔ اور دو زکوٰۃ ۔ یہ تو عبادت ہے۔ اور اسکا سیدھا راستہ ہونے سے مراد اللہ کا قرب حاصل کرنے کیلئے ان احکام کی تعمیل میں انکے نتیجہ عمل ا میں جو کیفیات (انوار) قائم ہوں گی وہی کیفیات اللہ تک پہنچنے کے لیے ایک راستہ کی صورت میں قائم ہیں۔ اور صِرَاطَ الْمُسْتَقِیْمَ میں کیا کیفیات ہیں۔ اسکی تشریح بھی قرآن خود کرتا ہے صِرَاطِ اللّٰہِ الَّذِیْ لَہٗ مَافِی السَّمٰوٰتِ وَمَافِی الْاَرْضِ یعنی عبادت کے نتائج کی کیفیات اللہ کا راستہ ہیں اور اللہ کا راستہ کہاں سے ملتا ہے۔ وہ جو کچھ کیفیات زمین اور آسمانوں میں ہیں یہی کیفیتیں ہیں جو اللہ تک پہنچنے کا راستہ ہیں۔ تو اس سے معلوم ہوا کہ تفکر اور تلاشِ حقیقت میں اللہ کو پانے کیلئے زمین و آسمان کی کیفیات کا مشاہدہ کرنے سے ہی تعبیر دیا گیا ہے۔ اور اسکی تائید اس تحریک سے ہوتی ہے۔ اِنَّ فِیْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۔ ایت " لِّلْمُوْقِنِیْنَ ۝ وَفِیْٓ اَنْفُسِکُمْ ط اَفَلَا تُبْصِرُوْنَ ۝ تحقیق زمین و آسمان کی پیدائش (بناوٹ) میں البتہ (اللہ کے خالق و معبود ہونے کی) نشانیاں ہیں اور اسکے علاوہ انسان (مرکب مادہ و نور، اور اشرف المخلوقات، مجسم جہاں) میں بھی اللہ کے خالق و معبود ہونے کی نشانیاں موجود ہیں۔ کیا تم حواس (آنکھ) کے ذریعہ نہیں دیکھتے؟

گویا اللہ کو پانے کیلئے انسان کے تفکر میں جب ابتدائی تحریک ہوتی ہے۔ تو وہ ابتداً حواس کے ذریعہ کائنات کی اشیاء کی بناوٹ میں تخلیقی ترکیب میں کسی خالق کی صناعی کی خصوصیت محسوس کرتا ہے۔ یہی کیفیت اسے خالق کی تخلیق کا راز پانے کی تحریک دیتی ہے۔ اور یہی تلاش اسے زمین کی ابتدا

ا اس میں شک نہیں کہ انسان کو دنیا میں رہ کر فطرت کی مطابقت کرنے کیلئے ایک نیک اور سیدھے رستے کی ضرورت ہے۔ کہ وہ خلاف فطرۃ افعال کا مرتکب نہ ہو اسکے لیے عبادت بجائے خود ایک راستہ کی صورت میں قائم کی گئی ہے۔ گویا عبادت کرنا ہی ایک سیدھا راستہ ہے۔ لیکن سیدھی راہ پر چلنے کا مقصد بھی یہی ہے کہ انسان اپنے مقصود و نصب العین کو پالے۔ سو مقصود پانے کے لیے جو راہ اختیار کرنی ہے۔ وہ اسی صراط مستقیم کے ذریعہ حاصل ہوتی ہے۔ اسلئے عبادت کا نتیجہ صراط مستقیم کہلاتا ہے۔ چونکہ انسان کا مقصود عرفان الٰہی ہے۔ اسلئے عرفانِ الٰہی کی راہ صراط مستقیم سے ہی ملتی ہے۔

سے آسمانوں کی تحقیق (لَہٗ مَافِی السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ) میں اللہ کی راہ کی طرف ڈال دیتی ہے۔ اور اسکا طریق وَاَنِ اعْبُدُوْنِیْ ط ھٰذَا صِرَاطٌ مُّسْتَقِیْمٌ۔ ہی ہے۔ اور پھر ایک آسان راہ انسان کا ذاتی وجود ہے۔ کہ وہ اپنے اشرف المخلوقاتی وجود پر تفکر کرے۔ تو اسے خود بخود اللہ کی راہ کا نشان مل جائیگا۔ اسی کیفیت کی طرف حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے اشارہ فرمایا ہے کہ مَنْ عَرَفَ نَفْسَہٗ فَقَدْ عَرَفَ رَبَّہٗ۔ جس نے اپنی ذات کی تخلیق بناوٹ۔ مرکب اور اسکی علت کو پہچانا اسنے گویا اپنی ابتدائی علت (علت لامحدود) اور اسکی تخلیق کے کمالاتِ سَمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ کو پہچانا ــــ یہ سب غیر جسمانی کیفیات و مقامات ہیں۔ اور وَاَنِ اعْبُدُوْنِیْ سے یہی مقاماتِ صراط مستقیم (مراتب کی صورت میں) حاصل ہوتے ہیں۔ اسلئے یہ فیصلہ شدہ امر ہے۔ کہ نماز۔ روزہ۔ صدقات (زکوٰۃ) وغیرہ عمل سے اللہ کا راستہ مل جاتا ہے۔

ان عبادات کے عمل سے یہی مقصود ہے۔ کہ عرفان و قرب الٰہی حاصل ہو۔ جب اس نظریہ کو لے کر ہم عبادت کریں۔ تو ہمارے لئے لازمی ہے۔ کہ ہمارے قلب و شعور میں ایک اللہ کا تصور قائم ہو جائے۔ اور جب ہم عبادت کریں۔ تو ہم ایک حقیقی تصور کے ساتھ عبادت کریں۔ چنانچہ اس نظریہ کی تائید اس حدیث سے ہوتی ہے۔ قَالَ اَنْ تَعْبُدَ اللّٰہَ کَاَنَّکَ تَرَاہُ فَاِنْ لَّمْ تَکُنْ تَرَاہُ فَاِنَّہٗ یَرَاکَ (متفق علیہ) کہ تم نماز کو اسطرح ادا کرو۔ کہ گویا تم اللہ کے سامنے (اللہ کے نور کا مشاہدہ کرتے) ہو اور اگر تم (اپنے تزکیہ مجاہدہ میں کامل نہیں) اللہ کو نہیں دیکھ سکتے۔ تو (مراتب کے لحاظ سے یہ تصور کر لو) سمجھ لو کہ اللہ تمہیں دیکھتا ہے اور پھر اسی تصور کی تقویت کیلئے اللہ تعالیٰ خود ایک تصور کی راہ بتاتا ہے۔ کہ اَلصَّلٰوۃُ مِعْرَاجُ الْمُؤْمِنِیْنَ۔ ایک مومن کیلئے نماز ایک تصور کی ابتدائی سیڑھی پیدا کرتی ہے۔ جس سیڑھی سے زینہ بہ زینہ تم اللہ کی راہ سے ہوتے ہوئے اللہ تک پہنچ سکتے ہو۔ یہاں معراج سے مراد۔ کیفیتِ تصور کا پیدا کرنا اور مشاہدہ راہ عرفان کا حاصل کرنا ہے۔ یعنی جب شریعت کے اس حکم کی تعمیل کے ساتھ تزکیہ و مجاہدہ سے قلب و روح میں تقویت پیدا ہو تو اس عبادت کے عمل سے تمہارے سامنے ایک راہ پیدا ہو گی۔ جو تم اپنے مشاہدہ میں پاؤ گے یہی راہ اللہ

تک پہنچنے والی ہوگی۔

اسکے ساتھ ہی سال میں ایک ماہ کے روزے بھی ایک کیفیت کے حامل ہیں۔ یہ کیفیت تمہیں اپنی منزل کی وسعتوں میں لے جائیگی اور تم پے در پے منازلِ الٰہی کا مشاہدہ کرتے جاؤ گے۔ اسی طرح زکوٰۃ۔ تمہیں مادیت سے علیٰحدہ کر کے تمہاری پرواز میں اتنا اضافہ کرے گی کہ کوئی مادی شے تمہارے قلب وروح کے آگے حائل نہ ہو سکے گی۔ اسی طرح ہر عمل کی کیفیت تمہیں منزل مقصود کی طرف لے جائے گی۔ یا تم اسے حاصل کرو گے ـــ اور اس قرب کا خاصہ یہی ہے۔ کہ تمہارے تصورات حقیقی ہوں۔ اور جب ایک شخص منازل الٰہی کا مشاہدہ اپنے قلب وروح کے ذریعہ شعور تک پہنچاتا ہے۔ تو اسے ایک راہنما کی ضرورت ضرور پڑتی ہے۔ کہ وہ اسے قبل از وقت شریعت کی پابندی میں طریق تزکیہ ومجاہدہ سکھائے۔ اور سنت نبویؐ کے مطابق تلاوت۔ تزکیہ۔ علم۔ اور حکمت سے روشناس کرنے کے بعد ہر عمل کی باطنی کیفیت (نتیجہ) سے روشناس کرائے۔ یہ سب امور یقینی طور پیر اکمل کے ذمہ ہی ہوتے ہیں یہ ایک اصول ہے۔ کہ کوئی شخص بغیر کسی خصوصی راہنمائی کے اپنے علم کی تصدیق وتکمیل نہیں کر سکتا۔ جب تک کہ اسے ایک خاص عالم کی راہنمائی حاصل نہ ہو۔ یہی طریق علم العرفان کا ہے۔ کہ جب تک اس علم کے حاصل کرنے میں ایک اجل واکمل عالم کی راہنمائی حاصل نہ ہو۔ یہ علم کبھی حاصل نہیں ہوسکتا۔

البتہ اس چیز کا فرق رکھنا ضروری ہے۔ کہ شریعت کے عام احکام کا علم علمِ ظاہری کہلاتا ہے اور عام لوگ اس پر عامل ہوتے ہیں۔ اسلئے اسکے عالموں کے لیے یہ ضروری نہیں۔ کہ وہ صاحبِ مشاہدہ ہوں لیکن قرآن وحدیث کے حقیقی مطالب ومعانی سے انہیں مکمل واقفیت ہونی ضروری ہے۔ کہ وہ قرآنؐ کے ارشادات کا وہی مطلب اخذ کریں جو حقیقتاً اس میں موجود ہے۔ ایسے عالموں کو امام کے نام سے موسوم کیا گیا ہے۔

دوسری چیز یہ ہے کہ یہی علم جو اماموں نے مکمل کر کے امت کو پیش کیا ہے۔ ہمارے لیے عرفان الٰہی کا تمام علم اس میں موجود ہے۔ لیکن اس علم کی تکمیل ولی اکمل سے ہی ہوتی ہے۔ حقیقتاً مراتب

کے لحاظ سے امام اور ولی اکمل میں مراتب حاصل کرنے میں کچھ فرق نہیں ہوتا۔ کیونکہ دونوں کے پاس مراتب حاصل کرنے کا ایک ہی ذریعہ ہوتا ہے۔ البتہ امام اور ولی اکمل میں یہ فرق ضرور ہوتا ہے کہ امام قرآن وحدیث کی تفسیر مشاہدہ کے بغیر صرف قلبی القاء[1] (بغیر مشاہدہ۔ صرف کیفیت کا قلب پر آ جانا۔ لیکن شعور سے آگاہی حاصل نہ کرنا) سے کرتا ہے۔ اور ولی اکمل چونکہ اپنے اوپر ریاضت ومجاہدہ کی تکلیف بھی لیتا ہے اور قرآن وحدیث کے ہر ارشاد کا باطن (نتیجہ) شعور سے مشاہدہ کرتا ہے۔ اسلئے امام کے مقابلہ میں ولی اکمل کا علم پختہ۔ حقائق سے پُر اور حقیقی مطالب ومعانی کا حامل ہوتا ہے۔ جس میں کسی قسم کی غلطی کا احتمال نہیں ہوسکتا۔ اور اس علم کی بنا پر ایک ولی اکمل اپنے عمل اور علم کے اعتبار سے افضل ہوتا ہے۔ ایسی حالت میں ایک ولی اکمل کی راہنمائی باقی عالموں کے مقابلہ میں زیادہ اہم اور خصوصی ہوتی ہے۔ یہ ضرورت عوام کے مقابلہ میں صرف مشاہدہ کرنے والے کے لیے مخصوص ہوتی ہے۔

ولی اکمل سنتِ نبوی کے مطابق رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا قائم مقام ہوتا ہے۔ اور اسی سے علم الٰہی (شریعت) کی تکمیل ہوتی ہے۔ اسلئے حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کے بعد آپکے قائم مقام (خلیفہ یا نائبِ رسول) ولی اکمل ہی ہوتا ہے جو بطریق نبوت۔ قرآن وحدیث اور مشاہدہ کا علم امت کو پہنچاتا ہے۔ گویا امام علم کی بنیاد کو قائم رکھتا ہے۔ اور ولی اکمل اس بنیاد پر عرفان کی عمارت مستحکم کرتا ہے۔ امام قرآن وحدیث کے احکام کو ایک حقیقی صورت میں پیش کرتا ہے۔ اور ولی اکمل اپنے عمل اور مشاہدہ سے اس حقیقت کی تصدیق کرتا ہے۔ اسلئے علم کی حقیقت کا انحصار ولی اکمل کی تصدیق اور طریق

---

[1] قلبی القاء۔ قلبی القاء سے مراد یہ کہ امام شریعت کے احکام پر بدرجہ کمال عامل ہوتا ہے۔ شریعت کے عمل سے اسے تزکیہ نفس حاصل ہوتا ہے۔ اسکے قلب میں لطافت پیدا ہوتی ہے۔ اسے کلی طور مشاہدہ کی قوت حاصل نہیں ہوتی جس سے صراط اللہ اور قرآنی علم کا مشاہدہ ہوسکے۔ البتہ شریعت کی پابندی اور تقویٰ سے قلب کی کیفیت لطیف ہونے سے علم کا عکس ضرور قلب پر آ جاتا ہے (صرف اس عکس کو شعور حاصل نہیں کرتا) اسی عکس کے ذریعہ امام قرآنی آیات کی حقیقی تفسیر کرتا ہے۔ جو اسکے قلب پر آ جاتی ہے۔ اسی کیفیت کو فقہ کہا جاتا ہے۔ جیسے لَهُمْ قُلُوبٌ ۝ لَّا يَفْقَهُونَ بِهَا۔

تزکیہ مجاہدہ پر ہی ہوتا ہے۔اس سے یہ واضح ہوتا ہے۔کہ انسان کو علم حاصل کرنے کے لیے ایک ایسے عالم کی طرف رجوع کرتا ہے۔جو من کل الوجود قرآنی علم سے آگاہ ہو تزکیہ مجاہدہ کا علم بھی رکھتا ہو۔ اگرچہ امام بھی سنتِ نبوی کے مطابق علم کو لوگوں تک پہنچاتا ہے۔لیکن ولی اکمل تزکیہ مجاہدہ سے طریق نبوت کی تکمیل کر دیتا ہے۔یعنی جس طرح حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے اپنے علم کی تکمیل کے ساتھ راہنمائی کی تکمیل کی اسی طرح ولی اکمل بھی شریعت کے ساتھ طریقت کی تکمیل کر کے راہنمائی کا مقام حاصل کرتا ہے۔اور یہ علم بغیر ولی اکمل کے اور کسی کو حاصل نہیں ہوتا ہے۔ولی اکمل احکام شریعت کا عامل بھی ہوتا ہے۔اور انکے نتائج بھی حاصل کر چکا ہوتا ہے۔اور یہی تکمیلِ علم اسے اکملیت کے مقام پر پہنچاتی ہے۔چونکہ یہ مقام روحانیت سے تعلق رکھتا ہے۔اسلئے ہر شخص کو عرفانِ الٰہی حاصل کرنے کیلئے ولیِ اکمل کی راہنمائی حاصل کرنی لازمی ہوتی ہے ــــــ ولی اکمل کی راہنمائی سے انسان کو کیا حاصل ہوتا ہے۔یہی کیفیت شریعت وطریقت کی اصل ہے۔

جہاں تک شریعت کے احکام کا تعلق ہے۔اس علم سے ہر شخص ظاہری طور واقف ہوتا ہے۔ کہ نماز کیسے پڑھی جاتی ہے۔روزہ کیسے رکھا جاتا ہے۔صدقہ کیسے دیا جاتا ہے۔اور ان احکام کی تکمیل میں یقینی طور انکے نتائج بھی حاصل ہوتے ہیں۔لیکن انسان میں اسکے وجود کے خواص اپنی اصلی قوت پر قائم نہیں ہوتے ہیں اسلئے اسکی عبادت سے اسے پوری قوت حاصل نہیں ہو سکتی جب تک نتائج کے حاصل کرنے کے ساتھ اپنے مراتب کی حفاظت اور اپنی روحانی قوتوں کی ترقی بھی ضروری حاصل نہ ہو۔تاکہ انسان ایک مقام حاصل کرنے کے بعد اپنی سفلی قوتوں کے غلبہ سے دوبارہ تنزل کی طرف نہ رجوع کرے۔اور باوجود ناقص ماحول کے انسان ہر نقص سے محفوظ رہے۔یہی عمل خالص طریقت کہلاتا ہے۔اسکے لیے تہجد۔قرأتِ قرآن۔اور رات کا جاگنا وغیرہ کا عمل ہے۔جو ولی اکمل کے ذریعہ حاصل کیا جاتا ہے۔

رات کا جاگنا۔قیام الیل: انسان کیلئے اسکی عادتوں کا تابع رہنا ایک فطری چیز ہے۔یعنی انسان دن کی روشنی میں خواہ مخواہ مصروفِ عمل رہتا ہے۔دن بھر کی مصروفیت کے بعد اسے آرام کی

ضرورت رہتی ہے۔اور انسان اپنی تھکان کے بعد خود بھی آرام کا خواہشمند رہتا ہے۔سو رات ہی ہے۔ جس میں اسے خود بخود آرام حاصل ہوتا ہے۔اور اپنی عمر کے نصف حصہ میں ایک پیہم عمل اسکی عادتِ ثانیہ بن جاتی ہے۔یعنی انسان دن کے بعد ہمیشہ رات کو سو کر دنیوی امور سے بے خبر ہو کر فارغ ہو جاتا ہے۔اور ہمیشہ کے عمل میں انسان رات کو آرام کرنے پر مجبور ہوتا ہے۔اگر انسان ابتدائی دور میں رات کے سونے میں ایک وقت مقرر نہ کرے تو وہ رات کی تخصیص کو بدل سکتا ہے۔یعنی وہ اگر دن میں بھی سونے کی عادت ڈال دے اور اپنی نیند کا وقت پورا کر لے۔تو وہ رات کو اپنی نیند کے لیے مخصوص نہیں رکھے گا۔اور رات کے وقت وہ سونے پر مجبور نہ ہوگا۔گو نیند اور آرام کا حاصل کرنا۔ انسان کی خواہش پر منحصر ہے۔اگر وہ رات کو آرام کے لیے مخصوص نہ کرے اور رات کے تقرر کے بغیر وہ اپنا آرام پالے۔تو وہ ایسا کرنے پر قادر ہے۔اس سے معلوم ہوتا ہے۔کہ ایک عمل کے بار بار کرنے سے۔وہ عمل انسان کی عادت بن جاتا ہے۔اور جب وہ اپنی عادت کی تعمیل کرنے لگ جاتا ہے۔تو وہ عادت اسکی قوتِ ارادی پر غالب آجاتی ہے۔اور انسان عادت سے مغلوب ہو کر اس عمل کو پورا کرنے کیلیے مجبور ہو جاتا ہے۔

سب سے بڑی اور مستحکم عادت انسان کی مصروفیت ہیں۔دن کا شغل اور رات کا آرام ہے۔اور یہ کیفیت انسان پر اسقدر طاری ہے۔کہ وہ اس عادت سے فرار حاصل نہیں کر سکتا۔اسی طرح انسان باقی امور میں بھی اپنے پیہم عمل کا تابع (عادی) ہو جاتا ہے۔اسکی وجہ یہ ہے۔کہ انسان آرام طلب ہو کر اپنی ہر نفسانی خواہش کو پسند کر کے اسکی تعمیل کا خواہشمند رہتا ہے۔اگر ان خواہشات میں عبادت ہو۔تو یہ چیز اگرچہ عادۃً ہی ہوتی ہے۔تاہم عبادت کے تاثرات اس پر طاری رہتے ہیں۔اور اگر ان خواہشات میں حیوانی مادہ ہو۔تو انسان انہیں تاثرات کو قبول کر لیتا ہے۔جس سے یہ روحانی ترقی سے دور ہو جاتا ہے۔ایسی حالت میں بار بار حیوانی خواہشات کی تکمیل اسکی قوتِ ارادی کو زائل کر دیتی ہے اور انسان اپنی مرضی سے کسی بُری عادت کو ترک کرنے سے عاجز ہو جاتا ہے۔اور جب انسان اپنی بُری عادتوں سے مجبور ہو جائے تو اسکا درجہ حیوانیت میں آجاتا ہے۔اور اسکی روح حیوانی

تنزل پذیر ہو کر مثل حیوانوں کے ہو جاتی ہے۔ جو صرف کھانے پینے کے کام کے سوا۔ تفکر اور تعقل و شعور کی تقویت سے خالی ہوتی ہے اور انکا انجام بھی انکے نتیجۂ عمل کے اعتبار سے تنزلی (اندھیرا۔ اور عذاب دینے والا ماحول) ہوتا ہے۔ اس کیفیت کو قرآن نے نہایت خوبی سے بیان کیا ہے۔

وَلَقَدْ ذَرَأْنَا لِجَهَنَّمَ كَثِيرًا مِّنَ الْجِنِّ وَالْإِنسِ ۖ لَهُمْ قُلُوبٌ لَّا يَفْقَهُونَ بِهَا وَلَهُمْ أَعْيُنٌ لَّا يُبْصِرُونَ بِهَا وَلَهُمْ آذَانٌ لَّا يَسْمَعُونَ بِهَا ۚ أُولَٰئِكَ كَالْأَنْعَامِ بَلْ هُمْ أَضَلُّ ۚ أُولَٰئِكَ هُمُ الْغَافِلُونَ ○ (پارہ ۹ سورۃ ۷ آیت ۱۷۹) اور البتہ تحقیق جہنم (ایک اندھیرا ___ اور عذاب دینے والا ماحول) بہت سے جنوں اور انسانوں کے لیے تیار کیا گیا ہے۔ جنکے دل ہیں۔ کہ وہ حقیقت کی آواز کو قبول کر کے اپنی خواہشاتِ نفسانی کو ختم کر دیں۔ اور حقیقت پر ایمان لا کر اس پر عمل کریں۔ لیکن وہ حقیقت کو اپنی قلبی قوت (فقہ) سے قبول کرنے پر آمادہ نہیں (اور نہ انکے دل میں یہ صلاحیت ہے)۔ وہ کان رکھتے ہوئے کلام الٰہی کو نہیں سنتے کہ اس پر عمل کر کے اپنے نفس کی اصلاح کریں۔ وہ آنکھوں سے۔ رسول کے معجزات اور اللہ کی نشانیاں دیکھنے کے بعد بھی عبادت کی طرف مائل نہیں ہوتے۔ انکے بُرے اعمال انکی عادت ثانیہ بن چکے ہیں اور وہ اپنی نفسانی خواہشات کی تکمیل کی وجہ سے حقیقت سے انکار کر رہے ہیں۔ ان لوگوں کی حالت یہ ہے کہ انکی ہیئتیں اگر چہ انسانوں جیسی ہیں۔ لیکن انکے عمل اور نفسانی خواہشات کی بلا روک تکمیل نے ان میں انسانی صفات زائل کر دی ہیں۔ اور یہ لوگ حیوانیت کی تکمیل کے بعد۔ ان حیوانوں سے بھی بدتر ہیں۔ جو حیوان ہونے کے باوجود۔ طوعاً و کرہاً فطرۃ کے قوانین پر چلنے کے لیے مجبور ہیں۔ یہ انسانی کیفیت اسکی تنزلی کیفیت ہے۔ اور اس کا نتیجۂ عمل جہنم ہے۔ اس میں کسی شخص کیلئے اسکی ذاتی تخصیص نہیں۔ کہ وہ یہودی کے گھر پیدا ہوا یا مسلمان کے گھر پیدا ہو۔ انسانی حیثیت سے ہر انسان کے وجود پر اسکے اعمال کا اثر یکساں ہوگا۔ ان حالات میں انسان خواہشات حیوانی کی لذت حاصل کرنے میں آرام طلب ہو جاتا ہے۔ اور وہ اپنی ہر خواہش کی تکمیل میں انسانیت کے دائرہ سے خارج ہو کر اپنے آرام کو حاصل کرنے میں اسقدر مجبور ہو جاتا ہے۔ کہ وہ اپنی جنس کے نفع نقصان کی بھی پرواہ نہیں کرتا۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے۔ کہ اس قسم کا انسان جب

خواہشات نفسانی کی تکمیل میں عادی ہو جاتا ہے تو یہ اپنی اشرف المخلوقات اور خلیفۂ ارض کی ودیعت کردہ صفات سے محروم ہو جاتا ہے اور باطل خواہشات کی تکمیلِ پیہم کا جذبہ اسے حیوانیت کے درجہ پر لاتا ہے۔ تو انسان منحرف ہو کر شریعت اور حقیقی فطری قانون سے بغاوت اور فساد و خونریزی پر آمادہ ہو جاتا ہے۔(مَنْ یُّفْسِدُ ۔ وَیَسْفِكُ الدِّمَآءَ) یعنی عبادت کی طرف مائل نہ رہنے والا انسان فساد و خونریزی پر آمادہ رہتا ہے۔ سو اسکے لیے اول شریعت کی پابندی اور پھر اصلی انسانیت کے مقام پر لانے کیلئے رات کا جاگنا قیام لیل ہی کارآمد ہو سکتا ہے۔ جس میں اسے آرام ترک کرنے سے اسکے مادی خواص میں مردنی چھا جاتی ہے اور انسانی عادت ثانیہ کو بدلنے کیلئے اسکی قوت ارادی میں تقویت پیدا ہو جاتی ہے جس سے نفس کی اصلاح ہونی شروع ہوتی ہے۔ اِنَّ نَاشِئَةَ الَّیْلِ ۔ هِیَ اَشَدُّ یہ تکلیف دہ کام ہے۔ وَطْاً اور نفس کو کچلنے والا فعل ہے۔ اور جب اس پر عامل ہو جائے تو رفتہ رفتہ اسکی عادت میں فرق آنے لگ جاتا ہے اور اسکی سفلی قوتیں مردہ ہو کر اسکی قوتِ ارادی آزاد ہو جاتی ہے۔ پھر یہ اپنی عادت کا پابند نہیں رہتا جس سے اسکی عادت کا اثر زائل ہو کر یہ عبادت پر عامل ہونے کیلئے اپنے ارادہ میں قوت پاتا ہے۔ قیام لیل میں نفس کا کچلنا۔ یعنی سفلی قوتوں کا زائل ہونا۔ جس سے انسان انکے غلبہ سے نجات حاصل کرتا ہے اور اپنی خواہشات نفسانی پر خود غالب آ جاتا ہے۔ اور اسکی روحانی قوت (روح حیوانی کی لطافت) قوی ہو جاتی ہے۔ جسکا نتیجہ یہی ہے۔ کہ انسان میں مشاہدہ کی قوتیں۔ قلب و روح۔ قوی ہو جاتی ہیں۔ قلب و روح قوی ہونے سے مشاہدہ کی قوت پیدا ہوتی ہے اور جب انسان شریعت کی پابندی میں عبادت کرے تو اسے اسکے نتیجۂ عمل کا علم ہونے لگتا ہے۔ اور جب زائد عبادت (نوافل) جو کہ نماز ہی ہے۔ اسکے نتائج عرفان الٰہی کی راہیں۔ یعنی زمین و آسمان کی روحانی قوتوں کا ادراک ہونے لگ جاتا ہے اور اسکے ساتھ ہی جب طریقِ مشاہدہ کا خصوصی عمل فَاقْرَءُوْا مَا تَیَسَّرَ مِنَ الْقُرْاٰنِ پر عامل ہو جاتا ہے۔ تو اسکا نتیجۂ عمل اور مشاہدہ کی قوت بھی انسان کو حاصل ہو جاتی ہے۔

فَاقْرَءُوْا مَا تَیَسَّرَ مِنَ الْقُرْاٰنِ میں کیا اثر ہے؟ اسکی تفسیر بھی قرآن نے خود کی ہے اِنَّ

قُرْاٰنَ الْفَجْرِ كَانَ مَشْهُوْدًا ○ تحقیق صبح کا قرآن پڑھنا حاضر کیا گیا ہے۔ مشہود سے مراد مشاہدہ کیا گیا ہے۔ یعنی صبح کے وقت قرآن پڑھنا مشاہدہ میں آتا ہے۔ اسکی ترکیب یہ ہے۔ کہ جب انسان نصف رات یا آخری تیسرے حصہ رات میں جاگ کر نماز (نفل) پڑھتا رہے۔ تو اس تہجد اور قیام لیل سے اسکے وجود کا تزکیہ ؎ ہو جاتا ہے۔

اور صبح کے وقت انسان کی طبیعت لطیف ہو چکی ہوتی ہے۔ جب صبح کو انسان قرآن (فَاقْرَءُوْا مَا تَيَسَّرَ مِنَ الْقُرْاٰنِ) اس حالت میں پڑھنے لگتا ہے۔ کہ اسکا ذہن بیرونی تفکرات و تخیلات سے فارغ ہوتا ہے۔ رات کے عمل سے اسکے قلب میں لطافت آ چکی ہوتی ہے۔ اسوقت انسان یکسوئی اور استغراق کے ساتھ ایک تصور باندھتا ہے کہ بیرونی ماحول سے علیحدہ ہو کر اپنے غیر جسمانی عالم پر قلب کے ذریعہ دیکھنا شروع کرتا ہے۔ تو قرآن (نُوْرٌ" مُّبِيْنٌ") کے الفاظ کا نتیجہ عمل اسکے سامنے آجاتا ہے۔ اور انسان اپنے قرآن کے نتیجہ عمل کو دیکھنے لگ جاتا ہے۔ اسلئے صبح کا پڑھنا مشاہدہ کیا گیا ہوتا ہے۔ وہ اسلئے کہ اول رات کا جاگنا۔ نوافل کا پڑھنا اور پھر صبح کا وقت جبکہ انسان تمام دنیوی آلائشوں سے فارغ اور تازہ دم ہوتا ہے۔ ایسی حالت میں انسان خواہ مخواہ اپنے عمل کے نتیجہ کا مشاہدہ کر لیتا ہے۔

فَاقْرَءُوْا مَا تَيَسَّرَ مِنَ الْقُرْاٰنِ کا صبح کے وقت عمل کرنا مشاہدہ میں آتا ہے۔ مَا تَيَسَّرَ سے مراد یہ ہے۔ کہ جتنا تم سے ہو سکے۔ اکثر علماءِ شریعت میں امام اور اولیاء۔ رات دن میں تمام قرآن کئی بار پڑھتے اور اسکا مشاہدہ بھی انکے لئے لازمی تھا۔ چنانچہ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کے بعد آپؐ کے اصحاب بھی تلاوت قرآن اور نوافل پڑھتے رہے۔ اسی طرح نائب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم (حضرت علی کرم اللہ وجہہ) نے بھی یہی طریق حاصل کیا اور آپ نے اپنے خلیفہ حضرت امام حسنؓ۔

؎ تزکیہ سے یہاں مراد یہ ہے۔ کہ انسانی جسم سفلی قوتوں کے غلبہ سے پاک ہو جاتا ہے۔ سفلی (مادی) قوتیں ختم ہو کر جسم لطیف ہو جاتا ہے۔ جسم لطیف ہونے سے روحِ حیوانی میں لطافت پیدا ہو جاتی ہے۔ روح میں لطافت پیدا ہونے سے اس میں مشاہدہ کی صلاحیت پیدا ہو جاتی ہے۔

حضرت امام حسینؓ اور حضرت حسن بصریؒ کو تعلیم کیا۔ اور اسی طرح ان حضرات کے بھی خلفاء قائم ہوئے اور یہ سلسلہ لگاتار چلتا گیا۔

حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کے زمانہ کے بعد ایک طویل مدت لوگوں میں یہ سلسلہ ایک انتہائی جذب و کیف اور مشاہدہ کے ساتھ گزرا۔ اولیاء اللہ نے بیحد ریاضتیں کیں اور اونچے مراتب حاصل کیے۔ لیکن رفتہ رفتہ زمانہ میں تبدیلی آئی اور لوگوں میں بھی کمزوریاں آنے لگیں۔ ادھر خلافتِ اسلامی ماحول سازگار نہ رکھ سکی ادھر لوگوں کی طبیعتوں میں آرام طلبی اور خود غرضی بھی پیدا ہونے لگی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ آدمی پیدائشی کمزور پیدا ہونے لگا۔ اور ان میں اتنی صلاحیت اور قوت نہ رہی کہ وہ تلاوتِ قرآن اور رات کے جاگنے پر عامل ہوسکیں۔ تیز انکی وجودی ساخت بھی اسقدر کمزور ہوگئی کہ ان پر مادیت کا غلبہ زیادہ بڑھنے لگا ان حالات کے پیش نظر اولیاء اللہ نے انکے وجود کے مطابق تزکیہ مجاہدہ کی ترکیبیں اختیار کیں یہی چیز ولی کی اختراع کہلاتی ہے۔ اور ایک زمانہ ایسا آیا کہ بہت کم لوگ ولی کا مقام حاصل کرتے۔ کیونکہ ان میں اب پیشتر جیسی صلاحیت نہ پائی جاتی تھی۔ ایسے زمانہ میں اگر کوئی شخص اپنے تزکیہ و مجاہدہ میں کمال حاصل کر کے انتہائی اکملیت حاصل کر لیتا تو وہ زمانہ بھر میں مشہور اور قابلِ تعریف سمجھا جاتا۔ چنانچہ ایسے زمانہ میں ہی بعض امام۔ محدث۔ فقیہ ایسے پیدا ہوئے جو اسلامی تواریخ میں عام لوگوں کے مقابلہ میں اپنے علم کے کامل و اکمل مانے جاتے ہیں جیسے امام احمد بن حنبلؒ۔ امام شافعیؒ۔ امام مالکؒ۔ امام ابو حنیفہؒ وغیرہ۔ اسکے ساتھ ہی صاحب مشاہدہ اولیا بھی پیدا ہوئے جنکا طریق مشاہدہ۔ مجاہدہ اور انکا مرتبہ کمال عام لوگوں کے مقابلہ میں انتہائی رفعت والا سمجھا گیا۔ ایسے اولیاء میں خصوصیت کے ساتھ حضرت بہاؤالدین نقشبند۔ حضرت شہاب الدین سہروردی۔ حضرت شیخ عبدالقادر جیلانی۔ حضرت محی الدین ابن عربی۔ حضرت بایزید بسطامی۔ حضرت معین الدین چشتی وغیرہ رحمتہ اللہ علیہم جیسی ہستیاں ہیں۔ ان اولیا نے لوگوں کی اصلاح کیلئے انکے وجود اور قوتوں کے مطابق طریق مجاہدہ و تزکیہ جاری کئے اور ہر ولی کے خلفاء کا ایک الگ الگ سلسلہ جاری ہوا جنہیں نقشبندی۔ سہروردی۔ قادری۔ چشتی کے نام سے موسوم کیا گیا۔ اور اسی طرح انکے بعد کے زمانہ میں

بھی جو شخص اپنے حصول عرفان ومشاہدہ میں کامل ہوا۔ اسکے عمل اور علم کو کمالیت کا درجہ ملا انکے نام سے بھی کئی سلسلے جاری ہوئے جیسے صابری۔ گرگاہی۔ عباسی۔ قدوسیہ۔ نجویہ۔ نعمتیہ۔ حسینیہ۔ کریمیہ۔ نیازیہ۔ حنفیہ۔ مطفائیہ۔ عظیمیہ۔ نظامیہ۔ مسعودیہ۔ نقشبندیہ قدوسیہ۔ عبدیہ۔ صدیقیہ وغیرہ اسی طرح ہر سلسلہ کے بزرگوں میں انکے نام سے سلسلے جاری ہوئے۔

جہاں تک حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کے ساتھ عبادت۔ نوافل (تہجد) قرأت قرآن میں فَاقْرَءُ وْ ا مَاتَیَسَّرَ مِنَ الْقُرْاٰنِ کا تعلق ہے۔ آپؐ نے احکام شریعت (نماز۔ روزہ۔ حج۔ زکوٰۃ) کی انتہائی تکمیل کی۔ اور زائد عبادت کا یہ حال تھا کہ راتوں کی عبادت میں آپؐ کے پائے مبارک میں ورم آجاتا۔ چنانچہ باری تعالیٰ نے خود آپؐ کے عمل کی تائید وتصدیق کرتے ہوئے فرمایا یٰۤاَیُّهَا الْمُزَّمِّلُ ۙ قُمِ الَّیْلَ اِلَّا قَلِیْلًا ۙ نِّصْفَهٗۤ اَوِ انْقُصْ مِنْهُ قَلِیْلًا ۙ اَوْزِدْ عَلَیْهِ وَرَتِّلِ الْقُرْاٰنَ تَرْتِیْلًا ۙ (پارہ ۲۹ سورۃ ۷۳ آیت ۱ تا ۴) اے کملی اوڑھے (سونے والے) اٹھ رات کو۔ مگر تھوڑا (باری تعالیٰ نے آپؐ کی زائد عبادت کا ملاحظہ فرماتے۔ وقت کا تعین بھی کر دیا) رات کا نصف یا اس سے کم کر تھوڑا (اور اگر آپ کا جی نہیں بھرتا) تو کچھ زیادہ کر ۔۔۔۔ اور آہستگی اور لطافت سے (قرآن میں سے جو میسر ہو) پڑھا کر۔ کیونکہ اِنَّ رَبَّكَ یَعْلَمُ اَنَّكَ تَقُوْمُ اَدْنٰی مِنْ ثُلُثَیِ الَّیْلِ وَنِصْفَهٗ وَثُلُثَهٗ وَطَآئِفَةٌ مِّنَ الَّذِیْنَ مَعَكَ ؕ وَاللّٰهُ یُقَدِّرُ الَّیْلَ وَالنَّهَارَ ؕ عَلِمَ اَنْ لَّنْ تُحْصُوْهُ فَتَابَ عَلَیْكُمْ فَاقْرَءُوْا مَا تَیَسَّرَ مِنَ الْقُرْاٰنِ ؕ عَلِمَ اَنْ سَیَكُوْنُ مِنْكُمْ مَّرْضٰی ۙ وَاٰخَرُوْنَ یَضْرِبُوْنَ فِی الْاَرْضِ یَبْتَغُوْنَ مِنْ فَضْلِ اللّٰهِ ۙ وَاٰخَرُوْنَ یُقَاتِلُوْنَ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ ۫ۖ فَاقْرَءُوْا مَا تَیَسَّرَ مِنْهُ ۙ وَاَقِیْمُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتُوا الزَّكٰوةَ وَاَقْرِضُوا اللّٰهَ قَرْضًا حَسَنًا ؕ (پارہ ۲۹ سورۃ ۷۳ آیت ۲۰) اللہ تعالیٰ نے حضور علیہ الصلوۃ والسلام کا عمل ملاحظہ فرمایا کہ آپؐ انتہائی تکلیف کے ساتھ عبادت کرتے ہیں۔ اور آپکے ساتھ آپکی امت کے ولی بھی اسی طرح مجاہدہ وریاضت کرتے ہیں۔ اور یہ چیز امت کیلئے ایک سنت ہوگی اسلئے انسانی قوت کا خیال رکھتے ہوئے طریق طریقت میں ایک تعین کر دیا۔ تاکہ آئندہ ایسے بھی لوگ ہوں گے جو اسقدر عمل کے متحمل نہ ہوسکیں گے پس رات کے حصص قلیل اور مَاتَیَسَّرَ مِنَ الْقُرْاٰنِ

کی تحدید کر دی۔

حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام اور اصحاب رسول اللہؐ کے زمانے کے بعد اسی قرآنی طریق کے مطابق مجاہدہ۔ تزکیہ اور مشاہدہ کیا جاتا رہا۔ اور زمانہ کے حالات کے اور لوگوں کی استعداد کے مطابق۔ رات کے جاگنے اور قرأتِ قرآن کی تاویل کے تحت فقراء نے اختراع کی۔

اب دیکھنا یہ ہے۔ کہ ان احکاماتِ شریعت میں طریق مجاہدہ میں عبادت۔ زائد عبادت۔ نفل قیام لیل۔ قرأت قرآن کی کیا ترکیب دی گئی ہے۔ اور ان کے مشاہدہ میں تصور کس طرح قائم کیا جاتا ہے۔

پیشتر بیان ہو چکا ہے۔ کہ بغیر رہنمائے اکمل کے علم حاصل نہیں کیا جا سکتا۔ اور علم حاصل کرنے کیلئے ایک راہنما کی تقلید۔ تائید و تصدیق ضروری ہے۔ اور ہر شخص جب بھی قرآن سے علم حاصل کرنا چاہے۔ تو اسے ایک اکمل عالم کی طرف رجوع کرنا چاہیے۔ اور علم سے مقصود صرف عرفان و قرب الٰہی ہے۔ مقصود حاصل کرنے کیلئے قرآن نے شریعت (عبادت) قائم کی۔ اور شریعت پر عمل کا طریقہ مَنْ یُّطِعِ الرَّسُوْلَ فَقَدْ اَطَاعَ اللّٰہَ ج (پارہ ۵ سورۃ ۴ آیت ۸۰) ہے یعنی جس نے رسولؐ کی اطاعت کی اسنے گویا اللہ کی اطاعت کی۔ اس سے معلوم ہوتا ہے۔ کہ مقصود حاصل کرنے کیلئے وہی طریق حاصل کیا جائے۔ جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے لیے مقرر کیا۔ اور آپؐ کی اطاعت سے مراد یہ ہے۔ کہ آپؐ نے جو عمل کیا وہ براہِ راست اللہ تعالیٰ کی طرف سے راہنمائی اور وحی تھی۔ اور اس وحی کا طریق ہی مقصود کو پہنچا سکتا ہے۔ گویا آپؐ کی اطاعت وحی کی اطاعت وحی کی اطاعت اللہ کی اطاعت ہے۔ باری تعالیٰ نے ظاہر عبادت عام انسانوں کیلئے مقرر کی اسکی اطاعت حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے کی باقی مشاہدہ کیلئے چونکہ خصوصیت تھی اسلئے یہ کیفیت وحی خفی کے ذریعہ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کو عطا کی گئی اسلئے اسکا طریق خفی ہی رہیگا۔ مقصود حاصل کرنے میں اطاعت بمنزل حُب ہے۔ قُلْ اِنْ کُنْتُمْ تُحِبُّوْنَ اللّٰہَ اگر تم اللہ کے عرفان و قرب حاصل کرنے میں اللہ کیلئے حُب کرنا چاہو تو فَاتَّبِعُوْنِیْ یُحْبِبْکُمُ اللّٰہُ تو حب میں رسول کی اتباع کرو تو جب ہی قرب حاصل ہوگا۔ حضور علیہ

الصلوٰۃ والسلام کی حب کیا تھی؟ ــــــ وہ حُب آپؐ کا عمل ــــــ تصور صرف ایک ذات واحد کا ــــــ اور اس تصور کرنے میں صرف ایک اللہ کا مشاہدہ ہی تھا۔ جو آپؐ نے اپنے۔ انہماک استغراق سے حاصل کیا۔ گویا آپکے تصورات میں صرف ایک اللہ کا نام اَللّٰہ ھُو ہی تھا۔ یہاں تک کہ آپؐ نے اسی تصور سے اللہ کا عرفان وقرب حاصل کیا۔ اور آپکی امت کے لئے فَاتَّبِعُوْنِی کے حکم کے تحت حُبِ رسول میں تصورِ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہی ہوگا۔ تاکہ مقام فنائیت میں وہی کیفیت حاصل ہو جس کیفیت سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حبِ الٰہی میں عرفانِ الٰہی حاصل کیا۔ اسطرح ایک انسان اگر سوائے حبِ رسول کے عرفان حاصل کرنا چاہے۔ تو وہ عمل از روئے قرآن خلاف شریعت ہوگا ــــــ چونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہی انسان کیلئے ایک راہنما کی حیثیت رکھتے ہیں اسلئے راہنمایانہ حیثیت سے عرفان الٰہی کے حصول میں ایک راہنما کا اتباع۔ حب اور تصور از روئے شریعت لازمی ہے۔ اور یہ سلسلہ اسوقت تک برابر جاری رہے گا جب تک کائنات میں انسان پیدا ہوتا رہے گا ہر زمانہ میں ہر انسان کیلئے یہی طریق حُب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم لازمی ہوگا۔

حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کو صرف اللہ کا تصور تھا۔ اس لیے آپکے لیے وہی عمل ہے جو اللہ تعالیٰ نے حکم کیا۔ اور حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام سے ماسوائے جو آپکی اُمت میں ہیں انکے لیے ایک تو شریعت کے احکام دوسرے خفی احکام حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کی طرف سے عطا کئے گئے ہیں۔ کیونکہ عام انسان پیغمبر جیسی عبادت نہیں کر سکتے۔ جو عبادت پیغمبر کے لیے مخصوص کی گئی عام انسان اسکے متحمل نہیں ہو سکتے۔ اسلئے پیغمبر کے عمل اور امتی کے عمل میں فرق ہوگا۔ مثال کے طور حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نوافل۔ قیام لیل۔ قرأت قرآن وغیرہ پر پورے عامل تھے۔ لیکن اصحاب رسول اللہؐ پر یہ عمل فرض نہیں کئے گئے۔ یہی وجہ ہے۔ کہ آپؐ نوافل یا دیگر عمل تواتر کے ساتھ نہیں کرتے تھے۔ کہ تواتر کے ساتھ عمل امت کیلئے لازمی سنت (سنت مؤکدہ) قرار دی جائے گی۔ اسی طرح روزے رکھنے میں یا دیگر افعال واعمال میں اصحاب رسول اللہ حسب ارشاد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم دوام نہیں کرتے۔ اصحاب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم میں بعض قیام لیل ونوافل پر عمل کرتے اور بعض نہیں۔ اور

جولوگ مکمل طور طریق طریقت کے عامل ہوتے انکے لیے لازمی تھا کہ وہ حُب رسول میں تصورِ رسول کریں۔ چنانچہ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام اور اصحاب رسول اللہؐ (تمامی امت) کے مابین عمل میں تمیز کرنے کیلئے اللہ تعالیٰ نے ایک واضح حکم صادر فرمایا۔

اِنَّ اللّٰهَ وَمَلٰٓئِكَتَهٗ يُصَلُّوْنَ عَلَى النَّبِيِّ ط يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا صَلُّوْا عَلَيْهِ وَسَلِّمُوْا تَسْلِيْمًا ۝ (پارہ ۲۲ سورۃ ۳۳ آیت ۵۶) تحقیق اللہ تعالیٰ اور اسکے فرشتے رسول اللہ پر درود بھیجتے ہیں۔ اے ایمان والو! تم بھی رسول اللہ پر بے شمار درود بھیجو۔

اور یہ حکم حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کے ساتھ حُب اور اتباع پر دلالت کرتا ہے۔ کہ رسول اللہؐ کی جملہ زائد عبادات کے مقابلہ میں تم حبِ رسول میں آپؐ پر درود بھیجو۔ اسلئے تصورِ رسول کیلئے سوائے درود کے اور کوئی ذریعہ مستحکم و مکمل نہیں ہوسکتا ہے۔ چنانچہ اس کی تائید خود حدیث پاک سے ہوتی ہے اصحابی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم حضرت ابی بن کعبؓ سے روایت ہے۔ وَعَنْ اُبَيِّ ابْنِ كَعْبٍؓ قَالَ قُلْتُ يَارَسُوْلَ اللّٰهِ اِنِّيْ اُكْثِرُ الصَّلٰوةَ عَلَيْكَ فَكَمْ اَجْعَلُ لَكَ مِنْ صَلٰوتِيْ فَقَالَ مَا شِئْتَ قُلْتُ الرُّبُعَ قَالَ مَاشِئْتَ فَاِنْ زِدْتَّ فَهُوَ خَيْرٌ لَّكَ قُلْتُ النِّصْفَ قَالَ مَاشِئْتَ فَاِنْ زِدْتَّ فَهُوَ خَيْرٌ لَّكَ قُلْتُ فَالثُّلُثَيْنِ قَالَ مَا شِئْتَ فَاِنْ زِدْتَّ فَهُوَ خَيْرٌ لَّكَ قُلْتُ اَجْعَلُ لَكَ صَلٰوتِيْ كُلَّهَا قَالَ اِذًا تُكْفٰى هَمُّكَ وَيُكَفَّرُ لَكَ ذَنْبُكَ (رَوَاهُ التِّرْمِذِيُّ) حضرت ابی بن کعب رضی اللہ عنہ نے حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام سے عرض کی یارسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم میں اکثر آپ پر درود بھیجتا ہوں۔ کیا میں اس درود میں زیادتی کرسکتا ہوں۔ آپؐ نے فرمایا مَاشِئْتَ فَاِنْ زِدْتَّ فَهُوَ خَيْرٌ لَّكَ۔ تمہاری مرضی اگر تم درود میں زیادتی کرو تو یہ تمہارے لیے بہتر ہے۔ انہوں نے عرض کی کیا میں تین حصہ عبادت کے ساتھ چوتھا حصہ درود پڑھوں تو آپؐ نے یہی فرمایا۔ تیری مرضی اگر تو زیادہ کرے تو یہ تیرے لیے بہتر ہے۔ انہوں نے عرض کیا نصف درود کروں آپؐ نے پھر یہی فرمایا کہ تیری مرضی اگر تو زیادہ کرے تو تیرے لیے بہتر ہے۔ اس طرح تین چوتھائی پر بھی فرمایا۔ تو انہوں نے عرض کی کہ کیا میں فرض عبادت سے بعد صرف درود ہی پڑھوں تو آپؐ نے فرمایا۔ یہ تمہارے لیے جنت میں داخل

ہونے کیلئے گناہوں کی مغفرت کیلئے کافی ہے۔(ترمذی)

اس حدیث سے صَلُوٰ کی تائید ہوتی ہے۔اس پر مزید حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کی یہ حدیث اسکی ترجمانی کرتی ہے۔

لَایُؤْمِنُ اَحَدُکُمْ حَتّٰی اَکُوْنَ اَحَبَّ اِلَیْہِ مِنْ وَّالِدِہٖ وَوَلَدِہٖ وَالنَّاسِ اَجْمَعِیْنَ (متفق علیہ) نہیں مومن ہوتا تم میں ایک بھی یہاں تک کہ محبت ہو اسے مجھ سے زیادہ۔اپنے والد سے اولاد سے اور تمام لوگوں سے (جو شخص ہم سے اپنی جان۔مال اولاد سے زیادہ محبت نہ رکھتا ہو۔وہ ہم سے نہیں)۔

اس حُب کا تقاضا یہی ہے۔کہ آپؐ کے تصور میں آپؐ کے نور میں ہی فنا حاصل کی جائے۔ آپکا نور کیا ہے؟ آپکا نور وہ ہے۔جس نے تمام زمین و آسمان کی کیفیتوں کو اپنے میں سمایا ہے۔اور وہی نور عرفانِ الٰہی۔بقائے الٰہی کے انتہائی مقام میں نور الٰہی میں فنا حاصل کر چکا ہے۔اور جب ایک ولی اس طریق سے عبادت کرے تو تصورات کا نتیجہ یہ ہوگا کہ وہ فنافی نورِ رسول اللہ ہوگا۔اور جب اپنی عبادت علی التواتر جاری رکھے گا۔تو اسے فنافی الرّسول کے ذریعہ فنافی اللہ کا مقام حاصل ہوگا یہی کیفیت اس ولی کے عرفان و قرب کی ہوگی ___ اور اس میں سب سے بڑا عمل حبِ رسول میں احکام شریعت نماز۔روزہ وغیرہ کے ساتھ۔قیام لیل اور قرأت قرآن میں سے صرف درود کی قرأت ہوگی۔ یہ عمل خود حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کا فرمایا ہے۔کہ درود کس طرح پڑھا جاتا ہے اور اسکا ہی نتیجۂ عمل تصورِ رسول اللہ میں نورِ رسول اللہ کی زیارت (فنا) میں حاصل ہوگا۔یہاں مشاہدہ و مجاہدہ کا کیا طریقہ ہوگا وہ یہ کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ایک طالب حقیقت کو یَتْلُوْا عَلَیْھِمْ اٰیٰتِہٖ میں ایک طرف قرآنی علم کا مشاہدہ (باطن میں) بتائیں گے یعنی قرأت قرآن میں اسکے نتیجۂ اعمال کے نوری مشاہدات بتائیں گے۔ظاہری شریعت کے تابع کیلئے ظاہری تزکیہ ہوگا۔اور باطنی طریقہ پر اسکے قلب کو نفسانی حیوانی آلائشوں سے پاک کریں گے وہ اسطرح۔کہ انسانی قلب میں جو خواہشات نفسانی کا مادہ موجود ہوگا۔ قلب پر باطنی طور نورانی (روحانی) Connection (تجلی۔توجہ) ڈالیں گے۔وہ اسطرح کہ حضور

علیہ الصلوٰۃ والسلام کا قلب مبارک مجسم نورانی ہوگا۔آپ قلب کا تزکیہ کرنے کیلئے اپنے قلب کے نور سے طالب کے قلب کو مس کریں گے۔(جس طرح ایک بیمار کے درد کا الیکٹرسٹی کے ذریعہ علاج کیا جاتا ہے)جس سے قلب میں روحانی قوت ابھر آئے گی۔یہی طریق یُزَکِّیۡہِمۡ (باطنی) ہوگا۔اور پھر طالب کو کیا مشاہدہ ہوگا؟____ وہی۔جو کچھ اسکا عمل ہوگا وہ قرأت قرآن کا نتیجۂ عمل اور خصوصی عمل مَا تَیَسَّرَ مِنَ الۡقُرۡاٰنِ (صَلُّوۡا۔درود) کا نتیجۂ عمل ہوگا۔ درود کا نتیجۂ عمل اسکے تصور کے ساتھ نورِ رسول اللہ ہوگا یعنی آپؐ کے نورانی وجود کی شکل ہوگی جو اسی شکل میں محسوس ہوگی جو حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کی دورِ پیغمبری میں تھی۔اسکے ساتھ جوں جوں مشاہدہ میں ترقی ہوتی جائے گی طالب اپنے عروج میں نور محمدیؐ کے عروجی مراتب میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی شبیہہ مبارک (نوری) کا مقامات کی ہیئتوں کے مطابق شکلوں میں مشاہدہ کرتا جائے گا۔یہاں تک کہ وہ مقام آئے گا جسے حقیقت محمدی سے تعبیر دیا جاتا ہے۔یہ حقیقت محمدی وہی کیفیت ہوگی۔جو محمد واحمد کی ابتدائی ازلی کیفیت ہوگی اور یہاں اس کیفیت سے آگاہی ہوگی جس کیفیت میں اللہ تعالیٰ نے اپنے ارادۂ ازلی کی ابتدا کی تھی جس میں تخلیق کا ابتدائی اقدام تھا۔اسکے بعد جو مقام آئے گا وہ ذات الٰہی ہی ہوگی اسطرح ایک طالب حق کو عرفان ومشاہدہ وقرب حاصل ہوگا جب اسکا عرفان اپنی انتہا کو پہنچ چکا تو اسکے عمل کی تکمیل بدرجہ اکمل ہو جائے گی یہی شخص ولی اکمل کہلائے گا۔اسے۔آیات۔تزکیہ۔علم۔حکمت سے کلی طور آگاہی حاصل ہو گی۔اب یہ اس مقام پر ہوگا کہ وہ طریق طریقت کی راہنمائی سے پوری طرح واقف ہوگا۔اب اس میں راہنمائی کی بھی صلاحیت ہوگی____

واضح ہو کہ علم ایک ایسے راہنما سے حاصل کیا جا سکتا ہے۔جسکا وجود پایا جا سکتا ہو۔گزشتہ تواریخوں سے پتہ چلتا ہے۔کہ پیغمبر کے گذر جانے کے بعد شریعت اور طریق مشاہدہ کا علم مفقود ہوتا رہا۔ایسے وقت میں کوئی شخص علم حاصل نہ کر سکا۔پیغمبر کے آنے پر پھر شریعت ومشاہدہ کی تجدید ہوتی رہی۔اسکا مطلب یہ ہے۔کہ ہر زمانہ میں یہ ایک طریق رہا کہ بغیر راہنما کی موجودگی کے کوئی شخص علم حاصل نہ کر سکا۔اسلئے راہنما کی موجودگی علم کے حصول میں لازمی چیز ہے۔چونکہ حضور علیہ الصلوٰۃ

والسلام نے ایک اکمل شریعت اور طریق مشاہدہ قائم کر دیا اسکے بعد یہ شریعت ہمیشہ قائم رہے گی۔ اور آپکا جاری کردہ طریق ہمیشہ جاری رہے گا۔ آپکے بعد آپکی راہنمائی ایک خلیفہ اور نائب رسول کے ذریعہ جاری رہے گی کیونکہ آپ نے اپنی موجودگی میں اپنے خلفاء کو اکملیت کے ساتھ قائم کر دیا۔ جو دونوں صورتوں (شریعت طریقت) میں قائم ہوئے چنانچہ اس حدیث کے مطابق اَنَا دَارُ الْحِکْمَۃِ وَعَلِیٌّ بَابُھَا آپکا ایک اکمل نائب مقرر ہوا۔ اس طرح پیغمبر کے بعد آپکی امت کے اکمل ولی نائب رسول کی حیثیت سے قائم مقام رسول راہنمائی کا کام کریں گے۔ چنانچہ امت محمد رسول اللہؐ میں یہ طریق مشاہدہ وراہنمائی قیامت تک جاری رہیگا۔ کیونکہ آپکو رحمۃ للعلمین کا خطاب عطا ہو چکا ہے اور آپکے عمل کے نتیجہ میں آپکو یہ مقام بھی حاصل ہو چکا ہے کہ وَمِنَ الَّیْلِ فَتَھَجَّدْ بِہٖ نَافِلَۃً لَّکَ اور رات کے قیام میں زائد عبادت (جس میں آپؐ کے پائے مبارک میں ورم آ تا رہا) کرنے میں عَسٰٓی اَنْ یَّبْعَثَکَ رَبُّکَ مَقَامًا مَّحْمُوْدًا○ آپکو محمد کی تکمیل میں انتہائی حمد کا مقام محمود[1] حاصل ہوگا۔ وہ یہ کہ آپکی امت قیامت تک آپکی حمد کرنے والی ہوگی ایک طرف دن اور رات کی رفتار کے ساتھ اس دنیا پر ہر زمان و ہر مکان (مقام اور وقت) میں لحہ لحہ اَشْھَدُ اَنَّ مُحَمَّدًا رَّسُوْلُ اللّٰہِ کی پکار جاری ہے۔ دوسری طرف عاشقانِ رسول اللہ کی کثرت ہے۔ اور آپکی امت میں خلافتِ رسولی بند نہیں ہو سکتی اور کائنات کا ہر ذرہ آپکی رسالت اور عظمت کی شہادت دے رہا ہے۔ اسلئے حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کے بعد کسی نبی کی ضرورت نہیں اور آپکے بعد ایک ولی اکمل کا وجود ہر زمانہ میں موجود ہے۔

---

[1] یہ امر ثابت شدہ ہے۔ کہ آپؐ کے بعد اسلام تمام روئے زمین پر پھیلا کوئی ایسا مقام نہیں جہاں مسلمان سجدہ نہ کرتا ہو اور اذان نہ دیتا ہو۔ سورج کی ابتدائی رفتار میں صبح۔ دوپہر۔ عصر۔ مغرب۔ عشاء۔ لیل۔ ختم نہیں اور لحہ لحہ میں فجر۔ ظہر۔ عصر۔ مغرب۔ عشاء کی اذانیں جاری ہیں کہ لحہ بھر کیلئے بھی وقفہ نہیں پایا جاتا۔ دوسری طرف رات کی عبادتوں میں آپؐ پر درود بھیجنا لحہ بھر کیلئے بھی بند نہیں جب تک سورج کی رفتار ہے۔ یہ عمل جاری رہے گا۔ یہی مقام محمود حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کو حاصل ہوا۔ جو ابد الآباد ختم نہ ہوگا۔

آپؐ کے بعد ایک ولی اکمل ہی آپؐ کے علم وعمل اور راہنمائی کی تکمیل کرتا رہے گا اور فَاتَّبِعُوْنِیْ یُحْبِبْکُمُ اللّٰہُ۔ ولی اکمل کا طریق بھی یہی ہوگا کہ وہ۔ شریعت کے احکام پر عمل۔ قیام لیل۔ قرأت قرآن کے ساتھ خصوصی عمل صَلُّوْا عَلَیْهِ وَسَلِّمُوْا تَسْلِیْمًا کا عامل ہوگا۔ ولی اکمل کا طریق مشاہدہ کیا ہوگا؟ ــــ لوگوں تک قرآن کا علم پہنچانا جیسے قرآن خود ہدایت کرتا ہے۔ وَاَنْزَلْنَآ اِلَیْكَ الذِّکْرَ لِتُبَیِّنَ لِلنَّاسِ مَانُزِّلَ اِلَیْهِمْ (پارہ۱۴ سورۃ۱۶ آیت۴۴)۔ یٰٓاَیُّهَا الرَّسُوْلُ بَلِّغْ مَآ اُنْزِلَ اِلَیْكَ مِنْ رَّبِّكَ ط (پارہ ۶ سورۃ ۵ آیت ۶۷) یہ طریق ظاہری شریعت کیلئے بھی ہے۔ کہ ایک عالم جو قرآنی علم۔ حدیث۔ فقہ کی تحصیل کر چکا۔ ظاہر خلیفہ ہوگا۔ اسکا کام خلافتِ اسلامی کا اقتدار حاصل کرنا۔ اسلامی ماحول کو تقویت پہنچا کر شرعی ماحول سازگار بنانا۔ جیسے حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی خلافت تھی۔ اسکے ساتھ قرآنی علم کو پھیلانا۔ اور اس کے علم کو آسان کرنا۔ علما (خلفاء) کا قائم کر کے ہر جگہ عوام میں تبلیغ کا ذریعہ پیدا کرنا۔ گویا عالمِ ظاہری کے لیے خلافت اسلامی کا قائم[1] رکھنا ضروری ہے۔ اسکے مقابل طریق طریقت میں بھی یہی طریق ہوگا۔ کہ یَتْلُوْا عَلَیْهِمْ اٰیٰتِهٖ ــــ اللہ کی راہ کے نشان

---

[1] انسانی فطرت کا تقاضا ہے۔ کہ انسان دولت کی فراوانی اور ضروریات زندگی کے آسانی سے فراہم ہونے پر آرام طلب ہو جاتا ہے۔ جسکا نتیجہ یہ ہوتا ہے۔ کہ انسانی آبادیوں میں ایک خالص ماحول میں بھی کمزور وجود پیدا ہو جاتے ہیں۔ جس سے طریق خلافت میں فرق آجاتا ہے۔ چونکہ خلافت ایک مجموعی قومیت سے وابستہ ہوتی ہے۔ اسلئے خلیفہ کے صحیح عامل نہ ہونے کے باعث جماعت بھی اثر انداز ہو جاتی ہے۔ اور اس انتشار کا نتیجہ یہ ہوتا ہے۔ کہ خلافت کی اصلیت زائل ہونے لگ جاتی ہے۔ اصلیت زائل ہونے سے قوت کم ہو جاتی ہے۔ قوت کم ہونے سے نظامِ خلافت بھی برہم ہو جاتا ہے۔ جسکا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ شرعی ماحول محدود ہو جاتا ہے۔ اقتدار ملکی ختم ہو جاتا ہے۔ بالآخر شریعت بھی محدود دائرے میں آجاتی ہے۔ اور اسلامی شریعت میں بھی یہی ہوا۔ کہ خلافت اسلامی میں ایک خلیفہ۔ خلیفۂ رسول کی حیثیت سے عامل نہ رہا۔ اور دولت کی فراوانی نے انہیں آرام طلب کر دیا۔ اور ان سے اقتدار چھن گیا۔ اور شریعت صرف مسجدوں میں محبوس ہوگئی۔ اور مسجدوں میں عالموں نے پناہ لی۔ لیکن یہ چیز بھی سالم نہ رہی۔ مسجدوں کے عالموں میں بھی قرآن وحدیث وفقہ کی تعلیم کے ساتھ نہ عمل رہا۔ نہ القاء قلبی رہا۔ نہ تبلیغ رہی۔ نہ وہ (باقی حاشیہ اگلے صفحہ پر)

بتانے۔ وَيُزَكِّيهِمْ قلب کوتوجہ نوری کے ذریعے پاک کرنا۔ اور يُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ اور فَاقْرَءُوْا مَاتَيَسَّرَ مِنَ الْقُرْاٰنِ میں سے قرآن کی کچھ قرأت بتانی۔ قرآن کی قرأت ایک طالب کے لیے مَاتَيَسَّرَ کے تحت کیا ہوگی؟ ــــ وہ یہ کہ اگر ایک شخص بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ۔ یا سبحان اللّٰہ۔ الحمد للّٰہ۔ یا۔ اَلرَّحِيْمُ۔ یا۔ قُلْ هُوَاللّٰهُ .... غرضیکہ ایک حرف قرآن کا پڑھنا بھی مَاتَيَسَّرَ مِنَ الْقُرْاٰنِ کے احاطہ میں آسکتا ہے۔ اسکے ساتھ سب سے بہتر قرأت صَلُّوْا عَلَيْهِ وَسَلِّمُوْا تَسْلِيْمًا میں حضور علیہ الصلوۃ والسلام پر درود بھیجنا سب سے افضل قرأت (ذکر) ہے۔ قرآن نے بھی حضور علیہ الصلوۃ والسلام کی زبانی مَاتَيَسَّرَ مِنَ الْقُرْاٰنِ کا تعین کردیا کہ اَفْضَلُ الذِّكْرِ لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ سب سے افضل ذکر یہی ہے۔ مَاتَيَسَّرَ مِنَ الْقُرْاٰنِ میں۔ لیکن جہاں ایک شاہد کو مشاہدہ کی ضرورت ہے۔ اسکے لیے تصور لازمی چیز ہے۔ سو یہ تصور سوائے درود شریف کے حاصل نہیں ہو سکتا۔ البتہ کلمہ شریف انسان کو اپنے مقصد حقیقی کے احاطہ میں رکھتا ہے۔

ولی اکمل کی راہنمائی میں بھی اگرچہ ولی اکمل کیلئے حب کا قائم کرنا ضروری ہے۔ لیکن شریعت نے ولی اکمل کیلئے (جیسے رسول کی اتباع فَاتَّبِعُوْنِيْ يُحْبِبْكُمُ اللّٰهُ اور حب کیلئے صَلُّوْا کا حکم رکھا) کوئی خصوصی حکم نہیں رکھا۔ ولی اکمل تو عمومی حیثیت رکھتا ہے۔ اسکی خصوصیت صرف علم کی بنا پر

(بقیہ حاشیہ گزشتہ صفحہ) خلافتِ رسولی کی روح رہی۔ نتیجہ یہ ہوا۔ کہ مسجدوں میں شریعت کی نماز۔ روزہ ہی رہا کچھ درس و تدریس رہی۔ لیکن شریعت کی روح قائم نہ رہ سکی۔ رفتہ رفتہ شریعتِ ظاہری میں اب ایک عالم ملاں کہلاتا ہے۔ اسکا کام نماز پڑھانی ہے۔ نہ علم کا اجرا ہے۔ نہ تبلیغ ہے۔ نہ ان میں ماحول سازگار بنانے کی قوت ہے۔ نہ خلفاء بنانے کی صلاحیت ہے۔ بس ایک رواجی شریعت ہے جس میں سابقہ شریعت کا بے جان عمل ہے۔ جس سے انسان نہ صحیح ماحول حاصل کرسکتا ہے۔ نہ اسکی اصلاح ہوسکتی ہے۔ باوجود نماز۔ روزہ کے بھی انسان زیادہ سے زیادہ غلط روی پر آمادہ رہتا ہے۔ البتہ اتنا ضرور ہے۔ کہ گزشتہ علماء نے شریعت کو جو تقویت پہنچائی اسکا ایک خاکہ ضرور ہے کہ کائنات کے ہر ذرّہ میں نماز میں اللہ ورسول کا نام لیا جاتا ہے۔ اور نمازوں میں اذانیں بدستور جاری ہیں جن میں اَشْهَدُ اَنَّ مُحَمَّدًا رَّسُوْلُ اللّٰهِ پکارا جاتا ہے۔ یہ کیفیت مسلمان کی نہیں بلکہ یہ اثر وَابْعَثْهُ مَقَامًا مَّحْمُوْدًا کا ہے۔

ہے۔ کہ بندوں میں سے ایک شخص عالم کی حیثیت سے راہنمائی کا مقام حاصل کرتا ہے۔ اور ایک راہنما سے علم حاصل کرنے کیلئے ضرور رجوع کرنا پڑتا ہے۔ جبکہ وہ شریعت کے عمل سے ہی عرفان حاصل کر چکا ہوتا ہے۔ اور طالب کو صرف ایک راہ (صراط مستقیم) حاصل کرنے کیلئے اسکی تقلید لازمی ہوتی ہے۔ اور وہ تقلید شریعت کی رو سے حب اور تصور کے ذریعہ ہی ہو سکتی ہے۔ اس تقلید کا اشارہ اس قرآنی آیت سے ظاہر ہوتا ہے اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيمَ ۝ اے اللہ دکھا (پہنچا) ہمیں سیدھا راستہ صِرَاطَ الَّذِينَ أَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ ۝ ان لوگوں کا راستہ جنہیں تو نے اپنے عرفان میں اعلیٰ مراتب کی نعمتوں سے نوازا اس سے مطلب کہ ہمیں بھی اپنی راہ دکھا۔ یہ وہی راہ ہے جس راہ پر ولی اکمل پہنچ چکے ہیں۔ تو اب راہ دیکھنے کی ترکیب یہی ہے کہ انسان ان راہ پانے والوں سے راہنمائی حاصل کرے۔ جبکہ طریقت کے حصولِ عرفان میں اتباعِ رسول کو لازمی قرار دیا گیا۔ اور رسول کے بعد آپکے نائبِ رسول یعنی اس بندے کی تقلید جس نے بدرجہ اتم عرفان حاصل کیا ہو۔ اور رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم سے تعلیم حاصل کر چکا ہو۔ گویا فَاتَّبِعُوْنِیْ کا حکم ہر زمانہ میں جاری رکھنے کا طریق یہی ہے کہ قائم مقام رسول اللہ سے حب رکھی جائے اور رسول اللہ سے جاری کردہ شریعت اسی نائب رسول سے حاصل کی جائے۔

جب ایک ولی اکمل اپنے کسی مرید (طالب) کو صراط مستقیم پر لے جاتا ہے۔ اسے عرفانِ الٰہی حاصل کراتا ہے۔ تو اسے عارف کہا جاتا ہے۔ اور جب تک ولی اکمل موجود ہوتا ہے۔ تب تک اس مقام و مرتبہ میں ولی اکمل خود فائز ہوتا ہے۔ ایسی حالت میں مرید عارف کو اسوقت تک یہ حق حاصل نہیں کہ وہ ایک تو ولی اکمل (پیر اکمل) کے ہوتے کسی کی راہنمائی کی ذمہ داری لے۔ دوسرے جب تک ولی اکمل کی طرف سے اسے یہ تصدیق حاصل نہ ہو کہ عارف کے کمال کی تکمیل ہو چکی ہے۔ اور وہ اس قابل ہے۔ کہ کسی دوسرے شخص کی بدرجہ کمال انتہا تک پہنچانے کی صلاحیت رکھتا ہے۔ اسکا مطلب یہ ہے۔ کہ اگر ایک شخص خود ذاتِ باری کا عرفان حاصل کر چکا ہو۔ تو اس میں مکمل راہنمائی کی صلاحیت اسوقت تک نہیں ہو سکتی جب تک کہ ولی اکمل کی طرف سے اسے سند حاصل نہ ہو۔ سند حاصل ہونے سے مراد یہ کہ دیکھنا اور چیز ہے۔ اور بنانا اور چیز۔ دیکھنے میں ایک انسان کا مقصود تک پہنچنا ہوتا

ہے۔ بنانے سے مراد ایک انسان کی راہنمائی کے لیے صلاحیت کا پایا جانا ـــــ اسلئے عارف کے مقابلہ میں ایک ولی اکمل کے سوا کسی دوسرے شخص کو کسی شخص کی راہنمائی کرنے کا شرعی طور حق حاصل نہیں۔

واضح ہو کہ طریق طریقت میں اسوقت تک کسی شخص کو راہنمائی کرنے کا حق حاصل نہیں جب تک اس میں سنت نبوی کی یہ خصوصیتیں نہ پائی جائیں۔ یَتْلُوْا عَلَیْهِمْ اٰیٰتِهٖ کہ وہ قرآن و حدیث وفقہ میں بدرجہ کمال عالم و عامل ہو۔ وہ قرآن کی ہر آیت سے اسکے ظاہری معانی سے واقف ہو۔ اور باطنی انوار (نور "مبین) و مشاہدہ سے واقف ہو۔ وَیُزَکِّیْهِمْ اور اس میں عرفان الٰہی حاصل کرنے کے بعد صراط مستقیم کی ہر منزل و مراحل سے آگاہی حاصل ہو۔ ہر منزل و مراحل میں راہ چلنے کے نشیب و فراز سے آگاہی ہو۔ اور طالب کو ان مقامات سے عبور کرانے کیلئے طالب میں صلاحیت پیدا کرنے کی قوت ہو۔ یعنی وہ طالب کے روحانی اور جسمانی وجود کو تمام مادی آلائشوں سے پاک کرنے کی صلاحیت اسقدر رکھتا ہو۔ کہ طالب کا وجود منازل عرفان میں۔ کسی مقام پر بھی پرواز کرنے میں مجبور نہ پایا جائے۔ یا ولی کسی مرحلہ میں طالب کو منازل طے کرانے میں عاجز نہ ہو۔ یہاں تک کہ طالب اپنے انتہائی مقام کو اسی طرح پالے جسطرح ایک راہنما ولی حاصل کر چکا ہے۔ وَیُعَلِّمُهُمُ الْکِتٰبَ اور وہ اپنی ذات سے ذات الٰہی کے تمام اسرار و رموز سے اسقدر واقف ہو۔ کہ صراط مستقیم کے ہر ذرّہ کیفیت سے اسے آگاہی حاصل ہو۔ کیونکہ کتاب میں وہ تمام کیفیات موجود ہیں جو ایک شاہد اپنے مشاہدہ میں صراط مستقیم اور راہ عرفان میں پاتا ہے۔ کیونکہ فَاقْرَءُوْا مَا تَیَسَّرَ کا نتیجہ ہی اللہ کے عرفان کی راہ ہے۔ یہ اسلئے کہ جب انسان عالم غیر جسمانی میں مشاہدہ کرنے لگ جاتا ہے۔ تو جاگتی حالت میں اسکا واہمہ۔ حافظہ۔ تعقل بھی کام کرتا رہتا ہے۔ اسکے ساتھ ہی عالم غیر جسمانی میں ایسی بھی قوتیں۔ کیفیتیں پائی جاتی ہیں۔ جو غیر حقیقی ہوتی ہیں تو انسان اگر علم نہ رکھتا ہو ایسی کیفیتوں میں اُلجھ کر راہ سے بھٹک جاتا ہے۔ ان کیفیات اور واہمہ۔ حافظہ۔ تعقل کے ہوتے ہوئے۔ ایک اکمل عالم (کتاب کے حقیقی انوار صراطِ مستقیم سے پوری واقفیت رکھنے والا) پورا علم و مشاہدہ رکھنے والا ہو۔ یعنی کتاب کے ہر لفظ کی کیفیات کو طالب کے شعور تک اسکی اصلی ماہیت میں لاسکتا ہو۔ وَالْحِکْمَۃَ ۔ وہ اپنی ذات سے لے

کر کائنات کے ہر ذرّہ کے باطن (روحانی وجود) صراط مستقیم اور منازل راہ عرفانِ الٰہی کی ہر کیفیت سے کلی طور واقفیت رکھتا ہو۔ واقفیت کرا سکتا ہو۔اور ہر وقت ظاہری باطنی کیفیات سے آگاہ رہتا ہو۔البتہ یہ ضروری نہیں۔کہ وہ ہر وقت انہی کیفیات کے مشاہدہ میں رہتا ہو۔نہیں بلکہ اسکی روح وسعت میں ہر کیفیت کو اپنے احاطہ میں لئے ہوئے ہو۔

پیشتر بیان ہو چکا ہے۔کہ مقصود (عرفانِ الٰہی) حاصل کرنے کیلئے۔سوائے شریعت کی تعمیل کے اور کوئی ذریعہ نہیں ہوسکتا ہے۔سو شریعت کی تکمیل کے ساتھ انسان کو مقصود کلی طور حاصل ہو جاتا ہے۔انسان عرفانِ الٰہی میں مراتب حاصل کر لیتا ہے۔گویا مراتب حاصل کرنے سے ہی انسانی مقصود کی تکمیل ہو جاتی ہے۔اسکے لیے شریعت کی ظاہری صورت ہے۔کہ ظاہری طور قرآن وحدیث اور فقہ سے علم حاصل کیا جائے۔البتہ شریعت میں زائد عبادت کا مخصوص طریق مراتب کے مشاہدات سے آگاہی کیلئے ہے مشاہدہ علم کی حکمت وحقیقت میں تقویت پہنچاتا ہے ــــ شریعت کے ظاہری علم کیلئے بھی یہ ضروری ہے۔کہ عالمِ ظاہری میں سنت نبوی کی مندرجہ بالا خصوصیتیں ظاہری طور پائی جائیں۔تب ہی مراتب کی تکمیل ہوسکتی ہے۔یعنی یَتۡلُوۡا عَلَيۡهِمۡ اٰيٰتِهٖ میں ایک عالم بھی قرآنی علوم میں حقیقی معانی میں بدرجہ کمال علم رکھتا ہو۔اور قرآن کی آیات میں غلط تاویل اور تحریف نہ کرتا ہو۔اسکے لیے اگرچہ نُـوۡر" مُبِیۡـن" کا مشاہدہ نہ ہو۔تاہم ذاتی کردار میں پاکیزگی اور شریعت کی تابعداری کا اسقدر پابند ہو کہ اسے قلبی القا حاصل ہو۔اور وَیُزَکِّیۡهِمۡ میں اسکا کردار و عمل اسقدر زود اثر ہو۔کہ اسکی تبلیغ میں اسکا فعل قابل تقلید اور اسوۂ حسنہ متاثر کرنے والا ہو۔اسکے قول میں قبولیت کا مادہ ہو۔یعنی نیکی کی تحریک پر انسان نیکی کی طرف رجوع ہو جائے۔اور بدی کی نہی پر انسان بدی سے باز رہے۔ اسکا ہر قانون۔ہر طریق اصلاح۔مستقل نتیجہ اپنے میں رکھتا ہو۔اس میں کسی وقت بھی خامی واقع نہ ہو۔وَیُعَلِّمُهُمُ الۡکِتٰبَ اور اسکی قرآنی تفسیر میں وہی کیفیت پائی جاتی ہو۔جو قرآن کے الفاظ میں حقیقی معانی مضمر ہیں۔اسکا درس حقائق سے پُر اور عمل نتیجہ خیز ہو۔وَالۡحِکۡمَةَ۔اسکے ظاہری علم میں۔اسکے بیان سے اصلی حقیقت (صراط مستقیم) کا صحیح تصور قائم ہو کر انسان کو ایک صحیح کیفیت کا تصور حاصل ہو

سکتا ہو۔ یہ دونوں کیفیتیں ایک انسان کی راہنمائی کیلئے ضروری ہیں۔ اگر شریعت ظاہری کا عالم ان صفات سے متصف نہ ہو۔ تو وہ شخص راہنمائی کا مستحق نہیں ہو سکتا ہے۔ نہ ایسا شخص قابلِ تقلید ہو سکتا ہے۔ برعکس اسکے اگر قول وفعل میں نامکمل انسان راہنمائی کا دعویٰ کرے تو ممکن نہیں کہ اسکی راہنمائی میں ظاہری طور ایک طالب صحیح راہ حاصل کرے۔ بلکہ ایسے شخص سے کسی کی اصلاح ہونا۔ ناممکن ہے۔ اور ایسی حالت میں لوگ جبکہ کسی مکمل راہنما کی راہنمائی حاصل نہ کر سکیں۔ لوگوں کے عقائد ونظریات اور اعمال میں نقائص پیدا ہوتے ہیں۔ اور عوام میں لادینی۔ شریعت سے فرار اور بے عملی واقع ہوتی ہے۔

اسی طرح ایک۔ نامکمل ولی کی راہنمائی میں بھی انسان نہ صحیح راہ پا سکتا ہے۔ نہ اسے مشاہدۂ حقیقی حاصل ہو سکتا ہے۔ فی زمانہ دیکھنے میں آتا ہے۔ کہ شریعت وطریقت میں کثرت سے عالم پائے جاتے ہیں اور وہ لوگ راہنمائی کا دعویٰ کرتے ہیں۔ تبلیغ درس وتدریس کا کام کرتے ہیں۔ لیکن انکی تبلیغ میں اتنا بھی اثر نہیں کہ ایک مسلمان کو ہی صحیح راہ پر لا سکیں۔ پھر بھی انکا دعویٰ ہوتا ہے۔ کہ ہم عالم ہیں اور بڑے دعوے سے کہتے ہیں کہ عالم وارث انبیاء ہوتا ہے اور حضورؐ کی اس حدیث۔ اِنَّ الْعُلَمَاءِ وَرَثَةُ الْاَنْبِيَـــــاءِ کی آڑ لے کر اپنا مادی اقتدار عوام پر مسلط رکھنا چاہتے ہیں۔ کہ ہم بھی منبرِ رسولؐ پر چڑھ کر قرآن وحدیث بتاتے ہیں۔ اسلئے ہم یقینی طور قابل احترام نائب رسول ہیں۔ لیکن حالت یہ ہے قرآن وحدیث کو سنا کر صرف تنخواہیں اور نذر ونیاز وصول کرنا انکا واحد مقصد ہوتا ہے۔ باوجود اسکے کہ وہ قرآن وحدیث وفقہ۔ معقول ومنقول۔ کلام۔ وحکمت کے تحصیل یافتہ ہوتے ہیں۔ لیکن انکے علم میں نہ فہم کا مادہ ہے۔ نہ ہی انکی تبلیغ میں قبولیت کا مادہ پایا جاتا ہے۔ اسکی وجہ یہی ہے۔ کہ ان علماء میں مندرجہ بالا صفات (سنّت نبوی) نہیں پائی جاتیں اور یہ حقیقت ہے۔ کہ جب تک ایک عالم میں سنّت نبوی کی ان صفات يَتْلُوا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِهٖ وَيُزَكِّيْهِمْ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ کا مادہ موجود نہیں انسان میں دین کی طرف کلی طور رجوع کرنے کا مادہ پیدا نہیں ہو سکتا۔ اور ان صفات کی مجمل صفت صحیح قول اور صحیح عمل ہے جو صفت بمشکل کسی عالم میں پائی جا سکتی ہے۔ یہی حالت ایک عالم ولی کی ہے۔ کہ فی زمانہ اکثر لوگ فقیری کے بھیس میں جگہ جگہ پھر رہے ہیں۔ ہزاروں زیارتیں۔ گدیاں مشہور زمانہ پائی

جاتی ہیں۔اوراکثر فقرا کی اسقدر مانگ ہے۔کہ لوگ جوق در جوق انکے آستانہ پر حاضر رہتے ہیں۔ لیکن بہت کم لوگ ایسے مل سکتے ہیں جو حقیقی معنوں میں ولی کہلانے کے مستحق ہوں۔لیکن ایسے لوگوں کی طرف کوئی بھی رجوع کرنے والانہیں۔اسکی وجہ یہ ہے۔کہ اول تو اسلامی (شرعی) ماحول سرے سے مفقود ہے۔دوسرے صحیح عالم نہ ہونے کے باعث شریعت وطریقت کا صحیح علم کسی کو حاصل نہیں۔ جس وجہ سے ایک طرف نقلی عالم (علماءسو) اور نقلی اولیا اپنی اغراض پوری کرنے کیلئے عوام کو دھوکہ میں رکھ رہے ہیں۔دوسری طرف عوام بھی شریعت وطریقت کا علم نہ ہونے کے باعث ایسے فقرا کے آگے جھک جاتے ہیں۔نہ ولی کو علم ہے کہ فقیری (طریقت) میں کیا کچھ علم ہوتا ہے۔نہ عوام کو ہی علم ہے کہ ہمیں کس شے کی تلاش کرنی چاہیے۔کس سے راہنمائی حاصل کرنی چاہیے۔اور کس طرح کرنی چاہیے۔

اکثر دیکھا گیا ہے کہ عوام مزارات پر چڑھاوے چڑھاتے ہیں۔وہاں کے سربراہ (متولی یا گدی نشین) بجائے خود غیر شرعی طریق جاری کر کے عوام کو گمراہ کرتے ہیں۔اور عوام بھی ایسے راہنماؤں کی راہنمائی میں مزارات کو ایک مقدس مقام سمجھ کر غیر شرعی اعمال کا ارتکاب کرتے ہیں۔ جس سے انہیں نہ کوئی صحیح راہ حاصل ہوسکتی ہے۔نہ ہی اُنکی کوئی اصلاح ہوسکتی ہے۔ان میں اکثر مزارات پر گانا بجانا۔میراثیوں سے طبلہ۔سارنگی۔باجا وغیرہ بجا کر چند غزلیں سنی جاتی ہیں۔قبر پر ڈھول بجا کر پھول چڑھائے جاتے ہیں۔اور مزار والے بزرگ کی تعریف میں اشعار گائے جاتے ہیں۔بزرگ کی مہندی لگتی ہے۔جس میں مہندی کو ڈولی میں رکھ کر جلوس نکالا جاتا ہے۔لوگ ناچتے ہیں۔نعرے مارتے ہیں۔پھر برات بھی نکلتی ہے۔وغیرہ۔چند ساعت کے لیے یہ تسلیم بھی کیا جائے کہ ایسے اعمال بزرگانِ سلف سے بھی واقع ہوئے ہیں اور ایسے بزرگ واقعی مشہور زمانہ ولی تسلیم کئے جاتے ہیں۔اور یہ افعال باطن سے تعلق رکھتے ہیں۔اسلئے شریعت کی ضد محسوس کئے جاتے ہیں۔لیکن دیکھنا یہ ہے۔کہ آیا طریقت کی بنیاد کن اعمال پر ہے۔طریقت کیا چیز ہے۔اور طریقت کے افعال کیوں شریعت کی ضد سمجھے جاتے ہیں۔اسکی وجہ یہ ہے۔کہ ایسے افعال کے جاری کرنے والے گندم نما جوفروش مجاور ہوتے ہیں۔جو شریعت وطریقت کے علم سے قطعی نابلد ہوتے ہیں۔صرف خودغرضی نفس

پرستی کی بناء پر ذاتی اختراع سے ایسے طریق پیدا کرتے ہیں جس سے جاہل عوام اپنی لاعلمی کی وجہ سے۔ان خود غرض فقراء کے آلہ کار بن جاتے ہیں۔اس طرح یہ لوگ ان اعمال میں کوئی حقیقی نظریہ نہیں رکھتے سوائے اسکے کہ ان کی غرض زر پرستی ہوتی ہے۔

اسی طرح بعض وہ گدی نشین جو بظاہر سفید پوش شریعت وطریقت کے پابند نظر آتے ہیں۔ مزاروں پر سالانہ عرس کرتے ہیں۔جس میں نماز۔وظائف۔ذکر اور لنگر (خیرات) چلاتے ہیں۔اور ایسے مزاروں میں عرس پر لاکھوں لوگ جمع ہوتے ہیں۔اور گدی نشین لاکھوں روپے نذر و نیاز میں حاصل کرتے ہیں۔ان اعمال کے حامل لاکھوں میں چند ہوتے ہیں۔باقی برائے نام عرس میں شرکت کیلئے یا تماش بینی کیلئے یا اپنی دنیوی اغراض (مقدمہ۔تکالیف۔مجبوری) کیلئے حاضر ہوتے ہیں۔ایسے موقع پر بھی عوام سوائے عرس میں چند ساعت کی شمولیت میں ایک بے معنی لُطف حاصل کرنے کے اور کچھ بھی حاصل نہیں کرتے۔ یہاں بھی مزار کے بزرگ کے جانشین۔گدی نشین کہلاتے ہیں۔ بظاہر یہ لوگ ولایت کے درجہ پر اپنے آپکو جتلاتے ہیں۔ بیعت کرتے ہیں۔لاکھوں مرید بناتے ہیں۔لیکن ان میں اکثر گدی نشین ایسے ہوتے ہیں۔جو حقیقی شریعت وطریقت کے علم سے نابلد ہوتے ہیں۔نہ ان میں شریعت کی تکمیل ہوتی ہے۔نہ ہی ان میں قوت مشاہدہ ایک ولی جیسی ہوتی ہے۔ایسے لوگ بھی صرف اپنی ساکھ (بزرگانہ عزت) نذر و نیاز۔اور شہرت کے متمنی ہوتے ہیں۔ان سے کوئی شخص نہ علم شریعت پاتا ہے۔نہ علم طریقت سے یہ لوگ واقف ہوتے ہیں۔نہ کسی کو فائدہ پہنچا سکتے ہیں۔باوجود اس کمزوری کے اکثریت انہیں ولی ومجدد تسلیم کرتی ہے۔اور ان غیر شریعت وطریقت افعال کو اصل دین وطریقت سمجھتے ہیں۔

اس دینی افراط وتفریط کا اصلی سبب یہ ہے۔کہ مدتوں سے اسلامی حقیقی ماحول بگڑا ہوا ہے۔ اور اسکی وجہ یہ ہے کہ اسلام میں ایک خالص راہنما۔ایک حقیقی عالم پایا نہیں گیا۔جو سنت نبوی کی روشنی میں عوام تک علم وعمل کو پہنچائے۔

حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کے زمانہ میں انسان کے عمل کیلئے ایک وحی (قرآن) اور ایک حدیث (اتباع رسولؐ) پائی جاتی تھی۔بس یہی شریعت حقہ تھی اور یہی طریقت تھی ___ اور شریعت

کے احکام خالص اور واضح تھے۔ جس میں نہ کسی مزار پر سارنگی گانجا بجانے کی ضرورت تھی۔ نہ پھول چڑھانے کی ضرورت تھی۔ نہ عرس منانے کی ضرورت تھی۔ اصحاب رسول اللہؐ نے صرف قرآن کو سُنا اور رسول کی اتباع میں قرآنی احکام کی تعمیل کی۔ قرآن عمل تھا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم عالم و راہنما تھے۔ اصحاب رسول اللہؐ میں ہر شخص کا نظریہ صرف قرب الٰہی اور محبت رسولؐ تھا۔ نتیجہ یہ ہوا۔ کہ کفر کے مقابلہ میں شریعت کا نظام ہر جگہ جاری ہونے لگا۔ ایک طرف ماحول اسلامی (روحانی) پیدا ہوا۔ اور اسی ماحول کے دائرہ میں ہر شخص کو حقیقی علم حاصل ہوتا رہا۔ جس نے ظاہری طور شریعت کی تابعداری کی اسے مراتب حاصل ہوئے۔ جس نے زائد عبادتِ شریعت کو اپنایا اسے مشاہدہ بھی حاصل ہوتا رہا۔ یہاں راہنما بھی عالم تھا اور تابع (طالب) بھی عالم تھے۔ ایسی حالت میں کسی کو غلط راہ اختیار کرنے کا موقع ہی نہ مل سکتا تھا۔

حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کے بعد خلافتِ اسلامی پیدا ہوئی۔ جسکا مقصد صرف اسلامی ماحول کا برقرار رکھنا اور اسے وسعت دینا تھا۔ چنانچہ اسلامی خلافت کا ہر شخص عامل و عالم تھا۔ ہر شخص اسلامی ماحول کے احاطہ میں آ کر نماز۔ روزہ۔ زکوٰۃ۔ نوافل ہی کا عامل رہا۔ اسکی وجہ صرف اسلامی شریعت سے قائم شدہ خالص ماحول کا پایا جانا اور ایک خالص عالم کی راہنمائی کا حاصل ہونا تھا ـــــ لیکن ایسا زمانہ بھی آیا۔ کہ دینی عروج کے ساتھ اسلام میں افراط زر بھی پیدا ہوا ـــــ افراطِ زر سے مراد یہ ہے کہ اسلامی معاشرہ میں کوئی شخص ایسا نہ پایا جاتا تھا۔ جو اپنی ضرورتوں کیلئے محتاج تھا۔ اب مال و زر کیلئے محتاج نہ ہونے کی وجہ سے افراط پیدا ہوگئی۔ یہ امر مسلمہ ہے۔ کہ انسان اپنی احتیاج (ضرورت) سے فارغ رہ کر آرام طلب ہو جاتا ہے۔ یہی کیفیت مسلمانوں میں پیدا ہوئی کہ اکثر خلفاء جاہ پرستی کی طرف مائل ہوئے۔ نتیجہ یہ ہوا۔ کہ خلفاء نے طریق سنتِ نبویؐ میں کوتاہی شروع کر دی۔ چونکہ شرعی ماحول کا انحصار خلیفہ کے عمل و علم پر ہی منحصر تھا۔ اسلئے خلیفہ کی راہنمایانہ حیثیت میں فرق آ گیا۔ اور اس میں وہ صفات (یَتْلُوْا عَلَیْهِمْ اٰیٰتِهٖ وَ یُزَکِّیْهِمْ وَ یُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ) نہ رہیں ـــــ لیکن اس زمانہ میں ہر شخص عالم تھا۔ چنانچہ خلیفہ سے ماسوائے علماء نے خلیفہ کے اعمال پر نکتہ

چھینی شروع کی جس سے۔خلافتِ اسلامی میں۔ایک خلیفہ اور ایک عالم کی تخصیص پیدا ہوگئی۔

خلیفہ و عالم کی تخصیص میں شریعت بھی منقسم ہوگئی۔چونکہ خلافت کو بیرونی ماحول کے حملہ سے محفوظ رکھنے کی ضرورت تھی۔اسلئے اب خلافت کے سپرد نظامِ حکومت سے متعلق امور ہوگئے۔ تاکہ شریعت بیرونی اثرات سے محفوظ رہے۔اور اندرونی ماحول میں چونکہ کثیر تعداد عالم موجود تھے۔ انہوں نے خالص شریعت کے علم کو جاری رکھا۔ایک طرف خلافت اسلامی کیلئے خلیفہ مقرر ہوا۔اور شریعت ایک علیحدہ جز ہوگئی۔اسکا طریق ایک عالم کے سپرد ہوا۔اور یہ عالم ان صفات نبوی کا حامل رہا جس سے شریعت کا ماحول علیٰ حالہٖ قائم رہا۔پیشتر ابتدائی ماحول میں خلافت اسلامی ماحول کو سازگار بنانے کیلئے تھی۔اور عالمِ ربّانی صرف مشاہدہ حقیقی کیلئے تھا۔اب اسلام میں۔خلافت شریعت دو چیزیں بنیں۔البتہ اس حالت میں بھی خلافت نے اگرچہ بیرونی ماحول سے شریعت کو محفوظ رکھا۔لیکن خود شریعت میں رخنہ اندازی کا سبب بھی خلیفہ ہی بنا ـــــ گویا شریعت ایک طرف بیرونی خطرات سے محفوظ تھی۔لیکن اسکے اندر خود کمزوریاں پیدا ہونے لگیں۔نتیجہ یہ ہوا۔کہ غرض پرست خلفاء نے شریعت کے احکام میں کوتاہی شروع کی اور علماء شریعت نے انکی مخالفت کی۔مخالفت کا نتیجہ یہ ہوا۔کہ خلفاء نے اپنے اقتدار کے ساتھ علماء کو پابند کرنے کی کوشش کی۔اس طریق کار سے عوام کا رُخ خلیفہ سے ہٹ کر کلیۃً عالم کی طرف ہوا۔یہاں سے شریعت میں راہنمایانہ حیثیت عالم کے سپرد ہوئی۔پیشتر خلیفہ کے امام و امیر ہونے پر شریعت کا مرکز دربار خلافت یعنی مسجد نبویؐ تھا۔جہاں خلافت کے دینی و دنیاوی مسائل طے ہوتے تھے اب دارالخلافت ایک علیحدہ چیز ہوگئی اور عالم کی سپردگی میں شریعت کا مرکز مسجد بنی ـــــ اسی مسجد کی ایک ہیئت (جہاں درس و تدریس ہوتی تھی) دارالعلوم کی شکل میں ظاہر ہوئی ـــــ اور ہر علم شریعت کا اجراء دارالعلوم سے ہی ہونے لگا۔دارالعلوم میں ایک عالم تمام قرآن و حدیث کے علم سے پوری طرح واقف تھا۔اور یہی علم۔علم شریعت کہلاتا تھا۔اسکے ساتھ اسی علم کی بنیادوں پر ایک ولی سازگار ماحول پاکر عوام میں مخصوص طالبانِ حقیقت کو مشاہدہ و عرفان کا علم عطا کرتا تھا۔گویا شریعت و طریقت ایک ہی سانچہ میں ڈھلی ہوئی تھی۔

یہ ایک فطری خاصہ ہے۔ کہ انسان جب تک زندہ ہے۔ اس میں سفلی قوتیں موجود رہتی ہیں۔ انسان ذرا بھی اپنی روحانی قوتوں سے لاپرواہ رہے۔ سفلی قوتیں غالب ہونے لگ جاتی ہیں۔ اور انسان خلاف فطرۃ افعال پر آمادہ ہو جاتا ہے۔ انسان کی روحانی قوتوں کو بحال رکھنے کا انحصار ماحول پر ہی ہوتا ہے۔ کہ اسے خالص ماحول میسر ہوتا رہے۔ تاکہ روحانی قوتیں قوی ہوتی رہیں اور سفلی قوتیں انسان کے ارادہ میں مقید رہیں۔ ماحول کے خالص ہونے کا دارومدار ایک خلیفہ۔ امیر یا عالم پر ہی ہوتا ہے۔ اسلئے امت میں تمام خرابیوں کی زیادہ تر ذمہ داری امت کے امیر یا راہنما پر ہی ہوتی ہے۔ جس وقت خلیفہ کی راہنمایانہ صفات میں کمزوری پیدا ہوگئی تو امت کے نظم وضبط میں بھی فرق آنے لگ جاتا ہے۔ اسکا اثر عوام پر بھی ہوتا ہے۔ ایک طرف ماحول میں کمزوری آجاتی ہے۔ اس میں کئی کمزوریاں پیدا ہو جاتی ہیں۔ سب سے بڑی کمزوری یہ کہ پابندی کا احساس لوگوں میں اٹھ جاتا ہے۔ لوگوں میں احتیاج (ضرورتوں کی محتاجی) بھی پیدا ہوتی ہے۔ یہی حالت مسلمانوں میں پیدا ہو گئی۔ کہ خلیفہ کی غلط روی کی حمایت اکثر لوگوں نے صرف غرض پرستی کی بنا پر کرنی شروع کی۔ جس سے غرض پرستی کی وبا عوام میں پھیلنے لگ گئی۔ ایک خلیفہ کے دربار خلافت میں حمایت کرنے والے پیدا ہو گئے۔ اور یہ کیفیت عوام میں بھی پیدا ہونے لگی یہ اس حالت میں پیدا ہوئی کہ ہر شخص شریعت کے احکام کا پابند بھی ہے۔ لیکن ناجائز حصول کا بھی متمنی ہے۔ ایسے لوگوں میں سے بعض اسی کیفیت کے ساتھ دارالعلوم اور مسجدوں میں داخل ہو گئے۔ ایک طرف علم بھی حاصل کر رہے ہیں۔ شریعت کے بھی پابند ہیں لیکن اپنی ضرورتوں کو وسعت بھی دینا چاہتے ہیں۔ ان میں بعض لوگ تو قرآن وحدیث کی فہم میں کمال بھی حاصل کرتے ہیں بعض اپنی دماغی قوتوں کی کمزوری کی بنا پر تحصیل علم میں نامکمل بھی رہتے ہیں۔ ایسی حالت میں دارالعلوم میں ایک ایسا عالم بھی پیدا ہوتا ہے۔ جو ایک طرف قرآن وحدیث کے حقیقی معنوں سے آگاہ ہے۔ لیکن اسکی تعمیل میں اسکی ذاتی کوتاہی اسے شریعت کی تکمیل نہیں کرنے دیتی ہے۔ یعنی یہ شخص قرآن وحدیث کے احکام وعلم کو جاننے کے باوجود اس پر جان بوجھ کر عمل نہیں کرتا۔ یہ شخص بھی اپنی ذاتی اغراض کی بنا پر ایک غلط رو حاکم کی حمایت کرتا ہے۔ اور احکام میں تاویل وتحریف کر

کے غلط کو اصل بنانے کی کوشش کرتا ہے۔ ایسے عالم کو عالم سوء (برا عالم) کہا جاتا ہے۔ باوجود قرآنی احکام ومعارف سے واقفیت ہونے کے بھی اسکا عمل صحیح نہیں لہذا اس میں اگرچہ یَتْلُوْا عَلَیْھِمْ اٰیٰتِہٖ کی صفت ہو بھی لیکن یُزَکِّیْھِمْ کا مادہ پیدا نہیں ہوسکتا نہ ہی اسے کتاب کا علم یُعَلِّمُھُمُ الْکِتٰبَ اور حکمت وَالْحِکْمَۃَ سے شناسائی ہوسکتی ہے۔ ایسا شخص اگرچہ عالم بھی کہلائے لیکن عالم سوء ہونے کی وجہ سے اس سے علم وراہنمائی حاصل نہیں ہوسکتی۔ جب ایسے لوگوں کی کثرت ہو جائے تو امت صحیح علم سے محروم رہ جاتی ہے۔ دوسرا فرقہ بھی ایسے لوگوں کا ہوتا ہے جو علم میں نامکمل ہوتے ہیں لیکن اپنی اغراض پوری کرنے کے لیے عالم کا لبادہ پہننے پر مجبور ہو جاتے ہیں۔ ایسے لوگ مکمل علم نہ ہونے کے باعث اختراع وتحریف کر کے غلط علم پیدا کرتے ہیں۔ ایسی حالت میں عوام میں جاہل طبقہ کی پیدائش ہو جاتی ہے۔ چونکہ عوام کے سامنے ماحول خراب ہونے کے باعث صحیح علم پیش نہیں ہوتا۔ اسلئے عوام علمانہ لبادہ کے دھوکہ میں غلط نظریات وعقائد کو جلد قبول کر لیتے ہیں اسکی وجہ یہ ہے۔ کہ عوام بھی اپنی احتیاج کے باعث آرام طلب ہوتے ہیں اور شرعی پابندی کو اپنے لئے بوجھ سمجھنے لگتے ہیں ــــ یہی کیفیت دارالعلوم کے علما کے ساتھ ہوئی۔ کہ یہاں پر علماء سوء کا وجود پیدا ہوا ــــ اور یہ فرقہ بھی عوام کی نظروں میں گر گیا۔ اور اسکے ساتھ علم حقیقی مفقود ہونے لگا۔ علماءِ حقیقی سے جو ماحول محفوظ تھا اس میں بھی رخنہ اندازی ہوگئی۔ ماحول سازگار نہ ہونے کے باعث طالبانِ حقیقت کم پیدا ہونے لگے ــــ ماحول خراب ہونے کے باعث اولیا (صاحبِ طریقت) نے تنہائی اختیار کی ایسی حالت میں یہ کیفیت پیدا ہوئی۔ کہ دارالعلوم کے حقیقی علما کی طرف عوام کا رجوع کم ہونے لگا اور بہت کم لوگ حقیقی عالم کے خواہش منداس طرف رجوع کرتے۔ اور غلط علم رائج ہونے کے باعث لوگ حقیقی علم سے دور ہو کر اسے قبول کرنے سے عاری رہے۔ لیکن کائنات کیلئے ایک فطری نظام پر چلنا ضروری تھا۔ اسلئے اکثر زمانوں میں جبکہ حقیقی علم کی روشنی مدھم ہونے لگ جاتی تو فطرت نے ایسے عالم پیدا کئے جنہوں نے شریعت کی ساکھ دوبارہ قائم کردی۔ یہ علما مشہور زمانہ ہیں۔ اسلئے کہ انکا علم وعمل عوام میں پائیدار اور نتیجہ خیز رہا۔ اور انہیں علماء کی تجدید علم مدتوں اپنی حالت میں قائم رہی۔ اس طرح خلافت ایک علیٰحدہ

چیز ہو کر رہ گئی۔ مسجدیں۔ دارالعلوم اور انکا علم ایک علیٰحدہ چیز بن کر رہ گیا۔ علماءِ سو کا علم علیٰحدہ چیز بن کر رہ گیا۔ نتیجہ یہ ہوا۔ کہ اسلامی شریعت میں مختلف عقائد و نظریات پیدا ہوئے۔ اور ان میں آپس کے اختلاف کا تصادم پیدا ہو کر مختلف فرقے بن گئے۔

علماءِ طریقت کیلئے اب کسی طالبِ حقیقت کا پایا جانا شریعت کے اندر مشکل تھا۔ اسلئے علماءِ طریقت نے علیٰحدگی اختیار کی اب جو لوگ صحیح شریعت پر چلنے والے تھے ان میں چند مخصوص ہستیاں اس طرف رجوع کرتیں جنہیں ولی فقیر یا درویش کے نام سے پکارا گیا۔ اسکی وجہ یہ تھی۔ کہ علماءِ طریقت نے جب ماحول کو سازگار نہ پایا تو انہوں نے اس ماحول سے کلی طور کنارہ کشی کر کے گوشہ نشینی اختیار کی تاکہ یہ اپنے تزکیہ و مجاہدہ کیلئے خاموش و تنہا فضا پا سکیں۔ انہوں نے آبادیوں سے علیٰحدہ مقام اختیار کیا اور شریعت میں جو لوگ عرفان کے جویاں تھے اسی مقام پر جمع ہو کر مشاہدہ و مجاہدہ میں مصروف رہتے۔ اور ہر ولی کے بعد اسکا ایک قائم مقام اس جگہ مقرر ہو کر تعلیم طریقت کا اجرا کرتا۔ علیٰحدگی کے باعث یہ جگہ خانقاہ کے نام سے موسوم ہونے لگی ــــ اور ایک ولی کے انتقال کے بعد جب اسکی قبر بھی اسی جگہ بنی تو اس جگہ کو مزار کے نام سے موسوم کیا گیا۔ الغرض مزار و خانقاہ[1] سے ہی طریقت کا اجراء

---

[1] خانقاہ۔ فارسی لفظ ہے۔ معلوم ہوتا ہے۔ کہ یہ طریق اس زمانہ میں رائج ہوا ہے۔ جب ایران و ہندوستان میں ایسے لوگوں نے مقام کیا ہوگا۔ تو اولیا چونکہ آبادی سے دور غیر آباد جگہوں پر قیام کرتے رہے تو لوگ ایسے مقام کو خانۂ کاہ (گھاس والا گھر) کے نام سے پکارتے کیونکہ غیر آباد جگہوں میں اولیا گھاس کے مکان ہی بنا لیتے ہوں گے۔ اسلئے خانہ کاہ بگڑ کر خانقاہ بن گیا ہوگا۔ اور عربی لفظ میں جہاں ایک بزرگ کی قبر واقع ہو مزار کے نام سے موسوم ہے۔ یہ نام زار سے ہے یعنی زیارت کرنے کی جگہ جیسے حضور کی اس حدیث میں اس لفظ کا اشارہ ہے مَنْ زَارَ قَبْرِیْ وَجَبَتْ لَہٗ شَفَاعَتِیْ۔ اسی زار سے مزار بنا اور اسلئے جب تک عراق۔ بغداد۔ شام۔ دمشق۔ مکہ وغیرہ میں ان لوگوں کا قیام رہا اس جگہ کو قبر (جیسے قبر النبی) یا تربت یا مزار ہی کہا گیا۔ اور اس سے قبل علماءِ طریقت و شریعت کا مقام دارالعلوم یا مسجد تھا اور ساتھ ہی ان دونوں طریق میں نمایاں فرق محسوس نہیں کیا جاتا تھا۔ اسلئے طریقت کے طریق اور عالم کیلئے کوئی مخصوص نام نہیں پایا جاتا ہے۔ البتہ طریقت کا لفظ طریق سے ہے "ت" عربی میں مخفی کرنے (چھپانے) کے لیے لگائی جاتی ہے۔ کہ یہ طریق مخفی ہے۔

ہونے لگا۔ چونکہ شریعت کا علم ایک عمومی علم تھا اسلئے اسکا اجرا علی الاعلان ہوا۔ کیونکہ انسانی مقصود کیلئے شریعت ہی مخصوص تھی اسلئے مراتب کے لحاظ سے اسی علم کی طرف رجوع رہا۔ اور مشاہدہ چونکہ مخصوص طریق تھا اسلئے یہ چیز پنہاں ہوگئی۔

یہ امر مسلمہ ہے۔ کہ طریقت میں سوائے شریعت کی پابندی وعمل کے اور کچھ نہ تھا البتہ اس کی تخصیص علم باطن میں باطنی کیفیات کے مشاہدہ سے ہی ہوتی تھی۔ مگر یہ چیز ایک مسلمان (مومن) کیلئے شریعت سے علیحدہ کوئی نئی یا غیر شرعی نہیں سمجھی جاتی تھی۔ کیونکہ اس میں خلاف شریعت کوئی عمل موجود نہ تھا۔ لیکن بد قسمتی سے اس طریق میں بھی نقص واقع ہوا۔ وہ یہ کہ علماء طریقت کا مقام آبادیوں سے باہر تھا۔ جہاں انکے لیے اپنی مختصر ضروریات کا فراہم ہونا مشکل تھا۔ اسلئے آبادیوں سے آنے والے طالبانِ حقیقت اپنے راہنماؤں کیلئے یا ان محتاجوں کیلئے جن کے پاس ضروریات زندگی کا کوئی ذریعہ موجود نہ تھا۔ انکی ضرورتوں کا سامان لے آتے۔ جیسے خلافت میں خلیفہ کیلئے بیت المال سے وظیفہ ہوتا یا اصحاب صفہ کے لیے حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام (جو کچھ آپؐ کے لیے نذر میں پیش کیا جاتا) انکی ضرورتیں پوری کرتے۔ اسی طرح لوگ عالمِ طریقت اور طالبوں کیلئے نذر لے آتے۔ لیکن یہ نذرانہ جمع کرنے کیلئے نہ ہوتا بلکہ اس میں سے صرف اتنا ہی لیا جاتا جس سے ایک وقت کی ضرورت پوری ہوتی۔ باقی حسب سنت نبویؐ مساکین میں خیرات کیا جاتا۔ یہ امر ضروری تھا۔ کہ اگر چہ علماء طریقت نے گوشہ نشینی اختیار کی تھی تاہم طالبان کی آمد ورفت اور رجوع نے عوام تک بھی خبر پہنچائی۔ اور اولیاء کا مخصوص طریقہ عوام کیلئے بھی باعث توجہ ہوا۔ اکثر لوگوں کی آمد ورفت سے یہ جگہ بھی مشہور ہونے لگی۔ اب اکثر لوگ طریق طریقت میں شامل ہونے کیلئے آتے۔ اور نذر ونیاز بھی پیش کرتے۔ نتیجہ یہ ہوا۔ کہ ایک طرف طریقت کو مخصوص انداز میں لیا گیا۔ دوسری طرف نذر ونیاز کا سلسلہ بھی جاری ہوا۔ یہاں سے طریقت کا طریق شریعت سے علیحدہ (بوجہ علیحدہ ہونے کے) سمجھا جانے لگا۔ عوام میں اکثر لوگ اسی فرقہ سے بھی ہوتے جو ایک طرف شریعت کے عامل ہوتے لیکن ان میں نفسی کثافت کی وجہ سے دنیوی اغراض کا مادہ بھی موجود تھا۔ اسلئے ایسے مقام پر جہاں طریقت کا یہ طریق مخصوص سمجھا گیا اور یہاں نذر

و نیاز کا سلسلہ بھی جاری ہوا۔ایسے لوگوں نے جو اپنی نفسی کثافتوں کو صاف نہ کر سکے ان میں اغراض کا مادہ موجود رہا۔طریق طریقت میں بناوٹ پیدا کی۔ایک طرف یہ لوگ پورے عامل و عالم بھی نہ بن سکے۔دوسری طرف دنیوی اغراض پرستی کا مادہ بھی ان میں موجود رہا۔ان لوگوں نے اپنی نفسی اغراض کی بنا پر اپنے آپکو فقیری لبادہ میں ایک عالم کہلوایا____ انکا مقصد عرفان و مشاہدہ نہ تھا۔ بلکہ حصول زر تھا____ اور ان لوگوں کی کثرت نے خانقاہوں اور مزاروں کو بھی اپنی اغراض کا اڈہ بنا کر مختلف قسم کی تاویلات و اختراعات پیدا کر کے طریقت کو شریعت کی بالکل ضد بنا دیا۔ بلکہ طریقت کے اصلی اصولوں میں تاویلات پیدا کر کے صحیح علم کو مسخ کر ڈالا۔چنانچہ اسلامی شرعی حدود میں اندرونی انتشار پیدا ہو کر کہیں خلافت۔کہیں شریعت۔کہیں طریقت کی قسمیں پیدا ہو گئیں۔دراصل ان اقسام کا وجود اغراض پرست خلفاء۔علماءِ شریعت و نقلی علماءِ طریقت کی وجہ سے پیدا ہوا____ خلافت تو زمانہ کے ساتھ مختصر ہو کر ختم ہو گئی۔اب دین کی اساس علماءِ شریعت کے پاس رہی۔ان میں حقیقی علماء کا علم کسی زمانہ تک محدود رہا آخر اندرونی اقسام و اختلاف کے سبب علماءِ شریعت بھی حقیقی صفات سے متصف نہ رہ سکے اسلئے ان علما کی حالت بھی حد درجہ کمزور ہو گئی۔اور شریعت میں چونکہ غرض پرست فقراء کے وجود سے اسکی اصل مفقود ہو گئی اسلئے اب شریعت و طریقت میں حد درجہ مخالفت پائی جاتی ہے۔یہی اقسام فی زمانہ خانقاہوں و مزاروں میں گدی نشینوں اور مجاوروں کی صورت میں پائی جاتی ہیں۔اور انکے طریق شریعت کے بالکل برعکس پائے جاتے ہیں۔ان حالات میں کوئی شخص عالم کے حقیقی علم کی طرف نہ رجوع کرتا ہے نہ اسے تسلیم کرتا ہے۔اسی طرح ایک عالمِ طریقت کا پایا جانا طالبانِ حقیقت کیلئے مشکل ہو گیا ہے۔کیونکہ ایسے لوگ بالکل پوشیدہ ہو چکے ہیں۔اسکی وجہ طالبانِ حقیقت میں کوئی ایسا نہیں جو حقیقت کا طلبگار ہو____ اور جو لوگ فقرا کی جستجو کرتے ہیں وہ صرف دنیوی اغراض کی خاطر باطل پرست فقرا اور نقلی فقرا کی طرف رجوع کرتے ہیں۔اسکی وجہ یہ ہے کہ ہر دو فریق علم سے بے بہرہ صرف دنیوی حصول کی خاطر عوام کو اپنی طرف رجوع کراتے ہیں تا کہ نذر و نیاز سے خزانہ بھر لیں۔اور عوام اپنی اغراض پورا کرنے کیلئے انکی طرف رجوع کرتے ہیں کہ انکی دنیوی اغراض پوری ہوں۔غلط علم

اور نقلی فقرا کی باطل اختراعات کی وجہ سے جاہل لوگ مزارات پر غیر شرعی افعال گانا بجانا۔ رنڈیوں کے ناچ۔ چراغاں۔ پھول چڑھانا اور بغیر مشاہدہ ہونے کے قبروں اور نقلی ولیوں کو سجدہ بھی کرتے ہیں۔

اسلام ایک روحانی مذہب تھا۔ اس کا عالم (عالم شریعت عالم طریقت) روحانیت سے پُر تھا۔ اسکا علم روحانیت سے پُر تھا۔ اسلئے اسکے عامل کیلئے بھی روحانیت کو ہی حاصل کرنا تھا۔ اسلام میں قرآن اور قرآنی عالم کی تعمیل واتباع (تابعداری) کا یہ اثر ضروری ہے۔ کہ اسکا ہر عامل بجائے خود ایک حقیقی عالم ہوتا ہے۔ گویا اسلام میں امت کا ہر شخص شریعت کی تعمیل میں خود بخود ایک عالم بنتا ہے۔ لیکن یہ کیفیت تب تک حاصل نہیں ہوسکتی جب تک کہ ایک عالم ان صفات نبوی کے اصولوں پر علم کا اجرا نہ کرے۔ اُس میں يَتْلُوْا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِهٖ۔ وَيُزَكِّيْهِمْ۔ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ کے اوصاف سے متصف ہونا لازمی ہے اور ان اوصاف کے پائے جانے کی سب سے بڑی نشانی یہ ہے۔ کہ ایک عالم۔ قرآن وحدیث اور فقہ پر عبور حاصل کرنے کے ساتھ صحیح معنوں میں قرآنی احکام کا حامل ہو اور ان اوصاف کا مجسمہ ہو۔ اسے پورے علم قرآن وحدیث سے آگاہی ہو۔ اسکا وجود ہر دنیوی آلائش سے پاک ہو۔ تاکہ اسکے علم الکتب کی تفسیر۔ تزکیہ نفس کے ساتھ قلبی القاء کے ذریعہ حقیقی راہ کے نشانات کا تصور دلا سکے۔ اور جب ان خوبیوں کے ساتھ علم کا اجرا کیا جائے تو لازمی نتیجہ یہ ہوگا کہ امت کا ہر شخص حقیقی علم سے روشناس ہوکر خود عالم بنے گا۔ ایسی حالت میں امت میں کسی قسم کا اختلاف پیدا نہ ہوگا۔ اس کیفیتِ علم کا اثر ہر ادنیٰ واعلیٰ کیلئے ہر زمانہ میں یکساں ہونا چاہیے۔ ورنہ بغیر ان خوبیوں کے جو علم حاصل کیا جائیگا اس میں یقینی طور نقائص اور اختلافات اور دین سے فرار کا احتمال ہوگا ____ مثال کے طور پر ہم دیکھتے ہیں کہ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کے زمانہ مقدس میں اور آپؐ کے بعد اصحاب تابعین تبع تابعین کے زمانہ میں جسطرح شریعت کی تکمیل کی جاتی تھی فی زمانہ اس عمل کا تصور کرنا بھی ہمارے لیے مشکل نظر آتا ہے۔ چہ جائیکہ ہم ویسا عمل کرسکیں۔ لیکن اس عدم تکمیل شریعت کیلئے ہم اپنی کمزوری کا جواز پیدا کرلیتے ہیں۔ کہ فی زمانہ کے لوگ اس زمانہ کے لوگوں جیسے نہیں۔ نہ ہی وہ شریعت ہم سے پوری ہوسکتی ہے۔ یہ نظریہ قطعاً غلط ہے۔ کیونکہ شریعت ایک ہے۔ اسکے لیے زمانہ کے قرب و بعد کی

تخصیص نہیں۔اس میں ادنیٰ واعلیٰ کی تخصیص نہیں۔وہی وَاَقِیْمُوا الصَّلٰوۃَ کاحکم اسوقت بھی تھا۔وہی وَاَقِیْمُوا الصَّلٰوۃَ کاحکم آج بھی اپنی ایک ہی کیفیت میں ہے۔فرق اگر ہے تو یہ کہ ان لوگوں نے سنتِ نبویؐ کے عین مطابق علم حاصل کیا اور علم کا اجرا کیا۔اور اِسوقت سنتِ نبویؐ کے مطابق علم کا اجرانہیں کیا جاتا ہے۔جسکا نتیجہ یہ ہے۔کہ نہ عالم صحیح عالم ہے نہ طالب صحیح طالب بن سکتا ہے۔یہی کیفیت گزشتہ قوموں کی تھی کہ پیغمبر کے بعد پیروانِ مذاہب میں اغراض پرستی پیدا ہوئی انہوں نے سنت نبویؐ کے مطابق علم کا اجرانہیں کیا بالآخر شریعت کا حقیقی علم مفقود ہوکر صرف اغراض پرست پیروان مذاہب کی تاویلات وتحریفات کودین سمجھا جانے لگا۔اور ہر شخص کو جب حقیقی دین کا علم نہ ملا تو لاعلمی کی وجہ سے بت پرستی اور اغراض پرستی کو ہی دین سمجھا جانے لگا۔باقی مذاہب میں اور اسلام میں اب فرق اتنا ہے۔کہ گزشتہ شریعتیں مفقود ہوچکی ہیں انکی روحانیت ختم ہوچکی ہے اور مسلمانوں کو خالص ماحول میّسر نہیں لیکن اسلام کی حقیقت اور روحانیت علیٰ حالہٖ مکمل طور قائم ہے اور اسکا ہر علم اور اسکی ہر قوت ایک حقیقت کا عرفان حاصل کرانے کیلئے موجود ہے۔ضرورت ہے تو صرف ان عالموں کی جوسنت نبویؐ کے عین مطابق اسکا اجرا کرسکیں۔تا کہ قرآنی علم کا اصلی مواد ہر شخص کو حاصل ہو سکے۔اور ہر شخص مثلِ سابق اپنے مقصود کو پہچانے اور پا سکے۔اسکے لیے علم کو اسکی حقیقی کیفیت میں پیش کرنے کی ضرورت ہے ـــــ

اور یہ چیز اسوقت تک نہیں ہوسکتی جب تک ایک عالم کی تعلیم میں تزکیہ کے ساتھ دنیوی آلائشوں سے پرہیز اور قلبی القا کی قوت سے علم کے ساتھ لوگوں کا تزکیہ کرانا نہ ہو۔یہ کیفیت اسی وقت ہوسکتی ہے جب ایک عالم کی روحانیت میں تقویت ہوان اوصاف کا مقصد اصلی یہ ہے۔کہ ہر عالم کیلئے یہ ضروری ہے۔کہ وہ دین (شریعت) کا اجرا صرف لوگوں کو عرفان الٰہی حاصل کرانے کیلئے کرے۔اسکے لیے وَاَنِ اعْبُدُوْنِیْ کا صحیح قرآنی طریق بتائے۔اوراس صحیح عمل سے صراط مستقیم کا ملنا یقینی ہوجائے۔اسکا نتیجہ یہ ہوگا کہ ہر شخص صحیح علم سے آگاہی حاصل کرسکے گا۔اسکا عمل نتیجہ خیز ہوگا۔تو پھر امت میں شریعت سے لاعلمی کا نقص دور ہوگا۔ہر شخص کیلئے ایک خالص ماحول میّسر ہوگا اور ہر شخص اصلی مقصد اور حقیقی علم و عالم کی طرف رجوع کرے گا۔

پیشتر بیان ہو چکا ہے۔ کہ اسلام میں شریعت وطریقت کی کیفیت کیا ہے؟ شریعت تو امت کے ہر شخص تک پہنچ چکی ہے جسکے لیے قرآنی احکام ٹھوس کیفیت میں پیش کئے گئے ہیں۔ فی زمانہ امت میں بھی شریعت کی تعمیل کی جاتی ہے۔ لیکن اس شریعت میں مختلف فرقوں کے مابین مختلف قسم کے اختلافات موجود ہیں۔ علاوہ ازیں طریقت کو شریعت سے بالکل علیٰحدہ بلکہ بعض حالتوں میں ایک دوسرے کی ضد سمجھا جاتا ہے۔ اسلئے ضروری ہے۔ کہ ان اختلافات کے اسباب اور اصلی طریقت کی وضاحت کی جائے۔ تاکہ معلوم ہو سکے کہ طریقت عین شریعت ہے۔ اور شریعت کے خلاف ہر عمل طریقت نہیں کہلاتا۔

قرآن کریم نے اپنی شریعت میں جو کچھ بتایا ہے۔ اگرچہ اس میں ہر قسم کے ظاہری باطنی عروج کیلئے مواد پایا جاتا ہے۔ لیکن اس تمام مواد سے مقصد صرف حقیقت کی طرف رجوع اور عرفانِ الٰہی یعنی اپنے خالق کو پہچاننا اور اس سے ملنا ہے۔ قرآن نے واضح طور بتایا یَآ اَیُّهَا الْاِنْسَانُ اِنَّكَ كَادِحٌ اِلٰی رَبِّكَ كَدْحًا فَمُلٰقِیْهِ ﴿۶﴾ (پارہ ۳۰ سورۃ ۸۴ آیت ۶) اے انسان تو محنت کرنے والا بنایا گیا ہے۔ اپنے رب کی طرف محنت کرنا پس تو نے ضرور اس سے ملاقات کرنی ہے۔ یعنی انسان کے ذمہ یہ چیز کر دی گئی ہے۔ کہ وہ سعی کر کے اپنے رب سے ملنے کی کوشش کرے۔ پس انسان نے ہر حال میں اللہ سے ملنا ہے۔ ظاہری طور جب ہم شریعت کے احکام کو لیتے ہیں تو ہمیں اسکی عبادت کرنے کیلئے نماز۔ روزہ۔ زکوٰۃ میں سعی کرنی پڑتی ہے۔ یہ سب اسلئے کہ ہم اپنی آئندہ زندگی میں اپنے لیے وہ ثواب نتیجہ عمل مہیا کریں۔ جس سے ہمیں وہاں عذاب نہ ہو بلکہ ہمیں جنت (راحت) نصیب ہو۔۔۔ اگر ہم نے اپنے عمل میں کوتاہی کی تو وہ دن ضرور آنے والا ہے۔ جس دن ہم نے اللہ کے سامنے پیش ہونا ہے۔ فَمُلٰقِیْهِ تو اس دن ہمیں محنت سے لاپرواہی کرنے کی سزا ضرور ملنی ہے۔ اگر ہم نے محنت کی تو اسکا نتیجہ جسقدر ہماری محنتوں میں زیادتی ہو اسی قدر ہم آئندہ زندگی میں جنت یا قرب الٰہی حاصل کریں گے فَمُلٰقِیْهِ اور جسقدر ہم نے طریقت کے طریق کے ذریعہ مجاہدہ و مشاہدہ سے کام لیا اسی قدر ہمیں عرفان الٰہی حاصل ہوگا فَمُلٰقِیْهِ ۔غرض انسان کو اسلئے جفاکش بنایا گیا ہے کہ وہ اس

دنیاوی زندگی میں محنت کرے اور اپنے رب سے ملے کیونکہ انسانی زندگی کا مقصد ہی یہ ہے کہ انسان نے ہر حال میں قربِ الٰہی حاصل کرنا ہے فَمُلٰقِیْهِ۔ اگر انسان نے اپنے منصب کا خیال نہ کیا۔ تو بھی جان لے کہ خواہ اپنے ارادے سے خود وہ اپنا مقصد پورا کرے تو بہتر۔ ورنہ آخرت میں اس پر عذاب کے ذریعہ تزکیہ کی مشقت ڈالی جائے گی تاکہ اسکی پیدا کردہ کثافت دور ہو جائے پھر اسے جنت میں داخل کیا جائیگا فَمُلٰقِیْهِ۔ اگر انسان نے اس مقصد کے خلاف قدم اٹھایا۔ تو اسکے لیے ابدی عذاب ہوگا۔ یہی دو کیفیتیں انسان کی محنت میں ظاہر ہوتی ہیں۔ انسان دنیا میں رہ کر اپنی ہر قسم کی دنیوی ترقی حاصل کرے۔ اگر اس نے دین کو صرف اپنے حقیقی مقصد عرفان وقرب کیلئے استعمال نہ کیا۔ تو اسکی ہر ترقی بیکار و بے سود ہوگی۔ انسان اگرچہ قرآنی علم کی روشنی میں ہی دنیا میں عروج حاصل کرے۔ لیکن اگر اُسنے اپنے حقیقی مقصد کو بھلا دیا۔ گویا اس نے قرآن سے کچھ بھی حاصل نہ کیا۔

اسلیئے عرفان الٰہی حاصل کرنے کیلیئے قرآن نے ایک ہی شریعت پیش کی اسی شریعت سے ایک شخص دنیاوی ترقی حاصل کرسکتا ہے۔ دینی ترقی حاصل کرسکتا ہے۔ اور سب سے خصوصی مقصد عرفانِ الٰہی حاصل کرسکتا ہے۔ اسلیئے ہر مقصد کیلیئے انسان قرآن سے مواد پاسکتا ہے۔ چنانچہ شریعت کے احکام نماز۔ روزہ۔ زکوٰۃ۔ صدقات وغیرہ انسان میں روحانیت پیدا کرنے کا سامان پیدا کرتے ہیں۔ اور نوافل تہجد۔ قرأت قرآن۔ قیام لیل انسان میں مشاہدہ کی قوت پیدا کرتے ہیں جس سے انسان کی محنت کا مقصد زندگی میں پورا ہو جاتا ہے۔ اور وہ اپنے رب کی طرف محنت کر کے اس سے ملتا ہے فَمُلٰقِیْهِ۔

نوافل میں۔ نماز زائد کا طریق وہی ہے۔ جو حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے پیش کیا۔ قیام لیل کا طریق بھی وہی ہے جسطرح حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے عمل کیا۔ اور قرآن نے بتایا۔ اب قرأت قرآن میں فَاقْرَءُوْا مَا تَيَسَّرَ کی حد تمام قرآن سے قرآن کے ایک حرف تک ہے۔ چاہے سارا قرآن پڑھا جائے۔ چاہے ایک حرف پڑھنا میسر ہو۔ دونوں صورتوں میں نتیجہ ایک ہی حاصل ہوگا۔ قرأت قرآن کا سبق خود حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے دیا۔ جس شخص میں جسقدر فرصت اور استطاعت تھی اسی قدر اسے پڑھنے کی اجازت تھی سوائے قرآن کے کوئی ایسا علم نہیں جو فَاقْرَءُوْا میں آسکتا ہے۔

اب اگر تمام احکام قرآن کے اندر موجود ہوں۔تو وہی شریعت کہلاتی ہے۔اگر یہی احکام طریقت میں (زائد عبادت کی صورت میں) آتے ہیں تو اسکا مطلب یہ ہے۔کہ شریعت پر عمل کرنا ہی طریقت کہلاتا ہے۔اب اگر فرق محسوس کیا جاتا ہے۔تو وہ ان دونوں طریق کے علم کا فرق ہے۔وہ فرق کیا ہے۔وہ مشاہدہ کا ہے۔ایک شخص زائد عبادت نہیں کرتا ہے۔اسے مشاہدہ حاصل نہیں۔اسے اپنے نتیجۂ اعمال کا علم نہیں۔علم ومشاہدہ نہ ہونے کی صورت میں وہ ماورائے ادراک کیفیات کی تصدیق نہیں کرتا۔اسکے مقابل ایک صاحب مشاہدہ شخص اپنے اعمال کے نتائج کا مشاہدہ کرتا ہے۔وہ یہ کہہ سکتا ہے۔کہ مجھے عالم روحانی میں اپنے عمل کا نتیجہ فلاں کیفیت میں حاصل ہے۔بس فرق ہے تو یہ ہے۔کہ ایک شخص نماز پڑھتا ہے۔تو وہ مشاہدہ میں نماز کے ثواب کا مشاہدہ کرتا ہے۔اور وہی نماز دوسرا شخص پڑھتا ہے۔لیکن اسکا مجاہدہ نہیں اسلیئے وہ اپنی نماز کا ثواب مشاہدہ نہیں کرسکتا۔گو دونوں اشخاص کا عمل ایک ہے نتیجہ ایک ہے۔لیکن ایک کو اقرار وشہادت پیش کرنے کی دلیل حاصل ہے۔کہ وہ مشاہدہ کرتا ہے۔دوسرا اپنے نتیجہ کیلیئے اقرار وشہادت پیش نہ کرنے کی وجہ سے اس حقیقت کا اقرار قانوناً نہیں کرسکتا۔کیونکہ ایک شخص تب تک ایک کیفیت کے وجود کی تصدیق وشہادت پیش نہیں کرسکتا جب تک کہ وہ کیفیت من و عن اسکے ذہن (علم) میں نہ آئی ہو ___ یہی اقرار وانکار صرف علم کی بنا پر مابین کا تفرقہ ہے۔البتہ اس مقام پر دو باتوں کا خیال رکھنا ضروری ہے۔وہ یہ کہ ایک شخص کا انکار محض اسکی ذاتی کمزوری کی بنا پر ہے۔لیکن اِسکے انکار سے حقیقت کا وجود عدم نہیں ہوسکتا۔یعنی اگر ایک شخص نماز کا نتیجہ مشاہدہ نہیں کرسکتا تو وہ اپنے نتیجۂ عمل سے انکار کرنہیں سکتا ہے۔اور جب خود اس میں ذاتی کمزوری یا مجبوری پائی جاتی ہے۔تو وہ دوسرے شخص کے مشاہدہ واقرار کو بھی جھٹلا نہیں سکتا۔لیکن ان دونوں کیفیتوں کا بیک وقت انکار واقرار کرنا مشکل ہے۔ایک شخص کا انکار کی صورت میں اقرار کرنا جائز نہیں اور اسی حالت میں اقرار کی صورت میں انکار کرنا بھی جائز نہیں تو یہ دونوں صورتیں بیک وقت عمل (عقیدہ) میں نہیں آسکتی ہیں۔اسکے لیے ضروری ہے۔کہ ان کیفیتوں کو ایک ہی حالت میں لایا جائے یا قطعی انکار یا قطعی اقرار ___ انکار تو ذاتی کمزوری اور مجبوری کی بنا پر اسلیئے نہیں ہوسکتا کہ کمزوری کے باعث انسانی علم انتہا کو

نہیں پا سکتالہذا یہ باور کرنا ممکن ہے۔ کہ شاید یہ وہ کیفیت ہو جسکا مجھے علم نہیں ہوا ہے۔ اور اقرار کی صورت یہ ہے۔ کہ شاہد کے علم کی حقیقت اور پختگی پر اعتماد ہو۔ یعنی اقرار کرنے والے شاہد کے کردار پر نظر ڈالی جائے کہ آیا یہ امین و صادق ہے؟ آیا یہ شخص قوانین فطرت کی خلاف ورزی کرتا ہے؟ یا مطابقت کرتا ہے؟ آیا یہ شخص شریعت پر پورا چلتا ہے؟ آیا یہ شخص طریقت کے طریق کا پورا عامل ہے؟ اور اسکی سب سے بڑی دلیل یہی ہے کہ اس میں يَتْلُوا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِهٖ وَيُزَكِّيْهِمْ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ کے خواص پائے جاتے ہیں وہ خواص کیا ہیں ـــ (۱) اگر یہ عالم ہے (ا) تو قرآن کا علم اسے کلی طور حاصل ہے؟ (ب) کیا یہ قرآنی تفسیر میں صحیح حقائق اخذ کرنے والا ہے؟ (ج) کیا اسکے کلام میں قرآن وحدیث کے خلاف کوئی مواد تو نہیں؟ (۲) (ا) اگر اسکا قال عین فطرۃ کے مطابق ہے تو اسکے حال (عمل) میں صحیح قال کے آثار (شریعت کی تابعداری) پائے جاتے ہیں؟ (ب) اسکا کردار پاکیزہ ہے؟ کیا اسکے قول میں کوئی بات غلط ثابت تو نہیں ہوتی؟ (ج) کیا یہ جو کچھ کہتا ہے وہ کرتا بھی ہے؟ (۳) کیا اس کے قولی دلائل یہ ثبوت پیش کر سکتے ہیں کہ جس چیز کا یہ دعویٰ کرتا ہے۔ وہ حقیقت پر مبنی ہے۔ اگر یہ صفات اس میں پائی جائیں تو پھر اسکے ماوراء ادراک مشاہدہ کی کیفیت کا باوجود ذاتی مشاہدہ نہ ہونے کے بھی اقرار کرنا لازمی ہے۔ اور انکار کرنا ایسی حالتوں میں جہاں ایک حقیقت کا انکشاف ہو کفر کے برابر ہوگا۔ مثال کے طور ہمارے لیے یہ آیت کریمہ حقیقت کی کسوٹی ہے۔

لَقَدْ مَنَّ اللّٰهُ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ اِذْ بَعَثَ فِيْهِمْ رَسُوْلًا مِّنْ اَنْفُسِهِمْ يَتْلُوْا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِهٖ وَيُزَكِّيْهِمْ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ ج وَاِنْ كَانُوْا مِنْ قَبْلُ لَفِيْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ ○ (پارہ ۴ سورۃ ۳ آیت ۱۶۴) البتہ اس میں شک نہیں کہ احسان کیا اللہ نے ان لوگوں پر جو ایمان لائے اور شریعت کی پابندی کرتے ہیں۔ جب اٹھایا ان میں ایک رسول انہیں میں سے۔ جو پڑھتا ہے اللہ کی کتاب میں سے حقیقت کے نشانات اور پھر (دونوں صورتوں میں شریعت وطریقت کی) پاک کرتا ہے۔ اور انکے ذہنوں کو کتاب کی آیات کی اصلی حقیقت سے آگاہ کرتا ہے۔ اگر چہ وہ اس سے پہلے کھلی گمراہی میں تھے۔

قرآن کریم رسول کی بعثت کا مجمل مقصد (Cause) بیان کر کے رسول کی صفت پیش

کرتا ہے۔ کہ قرآن کا مقصد علم بھیجنا ہے۔ صرف ہدایت کے لیے ـــــ اس ہدایت کی تکمیل رسول سے کی جاتی ہے ـــــ اور رسول کی صفت کیا ہے؟ وہ یہی کسوٹی ہے حضرت محمد رسول اللہ کی بعثت پر آپکے ذاتی کردار کا مطالعہ کیجئے۔ کہ آپکا کردار ابتدا سے انتہا تک ہر شے کے اقرار کے لیے بغیر مشاہدہ ایک دلیل ہے۔ آپ ابتدا میں محمد صلی اللہ علیہ وسلم تسلیم کئے گئے۔ آپ امین وصادق۔ مصلح تسلیم کئے گئے حالانکہ اس وقت دین و مذہب کا اس کردار سے کوئی تعلق ہی نہ تھا۔ آپکا قول ہر گبر و ترسا۔ یہود و نصاریٰ کے لئے قابل قبول تھا آپکی ذاتی شخصیت سے عرب کا ایک بزرگ ترین اور امیر ترین شخص بھی متاثر تھا۔ یہ حضورؐ کی طرف سے حقیقت کو تسلیم کرانے کیلئے ابتدائی داغ بیل تھی ـــــ یہ تو ظاہری شریعت کے تسلیم کرانے کیلئے ہی تھا۔ کہ آپکی بات کو جھوٹ نہیں سمجھا جاتا۔ لیکن آپکی عبادت میں جنگلوں کی تنہائی۔ خاموشی میں۔ استغراق وانہماک۔ راتوں کا جاگنا۔ غاروں کی خلوت آپکے مشاہدہ کے حقیقی ہونے کی کافی دلیل تھی۔ اسلئے بعثت پر آپ کا یہ اعلان کرنا کہ لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰهِ مبنی بر حقیقت ہے۔ کہ ایک امین وصادق۔ ایک ایسی ہستی کا اعلان کرنا جنکی عظمت و پاکیزگی کا ہر شخص معترف ہے۔ اس اعلان میں کسی قسم کے ظن یا شبہ کی گنجائش نہیں۔ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے لوگوں سے کہا کہ تم بلا مشاہدہ اس بات کا اقرار کرو کہ اَشْهَدُ اَنْ لَّآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَاَشْهَدُ اَنَّ مُحَمَّدًا عَبْدُهٗ وَرَسُوْلُهٗ۔ یہاں شہادت کی کیفیت بھی گزشتہ بیان کی گئی شہادت کے برابر ہے۔ مگر اسکا انکار کفر اور اقرار کرنا حقیقت کو تسلیم کرنا ہے۔ یہاں مشاہدہ خود دلیل نہیں صرف رسولؐ کا کردار اور آپکی پاکیزگی اور عظمت دلیل ہے۔ اس حالت میں جب قرآن نے پاکیزگی اور کردار کیلئے بھی رسول کے کردار کا اعلان کیا تو اب یہی کردار بمثل ایک کسوٹی کے ہر شخص کیلئے قرار دیا جاتا ہے۔ اگر اس کسوٹی پر ایک عالم ہو یا طالب پرکھنے میں ثابت ہو تو اسکے قول پر بلا مشاہدہ یقین کرنا لازمی ہے۔ اگر اس کسوٹی پر پورا نہیں اترتا ـــــ وہ بجائے خود مردہ زندہ کرے۔ اسکے قول کا اقرار کرنا گناہ ہے۔ یہ چیز تو صرف عقیدہ و تسلیم کیلئے ہی ہے۔ ہر انسان کو عرفان حاصل کرنا ضروری ہے۔ اسکی طرف رجوع کرنے کیلئے یہ تسلیم کافی ہے۔ لیکن اس تسلیم کو تقویت اسوقت حاصل ہوسکتی ہے۔ جب ہم ایک عالم کے قول

کی تصدیق بالمشاہدہ بھی پاسکیں۔یعنی جب ہم یہ چاہتے ہیں کہ ہم اپنی نماز کا نتیجہ خود مشاہدہ کریں۔تو اس وقت عالمِ طریقت کی طرف رجوع کریں گے۔اور وہ طریق اختیار کریں گے جس سے اسے مشاہدہ حاصل ہوا۔ہم بھی وہ طریق استعمال کریں گے اور مشاہدہ کر کے اپنے تسلیم کو حقیقی معنوں میں تقویت دیکر قطعی تصدیق وشہادت دیں گے۔

اب دیکھنا ہے۔کہ عالم کے پاس مشاہدہ کرنے کا کیا ذریعہ ہے؟اس کے لیے قرآن کسوٹی کے تین اوصاف یَتْلُوْا سے تلاوت (قرأت) یُزَكِّيهِمْ سے تزکیہ نفس۔اور یُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ سے صراط مستقیم کی راہوں کا مشاہدہ۔یہ تین کیفیتیں اگر اپنے اثر میں حقیقی معنوں میں ظاہر ہو جائیں تو مشاہدہ حقیقی ہے۔اور یہی طریق طریقت صحیح ہے۔یعنی۔صرف قرآن کی تلاوت کرانی یعنی جو کچھ تلاوت کیلئے بتلایا جائے وہ قرآن کی آیتیں ہوں (کوئی منتر جنتر نہ ہو) اور جو کچھ اسکا نتیجۂ عمل ہوگا وہی حقیقی کتاب کا علم اور باطن (روحانی کیفیات) ہوگا۔اور اسکے حصول کیلئے تزکیہ نفس ہے۔وہ کیا ہے۔اِنَّ نَاشِئَةَ الَّيْلِ هِيَ اَشَدُّ وَطْاً وَّاَقْوَمُ قِيْلاً۔تزکیہ نفس سے مراد انسانی وجود کی مادی قوتوں کو ارادہ کی قید میں لاکر روحانی قوتوں کو قوی کرنا۔اسکا ایک طریق قیام لیل ہے۔اسکے علاوہ وہ عمل جو ایک حقیقی راہنما سے تعلیم کیا جائے ـــــ یعنی وہ عمل جو بغیر قیام لیل کے دیگر ذرائع سے مادی قوتوں کو تحلیل کرنے کیلئے ایک حکیم طریقت اپنی تشخیص میں مختلف قسم کے وجودوں کے لئے مقرر کرے۔اس میں شک نہیں کہ قیام لیل (رات کا جاگنا) ہر وجود کے لئے کافی ہوسکتا ہے۔لیکن ہر زمانہ ہر وجود اس کیفیت کا یکساں طور متحمل نہیں ہوسکتا۔وہ بھی اس حکم کے تحت ہے وَاللّٰهُ يُقَدِّرُ الَّيْلَ وَالنَّهَارَ ط عَلِمَ اَنْ لَّنْ تُحْصُوْهُ فَتَابَ عَلَيْكُمْ۔یہ آیت بھی اس امر کی دلیل ہے کہ جو احکام تم پر ڈالے گئے وہ بعض اوقات تمہاری وجودی کمزوری کے باعث پورے نہ ہو سکیں گے۔اسلئے جو طریق ایک راہنما تمہاری تشخیص کیلئے مقرر کرے وہ بھی دراصل حقیقی ہوگا اس سے بھی تمہارا تزکیہ ہوسکے گا عَلِمَ اَنْ سَيَكُوْنُ مِنْكُمْ مَّرْضٰى لا وَ اٰخَرُوْنَ يَضْرِبُوْنَ فِي الْاَرْضِ۔وَاٰخَرُوْنَ يُقَاتِلُوْنَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ۔اس آیت میں تین قسم کی مصروفیتیں ہیں جو ایک شخص کیلئے اسکے

طریق طریقت۱میں مانع ہیں (۱) مرض (۲) تلاشِ معاش (۳) جہاد فی سبیل اللہ۔ جہاد فی سبیل اللہ ہمیشہ کے لیے نہیں۔ مرض اِس کے دوسرے درجہ پر ہے۔ کبھی ہے کبھی نہیں۔ لیکن امراض سے انسان کی طبیعتوں میں اختلاف پیدا ہو جاتا ہے۔ اسلئے ہر شخص کی طبیعت یکساں نہیں رہتی۔ اور تلاش معاش میں انسان ہر زمانہ میں مصروف رہتا ہے۔ یہ بعض اوقات اَنْ لَّنْ تُحْصُوْ کے زمرہ میں ہر عمل میں آتا ہے۔ اسلئے انسان کیلئے اسکی جبلت اسکی استطاعت قوت تحمل کے مطابق محنت دی جاتی ہے۔ کسی پر زیادہ۔ کسی پر کم۔ اب دیکھنا ہے۔ کہ قرأت قرآن میں کیا عمل ہے۔ تزکیہ میں کیا ترکیب ہے۔

حقیقتاً غور کیا جائے۔ تو معلوم ہوگا کہ قرآت قرآن کے نتیجۂ عمل میں ہی ھٰذَا صِرَاط" مُّسْتَقِیْم" کی راہیں مضمر ہیں اور اسی صراط مستقیم میں صِرَاطِ اللّٰہِ الَّذِیْ لَہٗ مُلْکُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ کی منازل و مراحل میں پائی جاتی ہیں سو مشاہدۂ کائنات ارض و سمٰوٰت قرأت قرآن سے مَاتَیَسَّرَ کے اشارہ ہیں ہی حاصل ہوتا ہے۔

اور یہ چیز حقیقتاً مخفی ہے۔ کیونکہ قرآن و حدیث سے ان آثار کا پتہ نہیں چلتا کہ کس قرأت سے صراط اللّٰہ کا مشاہدہ حاصل ہوتا ہے۔ یہ علم حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کو ہے۔ اور انکو جنہوں نے حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام سے مخفی طور طریق مشاہدہ و طریقت حاصل کیا۔ اسی طرح یہ علم ہر ولی کے سینہ بسینہ مشاہدہ سے متعلق چلا آیا۔ لیکن امت کے اولیاء زمانہ میں ظاہر طور معلوم کئے گئے ہیں۔ اور انکے علم کو بھی احاطہ میں لایا گیا ہے تاکہ علم العرفان۲ حاصل کرنے میں ہر طالب حقیقت کو آسانی حاصل

---

۱ اگرچہ اس آیت کا اطلاق فَاقْرَءُ وْا مَاتَیَسَّرَ مِنْہُ سے ہے۔ تاہم یہ امر ضروری ہے۔ کہ جہاں قرأت میں مجبوری ہو وہاں قیام لیل اور تزکیہ میں بھی مجبوری پیش آسکتی ہے۔ اسلئے یہ امر راہنمائے کامل کی روحانی تشخیص اور طریق علاج پر منحصر ہے۔ کہ جس قسم کی مضر خاصیتیں انسان میں پائی جائیں۔ اسی قسم کی تشخیص تزکیہ اور علاج کرے۔

۲ حضورؐ کے زمانہ میں اس علم کو ظاہر کرنے کی ضرورت اسلئے محسوس نہ ہوئی کہ ہر شخص شریعت و طریقت کا عالم و عامل تھا۔ کسی غلط روی کا احتمال بھی نہ تھا۔ اور چونکہ یہ سلسلہ بدستور چلا آتا تھا۔ اسلئے یہ سلسلہ اسی شخص کیلئے مخصوص کیا گیا تھا جو مشاہدہ کی طرف رجوع ہوتا۔ اور عام کیلئے ضرورت نہ تھی۔ بعد میں چونکہ نقل پیدا ہوگئی اسلئے اس علم کو اولیا نے کتابی صورت دیدی۔

ہو ۔۔۔ چنانچہ فی زمانہ شریعت میں طریقت کے چار خصوصی سلسلے پیدا ہو چکے ہیں ۔ جنکے طریق طریقت میں علیٰحدہ علیٰحدہ قرأت ۔ اور طریق تزکیہ پائے جاتے ہیں ۔ ایک طریق قادریہ ۔ دوسرا چشتیہ ۔ تیسرا نقشبندیہ ۔ چوتھا سہروردیہ ۔ یہ چہار سلسلے ایک ایک نام سے منسوب ہیں ۔۔۔ سلسلہ قادریہ حضرت شیخ عبدالقادر جیلانی رحمۃ اللہ علیہ سے نسبت رکھتا ہے ۔ عبدالقادر سے قادریہ ۔ دوسرا سلسلہ چشتیہ یہ حضرت خواجہ ابواسحٰق شامی چشتیؒ سے نسبت رکھتا ہے ۔ آپ نے خراسان کے گاؤں چشت کو رشد و ہدایت کا مرکز بنایا ۔ چشت کی نسبت سے یہ سلسلہ چشتیہ کہلایا ۔ تیسرا نقشبندیہ یہ سلسلہ حضرت بہاوالدین نقشبندیؒ سے منسوب ہے ۔ نقشبند سے مراد نقش باندھنے والا یہ طریقت میں آپکی خصوصی صفت تھی کہ آپ ایک طالب کو بہت جلدی تصوراتِ حقیقی میں پختہ کراتے تھے اسلئے اسی نام سے مشہور تھے اور اسی صفت سے انکا سلسلہ منسوب ہوا ۔ چوتھا سلسلہ حضرت شیخ شہاب الدین سہروردیؒ سے منسوب ہے ۔ آپؒ عراق میں زنجان کے ایک قصبہ سہرورد میں پیدا ہوئے ۔ اسی نسبت سے آپ کا سلسلہ ''سہروردیہ'' کے نام سے مشہور ہوا ۔

انکے خصوصی سلسلوں کا پایا جانا اسلئے ہے ۔ کہ انکے وقت میں ان حضرات نے صحیح شریعت و طریقت کے طریق پر سنتِ نبویؐ کی کسوٹی پر شریعت کو تازہ کیا اور علم و مشاہدہ کو انتہا تک پہنچا کر ہر شخص کیلئے عرفان کی راہیں از سرِ نو ہموار کر دیں ۔ انہوں نے اپنے علم و مشاہدہ کو انتہا تک پہنچایا ۔ جہاں ایک ولی کو انتہائی عرفان میں فنافی اللہ اور بقاباللہ کا مقام حاصل ہوتا ہے ۔ اور انکے خلفاء مریدین کا مسلسل گروہ ایک سلسلہ کہلاتا ہے ۔ یہ سلسلے اسلئے مخصوص اور مشہور ہیں کہ انکا علم مبنی بر حقیقت ہے اور جو طریق قرأت و تزکیہ ان حضرات نے پیش کیا اس ذریعہ سے انسان یقینی طور عرفان الٰہی مراتب اور مشاہدہ میں حاصل کر لیتا ہے ۔ باقی سلسلے ان چار سلسلوں کے مقابلہ میں انتہا کو پہنچانے کی صلاحیت نہیں رکھتے ۔۔۔ انکے علاوہ اور بھی سلسلے پائے جاتے ہیں وہ سلسلے بھی انہیں چار سلسلوں سے نسبت رکھتے ہیں یعنی ان حضرات کے بعد زمانہ کی رفتار کے ساتھ طالبان حقیقت میں ابتدائی قوتیں نہ پائی گئیں اور ان سلسلوں میں صحیح عالم نہ پائے گے ۔ اسی دوران میں ان سلسلوں میں کوئی ہستی پیدا ہوئی جس نے پھر سلسلہ کے طریق علم کو

زندہ کردیالہذا یہ سلسلہ اسی ہستی کے نام سے منسوب ہوگیا۔ جیسے چشتیہ صابریہ۔ چشتیہ نظامیہ۔ نقشبندیہ مجددیہ وغیرہ۔ ان چار سلسلوں میں زیادہ تر بعد کے باقی سلسلے قادریہ سلسلہ سے ہی پیدا ہوئے ہیں۔

حضرت محی الدین شیخ عبدالقادر جیلانی رحمتہ اللہ علیہ سے قبل اولیاء کے اوراد و وظائف (قرأت) کا صحیح طور اندازہ نہیں ہوسکتا لیکن اس بات سے انکار بھی نہیں کہ ان اولیاء نے قرأت قرآن میں حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام سے حضرت علیؓ۔ حضرت امام حسن و حسینؓ۔ حضرت حسن بصریؒ اور دیگر اولیا سے جو کچھ حاصل کیا ہو وہ قرأت قرآن ہی سے یا تمام قرآن یا قرآن کا ایک حصہ یا قرآن کا ایک حرف سبحان اللہ۔ الحمد للہ۔ قل ھو اللہ۔ یا رحمٰن۔ یا رحیم۔ بسم اللہ یا باقی اسماء الٰہی کا ذکر یا کلمہ توحید یا اللّٰہ ھو وغیرہ یا اسکے علاوہ درود شریف۔ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام پر درود و سلام (بمطابق قرآنی حکم کے) بھیجنا۔ یہی کچھ تھا۔ اسکے بعد ان چہار سلسلوں میں جو کچھ متواتر انکے مریدوں میں آتا ہے وہ بھی یہی چیز ہے۔ کسی سلسلہ میں کوئی قرآنی آیت اور درود شریف ہے۔ کسی میں اسماء الٰہی کا ذکر ہے۔ کسی میں اللّٰہ ھو کا ذکر ہے۔ فی زمانہ ان سلسلوں میں جو کچھ عمل ہے۔ اس میں زیادہ تر عمل تقریباً ہر سلسلہ میں " ذکر " ہے اور اس ذکر کو قرآنی آیت اور حدیث میں اَفْضَلُ الذِّکْرِ لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ سے نسبت دی جاتی ہے۔ چنانچہ سلسلہ قادریہ کے اکثر فقراء نے اسی ذکر اور ذکر اللّٰہ ھو کی بہت تفصیلیں پیش کی ہیں.......... اس میں شک نہیں کہ یہ اذکار اور قرأت۔ قرآن سے ہی ہیں۔ اب دیکھنا ہے کہ ان اوراد و وظائف کے طریق عمل کیا ہیں:۔

قرآن نے قرأت کیلئے فَاقْرَءُوْا مَا تَیَسَّرَ مِنَ الْقُرْاٰنِ کی ترکیب بتائی ہے۔ اسکے علاوہ طریق عبادت فَاذْکُرُوْنِیْٓ اَذْکُرْکُمْ (پارہ۲ سورۃ۲ آیت۱۵۲) کی تلقین ہے اور ایک اور قرآنی اشارہ بھی ہے جس سے ذکر کی نسبت دی جاتی ہے وہ آیت اَلَا بِذِکْرِ اللّٰہِ تَطْمَئِنُّ الْقُلُوْبُ ؕ (پارہ ۱۳ سورۃ ۱۳ آیت ۲۸) ہے۔ اسکے علاوہ ذکر کیلئے کئی آیتیں قرآن میں موجود ہیں۔ جس سے شریعت کی عبادت میں ذکر کا کرنا ثابت ہوتا ہے۔ کہ ذکر اور قرأت کی کیا تشریح ہے اور کیا ترکیب ہے؟ قرأت سے مراد قرآن کے الفاظ یا آیتوں کو عربی زبان میں ادا کرنا (پڑھنا) چنانچہ اسکی تصدیق

اس آیت سے ہوتی ہے۔ وَاِذَاقُرِئَ الْقُرْاٰنُ فَاسْتَمِعُوْالَہٗ (پارہ ۹ سورۃ ۷ آیت ۲۰۴)۔ جب قرآن کی آیات بیان کی جائیں تو تم انکو سُنو یہاں سننے کا حکم اس امر پر دلالت کرتا ہے۔ کہ سننے میں زبان سے ادا کئے ہوئے الفاظ ہی آسکتے ہیں (یہ علیحدہ بحث ہے۔ کہ اگر سننے سے مراد سن کر اس پر عمل کرنا ہو۔ لیکن اس بات کی دلیل بھی ہے کہ سننا کان سے تعلق رکھتا ہے اور آواز ہی کان تک پہنچ سکتی ہے۔ اور آواز زبان کے ادا کرنے سے ہی پیدا ہوتی ہے) اسلئے فَاقْرَءُوْا سے مراد خالص تلاوت (پڑھنا) قرآن بھی ہے۔ اور جہاں اس قرأت کا حکم ہے وہاں زائد عبادت میں ہی یہ حکم آیا ہے۔ اور اسکا تعین بھی کیا گیا ہے کہ رات کے تیسرے حصہ میں یا صبح کا قرآن پڑھنا۔ پھر اسکی کیفیت یہ بیان کی گئی ہے۔ کہ اِنَّ قُرْاٰنَ الْفَجْرِ کَانَ مَشْهُوْدًا ○ یہاں مشہود کا لفظ مشاہدہ کی تاثیر بھی ظاہر کرتا ہے۔ لہذا خالص قرآن سے یا قرآن سے کوئی جز صبح کے وقت پڑھنے سے انسان کو (زائد عبادت کی صورت میں) مراتب کا پانا اور مشاہدہ کا حاصل ہونا لازمی ہوتا ہے۔ اور جب طریق طریقت میں انسان صراط اللہ کے مشاہدہ کی جستجو میں قرآتِ قرآن سے کوئی جز پڑھے تو اسکے لیے طریق مشاہدہ کا اختیار کرنا ضروری ہے۔ طریق مشاہدہ کیا ہے؟

پیشتر بیان ہو چکا ہے۔ کہ صراط مستقیم کی راہیں نورانی کیفیت میں ہوتی ہیں اسلئے انکا مشاہدہ حواس سے نہیں بلکہ روح سے ہوتا ہے۔ روح قلب سے منسلک ہوتی ہے۔ اور قلب کا تعلق دماغ سے ہوتا ہے۔ گویا روح کے ذریعہ حاصل کردہ کیفیت قلب پر منعکس ہوتی ہے۔ اور قلب سے دماغ کیفیت پالیتا ہے۔ اس کی ترکیب اسطرح ہے جب ایک شخص۔ اپنے قلب کی روحانی قوتوں کو تزکیہ سے قوی کرتا ہے تو وہ تنہائی اور خاموشی میں (جہاں دماغ بیرونی کیفیات کی ترسیل کو نہ پا سکے اور حافظہ ساکن ہو جائے) حافظہ کے جمع شدہ واقعات کو ترتیب دینا شروع کرتا ہے جسے یکسوئی[1] کہتے

---

[1] یکسوئی سے مراد ایک ہی طرف کو توجہ کرنا۔ وہ طرف قلب کی ہے۔ کہ حافظہ کے خیالات کو ترتیب دیکر صرف ایک تصور کیلئے حافظہ میں جگہ خالی کرنا۔ اور حافظہ کو واقعات پیش کرنے سے روکنا۔ Concentration۔

ہیں۔ یہاں تک کہ بار بار یہ عمل کرنے سے حافظہ اپنے واقعات کو ترتیب دے کر انسان کے حسب ارادہ واقعات حاصل کرنے کیلئے جگہ خالی رکھتا ہے۔ اسوقت انسان قرآن کی ایک آیت کی تلاوت کرتا ہے۔ مثلاً یا صَمَدُ۔ اس اسم الٰہی کے پڑھنے سے صمد کے معنی بھی قلب میں آجاتے ہیں اس معنی کی شکل خواہش کی شکل میں ہوتی ہے۔ کہ میں صمد کی کیفیت کو مشاہدہ کرنا چاہوں۔ اس قرأت سے اسکا نتیجۂ عمل بھی صمد کی کیفیت میں ہوتا ہے۔ دل کی خواہش کے ساتھ روح صمد کی کیفیت حاصل کر لیتی ہے۔ ادھر روح نے کیفیت حاصل کی ادھر قلب پر عکس آگیا۔ قلب پر عکس آنے سے واہمہ پر صمدیت کے نور کا عکس آجاتا ہے۔ واہمہ پر عکس آنے پر حافظہ میں اسکی خالی جگہ میں یہ عکس آجاتا ہے۔ حافظ سے شعور اس نور کو پالیتا ہے۔ شعور کے پانے سے انسان ایک نور عالم باطن میں محسوس کرتا ہے۔ پھر اس نور کی جو وسیع کیفیت ہو وہ مختلف تمثیلی شکلوں میں مثلاً خوبصورت باغات۔ سنہری دریا وغیرہ کی صورتوں میں محسوس ہوتی ہیں اور اسکے بعد یہ کیفیت مستقل طور حافظہ میں جمع ہو جاتی ہے۔ اسطرح انسان مشاہدہ کے ذریعہ عالمِ باطن کا علم حاصل کرتا ہے۔ اسی طرح ایک عالم صراط اللہ کی کیفیات کے اسماءِ قرآنی کا ورد بناتا ہے جس سے صراط اللہ کے مراحل کا علم حافظہ میں آکر جمع ہو جاتا ہے۔ جب اس راہ روی کی تکمیل ہو جاتی ہے۔ تو انسان عالم اجل یا ولی یا عارف کہلاتا ہے۔ یہ صورت قرأت قرآن میں ہر اسمِ قرآنی اور درود صَلُّوا (حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام پر درود پڑھنے) کی ہوتی ہے۔

اسی طرح ذکر کی جس میں لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ یا اللّٰہ ھُو کی کیفیت ہے۔ انکے لئے بھی پڑھنا کافی ہے۔ یہ طریق فَاقْرَءُ وْا میں شامل ہے۔ اسکے علاوہ ذکر میں جو کیفیتیں بتائی جاتی ہیں انہیں اگر قرآنی حکم کے مطابق سمجھا جائے تو جہاں قرآن نے ذکر کا لفظ استعمال کیا ہے وہاں فَاقْرَءُ وْا کا اطلاق نہیں ہوتا۔ جیسے وَاذْکُرْ عِبٰدَنَآ اِبْرٰھِیْمَ۔ یٰبَنِیْٓ اِسْرَآءِیْلَ اذْکُرُوْا نِعْمَتِیَ۔ فَاذْکُرُوْنِیْٓ اَذْکُرْکُمْ۔ اَفْضَلُ الذِّکْرِ لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ۔

یہاں کیفیت کا دوبارہ یا داشت میں لانا۔ یہاں نعمتوں کو یاد کرنا اور عطیہ الٰہی کے لئے جذبہ تشکر پیدا کرنا ___ یہاں ذکر سے مراد طریق عبدیت کی تحریک پیدا کرنا ___ سب سے بہتر یاد

اس کیفیت وتصور کا پیدا کرنا کہ سوائے اللہ کے اور کوئی معبود نہیں ایسے مواقع میں ذکر کے معنی یاد کرنا۔ ذہن میں کیفیت جذب وتصور پیدا کرنا ہے۔ لیکن پڑھنا نہیں۔ اسلئے ان اذکار میں تصور کو بھی دخل ہے مگر ان کا ذکر سوائے فَاقْرَءُ وْا (پڑھنے) کے اور کوئی دوسرا طریق نہیں۔ اسکے علاوہ سلسلہ قادریہ میں اور باقی سلسلوں چشتیہ۔ نقشبندیہ میں بھی اس ذکر کا طریق جاری ہے۔ لیکن اسکی مختلف ترکیبیں اختراع کی گئی ہیں۔ لَآ اِلٰـہَ اِلَّا اللّٰہُ کو ضرب کے ساتھ پڑھا جاتا ہے۔ مثلاً ایک شخص جب لَآ اِلٰـہَ اِلَّا اللّٰہُ کا ورد کرتا ہے۔ تو وہ آنکھیں بند کر کے تصور کی کیفیت پیدا کرنے کے ساتھ۔ منہ بند کر کے نتھنوں سے سانس لیکر اسی سانس کے ذریعہ سانس اندر لے جا کر لَآ اِلٰہَ پڑھتا ہے اور اِلَّا اللّٰہُ کے ساتھ باہر سانس چھوڑتا ہے لیکن باہر سانس چھوڑنے کے ساتھ دل (قلب) پر ایک موہوم ضرب اِلَّا اللّٰہُ کی دیتا ہے۔ جس سے دل کا شدت کے ساتھ اچھلنا اور اس پر اِلَّا اللّٰہُ کی سانس کے ساتھ ضرب دینی محسوس ہوتی ہے۔ اسطرح بار بار یہ طریق کرنے سے قلب میں ایک کیفیت نوری پیدا ہوتی ہے۔ جسے لَآ اِلٰـہَ اِلَّا اللّٰہُ کا نور تصور کیا جاتا ہے۔ لیکن فقرا کا قول ہے کہ قلب میں بھی روحانی لطائف ہوتے ہیں۔ قلب کو بار بار متحرک (اچھالنے اور ضرب دینے سے) کرنے سے اسکی اپنی قلبی کیفیتِ نورانی کا ٹکراؤ ہو جاتا ہے۔ اور یہ ٹکراؤ نور کی کیفیت میں محسوس ہوتا ہے۔ دراصل اس ترکیب سے قلب میں روح کے ذریعہ انوار حاصل کرنے کی صلاحیت پیدا ہوتی ہے۔ اور ذاتی طور جو کیفیت نوری لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ کے نتیجہ میں پائی جاتی ہے وہ کیفیت تب تک حاصل نہیں ہوسکتی جب تک کہ نور محمدیؐ کے انوار درود (صَلُّوْا عَلَیْہِ وَسَلِّمُوْا تَسْلِیْمًا) کے ذریعہ حاصل نہ کئے جائیں۔ (طریق طریقت میں مشاہدہ کیلئے ایک مخصوص ترکیب ہے۔ جس میں ابتدأ تصورات میں خواہ اسماء الٰہی کی قرات ہو یا درود کی سب سے پہلے تصور پیر اکمل کیا جاتا ہے۔ اس تصور میں کیا خاصیت ہے اور کیوں تصور شیخ کیا جاتا ہے؟ ______) سلسلہ نقشبندیہ۔ چشتیہ۔ سہروردیہ میں قرآن کی آیات اور سورتیں پڑھنا اور تصور کرنا بھی ہے۔ یہ طریق فَاقْرَءُ وْا کے طریق میں شامل ہے۔

اسکے علاوہ کئی اور سلسلے موجود ہیں۔ لیکن وہ سب انہیں چار سلسلوں کی شاخیں ہیں۔ ان

سب سلسلوں میں قرأتِ قرآن ۔ ذکر۔ اور درود شریف کی قرأت تعلیم دی جاتی ہے۔ اور مشاہدہ کرنے کا طریق تصور ہوتا ہے۔ جسے ''مراقبہ'' سے تعبیر دیا جاتا ہے۔ ان تمام سلسلوں کا شجرہ آخر حضرت علی کرم اللہ وجہہ سے جاملتا ہے۔ سلسلہ نقشبندیہ کا شجرہ حضرت ابوبکر صدیقؓ سے نسبت دیا جاتا ہے۔ لیکن اصحاب رسولؐ میں بوجہ قرب محمدؐ اور تعلیم محمدؐ اکثر اصحاب کو علم طریقت حاصل تھا اور ان سے بھی لوگوں کو فیض حاصل ہوا۔ البتہ سلسلہ خلافت کیلئے حضرت ابوبکر صدیقؓ ____ اور حضرت علی کرم اللہ وجہہ ہی مامور و منتخب کئے گئے ۔ گویا اصحاب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے صرف یہی دو اصحاب ہیں۔ جنہیں حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام سے خلافتِ طریقت حاصل ہوئی ہے۔ جنکی نسبت سے امت کے تمام اولیاء کا سلسلہ جاری ہوا۔ اسکے سوا ایک اور سلسلہ بھی پایا جاتا ہے۔ یہ سلسلہ اویسیہ کہلاتا ہے۔ اس سلسلہ کی نسبت حضرت خواجہ اویس قرنی رضی اللہ عنہ سے ہے۔ اس اویسی سلسلہ میں بھی چند فرقے پائے جاتے ہیں۔ جو اویسی کہلاتے ہیں لیکن انکے طریق ذکر و قرأت اور عقائد آپس میں مختلف ہیں۔ ان میں ایک طریقہ اویسی قادری کہلاتا ہے۔ اور یہ سلسلہ خصوصی رسول نما اویسی بھی کہلاتا ہے۔ ایک اور فرقہ بھی اویسی ہے جو بظاہر شریعت کے پابند نہیں (نماز وغیرہ کے عامل نہیں) انکا خصوصی مشغلہ گانا بجانا بھی ہے۔ اس سلسلہ کا رسول نما اویسی قادری سلسلہ ایک خصوصی سلسلہ ہے جسکی نسبت براہ راست حضرت خواجہ اویس قرنی رضی اللہ عنہ سے ہے۔ لیکن گزشتہ دور میں اس سلسلہ کو ظاہر طور پایا نہیں گیا۔ اکثر اولیاء سابقین کے مکتوبات (تصانیف) سے پتہ چلتا ہے۔ کہ یہ سلسلہ دیکھنے میں نہیں آتا۔ بلکہ پوشیدہ ہے ۔ اور اسکے خلفا[1] بھی زمانے میں۔ باقی عام سلسلوں کے مانند دیکھنے میں نہیں آتے۔ اس سلسلہ اویسیہ کے اکثر فرقوں میں بھی قرأت قرآن۔ اور ذکر (جو سلسلہ قادریہ سے لیا گیا ہے۔ اسی لیے انہیں اویسی قادری کہا جاتا ہے) اور درود کی تعلیم جاری ہے۔ فی زمانہ اگرچہ سلسلے بے شمار ہیں مگر یہ سب سلسلے صرف چار ہی سلسلوں کی پیدائش ہیں اور پانچواں سلسلہ اویسیہ ہے۔

---

[1] اس کے متعلق آگے تشریح ہوگی صفحہ ۴۲۲ پر۔

الغرض ان تمام سلسلوں میں خصوصی طریق شریعت کی تعمیل اور طریقت کے لیے قرأت۔ قیام لیل۔ اور تزکیہ نفس کیا جاتا ہے۔ یعنی مراتب ونتیجہ اعمال کیلئے قرأت قرآن۔ اور قلبی اصلاح کیلئے قیام لیل اور سابقہ اولیا سے اختراع کردہ طریق تزکیہ ـــــ یہی دو چیزیں اسلامی شریعت و طریقت ہیں۔ انکے ماسوائے اولیا نے جو کچھ طریقے ایجاد کئے ہیں ان میں وہی طریق درست ہیں جن میں سب سے اول شریعت کی پابندی لازمی ہے اور باقی تمام طریقے جن میں شریعت کا اہتمام نہیں لغو اور بے بنیاد ہیں یہ طریقے انہیں لوگوں نے پیدا کئے ہیں جو نقلی اولیا کے بھیس میں مزاروں پر لاعلم لوگوں کو دھوکہ دے کر اپنی اغراض پوری کرتے ہیں انکی کوئی حقیقت نہیں۔

واضح ہو کہ قرآن وحدیث کی رو سے سوائے شریعت کے طریقت کوئی چیز نہیں۔ طریقت کی اگر خصوصیت ہے۔ تو یہ ہے۔ کہ یہ طریق حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کی بعثت سے قبل چالیس سال کے انہاک واستغراق ومشاہدہ کی سنت ہے ـــــ شریعت وہ چیز ہے۔ جو قرآن میں وحی کے ذریعہ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کو حاصل ہوئی۔ اور یہی چیز عرفان الٰہی کے حصول کے لیے اللہ تعالیٰ نے پیش کی۔ اور سنت نبویؐ ہونے کی حیثیت سے وہی عمل جو حضور علیہ الصلوٰۃ نے قبل از نبوت اختیار کیا قرآن میں دہرایا گیا۔ گویا مشاہدہ کیلئے قرآن نے جو طریق پیش کیا وہ دراصل شریعت کی ایک جز (قرار دی گئی) ہے۔ اور یہ جُز صرف مشاہدہ وعلم کیلئے ضروری رکھی گئی ہے۔ کیونکہ اس تمام شریعت کا مقصد بھی ہر انسان کیلئے عرفان وعلم کا فراہم کرنا ہے۔ کیونکہ اسی عمل سے حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کو قبل از نبوت وہ مقام حاصل ہوا۔ کہ آپؐ نے اپنی قلبی وسعت واستطاعت سے وحی کو پایا۔ وحی کا پانا۔ گویا قلب ودماغ کا ماوراء ادراک کیفیات کا مشاہدہ کرنے سے ہی ہوتا ہے۔ چنانچہ قرآن کا خود اس امر کیلئے بیان ہے۔

وَمَا كَانَ لِبَشَرٍ اَنْ يُّكَلِّمَهُ اللّٰهُ اِلَّا وَحْيًا اَوْمِنْ وَّ رَآ ئِ حِجَابٍ اَوْيُرْسِلَ رَسُوْلًا فَيُوْحِيَ بِاِذْنِهٖ مَـا يَشَـآ ءُ (پارہ ۲۵ سورۃ ۴۲ آیت ۵۱) کہ اللہ تعالیٰ کسی شخص سے بات نہیں کرتا۔ مگر قلب کے القاء کے ساتھ۔ یا پس پردہ غیبی (روحانی) آواز (کلام الٰہی) کے ساتھ یا فرشتہ کے ذریعہ۔ یہ سب کیفیتیں اسوقت تک حاصل نہیں ہوسکتیں جب تک کہ ایک انسان کے قلب ودماغ میں مشاہدہ کی پوری قوت

موجود نہ ہو۔ یہی کیفیت حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کی تھی۔ اور یہی کیفیت طریقت کہلاتی ہے۔ گویا قرآنی شریعت پر عمل کرنا یہ دین سے تعلق رکھتا ہے۔ اور سنت نبویؐ پر عمل کرنا یہ چیز وجود (قلب و دماغ) سے تعلق رکھتی ہے۔ چونکہ یہ کیفیت خود حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کے عمل میں آئی ہے۔ اسلئے اسی کیفیت کو قرآن نے متلاشیانِ حقیقت کیلئے سنت کر دی۔ چنانچہ اسی لیے بعد از فرائض (فرضی احکام نماز۔ روزہ۔ زکوٰۃ) یہ طریق نوافل (زائد عبادت) میں شامل کیا گیا۔ جو نوافل سنت نبویؐ میں شمار کئے جاتے ہیں۔ عرفان الٰہی اللہ تعالیٰ کا مقصد ازلی ہے۔ جو انسان کیلئے فرض کیا گیا ہے۔ وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْاِنْسَ اِلَّا لِيَعْبُدُوْنِ ○ اس ارشاد ربانی سے مقصد ازلی کی صاف وضاحت ہوتی ہے۔ کہ انسان کی پیدائش کی واحد غرض وغایت یہ تھی کہ وہ عبادت (شریعت کی پابندی) سے اللہ کے عرفان میں مراتب حاصل کر کے اور اس تک پہنچے۔ سو عرفان کیلئے خالص فرض عبادت تصور کی گئی۔ اور زائد عبادت سے اس عرفان الٰہی کو اپنے علم کے احاطہ میں لائے۔ تاکہ انسان کو عرفان کی حقیقت و معرفت کا علم ہو۔ اس طرح مراتب و علم سے مقصود کی تکمیل ہوتی ہے۔ یہی چیز دین کی اساس ہے۔ اور بغیر اس شریعت کی تعمیل کے عرفان الٰہی کسی طرح بھی حاصل نہیں ہو سکتا۔ عرفان الٰہی سے مراد انسان کی ودیعت کردہ روح رحمانی کا ذاتِ واحد تک پہنچنا اور اسے پہچاننا اور اسی ذات کے نور میں سمانا ہے۔ بس اسی کو عرفانِ الٰہی کہتے ہیں۔ یہاں صرف انسانی روح رحمانی کا عمل ہے۔ باقی انسان کا بشریت (مادیت) کی حالت میں اس کیفیت سے آگاہ ہونا اسکے وجودی قلب و دماغ سے ہے۔ آگاہ ہونا نہ ہونا عرفان کیلئے شرط نہیں۔ آگاہی صرف علم کیلئے ہے۔ کیونکہ یہ تمام کیفیتیں انسان کی مادی زندگی اور دنیوی زندگی سے تعلق نہیں رکھتیں۔ یہ تو اسکی عاقبت (دوسری زندگی) کیلئے ہے۔ یہ زندگی اس مادی زندگی سے علیٰحدہ ہے۔ اسکے لیے یہ ضروری نہیں کہ یہ زندگی قیامت کے دن ہی شروع ہو۔ نہیں بلکہ عاقبت سے مراد ہی عَقَبَ ہے۔ کہ اس مادی زندگی کے پسِ پردہ دوسری زندگی اور قیامت تو اس کیفیت کا نام ہے۔ جہاں اعمال کا ٹھہراؤ ہوگا اور اسکے بعد ہر شخص کو اسکے عمل کا بدلہ ملے گا۔ اسکے بعد اعمال کا موقع کسی کو نہ ملے گا۔

اسلئے طریقت سے مراد وہ طریق ہے۔ جس طریق سے حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کو وہ مقام حاصل ہوا۔ جس قوت سے آپؐ نے علم حاصل کر کے ایک اکمل عالم کی حیثیت سے کلامِ الٰہی کو گمراہ قوم کیلئے حاصل کیا۔ وحی کیلئے ایک اکمل راہنما کی ضرورت تھی اکمل راہنما وہی ہوسکتا ہے۔ جو عرفانِ الٰہی کے تمام نشیب وفراز سے قطعی طور آگاہ ہو۔ اور اسکی تکمیل اللہ نے نزول وحی کے ساتھ ساتھ کردی یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے آپکو آپکی تکمیل کی سند حاصل ہوئی اَکْمَلْتُ لَکُمْ دِیْنَکُمْ وَاَتْمَمْتُ عَلَیْکُمْ نِعْمَتِیْ (پارہ ۶ سورۃ ۵ آیت ۳)۔ آج آپکی اجرا کردہ شریعت مکمل ہوچکی اور عرفان الٰہی کے لیے جو کچھ ضروری تھا وہ آپکو عطا کیا گیا اسکے بعد اب کوئی ایسی شے نہیں جو عرفان کے احاطہ میں نہ آنے والی ہو۔

الغرض عرفان الٰہی میں شریعت ایک عمل ہے۔ اور طریقت حصولِ علم ہے۔ جسکا تعلق قلب ودماغ سے ہے۔ رہا یہ سوال کہ فَاقْرَءُوْا مَاتَیَسَّرَ مِنَ الْقُرْاٰنِ ہی سے نتیجہ عمل پیدا ہوتا ہے۔ جس سے صراط اللہ عبور ہوتا ہے۔ تو اسکا مطلب تب تک پورا نہیں ہوسکتا جب تک کہ اول شریعت (نماز۔ روزہ۔ زکوٰۃ) پر عمل نہ کیا جائے۔ کیونکہ شریعت کے اعمال سے ہی نتیجہ پیدا ہوتا ہے۔ اور قرآن سے پڑھنا اسکا یہ مطلب ہے۔ یہ ایک ذریعہ ہے جس سے نتیجۂ عمل پر نظر پڑتی ہے۔ یہ ایک سبب ہے نتیجۂ اعمال کے مشاہدہ کرنے کا مثلاً ایک شخص شریعت پر عمل کرتا ہے۔ اسے مشاہدہ حاصل نہیں۔ اب اگر مشاہدہ حاصل کرنا ہو۔ تو اسکے لیے ایک کیفیت تصور پیدا کیا جائے۔ تا کہ تصور کے ذریعہ نتیجۂ اعمال کا مشاہدہ کیا جائے۔ تو جب تک ہم تصور کیلئے ایک کیفیت کو ذہن میں لانے کیلئے قائم نہ کریں تب تک ہمیں باطن میں اپنے اعمال کا مشاہدہ کرنے میں مشکل ہوگی۔ اسلئے ہم اپنے تصور میں یارَحِیْمُ کا تصور شروع کرتے ہیں یہی تصور ہمارے لیے ایک نقطہ کا کام دیتا ہے۔ جس نقطہ کی باطنی کیفیت صراط مستقیم پر ہوتی ہے۔ جب ہم اس تصور کو صراط مستقیم میں پاتے ہیں تو اس وقت اس تصور کے ساتھ ہمیں نماز کے نتیجہ عمل کا مشاہدہ بھی ہو جاتا ہے۔

اس کا مطلب یہ ہے۔ کہ شریعت کے احکام ایک طرف ظاہری طور ماحول سازگار بناتے

ہیں۔ دوسری طرف ان میں منازلِ راہ عرفان ہیں جیسے نماز کی کیفیت قرآن خود بتاتا ہے کہ اِنَّ الصَّلٰوۃَ تَنْھٰی عَنِ الْفَحْشَآءِ وَالْمُنْکَرِ۔ نماز فحش وانکار سے علیحدہ کردیتی ہے۔ یہاں نماز ماحول سازگار بنا کر انسان کو ذلیل حرکات سے باز رکھتی ہے۔ اَلصَّلٰوۃُ مِعْرَاجُ الْمُؤْمِنِیْنَ۔ یہ نماز ایک سیڑھی ہے۔ جسکے ذریعہ قرب الٰہی یا منازل الٰہی (صراط اللّٰہ) طے کی جاتی ہیں۔ گویا اسکے نتیجہ میں بھی اللہ کے عرفان کی منازل کی وہ کیفیتیں پائی جاتی ہیں۔ جنکے ذریعہ ابتداً اللہ کی راہ میں جایا جاتا ہے۔ اگر یہ سیڑھی استعمال نہ کی گئی تو قرأت قرآن سے کچھ بھی پڑھا جائے۔ تو وہ کیفیتیں تب تک پائی نہیں جا سکتیں جب تک سیڑھی کا حاصل ہونا میسّر نہ ہو۔ اسلئے شریعت کی پابندی کے ساتھ ہی قرأتِ قرآن کی کیفیات حاصل ہوسکتی ہیں اور چونکہ قرأت میں تمام قرآن آتا ہے اسلئے یہی قرأت اور شریعت ایک ہی کیفیت ہیں۔

اور شریعت بجائے خود عرفان ہے۔ اور طریقت اس عرفان کے مشاہدہ کا ذریعہ ہے۔ گویا احکام شریعت اور قرأت قرآن مل کر صراط اللہ کی منازل عبور کراتے ہیں۔ اسی اصول کے مطابق پیر اکمل جو قرأت بتاتا ہے وہ وہی قرأت ہوتی ہے جسکا وجود نورانی صراط اللہ میں قائم ہوتا ہے۔ اسلئے ہر منزل کو پانے کیلئے قرآن کے انہیں کلمات کو پڑھا جاتا ہے۔ جس میں منازلِ عرفان نتیجۂ عمل کے لحاظ سے پائی جائیں۔ یہ کمالِ علم صرف ولی اکمل کو حاصل ہوتا ہے۔ وہ طریق سنت نبویؐ میں تلاوتِ قرآن وہی بتاتا ہے جس تلاوت قرآن میں انتہائی مقامات کا نتیجۂ عمل ہو گویا یہ طریق راہنمائی ولی اکمل کی خصوصیت[2] میں شامل ہوتا ہے۔ کہ وہ طالب صادق کو اپنی مرضی وارادہ سے ایک مقام سے دوسرے مقام تک لے جاتا ہے۔

اس میں شک نہیں کہ فَاقْرَءُوْا مَا تَیَسَّرَ مِنَ الْقُرْاٰنِ کا نتیجۂ عمل ہی صراط اللّٰہ ہے۔ لیکن یہ

---

[1] الٓمّٓ ۚ ذٰلِکَ الْکِتٰبُ لَا رَیْبَ ۛ فِیْہِ ۚ ھُدًی لِّلْمُتَّقِیْنَ ۙ اس قرآن میں تمامی علم موجود ہے جو طالب کو مطلوب تک پہنچانے والا ہے۔ [2] اس کی تشریح آگے آئے گی۔

صراط اللہ تب تک پائی نہیں جا سکتی جب تک کہ شریعت کی پوری پابندی نہ کی جائے۔ شریعت کی پابندی سے مراد نماز (فرائض) کا قائم کرنا۔ روزہ رکھنا۔ زکوٰۃ دینا ہے۔ کیونکہ سب سے پہلے شریعت کی پابندی انسان کیلئے ایک خالص ماحول پیدا کرتی ہے۔ اگر ماحول سازگار نہ ہو تو انسان کو حقیقت کی طرف رجوع ہونے کا موقع نہیں مل سکتا۔ اسکے علاوہ اَلصَّلٰوۃُ مِعْرَاجُ الْمُؤْمِنِیْنَ۔ نماز عرفانِ الٰہی میں سیڑھی کا کام دیتی ہے۔ اسکا مطلب یہ ہے۔ کہ عرفان الٰہی کی ابتدائی منازل نماز سے ہی طے ہوتی ہیں۔ اگر عروج کیلئے سیڑھی میسر نہ ہو تو انسان کیلئے کوئی راہ پیدا نہیں ہوسکتی جس سے وہ عرفان الٰہی کی منازل تک رسائی حاصل کر سکے۔ اور ان جملہ احکام (نماز۔ روزہ۔ نوافل۔ قرأت۔ قیام لیل) کی مجموعی پابندی سے ہی عرفان الٰہی حاصل ہوسکتا ہے۔ اسلئے یہ امر طے شدہ ہے۔ کہ ہر وہ عمل جو عرفان الٰہی حاصل کراتا ہے شریعت ہی کہلاتا ہے۔ البتہ عرفان حاصل کرنے میں پہچان (مشاہدہ) کا طریقہ شریعت کی اس جز زائد عبادت سے ہی تکمیل پاتا ہے۔

الغرض عرفانِ الٰہی میں شریعت کے احکام میں نماز۔ روزہ۔ زکوٰۃ اور فَاقْرَءُوْا مَا تَیَسَّرَ مِنَ الْقُرْاٰنِ مراتب پیدا کرتے ہیں اور ان مراتب کا مشاہدہ۔ قیام لیل اور تزکیہ (ایک راہنمائے کامل کا طریق علاج) سے ہی ہوسکتا ہے۔ شریعت کی پابندی کے ساتھ قرأت قرآن ایک خصوصی چیز ہے۔ لیکن یہ طریق باقی عبادتوں کے ساتھ قرآن کا پڑھنا اور پڑھنے کے ساتھ ہر قرأت کا حقیقی تصور قائم کرنے سے پورا ہوتا ہے۔ اسلئے قرأت میں تصور ایک لازمی چیز ہے۔ تاکہ اس تصور کے ذریعہ تزکیہ نفس کے ساتھ ہر عمل کا نتیجہ مشاہدہ میں آسکے۔ قرأت صرف عمل ہے۔ اور جو کچھ اس سے نتیجہ حاصل ہو اسکے مشاہدہ کیلئے سوائے۔ تزکیہ اور تصور کے اور کوئی شے اور کوئی طریق نتیجہ خیز نہیں ہوسکتا۔ مثال کے طور ایک شخص افضل الذکر (لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ) کی قرأت کرتا ہے۔ تو اسکے لیے صرف قرأت کا ادا کرنا کافی ہے۔ اسکے مشاہدہ کیلئے۔ یا تو قیام لیل یعنی رات کے وقت پڑھنا۔ یا وہ طریق اختیار کرنا جو طریق ایک راہنمائے کامل رات کے جاگنے کے بدل میں بتائے۔ وہ بدل کیا ہوسکتا ہے؟ ــــــ وہ بدل یہ عمل ہوگا جس سے طالب کی سفلی قوتیں (جو اسکے مشاہدہ میں رکاوٹ ہیں) مُردہ ہوں اور

روحانی قوتیں قوی ہوں۔ جس سے قلب میں قوتِ مشاہدہ پیدا ہوتی ہے۔ کیونکہ قیام لیل سے بھی یہی کیفیت پیدا ہوتی ہے لیکن اس قرأت کے ساتھ خصوصی طور یہ مجاہدہ متعلق نہیں۔ یہ تو ہر قرأت کے مشاہدہ کیلئے ایک بار کا ہونا ضروری ہے۔ گویا اسکا مطلب یہ ہے۔ کہ قرأت کیلئے کسی کلمہ کا مخصوص کر کے اسکے لئے طریق مجاہدہ مخصوص کرنا ضروری نہیں۔ بلکہ مشاہدہ کیلئے بغیر تعین مجاہدہ کیا جائے۔ اسکا مطلب یہ ہے۔ کہ مشاہدہ کیلئے مجاہدہ کرنا علیحدہ چیز ہے۔ اور جب مجاہدہ سے قوت مشاہدہ پیدا ہو جائے تو پھر ہر قرأت کے نتیجہ کا مشاہدہ ہوسکتا ہے۔ لیکن یہ ضروری ہے۔ کہ ابتدأ راہنمائے کامل وہی قرأت (کلمات) بتاتا ہے۔ جن کے انوار ابتدائی ہوں۔ بصورت دیگر مشاہدہ کی قوت پانے کے باوجود اگر اس کے قلب میں زیادہ قوی ولطیف انوار برداشت کرنے کی قوت موجود نہیں تو یہ ان انوار کا مشاہدہ نہ کر سکے گا۔ اسلئے ایسی صورت میں۔ قرأت کے ساتھ۔ یکسوئی وتنہائی میں تصورِ شیخ (پیر کامل) کا پختہ کرنا بتایا جاتا ہے۔ تصور شیخ کا دارومدار رہنمائے کامل کی ذاتی کمالیت پر ہوتا ہے۔

شیخ سے مراد راہنما ہوتا ہے۔ راہنما ایک علم کا کلی طور منتہی ہوتا ہے۔ یہاں علم کیا چیز ہے۔ وہ یہ کہ انسان کسی مقام پر بھی موجود ہو بہر حال وہ مقام ایک کیفیت ہوتی ہے۔ اس کیفیت کی انتہا زمین (مادہ) ہے۔ گویا زمین تمام کیفیاتِ مخلوق اور کیفیاتِ الٰہی (نور الٰہی) میں آخری اور سفلی (تنزلی) کیفیت ہے۔ جب اس کیفیت کو اسکی ابتدائی (نورانی) کیفیتوں کی طرف پھیرا جائے تو یہ (زمین) کیفیت ایک مقام کی حیثیت میں آتی ہے۔ اور اس مادہ سے لے کر ذات الٰہی کے انوار تک کا ماحول مقام سے تعبیر دیا جاتا ہے۔ اور اسکی درمیانی مختلف کیفیاتِ مادی ونوری مراحل ومنازل کے نام سے تعبیر دی جاتی ہیں۔ اسی طرح انسان مادی حیثیت میں مادی مقام میں ہوتا ہے۔ اسکے سفلی مقام سے لے کر منتہائے مقام تک کی تمام کیفیات سے مشاہدہ کے ذریعہ علم وآگاہی حاصل کرنے والے کو عالم ومنتہی کہا جاتا ہے۔ اور جو کیفیتیں مشاہدہ کے ذریعہ اسکے قلب وحافظہ میں جمع ہوں اسے علم کہا جاتا ہے۔ جب انسان مشاہدہ میں ابتدائی قدم اٹھاتا ہے۔ تو اُسے مبتدی (ابتدا کرنے والا) کہا جاتا ہے۔ جب انسان اپنے مشاہدہ کی اسقدر تکمیل کرتا ہے۔ کہ مشاہدے کیلئے باقی ضرورت نہ رہے تو

اسے منتہی (انتہا کو پانے والا) کہا جاتا ہے۔ اور جو کچھ اسے مشاہدہ میں حاصل ہوا وہی علم کہلاتا ہے۔ چونکہ یہ کیفیات انسان کے قلب و حافظہ میں ابتداً جمع نہیں ہوتیں اسلیئے اس عدم واقفیت کو غیب (ماوراء ادراک) سے تعبیر دیا جاتا ہے۔ ایک انسان اپنی لاعلمی کی وجہ سے ان کیفیات کو حاصل کرنے میں کوئی قوت نہیں پاسکتا۔ جب تک کہ اسے کسی راہنما کی راہنمائی حاصل نہ ہو۔ اسلیئے ایک انسان کو ایک منتہی کی راہنمائی کیلیئے لازمی طور اس عالم کی طرف رجوع کرنا پڑتا ہے۔ اس رجوع کرنے کو تلاش حقیقت (جستجو) سے تعبیر دیا جاتا ہے۔ اور جستجو کرنے والے کو طالب کہا جاتا ہے۔ ایک راہنما سے راہنمائی حاصل کرنے کیلیئے اسکے حکم کے تحت چلنے کیلیئے ایک عہد کی ضرورت ہوتی ہے۔ تاکہ جسطرح ایک راہنما ہدایت کرے اسی طرح چلا جائے۔ اس کیفیتِ معاہدہ کو بیعت کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے۔ معاہدہ کی شرائط میں وہی چیزیں ہوتی ہیں۔ جو شریعت نے ایک طالب کو اسکے عرفان کیلیئے مقرر کی ہوں۔ عرفان الٰہی کیلیئے۔ احکام (فرائض) کی شدت کے ساتھ پابندی۔ ان طریقوں کو اپنانا جن سے مشاہدہ حاصل ہوتا ہو۔ ان میں طریق تزکیہ ہے جو پیر اکمل (منتہی) بتائے۔ اسکے ماسوے وہ قواعد و شرائط جو ایک پیر اکمل کی راہ روی میں طالب کو مکمل پیروی کیلیئے بتائے جائیں۔ تاکہ کسی مقام پر طالب پیر اکمل کی راہنمائی سے ہٹ کر کسی دوسری طرف رُخ نہ کرے۔ ورنہ خلاف ورزی میں۔ طالب کو مقصد حاصل نہ ہو سکے گا۔ اور پیر اکمل اسکی گمراہی کا ذمہ دار نہ ہوگا۔

پیر اکمل کی بیعت کیا ہوتی ہے۔ وہ طرفین کا معاہدہ ہوتا ہے۔

پیر اکمل: میں عرفان الٰہی کا منتہی ہوں۔ اور میں ذمہ دار ہوں کہ صفات نبوی (سنتِ انبویؐ[1]) کے ماتحت میں عرفان الٰہی میں کتاب اللہ کے حقیقی معنی بتاؤں ــــ اور تمہارے وجود کو سفلی قوتوں کے غلبہ سے آزاد کرنے کے لیے صحیح علاج کروں ــــ اور تمہیں مشاہدۂ قلبی کے ذریعہ صراط اللہ کی سیر کراتے ہوئے منزلِ مقصود تک پہنچاؤں۔

---

[1] يَتْلُوا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِهٖ۔ وَيُزَكِّيْهِمْ۔ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ۔

طالب (مرید): میں اپنا مقصود پانا چاہتا ہوں۔ میں آپکو اپنا راہبر تسلیم کرتا ہوں۔ اس راہنمائی میں جو حکم آپ مجھ پر کریں میں اسکی تعمیل میں۔ اپنی جان و مال اولاد ہر عزیز شے قربان کرنے کے لیے تیار ہوں۔

پیر اکمل: میرا حکم مانو گے؟

مرید: بسروچشم مانوں گا۔!

پیر اکمل: نماز۔ روزہ۔ حج۔ زکوٰۃ۔ پرکار بند رہو۔ ہر بدی سے پرہیز اور ہر نیکی پر عمل کرو (جو قرآن نے بتائی)۔

مرید: ہر حکم پر عمل کرونگا۔ اس میں سر مو فرق نہ کرونگا۔

پیر اکمل: تمہیں یہ یقین ہے۔ کہ جو کچھ میں کہوں اس میں حقیقت مضمر ہے؟

مرید: البتہ بے شک۔ جو کچھ آپ کہیں حقیقت ہے[1]۔

اسکے بعد۔ پیر خصوصی احکام میں سے طریق تزکیہ و مجاہدہ بتاتا ہے۔ جس میں۔ فَاقْرَءُوْا مَاتَيَسَّرَ مِنَ الْقُرْاٰنِ میں سے وہ قرأت (اوراد و وظائف) ہوتی ہے۔ جو پیر کو اپنے پیر سے پیشتر تعلیم ہوتی ہے۔ اور جس قرأت و طریق مجاہدہ سے پیر نے انتہا کو حاصل کر کے اپنے قلب و حافظہ میں علم العرفان جمع کیا ہوتا ہے۔ اور ساتھ ہی۔ قیام لیل۔ رات کا جاگنا: رات کے جاگنے میں۔ پیر کی طرف سے۔ یا رات کے کسی حصہ میں جاگ کر قرآن (یا وظیفہ) پڑھنا یا چوبیس گھنٹوں میں کسی وقت معین میں۔ تنہائی۔ یکسوئی کے ساتھ پیر کا تصور یا کسی اسم الٰہی کا تصور۔ (مثلاً اللہ۔ یا رحمٰن۔ یا رحیم۔ یا صمد وغیرہ) کی مشق کرنا۔ اسکے علاوہ پیر مرید کے جسمانی قویٰ (لطافت و کثافت) کا معائنہ کر کے حسب طبیعت (خواص) مجاہدہ بتاتا ہے۔ مثلاً روزہ رکھنا۔ بعض حالتوں میں ان اشیاء سے پرہیز بھی بتایا جاتا ہے۔ جو مادیت میں غلبہ پیدا کرنے والی ہوں۔ مثلاً نشہ (تمباکو وغیرہ)۔ پیاز۔ تھوم (لہسن)۔ مچھلی۔ انڈا۔

---

[1] یہ معاہدہ قول (کہنے) میں نہیں آتا۔ بلکہ یہ کیفیت قلب میں ہوتی ہے۔ اسے نیت کہتے ہیں۔

گوشت وغیرہ سے پرہیز اور بعض ولی ان چیزوں کے استعمال میں کوئی پابندی نہیں کرتے۔

یہاں چند کیفیتوں کے متعلق تشریح ضروری ہے۔

علم کی کیفیات۔ پیر اکمل۔ طریق بیعت اور بیعت کی کیفیت۔ تصور۔ تزکیہ۔

علم کی کیفیت: محققین اسلام (شریعت وطریقت) نے عرفان الٰہی میں۔ صراط مستقیم (صراط اللّٰــــہ) کے مشاہدہ میں ان کیفیات کو علمی صورت میں بیان کیا ہے۔ ان کیفیات میں مختلف قسم کے مشاہدات کا ذکر کیا گیا ہے۔ یعنی جس ولی نے جو کچھ اپنے مراتب کے مشاہدہ میں حاصل کیا اسی کا ذکر اپنے مکتوبات میں کیا۔ اس بات کا خیال رکھنا ضروری ہے۔ کہ اولیاء اللہ کو جو مشاہدات حاصل ہوتے ہیں چونکہ انکا تعلق ماوراء ادراک عالم باطن سے ہے۔ اسلئے ایسی کیفیات کی ظاہری دلیل پیش نہیں ہو سکتی کیونکہ ان کیفیات کا نہ تو ظاہری وجود ہے۔ جو مادی حواس میں آسکے۔ نہ ہی ان کیفیات کا مشاہدہ ہر شخص کر سکتا ہے۔ اسلئے اسکی دلیل خود ولی کی ذات اور اسکا شرعی کردار ہوتا ہے۔ یعنی اگر ولی پورے طور شریعت کا پابند ہو۔ شرعی احکام کی تبلیغ کے ساتھ وہ صفات نبویؐ (سنت نبویؐ) سے متصف ہو۔ اور اسکا عمل وعلم نتیجہ خیز ہو۔ یعنی اس کے پیروؤں میں بھی شریعت کی پابندی ہو۔ اور انکا ہر فعل شریعت کے احاطہ کے اندر ہو۔ چنانچہ ان اولیاء میں سے مخصوص ومشہور اولیا حضرت علی کرم اللہ وجہہ۔ حضرت حسن بصریؒ۔ حضرت محی الدین ابن عربیؒ۔ حضرت بایزید بسطامیؒ۔ حضرت محی الدین شیخ عبدالقادر جیلانیؒ ایسی ہستیاں ہیں جنکے قول طریقت میں بطور سند پیش کئے جاتے ہیں۔ انہیں اولیا کے مکتوبات سے طریقت کے علم کی ایک مخصوص راہ مقرر کی گئی ہے۔ جس راہ کی واقفیت وعلم ہر ولی کے لیے ضروری ہے۔ اور اسی راہ سے عرفان کی منزلیں طے ہوتی ہیں اس کیفیت کو مختلف ناموں اور تمثیلی شکلوں میں پیش کیا گیا ہے۔ یہ تمام روحانی کیفیتیں درحقیقت مجسم نورانی ہوتی ہیں۔ لیکن انسان کی قوتِ ادراک کے مطابق ہر شخص کو اپنی قوت کے مطابق نظر آتی ہیں۔ مثلاً ملائکہ۔ فرشتے۔ ان کا نام انکے وجود سے ہی پیدا ہوا۔ ملائکہ کے معنی نوری جسم والے۔ نوری جسم کے ہاتھ پاؤں نہیں ہوتے ہیں۔ وہ مادی جسم نہیں رکھتے۔ اسلئے انکا وجود ایک لکہء نور (نور کا بادل) کی مانند ہوتا ہے۔ لیکن انکا وجود باطن میں بھی

ایک انسان کی شکل میں نظر آتا ہے ملائکہ جب انسان کے مشاہدہ میں آتا ہے۔تو وہ خود اپنی شکل انسان کی نہیں بناتا۔نہ اسکی شکل انسانی ہوتی ہے۔ بلکہ انسان کو ہی اپنی قلبی اور ذہنی قوت کے مطابق ملائکہ انسانی شکل میں محسوس ہوتا ہے۔اسکی دو وجوہات ہیں۔ایک تو قدرت نے انسان میں علم حاصل کرنے کیلئے ایک منظم ضابطہ پیدا کیا ہے۔تاکہ انسان اپنی مادی ہیئت میں بھی عالم روحانی کا علم محفوظ کر سکے۔سو اسکے علم محفوظ کرنے کی جگہ اسکا دل اور اسکا دماغ ہے۔انہیں دو قوتوں کے ذریعہ ہر کیفیت کو اسی حالت میں (علم) اخذ کرتا ہے۔جو حالت اسکے ذہن میں (آگاہی کیلئے) آسکے۔اسکا مطلب یہ ہے۔کہ انسان ملائکہ کو اسکی اپنی اصلی حالت نوری میں دیکھتا ہے۔جب یہ عکس قلب کے ذریعہ واہمہ سے گزرتا ہے۔تو اس نور کی ہیئت یہاں پر انسانی شکل میں محسوس کی جاتی ہے۔اور یہی کیفیت حافظہ میں جمع ہو جاتی ہے۔اور جوں جوں انسان کے وجود میں لطافت پیدا ہوتی ہے۔اور اسے حقیقی علم سے کلی طور شناسائی ہو جاتی ہے۔تو یہ اس حالت میں ملائکہ کے نوری جسم کو اسکی اصلی حالت میں بھی محفوظ کر لیتا ہے۔اور اس میں ملائکہ کے مختلف نورانی پیکروں کو پہچاننے کی پوری صلاحیت پیدا ہو جاتی ہے۔تو پھر انسان ایک ملائکہ کو بجائے تمثیلی شکل میں دیکھنے کے اسکی اصلی حالت میں اسے پہچانتا ہے۔

دوسری وجہ یہ ہے کہ انسان عالم نورانی کی پہچان میں پوری قدرت نہیں رکھتا اگر مختلف قسم کے انوار (جو بے شمار کیفیتوں میں پائے جاتے ہیں) مشاہدہ میں آئیں۔تو ان کیفیات کا علم انسان حافظہ میں جمع نہیں رکھ سکتا۔اسلئے ہر کیفیت ایک تمثیلی شکل (باغ۔دریا۔نہریں نوری وغیرہ) میں محسوس کرتا ہے۔

اسکی بھی یہی کیفیت ہے۔ جب ایک انسان اپنے علم کی انتہاء کو پالیتا ہے۔تو اس میں ہر کیفیت کو پہچاننے کی قوت پیدا ہوتی ہے۔لیکن یہ کیفیت ایک اکمل منتہی کو ہی حاصل ہوتی ہے۔جو اپنی انتہا میں فنافی اللّٰہ کا مقام حاصل کر چکا ہوتا ہے ـــــ اسکی مثال ایک عام آدمی کے مشاہدہ سے بھی ملتی ہے۔

مثلاً ایک شخص خواب دیکھتا ہے۔کہ اسکا لڑکا (جو کسی دور مقام میں تعلیم حاصل کر رہا ہو) ایک دریا میں ڈوب رہا ہے۔اسکا علم نہ ہو سکا کہ وہ ڈوب گیا یا کنارے آلگا۔اس خواب کی دہشت سے انسان جاگ جاتا ہے۔اس خواب کی کیفیت دیکھنے پر وہ قدرتی طور فکر مند ہو جاتا ہے۔کہ نہ معلوم میرے

لڑکے پر کیا حادثہ گزرا۔ نہ معلوم یہ میرا تخیلی خواب ہے یا واقعہ ہے۔ نہ معلوم وہ واقعی دریا میں ڈوبا۔ یا کوئی اور حادثہ اسے پیش آیا ـــــ دریا میں ڈوبنے کا منظر دیکھ کر وہ یہ فیصلہ نہیں کرسکتا کہ آیا میں نے واقعہ کو اصلی ہیئت و کیفیت میں دیکھا۔ یا تمثیلی شکل میں۔ اب یہ فیصلہ اسوقت ہی ہوسکتا ہے۔ جبکہ لڑکے کے متعلق اطلاع آئے ـــــ لڑکے کے متعلق جو بھی اطلاع آئے۔ لیکن یہ امر مسلمہ ہے۔ کہ انسان کے مشاہدہ میں حقیقی و تمثیلی واقعات کا پیدا ہونا۔ اسکے واہمہ و حافظہ سے ہی تعلق رکھتا ہے۔ اگر قلبی قوت ۔ واہمہ۔ حافظہ قوی ہو تو واقعہ اپنی اصلی ہیئت میں پیش آئیگا۔ اگر قلب واہمہ۔ حافظہ میں اصلی واقعہ کو اصلی ہیئت میں پانے کی صلاحیت نہ ہو تو یہی اصلی واقعہ تمثیلی ہیئت میں اخذ کیا جائیگا۔ یہی کیفیت عالم روحانی کی ہوتی ہے۔ ایسے واقعات کا ہونا ہر ولی کے ساتھ لازمی ہے جب تک ایک ولی۔ اپنی روح رحمانی اور روح حیوانی میں مکمل تقویت نہ پاتا ہو۔ چنانچہ انہیں کیفیات کے مطابق اولیا نے اس عالم باطن (صراط اللہ) میں ایک خصوصی راہ کا مشاہدہ کیا ہے۔ جو مختلف منازل و مراحل میں واقع ہے ۔اس صراط اللہ کی ابتدا عالمِ ناسوت (یعنی عالم ناس ـــــ ناس سے مراد انسان) سے ہوتی ہے۔ گویا صراط کی ابتدا خود انسان اور دنیا سے ہی ہوتی ہے۔ چنانچہ اس عالم کی شہادت اس آیت سے ملتی ہے۔ اَللّٰـهُ نُوْرُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ط (پارہ ۱۸ سورۃ ۲۴ آیت ۳۵) اللہ زمین و آسمان کا نور ہے۔ یعنی زمین و آسمان کی تخلیق میں بھی اللہ کا نور پایا جاتا ہے۔ اس عالم ناسوت میں اسی نور کی کیفیتیں مشاہدہ میں آتی ہیں۔ محققین اسلام (علماء طریقت) نے اس عالم ناسوت میں کیفیات کی اکتالیس منزلیں بتائی ہیں۔ اسکی ابتدائی منزل میں انسان مختلف قسم کے انوار مشاہدہ میں لاتا ہے۔ ان انوار میں ابتدائی نور کی کیفیت یہ ہے۔ کہ اس دنیا کے سب سے روشن آفتاب سے زیادہ کئی درجہ اس نور میں روشنی اور خوبصورتی پائی جاتی ہے۔ اگر کوئی شخص بغیر کسی راہنما کی راہنمائی کے یہ نور دیکھ پائے تو لاعلمی کی وجہ سے وہ اس عظیم الشان نور کو اللّٰـہ کا حقیقی ذاتی نور تصور کرنے لگے۔ لیکن یہ نور اللہ کی راہ میں ابتدائی نور ہے۔ اسی طرح ہر منزل میں انوار میں درجہ بدرجہ ترقی (تیزی) پائی جاتی ہے۔ اور ان منازل کے انوار مختلف تمثیلی شکلوں (صحرا۔ باغات۔ دریاؤں وغیرہ) میں مشاہدہ میں آتے ہیں۔ ان

انوار ومنازل کے مشاہدے کیلئے اولیا کے پاس جوطریقہ ہے وہ اسی قرآنی حکم کے تحت ہے۔ جس میں سب سے اول شریعت (نماز۔روزہ۔زکوٰۃ) پر پابندی ہے۔ اور مشاہدہ کیلئے زائد عبادت یعنی ایک وقت معین پر قرأتِ قرآن [1] یا بغیر کسی خصوصی تصور کے قلب پر نظر رکھ کر (ولی کی بتائی ہوئی قرأت اسماء الٰہی کا تصور یا قرأت یعنی پڑھنا) یا تصورِ شیخ (تصورِ شیخ کی تفصیل دیکھیں صفحہ ۳۴۳-۳۶۴) میں

---

[1] قرأت قرآن میں ایک حرف میں اسم الٰہی اللّٰہ یا اللّٰہ ھو۔ یا اَللّٰہُ الصَّمَدُ وغیرہ یا کوئی آیت یا سورۃ ہے۔ مگر اس قرأت میں زیادہ موثر قرأت وہ ہے جو پیر اکمل کی طرف سے تعلیم دی جائے۔ اس قرأت میں۔ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کی راہنمائی میں جو کچھ آپکے اصحاب (اولیا) کو قرأت حاصل ہوئی۔ اس میں عمومی حیثیت میں تمام قرآن کی قرأت شامل ہے۔ چنانچہ احادیث سے ثابت ہے۔ کہ اکثر اصحاب رات دن میں کئی بار قرآن تمام کا تمام تلاوت کرتے۔ اور اکثر اصحاب سال بھر میں زیادہ سے زیادہ نفلی روزے رکھتے۔ لیکن ان لوگوں کو جنہیں حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کی طرف سے خصوصی تعلیم تھی۔ جیسے حضرت علیؓ۔ سلیمان فارسیؓ۔ حضرت ابو بکرؓ۔ حضرت عمرؓ۔ حضرت عثمانؓ۔ حضرت خواجہ اویسؒ (قرنی) وغیرہ۔ انہیں حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کی طرف سے خصوصی تعلیم قرأتِ قرآن سے ملی تھی۔ کیونکہ عام لوگوں کے مقابلہ میں ان مخصوص حضرات کو عرفان ومشاہدہ بھی زیادہ حاصل تھا۔ لیکن یہ علم وحی خفی سے متعلق تھا۔ اور اسکی تلقین بھی طریق طریقت میں خفی ہی رہی۔ یہی وجہ ہے۔ کہ طریق طریقت میں کوئی خصوصی تعلیم محسوس نہیں کی جاتی جس تعلیم کو حدیث رسول اللہؐ سے خصوصی نسبت دی جائے۔ البتہ حدیث رسول اللہؐ میں قرأت قرآن سے متعلق تعلیم پائی جاتی ہے۔ جن میں آیات کریمہ اور درود شریف ہیں۔ لیکن انکے پڑھنے کے نتائج بھی حدیث میں موجود ہیں۔ مثلاً سُبْحَانَ اللّٰہِ وَبِحَمْدِہٖ سُبْحَانَ اللّٰہِ الْعَظِیْمِ۔ رسول اللہؐ نے فرمایا جو شخص اس وظیفہ کو صبح شام سو دفعہ روزانہ پڑھے تو کوئی شخص اس سے زیادہ بہتر عمل (قرأت) نہیں لائیگا۔ مگر وہ شخص جو یہی قرأت اتنا ہی پڑھے یا اس سے زیادہ پڑھے۔

لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ وَحْدَہٗ لَا شَرِیْکَ لَہٗ لَہُ الْمُلْکُ وَلَہُ الْحَمْدُ وَھُوَ عَلٰی کُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٌ۔ سوائے اللہ کے اور کوئی معبود نہیں۔ وہ واحد (ایک اپنی وسعت کے اعتبار سے) ہے۔ اس کے مقابل دوسری کوئی واحد ہستی نہیں۔ یعنی اسکا کوئی شریک نہیں۔ اسی سے کائنات ہے۔ اور اسی کی حمد ہے اور وہ ہر شے پر قادر ہے۔

حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے فرمایا۔ جو شخص اس قرأت (وظیفہ) کو روزانہ سو (باقی حاشیہ اگلے صفحہ پر)

اسماءالٰہی کا پڑھنا ہے۔

بغیر کسی خصوصی تصور کے قلب پر نظر رکھنے سے مراد یہ ہے کہ۔ انسان واہمہ۔ حافظہ وشعور کے ذریعہ۔ قلب کو آنکھ کی جگہ استعمال کر کے اس پر منازل کی کیفیات کے عکس کو حاصل کرتا ہے۔ اس عکس میں ہر منزل سے انسانی روح حیوانی درجہ بدرجہ ترقی کرتے کرتے عالم ناسوت کی منازل سے گزرتی ہے۔ جس جس منزل سے روح کا گزر ہوتا ہے۔ وہی کیفیت قلب پر آتی ہے۔ اسی کیفیت کو

(بقیہ حاشیہ گزشتہ صفحہ) مرتبہ پڑھے اس کو دس غلاموں کے آزاد کرنے کا ثواب ملے گا۔ اسکے لیے سونیکیاں لکھی جائیں گی۔ سوگناہ معاف ہوں گے اور شام تک شیطان کے پنجے سے محفوظ رہے گا۔ (متفق علیہ)

ثواب۔ نیکیاں۔ نتیجۂ اعمال میں مراتب ہی تو ہیں۔ اور شیطان کے پنجے سے حفاظت سے مراد بھی قلب پر بدی کرنے کی خواہشات کا پیدا نہ ہونا ہے۔ جو خواہشات شیطان کی توجہ پیدا کرتی ہیں۔

رَضِیْتُ بِاللّٰہِ رَبًّا وَبِالْاِسْلَامِ دِیْنًا وَبِمُحَمَّدٍ نَبِیًّا میں راضی ہوں اللہ کو اپنا پالنے والا تسلیم کرنے میں۔ اور اسلام کو اپنا دین اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو نبی اور رسول ماننے میں۔

حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کا ارشاد ہے کہ کوئی مسلمان بندہ اس دعا کو صبح وشام تین دفعہ نہیں پڑھتا مگر اللہ تعالیٰ پر اس کا حق ہو جاتا ہے۔ کہ قیامت کے دن اسے راضی کرے۔ (رواہ احمد والترمذی)

سُبْحَانَ اللّٰہِ اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ اَللّٰہُ اَکْبَرُ اللہ تعالیٰ تمام عیبوں سے پاک ہے۔ تمام حمد اسی اللہ کے لیے ہے۔ اللہ سب سے بڑا ہے۔ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے یہ قرأت حضرت فاطمۃ الزہرا رضی اللہ عنہا کو بتائی۔ کہ جتنا آرام ایک خادم سے حاصل ہوتا ہے۔ اس سے زیادہ اس قرأت سے بارگاہ خداوندی میں راحت (قرب) حاصل ہوگا۔ (رواہ مسلم)

سُبْحَانَ اللّٰہِ وَالْحَمْدُ لِلّٰہِ وَلَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ وَاللّٰہُ اَکْبَرُ ۔ اللہ پاک ہے۔ اور حمد سب اللہ کیلئے ہے۔ اور نہیں کوئی معبود سوائے اللہ کے اور اللہ بڑا ہے۔

حضور کا فرمان ہے یہ کلمات سارے کلمات سے افضل ہیں۔ اللہ کے ہاں سب اسماء سے محبوب ہیں۔ اور ان کلمات کی قرأت آپ کو باقی کلمات سے محبوب ہے (مسلم)

اَسْتَغْفِرُ اللّٰہَ الَّذِیْ لَآ اِلٰہَ اِلَّا ھُوَ الْحَیُّ الْقَیُّوْمُ وَاَتُوْبُ اِلَیْہِ میں اس خدا سے (باقی حاشیہ اگلے صفحہ پر)

شعور کے ذریعہ محسوس کیا جاتا ہے۔ اگر تصور شیخ کے ساتھ مشاہدہ کیا جائے۔ تو اسکا بھی یہی مطلب ہے۔ کہ قلب کی طرف توجہ کی جاتی ہے۔ اور مقصود شیخ ہوتا ہے۔ شیخ چونکہ ان مراحل سے گزر چکا ہوتا ہے۔ اسلئے شیخ کے تصور قائم ہونے کے ساتھ اسکا مقام بھی مشاہدہ میں آتا ہے۔ گویا دونوں حالتوں میں ایک مقام کے ساتھ شیخ کا تصور بھی حاصل ہوتا ہے۔ البتہ شیخ کے تصور میں یہ فائدہ ہوتا ہے۔ کہ تصور کیلئے ایک آسان ذریعہ حاصل ہوتا ہے۔ وہ ذریعہ شیخ کی ظاہری صورتِ خیالی ہوتی ہے۔ (جو کہ

(بقیہ حاشیہ گزشتہ صفحہ) بخشش مانگتا ہوں۔ جسکے سوا اور کوئی معبود نہیں وہ زندہ ہے۔ خود قائم ہے۔ اور اسی کی طرف رجوع کرتا ہوں۔

حضورؐ کا ارشاد ہے۔ کہ جس نے یہ کلمات پڑھے اسکے گناہ معاف ہو جاتے ہیں (رواہ ترمذی۔ ابوداؤد)۔

اَللّٰھُمَّ اَجِرْنِیْ مِنَ النَّارِ (رواہ ابوداؤد) اے اللہ تو مجھے دوزخ سے پناہ دے۔ آپؐ نے فرمایا مغرب کی نماز کے بعد کسی سے بات کرنے سے پہلے سات دفعہ کلمات پڑھا کرو۔ اس حالت میں اگر تم رات کو مر گئے تو اللہ تعالیٰ تمہیں دوزخ سے نجات دیگا یہی کیفیت صبح کی نماز کے بعد پڑھنے میں ہے کہ دن کو مر گئے تو دوزخ سے نجات ہوگی۔

اَللّٰھُمَّ قِنِیْ عَذَابَکَ یَوْمَ تَجْمَعُ اَوْ تَبْعَثُ عِبَادَکَ اے اللہ جس دن تو اپنے بندوں کو اٹھائے گا۔ اس دن مجھے عذاب سے بچا (جامع ترمذی)

اَللّٰھُمَّ صَلِّ عَلٰی مُحَمَّدٍ وَّ عَلٰی اٰلِ مُحَمَّدٍ کَمَا صَلَّیْتَ عَلٰی اِبْرٰھِیْمَ وَعَلٰی اٰلِ اِبْرٰھِیْمَ اِنَّکَ حَمِیْدٌ مَّجِیْدٌ ط اَللّٰھُمَّ بَارِکْ عَلٰی مُحَمَّدٍ وَّعَلٰی اٰلِ مُحَمَّدٍ کَمَا بَارَکْتَ عَلٰی اِبْرٰھِیْمَ وَعَلٰی اٰلِ اِبْرٰھِیْمَ اِنَّکَ حَمِیْدٌ مَّجِیْدٌ ۔ اے اللہ درود بھیج اوپر محمدؐ کے اور اوپر محمدؐ کی آل کے جیسے درود بھیجا اوپر ابراہیمؑ کے اور ابراہیمؑ کی آل کے تحقیق تو تعریف کے لائق بزرگی والا ہے اے اللہ برکت بھیج اوپر محمدؐ اور محمدؐ کی آل کے جیسے برکت بھیجی ابراہیمؑ اور ابراہیمؑ کی آل کے تحقیق تو تعریف کے قابل بزرگی والا ہے۔

حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے فرمایا مَنْ صَلّٰی عَلَیَّ وَاحِدَۃً صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ عَشْرًا۔ جو شخص ہم پر ایک دفعہ درود پڑھتا ہے۔ اللہ اس پر دس بار درود (رحمت) بھیجتا ہے۔ (رواہ نسائی) ــــ نیز فرمایا جس نے مجھ پر زیادہ درود پڑھا۔ قیامت کے دن سب سے زیادہ ہم سے قریب ہوگا۔ (رواہ ترمذی)

ان احادیث کی تعلیمات میں قیامت۔ قبر۔ جہنم کے عذاب سے نجات اور (باقی حاشیہ اگلے صفحہ پر)

انسان کے حافظہ میں ہوتی ہے) ان منازل میں زمین کی تمام کیفیات کے ظاہر و باطن کا علم حاصل ہوتا ہے۔ یعنی۔ اس کائنات کی ان تمام اشیاء کی کیفیت کیا ہے۔ پہاڑ کیا ہیں۔ ان میں کیا ہے۔ یہ کیسے بنے انکی تخلیق کی تمام کیفیتیں۔ درخت۔ وحوش۔ طیور۔ دریا۔ سمندر۔ سورج۔ چاند۔ ستارے۔ بادل اور خصوصاً انسان کی بناوٹ اور پیدائش غرضیکہ دنیا کی ہر شے کی تخلیق ابتدا سے انتہا تک۔ زمین اور زمین کی ابتدائی کیفیت کب اور کس طرح بنی۔ اسکے علاوہ غیب۔ یعنی ایک شخص کا مشرق میں بیٹھ کر

(بقیہ حاشیہ گزشتہ صفحہ) جنت کا حصول حاصل ہوتا ہے۔ لیکن عرفان الٰہی میں مقصود قرب وفنا ذاتِ الٰہی کا حاصل ہونا ہے۔ یہ تعلیم عام لوگوں کے لئے ہے۔ اور طریق طریقت کے مخصوص طریق میں مخصوص تعلیم (اسماء) الٰہی ہے۔ اور وہ بھی کلمات قرآنی ہی سے ہیں جیسے اَفْضَلُ الذِّکْرِ لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ۔ یا اللہ نے جن اسماء میں اپنی شان عالی کا تصور دلایا ہے۔ ھُوَ اللّٰہُ۔ ھُوْ لَہٗ۔ سُبْحَانَ اللّٰہِ۔ اَلْمَلِکُ۔ اَلْقُدُّوْسُ۔ وغیرہ یہ وہ اسماء ہیں جنکے انوار کا اندازہ ظاہری الفاظ میں ممکن نہیں۔ اسکے علاوہ قرأت قرآن میں درود (صَلُّوْا) بھی ہے۔ اور ان تمام اذکار و اسماء کی قرأت سے زیادہ افضل صَلُّوْا ہی ہے۔ کیونکہ باقی اسماء الٰہی کی قرأت کے مقابلہ میں صَلُّوْا کیلئے قرآنی حکم بھی ہے۔ یہ اگرچہ خصوصی حکم میں آیا ہے (جسکے لئے درود پڑھنا باقی فرائض نماز۔ روزہ کی طرح فرض ہو جاتا ہے) لیکن یہ درود (صَلُّوْا) کا ورد زائد عبادت میں شمار ہوتا ہے۔ جیسے اِنَّ اللّٰہَ وَمَلٰٓئِکَتَہٗ یُصَلُّوْنَ عَلَی النَّبِیِّ ط یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا صَلُّوْا عَلَیْہِ وَسَلِّمُوْا تَسْلِیْمًا○ تحقیق اللہ اور اسکے ملائکہ درود بھیجتے ہیں اوپر نبی کے اے ایمان والو درود بھیجو تم بھی اوپر نبی کے ___ اس آیت میں صَلُّوْا میں ایک خصوصی حکم پایا جاتا ہے۔ جس حکم میں فرض کی کیفیت پائی جاتی ہے۔ لیکن یہ حکم دوام کیلئے ہے۔ کہ ہمیشہ اور بار بار بے شمار درود بھیجا جائے۔ اور فرض کیلئے وقت کی حد ہے۔ درود کیلئے حد مقرر نہیں کی گئی۔ اگر صَلُّوْا فرض میں شامل ہوتا تو اسکے لیے باقی فرائض کی طرح (جسطرح نماز میں پانچ وقت اور روزہ میں ایک ماہ ہے) ایک وقت مقرر کیا جاتا۔ یہ اَمْرُ ہمیشہ کیلئے اور بے شمار زیادہ سے زیادہ درود پڑھنے کیلئے ہے۔ اسلئے یہ حکم زائد عبادت نَافِلَةً لَّکَ میں شامل ہے۔ اب درود کی خصوصیت اسماء الٰہی کے مقابلہ میں قرآن کے اس حکم کے تحت کیا ہے؟ جبکہ باقی قرأتِ قرآن میں اسماء الٰہی یا تلاوتِ قرآن کیلئے ایسا حکم نہیں۔ یہ خصوصیت لفظ محمد و احمد کے اسم مقدس کے لحاظ سے ہی ہے۔ یعنی اللّٰہ کی طرف سے درود بھیجنا حمد سے متعلق ہے۔ کہ جسقدر حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے عرفان ومحبت الٰہی میں اللہ کو پہنچاننے میں جستجو (مجاہدہ) کی اسکے نتیجہ میں اللہ تعالیٰ (باقی حاشیہ اگلے صفحہ پر)

مغرب کے حالات کا مشاہدہ کرنا۔ دل کی کیفیات وغیرہ سب کچھ مشاہدہ میں آتا ہے۔ اور یہ کیفیتیں عالم ناسوت کی ابتدائی منازل میں ہی مشاہدہ میں آتی ہیں۔ اسکے علاوہ بے شمار نوری کیفیتیں جو پے در پے انتہا تک تیزی اور روشنی میں قوی ہوتی ہیں اور اس عالمِ ناسوت کی انتہا۔ ایک نورانی عالم پر ہوتی ہے۔ جس میں مادی اشیا سے ماسوئی خالص نورانی کیفیات واقع ہیں اسے عالمِ ملکوت کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے۔ عالم ملکوت سے مراد۔ ملکوتی دنیا۔ ملکوت ملائکہ سے ہے۔ ملائکہ کے معنی نوری

(بقیہ حاشیہ گزشتہ صفحہ) نے انہیں وہ مقام منتہا عطا کیا جو کسی مخلوق کو عطا نہیں ہوا۔ جس مقام میں حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے احمد کا خطاب حاصل کیا۔ اس نتیجہ میں اللہ نے تمام کائنات کے ذمہ یہ مقرر کر دیا۔ کہ ہر شے محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی حمد کرے اور ان کی حب میں ان کے ہی حکم کی تابعداری کرے اور یہ چیز ازل سے شروع ہو کر ابد تک قائم کی گئی ــــ یعنی صَلٰوۃ اسے مراد یہ کہ ہر شخص کے دل میں محمد رسول اللہ کی عظمت قائم ہو اور ہر شے اسی رسول کی عظمت کے سامنے سر تسلیم خم کرے۔ اللہ نے انہیں لا انتہا عظمت عطا کی اور تمام کائنات سے آپکی عظمت تسلیم کرائی۔ اور فرشتوں کا درود یہ ہے۔ کہ ملائکہ بھی آپکی عظمت تسلیم کیے ہوئے ہیں۔ اور آپکی عظمت کے دوام از ازل تا ابد کے خواہاں ہیں۔ اور انسان کا درود یہ ہے۔ کہ محمد رسول اللہ کی محبت ہر عزیز سے عزیز شے سے زیادہ کی جائے۔ اپنے تصورات میں صرف حب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو ہی تقویت دی جائے اور انہیں کے نور کی پہچان کی جائے۔ اور انہیں کی شریعت وعظمت کو تسلیم کیا جائے۔ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام سے سوال کیا گیا۔ یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم درود میں کیا پڑھا جائے۔ یعنی ہم اپنے تصورات میں صَلٰوۃ کو کیسے لائیں۔ تو آپؐ نے فرمایا۔

اَللّٰهُمَّ صَلِّ عَلٰى مُحَمَّدٍ وَّ عَلٰى اٰلِ مُحَمَّدٍ كَمَا صَلَّيْتَ عَلٰى اِبْرٰهِيْمَ وَعَلٰى اٰلِ اِبْرٰهِيْمَ اِنَّكَ حَمِيْدٌ مَّجِيْدٌ ۝ اَللّٰهُمَّ بَارِكْ عَلٰى مُحَمَّدٍ وَّعَلٰى اٰلِ مُحَمَّدٍ كَمَا بَارَكْتَ عَلٰى اِبْرٰهِيْمَ وَعَلٰى اٰلِ اِبْرٰهِيْمَ اِنَّكَ حَمِيْدٌ مَّجِيْدٌ ۝ ۔ یہی قرأت درود شریف کے نام سے تعبیر دی جاتی ہے۔ یعنی اے اللہ درود بھیج اور پر محمدؐ کے اور اوپر محمد کی آل کے جیسے درود بھیجا اوپر ابراہیمؑ کے اور ابراہیمؑ کی آل کے۔ تحقیق تو تعریف کے لائق بزرگی والا ہے۔ اے اللہ برکت بھیج اوپر محمدؐ اور محمد کی آل کے جیسے برکت بھیجی ابراہیمؑ اور ابراہیمؑ کی آل کے تحقیق تو تعریف کے قابل بزرگی والا ہے۔

یہاں پہلے حصہ میں صَلِّ عَلٰى مُحَمَّدٍ وَّاٰلِ مُحَمَّدٍ ہے دوسرے حصہ میں بَارِكْ عَلٰى مُحَمَّدٍ وَّاٰلِ مُحَمَّدٍ ہے اسکے مقابل صَلَّيْتَ عَلٰى اِبْرٰهِيْمَ وَاٰلِ اِبْرٰهِيْمَ ہے دوسرے حصہ میں بَارَكْتَ (باقی حاشیہ اگلے صفحہ پر)

پیکر کے ہیں۔ یعنی اس عالم میں نوری مخلوق کا وجود واقع ہے۔ اس نوری عالم (عالم ملکوت) کا تصور۔ یا تو تصورِ شیخ سے ہوتا ہے۔ یا تصور حضرت محمد رسول اللہؐ سے ہوتا ہے۔ چونکہ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کے تصور کی انسان کو قدرت حاصل نہیں دوسرے آپکے تصور میں عالمِ ناسوت کے انوار سے بیحد زیادہ نور واقع ہے۔ اسلئے احتمال ہے۔ کہ اگر اس تصور میں عالمِ ملکوت کا نور بھی مشاہدہ میں آئے تو انسانی شعور و تعقل اور قلب اس نور کے متحمل نہیں ہو سکتے۔ جیسے ایک شخص کی آنکھوں پر سورج جیسی روشنی

(بقیہ حاشیہ گزشتہ صفحہ) عَلٰی اِبْرٰهِیْمَ وَاٰلِ اِبْرٰهِیْمَ ہے۔

یہ درود خود حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کی طرف سے عامۃ المسلمین و مومنین کو تعلیم کیا گیا۔ قرآن میں صرف صَلُّوْا ہے۔ مگر وحی خفی میں حضورؐ کو صَلُّوْا کی (وحی جلی) تعلیم وہی درود تعلیم کیا گیا جو درود آپؐ نے عام لوگوں کو تعلیم دیا۔ اور اسکی فرضیت (اَمْـــرُ۔ حکم) کو نماز کے ساتھ شامل کر کے پورا کیا گیا۔ نماز بھی تصورات میں سیڑھی کا درجہ رکھتی ہے۔ اسلئے درود میں بھی تصور ہی قائم ہوتا ہے۔ اور وہ تصور اسی درود کے لحاظ سے ہے جو کلمات درود میں پائے جاتے ہیں۔ یعنی اے اللہ میری طرف سے محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی عظمت و محبت کو تسلیم کرنا قبول کر کہ آپ کائنات میں سب مخلوق سے زیادہ عظمت و رفیع شان کے حامل ہیں۔ اور سب سے زیادہ تیری حمد کرنے والے ہیں۔ اور سب سے زیادہ ـــــ سب مخلوق میں قابلِ حمد ہیں۔ جیسے تو نے حضرت ابراہیمؑ کو اور اسکی آل کو تمام مخلوق میں پیغمبرانہ عظمت دی۔ کہ سب حضرت ابراہیمؑ اور اسکی شریعت کے تابعدار رہے۔ اسکے ساتھ اسکے دوسرے حصہ میں اس درود کی تفسیر ہے۔ کہ اے اللہ حضرت محمد رسول اللہ کی اس عظمت کو جو تمام کائنات ارض وسماوات پر حاوی ہے دوام عطا کر (بـارك+) حضرت محمد رسول اللہ کی شریعت اور اسکی تعمیل قیام قیامت تک علیٰ حالہ جاری رہے۔ تا کہ ہر شخص آپکا ثنا خواں رہے۔ ہر شخص آپ کی محبت کو ہی پائے۔ ہر شخص آپؐ کے تصور میں ہی غرق رہے۔ جیسے حضرت ابراہیمؑ کا دین اور آپکی عظمت کا سکہ ہمیشہ سے جاری ہے۔

اس صَلُّوْا حکم کی تخصیص اس لیے ہے۔ کہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک بھی حضور محمد رسول اللہ کی عظمت و محبت مسلمہ ہے چونکہ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام محمد و احمد ہیں اسلئے اس آیت کے مطابق (باقی حاشیہ اگلے صفحہ پر)

(حاشیہ در حاشیہ) +بـارك سے مراد بـرك۔ جم کر بیٹھنا۔ یعنی آپؐ کی شریعت کائنات پر ہمیشہ جاری رہے تا کہ ہر شخص آپکی ہی تعریف وحمد میں ہمیشہ رطب اللسان ہو۔

اچانک آنے سے آنکھ کی قوت فنا ہو جاتی ہے۔ اسی طرح نورِ محمدیؐ کے اچانک جلوہ زن ہونے سے انسان۔ شعور و تعقل کا توازن کھو کر اپنی جان سے بیخبر و بیخود ہو کر مجذوب ہو جاتا ہے۔ یہ چیز انسان کیلئے ایک نقص ہوتا ہے۔ اسلئے حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کے تصور کیلئے تصور شیخ یا روضہ مدینہ منورہ (تصور خیالی) کا تصور کیا جاتا ہے۔

عالمِ ناسوت طے کرنے کے بعد طالب میں یہ صلاحیت ہو جاتی ہے۔ کہ وہ عالمِ ملکوت کا

(بقیہ حاشیہ گزشتہ صفحہ) قُلْ اِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّوْنَ اللّٰهَ فَاتَّبِعُوْنِيْ يُحْبِبْكُمُ اللّٰهُ ۔ اللہ تعالیٰ کی مرضی ہے۔ کہ کائنات تمام حضور محمد رسول اللہ کی ہی ثناخواں ہو۔ اسلئے مرضیِ الٰہی کے مطابق قرأت قرآن میں افضل قرأت درود پڑھنا ہے۔

مندرجہ بالا درود وحی جلی میں موجود نہیں۔ مگر وحی خفی میں ہے۔ چونکہ یہ حکم ہر شخص کیلئے ہے۔ اسلئے اسکا افشا ضروری تھا۔ اور یہ تعلیم عام (شرعی) ہے۔ اسکے علاوہ وحی خفی میں اور درود و اوراد بھی شامل ہیں۔ اور طریق طریقت میں طالبانِ حقیقت کو تعلیم دیئے جاتے ہیں۔ اس تعلیم کے خفی ہونے کی دلیل کیا ہے؟

یہ حضورؐ کے تابعین میں حضرت خواجہ اویسؒ (قرنی) کی مثال ہے۔ کہ آپ کو اسلام قبول کرنے (یعنی شریعت کی تابعداری کرنے) کے بعد حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کی صحبت میسر نہ ہو سکی۔ مگر آپ نے شریعت کی تکمیل کے ساتھ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت اور تزکیہ مجاہدہ کو اس قدر کمال کو پہنچایا۔ کہ آپکے تصور میں حقیقی صورتِ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مشاہدہ میں آئی اور آپکو اسی باطنی کیفیت کے ساتھ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے وحی خفی کی تعلیم میں (خواہ اسماءِ الٰہی ہوں یا درود) تعلیم کیا۔ جس تعلیم سے آپ نے اپنے مقصد (عرفانِ الٰہی) کی بدرجہ تمام تکمیل کی۔ اور حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے حضرت اویسؒ کو اپنے دوست کے لقب سے پکارا۔ حالانکہ حضرت اویسؒ کو اپنی عمر میں کبھی حضورؐ سے ملنے کا موقع میّسر نہ ہوا۔ اسلئے حدیث رسول اللہؐ سے مروی تعلیمات سے علاوہ قرأت قرآن میں ایسی تعلیمات بھی ہیں جو مخفی طور تعلیم ہوتی رہیں اور سلسلہ کے ہر ولی کو (پیر سے خلیفہ کو) سینہ بسینہ تعلیم ہوتی رہیں۔ چنانچہ ہر زمانہ میں ہر ولی کے پاس جو طریقت کی تعلیم تھی۔ وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیم ہی سینہ بسینہ منتقل ہوتی رہیں۔ البتہ یہ بات ہے۔ کہ طریق مشاہدہ میں لوگوں کی طبیعتوں اور قوتوں کے مطابق طریق مجاہدہ و تزکیہ میں اولیا نے مختلف طریق اختراع کئے۔ لیکن یہ چیز طریق تزکیہ سے تعلق رکھتے ہیں۔ تعلیم سے نہیں۔

مثال کے طور ابتدائی زمانہ میں لوگوں کی قوتیں جسمانی و روحانی قوی تھیں۔ (باقی حاشیہ اگلے صفحہ پر)

مشاہدہ کر سکے۔ چنانچہ عالم ملکوت میں تصور روضہ مدینہ منورہ کرنے سے حافظہ میں سے پے در پے تصویر خیالی شعور کے سامنے آجاتی ہے۔ جسوقت تزکیہ ومجاہدہ کے بعد قلب پر اصلی عالم ملکوتی کی کیفیت آتی ہے۔ اس میں بھی پہلے تصور روضہ مدینہ ہی سامنے آتا ہے۔ اور اسکے تصور حقیقی میں روضہ مدینہ منورہ کی اندرونی کیفیت میں حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کی تربت مقدس کی جگہ سامنے آجاتی ہے۔ چونکہ یہاں حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کا نور رہوتا ہے۔ اور یہ جگہ تمام اولیاء اکرام کے روحانی وجودوں کا مرکز و

(بقیہ حاشیہ گزشتہ صفحہ) ایک طرف انہیں مجاہدات کی تکلیف محسوس نہ ہوتی تھی۔ اور تھوڑے سے مجاہدہ میں انہیں قوتِ مشاہدہ حاصل ہوتی تھی۔ مگر جوں جوں زمانہ گزرتا گیا۔ لوگوں میں شریعت کے عمل سے کوتاہی۔ آرام طلبی پیدا ہوگئی۔ جس وجہ سے اکثر لوگ فطری طور کمزور ہوتے گئے۔ انکی جسمانی۔ روحانی قوتیں کمزور ہوتی گئیں۔ ان میں تسلیم وجستجو کا مادہ بھی کم ہوتا گیا۔ اسلئے اولیا نے ہر شخص کی جسمانی روحانی قوت کے مطابق اسے عمل بتایا۔ کہ ایک طرف انسان عمل کی شدت محسوس نہ کرے اور دوسری طرف اسکا مجاہدہ بھی پورا ہوتا رہے۔ مگر ایسی اختراعیں عارضی تھیں۔ اور ان اختراعوں کا مقصد بھی یہی تھا کہ انسان اس مجاہدہ وتزکیہ کا اہل ہو۔ جو قرآن نے خالص طور تزکیہ کیلئے (قیام لیل۔ قران الفجر) بتایا ہے۔ مثال کے طور ایک ولی اپنے مرید کو یہ تعلیم دیتا ہے۔ کہ کلمہ لَآ اِلٰـہَ اِلَّا اللّٰـہُ کا ورد کرو اسکے لیے صرف تصور کی ضرورت ہے۔ تا کہ انسان کے قلب پر کلمہ کے انوار عکس پذیر ہوں۔ اسکے لیے مجاہدہ قیام لیل میں رات کے وقت اٹھ کر اتنی دیر پڑھنا ہے۔ جتنی دیر ایک شخص اپنے حافظہ میں خیالات ظاہری کو ترتیب دیکر شعور وتعقل کو حافظہ کے واقعات بہم کرنے سے قطعی رک جائے اور قلب وحافظہ کا رابطہ پیدا ہو کر صرف ایک ہی تصور قلب وحافظہ میں آجائے۔ اسکے لیے ولی کلمہ کی تعداد مقرر کر کے پانچ ہزار۔ دو ہزار۔ گیارہ سو۔ یا تین سو تیرہ کم سے کم یا زیادہ سے زیادہ تعداد مقرر کرتا ہے۔ بس اسکے مشاہدہ کیلئے یہی کچھ کافی ہے۔ لیکن دیکھنا ہے۔ کہ ایک مبتدی شخص کے اس سے قبل خیالات وخواہشات کیسی ہیں۔ اسکی جسمانی قوت کیسی ہے۔ اگر خیالات میں نقص ہو اور جسمانی حالت میں بھی نقص ہو تو اسکے لیے چاہیئے تو یہ کہ اسے قیام لیل میں ساری رات عمل کرنے کیلئے کہا جائے۔ لیکن جسمانی حالت کمزور ہونے کے باعث انسان اس مجاہدہ کا متحمل نہیں۔ ورنہ یہ عمل کرنے سے رہ جائے گا۔ اسکے لیے ولی نے یہ اختراع کی کہ خالی تصور اور سادہ قرأت کے ساتھ جسمانی اصلاح (قلب ودماغ کی اصلاح) کیلئے یہ ترکیب بتائی کہ لَآ اِلٰـہَ اِلَّا اللّٰـہُ کو پڑھتے وقت سانس کے ساتھ پڑھا جائے۔ کہ لَآاِلٰہَ پڑھنے کے ساتھ سانس اوپر کھینچو۔ اور اِلَّا اللّٰہ پڑھنے کے ساتھ (باقی حاشیہ اگلے صفحہ پر)

مسکن ہے۔ اسلئے اس جگہ کو اجلاسِ محمدیؐ یا مجلس محمدیؐ کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے۔ یہ جگہ عالمِ باطن میں ایک اجلاس کی شکل میں نظر آتی ہے۔ جس میں حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام ایک تختِ شاہی پر متمکن اور باقی اولیائے زمانہ دو رویہ قطاروں میں کرسیوں (تختوں) پر بیٹھے نظر آتے ہیں۔۔۔ یہ کیفیت قرأت قرآن سے صرف درود شریف کے ورد و تصور سے ہی نظر آسکتی ہے۔ باقی منازل عالم ناسوتی اگرچہ اسماء الٰہی سے نظر آتے ہیں۔ لیکن وہ منازل بغیر اسماء الٰہی کے بھی نظر آسکتی ہیں۔ اجلاس محمدیؐ

(بقیہ حاشیہ گزشتہ صفحہ) سانس واپس چھوڑ دے۔ اور واپس سانس کو چھوڑتے وقت دل کو اندروں میں (اچھالنے کی) حرکت دو گویا سانس کے ساتھ اِلاَّ اللّٰہ کی ضرب دل پر لگائی محسوس ہو۔ اس طریق کو نفی (لَا اِلٰہَ) اثبات (اِلاَّ اللّٰہُ) سے تعبیر دیا گیا۔ گو خیال یہ کیا جاتا ہے کہ سانس دل پر پڑتا ہے۔ یا اِلاَّ اللّٰہ کی ضرب دل پر لگائی جاتی ہے۔ لیکن اس طریق میں دل کو بار بار اچھالنے سے خود دل محرک ہونے کا عادی ہو جاتا ہے۔ اور اس میں ایک غیر وجودی حرکت محسوس کی جاتی ہے۔ یہ حرکت غیر وجودی ہوتی ہے۔ کیونکہ قلب کی حرکت اسکے خون کے دوران سے متعلق ہوتی ہے۔ اس حالت میں اسکی حرکت کو نبض سے محسوس نہیں کیا جاتا ہے۔ اسلئے یہ حرکت غیر وجودی ہوتی ہے۔ اور اس حالت میں دل کی دھڑکن کو شدت سے محسوس کیا جاتا ہے۔ چونکہ یہ دھڑکن نبض سے مشابہ نہیں ہوتی اسلئے اسکا تعلق دل کی مادی ہیئت سے نہیں ہوتا۔ بلکہ دل کے لطائف (لطیف قوت)۔ لطائف کے متعلق صفحہ ۳۳۴ حاشیہ پر مزید ذکر ہے) سے ہوتا ہے۔ اِلاَّ اللّٰہ کا سانس نتھنے کے راستہ باہر جاتا ہے۔ مگر دل کی دھڑکن میں اِلاَّ اللّٰہ کی آواز کو بھی محسوس کیا جاتا ہے۔ یعنی ایسے معلوم ہوتا ہے۔ کہ دل کے اچھلنے کے ساتھ اِلاَّ اللّٰہ کی آواز آرہی ہے۔ ایسی حالت میں دل کی دھڑکن اور اِلاَّ اللّٰہُ کی آواز کا تعلق صرف دل کو اچھالنے سے ہوتا ہے۔ اور تصورات میں جو احساس پیدا کیا جائے وہی احساس قلب کے لطائف میں قائم ہو جاتا ہے۔ تو معلوم ہوتا ہے۔ کہ دل اِلاَّ اللّٰہُ پڑھ رہا ہے۔ دیکھنا تو یہ ہے۔ کہ ورد پورے کلمہ لَآ اِلٰہَ اِلاَّ اللّٰہُ کا ہوتا ہے۔ لیکن دل صرف اسی کیفیت کو پاتا ہے۔ جسکی ضرب اس پر دی جاتی ہے۔ انوار تو تمام کلمہ کے حاصل کرنے ہوتے ہیں۔ لیکن دل آدھا کلمہ ہی پڑھتا ہے۔ اسکا مطلب یہ ہے۔ کہ یہ طریق صرف دل کی قوت کو لطیف کرنے کا ہے۔ مادی حالت میں دل کو بار بار اچھالنے سے اسکے لطائف کا ٹکراؤ ہوتا ہے۔ اور یہی لطائف کیفیات کی صورت میں تصور میں آتے ہیں۔ جنہیں کلمہ کے انوار سمجھا جاتا ہے۔ یہ طریق اگر کلمہ پڑھنے کے بغیر بھی کیا جائے تو بھی یہی کیفیت قلب پر آسکتی ہے۔ دراصل ایک ولی نے تصور لَآ اِلٰہَ اِلاَّ اللّٰہُ کے ساتھ قلب (باقی حاشیہ اگلے صفحہ پر)

ان اسماء کے ورد سے نظر نہیں آسکتا۔ کیونکہ یہ عالم خالص نورانی (ملکوتی) ہے۔ یہاں تک انسانی روح حیوانی کی پرواز (مادی حیثیت کے اعتبار سے) نہیں ہو سکتی۔ یہ کیفیت روح رحمانی کے ذریعہ ہی مشاہدہ میں آسکتی ہے۔ اور اگر اسماء الہٰی کے تصور کے ساتھ یہ مقام مشاہدہ میں آتا۔ تو اس کیفیت میں بھی نقص آنے کا احتمال ہوتا۔ کہ ہر شخص بغیر شریعت کی پابندی کے اسماء الہٰی کے تصور سے یہ جگہ پالیتا ــــ لیکن طریقت میں اس مقام کا مشاہدہ اور رسائی ایک سند کے طور پر مقرر کی گئی ہے۔ کہ اگر ایک

(بقیہ حاشیہ گزشتہ صفحہ) کے لطائف کو اجاگر کرنے کا ایک وقتی طریق پیش کیا۔ تا کہ قلب میں قوت مشاہدہ قوی ہو۔ اور بعد میں جب پورے کلمہ کے انوار قلب پر آجائیں تو اسکے پورے انوار کا مشاہدہ ہو جائے۔ اسی طرح اس ضرب کے چار طریق ہیں۔ جنہیں ذکر یک ضرب۔ ذکر دو ضرب۔ ذکر سہ ضرب۔ ذکر چہار ضرب اسکے علاوہ ذکر ارہ۔ ذکر ہفت در بند وغیرہ سے تعبیر دیا جاتا ہے۔ اسکے علاوہ سانس بند کر کے بھی ذکر ہوتا ہے۔ دراصل ان ترکیبوں سے قلب کی قوتِ مشاہدہ قوی ہو جاتی ہے اور رفتہ رفتہ کلمہ لَآ اِلٰـہَ اِلَّا اللّٰہُ کے انوار کا مشاہدہ ہوتا ہے۔ تو ایسے سمجھا جاتا ہے۔ کہ یہی ضربات ہی وجہ کسب نور ہیں۔ اور اس تمام طریقہ میں صرف وہی انوار حاصل ہوتے ہیں۔ جو عالم ناسوت میں واقع ہیں۔ اسی طرح باقی اسماء اللہ ھو وغیرہ میں بھی تزکیہ کے طریق (صرف قلبی قوت کو اجاگر کرنے کیلئے) اختراع کئے گئے ہیں۔

ان طریقوں میں بھی نقص واقع ہوتا ہے۔ وہ اس طرح کہ یہ طریق وجودی عمل (مادی عمل) سے تعلق رکھتا ہے۔ اگر لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ نہ بھی پڑھا جائے۔ تو بھی قوت مشاہدہ پیدا ہوتی ہے۔ مگر کلمہ کا ورد ساتھ رکھنے کی وجہ سے اس تفریق کو محسوس نہیں کیا جاتا۔ یہ امر مسلمہ ہے۔ کہ صراط اللہ کے لیے شریعت کی پابندی لازم ہے۔ ورنہ بغیر شریعت کی پابندی کے صراط اللہ کا حاصل ہونا ممکن نہیں۔ کیونکہ قرآنی طریق طریقت میں وَاَنِ اعْبُدُوْنِیْ ط ھٰذَا صِرَاطٌ مُّسْتَقِیْمٌ لازمی چیز ہے۔ اور اس طریق میں نقص محسوس نہ کرنے کا سبب بھی یہی ہے۔ کہ ایک شخص بغیر شریعت کی پابندی (نماز۔ روزہ) کے بھی یہ کیفیتیں حاصل کر لیتا ہے۔ ایسی حالت میں جبکہ ایک شخص سے عالم ناسوت کے مشاہدہ میں دنیا کے باطنی واقعات (کشف۔ دل کے حالات کا جاننا۔ چھپے خزانے۔ یا قبروں کے حالات بتانا۔ یا بیماروں کا اچھا کرنا۔ یا دیگر کرامتیں کرنا) کا صدور ہوتا ہے۔ اسے ولی کا درجہ دیا جاتا ہے۔ اور بغیر شریعت کی پابندی کے بھی۔ اس طریق کو صحیح سمجھ کر شریعت اور طریقت کو دو علیحدہ طریق سمجھا جاتا ہے۔ یہ غلط فہمی اور لاعلمی ہی (باقی حاشیہ اگلے صفحہ پر)

شخص تمام عالم کے حالات سے آگاہ ہو۔ اور اجلاسِ محمدیؐ میں رسائی نہ ہوا سے ولی نہیں کہا جاسکتا۔ اور ولی کی خصوصیت میں شریعت کی پابندی اور درود شریف ہی مقرر کیا گیا ہے۔ نیز درود شریف میں چونکہ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام پر درود بھیجنا ہے۔ اسلئے اس درود کے نتیجۂ عمل میں بھی اجلاس محمدیؐ کی ہی کیفیت ہے۔ کیونکہ درود پڑھنے سے حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کی توجہ ایک عامل پر پڑتی ہے۔ اور وہ

(بقیہ حاشیہ گزشتہ صفحہ) ایک حقیقت کو غلط رنگ میں پیش کرنے کا سبب بن جاتی ہے۔

عالمِ ناسوت کی ان اکتالیس منازل میں بے شمار انوار پائے جاتے ہیں۔ چونکہ یہ عالم عالم ناس دنیا سے متصل ہے۔ اسلئے اسکا مشاہدہ انسان کی روح حیوانی کے ذریعہ بھی ہوتا ہے۔ روح حیوانی کی تقویت کیلئے صرف روح حیوانی کی تقویت کی ضرورت ہوتی ہے۔ اسے شریعت کے طریق تزکیہ کی ضرورت نہیں ہوتی۔ کیونکہ انسان میں بجائے خود اسکے مادی خواص میں بھی اتنی قوت ہے۔ کہ اگر انہیں بغیر شرعی طریق کے قوی کیا جائے تو ان قوتوں سے مادی قوتوں (اور عالم ناسوت) کا مشاہدہ ہوسکتا ہے۔ البتہ اگر شریعت کی پابندی کے ساتھ عالم ناسوت کا مشاہدہ کیا جائے۔ تو اسکے لیے بہتر اور صحیح طریق شریعت کی پابندی ہے۔ ان حالات میں اگر ایک شخص بغیر شریعت کے طریق کے عمل کرے تو اسکا عمل اصل مقصود تک نہیں پہنچ سکتا ہے۔ اور اسکی اس حالت میں جسم کی کمزوری پر یہ مشاہدہ برقرار نہیں رہ سکتا۔ اور سب سے بڑی خرابی یہ ہے۔ کہ اس طریق سے ایک باطل طریق کا اجرا ہوتا ہے۔ اور لاعلم لوگ ایک شراب پینے والے۔ چرس بھنگ پینے والے اور ہر قسم کے خلاف شریعت کام کرنے والے شخص کو ولی سمجھ کر اس سے اپنے مقصود میں راہنمائی حاصل کرنے کیلئے رجوع کرتے ہیں۔ اور ہر خلاف شریعت وطریقت عمل کو دین سمجھ کر اصلی شریعت حقہ کی تکذیب ونفی کرتے ہیں۔

اسکے ماسوائے درود شریف کے ورد میں ابتداء سے انتہا تک کوئی خارجی طریق مجاہدہ اختراع نہیں کیا گیا ہے۔ سوائے اسکے کہ وحی خفی کے ذریعہ نماز کے درود شریف کے علاوہ مختلف قسم کے درود شریف بتائے گئے ہیں۔ ان میں سب سے پہلے شریعت کی پابندی۔ قرآنی طریق تزکیہ (یا اولیا کا طریق تزکیہ) جس میں صرف مختلف اوقات میں قرأت درود کے ساتھ تصور شیخ یا مرکزِ نور (روضہ مدینہ منورہ) کا تصور خیالی بتایا جاتا ہے۔ اس طریق میں بھی۔ عالمِ ناسوت کے منازل کا مشاہدہ ہوتا ہے۔ اور اسکے آخری منازل کے طے ہونے کے بعد روضہ مدینہ منورہ کا تصور سامنے آجاتا ہے۔ اگر شریعت کی تعمیل نہ کی جائے تو پھر عالم ملکوت کا باب اول روضہ مدینہ منورہ کا تصور حقیقی نہیں آسکتا۔

توجہ ایک نور کی کیفیت میں طالب کے دل پر آتی ہے۔ ایسی نوری توجہ میں اجلاس محمدیؐ اور زیارت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہوتی ہے۔ چنانچہ خود حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کی حدیث اس امر کی شہادت ہے۔ جو شخص ہم پر درود پڑھتا ہے۔ اسی لہجہ۔ اُسی آن۔ اسی آواز میں ہم تک پہنچتا ہے۔ جسوقت آپؐ تک درود پہنچتا ہے۔ تو حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کو معلوم ہوتا ہے۔ کہ فلاں شخص ہم پر درود پڑھتا ہے۔ تو یہی صورت توجہ کی ہوتی ہے۔ اگر یہ شخص طریق طریقت پر عامل ہو تو اسوقت قلب کی کیفیت کے ساتھ اجلاس محمدیؐ اور حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کے نور مقدس کا مشاہدہ کرتا ہے۔ آپؐ کی شکل مقدس اسی ہیئت میں ہوتی ہے۔ جو شکل آپؐ کی رسول اللہ کی حیثیت سے مدینہ منورہ میں تھی۔ حضورؐ نے اس کی تصدیق کے لیے فرمایا کہ مَنْ رَآنِیْ فَقَدْ رَأنِیْ فَاِنَّ الشَّیْطَانَ لَا یَتَمَثَّلِیْ تحقیق جس نے ہمیں عالم مشاہدہ میں دیکھا۔ حقیقتاً ہمیں ہی دیکھا۔ تحقیق شیطان ہماری شکل نہیں بن سکتا۔ اس حدیث سے یہ بھی ثابت ہوتا ہے۔ کہ سوائے درود شریف کے حضورؐ کو دیکھا نہیں جا سکتا۔ اور مادی طریق استدراج (یعنی بغیر شریعت کی پابندی) سے ہمیں نہیں دیکھا جا سکتا۔

گویا اجلاس محمدیؐ ایک فقیر کیلئے ولایت کی سند ہے۔ اگر یہاں تک رسائی نہیں تو وہ فقیر کہلا نہیں سکتا۔ اگر شریعت کا پابند ہے اور درود بھی پڑھتا ہے۔ تو یہ شخص عامل کہلاتا ہے ــــ اگر شریعت کا پابند نہ ہو اور درود بھی پڑھتا ہو تو بھی اسے اجلاس محمدیؐ حاصل نہیں ہو سکتا ہے۔ بلکہ یہ شخص استدراجی (یعنی حیوانی قوتوں والا) کہلاتا ہے ــــ یہاں سے ترقی کرتے کرتے انسان عالم ملکوت میں تمام آسمانوں کی کیفیتیں۔ ملائکہ۔ انبیاء سابقین جتنے بھی دنیا پر نازل ہوئے ہیں۔ جنت کی اصلی کیفیت۔ دوزخ جہنم۔ قیامت۔ سات آسمان اور کرسی و عرش کی کیفیتیں مشاہدہ کر سکتا ہے۔ قرآن کریم نے عالم ملکوت کی ان کیفیات کے نام ملکوت السمٰوٰت۔ کرسی و عرش۔ ذکر کیا ہے۔ صراط اللہ کی ابتدائی راہ اسی ملکوت السمٰوٰت سے ہے۔ اور ملکوت السمٰوٰت کا باطنی دروازہ روضہ مطہرہ مدینہ منورہ کے باطنی وجود اجلاس محمدیؐ سے ہی ہے چونکہ یہاں سے خالص کیفیات نورانی شروع ہوتی ہیں۔ اور یہ انوار روح حیوانی سے حاصل نہیں ہو سکتے۔ بلکہ روح رحمانی اور قلب و دماغ کی پوری

صلاحیت سے حاصل ہوتے ہیں ۔۔۔ یہ صلاحیت اسوقت تک پیدا نہیں ہوسکتی جب تک ایک انسان ۔طریقت کی راہ میں قدم رکھ کر۔طریق طریقت پر پوری طرح کاربند نہ ہو۔اور انسان میں حُب کا جذبہ پیدا نہ ہو۔ان اوصاف سے متصف ہونے والا ہی ولی کہلاتا ہے۔شریعت وطریقت کی پابندی اور جذبۂ حُب کے پیدا ہونے کا تقاضا یہ ہے کہ یُحْبِبْکُمُ اللّٰہُ [1] ۔اللہ بھی ایسے مومن کو اپنا دوست بناتا ہے۔اور اسکے لیے باطنی عالم میں نورانی راہیں کشادہ کر دیتا ہے۔اَللّٰہُ وَلِیُّ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لا یُخْرِجُھُمْ مِّنَ الظُّلُمٰتِ اِلَی النُّوْرِ ۃ (پارہ ۳ سورۃ ۲ آیت ۲۵۷) اللہ ایک مومن کو اپنا دوست بناتا ہے۔اور مادیت کے اندھیرے سے نکال کر نورانی عالم میں پہنچاتا ہے۔سو اس نورانی عالم کی ابتدا اجلاس محمدیؐ سے ہوتی ہے۔لہٰذا حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کے اجلاس میں پہنچنا ہی عرفان الٰہی کا پہلا زینہ ہے۔

عالم ملکوت میں سات مقامات ہیں جہاں روضہ مدینہ منورہ کی طرح اجلاسِ محمدیؐ ہیں۔ان اجلاسوں کی حیثیت عالم ملکوت میں قصر شاہی کی سی ہے۔جس طرح ایک ملک میں دربار شاہی افضل مقام ہوتا ہے۔اسی طرح عالم ملکوت میں ان اجلاسوں کو افضلیت حاصل ہے۔اور ولی کا ان اجلاسوں میں پہنچنا ضروری اور لازمی ہوتا ہے۔جب تک اسے دربار شاہی سے شہنشاہ کائنات کی سند حاصل نہ ہو وہ اس مقام کا ولی نہیں کہلا سکتا۔۔۔ ان مقامات میں دوسرا مقام بیت اللہ ہے۔تیسرا عرش۔چوتھا

---

[1] اس کی تائید اس حدیث پاک سے ہوتی ہے مَنْ صَلّٰی عَلَیَّ وَاحِدَۃً صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ عَشْرًا ۔جس نے ایک دفعہ ہم پر درود بھیجا اللہ تعالیٰ اس پر دس بار درود بھیجتا ہے۔اسکا مطلب یہ ہے۔کہ باقی اسماء الٰہی کے مقابلہ میں اگر قرآن کے ایک حرف کا نتیجہ ایک نیکی (ثواب) ہے۔تو اس کے مقابلہ میں ایک بار درود پڑھنے والے کو ایسی دس نیکیاں حاصل ہوتی ہیں۔اور اللہ تعالیٰ ایسے شخص کو اپنا دوست بناتا ہے۔دوست بنانے سے مراد یُخْرِجُھُمْ مِّنَ الظُّلُمٰتِ اِلَی النُّوْرِ ۔اندھیرے سے نکال کر نور میں پہنچاتا ہے۔وہ نور عالم نوری کہلاتا ہے۔جسے عالم ملکوت بھی کہا جاتا ہے۔اور عالم ملکوت سے مراد زیارت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہے۔جو اول اجلاس محمدیؐ میں حاصل ہوتی ہے۔اور یہ کیفیت یُحْبِبْکُمُ اللّٰہُ اور فَاتَّبِعُوْنِیْ سے ہی حاصل ہوتی ہے۔

مقام تحت الثریٰ اور باقی ۱ تین مقامات عرش سے اوپر ہیں۔ یہ چار مقام عالم ملکوت میں واقع ہیں۔ پہلا مقام تو روضہء مدینہ منورہ میں ہے۔ دوسرا اجلاس بیت اللہ میں۔ یعنی جس جگہ خانہ کعبہ واقع ہے۔ باطن میں بیت اللہ ۲ مشاہدہ میں نہیں آتا بلکہ ایک لا انتہا نورانی دریا مشاہدہ میں آتا ہے۔ جس میں بے شمار کشتیاں تیرتی نظر آتی ہیں۔ اس دریا کو دریائے تــوحیــد کہا جاتا ہے۔ اور اس میں تیرنے والی کشتیاں اولیا کے روحانی وجودوں کی تمثیلی کیفیت ہوتی ہے۔ اس دریائے توحید میں ایک عظیم الشان سنہری کشتی میں حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کا دوسرا اجلاس ۳ ہوتا ہے۔

تیسرا اجلاس محمدیؐ عرش پر ہے۔ یہ مقام مجسم نوری ہے۔ سات آسمان اور کرسی کے اوپر واقع ہے۔ اس عرش میں بیت المعمور ہے اس کی تمثیلی شکل ہو بہو بیت اللہ سی ہے۔ باالفاظ دیگر بیت اللہ کی ساخت اسی بیت المعمور کی تمثیلی شکل کا نمونہ ہے۔ چونکہ یہ مقام مجسم نوری ہے۔ اسلئے یہاں ظاہر و باطن کی تمیز ختم ہوتی ہے۔ عرش عالم نورانی ہے اسلئے عالم باطن سے تشبیہ دیا جاتا ہے۔ اجلاس محمدی بھی عالم روحانی ہے۔ اسلئے ان دونوں کیفیتوں میں کوئی فرق نہیں۔ یہ مقام عالم ملکوت کی آخری حد ہے۔

چوتھا اجلاس تحت الثریٰ۔ تحت ثریٰ کے معنی گیلی مٹی کے نیچے۔ یہ ایک اصطلاحی نام ہے زمین کے سب سے نچلے طبقہ کا۔ دراصل زمین کا کوئی نچلا طبقہ ہے ہی نہیں۔ یہ دنیا ایک گیند کی مانند گول ہے۔ اسکی اوپر کی سطح تو اوپر کا طبقہ کہلائیگا خواہ وہ کسی جہت (مشرق۔ مغرب۔ شمال۔ جنوب۔ اوپر۔ نیچے) میں ہو ـــــ اسلئے گیلی مٹی سے مراد زمین کے اندر کا وہ حصہ ہے جسکی مٹی گیلی ہے۔ یعنی

---

۱ چونکہ یہ مقامات غیب اور سر میں شمار ہیں۔ اگرچہ ان کے اخفاء میں جرج نہیں۔ لیکن زمانہ میں اغراض پرست انسان پر عقلی طور ان واقعات کی آگاہی سے۔ انکے غلط طریق میں تقویت پیدا ہوتی ہے۔ اسلئے اسکا تعلق مشاہدہ ہی سے ہے۔

۲ ان اجلاسوں کی کیفیات بھی مشاہدہ کی آگاہی سے تعلق رکھتی ہیں اسلئے انکی تفصیل لکھنے کی ضرورت نہیں۔

۳ بیت اللہ بھی توحید کا مرکز ہے۔ اس مرکز کی باطنی ہیئت بھی نوری ہے۔ چونکہ توحید کا اجراء حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام سے ہی ہوا۔ اسلئے اس توحید کے مرکز میں بھی آپ کی باطنی شہنشاہیت کا اجرا ہوا۔

زمین کی سطح سے بہت نیچے (اندر کی طرف) چونکہ اس میں پانی ہوتا ہے۔ اور اس پانی کا دوران زمین میں انسانی رگوں کی مانند ہے۔ زمین کے اندر بعض مقامات میں پانی دریاؤں کی چوڑائی میں بھی ادھر اُدھر چلتا ہے۔ اور پانی ہونے کی وجہ سے یہ مٹی گیلی ہوتی ہے۔ یہ طبقہ گویا زمین کا گودا ہے جس طرح ایک انڈے میں زردی۔ اور زردی کے اوپر سفیدی۔ جو کہ چاروں طرف ایک ہیئت ایک شکل رکھتی ہے اور اسکا چھلکا جس طرف بھی پایا جاتا ہے اوپر کا چھلکا ہی کہلاتا ہے۔ اسی طرح گیلی مٹی زمین کا مرکز ہے۔ مثال کے طور

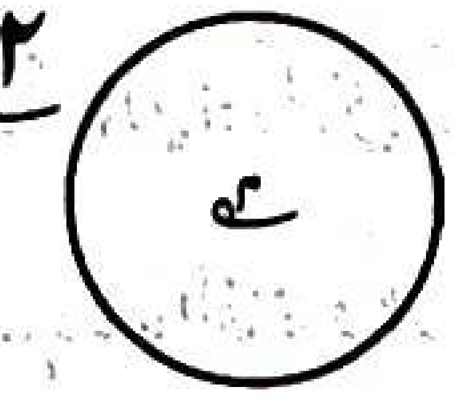

۱۔ نشان زمین کا مرکز ہے۔ یہ مرکز گیلی مٹی ہے۔

۲O نشان اوپر کی سطح ہے۔

کائنات میں زمین کا مقام سب سے آخری مقام ہے۔ مثال کے طور

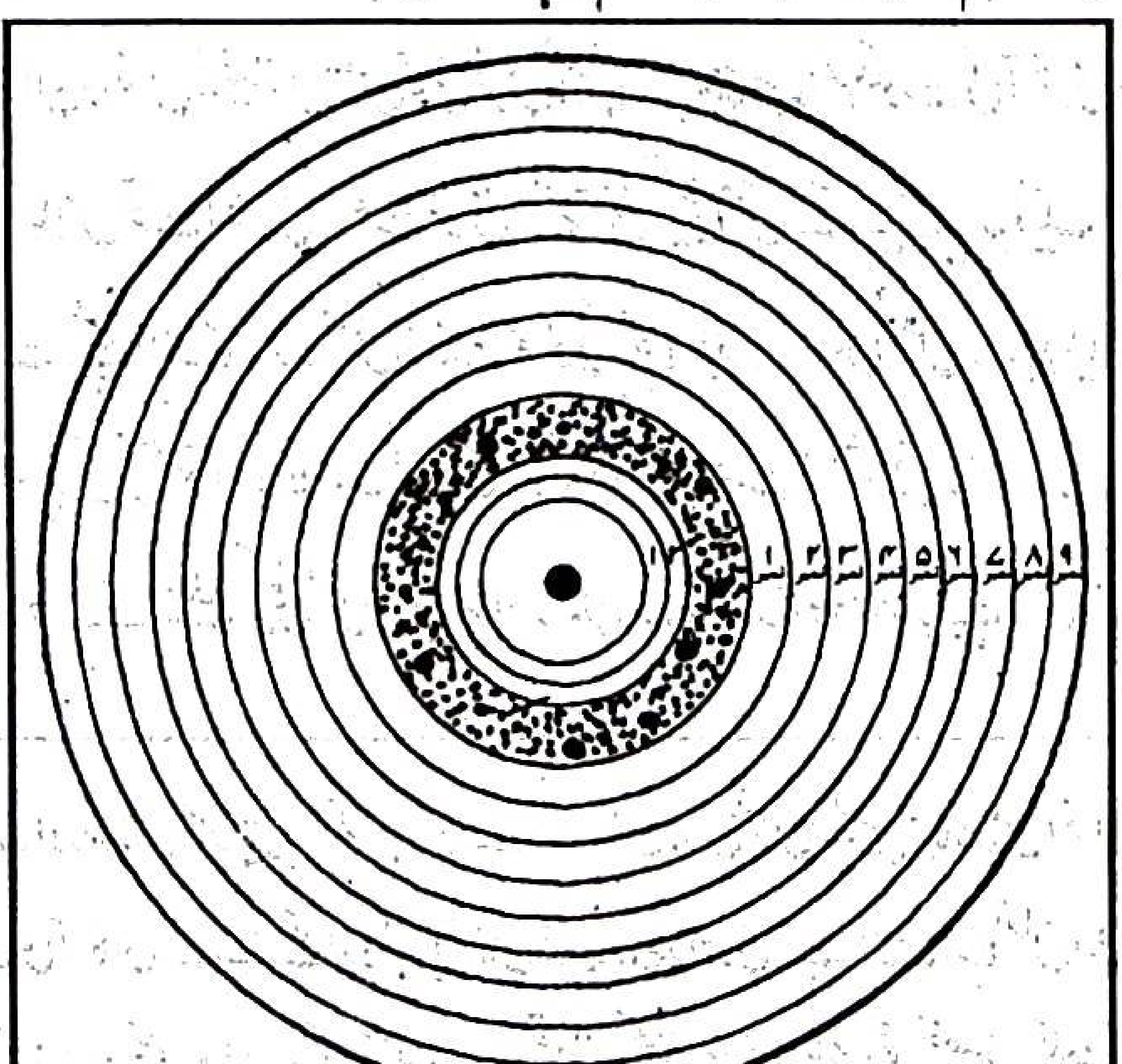

اس نقشہ میں نقطہ زمین کا مرکز ہے۔ گویا یہی نقطہ تمام موجوداتِ ارض وسمٰوٰت تا احدیت ایک مرکز کی حیثیت سے ہے۔ مرکز کے اعتبار سے یہی مقام سب سے دور اور سب سے نیچے کہلاتا ہے۔

نمبر ا کرۂ آبی ہے۔ جو ہر جہت (طرف) سے زمین کا احاطہ کئے ہوئے ہے۔

نمبر ۲ کرۂ ہوائی ہے۔ یہ کرہ۔ کرۂ آبی کے اوپر زمین اور کرۂ آبی کو گھیرے ہوئے ہے۔

نمبر ۳ کرۂ آتشی ہے۔ یہ کرہ۔ زمین اور تمام کواکب کو اپنے میں سمائے ہوئے ہے۔

تمام ستارے۔ چاند۔ سورج سب اسی کرۂ آتشی میں واقع ہیں۔ اس کرۂ آتشی میں سب سے دور مقام مرکز کے اعتبار سے زمین ہی ہے۔ باقی ستارے۔ چاند۔ سورج زمین کے مقابلہ میں نزدیک ہیں۔ اس کرۂ آتشی کی وسعت زمین سے لے کر آسمان اول تک واقع ہے۔ نشان ( ) تمام ستاروں۔ چاند اور سورج کی نشاندہی کرتے ہیں۔ اس کرۂ آتشی میں اسقدر سورج۔ چاند۔ ستارے موجود ہیں جنکا علم انسانی ادراک سے باہر ہے۔ یہ سیارے زمین کے ارد گرد دائیں بائیں اوپر نیچے ہر طرف پھیلے ہوئے ہیں۔ اور انکی وسعت آسمان اول تک جہاں تک کرۂ آتشی واقع ہے۔ اور زمین ان تمام سیاروں کے عین وسط میں ہے۔ اسکی سب سے بڑی دلیل۔ زمین کا مادی وجود ہے۔ زمین کے دور ہونے کی وجہ سے کرۂ آتشی کا اثر باقی سیاروں کے مقابلہ میں اس پر کم پڑتا ہے۔ اسلئے زمین ایک زمانہ گزرنے کے بعد اپنی گرمی ختم کر کے ٹھنڈی ہو گئی اور وہ ٹھنڈی کیفیت مٹی کی شکل میں آ گئی۔ باقی ستارے کرہ آتشی میں نزدیک و نزدیک تر ہونے کے باعث نہ اپنی گرمی ختم کر سکتے ہیں۔ نہ کرۂ آتشی کی گرمی انہیں ٹھنڈا ہونے دیتی ہے۔ اسلئے زمین۔ اور زمین کا اندرونی حصہ جہاں ایک قوس (نیم قطر) کی حد ختم ہو کر دوسری قوس (نیم قطر) کی حد شروع ہوتی ہے مرکز (تحت الثریٰ) کہلاتا ہے۔

کرہ آتشی کے اوپر آسمان اول نمبر ا کا احاطہ ہے۔ یہ آسمان کرۂ آتشی سے بھی تیز اور تاباں ہے۔ اسکی تیزی تابانی بمنزلہ نور ہے۔ جس طرح زمین خاکی میں مخلوق خاکی۔ اور ستاروں اور سورج میں مخلوق ناری (ذرات شمسی) واقع ہیں۔ اسی طرح اس نوری کیفیت (آسمان اول) میں نوری مخلوق پائی جاتی ہے۔ اسی طرح ہر آسمان اور اس کی مخلوق و کیفیت پر ایک آسمان کا احاطہ ہر جہت سے ہے نمبر ا سے لے کر نمبر ۷ تک اسی طرح نمبر ۸ ''کرسی'' کا احاطہ تمام آسمانوں پر ہے۔ اسی کیفیت کو قرآن اس طرح بیان کرتا ہے وَسِعَ كُرْسِيُّهُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ ۔ اسکی کرسی نے آسمانوں اور زمین کو اپنے میں سمایا

ہے۔اور کرسی کو عرش نمبر ۹ نے اپنے میں سمایا ہے۔اسی طرح ہر نوری ماحول ہر ادنیٰ ماحول کو اپنے میں سمائے ہوئے ہیں اور ان تمام مخلوقی کیفیتوں کی جب انتہا ہو جاتی ہے۔تو اسکے بعد ایک ہی کیفیت نوری باقی ہے جس نے تمام کیفیتوں کو اپنے میں سمایا ہے۔اسکے بعد کوئی ایسی کیفیت نہیں جسکا احاطہ ہو۔یہ نور اپنی وسعت میں لا انتہا ہے۔اسلئے اس ہیئت نوری کو جسکی کوئی انتہا نہیں اور اسکی ہیئت کے تصور میں (کہ وہ کتنا وسیع۔کہاں تک۔اور کب سے ہے) جب انسان اپنے عقل وشعور کی پرواز کرتا ہے۔تو وہ تھک کر رہ جاتا ہے۔اور حیرت و درماندگی میں پڑتا ہے تو بے ساختہ زبان سے اللہ کی آواز نکلتی ہے۔

الغرض زمین ـــــ اور زمین میں مرکز (تحت الثریٰ) احدیت کا بھی مرکز ہے۔جس طرح ظاہر میں مدینہ منورہ میں روضۂ مطہرہ کا باطن اول اجلاسِ محمدیؐ ہے۔ظاہری بیت اللہ میں باطنی اجلاس دوم ہے۔تیسرا اجلاس محمدیؐ عرش پر ہے۔اسی طرح اس مرکز کے مقام پر باطنی اجلاس محمدیؐ چہارم ہے۔

ان چار مقامات میں اجلاس محمدی کا ہونا۔ایک خصوصیت رکھتا ہے۔وہ خصوصیت خود ذات حضرت محمد رسول اللہؐ سے ہے۔آپؐ نے کائنات میں تمام مخلوق سے زیادہ اللہ تعالیٰ کی حمد کی۔بدرجہ اکمل حمد کا تقاضا یہ ہے۔کہ آپؐ سب سے زیادہ اللہ کے قریب ہیں۔قریب ہونے کا تقاضا یہ ہے۔کہ اللہ سب مخلوق سے زیادہ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کو محبوب رکھتا ہے۔اس محبوبیت کا اثر یہ ہے۔کہ اللہ اور اسکے فرشتے حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام پر درود بھیجتے ہیں۔اور تمام کائنات کو حضورؐ کی حمد کا حکم دے دیا۔ایسے محمدؐ کی جگہ دل میں ہی ہونی چاہئے۔سو روضہ مدینہ منورہ اس مادی کائنات میں دل کے مقام پر ہے۔اسلئے آپکو کائناتِ دل پر حکمران بنا کر تخت پر بٹھایا ــــ اور تمام کیفیات نورانی آسمان و ماوراء آسمان کا دل عرش ہے۔اسلئے اس عرش میں بھی آپؐ کا عرش قائم کیا تاکہ تمام عالم ملکوتی میں حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کی شہنشاہیت[1] تسلیم کی جائے۔اسلئے تمام ملائکہ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام پر درود بھیجتے ہیں ــــ بیت اللہ مرکز ہے زمین کا تمام موجودات کا۔کیونکہ مکہ زمین کا مرکز ہے۔اگر مرکز

---

[1] مثنوی ع کز برائے مَن بدش سجدہ ملک۔

موجود نہ ہوتو دائرہ کا علم نہیں ہوسکتا۔ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام ہی سب سے اکمل حمد کرنے والے ہیں اور مرکز بھی ایک کیفیت کی حد کہلاتا ہے۔ اس حد کو محمدؐ نے ہی حمد کا جامہ پہنایا۔ آپؐ نے خود حمد کی اللہ کو بدرجہ اتم پہچانا۔ اور انسان کیلئے عرفان کی راہیں آسان کردیں۔ بیت اللہ بمثل حد ہے اور محمد کی پیدائش سے ہی حمد کی تکمیل ہوئی اسلئے یہاں پر بھی حمد کے ساتھ محمدؐ کی شہنشاہیت قائم ہے۔

تحت الثریٰ ذات احدیت سے لیکر زمین تک کا آخری مرکز ہے۔ مرکز کی حیثیت سے یہی نقطہ ذات احد کے وجود کو ظاہر کرتا ہے۔ اگر نقطہ نہ ہوتو دائرہ محسوس نہیں کیا جاسکتا۔ سو حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام خود ذات احدیت میں ایک نقطہ کی حیثیت سے ہیں۔ یعنی جسوقت کوئی وجود موجود نہ تھا صرف اللہ کی ذات احد تھی۔ ذاتِ احد میں مخلوق کا وجود قائم جب ہوا۔ تو وہ بھی ذات احد میں ایک نقطہ کی حیثیت سے تھا۔ کہ ہر جہت میں نور الٰہی تھا اور اسی نور الٰہی میں ایک نقطہ مرکز کی حیثیت سے قائم (پیدا) ہوا۔

یہ امر مسلمہ ہے۔ کہ کائنات میں ہر مخلوق علت و معلول کی حیثیت سے ہے۔ اسلئے لازمی ہے۔ کہ ذات احد سے ایک ہی معلول پیدا ہوا اور اسی معلول سے معلول در معلول ــــــ معلول بنتے رہے۔ اور سب سے ابتدائی معلول ہی ایک مرکز و نقطہ کی حیثیت سے ہونا لازمی تھا۔ اور حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کے اسم مقدس احمد سے خود یہ معنی پیدا ہوتے ہیں۔ کہ سب سے ابتدائی۔ سب سے قریب معلول ہی بدرجہ اتم حمد کرسکتا ہے۔ اسی حمد کے اعتبار سے حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کا نام مقدس احمد ہوا۔ سو ابتدائی معلول اپنی حمد اور قرب کے اعتبار سے۔ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کا ہی نور[1] تھا۔

---

[1] حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کی حدیث ہے کہ کُنْتُ نَبِیًّاوَ اٰدَمُ بَیْنَ الْمَاءِ وَالطِّیْنِ ہم حضرت آدمؑ کے پانی اور مٹی میں ہونے سے قبل بھی نبی تھے۔ نبی سے مراد حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کی صفت ھو الاوّل ھو الآخر۔ یہ کیفیت نور کے اعتبار سے ہے دوسری حدیث اَوَّلُ مَاخَلَقَ اللّٰہُ نُوْرِیْ سب سے پہلے ہمارا ہی نور بنا۔

یعنی اس ابتدائی نور کا نام ہی احــمــد تھا اور اگر حروف کا مطالعہ کیا جائے تو اس میں احد کے مرکز میں میم (م) محــمــد ہے جو نقطہ کی حیثیت سے پائی جاتی ہے۔ جس سے احمد بنا۔ گویا ابتداءِ مخلوق بھی احمدؐ سے ہوئی اور اس کی آخری حد بھی محمدؐ کی پیدائش سے ہوئی کسی شاعر نے اس کیفیت کو اس شعر سے ظاہر کیا ہے۔

وجودِ مرکز پرکار عالم کے شدے ثابت
احد خود قاب قوسین ار نہ بودے میم احمدؐ را

یعنی اگر محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا وجود پیدا نہ ہوتا تو اس عالم کا وجود ظاہر نہ ہوتا۔ اس لئے تحت ثریٰ میں اس مرکزی نقطہ ہونے کی حیثیت سے آپکا مقام تحت ثریٰ مرکزِ کائنات واحدیت میں بھی ہے۔ اور آپکی شہنشاہیت اس مرکز میں بھی قائم ہے۔

ان اجلاسوں میں روضۂ مطہرہ۔ بیت اللہ۔ کے بعد پے در پے آسمانوں (صــــراط الــلّــــہ) کی سیر ہوتی ہے۔ چنانچہ سب سے پہلے آسمان اول کا مشاہدہ ہوتا ہے۔ ایک شاہد جب آسمانوں کی طرف سیر کرتا ہے تو وہ بیت اللہ کے اجلاس سے یہ راہ پاتا ہے۔ اس سیر میں بعض حالتوں میں ایک براق (سواری) کو محسوس کیا جاتا ہے۔ اور بعض حالتوں میں اپنی پرواز محسوس ہوتی ہے۔ اسکے علاوہ بھی کئی حالتیں محسوس کی جاتی ہیں۔ جنکے لئے روضہ مطہرہ اور بیت اللہ کے درمیان مقامات واقع ہیں۔ ان میں ایک خصوصی مقام ایک نورانی دریا اور ایک پہاڑی[1] کا تمثیلی مقام بھی واقع ہے۔ اس دریا کو بحر القیوم کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے۔ اس جگہ سے بھی آسمان اول کی طرف سیر ہوتی ہے۔ مگر یہ پرواز محسوس نہیں ہوتی بلکہ آنکھ کے جھپکنے کی ساعت محسوس ہوتی ہے۔ قدم اٹھا اور آسمان اول پر ڈالا۔ بس!

---

[1] یہ پہاڑی صفا و مروہ کی باطنی شکل ہے جسکی باری تعالیٰ خود تائید کرتا ہے۔ اِنَّ الصَّفَا وَالْمَرْوَةَ مِنْ شَعَائِرِ اللّٰهِ صفا اور مروہ اللہ کے شعائر میں سے ہے۔

آسمان اول: آسمان اول کی کیفیت مجسم نورانی ہے۔ایک وسیع نورانی ماحول۔اس میں لاتعداد ملائکہ مشاہدے میں آتے ہیں۔ان میں ملائکہ کا ایک سردار ہوتا ہے۔اس کا نام اسماعیل ہے۔اور یہاں کا ماحول باغات دریاؤں کی تمثیلی شکلوں میں بھی محسوس ہوتا ہے۔درحقیقت یہ تمام کیفیتیں مجسم نورانی ہیں۔انکے مشاہدے کی بھی یہی کیفیت ہے۔کہ جسقدر انسان میں قوت و استطاعت مشاہدہ کی ہو اسی قدر اصل و تمثیلی ہیئتوں میں مشاہدہ ہوتا ہے۔

اسی طرح پرواز کرتے ہوئے ایک آسمان دوسرے آسمان سے ملا ہوا (Vanish) جیسے ایک رنگ کے ساتھ دوسرے کو ملایا جائے تو دو رنگوں کی درمیانی حد [1] کو محسوس نہیں کیا جاتا۔یعنی آسمان اول کی نوری کیفیت سے جب آسمان دوم کی طرف سیر کی جائے تو اسی نور کی تیزی و تابانی میں رفتہ رفتہ تیزی آجاتی ہے۔اسی تیزی کے کمال میں آسمان دوم آتا ہے۔

آسمان دوم: آسمان دوم میں بھی ملائکہ نورانی پیکر کا وجود محسوس کیا جاتا ہے۔اس آسمان اور اسکی مخلوق کی حد علم میں نہیں آسکتی بلکہ ہر شخص جس مقام و سمت سے آسمانوں میں داخل ہوتا ہے۔وہی کیفیت اسکے علم میں آتی ہے۔اسکے علاوہ ایک عارف جسقدر اپنے حُب اور عمل میں مقبول ہو اسی قدر اسے مشاہدہ کرایا جاتا ہے۔اس آسمان میں بھی ایک فرشتہ تمام ملائکہ کا سردار مقرر ہے۔اس کا نام اسرافیل ہے۔یہاں کا ماحول بھی تمثیلی باغات۔دریا۔عظیم الشان عمارتوں میں محسوس ہوتا ہے۔

آسمان سوم: آسمان سوم کی کیفیت نوری میں بھی بے شمار ملائکہ ہیں۔انکا بھی ایک مقرب فرشتہ بکوُن سردار ہے۔حضرت عیسیٰؑ کا مقام بھی اسی آسمان پر ہے۔حضرت عیسیٰؑ اسی جسد مبارک میں آسمان سوئم میں مقیم ہیں۔جو جسد مبارک آپکا زمین پر تھا۔اور باقی پیغمبر مختلف آسمانوں میں روحانی جسم کے ساتھ مقیم ہیں۔قرآن کریم میں حضرت عیسیٰؑ کے متعلق کئی آیتیں نازل ہوئی ہیں۔جن میں آپکی پیدائش۔

---

[1] جیسے ایک سرد مقام سے انتہائی گرم مقام کی طرف سفر کیا جائے تو سرد مقام اور گرم مقام کے درمیان سردی گرمی کی کوئی معین حد محسوس نہیں ہوتی۔بلکہ رفتہ رفتہ سردی میں تبدیلی ہو کر گرمی آجاتی ہے۔

تبلیغ ۔معجزات ۔قتل کی آیتیں خصوصی ہیں ۔آپکی پیدائش کے متعلق سب سے پہلے وہ آیت ہے جس میں حضرت مریم علیہا السلام کواللہ تعالیٰ نے وحی کے ذریعہ آگاہ کیا یٰمَرْيَمُ إِنَّ اللّٰهَ اصْطَفٰكِ وَطَهَّرَكِ وَاصْطَفٰكِ عَلٰى نِسَآءِ الْعٰلَمِيْنَ ○ (پارہ ۳ سورۃ ۳ آیت ۴۲) اے مریم بلاشبہ اللہ تعالیٰ نے تم کو منتخب یعنی قبول فرمایا ہے اور پاک بنایا ہے اور تمام جہاں بھر کی عورتوں کے مقابلہ میں تم کو منتخب فرمایا ہے۔

- إِنَّ اللّٰهَ اصْطَفٰۤى اٰدَمَ وَنُوْحًا وَّ اٰلَ إِبْرٰهِيْمَ وَاٰلَ عِمْرٰنَ عَلَى الْعٰلَمِيْنَ ○[۱] تحقیق اللہ نے چن لیا (افضل ومقرب) آدم ۔نوح ۔آل ابراہیم اور آل عمران کو۔ دوسری آیت میں آل عمران کا خصوصی ذکر ہے۔

إِذْ قَالَتِ امْرَاَتُ عِمْرٰنَ رَبِّ إِنِّيْ نَذَرْتُ لَكَ مَا فِيْ بَطْنِيْ مُحَرَّرًا فَتَقَبَّلْ مِنِّيْ ج [۱] جب عمران کی بیوی نے کہا اے رب جو کچھ میرے شکم (بطن) میں ہے آزاد کر کے تیری نذر[۲] کروں گی۔ پس میری نذر قبول کر فَلَمَّا وَضَعَتْهَا قَالَتْ رَبِّ إِنِّيْ وَضَعْتُهَآ اُنْثٰى ط وَاللّٰهُ اَعْلَمُ بِمَا وَضَعَتْ ط وَلَيْسَ الذَّكَرُ كَالْاُنْثٰى ج وَإِنِّيْ سَمَّيْتُهَا مَرْيَمَ [۱] ۔پس جب لڑکی پیدا ہوئی تو کہنے لگیں (حسرت سے) اے پروردگار لڑکی پیدا ہوئی ۔اللہ جانتا تھا جو کچھ اس نے جنا (اللہ اسکی عظمت و بزرگی کو جانتا تھا) تو عمران کی بیوی نے کہا کہ (نذر میں راہب بننے کیلئے لڑکے دیئے جاتے ہیں) مرد عورت (راہب[۳]) کی طرح نہیں ہوسکتا اور میں اس لڑکی کا نام مریم رکھتی ہوں فَتَقَبَّلَهَا رَبُّهَا بِقَبُوْلٍ حَسَنٍ [۱]

---

[۱] پارہ ۳ سورۃ ۳ آیت ۳۳ ۔۳۵ ۔۳۶ ۔۳۷

[۲] اس وقت نذر کا یہ طریق تھا ۔کہ اولاد کو اللہ کی نذر میں کر کے ہیکل میں لاتے ۔اور اسے راہبوں کے سپرد کیا جاتا ۔انکی تربیت راہبانہ طریق پر ہوتی ۔آخر یہی راہب بنتے ۔ایسے بچوں کو روحانی تعلیم دی جاتی ۔اور انہیں ہیکل کے حجرہ میں رکھا جاتا ۔جہاں یہ تعلیم بھی سیکھتے اور تزکیہ مجاہدہ بھی کرتے۔

[۳] اس سے قبل یہود میں عورت کے راہبہ بننے کا رواج نہ تھا ۔یہی وجہ تھی ۔کہ عمران کی بیوی نے کہا کہ مرد کی جگہ عورت کیسے راہب بن سکتی ہے۔

پس اللہ نے بطریق احسن نذر میں قبول کیا۔ وَ کَفَّلَهَا زَكَرِيَّا [2]۔ اور ہیکل میں قبول ہونے کے بعد حضرت مریمؑ کی پرورش وتربیت حضرت زکریاؑ [3] کے سپرد کی گئی۔

حضرت عیسیٰؑ سے قبل یہودیوں کا مذہب موسوی مذہب تھا۔ حضرت موسیٰؑ کے بعد جتنے بھی پیغمبر آئے انہوں نے حضرت موسیٰؑ کے دین کی تبلیغ وتجدید کی۔ انکی عبادت گاہوں کو ہیکل کہا جاتا تھا۔ اس ہیکل میں منبر کے ساتھ ایک حجرہ (محراب) ہوتا تھا۔ جس میں راہب لوگ عبادت وتزکیہ نفس کیا کرتے۔ اور اکثر وقت خلوت اور مراقبہ میں گزارتے۔ یہ سنت حضرت موسیٰ علیہ السلام کی تھی۔ جب آپکو توراۃ ملی تو آپکو چالیس یوم خلوت کا حکم ملا چنانچہ آپ چالیس یوم خلوت ومراقبہ میں رہے۔ اسی تزکیہ کے عالم میں آپکو وحی کے ذریعہ تورات دی گئی ــــ اسی سنت کے مطابق یہود ہیکل میں کشف

---

[1] نذر۔ جب عمران کی بیوی نے لڑکی پائی تو اسے چونکہ نذر مان چکی تھی حضرت مریمؑ کو ہیکل میں لائی۔ تو اللہ تعالیٰ نے اسے قبول کیا۔ اس زمانہ میں چونکہ پے درپے پیغمبر آتے۔ اور حضرت مریمؑ کے زمانہ میں بھی پیغمبر موجود تھے۔ اور اس زمانہ میں اللہ کی وحی علی الاعلان ظاہر ہوتی۔ جیسے حضرت ابراہیمؑ کے پاس فرشتوں کا آنا۔ حضرت لوطؑ کے پاس فرشتوں کا آنا اور ہر شخص کا دیکھنا۔ بنی اسرائیل پر بادلوں کا سایہ ہونا۔ من وسلویٰ کا نازل ہونا۔ حضرت عیسیٰؑ کے پیروؤں کیلئے آسمان سے رزق نازل ہونا وغیرہ ایسے مافوق الفطرت واقعات ظاہر طور واقع ہوتے اسی طرح ہیکلوں میں نذر قبول ہونے کے وقت اللہ تعالیٰ کی طرف سے قبولیت کے اظہار کیلئے بھی ایک نشان ہوتا۔ یہ یا تو فرشتہ کے ذریعہ اطلاع دی جاتی۔ یا ہیکل کے بزرگ راہب کو القا کیا جاتا جو نذر کو لے لیتا۔ یہی کیفیت حضرت مریمؑ کی نذر میں ہوئی۔

[2] پارہ ۳ سورۃ ۳ آیت ۳۷

[3] حضرت مریمؑ کے سپرد ہونے کے بعد آپکے پرورش کنندہ کا انتخاب ضروری تھا اسلئے ہیکل کے سربراہوں نے مجلس قائم کر کے ایک کفیل مقرر کرنے کیلئے قلم پھینکے۔ (قرعہ اندازی ہوئی) چنانچہ اس قرعہ اندازی میں بہ تائید ایزدی حضرت زکریاؑ کا نام آیا ذٰلِكَ مِنْ أَنْبَاءِ الْغَيْبِ نُوحِيهِ إِلَيْكَ ۚ وَمَا كُنْتَ لَدَيْهِمْ إِذْ يُلْقُونَ أَقْلَامَهُمْ أَيُّهُمْ يَكْفُلُ مَرْيَمَ ص (پارہ ۳ سورۃ ۳ آیت ۴۴) ۔ اے محمدؐ یہ خبریں علم غیب سے تعلق رکھتی ہیں۔ جو آپکی طرف وحی کی گئیں۔ آپ اسوقت انکے پاس (ہیکل کے سربراہوں راہبوں کے پاس) نہ تھے۔ جب وہ حضرت مریمؑ کے کفیل کیلئے قلمیں پھینک کر قرعہ اندازی کر رہے تھے۔ اسکے بعد حضرت مریمؑ کو حضرت زکریاؑ کی کفالت میں دیگر ہیکل کے حجرہ میں رکھا گیا۔ جو باہر سے مقفل ہوتا۔

والہام حاصل کرنے کیلئے حجرہ میں خلوت گزیں رہتے۔

حضرت مریم علیہا السلام کی پیدائش پر حضرت زکریاؑ کو آپ کا کفیل و سرپرست مقرر کیا گیا۔ اور انہیں اسی حجرہ میں بمطابق حکم الٰہی خلوت نشین رکھا گیا۔ آپ کو کوئی غذا نہ دی جاتی۔ جب حضرت زکریاؑ حضرت مریم علیہا السلام کے پاس آئے تو آپ کے پاس قسم قسم کے پھل پائے تو پوچھا یہ پھل کہاں سے آئے۔ تو آپ نے جواب دیا کہ یہ اللہ کی طرف سے عطا کئے گئے۔ كُلَّمَا دَخَلَ عَلَيْهَا زَكَرِيَّا الْمِحْرَابَ لا وَجَدَ عِنْدَهَا رِزْقًاج قَالَ يٰمَرْيَمُ اَنّٰى لَكِ هٰذَاط قَالَتْ هُوَ مِنْ عِنْدِ اللّٰهِط اِنَّ اللّٰهَ يَرْزُقُ مَنْ يَّشَآءُ بِغَيْرِ حِسَابٍ ○ (پارہ ۳ سورۃ ۳ آیت ۳۷) جب حضرت زکریاؑ ہیکل کے حجرہ میں داخل ہوئے۔ جہاں حضرت مریمؑ معتکف تھیں تو وہاں رزق پایا۔ تو کہا اے مریم یہ کہاں سے آیا۔ تو حضرت مریمؑ نے جواب دیا۔ یہ اللہ کی طرف سے ہے اور اللہ جسکو چاہتا ہے۔ رزق دیتا ہے۔

اس طرح حضرت مریمؑ کی پرورش اور تربیت ایک پیغمبر کے ذریعہ ہوئی۔ اور آپ کو کوئی مادی غذا میسّر نہ ہوئی بلکہ اللہ نے آپکی غذا نور پر رکھی یہ تمام پھل جنہیں حاصل کرنے کیلئے کوئی مادی ذریعہ موجود نہ تھا یہ اللہ کی طرف سے نوری غذا تھی۔ کیونکہ اللہ نے کہا کہ وَاللّٰهُ اَعْلَمُ بِمَا وَضَعَتْ اللہ جانتا ہے۔ کہ جس لڑکی کے پیدا ہونے پر عمران کی بیوی راضی نہ تھی کہ لڑکے کو نذر دیتی۔ اللہ جانتا تھا کہ وہ لڑکی ایک منتخب لڑکی تھی۔ جسے مجسم نور کی حالت میں رکھ کر ایک نور کا پیدا کرنا ہے۔

اس تزکیہ و مجاہدہ اور روحانی غذا کا یہ لازمی نتیجہ تھا۔ کہ حضرت مریمؑ براہ راست فرشتوں کی باتیں سنتیں اور فرشتے انکے پاس آتے وَاِذْ قَالَتِ الْمَلٰٓئِكَةُ يٰمَرْيَمُ اِنَّ اللّٰهَ اصْطَفٰكِ وَطَهَّرَكِ وَاصْطَفٰكِ عَلٰى نِسَآءِ الْعٰلَمِيْنَ ○ اور جب کہا فرشتہ نے (مریم کے پاس آ کر) اے مریم اللہ نے تجھے دنیا کی تمام عورتوں میں منتخب کرلیا ہے۔ اور (تمام مادی آلائشوں سے) تجھے پاک بنا دیا ہے ـــــ تیری مثال دنیا کی عورتوں جیسی نہیں۔ بلکہ تو مجسم نور ہے۔ اسلئے اپنے نوری وجود کو برقرار رکھنے کیلئے يٰمَرْيَمُ اقْنُتِىْ لِرَبِّكِ وَاسْجُدِىْ وَارْكَعِىْ مَعَ الرّٰكِعِيْنَ ○ (پارہ ۳ سورۃ ۳ آیت ۴۳) اب تو اپنے رب کی خشوع و خضوع اور حضور قلب سے

عبادت کر سجدہ[1] کر اور رکوع کر ــــــ اس رکوع و سجود کا یہ نتیجہ ہوا کہ حضرت مریمؑ اس مقام پر پہنچیں جہاں آپ سے ایک نور کا پیدا ہونا مقصود تھا۔ چنانچہ اس واقعہ کی تفصیل سورہ مریم پارہ ۱۶ میں ہے۔

وَاذْكُرْ فِي الْكِتٰبِ مَرْيَمَ ۘ اِذِ انْتَبَذَتْ مِنْ اَهْلِهَا مَكَانًا شَرْقِيًّا ۙ ۔ فَاَرْسَلْنَآ اِلَيْهَا رُوْحَنَا فَتَمَثَّلَ لَهَا بَشَرًا سَوِيًّا ۝ ۔ قَالَ اِنَّمَآ اَنَا رَسُوْلُ رَبِّكِ ۖ لِاَهَبَ لَكِ غُلٰمًا زَكِيًّا ۝ (پارہ ۱۶ سورة ۱۹ آیت ۱۶۔۱۷۔۱۹) اور ذکر کر حضرت مریمؑ کا جب انہیں (ہیکل کے) مشرقی مکان میں علیحدہ رکھا گیا۔ پس بھیجا ہم نے مریم کی طرف اپنی روح (فرشتہ) پس وہ فرشتہ مریم کیلئے ایک بشر کی صورت میں ہوا۔ کہا میں فرشتہ ہوں۔ تا کہ میں تمہیں ایک مزکی (پاک) لڑکا دوں۔

فَنَفَخْنَا فِيْهِ مِنْ رُّوْحِنَا وَصَدَّقَتْ بِكَلِمٰتِ رَبِّهَا وَكُتُبِهٖ وَكَانَتْ مِنَ الْقٰنِتِيْنَ ۝ع

(پارہ ۲۸ سورة ٦٦ آیت ۱۲) پس پھونکا ہم نے بیچ اُس کے رُوح اپنی کو اور انہوں نے اپنے پروردگار کے پیغاموں کو (جو ان کو ملائکہ کے ذریعے پہنچے تھے) اور اسکی کتابوں کی تصدیق کی اور وہ تھیں فرمانبرداروں سے۔

یہ امر مسلمہ ہے۔ کہ انسان کا وجود مادہ سے بنا ہے۔ اسکے وجود میں بھی اشرف المخلوقات ہونے کی حیثیت سے تمام مادی (اور لطیف) قوتوں کا جوہر ہے۔ اسکے خاکی اور مادی ہونے کا سبب مادیت سے وجود حاصل کرنے کی وجہ سے ہے۔ انسان کے وجود کی ابتداء باپ کے نُطفہ (لطیف مادی جوہر) سے ہوتی ہے۔ ماں کے رحم میں اسکی نشوونما خون (مادی جوہر) سے ہوتی ہے۔ پیدائش کے بعد بھی اسکی نشوونما غذا (مادی جوہر) سے ہوتی ہے۔ انسان کے ابتدائی نطفہ کی ہیئت ایک ذرہ کی ہوتی ہے۔ یہ ذرہ لطیف ہیئت میں ہوتا ہے۔ اگر اس ذرہ کو مادی غذا حاصل نہ ہو۔ تو اسکی نشوونما کا جاری رہنا ناممکن ہے۔ اور اگر اس حالت میں جبکہ ایک نُطفہ (ذرہ) کو مادی غذا بھی حاصل نہ ہو اور اسکی ارتقائی کیفیت بدستور جاری رہے۔ تو اسکا مطلب یہ ہے۔ کہ اس میں قوت لطیف ہے۔ اگر اسے غذا

---

[1] یہود کی عبادت رکوع اور سجود ہی تھی۔

میسر ہو تو یہ غذا بھی لطیف ہی ہو گی۔

اور جس وجود کو اپنی ابتدائی زندگی سے مادی غذا حاصل نہ ہو اور اسکی نشو و ارتقا بھی ہوتی رہے۔ تو یہ وجود مجسم لطیف (نورانی) ہو گا۔ جب اس وجود سے کسی پیدائش کا آغاز ہو۔ تو اس پیدائش میں سوائے نور کے مادیت کا ایک ذرہ بھی نہیں ہو سکتا۔

یہی کیفیت نوری حضرت مریمؑ کے جسدِ مقدس کی تھی۔ اس وجود کا ہر ذرہ ایک مقدس نور تھا۔ اور اسی بنیاد سے حضرت عیسیٰؑ کے وجود کی نشو و نما مقصود تھی۔

اِذْ قَالَتِ الْمَلٰٓئِكَةُ يٰمَرْيَمُ اِنَّ اللّٰهَ يُبَشِّرُكِ بِكَلِمَةٍ مِّنْهُ ۖ اسْمُهُ الْمَسِيْحُ عِيْسَى ابْنُ مَرْيَمَ [1] اور جب فرشتہ نے حضرت مریمؑ سے کہا۔ اے مریم اللہ تجھے بشارت دیتا ہے۔ کہ تجھ میں اسکی طرف سے ایک نیا نشان خالقیت ظاہر ہو گا۔ یعنی بغیر باپ کے ایک لڑکا ہو گا۔ اسکا نام مسیح۔ عیسیٰ۔ بیٹا مریم کا ہو گا ـــــــ اسکی افضلیت اور خصوصیت کے یہ نشان ہو نگے۔ کہ وہ بھی ایک مجسم نور ہو گا۔ اسکی دلیل یہ ہے کہ وہ فوق الفطرت وَيُكَلِّمُ النَّاسَ فِى الْمَهْدِ وَكَهْلًا وَّمِنَ الصّٰلِحِيْنَ ○ [2] گود میں شیر خوار ہونے کے باوجود وہ لوگوں سے بات کریگا۔ اور وہ صالحوں میں سے ہو گا ـــــــ حضرت مریمؑ کیلئے فطری طور یہ خبر ما فوق الفطرت تھی انہیں ابھی اس کیفیت کا علم نہ تھا۔ کہ بغیر سبب کے ایک کیفیت کیسے وجود میں آسکتی ہے۔ تو آپ نے کہا قَالَتْ رَبِّ اَنّٰى يَكُوْنُ لِىْ وَلَدٌ وَّلَمْ يَمْسَسْنِىْ بَشَرٌ ؕ [3] اے میرے رب میرے ہاں کیسے بچہ ہو سکتا ہے۔ جبکہ مجھے کسی بشر نے چھوا تک نہیں؟ قَالَ كَذٰلِكِ اللّٰهُ يَخْلُقُ مَا يَشَآءُ ؕ اِذَا قَضٰٓى اَمْرًا فَاِنَّمَا يَقُوْلُ لَهٗ كُنْ فَيَكُوْنُ ○ [4] کہا اس طرح تیرا اللہ پیدا کرتا ہے۔ جو چاہتا ہے۔ جب وہ کسی شے کے بنانے کا ارادہ کرتا ہے پس وہ اس شے کیلئے کہتا ہے ''ہو جا'' پس وہ ہو جاتی ہے۔

قوانین فطرت کا یہ تقاضا ہے۔ کہ ہر شے کی تخلیق (پیدائش) اسباب و علل کے تحت خود بخود ہوتی جا رہی ہے۔ خالق نے ہر سبب (علت) میں ایک معلول کا وجود قائم کر دیا ہے۔ بالفاظ دیگر۔ یہ

---

[1] پارہ ۳ سورۃ ۳ آیت ۴۵ [2،3،4] پارہ ۳ سورۃ ۳ آیت ۴۶، ۴۷

تمامی علت و معلول کی کیفیتیں فطری طور اس ابتدائی وجود میں موجود تھیں۔ جسکے لیے ازل میں اللہ تعالیٰ نے اپنے ارادہٗ ازلی کی تکمیل میں ایک کیفیت کو کن کے حکم سے اپنے نور احد ولا انتہا میں سے پیدا کیا۔ اسکی مثال ایک دانہ کی سی تھی جس میں درخت کی ہر کیفیت سمائی ہوئی تھی۔ اب زمانہ کی رفتار کے ساتھ ہر شے اپنے وقت اپنے محل پر ظاہر ہوتی جا رہی ہے۔ یہ کارگاہ حیات کی ایک منضبط ترکیب ہے جسکے لیے اب ''کن'' کہنے کی ضرورت نہیں۔ مزید برآں اس کائنات میں ایسے مافوق الفطرۃ واقعات کا ظہور بھی ہوا ہے۔ جسکا تعلق بظاہر اس فطری ترکیب تخلیق سے نہیں۔ جیسے گزشتہ قوموں میں تباہی کے آثار کا پایا جانا۔ مثلاً زمین سے خلاف عقل پانی ابلنا۔ آسمان سے پانی برسنا۔ بادلوں کا سایہ پیدا ہونا۔ من وسلویٰ کا نازل ہونا۔ یا ایسے غیر عقلی واقعات کا ہونا جنکے لیے اسباب وعلل نہیں پائے جاتے ہیں۔ یہ واقعات قدرتِ کاملہ۔ قوتِ الٰہی سے تعبیر دیئے جاتے ہیں۔ یہ ایسے واقعات ہیں جو عقل میں نہیں آتے۔ بلکہ شعور سے تعلق رکھتے ہیں جیسے آیت اَفَاَمِنَ الَّذِیۡنَ مَکَرُوا السَّیِّاٰتِ اَنۡ یَّخۡسِفَ اللّٰہُ بِہِمُ الۡاَرۡضَ اَوۡ یَاۡتِیَہُمُ الۡعَذَابُ مِنۡ حَیۡثُ لَا یَشۡعُرُوۡنَ ۙ (پارہ ۱۴ سورۃ ۱۶ آیت ۴۵) کیا ہیں وہ لوگ بے خوف ہو گئے۔ جو مکر کرتے ہیں برائیوں میں یہ کہ دھنسا دیوے ظاہری۔ ساتھ انکے زمین کو یا آئے عذاب ان پر اس جگہ سے جس کا وہ شعور نہیں رکھتے۔

یہ واقعات چونکہ اسباب کے احاطہ میں نہیں ہوتے ہیں۔ اسلئے ایسے واقعات کیلئے اللہ تعالیٰ ہر وقت حکم کن استعمال کرتا ہے۔ یہ واقعات کن سے ہی پیدا ہوتے ہیں۔ گو بظاہر ان کے اسباب معلوم نہیں ہوتے ہیں باطن میں انکے اسباب موجود ہوتے ہیں۔ وہ اسباب نوری روحانی ہوتے ہیں۔ اور کن میں یہی اسباب نوری۔ کن کے ذریعہٗ مادی ہیئت اختیار کرتے ہیں۔ اسلئے آیت میں یَشۡعُرُوۡنَ کا لفظ استعمال کیا گیا ہے۔ کہ ان اسباب کو تعقل سے دیکھا نہیں جا سکتا بلکہ شعور سے دیکھا جاتا ہے۔ اسی طرح حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی پیدائش بھی ان اسباب وعلل سے خالی ہے۔ جو عقل کے ذریعہ پہچانے جاتے ہیں۔ یہ تخلیق کی ایک فطری ترکیب ہے۔ کہ بچہ بغیر باپ کے نُطفہ کے پیدا نہیں ہو سکتا۔ اگر ہو تو اسکا مطلب یہ ہے۔ کہ یہ بظاہر غیر فطری واقع ہے۔ جسکا تعلق اس فطری نظام کائنات

سے نہیں ـــــ اس واقعہ کا ہونا۔ قدرتِ کاملہ سے ہی ہوتا ہے۔ اسی واقعہ میں کن کا حکم صادر ہوتا ہے۔ کَذٰ لِكِ اللّٰهُ يَخْلُقُ مَا يَشَآءُ ط اسطرح اللہ پیدا کرسکتا ہے۔ اگر وہ چاہے اِذَاقَضٰی اَمْرًا فَاِنَّمَا يَقُوْلُ لَهٗ كُنْ فَيَكُوْنُ ○ اور جب وہ کسی شے کے بنانے کا ارادہ کرے۔ تو بغیر اسباب کے وہ صرف اس شے کے لئے کن کہتا ہے۔ تو اسکا وجود ظاہر ہو جاتا ہے۔ اور اس وجود کی ہیئت بھی اسی ہیئت میں آجاتی ہے۔ جسکے لیے سبب کا ہونا ضروری ہے۔ کن کہنے سے یہ کیفیت کیسے پیدا ہوتی ہے۔ اسکے لیے اللہ نے ایک روحانی سبب بھی قائم کیا ہے۔ جو غیر عقلی (شعوری) ہے۔ اللہ کا کوئی فعل غیر مترتب نہیں بلکہ ہر شے ایک قانون کے تحت ہوتی ہے۔ چنانچہ حضرت عیسٰی علیہ السلام کی پیدائش میں یہ تمام کیفیتیں پائی جاتی ہیں۔ اسی لئے اللہ تعالیٰ نے حضرت عیسٰی علیہ السلام کی پیدائش کا حقیقی (شعوری) نقشہ بھی بتادیا۔ اِنَّ مَثَلَ عِيْسٰى عِنْدَ اللّٰهِ كَمَثَلِ اٰدَمَ ط خَلَقَهٗ مِنْ تُرَابٍ ثُمَّ قَالَ لَهٗ كُنْ فَيَكُوْنُ ○ (پارہ ۳ سورۃ ۳ آیت ۵۹) یعنی حضرت عیسٰیؑ کی مثال بھی مانند مثال حضرت آدمؑ کی ہے۔ کہ انہیں مٹی سے بنایا۔ پھر کہا ہو جا پس وہ (حضرت آدمؑ) ہو گیا۔ یہاں حضرت آدمؑ کی ابتداء بھی بغیر باپ کے ہوئی جنکے لیے (باپ کے) نُطفہ کا کوئی وجود نہیں تھا۔ پھر انکی پیدائشی کیفیت کو اسی کیفیت میں ڈھالا۔ جس کیفیت میں باپ کے نطفہ کا ہونا ضروری ہے۔ اب حضرتِ آدمؑ کے بغیر باپ کے پیدا ہونے کیلئے اللہ تعالیٰ نے کونسی غیر عقلی (شعوری) ترکیب استعمال کی! وہ بھی ایک آئینی اور حقیقی ترکیب تھی۔ یعنی جب مادہ کا وجود نہ تھا ـــــ تو نار (آگ) تھی۔ جب نار کا وجود نہ تھا تو نور تھا۔ گویا ہر وجود سے قبل اسکی علّت اور معلول سے قوی قوت تھی جس میں معلول کا وجود موجود تھا۔ مگر قوی قوت میں۔ گویا ہر کیفیت کی انتہا پر ـــــ اور ہر کیفیت کی ابتداء پر۔ ایک ابتدائی ترکیب ایسی پائی جاتی ہے۔ جو بجائے خود نظامِ تخلیق میں نئی محسوس کی جاتی ہے۔ وہ یہ کہ نور سے نور بننے میں ایک ہی ترکیب ہوتی ہے۔ لیکن نور سے نار بننے میں اول کیفیت سے دوسری کیفیت پیدا ہونے میں ایک انوکھا پن ظاہر ہوتا ہے۔ اسی طرح نار سے لکھا ئے نار پیدا ہونے میں کوئی غیر مترتب ترکیب نہیں۔ لیکن نار سے خاکی (مادّہ) کیفیت بننے میں خود بخود انوکھی ترکیب ہو جاتی ہے جبکہ نار سے نار نہیں بلکہ مادہ بنتا

ہے۔اسی طرح حضرت آدمؑ کی تخلیق میں بھی باپ کے نُطفہ کا نہ ہونا ایک ایسی کیفیت کا ہونا ضروری ہے۔ جو اپنی ابتدا میں ایک ایسی کیفیت ہو جسکے لیے ایک حکم کی ضرورت ہے کہ وہ کیفیت (غیر عقلی طور) ایک نئی کیفیت میں آئے اور جب نئی کیفیت کا مسلسل اجرا ہوتا ہے تو اسکی ترکیب مسلسل اجرا کی صورتوں میں ایک قانونی اور فطری صورت اختیار کر جاتی ہے۔ کہ ہر بچہ بجائے بغیر باپ ہونے کے لازمی طور باپ کے نطفہ سے ہی پیدا ہوتا ہے۔اور یہ کیفیت اسقدر مستحکم ہو جاتی ہے۔ کہ باوجود ایک انسان کے بغیر باپ کے پیدا ہونے کے ـــــــ پھر بغیر باپ پیدا ہونے کو عقلی طور تسلیم نہیں کیا جاتا۔ایسی کیفیت کو ماوراء ادراک (شعوری) کہا جاتا ہے۔گویا غیرِ عقلی واقعات کا صادر ہونا غیر فطری نہیں بلکہ انکا بھی وجود ہوتا ہے لیکن یہ وجود حواس میں نہیں آتے۔اس سے معلوم ہوتا ہے۔ کہ صرف عقل کے احاطہ میں آنے والے واقعات ہی فطری نہیں بلکہ وہ واقعات جو اچانک غیر عقلی طریقہ پر ظاہر ہوں وہ بھی فطری واقعات میں شمار ہوتے ہیں۔صرف قبل از وقت ہمیں انکا وجود محسوس نہیں ہوتا۔قدرتِ کاملہ خود ان واقعات کو پیدا کر کے ظاہر کر دیتی ہے۔اور اسی کیفیت میں کُـن کا حکم صادر ہوتا ہے۔ کہ خالق ایک ان ہونی کیفیت کو وجود میں لاتا ہے اسی لئے حضرت عیسیٰؑ کی پیدائش کیلئے حضرت آدمؑ کی مثال دی گئی۔ کہ جیسے اللہ تعالیٰ نے ایک ان ہونی (غیر عقلی) بات کو یقینی (عقلی) کر دیا۔اسی طرح حضرت عیسیٰؑ کی پیدائش میں جبکہ اللہ تعالیٰ کے ارادہ میں حضرت عیسیٰؑ کی پیدائش تھی۔ اور اسی طریقہ پر تھی۔تو اسکے اسباب بھی بنائے اور اسکی ابتداء حضرت زکریاؑ کا قصہ بیان کرنے میں بتا دی کہ اِذْ نَادٰی رَبَّہٗ نِدَآءً خَفِیًّا ○ اِجب زکریاؑ نے اللہ کو دل سے پکارا۔قَالَ رَبِّ اِنِّیْ وَهَنَ الْعَظْمُ مِنِّیْ وَاشْتَعَلَ الرَّاْسُ شَیْبًا وَّلَمْ اَکُنْۢ بِدُعَآئِكَ رَبِّ شَقِیًّا○ ۲ اے رب میرے۔میرے بدن کے جوڑ کمزور ہو گئے اور سر بڑھاپے کی وجہ سے سفید ہو گیا۔میں اسوقت دعا مانگ رہا ہوں۔جبکہ مجھے علم ہے کہ اس حالت میں میرے پاس اسباب وعلل کا کوئی سامان نہیں یعنی بڑھاپے کی اس عمر میں ایک انسان کے اولاد نہیں ہو سکتی۔پر تیری قدرتِ کاملہ پر یہ ایمان ہے۔ کہ تو کن کے ذریعہ میری

۱، ۲ پارہ ۱۶ سورۃ ۱۹ آیت ۳۔۴

دعا کا نتیجہ پیدا کرسکتا ہے وَاِنِّیْ خِفْتُ الْمَوَالِیَ مِنْ وَّرَآءِ یْ وَ کَانَتِ امْرَاَتِیْ عَاقِرًا فَھَبْ لِیْ مِنْ لَّدُنْكَ وَلِیًّا ۝ ۱ میں اپنے بعد اقارب سے ڈرتا ہوں۔ اور میری بیوی بانجھ ہے۔ سو مجھے اپنی قدرت سے ایک لڑکا وارث عطا کر! تو اسکی دعا کے جواب میں اللہ تعالیٰ کہتا ہے (بذریعہ القایا مشاہدہ) یٰزَکَرِیَّآ اِنَّا نُبَشِّرُكَ بِغُلٰمِ نِ اسْمُهٗ یَحْیٰی ۲۔ اے زکریا تیری دعا میں نے قبول کرلی اب جبکہ تیرے پاس اسباب موجود نہیں میں قدرت کاملہ سے تجھے تیری بانجھ عورت سے ہی لڑکا دوں گا۔ اس کا نام یحییٰ ہے۔ حضرت زکریا نے اپنی تسلی اور عقلاً طور تسلیم کرنے کیلئے پھر سوال کیا۔ کہ اسکی کیا ترکیب ہے۔ جب کہ میری بیوی بانجھ ہے۔ قَالَ رَبِّ اَنّٰی یَکُوْنُ لِیْ غُلٰمٌ وَّ کَانَتِ امْرَاَتِیْ عَاقِرًا وَّ قَدْ بَلَغْتُ مِنَ الْکِبَرِ عِتِیًّا ۝ ۳ کہا اے رب میرے ہاں لڑکا کس طرح پیدا ہوگا جب کہ میری بیوی بانجھ ہے اور میں بوڑھا ہو چکا ہوں؟۔ اللہ نے کہا کَذٰلِكَ قَالَ رَبُّكَ ھُوَ عَلَیَّ ھَیِّنٌ وَّ قَدْ خَلَقْتُكَ مِنْ قَبْلُ وَلَمْ تَكُ شَیْئًا ۝ ۴ اسی طرح ہوگا (یعنی اس سے یہ راز پوشیدہ ہی رکھا کہ میں کس طرح بناتا ہوں) اس بارے میں اتنی ہی بات بتائی۔ کہ میرے لیے (خالق ہونے کی حیثیت سے) یہ چیز آسان ہے اور میں نے پہلے آدم کو بھی اسی طرح بنایا۔ کہ اسکے لیے بھی کوئی ظاہری سبب موجود نہ تھا۔ اسکے بعد ہی حضرت مریمؑ کا ذکر آتا ہے۔ اور حضرت مریمؑ کا کفیل اسی پیغمبر کو بنایا جاتا ہے۔ جو اس وجود کی پاکیزگی اور لطافت کا حامل اور اس کیفیت سے آگاہ ہے۔ اسی پیغمبر نے حضرت مریمؑ کی پرورش کی اور آپکا تزکیہ کیا۔

حضرت مریمؑ کو شرقی مکان (ہیکل) میں رکھا گیا جہاں اسے کوئی مادی غذا میسر نہ تھی گویا۔ پیدا ہونے کے ساتھ ہی اسے نذر کیا گیا۔۔۔۔ اور آپکی بلوغت تک آپکی تربیت اور آپکا مقام خلوت کدہ میں ہی ہوا۔ اسکا نتیجہ یہ ضروری تھا۔ کہ حضرت مریمؑ کا وجود مقدس مجسم نور ہوتا۔ اور اسی وجود سے حضرت عیسیٰؑ کی غذا میسر ہونی تھی۔ سو ایک وقت مقررہ پہ اللہ تعالیٰ نے حضرت عیسیٰؑ کیلئے ایک منتخب کردہ روح (نور) فرشتہ (جبرئیل) کے ذریعہ حضرت مریمؑ کی طرف بھیجا۔ اور حضرت جبرائیل علیہ السلام نے اپنے نوری اوصاف کے ذریعہ یہ نور حضرت مریمؑ میں پھونکا۔ اور یہ نور (ایک ذرہ نور)

۱،۲،۳،۴ پارہ ۱۶ سورۃ ۱۹ آیت ۵، ۷، ۸، ۹

بطن حضرت مریمؑ میں مقیم ہوا تو اللہ تعالیٰ نے حکم دیا کُن تو اس نور[1] نے انسانی خاصیتوں میں آنے کی خاصیت پالی۔ اور یہ نور بطن مادر میں انسانی ہیئت میں رفتہ رفتہ (مثل بچہ کے) نو ماہ میں اپنے منازل طے کرتا ہوا ایک بچے کی شکل میں ظاہر ہوا۔ قرآنی عقائد میں یہ مبالغہ نہیں۔ کیونکہ اس سے قبل دو دلیلیں موجود ہیں۔ کہ ایک بانجھ اور بوڑھے کے بھی لڑکا ہوسکتا ہے۔ دوسرے نور بھی انسانی ہیئت میں آسکتا ہے کیونکہ اسکی شہادت فرشتہ کے حضرت مریمؑ کے سامنے آنے سے ہوتی ہے کہ فَاَرْسَلْنَآ اِلَيْهَا رُوْحَنَا فَتَمَثَّلَ لَهَا بَشَرًا سَوِيًّا ○ (پارہ ۱۶ سورۃ ۱۹ آیت ۱۷) یہاں بھیجی ہوئی روح فرشتہ ہے۔ اسے روح نورانی پیکر کی وجہ سے کہا گیا۔ اس نے حضرت مریمؑ کے سامنے شکل انسانی اختیار کی۔ اسلئے ثابت ہوتا ہے۔ کہ فرشتہ (نور) انسانی حالت میں آسکتا ہے۔ لیکن جب تک اسکی اصل مادہ سے ملوث نہ ہو۔ اسکی شکل انسانی کے باوجود یہ مادی نہیں بلکہ مجسم نورانی ہوتا ہے۔ اور اگر اسے مادی غذا بھی حاصل ہو۔ تو بھی جب اسکی مادیت کا تزکیہ ہو۔ تو بظاہر اسکے خواص انسانی نظر آتے ہیں۔ لیکن اس کا بنیادی وجود اور اسکی لطیف قوتیں مجسم نورانی ہوں گی۔ ایسی حالت میں ایک جسم آسمانِ سوئم پر بھی رہ سکتا ہے۔ اور ایک جسم اللہ کی ذات سے اپنی جسمانی حالت میں بھی پہنچ سکتا ہے۔ چونکہ حضرت عیسیٰؑ مجسم نور ہیں اسلئے انکا مقام آسمان سوئم میں اسی وجود کے ساتھ ہے جو آپکا وجود پیغمبری زمانہ میں بیت المقدس میں تھا۔ گویا حضرت عیسیٰؑ ابھی زندہ ہیں۔

چونکہ قدرت نے ہر مخلوق کے لیے اَلْاَرْض میں ایک معین وقت تک رہ کر نقل مکانی (موت) مقرر کر رکھی ہے۔ اسلئے لازمی طور حضرت عیسیٰؑ کیلئے بھی اس کیفیت کا پانا لازمی ہے۔ جو تمام مخلوق کے لیے مقرر کی گئی ہے۔ اس وعدہ کو پورا کرنے کیلئے یہ ضروری ہے۔ کہ ایک وقت حضرت

---

[1] یہی وجہ تھی کہ حضرت عیسیٰؑ پھونک (دم یا توجہ) سے بیماروں کو درست کرتے۔ فطری تخلیق کا یہ لازمہ ہے۔ کہ قوی نور مادہ کو اپنے میں جذب کر کے فنا کر دیتا ہے۔ اسلئے مریض جراثیم نور کے اثر سے فنا ہو جاتے۔ اور مردہ پرندوں۔ جسم میں یہی نور دوبارہ خون بن کر حرکت میں آجاتا۔

عیسیٰؑ دنیا پر آ کر اس کیفیت کو حاصل کرلیں۔اب رہا سوال یہ کہ حضرت عیسیٰؑ کو آسمان سوئم میں رکھنا کس غرض سے تھا؟ ـــــ وہ اسلئے کہ حضرت عیسیٰؑ کی پیدائش۔اور آپ جیسا شرف کسی بشر کسی پیغمبر کو حاصل نہیں تھا۔مزید برآں آپ صرف مخصوص بنی اسرائیل قوم کے لیے نبی بن کر آئے تھے۔لیکن ابھی کلی طور زمانہ میں انسان کے شرف انسانیت کی تکمیل نہیں ہوئی تھی۔اور ابھی ایک ایسے نبی کی ضرورت تھی۔جو عالمگیر حیثیت میں ایک راہنما ایک پیغمبر بن کر آئے۔اور یہ مقام حضور علیہ الصلوۃ والسلام کیلئے ہی مقرر تھا۔ایک عالمگیر پیغمبر کیلئے۔اسکی افضلیت۔اسکی عظمت۔اور اسکی نبوت (رسالت) کی تکمیل کیلئے یہ ضروری تھا۔کہ وہ سب انبیاء سے افضل ہو۔اور افضل ہونے کی حیثیت سے حضرت عیسیٰؑ کی افضلیت کے مقابلہ میں ایک آخرالزمان نبی کی افضلیت اسکی نبوۃ کے اعتبار سے مقدم ہو۔اسلئے حضور علیہ الصلوۃ والسلام کی افضلیت کا اظہار کرنا مقصود تھا۔چنانچہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پیغمبر آخرالزماں بن کر آئے۔آپ کو محمد کہا گیا۔یعنی بدرجہ اتم خوبیوں والا۔

حُسن یوسف دمِ عیسیٰ یدِ بیضا داری   آنچہ خوباں ہمہ دارند تو تنہا داری

جس میں تمام انبیاء کی خوبیاں جمع تھیں۔حضرت عیسیٰؑ کا مقام آسمان سوئم میں ہی بجسد ہے۔لیکن اللہ تعالیٰ نے محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی عظمت کو اس فضیلت سے بھی زیادہ ارفع کردیا۔کہ آپکو بجسدا[1] اپنی ذات تک پہنچایا ـــــ اور دوسری وجہ فضیلت یہ قرار پائی باقی رکھی گئی۔کہ حضرت عیسیٰؑ کے باوجود نورانی پیکر ہونے کے اللہ تعالیٰ نے انہیں خود دشمنوں کے ہاتھ سے بچا کر انہیں تطہیر سے بچا کر آسمان سوئم پر اٹھا

---

[1] اب اس امر کی دلیل کی ضرورت نہیں کہ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کا جسد مبارک کیسے پہنچا۔کیونکہ حضرت عیسیٰؑ کی روح کی طرح آپؐ کا مخصوص نور بھی آدمؑ سے لے کر حضرت عبداللہؓ تک منتقل ہوتا رہا اور یہی نور بطن عالی میں شکل بشرا اختیار کرگیا یہی وجہ تھی کہ آپکی انگلیوں سے پانی جاری ہوتا۔سوکھے درخت میں جان پائی گئی (دیکھئے آپؐ کے معجزات) فرق صرف یہ ہے کہ حضورؐ کا نور آدمؑ سے لے کر حضرت عبداللہ تک منتقل ہوتا رہا۔ اور حضرت عیسیٰؑ کا نور خزانہ الٰہی میں رکھا گیا۔اس کا انتقال نہیں ہوا۔

ُلیا۔ یعنی یہودیوں نے حضرت عیسیٰؑ کو قتل کرنے کی کوشش کی مگر وہ کامیاب نہ ہوسکے۔ وَمَاقَتَلُوْہُ وَمَا صَلَبُوْہُ وَلٰکِنْ شُبِّہَ (پارہ ۶ سورۃ ۴ آیت ۱۵۷)۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو یہودی قتل نہیں کرسکے بلکہ وہ اس بارے میں شبہ میں پڑ گئے ـــــ بَلْ رَّفَعَہُ اللّٰہُ ۔ بلکہ آسمان پر اٹھالیا (رفع) برعکس اسکے۔ لیکن حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کے زمانہ میں۔ یہوداا ور پسطوس اور پلاطوس سے بڑھ کر ہرقل قیصر روم ۔خسرو پرویز کسریٰ ایران کی باجبروت حکومتیں تھیں۔ اور ایک یتیم تن واحد ہستی نے ان سب قوتوں کو فنا کردیا۔ مگر کسی شخص کی یہ جرات نہ ہوسکی کہ حضورؐ کی طرف انگلی سے بھی اشارہ کرسکے۔

حضرت عیسیٰؑ کے لیے طبعی موت واقع ہونے کیلئے دوبارہ دنیا میں نازل ہونے کا وقت مقرر کیا گیا۔ وہ وقت وہ مقرر کیا جس وقت کائنات پر محمد رسول اللہ کی شانِ محمدیؐ طاری ہوچکی ہوگی۔ اور اسوقت کوئی پیغمبر ایسا نہ پایا جائے گا جو آپؐ کی شان ارفع کے مقابل کوئی خصوصیت حاصل کرسکے۔ اور اس وقت حضرت عیسیٰؑ کی شان اَلْعُلَمَاءُ اُمَّتِیْ کَاَنْبِیَآءِ بَنِیْ اِسْرَائِیْلَ جیسی محسوس ہوگی۔ کہ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کی امت کا ایک عالم زمانہ کو اسکی شر وانحراف سے اتنا پاک کرے گا کہ چند حواریوں کے مقابلہ میں تمام عالم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حمد کرے گا۔ اس عالم کو مہدی کے خطاب سے پکارا جائیگا ـــــ اسوقت حضرت عیسیٰؑ کا نزول ہوگا۔ چونکہ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کے بعد نہ کوئی نبی ہوگا نہ کسی مذہب (خواہ وہ یہودی ہوں۔ یا عیسائی (نصاریٰ) خواہ بدھ ہوں۔ خواہ کافر ہوں) کو کسی پیغمبر کے نازل ہونے کا قطعاً گمان نہ ہوگا۔

حضرت عیسیٰؑ کی بعثت حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کے پونے چھ سو سال قبل ہوئی۔ اور حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کی بعثت سے قبل حضرت عیسیٰؑ کا نزول نہیں ہوا۔ اسلئے جبکہ حضرت عیسیٰؑ نے فطری طور موت حاصل کرنی ہے اسکے لیے لازمی طور آپکا نزول مابعد نبوت حضرت محمد رسول اللہؐ ہی ہوگا۔ اسلئے اسوقت شہنشاہیت محمد رسول اللہ کی ہی قائم ہوگی اور آپ بھی انبیاء بنی اسرائیل کی حیثیت سے علماءِ محمد رسول اللہؐ میں شامل ہوں گے۔ پیغمبر کے لحاظ سے آپ کی ذاتی خصوصیت پیغمبرانہ ہوگی۔ اور

دین کے لحاظ سے آپ شریعتِ محمدیؐ کے عامل ہوں گے۔ جیسے محمد رسول اللہؐ نے بھی وہی عمل کیا جو وحی سے حاصل کیا۔ اور وہی عمل آپکی امت نے من وعن کیا۔ راہنمایانہ حیثیت سے آپ پیغمبر آخرالزمان ہی ہیں۔ اور امت کی تقلید میں جو عمل مشترک ہوگیا۔ اس سے پیغمبر پیغمبر ہے۔ اور امت امت ہے۔ گویا دین کے اشتراک سے نہ پیغمبر میں فرق آسکتا ہے۔ نہ امت میں فرق آسکتا ہے۔ یہ اعتراض ہوسکتا ہے۔ کہ حضرت عیسیٰؑ پیغمبر کی حیثیت سے نازل ہوئے۔ اور پیغمبر کی حیثیت سے رہنا چاہیے۔ اور پیغمبر کی حیثیت سے ہی جانا چاہیے۔ دوسرے یہ کہ پیغمبر کی خصوصیت یہ ہوتی ہے کہ اسے براہ راست وحی کے ذریعہ شریعت حاصل ہوتی ہے۔ اور اسکی تابع ایک امت ہوتی ہے۔ مگر حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کے بعد حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی یہ حیثیت نہیں رہ سکتی۔ اول ایک پیغمبر کی مستقل شریعت کے بعد آپ پیغمبر کی حیثیت سے نہیں رہ سکتے پھر آپکی اپنی نہ شریعت ہوگی نہ امت ہوگی بلکہ آپکو بھی بجائے پیغمبر ہونے کے امت میں شمار ہونا ہوگا۔

ان اعتراضات پر بنیادی طور مطالعہ کرنا ضروری ہے۔

(۱) حضرت عیسیٰؑ صرف بنی اسرائیل پر ہی پیغمبر ہو کر آئے۔	(۱) حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام رحمۃ للعلمین اور کَآفَّةً لِّلنَّاسِ ہوکر آئے۔
(۲) حضرت عیسیٰؑ پر انجیل نازل ہوئی جس میں صرف قوم بنی اسرائیل کے لئے چند احکام تھے۔	(۲) حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام پر قرآن نازل ہوا۔ جو تمام عالموں کیلئے ہدایت وعرفان وعروج کا سرچشمہ بدرجہ اتم ہے۔
(۳) حضرت عیسیٰؑ کی امت بنی اسرائیل تھے۔	(۳) حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کی امت تمام مخلوق کائنات ہے۔
(۴) حضرت عیسیٰؑ کو بنی اسرائیل قوم کی پیغمبری اور کلمۃ اللہ کی فضیلت حاصل ہے۔	(۴) حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کو کائنات کی تمام قوتوں اور تمام انسانوں کی پیغمبری اور حبیب اللہ اور محمد و احمدؐ اور صاحب معراج ہونے

کی فضیلت حاصل ہے۔

(۵) حضرت عیسیٰؑ کو یا عیسیٰ ابن مریم کہہ کر پکارا اور آپکے لئے کوئی خصوصی اعلان نہیں ہوا۔

(۵) حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کے لیے یٰسین ۔ یَآ اَیُّهَا الْمُزَّمِّلُ ۔ یَآ اَیُّهَا الْمُدَّثِّرُ ۔ رَحْمَةً لِّلْعٰلَمِیْنَ ۔ رَءُوْفٌ رَّحِیْمٌ ۔ سِرَاجًا مُّنِیْرًا شَاهِدًا وَّ مُبَشِّرًا خَاتَمَ النَّبِیّٖنَ کے خطاب و القاب استعمال کئے گئے۔ آپؐ کے لیے اَکْمَلْتُ لَکُمْ دِیْنَکُمْ وَاَتْمَمْتُ عَلَیْکُمْ نِعْمَتِیْ ۔ سُبْحٰنَ الَّذِیْٓ اَسْرٰی۔ اِنَّ اللّٰهَ وَمَلٰٓئِکَتَهٗ یُصَلُّوْنَ عَلَی النَّبِیِّ ط یَآ اَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا صَلُّوْا عَلَیْهِ وَ سَلِّمُوْا تَسْلِیْمًا کا اعلان ہوا۔

اب ان فضائل کا موازنہ کرنے کے بعد انکے مادہ کا مطالعہ کر کے غور کیا جائے۔

(۱) کَآفَّةً لِّلنَّاسِ ۔ ایک عالمگیر انسانیت کی راہنمائی وجہ رفعت ہے۔ یا ایک مختصر قوم کی راہنمائی؟ پھر ایک کائنات کو شریعتِ قرآن کی تبلیغ سے انتہائی کمال تک پہنچانا افضل ہے یا چند کس کی راہنمائی میں ایک مخصوص قوم کو اتنا مکمل کرنا کہ ان میں چند ہی افراد کا صاحب علم ہونا۔ اسکے مقابل امتِ محمدی کا ایک فرد بھی انتہائی علم و کمال کا حامل ہوگا۔

(۲) شریعت قرآن کے مقابلہ میں۔ حضرت عیسیٰؑ کی شریعت کو کچھ تفوق حاصل نہیں۔ یہ بہتر ہے؟ کہ ایک مختصر شریعت کو قبول کیا جائے یا ایک عالمگیر شریعت کو قبول کیا جائے۔ شریعت کا قبول کرنا۔ یا حاصل ہونا وجہ فوقیت نہیں بلکہ شریعت کی وسعت اور نتیجۂ عمل کی وسعت وجہ تفوق ہوتی ہے۔ اسلئے مختصر شریعت کے مقابلہ میں وسیع شریعت کا حاصل کرنا باعث رفعت ہے۔ نہ کہ کمتری۔

(۳) محمد و احمدؐ کے مقابل کلمۃ اللہ ہونے میں تقابل ـــــ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کی شریعت و طریقت سے آپکی امت کا ایک فرد خلیفہ محمد رسول اللہ کی حیثیت سے ایک عالمگیر

امت کی ہدایت وعلم کا حامل ہوتا ہے۔اسکے مقابل انبیاء بنی اسرائیل بجائے خود مختصر قوموں کے راہنما تھے ـــــ باالفاظ دیگر تمام انبیائے سابقین اپنے علم وہدایت کے لحاظ سے اس مقام کو حاصل نہ کر سکے جو خلیفہ (شریعت وطریقت) محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو حاصل ہیں۔گویا انبیاء سابقین کی پیغمبری کا خاصا یہ تھا۔کہ وہ قوموں کیلئے ایک حقیقی راہ کیلئے ماحول قائم کر سکے۔مگر امتِ محمدیؐ کے علماء کائنات کے ہر انسان کے مقصود کی تکمیل بدرجہ اتم کرا سکتے ہیں۔

(۴) کسی پیغمبر کو محبوبیت کا وہ درجہ حاصل نہ ہوا۔جو حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کو حاصل ہوا اور سابقین انبیاء میں سے اکثر قومیں منحرف ہی رہیں۔لیکن حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کی امت میں ایسی ہستیاں ہر زمانہ میں موجود ہیں۔جو خود بھی مقصد کی تکمیل کر چکے اور اس علم کو برابر جاری رکھے ہوئے ہیں۔

(۵) سبحان الذی اسریٰ۔پھر عمل میں اشتراک اللہ۔ملائکہ اور امت کا ایک ہی عمل ـــــ یہ ایک محبوبیت کی خصوصیت ہے جو صرف امت محمد رسول اللہؐ کو ہی حاصل ہے۔

اس تقابل پر غور کرنے کے بعد یہ محسوس کرنا آسان ہے۔کہ ایک پیغمبر کو جبکہ اسکی پیغمبرانہ عظمت بھی برقرار ہے۔پھر اسکے شرف میں شریعت محمدیؐ کا عامل ہونا۔اور بھی مزید شرف کا باعث ہے۔

الغرض حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا نبوتِ محمد رسول اللہؐ میں نازل ہونا۔ایک پیغمبر کیلئے باعث عظمت ہے۔اور امت محمدیؐ کیلئے بھی ایک پیغمبر کا عالم کی حیثیت سے نازل ہونا باعثِ عظمت ہے۔یہ تمام عظمتیں مل کر حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کی انتہائی عظمت میں شامل کی گئی ہیں۔دنیا میں چند ہی ایسے انبیاء ہیں جنکے نقل مکانی کرنے کے بعد کسی نبی کا نشان (قبر) پایا جا سکتا ہے۔مگر محمد رسول اللہؐ کا نشان قیام قیامت تک باقی رہیگا۔اور حضرت عیسیٰؑ کے امت محمدیؐ میں نازل ہونے کی یہ ایک خصوصیت ہے کہ آپکا نشان بھی۔اسی مقصد کی تکمیل کی غرض سے آپکے زمانہ نزول تک قائم ہے۔اور آپکے نقل مکانی کے بعد بھی آپکی قبر روضہ مدینہ منورہ میں پیغمبرانہ حیثیت سے ایک طرف محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پہلو میں اور دوسری طرف علماءِ امت حضرت ابوبکر وحضرت عمر رضی اللہ عنہما کے ساتھ تا ابد قائم رہیگی۔اور آپکا وجود نوری اسی وجود نوری کے ساتھ ہوگا۔جو وجود نوری ازل سے ابد تک قائم رہیگا۔اور

آپکو بھی وہی زمین حاصل ہوگی جس میں حضور محمد رسول اللہ کا دربار خلافت ابدالآباد تک قائم رہیگا۔

آسمان چہارم: ہر آسمان کی کیفیت اسکے نچلے طبقہ (آسمان) سے قوی ہوتی ہے۔ کیونکہ ہر آسمان ایک دوسرے پر احاطہ کئے ہوئے ہے۔ آسمان اول۔ تمام سیاروں۔ ستاروں۔ چاند۔ سورج کا اپنی قوت کے اعتبار سے احاطہ کئے ہوئے ہے۔ اسلئے اِس قوت کا وسیع ہونا۔ خود ان اشیاء کی علت کا ہونا دلیل ہے۔ آسمان سوئم آسمان دوئم سے قوی ہے۔ اور آسمان دوئم پر احاطہ کئے ہوئے ہے۔ اِسی طرح آسمان سوئم اور اسکی کیفیتیں آسمان چہارم کی معلول ہیں اور آسمان چہارم سوئم سے قوی ہے۔ اسی طرح آسمان پنجم۔ ششم۔ ہفتم۔ کرسی اور عرش کی کیفیت ہے آسمان چہارم بھی نوری کیفیت میں ہے۔ اسکی مخلوق بھی نوری ہے۔ اس میں لاتعداد ملائکہ ہیں۔ اور اس آسمان پر حضرت موسیٰ علیہ السلام کا مقام ہے۔ ایک صاحبِ مشاہدہ ولی کی حضرت موسیٰؑ سے اسی مقام پر ملاقات ہوتی ہے۔

آسمانِ پنجم: میں بھی یہی کیفیت ہے۔ اور اس میں لاتعداد ملائکہ اور کیفیات نوری واقع ہیں ان میں ملائکہ کا ایک سردار ہے جسکا نام سقطائیل ہے۔

آسمان ششم: میں ملائکہ کے علاوہ۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام کا مقام ہے۔

آسمان ہفتم: میں بھی ملائکہ اور نوری کیفیات واقع ہیں۔ ان میں بھی ایک فرشتہ رویائیل نام ملائکہ کا سردار ہے۔

اسکے بعد کرسی۔ عرش واقع ہیں۔ عرش پر حضور علیہ الصلوۃ والسلام کا اجلاس ہے۔ جیسے روضہ مدینہ منورہ۔ بیت اللہ۔ تحت الثریٰ میں ہے۔ اسی طرح عرش پر بھی اجلاسِ محمدیؐ ہے۔ یہاں ایک نوری محل ہے۔ جسے بیت المعمور کہا جاتا ہے۔ اسی بیت المعمور کے مشابہ بیت اللہ بنایا گیا ہے۔ عرش کے بعد عالم جبروت[1] کا مقام شروع ہوتا ہے۔ اس مقام میں کئی مختلف کیفیتیں واقع ہیں جنکے مختلف نام ہیں۔ جن میں اصول الاصول۔ شیون۔ اظلال۔ عالم امر۔ اور آخر میں احدیتِ مجردہ۔ احدیت مجردہ کے معنی

---

[1] عالم جبروت ایک مقام ہے۔ جہاں پر صرف ملائکہ مقربین ہی مقیم ہو سکتے ہیں۔

خالص انوار الٰہی۔ مجرد نورِ احد یہاں پر عالم جبروت کا اختتام ہے۔ اسی مقام کی کیفیت حقیقت محمدیؐ سے تعبیر ہے۔ کیونکہ یہ مقام نور احد کی کیفیت لا انتہا کی کیفیات اور عالم جبروت کا سنگھم (دومیل) ہے۔ ذات احد کی لا انتہا کیفیت میں اسی مقام سے حقیقتاً اسکی تخلیق کی ابتداء ہوتی ہے ـــــ اور تخلیق کی ابتدا نور محمدیؐ سے ہوئی ہے۔ اسلئے یہاں پر نورِ محمدیؐ کی تخلیقِ ابتدائی کا سِرّ (راز) مشاہدہ میں آتا ہے۔ عالم جبروت سے لے کر عالمِ خلق (عالمِ ناسوت) تک جو کیفیتیں واقع ہیں ان تمام کیفیات پر احدیت مجردہ کا احاطہ ہےـــــ اسلئے احدیت کی تخلیق و معلول نور محمدیؐ ہے۔ اور نور محمدیؐ کا معلول۔ تمام کیفیاتِ خلق۔ از احدیت تا عالم ناسوت پایا جاتا ہے یہی نور محمدیؐ ہر کیفیت میں بنیادی نور کی حیثیت رکھتا ہے۔ اور یہی نور محمدیؐ ان تمام کیفیات کا احاطہ کئے ہوئے ہے۔ مثال کے طور اگر ذاتِ الٰہی سے تخلیق کی ابتدا ہوئی۔ تخلیق کی ترکیب اسطرح نہیں کہ علّت اپنی ہیٔت معلول میں منتشر کردے۔ نہیں۔ بلکہ ذاتِ احد لامحدود اور لا انتہا وسیع ہے۔ اسلئے اسکا معلول میں منتشر ہونا ناممکن ہے۔ البتہ تخلیق کا مقام ذات احد میں ایک نقطہ کی حیثیت سے ہے۔ جسکا مطلب یہ ہے۔ کہ نہ ذاتِ احد عدم ہوتا ہے۔ اور نہ تخلیق کے وجود سے اسکی حد قائم ہوسکتی ہے۔ نہ ہی اسکی احدیت میں کوئی فرق آسکتا ہے۔ کیونکہ احد خود واسع (وسیع اور احاطہ کئے ہوئے) ہے۔ اور تخلیق کی ہیٔت میں بھی بنیادی طور ذاتِ احد کے وجود ہونے سے۔ کسی دوسری شے کا وجود بھی قائم نہیں ہوتا۔ جس سے حد یا تثنیہ (دو کا وجود) کا وجود ثابت ہو۔ اسلئے معلول کا قائم ہونا محسوسات سے ہے۔ جو احساس اسکی رنگت سے ہی محسوس کیا جاتا ہے۔ یعنی اگر یہ تصور کیا جائے کہ ذاتِ احد کے نور کی رنگت سفید ہے۔ تو اس سفید رنگت کی ابتدا انتہا نہیں ایسی حالت میں ایک تخلیق (نور کے اعتبار سے) اسکی رنگت سے ہی پہچانی جاسکتی ہے۔ کیونکہ نور کا اور کوئی وجود ہی نہیں ہوتا۔ تو ابتدائی تخلیق کو ایک سیاہ نور کی کیفیت میں لاکر اس سفید نورِ احدیت میں مرکز کی حیثیت حاصل ہوگی۔ اور یہ کیفیت اسکی رنگت سے پہچانی جائے گی۔ سیاہ رنگت اپنی نوری کیفیت میں ہوگی۔ یہ رنگت مادی سیاہی نہیں کہ اندھیرا محسوس کیا جائے۔ بلکہ اس نور میں بھی ایک مشاہدہ حاصل ہوگا اور یہ نور کا انتہائی درجہ کہلائے گا۔ گویا سیاہ نور دراصل ہر تیز سے تیز قوی سے قوی نور

کا انتہائی درجہ ہے۔ اس نور کو ہر شاہد اپنی قوتِ مشاہدہ کی قوت پر ہی مشاہدہ میں لاسکتا ہے۔ یہ نور نور محمدیؐ سے تعبیر دیا جاتا ہے۔ اور پھر اس نور سے جو تخلیق معلول کی صورت میں واقع ہوگی اسکی کیفیت بھی اسی طرح واقع ہوگی جسطرح نور احد میں ہے۔ یعنی سیاہ نور اتنا وسیع ہوگا جسکی انتہا اسکی ابتدائی تخلیق کے لحاظ سے ایک شاہد کیلئے لا انتہا کا درجہ رکھتی ہے۔ اسی وسعت میں اسکے مرکز میں ایک کیفیت اپنی رنگت میں نمودار ہوگی۔ وہ رنگت معلول کی حیثیت سے سفید[1] ہوگی۔ اور یہ کیفیت بھی اسی طرح واقع ہوگی کہ علت موجود اور معلول مرکز کی حیثیت سے قائم ہوگا۔ اسی طرح اس علّت سے جو معلول قائم ہوگا اسکی رنگت معلول کے لحاظ سے سفید سے کمتر نیلگوں مائل بہ سرخی ہوگی۔ اور یہ رنگت بھی سفید علّت میں مرکز کی حیثیت سے قائم ہوگی۔ چونکہ مشاہدہ میں ایک ایسی کیفیت بھی پائی جاتی ہے۔ جس میں کوئی نوری کیفیت[2] محسوس نہیں کی جاتی۔ اسلئے یہ کیفیت اصل نور کی آخری تنزلی کیفیت تصور کی جائیگی۔ اس کیفیت کے واقع ہونے سے۔ یہ نتیجہ ظاہر ہے۔ کہ ایک لا انتہا وسیع نور سے اسکے معلول علی الترتیب اپنی تنزلی کیفیتوں میں ایک رنگت حاصل کرتی جاتی ہیں۔ اور ہر کیفیت کا ایک تنزلی رنگ ہوتا ہے۔ اسلئے نیلگوں نور کی تنزلی کیفیت (معلول) سبز رنگت میں ہوگی اور سبز رنگ کی آخری کیفیت سرخ (ناری) کیفیت میں ظاہر ہوگی اور اسی نار کی معلولی یا تنزلی کیفیت نے ایک خاکی وجود حاصل کرلیا۔ ان تمام کیفیات میں ہر معلول ایک مرکز کی حیثیت سے ہوگا۔ جس سے علّت کا وجود بھی قائم رہیگا۔ اور معلول اسکی جُز قرار دی جائیگی ـــــ یہی کیفیت وحدۃ الوجود کی تفسیر ہے۔ کہ خود اللہ کا وجود نہ عدم ہوتا ہے۔ نہ منتشر ہوتا ہے۔ نہ ہر انسان میں خدا کا سالم وجود آسکتا ہے۔ بلکہ وہ خالق کی حیثیت سے خود موجود اور سالم ہے۔ اسکی تخلیق کے باوجود جبکہ کئی وجود ظاہر ہوتے ہیں۔ یہ سب کیفیتیں صرف رنگت سی محسوس ہیں۔ اور ہر مقام پر ہر وجود کی ایک کیفیت ہے۔ یہ تخلیقی ترکیب۔ نہ اللہ کو معدوم کرتی ہے۔ نہ کسی غیر اللہ کا وجود پیدا کرتی ہے۔ بلکہ کثرت پیدا ہونے کے باوجود ایک احد کا وجود سالم اور واحد ہی رہتا ہے۔

---

[1] اس سفیدی اور ذات احد کی سفیدی میں ذات اور مخلوق کے تناسب سے فرق ہے۔ [2] خاکی (مادی) وجود۔

اسکے بعد احدیت مجردہ سے خود احدیت کا خالص (ذاتی) وجود واقع ہے۔ اس نور میں نورِ مجردہ اور خالق ہونے کی حیثیت میں سوائے نور کے اور کوئی کیفیت محسوس نہیں ہوتی۔ کیفیت نہ ہونے کی وجہ سے اسے لامکان سے تعبیر دیا جاتا ہے ۔۔۔ اس نور سے آگے نورالٰہی کے مشاہدہ ہونے پر انسان کے نصب العین کی بدرجہ اکمل تکمیل ہوتی ہے۔ ایسے عارف کو ولیِ اکمل کہا جاتا ہے۔

پیر اکمل: پیر اکمل کی اصل تعریف ولی اکمل ہے۔ باقی نام پیر۔ شیخ وغیرہ۔ دراصل ولایت کے نام نہیں یہ ایک ولی کی جسمانی کیفیت کو ظاہر کرتے ہیں۔ یہ ایک ضروری امر ہے۔ کہ ان مقامات کے حصول میں انسان کی ایک طویل عمر صرف ہوتی ہے۔ انسان جسوقت اپنے مقصد کی تکمیل کرتا ہے۔ تو وہ اکثر حالتوں میں بوڑھا ہو چکا ہوتا ہے۔ اسلئے ایسے ولی کو جبکہ اسکی بزرگی تسلیم کی جاتی ہے۔ ادباً نام نہیں پکارا جاتا بلکہ یا شیخ کہا جاتا ہے شیخ" کے معنی بوڑھا۔ اور پیر اسکا فارسی معنی ہے۔ فارسی میں بوڑھے کو پیر کہا جاتا ہے۔ وَاَبُوْنَا شَیْخٌ" کَبِیْرٌ" اور ہمارا باپ بہت بوڑھا ہے۔ اسلئے ولی اکمل کو۔ شیخ کبیر یا پیر اکمل کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے۔ ورنہ ایک عارف اکمل کیلئے۔ ولی اکمل اسکا اصلی عرف ہے۔ علم طریقت میں ولی تین قسم کے ہوتے ہیں۔ یہ قسمیں ان کی صفت کے مطابق ہوتی ہیں۔

(۱) ولی کامل (۲) ولی مکمل (۳) ولی اکمل

ولی کامل: وہ شخص ہوتا ہے۔ جو عالم ناسوت کی اکتالیس منزلیں طے کر کے عالم ملکوت کی ابتدائی منزل اول اجلاسِ محمدیؐ میں پہنچ چکا ہو۔ اسکی تعریف یہ ہے۔ کہ شریعت کی پابندی کے ساتھ طریق طریقت سے ایک راہنما کی راہنمائی میں اسے اول اجلاسِ محمدیؐ (روضہ مدینہ منورہ) کی کیفیات کا علم حاصل ہو چکا ہو۔۔۔ اس کی حیثیت ایک مبتدی کی ہوتی ہے۔ اسکے مقابل اگر ایک شخص اجلاسِ محمدی تک نہ پہنچا ہو۔ بلکہ عالم ناسوت کی کسی منزل یا آخری اکتالیسویں منزل میں ہو۔ ایسا شخص اگر چہ شریعت کا پابند بھی ہو طریقت پر عامل بھی ہو اور کرامات کا صدور بھی اس سے ہوتا ہو۔ لیکن عالم ملکوت (ماوراء مادہ) کے باب اول میں نہ داخل ہوا ہو۔ ولی کامل نہیں کہلا سکتا۔ بلکہ عامل کہلائیگا۔ کیونکہ طریقت میں قرب و

عرفان الٰہی ایک خصوصی درجہ رکھتا ہے۔ اسلئے عارف جب اپنی روح رحمانی کے ذریعہ عالم ملکوت میں داخل ہوتب ہی اسکا مرتبہ قرب میں شمار ہوسکتا ہے اور قرب کا پانا ہی ولایت کا خاصہ ہے۔ اسکے ماسوئ ایک عامل اپنی روح جسمانی میں قوی ہوتا ہے اور ولی ہونے کیلئے ایک امیدوار (Candidate) کی حیثیت رکھتا ہے۔ گویا ایک امیدوار نیم ولی ہوتا ہے۔

ولی مکمل: وہ شخص ہوتا ہے۔ جس نے ولایت کی تکمیل کی ہو۔ یعنی اول اجلاسِ محمدیؐ سے عالم ملکوت۔ عالم جبروت۔ عالم لاہوت کی تمام منزلوں میں قرب وعرفان حاصل کر کے ذات احد (اللہ) کا قرب و عرفان حاصل کر چکا ہو۔ یہ شخص عارف کہلاتا ہے۔ اور اسکے علم وعرفان کی تکمیل ہو جاتی ہے۔

ولی اکمل: وہ شخص ہوتا ہے۔ جو ولی مکمل کی طرح اپنے عرفان ومشاہدہ کی کلی طور تکمیل کر چکا ہو۔ اسکے ساتھ ہی وہ طریق نبوت کے مطابق۔ تلاوت۔ تزکیہ۔ علم۔ اور حکمت کے طریق سے واقف ہو۔ اور عالمانہ (راہنمایانہ) حیثیت سے وہ راہنمائی کے ان طریقوں سے ایک انسان کے تلاش مقصود میں پوری قوت کے ساتھ اسے عرفان و مشاہدہ کرا سکتا ہو۔ اسکا مطلب یہ ہے۔ کہ ایک ولی اکمل ایک طالبِ حقیقت کی تمام مادی قوتوں کو اپنی نوری قوت سے اصلاح کر کے اسے اس قابل بنا دے کہ وہ مشاہدہ کر سکے۔ اور ولی اکمل ایک شخص کی ابتدائی حالت میں طالب کے عمل (طریقت) کے بغیر اسکی روحانی معراج میں ذاتِ احد کے نور تک پہنچا دے۔ گویا ولی اکمل میں کمالیت اسوجہ سے ہوتی ہے۔ کہ وہ قدرت رکھتا ہے۔ کہ طالب کو اسکے مقصود (عرفان الٰہی) میں اپنی روحانی قوت سے ایک آن میں بغیر مجاہدہ ولی مکمل بنا دے۔ ولی اکمل کی راہنمایانہ خصوصیت میں یہ چیز شامل ہوتی ہے۔ کہ وہ منازل راہ عرفان کی ہر ہر کیفیت سے کلی طور آگاہ ہوتا ہے۔ ان کیفیات کے تمام اسرار ورموز سے کلی طور واقف ہونے کے علاوہ ایک شخص کو اپنی قوت اور ارادہ سے اٹھا کر ان مقامات کی سیر کرا سکتا ہے۔ یہی صفت ولی مکمل کے مقابلہ میں ولی اکمل میں خصوصیت پیدا کرتی ہے۔ اور ولی مکمل خود ذات احد کا مشاہدہ وعرفان کر سکتا ہے۔ مگر کسی دوسرے شخص کو مشاہدہ کرانے کی صلاحیت نہیں رکھتا ___ جیسے ایک

عالم اور طالب علم۔ ایک اسی علم میں درجہ استادی کا رکھتا ہے اور دوسرا اسی درجہ کا طالب علم کہلاتا ہے۔ علم حاصل کرنے کے بعد اگرچہ علم کی تمام کیفیتیں اس پر طاری ہو چکی ہوتی ہیں اور ہر کیفیت (تزکیہ) اسکے علم میں آچکی ہوتی ہے۔ لیکن استادی کی سند حاصل نہ ہونے کی وجہ سے وہ خود استاد نہیں بن سکتا۔ یا استادی کے درجہ پر اسے مامور نہیں کیا جاتا۔ اسی طرح جب تک کہ ولی اکمل اور محکمۂ ولایت۔ اجلاس محمدیؐ سے اسے سند حاصل نہ ہو یہ ولی اکمل کے درجہ پر متعین نہیں ہو سکتا ہے۔ علاوہ ازیں ولی اکمل راہنمائی کی حیثیت سے امت میں بمثل پیغمبر[1] ہوتا ہے۔ تاکہ انتہائی علم حاصل کرنے کیلئے ولی اکمل کی طرف رجوع کیا جائے۔ ولی مکمل ولی اکمل کے ماتحت طالب کی حیثیت سے رہتا ہے۔ البتہ اسکے مکمل علم کی بنا پر یہ طریق طریقت کا اجرا علم وتزکیہ میں اسوقت کرا سکتا ہے جب ایک طالب کیلئے اسے منتہا تک پہنچانے کی ذمہ داری لینے کی صلاحیت اس میں پائی جائے۔ لیکن یہ صلاحیت تب تک نہیں ہو سکتی جب تک اسے ولی اکمل کا درجہ حاصل نہ ہو۔ اسلئے کوئی شخص ولی اکمل کے ہوتے ہوئے ولی مکمل کی ذمہ داری میں نہیں آسکتا ہے۔ گزشتہ پیغمبروں کے زمانوں میں انسان کو منتہا تک پہنچانے کیلئے سوائے پیغمبر کے امت میں کوئی ولی اکمل کے مقام کو حاصل نہ کر سکا۔ اسلئے پیغمبر کے بعد نہ کوئی منتہا حاصل کر سکا۔ نہ دین کی حفاظت ہو سکی۔ لیکن حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کے بعد آپکی امت میں بے شمار ولی اکمل پائے جاتے ہیں جو انسان کو انتہائی عرفان تک پہنچا سکتے ہیں۔ اور اسطرح علم الٰہی اور دین الٰہی میں دوام قائم رہیگا۔ چنانچہ قرآن میں وَكَذٰلِكَ جَعَلْنٰكُمْ اُمَّةً وَّسَطًا لِّتَكُوْنُوْا شُهَدَآءَ عَلَى النَّاسِ وَيَكُوْنَ الرَّسُوْلُ عَلَيْكُمْ شَهِيْدًا ط (پارہ ۲ سورۃ ۲ آیت ۱۴۳) کا اشارہ اسی کیفیت کو ظاہر کرتا ہے۔ اور حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کی حدیث اَلْعُلَمَاءُ اُمَّتِیْ كَاَنْبِيَآءِ بَنِیْ اِسْرَائِيْلَ۔ بھی اسی کیفیت کی طرف اشارہ کرتی ہے۔ کہ گزشتہ زمانہ میں پیغمبر قوم بنی اسرائیل سے ہی ہوتے رہے اور ولایت کے منصب میں پیغمبر نے جو اجرا علم وعمل میں کیا وہی اجرا امت محمدی کا ولی اکمل بھی کرتا ہے۔ اور ولی اکمل نائب رسول کی حیثیت سے دین کو ہمیشہ جاری رکھے گا۔ ذمہ داری کیا چیز ہے؟ ذمہ داری سے مراد

[1] قائم مقام۔ یا خلیفہ یا نائب رسول۔

طالب وراہنما کے درمیان علم وعرفان کی تکمیل کا عہد ہوتا ہے اسے بیعت سے تعبیر دیا جاتا ہے۔

بیعت: بیعت۔ بیع سے مشتق ہے۔بیع سے مراد۔ایک شے کی ملکیت واختیار سے کلی طور دست بردار ہو کر۔اس شے کی ملکیت اور اختیار دوسرے شخص کے سپرد کرنا۔اسکے بعد بائع (فروخت کرنے والا) کو اس شے پر تصرف رکھنے کا قطعی طور حق باقی نہیں رہتا۔ایک طالب ایک راہنما سے کس شے کی بیعت کرتا ہے؟_____ وہ اسکی مستقل ذاتی حیثیت جان اور ارادہ ہوتا ہے۔ جان کو محفوظ کرنے کا انسان خود ذمہ دار ہوتا ہے۔اور اسکے لیے وہ اپنے ارادے سے کام لیتا ہے۔ وہ اپنے ارادے سے اپنے لیے ہر نفع ونقصان کو حاصل کرتا ہے۔انسان کے لیے نفع ونقصان کی کیا ہیئت ہوتی ہے؟ وہ اسکی نشو وارتقا ہے۔ کہ انسان رہ کر اپنی انتہائی عمر تک منازل طے کرے اور اسے نشو وارتقا کیلئے آسانی سے تمام ذرائع حاصل ہوں۔ جہاں تک حصول سامان حیات کا تعلق ہے۔ وہ کسی دوسرے پر بھروسہ نہیں کرتا۔ بلکہ خود اپنے ارادہ وسعی سے اپنے لیے سامان حاصل کرتا ہے۔ کیونکہ ہر شخص مساوی حیثیت سے اپنے وجود میں سامانِ زندگی فراہم کرنے کیلئے حواس وتعقل اور ارادہ خود اختیاری حاصل کئے ہوئے ہے۔ جب اسے اپنے سامانِ حیات کی فراہمی میں علم کی کمی کے باعث مجبوری پائی جاتی ہے۔ اسوقت اسکا ارادہ بھی کار آمد نتائج پیدا نہیں کرسکتا۔لہذا ایسا انسان اپنی نشو وارتقا میں سامان حیات کی فراہمی کیلئے (اپنی مجبوری کے باعث) کسی دوسرے بہتر عالم کا محتاج رہتا ہے۔

اس عہد کی تین نوعیتیں ہوتی ہیں۔اگر مادی حالت میں انسان اپنی سعی میں صحیح نتیجہ حاصل کرنے میں مجبور ہو۔تو مجموعی حیثیت میں ایسے انسانوں کی جماعت ایک ایسے عالم (راہنما) کی طرف رجوع کرتی ہے جو ان کے تمدنی معاشرتی امور میں ایک بہتر نتیجہ پیدا کرنے کی صلاحیت رکھتا ہو۔اس رجوع کو انتخاب کہتے ہیں۔اس انتخاب سے ایک لیڈر (راہنما) کا وجود پیدا ہوتا ہے۔لیڈر کے حواس وتعقل کی وسعت اسقدر ہوتی ہے۔ کہ وہ انسانی ضروریات کے لیے ذرائع پیدا کرنے میں اپنی دماغی قوت میں عام لوگوں کے مقابلہ میں کلی (انتہائی) قوت کا حامل ہوتا ہے۔ جب جماعت ایک لیڈر کو منتخب کرلیتی ہے۔تو جماعت کی عقلیں (بوجہ نارسائی کے) لیڈر کی عقل میں مدغم ہو جاتی ہیں۔ باالفاظ

دیگر لیڈر کی عقل اور اسکا ارادہ جماعت کی عقلوں اور ارادوں پر حاوی ہو جاتا ہے۔ اور جو کچھ لیڈر کرے وہی نتیجہ ہر انسان پر اثر انداز ہوتا ہے۔ جہاں کسی شخص نے لیڈر کی عقل وارادہ کی مخالفت کی۔ ایسا شخص بوجہ عدم صلاحیت کے اعتدال سے باہر ہو کر نتیجتاً خلافِ فطرۃ پر آمادہ ہوتا ہے۔ لہذا یہ شخص قوم کا غدار سمجھا جاتا ہے۔ علاوہ ازیں لیڈر پر یہ ذمہ داری عائد ہو جاتی ہے۔ کہ وہ قوم کی ضروریات پورے طور فراہم کرے۔ یہ پہلی نوعیت ہے۔

دوسری نوعیت دین کی ہوتی ہے۔ یہ چیز علم سے تعلق رکھتی ہے۔ کہ ہر شخص دین کو سمجھنے کی استطاعت نہیں رکھتا۔ اسلئے اسے ایک راہنما کی تقلید کی ضرورت رہتی ہے۔ دین کا راہنما پیغمبر ہوتا ہے۔ جس سے علم الٰہی حاصل کیا جاتا ہے۔ پیغمبر ہر زمانہ میں پایا نہیں جاتا۔ اسکا علم موجود ہوتا ہے۔ جس سے ہر شخص استفادہ کر سکتا ہے۔ لیکن علم حاصل کرنے میں پیغمبر کا موجود ہونا لازمی ہے۔ کیونکہ علم بغیر راہنما کے ادھورا رہتا ہے۔ جب تک خود عالم اسکی تفسیر وتشریح نہ کرے۔ براہ راست علم کی حقیقت سے آگاہ ہونا ناممکن ہے۔ اس کمی کو پورا کرنے کے لیے پیغمبر کا پیرو (نائب یا خلیفہ) ایک عالم کی حیثیت سے قائم ہو جاتا ہے۔ جسے۔ محدث۔ فقیہ یا امام کے نام سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ تقلید اور عہد کی صورت میں اسکی بھی یہی کیفیت ہوتی ہے۔ کہ انتخاب میں ایک امام کو لازمی طور منتخب کرنا ہوتا ہے۔ اور جب اسکا انتخاب ہو چکا تو اسکی فقہ اور علم کی کمالیت کے آگے۔ انسان کا عقل وارادہ ختم ہو جاتا ہے۔ پھر امام کے قول وفعل کے عین مطابق بغیر کسی سوچ کے چلنا پڑتا ہے۔ اسے تقلید یا اطاعت کہتے ہیں۔

تیسری نوعیت بھی علم سے متعلق ہوتی ہے۔ یہ علم۔ ماوراء ادراک کا ہے۔ جس میں انسانی عقل وشعور قطعی طور عاجز ہوتے ہیں۔ چونکہ یہ کیفیت انسانی زندگی کا ایک واحد اور خصوصی نصب العین ہوتا ہے۔ اسلئے اس انتخاب میں اسی راہنما کو منتخب کیا جا سکتا ہے۔ جو شرعی قانونِ طریقت کے مطابق ولی اکمل کی حیثیت رکھتا ہو۔ اور علم حاصل کرنے کیلئے ایسے عالم کی شدت کے ساتھ ضرورت رہتی ہے۔

ایک عالم سے امداد حاصل کرنے کیلئے ضروری ہے۔ کہ قانونی معاہدہ کیا جائے۔ ایک عالم (جو اپنے لیے کلی طور ہر قسم سامان زندگی فراہم کرنے میں انتہا کو پہنچ چکا ہو) یہ ضمانت دیتا ہے۔ کہ ایک

شخص میری راہنمائی میں اپنے لئے تمام ضروریات حاصل کرسکتا ہے۔ بشرطیکہ ایک شخص اپنے مجبور ارادہ کو اپنی نامکمل سعی کو میرے ارادہ وسعی کے مقابلہ میں استعمال نہ کرے۔ میں (عالم) ذمہ دار ہوں کہ تمام سامان نشوو ارتقا مہیا کردوں۔ یہ کیفیت بیعت کی ایک جز ہے اور اسکی دوسری جز طالب سے ہوتی ہے جو اپنی نشوو ارتقا کے سامان میں عاجز ہوتا ہے۔ اسکی طرف سے بھی یہی عہد ہوتا ہے۔ کہ میں (طالب) بجائے اپنی ذمہ داری کو اپنی ذات سے وابستہ رکھوں۔ میں (طالب) اپنی نشوو ارتقا کیلئے اپنے تمام اختیارات اور اپنی سعی وارادہ اور اپنی جان تمہارے (عالم کے) سپرد کرکے ہر کیفیت سے دست بردار ہوتا ہوں۔ اسکی مثال ایسی ہو جاتی ہے جیسے ڈاکٹر کے سامنے ایک مجبور و بیمار نعش کی جو خود اپنا علاج کرنے سے قاصر ہوتا ہے۔ اب بیمار کی صحت کی ذمہ داری ڈاکٹر پر آجاتی ہے خواہ اسے صحت مند بنا سکے یا اسے ہلاکت کی طرف لوٹادے۔ یہاں بیمار کا ارادہ وسعی ڈاکٹر کی ذمہ داری میں جذب ہوجاتا ہے۔ یہی کیفیت ایک ولی اکمل اور مادیت میں گھرے ہوئے (اشرف المخلوقات) انسان کی ہوتی ہے۔

انسان ہونے کی حیثیت سے جہاں تک انسان کے مادی ذرائع کا تعلق ہے۔ انسان درختوں کے پتوں اور گھاس پات سے بھی اپنی زندگی کو برقرار رکھ سکتا ہے۔ کیونکہ کائناتِ ارضی میں یہ اشیاء بلامحنت و بلا معاوضہ آسانی سے حاصل ہوسکتی ہیں۔ اسلئے انسان سوائے نفسانی لذات حاصل کرنے میں اپنی زندگی کی بقا و دوام میں مجبور نہیں ہوسکتا۔ مجبور اگر ہوسکتا ہے۔ تو اپنے علم کی وسعت کیلئے۔ علم کی وسعت کیلئے انسان کس مقام پر اور کس شے کے حصول کے لیے عاجز ہوتا ہے؟ــــ وہ اسکی ذاتی شخصیت کی بنا پر باقی مخلوق کے مقابلہ میں۔ اسکے تفکر میں علمی سرمایہ حاصل کرنے میں پائی جاتی ہے اگرچہ مادی حیثیت میں بھی علم کو دخل ہے۔ لیکن انسان کی مادیت میں علم کی کمی اسے اپنی زندگی کو قائم رکھنے میں مجبور نہیں کرسکتی۔ البتہ انسانی شرافت وعظمت اور عقلی خصوصیت میں اسکے لیے کائنات خلقت پر اسکی ابتداء وانتہا کو پانے کی جو ذمہ داری انسان پر عائد ہوتی ہے۔ اسکے لیے اُسے ایک عالم اجل (راہنما) کی اشد ضرورت پڑتی ہے یہ عقلی خصوصیت خود اس امر کی دلیل ہے۔ کہ انسان

کیلیئے تفکر فی الخلوق ایک لازمی چیز ہے۔اور تفکر کا نتیجہ کیا ہوگا؟ ـــــــ وہی نتیجہ عرفان الٰہی سے تعبیر دیا جاتا ہے۔گویا عرفان الٰہی حاصل کرنے کے لیے ایک انسان کی علمی حیثیت سے مجبوری اسے کسی معاون کی ضرورت محسوس کراتی ہے۔یہی ضرورت جستجو۔تلاش کی تحریک پیدا کرتی ہے۔یہی تلاش اسے ایک عالم (ولی اکمل) کے آگے جُھکا دیتی ہے۔اور جھکنے سے مراد یہی ہے!۔کہ ایک انسان اپنے مقصد کی تکمیل کیلیئے کسی عالم کے ہاتھ پر اپنی جان (یعنی اپنا ایمان) اپنی سعی اپنا ارادہ فروخت کر کے اپنے تمام اختیارات اسئے سپرد کر ڈالے۔اور خود اپنے نفع ونقصان سے بے نیاز ہو جائے۔گویا اسکی عاجزی ہی اسے ایک ولی اکمل کی معیت میں ہر نفع ونقصان سے بے نیاز کر دیتی ہے۔اور اسکی بے نیازی اسکی عاجزی سے ہی نمایاں ہوسکتی ہے ـــــ یہ تو بیعت میں خرید وفروخت کی ایک کیفیت ہے۔ لیکن اس بیعت میں ملکیت کے انتقال کی کیا صورت ہے۔وہ صورت نہایت ہی نازک اور اہم ہے۔

ولی اکمل کیلیئے ولایت کی اکملیت کا دعوٰی کرنا ایک نازک مقام ہے!۔ولی اکمل تب تک یہ دعویٰ کرنے کا حق نہیں رکھ سکتا جب تک کہ اسے اکملیت کی سند حاصل نہ ہو۔اگر دعوٰی بغیر وصف اور دلیل کے ہو تو ایسا شخص باوجود ولی کامل اور مکمل ہونے کے بھی کذاب (جھوٹا) تصور کیا جائیگا۔ایسی ہستی کا صرف اپنی لذتِ نفسانی کے تحت دعویٰ کرنا انسانیت کیلیئے ایک گمراہ کن راہ پیدا کرنے کا سبب ہوگا۔اور یہ فعل تمام انسانیت کے قانون میں ایک عظیم جرم ہے۔کیونکہ ایسی حالت میں ایک انسان کے نصب العین کی تکمیل ہونے کی بجائے اسکی عدم تکمیل اور گمراہی پر اسکی جان وایمان (مقصود) کے ضائع ہونے کا احتمال یقینی ہو جاتا ہے۔اس قانون کے تحت جو شخص ایک انسان کے حقیقی مقصود کی ذمہ داری بغیر سند اور کمالیت تامہ کے بیعت کے نام سے لے۔اسکے لیے بیعت لینے سے قبل ان تاثرات اور اپنی ذمہ داری کا اندازہ کرنا ضروری ہے۔کہ لوگوں کی راہنمائی میں جس بیعت کو وہ استعمال کر رہا ہے۔کیا قانونی حیثیت میں وہ ایک شدید جرم کا ارتکاب تو نہیں کر رہا ـــــ ہاں۔لذت نفسانی اگر اسے اس احساس سے باز رکھے۔مگر اسکا نتیجہ لازمی ہے۔کہ انسانیت کو دھوکہ میں ڈالنے کی پاداش میں

جوسزا مقرر ہے وہ ہر حال میں اس پر طاری ہوگی۔

ایک ولی اکمل جسے اکملیت کی سند حاصل ہو۔بیعت لینے کی صورت میں اسکی کیا پوزیشن ہوتی ہے۔پیشتر بیان ہو چکا ہے۔کہ طریق عرفان و مشاہدہ میں ایک انسان تب تک ایک کیفیت کا مشاہدہ نہیں کرسکتا جب تک کہ وہ اس کیفیت میں جذب ہوکراس کیفیت کے تمام تاثرات کا حامل نہ ہو جائے۔ولی اکمل جب عالم ناسوت کے مقامات سے گزرتا ہے۔تو ہر منزل کی کیفیت سے اس کی روح حیوانی کا گزر ہوتا ہے۔یہ ایک فطری اصول ہے۔کہ ایک مادی کیفیت کا وجود خود بخود نہیں ہوتا۔بلکہ اس کے وجود کا سبب اسکی علت ہوتی ہے۔ایک علت سے ایک ہی معلول نہیں بنتا بلکہ کئی معلول بنتے ہیں۔مثال کے طور پر اگر دانہ کو درخت کی بنیادی علت قرار دیا جائے۔تو دانہ سے براہ راست دانہ یا میوہ ایک ہی علت نہیں بنتی۔دانہ اگر اپنے معلول کی ہیئت میں دانہ ہی پیدا کرے تو وہ دانہ کی حیثیت میں خود علت ہی کہلائے گا۔اسلئے علت میں فطری ترتیب کے مطابق پودا۔تنا۔شاخیں۔پتے۔پھول۔پھل ضروری پیدا ہوتے ہیں۔ہر کیفیت الگ الگ ہیئت میں نمودار ہوتی ہے۔اسلئے ثابت ہوتا ہے۔علت واحد کی حیثیت سے معلول کا مرکب ہوتی ہے۔اور ہر معلول کثرت کے دائرہ میں علت کے وجود کا ایک جز ہوتا ہے۔اسلئے مرکب کا (کل) جز کے مقابلہ میں قوی ہونا ایک فطری اصول ہے۔یہی ترکیب ہر معلول وعلّت میں واقع ہوتی ہے۔مادی کیفیات سے ماسوئی ہر لطیف قوت مادہ سے قوی ہوتی ہے۔اور جہاں تک مادہ کی علتوں کا تعلق ہے۔مادہ کے مقابلہ میں انکی قوت کے اعتبار سے ہر علت لطیف ہیئت میں ہوگی لہذا۔ماورائے مادہ ہر قوت کا مادہ سے لطیف اور قوی ہونا لازمی ہے۔اور جب مادہ اپنی علت کی طرف ارتقا کرے تو اسکے لیے لازمی ہے کہ وہ اپنی علت میں جذب ہونے کے ساتھ علّت کی سی ہیئت اختیار کرے گا۔مثال کے طور سورج کے شمسی ذرات میں اگر مادی ذرات کا دخل ہو۔تو مادہ جب تک شمسی قوت کا حامل نہ ہو۔شمسی ذرات میں داخل نہیں ہو سکے گا۔اور جب مادی ذرات شمسی ذرات سے متصل ہو جائیں تو شمسی ذرات کا غلبہ انہیں اپنے میں جذب کر لے گا جب انکا گزر شمسی ماحول میں ہوگا تو یہ مادہ مستقل شمسی ہیئت اختیار کر لے گا۔گویا مادہ اپنی قوت

کے اعتبار سے شمسی کیفیت کا حامل ہوگا۔اسی طرح جب ایک ولی کی روح حیوانی (جو بجائے خود ایک قوی نور ہوتی ہے) کا عالمِ ناسوت کی نورانی منازل سے گزر ہوتو عالم ناسوت کی ہر منزل کی کیفیت روح حیوانی پر طاری ہوگی۔گویا ایک طرف روح خود ایک مقام کی ہیئت حاصل کر لے گی۔ ہیئت حاصل کرنے سے اس مقام کی کیفیتوں کا اثر روح پر طاری رہے گا۔دوسری طرف یہی عکس قلب پر آنے سے انسانی علم میں جمع ہوگا۔ یہ نوعیت ایک مقام کا قرب ومشاہدہ کرنے کی ہوتی ہے۔ یہاں تک کہ ولی اکمل اسی حیثیت سے ہر مقام ومنزل کا قرب وعرفان حاصل کر لیتا ہے۔ جب ولی اکمل اپنے مقصود کی تکمیل کے بعد اکملیت کی سند حاصل کر لیتا ہے۔تو وہ راہنمائی کے مقام پر ابتدا سے انتہا تک ایک سالم حیثیت (وجود روحی کی) پالیتا ہے۔اور ایک طالب کی راہنمائی کا طریق اسکے لیے یہی ہوتا ہے۔کہ طالب کی روح کو اپنی (عالم ناسوتی) روح میں جذب کر لیتا ہے۔ایسی حالت میں ولی اکمل طالب کی روح کو بیک وقت تمام منازل کی (روحی) ہیئتوں میں جذب کرتے ہوئے منتہا تک جذب کر لیتا ہے۔یہی کیفیت اس حقیقت سے تعبیر دی جاتی ہے۔کہ ایک ولی اکمل ایک آن میں طالب کو جذب کی حالت میں ذات احد تک جذب کر کے اس کے قرب او مشاہدہ الٰہی کی تکمیل کرا سکتا ہے۔جہاں تک عالم ناسوت واقع ہے اسکا مقام (عالم ناس) کائنات کا باطن ہوتا ہے۔چونکہ انسان کائنات کے جواہر کا مرکب ہے۔اسلئے عالم ناسوت کی ابتدائی منازل میں انسان ایک طرف اپنے

لیکن یہ کیفیتیں جو مراتب کہلاتے ہیں علم ومشاہدہ کی رُو سے نہیں ہوتیں۔اسکی وجہ یہ ہوتی ہے۔کہ جسم میں مشاہدہ کے قویٰ دل ودماغ اپنی مادی ہیئت میں ہوتے ہیں۔اسلئے مشاہدہ اور تاثر کی صورت میں مادی وجود نور کی قوت کا متحمل نہیں ہوسکتا نتیجہ یہ ہوتا ہے۔کہ مادی وجود میں یا تو تعقل پر محویت طاری ہو جاتی ہے۔اور تعقل حواس کی اطلاعات سے بے خبر ہو جاتا ہے۔ایسے شخص کو مجذوب یعنی جذب ہوا ہوا کہتے ہیں۔اگر قرب کی کیفیت اسکی روح جسمانی پر طاری ہوگئی۔تو یہ ذرات بھی روح میں جذب ہو کر روح رحمانی کی کیفیت حاصل کرتے ہیں۔ایسی حالت میں انسان (روح جسمانی کے مجسم زندگی بننے سے) دائم الحیات ہو جاتا ہے۔اور اپنی تمام عمر میں بغیر مادی ذرائع کے زندہ رہتا ہے۔اور ہمیشہ محویت واستغراق میں رہتا ہے۔اور تیسری کیفیت میں اگر وجود نورانی کیفیت کا متحمل نہ ہوتو اسکی روح جسمانی ختم ہو کر اس پر موت واقع ہوتی ہے۔

آپکو مشاہدہ میں کائنات کے اجزا کی صورت میں محسوس کرتا ہے۔اسے فنافی الذات کہا جاتا ہے۔ گویا اپنے مرکباتی اجزا کا اسے مشاہدہ ہوتا ہے۔جس میں اسے ہر شے مخلوق کی حقیقی تخلیق کا مشاہدہ ہوتا ہے۔چونکہ انسان کی ابتدا آدم سے ہوتی ہے۔اسلئے اپنے وجود کی ابتدائی کیفیت آدم کی ابتدائی تخلیق کا مشاہدہ اور اس کائنات کی علّت کا مشاہدہ جس میں تمام فلکی کرّے۔سورج۔چاند۔ستارے تا آسمان اول کی تمام کیفیتوں کا حقیقی مشاہدہ ہو جاتا ہے۔الغرض ولی اکمل کی روح میں جذب کی تاثیر میں اسے تمام کائناتِ خلقت کی تخلیق کا مشاہدہ ہوتا ہے۔یہی تفسیر اس آیت کی ہے۔ وَفِي الْأَرْضِ اٰيٰتٌ لِّلْمُوْقِنِيْنَ ۝ وَفِيْٓ اَنْفُسِكُمْ ۭ اور اَفَلَا تُبْصِرُوْنَ کا اشارہ آنکھ(حواس) کی طرف ہے۔تو یہ اشارہ ابتدائی تحریکِ تفکر کیلئے ہے۔کہ انسان کے حواس میں جو مادی کیفیتیں پائی جاتی ہیں انہیں کے مشاہدہ میں تخلیق کائنات کی ترتیب میں ایک خالق کے وجود کا نشان ملتا ہے ــــــ اسکے ساتھ ہی۔ چونکہ یہ کیفیت ولی اکمل کی روح کے وسیلہ سے حاصل ہوتی ہے۔اسلئے ولی اکمل کی ہیئت نوری کا بھی ان کیفیتوں کے ساتھ مشاہدہ ہوتا ہے۔یعنی ہر کیفیت کے مشاہدہ میں ولی اکمل کا وجود بھی دیکھا جاتا ہے۔جب ایک طالب عالم ناسوت کی آخری منزلیں طے کرنے لگتا ہے۔تو چونکہ ان انوار میں ولی اکمل کی روح بھی جذب ہو چکی ہوتی ہے(یعنی ولی اکمل کی روح کی ابتدا اسی مقام سے ہوتی ہے)تو طالب کی روح کیلئے یہی روح وسیلہ(ذریعہ) کا کام دیتی ہے۔ایسی حالت میں طالب و ولی کی روح کو طے مقام ہونے سے فنا حاصل ہو جاتی ہے۔ایک طالب جہاں اپنے وجود کو کائناتی اجزا میں محسوس کرتا ہے۔وہاں ولی اکمل کی ارتقائی ہیئت میں بھی محسوس کرتا ہے۔اس مقام کو فنافی الشیخ کے مقام سے تعبیر دیا جاتا ہے۔ فنافی الشیخ کی خاصیت یہ ہے۔کہ طالب کو سوائے صورتِ شیخ کے اور کوئی شے اپنے مشاہدہ میں نظر نہیں آتی۔چونکہ عالم ملکوت کی کیفیت میں اس کا گزر نہیں ہوتا ہے نہ ہی عالم جبروت ولاہوت سے اس کا گزر ہوتا ہے۔اسلئے اپنے تصور میں اسے سوائے تصور شیخ(فنافی الشیخ) کے اور کوئی تصور حاصل ہو ہی نہیں سکتا۔چنانچہ ایسا عارف اگر ماسوائے طریق طریقت کے شریعت کی تعمیل میں نماز وغیرہ میں مشاہدہ کرے۔تو چونکہ اسکی روح پر عالم ناسوت اور ولی اکمل کی

آپکومشاہدہ میں کائنات کے اجزا کی صورت میں محسوس کرتا ہے۔اسے فنافی الذات کہا جاتا ہے۔ گویا اپنے مرکباتی اجزا کا اسے مشاہدہ ہوتا ہے۔جس میں اسے ہر شے مخلوق کی حقیقی تخلیق کا مشاہدہ ہوتا ہے۔چونکہ انسان کی ابتدا آدم سے ہوتی ہے۔اسلئے اپنے وجود کی ابتدائی کیفیت آدم کی ابتدائی تخلیق کا مشاہدہ اور اس کائنات کی علّت کا مشاہدہ جس میں تمام فلکی کرّے۔سورج۔چاند۔ستارے تا آسمان اول کی تمام کیفیتوں کا حقیقی مشاہدہ ہو جاتا ہے۔الغرض ولی اکمل کی روح میں جذب کی تاثیر میں اسے تمام کائناتِ خلقت کی تخلیق کا مشاہدہ ہوتا ہے۔یہی تفسیر اس آیت کی ہے۔ وَفِي الْاَرْضِ اٰيٰتٌ لِّلْمُوْقِنِيْنَ ۙ وَفِيْٓ اَنْفُسِكُمْ ۭ اَفَلَا تُبْصِرُوْنَ اور کا اشارہ آنکھ (حواس) کی طرف ہے۔تو یہ اشارہ ابتدائی تحریکِ تفکر کیلئے ہے۔کہ انسان کے حواس میں جو مادی کیفیتیں پائی جاتی ہیں انہیں کے مشاہدہ میں تخلیق کائنات کی ترتیب میں ایک خالق کے وجود کا نشان ملتا ہے ___ اسکے ساتھ ہی۔ چونکہ یہ کیفیت ولی اکمل کی روح کے وسیلہ سے حاصل ہوتی ہے۔اسلئے ولی اکمل کی ہیٔت نوری کا بھی ان کیفیتوں کے ساتھ مشاہدہ ہوتا ہے۔یعنی ہر کیفیت کے مشاہدہ میں ولی اکمل کا وجود بھی دیکھا جاتا ہے۔جب ایک طالب عالم ناسوت کی آخری منزلیں طے کرنے لگتا ہے۔تو چونکہ ان انوار میں ولی اکمل کی روح بھی جذب ہو چکی ہوتی ہے (یعنی ولی اکمل کی روح کی ابتدا اسی مقام سے ہوتی ہے) تو طالب کی روح کیلئے یہی روح وسیلہ (ذریعہ) کا کام دیتی ہے۔ایسی حالت میں طالب و ولی کی روح کو طے مقام ہونے سے فنا حاصل ہو جاتی ہے۔ایک طالب جہاں اپنے وجود کو کائناتی اجزا میں محسوس کرتا ہے۔وہاں ولی اکمل کی ارتقائی ہیٔت میں بھی محسوس کرتا ہے۔اس مقام کو فنافی الشیخ کے مقام سے تعبیر دیا جاتا ہے۔ فنافی الشیخ کی خاصیت یہ ہے۔کہ طالب کو سوائے صورتِ شیخ کے اور کوئی شے اپنے مشاہدہ میں نظر نہیں آتی۔چونکہ عالم ملکوت کی کیفیت میں اس کا گزر نہیں ہوتا ہے نہ ہی عالم جبروت ولاہوت سے اس کا گزر ہوتا ہے۔اسلئے اپنے تصور میں اسے سوائے تصور شیخ (فنافی الشیخ) کے اور کوئی تصور حاصل ہو ہی نہیں سکتا۔چنانچہ ایسا عارف اگر ماسوائے طریق طریقت کے شریعت کی تعمیل میں نماز وغیرہ میں مشاہدہ کرے۔تو چونکہ اسکی روح پر عالم ناسوت اور ولی اکمل کی

روح کا تسلط ہوتا ہے۔ اسلئے معراج المومنین (نماز) میں اس تصور سے فرار نہیں ہوسکتا۔ چونکہ طالب کا مقصود عرفان الٰہی ہوتا ہے۔ اور عرفان الٰہی میں صرف مقصود تصور احدیت ہی ہوتا ہے۔ تو یہ تصور (شیخ) عرفان الٰہی کا ہی ابتدائی تصور ہوتا ہے۔ اسلئے اس کیفیت شیخ کو مظہر الٰہی سے تعبیر دیا جاتا ہے۔ اور یہ تصور اَللّٰہُ نُوْرُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ کی تفسیر میں شریعت کے دائرہ کے اندر حقیقی تصور کہلاتا ہے۔ اسلئے شریعت وطریقت کے علم کی رو سے طالب کا ابتدائی تصور (تصور شیخ) شریعت کے تابع ہوتا ہے۔

عالم ناسوت کی اکتالیس منازل طے کرنے کے بعد عالم ملکوت کی ابتدائی منزل اول اجلاس محمدیؐ ہے۔ یہاں سے جو نور ہوگا وہ ملکوتی ہوگا اس نور میں افضلیت چونکہ نور محمدیؐ کو ہے اسلئے یہ نور نورِ محمدیؐ کہلاتا ہے۔ اور جب ولی اکمل طالب کی روح پر اس تاثیر کو طاری کرتا ہے۔ تو ایک طالب کو اجلاس محمدیؐ کا مشاہدہ ہوتا ہے۔ ولی اکمل چونکہ یہ تاثیر اپنے جذب روحی میں حاصل کر چکا ہوتا ہے۔ اسلئے طالب کو اجلاسِ محمدیؐ میں تمام ولی کامل۔ مکمل اور ولی اکمل کے مشاہدہ کے ساتھ زیارت حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم حاصل ہوتی ہے۔ چونکہ ولایت کی سند اول اجلاس محمدیؐ سے ہی ملتی ہے۔ اسلئے یہ سند حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کی روحانی مہر سے مصدقہ ہوتی ہے۔ اور یہی طالب ولی کامل کا درجہ حاصل کر لیتا ہے۔ یعنی یہی طالب ولی کہلانے کا مستحق ہوتا ہے۔ اور یہ امر لازمی ہے۔ کہ باوجود ولی کامل ہونے کے (مگر مشاہدہ ذات الٰہی نہ ہونے کے) یہ شخص بیعت کرنے کا حق نہیں رکھتا کیونکہ یہ شخص خود راہ رو ہوتا ہے۔ اور منتہا سے بے خبر ہوتا ہے۔ اسلئے اسکی بیعت نامکمل ہوتی ہے۔ جس نوعیت سے ولی کامل ـــــ ولی اکمل کی روح کے جذب سے مراتب[1] حاصل کرتا ہے۔ اسی نوعیت سے اسکے جذب میں ترقی ہوتی ہے۔ اس جذب میں مقامات ملکوتی کے ساتھ ساتھ ولی اکمل کے روحانی وجود اور حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کے روحانی (مراتب روحانی کی ہیئت میں) وجود کو بھی مشاہدہ میں محسوس کرتا ہے۔ اس احساس کی نوعیت یہ ہوتی ہے۔ کہ ایک حیثیت میں یہ تینوں وجود

---

[1] مراتب وہی ہیں جو علم کی تفصیل میں مقامات دیئے گئے ہیں۔

جذب کے اعتبار سے ایک ہی وجود ہوتے ہیں۔اور ذریعہ کے اعتبار سے کیفیت (مقام) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم۔اور ولی اکمل کے روحانی وجود الگ الگ محسوس ہوتے ہیں۔یہ وجود صرف مشاہدہ ہی میں نہیں آتے بلکہ مجسم نور اور زندگی کے اعتبار سے ان میں مادی حواس کے مقابلہ میں روحانی حواس ہوتے ہیں۔جن سے حواس جیسے عمل (سننا۔دیکھنا۔چھونا۔چکھنا۔سونگھنا) کا صدور ہوتا ہے اس حالت میں انسان اپنی نوری ہیئت کے اعتبار سے ہر خفیہ سے خفیہ آواز سن سکتا ہے۔اور شعور کے ذریعہ اپنے علم کے خزانے (حافظہ) میں (روحانی عکس کے ذریعہ) جمع کرسکتا ہے۔جوں جوں مراتب میں ترقی ہوتی جاتی ہے توں توں جذب میں فنائیت کا احساس غالب ہوتا جاتا ہے۔اور جب عالم ملکوت کی انتہائی منزلوں سے گزر ہوتا ہے۔تو طالب ولی اکمل کے نوری جذب کے ساتھ اپنے نوری وجود کا احساس نہیں کرتا بلکہ وہی کیفیت محسوس کرتا ہے۔جس میں ولی اکمل اور نور محمدیؐ کی کیفیت پائی جاتی ہے یعنی جو ولی اکمل کو نور محمدیؐ میں فنا ہونے پر حاصل ہوتی ہے۔یعنی طالب اور ولی اکمل کا وجود ایک ہو کر فنافی الرّسول کی کیفیت محسوس کرتا ہے۔گویا اس کیفیت کو پانا طالب کی حیثیت سے نہیں ولی اکمل کی حیثیت سے ہی ہوتا ہے۔یہاں تک کہ اسے سوائے نور محمدیؐ کے اور کچھ محسوس نہیں ہوتا۔اسی نور کے مشاہدہ میں طالب کو ہر شے میں نورِ محمدیؐ[1] نظر آنے لگتا ہے۔یعنی اگر وہ مادی اشیاء پر نظر ڈالتا

---

[1] ان مشاہدات میں ایک طالب پر تین قسم کی کیفیتیں طاری رہتی ہیں جنکے تحت اس کا مشاہدہ ہوتا ہے۔اول یہ کہ اگر جذب کی حالت میں اس پر از خود رفتگی (محویت) طاری ہو جائے۔تو یہ ماسوائے (دنیاوی مشاغل) سے بیخبر صرف استغراق نوری میں ہر وقت محو رہتا ہے۔ایسا شخص مجذوب (جذب ہوا ہوا) کہلاتا ہے۔اسکی محویت کی وجہ اسکے قلب اور دماغ کی عدم صلاحیت ہوتی ہے۔کہ اسکا قلب اور دماغ بوجہ مادہ کے غلبہ ہونے کے نور کی تجلی کا متحمل نہیں ہوتا۔اسلئے تعقل استغراق نوری میں نور کی طرف متوجہ رہ کر حواس کی طرف مائل نہیں رہتا۔جس سے یہ شخص دنیوی معاملات پورے نہیں کرسکتا۔

دوسری قسم یہ ہوتی ہے۔کہ ولی دنیاوی مشاغل کی طرف پورے طور توجہ رکھتا ہے۔اسکا مجاہدہ تزکیہ مکمل ہوتا ہے اسلئے جذب کے ہونے پر بھی اسکے قلب و دماغ پر تجلی ہونے سے دماغ پر محویت طاری نہیں (باقی حاشیہ اگلے صفحہ پر)

ہے تو اسے نور محمدؐ ہی ان اشیاء کے باطن میں نظر آتا ہے۔ جب ولی اکمل پر نظر پڑتی ہے۔ تو وہ بھی نوری وجود میں حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کی شکل میں نظر آتا ہے۔ اور جب اپنی ذات پر نظر ڈالتا ہے۔ تو وہ بھی اسی شکل میں نظر آتی ہے۔ یہ کیفیتِ مشاہدہ محمد (ابتدائی بنیادی نور) کی اصلی کیفیت ہوتی ہے۔

ان ملکوتی کیفیتوں کی آخری منزل انتہائے عالم ملکوت ہوتی ہے۔ اسکے بعد عالم جبروت

(بقیہ حاشیہ گزشتہ صفحہ) ہوتی۔ بلکہ وہ اپنی مرضی کے مطابق جب چاہے۔ دنیوی مشاغل میں مصروف رہتا ہے۔ اس وقت اسکے قلب کا دماغ سے رابطہ ٹوٹتا ہے۔ اسلئے قلب پر اگرچہ تجلی کا عکس آبھی جائے لیکن رابطہ نہ ہونے کی وجہ سے اسکا دماغ اس طرف متوجہ نہیں ہوتا۔ بلکہ حواس کے احکام کی طرف متوجہ رہتا ہے۔ اور جب چاہے اپنی مرضی سے مشاہدۂ ذات الٰہی کرے تو مراقبہ (یکسوئی) میں بیٹھ کر قلب کا رابطہ دماغ سے کرتا ہے۔ تو حسب منشا جس کیفیت تک مشاہدہ کرنا چاہے کر سکتا ہے۔ اور اس پر محویت طاری نہیں ہوتی ایسا ولی سالک کہلاتا ہے۔ کہ دنیوی امور میں بھی سالم القوۃ رہتا ہے۔ اور مشاہدہ میں بھی قوی ہوتا ہے۔

تیسری قسم یہ ہے۔ کہ ولی سالک کے مقابلہ میں دنیوی لذات سے صرف اسی قدر حاصل کرتا ہے۔ جس قدر اسے زندگی کے قیام کے لیے تھوڑی مقدار میں ضرورت ہوتی ہے۔ اس وجہ سے یہ دنیاوی مشاغل کی طرف کم مائل رہتا ہے۔ اسکا تزکیہ مجاہدہ باقی دونوں قسم کے اولیاء سے زیادہ وسیع ہوتا ہے۔ اسلئے اسکا وجود بھی مجسم نوری ہوتا ہے ــــ یہ شخص ہوش مند رہتا ہے اور راہنمایانہ حیثیت سے علم کا بھی اجرا کرتا ہے۔ لیکن جسم کی لطافت کی وجہ سے جب اسکے وجودی خواص میں اچانک حب یا تصور سے جوش آتا ہے اسوقت ہمہ تن محویت ہو جاتا ہے۔ اور جسم کے لطیف ہونے کی وجہ سے حواس اور تعقل کا رابطہ منقطع ہو جاتا ہے اس پر یکسر محویت طاری ہو جاتی ہے۔ ایسے اولیا کی کیفیت جنکا قلب وشعور وتعقل قوی ہوتا ہے۔ انکی جسمانی ہیئت مستقل ہوتی ہے۔ عالم محویت میں جب ان پر جذب کی کیفیت طاری ہو جاتی ہے۔ تو یہ اسی جذب کی کیفیت سے متاثر ہو کر عالم محویت میں پکار اٹھتے ہیں۔ میں عیسٰی ہوں۔ میں ابراہیم ہوں۔ میں موسٰی ہوں۔ میں محمد ہوں۔ میں اللہ ہوں۔ (اَنَا عِیْسٰی ۔ اَنَا اِبْرٰهِیْمُ ۔ اَنَا مُوْسٰی ۔ اَنَا مُحَمَّدٌ" رَّسُوْلُ اللّٰہ ۔ اَنَا اَللّٰہ۔ سُبْحَانِیْ مَا اَعْظَمُ الشَّانِیْ) (اس کی تشریح گزشتہ صفحات پر ہو چکی ہے) اور جب محویت ختم ہو جاتی ہے۔ تو پھر اپنے حواس میں مستقل ہوتے ہیں۔

عالم باطن میں چار خصوصی نور ہیں۔ ایک لطیفۂ عیسوی۔ دوسرا لطیفۂ موسوی۔ (باقی حاشیہ اگلے صفحہ پر)

میں جذب کی یہی کیفیت ہوتی ہے جیسے عالم ملکوت میں۔ ولی کامل۔ ولی اکمل کی روح میں جذب ہو جاتا ہے۔ اور ولی اکمل کی روح نور محمدیؐ میں جذب ہو چکی ہوتی ہے۔ اسلئے عالمِ جبروت میں دونوں روحوں (ولی کامل ولی اکمل) کو حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کے نور سے مشاہدہ ہوتا ہے۔ یعنی یہاں بذات خود حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کا نور ہی (جذب کے اعتبار سے) شاہد کی حیثیت رکھتا ہے۔ ولی

(بقیہ حاشیہ گزشتہ صفحہ) تیسر الطیفۂ ابراہیمی۔ چوتھا لطیفۂ محمدیؐ (یا لطیفۂ اخفا) اوران چہار انوار کی کیفیت قلب میں بھی ہوتی ہے۔ ان لطائف کے الگ الگ نوری رنگ ہوتے ہیں لطیفۂ عیسوی کا سبز رنگ ہوتا ہے۔ لطیفۂ موسوی کا رنگ نیلگوں یا مائل بہ سُرخی۔ لطیفۂ ابراہیمی کا رنگ سفید۔ لطیفۂ محمدی کا رنگ سیاہ ہوتا ہے۔ سیاہ رنگ ہونے کی نسبت سے اسے لطیفۂ اخفا بھی کہا جاتا ہے۔ ایک شاہد کو عالم باطن میں یہ انوار اپنی رنگوں کے ساتھ مشاہدہ میں آتے ہیں۔ لیکن یہ کیفیتیں اپنی ابتدائی رنگت میں جاذب نہیں ہوتے ہیں۔ بلکہ ایک مبتدی بھی ان انوار کو دیکھتا ہے۔ ابتدائی طور جب ایک مبتدی قلب کے ذریعے مشاہدہ کرتا ہے تو اسے کبھی سبز رنگ۔ کبھی سرخ رنگ کے انوار محسوس ہوتے ہیں۔ یہ انوار اپنی ابتدائی کیفیت میں ہلکے نظر آتے ہیں۔ کبھی ان میں قبض واقع ہوتا ہے (کبھی دیکھنے میں آتے ہیں کبھی دیکھنے میں نہیں آتے ہیں) جب مبتدی کی قوت مشاہدہ مستقل ہو جاتی ہے۔ تو اسے ہر کیفیت سفید نور میں مشاہدہ ہوتی ہے۔ یہ کیفیت ہر وقت مستقل رہتی ہے۔ اسے نور ابراہیمی کہتے ہیں۔ اسی حالت میں اگر کبھی انوار تیز ہو جائیں اور مبتدی کی قوتِ مشاہدہ قوی نہ ہو (یعنی اسکے وجود کا تزکیہ نہ ہوا ہو) تو اچانک سیاہ رنگ کا نور طاری ہو جاتا ہے اس سیاہی میں انسان کوئی کیفیتِ نوری محسوس نہیں کرتا۔ اسکی مثال ایسی ہوتی ہے جیسے کوئی شخص رات کے اندھیرے میں محسوس کرتا ہو۔ اس کیفیت کے طاری ہونے کے بعد جب تک انسان کا تزکیہ مجاہدہ پورا نہ ہو تب تک سفید نور محسوس نہیں ہوتا۔ دراصل یہ کیفیت اصلاح کے طور وارد ہوتی ہے۔ جب ایک مبتدی پر اچانک تیز انوار (اس کے مراتب میں سے) طاری ہوں۔ اگر یہ انوار براہ راست قلب و دماغ تک آ جائیں۔ تو قلب و دماغ میں قوت نہ ہونے کے باعث انسان پر محویت طاری ہو جاتی ہے۔ اور انسان میں جذب کی کیفیت طاری ہوتی ہے۔ اسلئے ایسے سلسلہ میں جس میں سالکانہ طریق اختیار کیا جائے۔ یہ نور خود بخود طاری ہو کر اس قلب و دماغ پر چھا جاتا ہے۔ اور اس سیاہ نور میں کوئی اور نور مشاہدہ میں نہیں آتا ہے۔ اسلئے اسے لطیفۂ اخفا کہا جاتا ہے۔ لطیفۂ اخفا محض سیاہ رنگ میں ہی مشاہدہ نہیں کیا جاتا۔ بلکہ مراتب کے لحاظ سے اسے سفید اور سنہری رنگ میں بھی مشاہدہ میں لایا جاتا ہے۔

کامل اور ولی اکمل نور محمدیؐ میں جذب ہونے کی وجہ سے صرف نور محمدیؐ تک جذب ہوتے ہیں اور اسی نور کا مشاہدہ کرتے ہیں۔ اسکے بعد عالم لاہوت میں خود حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کی روح جذب ہوتی ہے۔ اسلئے نور الٰہی میں حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کا جذب ہونا۔ اور قرب وعرفان کا حاصل ہونا متصور ہوتا ہے۔ البتہ اس جذب ومشاہدہ کو ایک عارف بھی محسوس کرتا ہے کیونکہ اس کی روح بھی نور محمدیؐ میں جذب ہوئی ہوتی ہے۔ اس جذب کی کیفیت یہ ہوتی ہے۔ کہ جونہی روح محمدیؐ ذات الٰہی میں جذب ہوتی ہے اس وقت نورِ الٰہی کا جو تاثر نور محمدیؐ پر آتا ہے۔ اس کیفیت کا اثر ولی کامل کی روح پر (جو ولی اکمل کے ذریعہ نور محمدیؐ میں سمائی ہوتی ہے) بھی آتا ہے۔ یہی عکس قلب پر وارد ہوتا ہے۔ اور قلب سے شعور تک آتا ہے۔ تو انسان یہ سمجھتا ہے۔ کہ میں ذات الٰہی کا مشاہدہ کرتا ہوں۔ اس کیفیت (مشاہدہ ذات الٰہی) کا اگرچہ مشاہدہ جذب کی حالت میں ہی ہوسکتا ہے لیکن تینوں کیفیتوں (روحوں) کے ایک ہی وجود میں آنے کی کیفیت میں ہر روح الگ الگ تصور میں آتی ہے۔ یعنی جب ولی کامل کو ذاتِ الٰہی کا مشاہدہ ہوتا ہے۔ تو وہ اپنے ہمراہ ولی اکمل اور حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کے وجود اقدس کو بھی پاتا ہے۔ اسلئے جذب کے تحت جب تک ولی کامل کو ولی اکمل اور حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کے وجود کا تصور ذات الٰہی کے مشاہدہ میں نہ آئے۔ تو وہ نور (جس میں ولی اکمل اور حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کا تصور نہ پایا جائے) نور الٰہی نہیں ہوتا ہے۔ اور جب ولی کامل ذات الٰہی کے مشاہدہ میں ولی مکمل بن جاتا ہے۔ تو ولی اکمل ہر مشاہدہ میں اسکے ہمراہ ہوتا ہے۔ جب تک ولی اکمل اسکے تصور میں شامل نہ ہو یہ ولی مکمل نہیں کہلاسکتا کیونکہ اس حالت میں یہ ولی اکمل کی راہنمائی میں ہی ہوتا ہے۔ ولی مکمل اور ولی اکمل دونوں کو ایک ہی ذات الٰہی کا مشاہدہ ہوتا ہے۔ اس حالت میں دونوں کا مشاہدہ مساوی ہوتا ہے۔ لیکن فرق یہ ہوتا ہے۔ کہ ولی اکمل کے ساتھ اسکا راہنما (ولی اکمل کا ولی اکمل) نہیں ہوتا ہے بلکہ یہ ہستی بذات خود مرتبۂ خلافت پر فائز ہوتی ہے اسلئے ولی مکمل تب تک ولی اکمل نہیں ہو سکتا جب تک کہ اسے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور ولی اکمل کی طرف سے سندِ خلافت حاصل نہ ہو۔ جب ولی مکمل کو سندِ خلافت حاصل ہو تو پھر اسے ولی اکمل کی معیت کی ضرورت نہیں رہتی۔ یہ سند اسے

اس وقت ملتی ہے جس وقت اس میں راہنمایانہ صلاحیت پیدا ہو کر اسکے علم و عرفان کی کلی طور تکمیل ہو جائے پھر اسے خود کسی راہنما کی ضرورت نہیں رہتی۔ دوسرے اسے خلافت اسوقت ملتی ہے۔ جب ایک قائم مقام خلیفہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی جگہ خالی ہو کر ایک نئے خلیفہ کی ضرورت محسوس ہو۔ وہ وقت ولی اکمل کی موت کے بعد ہوتا ہے۔ چونکہ امت کو ایک عالم راہنما کی ضرورت ہوتی ہے۔ اسلئے ایک ولی کی موت پر اسکی جگہ ایک زندہ ولی مکمل کو ولی اکمل کی حیثیت سے یہ جگہ (مقام) حاصل ہوتی ہے۔ جب تک ولی اکمل مسند خلافت پر قائم نہیں ہوتا۔ یہ بھی طالب (مرید) کی حیثیت سے ولی اکمل کے ماتحت رہتا ہے۔ البتہ ولی اکمل کی حیثیت سے یہ شخص بھی بیعت کر سکتا ہے۔

فی زمانہ دیکھنے میں آتا ہے۔ کہ کثرت سے طریقت کا اجرا ہوتا ہے۔ ہر شخص بجائے خود ایک ولی بنا ہوا ہے۔ اکثر دار العلوم۔ مزارات۔ میں عالم پائے جاتے ہیں۔ اور بیعت کرتے ہیں۔ ان میں علماء دار العلوم (شرعی عالم) سنت نبویؐ کے تحت بیعت لیتے ہیں۔ کہ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے اکثر مواقع میں لوگوں میں سے مردوں عورتوں سے بیعت لی ہے۔ چنانچہ اسکا ذکر قرآن میں بھی آتا ہے۔ لَقَدْ رَضِیَ اللّٰهُ عَنِ الْمُؤْمِنِیْنَ اِذْ یُبَایِعُوْنَكَ تَحْتَ الشَّجَرَةِ۔ یَدُاللّٰهِ فَوْقَ اَیْدِیْهِمْ ۔ اس آیت کا شانِ نزول ایک خصوصی واقعہ ہے۔ جب حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ کو مکہ میں بطور سفیر (ایلچی) بھیجا تو خبر آئی کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کو شہید کیا گیا۔ اسوقت مسلمان جہاد پر نہیں جا رہے تھے۔ بلکہ حج کرنے جا رہے تھے۔ اسلئے انکے پاس جہاد کا کوئی سامان موجود نہ تھا۔ یہ ضروری تھا کہ بغیر سامان حرب کے کفار کے مقابلہ میں اسوقت جہاد کرنے میں مسلمانوں کو جانی نقصان پہنچتا۔ اس حالت میں حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے جہاد کا ارادہ کر لیا۔ حضرت عثمانؓ کی شہادت کی خبر اس امر کی دلیل تھی کہ کفار کی یہ جرات کسی قوی قوت و سامان کے تحت ہے۔ اسلئے ایسے موقع پر جبکہ ہر شخص یہ بخوبی جانتا تھا۔ کہ اس وقت جہاد میں جانا موت کو پانا ہے۔ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے ہر شخص سے عہد لیا کہ جہاد میں جائیں گے اور بغیر سامان جنگ کریں گے۔ خواہ اپنی جان چلی جائے لیکن پیٹھ پھیر کر بھاگ نہ جائیں گے۔ یہ چیز مسلمانوں کیلئے آزمائش تھی کہ

کون اللہ اور اسکے رسول کا ساتھ دینے والا ہے۔کون اس پر اپنی جان دینے والا ہے۔سو اصحاب رسول اللہ نے حضورؐ کے ہاتھ پر بیعت کر لی۔ گو اصحاب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ جہاد کرنے پر ہر وقت تیار رہتے تھے۔لیکن یہ مقام نہایت اہم تھا اسلئے اس مقام پر ایک حقیقی حب کرنے والا ہی ٹھہر سکتا تھا۔ یہاں بیعت کا طریق کیا تھا کہ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کے سیدھے ہاتھ پر بائع کا ہاتھ اوپر آجاتا۔اور ہر مسلمان سے جہاد کرنے کا عہد لیا جاتا۔ کہ میں ہر حال میں محمد رسول اللہؐ کے حکم پر اپنی جان نثار کرنے پر خوشی سے راضی ہوں۔ یہ بیعت ایک نازک مرحلہ پر تھی اسلئے ہر مسلمان کیلئے ایک کسوٹی اور مومن ہونے کی سند تھی۔ چنانچہ یہی سند اللہ تعالیٰ نے مومنوں کو عطا کی کہ تمہاری جانثاری اور محبت کو دیکھ کر اللہ خوش ہوا اور تم سے راضی ہوا۔اور اسی رضا اور خوشنودی کا اظہار یَدُ اللّٰہِ فَوْقَ اَیْدِیْھِمْ سے کیا گیا۔یعنی جب دو ہاتھوں میں مصافحہ ہوتا ہے تو تیسرا ہاتھ اسوقت طرفین میں سے ایک کا اوپر رکھا جاتا ہے۔ جب شدت محبت کا اظہار کیا جائے۔سو اللّٰہ کا ہاتھ تیسرا انکے ہاتھوں کے اوپر تھا۔ سے یہی مراد ہے۔ کہ شدّتِ محبت میں اللہ کا ہاتھ دونوں ہاتھوں کے اوپر تھا۔سو یہ بیعت تو بیعت رضوان (باغ کی بیعت) یا بیعت شجر (درخت کے نیچے بیعت) کے نام سے تعبیر دی جاتی ہے۔اس سے صرف بیعت کا طریق مخصوص کیا گیا۔ کہ سنتِ نبویؐ میں بیعت کس طرح کی جاتی ہے۔اسی طرح اکثر مقامات پر حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے بیعت لی ہے۔اور عورتوں سے بھی بیعت لی ہے۔یٰۤاَیُّھَا النَّبِیُّ اِذَا جَآءَكَ الْمُؤْمِنٰتُ یُبَایِعْنَكَ عَلٰۤى اَنْ لَّا یُشْرِكْنَ بِاللّٰهِ شَیْــٴًـا وَّ لَا یَسْرِقْنَ وَ لَا یَزْنِیْنَ وَ لَا یَقْتُلْنَ اَوْلَادَهُنَّ وَ لَا یَاْتِیْنَ بِبُهْتَانٍ یَّفْتَرِیْنَهٗ بَیْنَ اَیْدِیْهِنَّ وَ اَرْجُلِهِنَّ وَ لَا یَعْصِیْنَكَ فِیْ مَعْرُوْفٍ فَبَایِعْهُنَّ وَ اسْتَغْفِرْ لَهُنَّ اللّٰهَ ط (پارہ ۲۸ سورۃ ۶۰ آیت ۱۲) لیکن ان بیعتوں میں واقعات بھی ظاہر ہیں کہ کن وجوہات پر بیعت لی گئی۔لیکن طریقت کے لیے حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے کسی جگہ بھی بیعت نہیں لی۔ اسلئے معلوم ہوتا ہے۔ کہ بیعت لینا طریقت میں سنت نہیں البتہ یہ طریقہ ایک خلیفہ سے جاری ہوا ہے۔ جو حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کے بعد آپکے خلیفہ کے مقام پر قائم ہوتا ہے۔ کیونکہ بیعت صرف ہاتھ پکڑ کر عہد لینا ہی نہیں ہوتا ہے۔ کہ امر کی تاکید اور نہی سے مانع کا عہد لیا

جائے۔ بلکہ بیعت کے وقت جب ولی اکمل ایک طالب کا ہاتھ پکڑ کر اس سے شریعت کی پابندی کا عہد لیتا ہے۔تو اسکے ساتھ ہی عالم باطن میں وہ طالب کو (روح کو) اوّل اجلاس محمدیؐ میں حضور علیہ الصلوٰہ والسلام کے سامنے پیش کرتا ہے۔ کہ یہ شخص عہد کرتا ہے۔ کہ میں شریعت کے ساتھ طریقت پر بھی عامل رہوں گا۔ ولی اکمل اور طالب کا اقرار گویا حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کے سامنے ہوتا ہے۔ اس حالت میں ایک طالبِ حقیقت کو ہر حال میں اپنے عہد کا پابند رہنا پڑتا ہے اور اس عہد کی خصوصیّت یہی ہوتی ہے۔ کہ اس طالب کا نام دربار رسول اللہؐ کے رجسٹر میں درج ہو جاتا ہے۔ اور اسکے لیے صراط اللہ کی راہیں کھول دی جاتی ہیں۔ چنانچہ فی زمانہ طریقت میں صرف بیعت کرنے سے ہی آدمی ولی بن جاتا ہے۔ ایک شخص کے لیے یہ کافی ہے۔ کہ وہ کسی نام نہاد ولی سے بیعت کرے اسکے بعد اُس پر کوئی ذمہ داری عائد نہیں ہوتی۔ طریقت میں بیعت کرنا ایک رسم ہو چکی ہے۔ کہ بے مُرشد آدمی نجات نہیں پا سکتا اسلئے کسی شخص سے بیعت کرنی ضرور ہے۔ اسے یہ معلوم نہیں کہ بیعت کس لیے کی جاتی ہے۔ اور بیعت کے بعد انسان پر کیا ذمہ داری عائد ہوتی ہے۔ بلکہ بیعت کرنے کے بعد وہ نماز کی خصوصیت کو بھی محسوس نہیں کرتا کہ مسلمان کے لیے شریعت کی پابندی فرض ہے۔ اور پیر حضرات بھی دلیری سے ہر شخص کی بیعت کرتے ہیں۔ انکے نزدیک بیعت صرف ایک شخص کو اپنے حلقۂ عقیدت میں لانا ہے۔ کہ یہ شخص ہماری طرف رجوع کرے اور ہمارے مریدوں میں شامل رہے۔ حقیقت یہ ہے۔ کہ ان حضرات میں کوئی بھی ایسا شخص نہیں جس سے بیعت کی جائے۔ کیونکہ فی زمانہ نہ عالم شریعت میں تبلیغی صلاحیت موجود ہے۔ نہ اس میں سنت نبوی کی صفتیں ہیں۔ عالم طریقت میں ولی اکمل تو کُجا ولی کامل بھی نہیں پایا جاتا ہے اسلئے فی زمانہ حقیقی علم کسی شخص سے حاصل ہونا۔ ناممکن ہے۔

یہ حقیقت ہے کہ طریقت کا طریق شریعت میں ایک مخصوص اور افضل طریق ہے۔ اور اسکی خصوصیت میں ایک ولی کو عام انسانوں کے مقابلہ میں بے شمار انعام (مراتب و مشاہدہ اسرار الٰہی) حاصل ہوتے ہیں۔ اسلئے قرآن میں صِرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ ۔ صِرَاطَ اللّٰهِ ۔ اَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ ۔ میں صرف وہ لوگ شمار کیے جاتے ہیں جنکے متعلق قرآن خود یہ خصوصیت ظاہر کرتا ہے کہ اَلَّذِيْنَ اَنْعَمَ اللّٰهُ

عَلَيْهِمْ مِّنَ النَّبِيّٖنَ وَالصِّدِّيْقِيْنَ وَالشُّهَدَآءِ وَالصّٰلِحِيْنَ ج (پارہ ۵ سورۃ ۴ آیت ۶۹) جنہیں صراط المستقیم حاصل ہوا۔ انہیں انعام ملے وہ لوگ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی جماعت کے لوگ ہیں۔ وہ حضرت عمرؓ۔ حضرت علیؓ۔ حضرت امام حسینؓ وحسنؓ کی جماعت کے لوگ ہیں۔ وہ لوگ حضرت موسیٰؑ وعیسیٰؑ کی جماعت کے لوگ ہیں۔ وہ اصحاب رسول اللہؐ (اَلَّذِیْنَ مَعَکَ) کی جماعت کے لوگ ہیں یہ سب لوگ مقبول بارگاہِ حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہیں۔ اسلئے انکی راہ پر چلنے والا بھی دربار رسول اللہؐ میں شامل کیا جاتا ہے۔ اسلئے بیعت کیلئے لازمی ہے۔ کہ بیعت کرنے والا ولی اکمل ہو۔ صاحب مشاہدہ ہو۔ یَتْلُوْا عَلَیْهِمْ اٰیٰتِهٖ وَیُزَکِّیْهِمْ وَیُعَلِّمُهُمُ الْکِتٰبَ وَالْحِکْمَةَ کے تحت ایک طالب کی اصلاح وتزکیہ کرانے والا ہو۔ اگر یہ خوبیاں ایک شخص میں نہ پائی جائیں۔ تو وہ شخص نہ ولی کہلا سکتا ہے نہ بیعت کرنے کا کسی طرح بھی حق رکھتا ہے۔ ایک عالم (عالم شریعت) اگر چہ اپنے علم و تفسیر وفلسفہ میں کمال حاصل کئے ہوئے ہو۔ تو اسکا تعلق اسکی ذات سے ہوتا ہے۔ اسکا اثر اسکے لیے نفع بخش ہوسکتا ہے۔ وہ اگر بیعت لیتا ہے۔ تو کونسی بیعت لیتا ہے؟ وہ انسان کیلئے کس چیز کا ذمہ دار بن سکتا ہے؟ اگر ذمہ دار بن نہیں سکتا تو اسے بیعت کے نام سے بیعت لینے کا کوئی حق حاصل نہیں۔ اگر بیعت سے مراد اصلاح لی جاتی ہے۔ تو یہ اصلاح ایک عہد کے بغیر بھی کی جاسکتی ہے۔ بلکہ اصلاح کرنا ایک عالم پر اپنے علم کے اعتبار سے فرض ہے۔ لیکن اس اصلاح میں تلاوت۔ تزکیہ۔ علم۔ حکمت کی خوبی اگر عالم میں نہ پائی جائے (صرف علم ہی علم ہو) تو وہ شخص اصلاح کرنے کا بھی مجاز نہیں۔ بلکہ اس شخص پر اپنی ذمہ داری عائد ہوتی ہے۔ کہ دین رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم حاصل ہونے کے ساتھ ساتھ اسکے لیے یہ سنت نبویؐ کی خوبیاں حاصل کرنا ایک فریضہ ہے۔ جب تک اسے یہ خوبیاں حاصل نہ ہوں وہ شخص خود اپنے لئے اپنے کردار کی کمزوری کا ذمہ دار ہوگا۔ کیونکہ اسکی کمزوری کے باعث علم ایک مقفل صندوق میں آجاتا ہے۔ جس علم سے انسان تزکیہ۔ علم وحکمت حاصل کرنے سے عاری ہوتا ہے۔ ایک عالم کے علم سے قرآن کے معنی۔ یا تفسیر حافظہ میں جمع کرنے سے علم کی تکمیل نہیں ہوتی۔ جب تک کہ اس علم سے کلی طور عمومی حیثیت سے انسانی قلوب منور نہ ہوں۔ سو ایسے عالم جو بیعت کے نام سے

لوگوں سے بیعت لیتے ہیں جائز نہیں۔ البتہ عام لوگوں کو راہ راست پر لانے کیلئے ایک طریق استعمال کیا جائے تو اسے رسمی تلقین یا تبلیغ کے نام سے موسوم کیا جانا چاہیے۔ اسکے لیے کسی شخص سے عہد لینے کی ضرورت نہیں ہوتی۔ اکثر لوگ ایسے بھی پائے جاتے ہیں جو گدی نشین۔ یا کسی جگہ مقام کرتے ہیں اور خود کو ولی کہلاتے ہیں۔ یہ لوگ ایک رسمی عبادت (شریعت کی پابندی) پر عامل ہوتے ہیں اور اسی شرعی لبادہ میں لوگوں پر اپنی ولایت مسلط کرتے ہیں۔ انکا تاثر عوام پر کثرت کے ساتھ ہوتا ہے۔ چنانچہ ایسے لوگوں کے مریدوں میں اعلیٰ طبقہ کے دنیادار لوگ اور تعلیم یافتہ لوگ بھی پائے جاتے ہیں۔ اور انکی ولایت کو بدرجہ کمال تسلیم کیا جاتا ہے۔ لیکن ان بزرگوں کی تعلیم و ہدایت صرف قال (گفتگو) تک ہی محدود ہوتی ہے۔ ان میں کوئی شخص اتنا دعویٰ بھی نہیں کرسکتا ہے کہ وہ اول اجلاس محمدیؐ کا سند یافتہ ولی ہے۔ نہ ہی وہ اسکی کوئی دلیل ہی دے سکتے ہیں۔ باوجود اسکے انہیں فنا فی اللہ تسلیم کیا جاتا ہے۔ اسکی وجہ علم شریعت و طریقت سے ناواقفی ہے۔ فی زمانہ جب کہ مسلمان صحیح طور شریعت کا پابند بھی نہیں۔ اسکے باوجود تقریباً پچاس فیصد لوگ اولیا کی صورت میں مزاروں۔ گدیوں اور درباروں میں۔ لوگوں کو اپنی طرف رجوع کراتے ہیں۔ پیری مریدی کا سلسلہ جاری کر رکھا ہے۔ اور لوگوں سے بیعت لے رہے ہیں — سالانہ عرس پر بے شمار عقیدت مندوں کا ہجوم ہوتا ہے۔ لاکھوں روپوں کا نذرانہ چڑھتا ہے اور عقید تمندوں کا یہ حال ہے۔ کہ صرف مریدی۔ اور بے معنی بیعت پر پیر سے وابستگی رکھتے ہیں۔ اور اکثر لوگ ایسے ہیں جو بھولے سے ایک وقت نماز نہیں ادا کرتے۔

عالم لوگوں کا یہ عالم ہے۔ کہ شریعت کو ایک علیٰحدہ علم کی صورت میں اپنا کر طریقت کی مخالفت کرتے ہیں۔ انہیں اپنے علم پر ناز ہے۔ اس میں شک نہیں کہ انہیں علم کے حاصل ہونے پر ناز ہونا چاہیے۔ واقعی یہ لوگ عوام کے مقابلہ میں علم کے لحاظ سے افضل ہیں۔ لیکن باوجود کثرت علماء کے۔ کثرت سے دین سے بیزاری پائی جاتی ہے۔ بعض علماء دین پھیلانے میں کوشاں بھی رہتے ہیں۔ لیکن انکی ہدایت میں کثرت سے مبالغہ پایا جاتا ہے۔ اسکی وجہ یہ ہے۔ کہ یہ عوام کے حالات وعقائد پر ہی علم کا اجرا کرتے ہیں۔ کوئی شخص قرآن سے صرف مادیت کی ترقی کا خواہاں ہے۔ وہ مسلمان کو

قرآن کی ہر آیت میں مادی ترقی کی تفسیر دکھاتا ہے۔ یہاں تک کہ اس روحانی دین کی شکل بالکل مسخ ہو جاتی ہے۔ لیکن آرام طلب اور دین سے بیزار مسلمان اسے حقیقت سمجھنے پر آمادہ ہوتا ہے۔ یہ آمادگی صرف مختلف غلط عقائد کی ''ضد'' اور ''رد'' ہوتی ہے۔ کہ مسلمان دوسرے عقائد کی طرف رجوع نہ کرے۔ وہ عقائد کیا ہیں۔ ملاں اور درویش کے عقائد۔ ملاں کے عقائد شرعی عقائد ہوتے ہیں۔ لیکن یہ بھی ایک طرف ولایت (طریقت) کی تکذیب کرتا ہے۔ دوسری طرف مادیت کی تکذیب کرتا ہے۔ اسی عقائد کی تکذیب میں وہ قرآن کو انکے رد میں پیش کرتا ہے۔ ملاں چونکہ علم معانی۔ تفسیر اور احکام بتاتا ہے۔ لیکن قرآن کی روح۔ تلاوت۔ تزکیہ۔ علم وحکمت اسکے پاس نہیں۔ اسلئے اسکے عقائد کو بوسیدہ اور پرانی باتوں سے تعبیر دیا جاتا ہے۔ ادھر درویش میں اکملیت نہیں۔ اسکا علم بھی من گھڑت عقائد کا پلندہ ہے۔ اور اکثر عقائد (روحانیت سے خالی) شریعت اور مادیت کی ضد ہوتے ہیں اسلئے ہر عقیدہ ایک دوسرے کی مخالفت پر برسر عمل ہے۔ ایسی حالت میں نہ مادہ پرست صحیح علم پیش کرسکتا ہے۔ نہ ملاں کے علم پر مسلمان کان دھرتا ہے۔ نہ ولی کے مافوق الفطرت علم کو کوئی تسلیم کرنے پر آمادہ نظر آتا ہے۔ اس طرح جو بھی کسی عقیدہ کی طرف مائل ہے۔ وہ ''دل کی چاہ'' کی وجہ سے آرام طلبی اور لاعلمی کی وجہ سے اپنا اپنا عقیدہ جمائے بیٹھا ہے۔ اور اگر حقیقی علم پر کوئی عامل ہو۔ تو اس علم سے ہر شخص دور بھاگتا ہے۔ اور اسے بھی مبالغہ سمجھا جاتا ہے۔ لیکن کوئی شخص بھی کمالِ علم کے ذریعہ کسی عقیدہ کو نہ قبول کرتا ہے نہ رد کرسکتا ہے۔

الغرض حقیقی علم کے لیے یہ ضروری ہے۔ کہ علم قرآن کا ہو۔ قرآنی شریعت کا ہو۔ عالم کو یہ مادہ حاصل ہو کہ يَتْلُوا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِهٖ وَيُزَكِّيْهِمْ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ ۔ وہ شخص عقائد کی ضد اور رد میں قرآن کی اپنی سمجھ کے مطابق تفسیر کرنے والا نہ ہو بلکہ قلبی فِقہ (القا الٰہی) کے ذریعہ تفسیر کرنے والا ہو۔ وہ شخص پاکیزہ فطرۃ۔ پاکیزہ اخلاق۔ پاکیزہ اکل کا حامل ہو۔ تاکہ اسکے قلب میں پاکیزگی پیدا ہو تب ہی اسکے قول میں قوام آسکتا ہے۔ تب ہی اسکی بات دلوں پر (نوری) اثر کرسکتی ہے۔ ورنہ زمانہ قدیم میں خوارج۔ معتزلہ۔ قدریہ۔ جہمیہ۔ کرامیہ۔ مرجیہ۔ قرامطہ۔ فرقے اسی علمی عقیدہ کے اختلاف سے ہی پیدا ہوئے ہیں۔ جنہوں نے ایک ہی قرآن کے علم کے مختلف اور متضاد

عقائد و تفاسیر پیدا کر دیں۔

اسی طرح علم طریقت کیلئے ایک ولی اکمل ہو جس کے پاس حقیقی اور نتیجہ خیز علم ہو اور اس سے حقیقی شریعت کا اجرا ہو اور نتیجہ کے طور حقیقی عالم پیدا ہوں۔ یہ شخص اپنے علم میں مندرجہ بالا آیت کے تحت اثر پیدا کرنے والا ہو۔ اور صاحبِ مشاہدہ و عرفان ہو۔ ایسے ہی شخص کو بیعت کرنے کا حق حاصل ہوتا ہے ـــــ یہی شخص۔ ایک طالب کے اختیارات وارادہ کو خرید کر اسے ساکت کر کے اسکے نفع ونقصان کا ذمہ دار بن سکتا ہے۔ غور کرنے کا مقام ہے۔ کہ جو شخص محض ظاہری علم سے بھی بے بہرہ ہو۔ اور ابھی ولی کامل کی سند بھی اسے حاصل نہ ہو۔ بلکہ اسکے وہم و گمان میں بھی یہ مقام ملکوتی نہ ہو کسی شخص کو خرید کر اور کیا کر سکتا ہے۔ کہ خود بھی گمراہ ہو اور دوسرے کو بھی گمراہ کرے۔

تصوّر: جذب کے باب میں بیان ہو چکا ہے۔ کہ ولی اکمل کی روح عالم ناسوت کی ابتدائی منزل سے تا ذات احد وسیع ہوتی ہے اور ولی اکمل کی راہنمائی میں صراط اللہ کے مشاہدہ میں پیر اکمل کی روح ہی ھدایت[1] کیلئے وسیلہ بن سکتی ہے۔ اسلئے طریقت میں عرفان راہ الٰہی کے مشاہدہ میں ضروری ہے۔ کہ پہلے ولی اکمل کی روح کا مشاہدہ کیا جائے۔ مشاہدہ کا طریق جذب سے ہوتا ہے۔ اور جذب کیلئے ضروری ہے کہ طالب کی روح ولی اکمل کی روح کے قریب ہو کر اس میں جذب ہو جائے۔ جب اس کیفیت کو مشاہدہ میں لانا ہو۔ تو اسکے لیے تصور شیخ ضروری ہوتا ہے۔

تصوّر سے مراد تصویر قائم کرنا۔ یا صورت قائم کرنا۔ یہ ایک فطری امر ہے۔ کہ ایک شخص کی عدم موجودگی میں اسکی مادی تصویر (وجود) قائم کرنے سے انسان ہر حال میں قاصر ہے۔ نہ تو ایک آدمی (مادی جسم) خود ایک سے زائد مقامات پر اپنا وجود (مادی) قائم کر سکتا ہے۔ نہ ہی دوسرا کوئی آدمی کسی آدمی کا وجود اپنے سامنے (حواس میں) مادی حالت میں محسوسات میں لا سکتا ہے۔ لہٰذا اگر کسی شخص کی صورت ذہن میں آئے تو اسکا مطلب یہ ہے۔ کہ یہ صورت غیر مادی ہوتی ہے۔ اور یہ امر بھی مسلمہ ہے۔

---

[1] ہدایت کے معنی طالب کو مطلوب تک پہنچانا۔ یعنی ایک منزل سے دوسری منزل حاصل کرنا۔

کہ خواہ صورت مادی ہو یا غیر مادی۔ دونوں صورتیں انسانی ذہن ہی محسوس کرتا ہے۔ انسانی ذہن میں محسوس کرنے والا (ذہنی) حصہ دماغ کا وہ حصہ ہے۔ جسے متصرفہ کہتے ہیں۔ حواس کے ذریعہ آگاہ ہونے والا حصہ تعقل کہلاتا ہے۔ اور تعقل کو جو کیفیت کسی صورت کی حاصل ہوتی ہے۔ وہ پہلے حافظہ میں آجاتی ہے۔ غور طلب یہ امر ہے۔ کہ جو صورت حافظہ میں ہوتی ہے۔ کیا وہ مجسم ہوتی ہے۔ یا عکسی؟ مجسمہ تو حافظہ میں آنہیں سکتا۔ کیونکہ حافظہ میں نہ تو اتنی گنجائش ہے۔ کہ وہاں ایک انچ کے حصہ میں آدمی سما سکے۔ نہ ہی مجسمہ کو حافظہ تک پہنچنے کا کوئی راستہ ہے کہ حافظہ میں بیٹھ کر تعقل کے سامنے آجائے۔ تو ثابت ہوتا ہے۔ کہ جس جگہ مجسمہ خود نہ پہنچ سکے۔ اس جگہ اگر اسکی تصویر ہو بہو آجائے۔ تو وہ مجسم نہیں ہوتی۔ بلکہ غیر مجسم ہوتی ہے۔ غیر مجسم ہونا ہی غیر مادی کہلاتا ہے۔ یعنی جہاں مادہ کا دخل نہ ہو وہاں اگر مادہ قائم ہو تو اسکی ہیئت غیر مادی ہی ہو سکتی ہے ـــــ اسلئے حافظہ میں جو تصویر آجاتی ہے۔ وہ اگر چہ مادی (مجسم وجود) ہی ہو لیکن حافظہ میں اسکی کیفیت غیر مادی ہو جاتی ہے ـــــ اسلئے حافظہ ہر کیفیت کو خواہ مجسم ہو یا غیر مجسم دونوں حالتوں میں ایک ہی ہیئت غیر مادی میں حاصل کرتا ہے اور اسی غیر مادی تصور کو اپنے میں جمع کر لیتا ہے۔ اور کسی مجسمہ کی عدم موجودگی میں یہی غیر مادی مجسمہ اپنی ایک ہی ہیئت کو بار بار دہراتا ہے۔ اسکا مطلب یہ ہوتا ہے۔ کہ ایک مجسمہ کو کئی بار تصور میں لایا جائے تو وہ صرف ایک ہی تصویر ہوتی ہے۔ جو بار بار تعقل کے سامنے آجاتی ہے ـــــ یہی کیفیت تصور کی ہوتی ہے۔ کہ ایک شخص کو دیکھ کر حافظہ میں اسکی ہیئت جمع ہو جاتی ہے جس طرح انسان کے ایک مجسم آدمی کا عکس اسکی موجودگی میں تعقل کے سامنے آجاتا ہے۔ اسی طرح یہی تصویر اسکی عدم موجودگی میں اسی ہیئت میں تعقل کے سامنے آجاتی ہے۔ گویا موجودگی اور عدم موجودگی کی تصویر میں کوئی فرق نہیں ہوتا ہے۔ جب ایک شخص کسی دوسرے شخص کی صورت حافظہ سے تعقل کے سامنے لاتا ہے تو گویا اس تصور سے شخص حاضر ہو جاتا ہے۔ کیونکہ حاضر و غیر حاضر کے تصور میں ایک ہی ذہنی وجود تعقل کے سامنے ابھر آتا ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے۔ کہ حاضر اس شے کو کہتے ہیں جو حافظہ سے تعقل کے سامنے آجائے۔ اور غیر حاضر وہ شے ہوتی ہے۔ جو حافظہ سے تعقل کے سامنے نہ آئے۔ حاضر میں حواس (آنکھ) کے ذریعہ مجسم سامنے ہو کر حافظہ میں خود

بخود حاضر ہو جاتا ہے۔ایسی صورت میں حافظہ کا صورت سامنے لانا کوئی معنی نہیں کیونکہ مجسم کی صورت اور حافظہ کی صورت ـــــ حافظہ میں ایک ہی ہیئت رکھتی ہے۔ لہذا مجسم اور حافظہ کی صورت کا علیٰحدہ ہونا نہیں ہوتا ہے۔اور اگر وجود حاضر نہ ہوا۔لیکن حافظہ میں وہی صورت حاضر ہوئی جو خود اسی وجود کی ہیئت (حاضر ہونے کے وقت) تھی تو پھر وجود کی غیر حاضری تعقل کے لیے بے معنی ہوتی ہے۔اس طرح ایک مجسم اپنی غیر حاضری میں حافظہ کے ذریعہ حاضر میں شمار سمجھا جاتا ہے ـــــ یہی معنی تصور کے ہیں کہ غیر حاضر کو حاضر کے وجود میں لانا ـــــ جب ایک وجود حاضر ہو جائے۔اور مشاہدہ میں آئے۔تو اسکے وجود کی شہادت کو یقین میں لایا جاتا ہے ـــــ ''میں نے اس شخص کو دیکھا'' اس سے مراد یہ شخص حافظہ کے ذریعہ میرے تعقل میں آیا ـــــ شہادت۔سے مراد۔حاضر ہونا ہے۔گویا تصور سے مراد۔ایک شے کو مشاہدہ سے حاضر کی ہیئت میں لایا جاتا ہے۔یہی چیز تصور کہلاتی ہے۔

تصور کا وجود حواس میں آنکھ (بصر) سے پیدا ہوتا ہے۔اگر آنکھ وجود نہ حاصل کرے۔تو حافظہ صورت کا وجود پیدا نہیں کر سکے گا۔اور اس حالت میں اگر حافظہ کوئی صورت پیدا کرے۔تو اسکا مطلب یہ ہوگا۔کہ آنکھ کے بغیر حافظہ کا کوئی اور ذریعہ (بصیرت) بھی ہے۔جس سے ایک تصور اسے آنکھ سے دیکھنے کے بغیر بھی حاصل ہوتا ہے۔تصور کو یہی اہمیت وخصوصیت حاصل ہے۔کہ وہ بغیر آنکھ کے دیکھنے کے حافظہ کو ایک صورت (دِلی تصور) کا وجود فراہم کرتا ہے۔اب دیکھنا یہ ہے۔کہ حافظہ ایک صورت پیدا کرنے میں کیا کردار (پارٹ) ادا کرتا ہے۔

پیشتر اس کے متعلق بیان کیا جا چکا ہے کہ مشاہدہ میں حافظہ کیسے کیفیتیں حاصل کرتا اور جمع کرتا ہے انسان کی پیدائش میں اسکی وجودی تکمیل ماں کے پیٹ میں ہی ہوتی ہے۔اس وجودی تکمیل میں انسان کا ہر عضو مستقل صورت حاصل کر لیتا ہے۔یعنی اسکے اعضا کان۔آنکھ۔ناک۔بازو۔لاتیں۔سر۔جسم کا ہر حصہ اتنا مکمل ہو جاتا ہے۔کہ پھر اسکی صورت بدلنے میں نہیں آتی۔آخری تخلیق کے بعد پھر یہ وجود بڑھنا شروع ہو جاتا ہے۔اور ایک مقررہ وقت پر جبکہ یہ بیرونی فضا کے قابل ہو جاتا ہے۔تو اسکی ظاہری پیدائش واقع ہوتی ہے۔اس وقت اسے ایک قوتِ علم حاصل ہوتی ہے۔اسکے

کان۔ناک۔منہ۔آنکھیں۔حس برابر کام کرتے ہیں۔اور یہ حواس اسوقت پورا کام کرتے ہیں۔ آنکھ دیکھتی ہے۔کان سنتے ہیں۔مس (لامسہ) میں پورا احساس ہوتا ہے۔مثال کے طورا گر ایک بچے کا ہاتھ آگ میں چلا جائے۔تو وہ ہاتھ ضرور جلتا ہے۔اسکی جلن قوت لامسہ محسوس کرتی ہے۔اسے واہمہ حافظہ اور تعقل تک پہنچاتی ہے۔اور ہاتھ جلنے سے بچہ چیخ کر روتا ہے۔لیکن ایک بار جلنے کے بعد بچہ دوبارہ آگ کی مضرت سے خوف نہیں کھاتا ہے۔نہ ہی وہ آگ کے وجود کی کیفیت کا احساس کرتا ہے۔اگر دوبارہ آگ کے سامنے آجائے تو دوبارہ اسکا ہاتھ آگ میں چلا جاتا ہے۔اور بچہ عادتاً چیخ کر روتا ہے۔اس سے معلوم ہوتا ہے۔کہ باوجود وجودی تکمیل کے اسکا حافظہ قوی نہیں ہوتا۔جس میں ایک واقعہ جمع ہو سکے۔اسکے برعکس اسکا تعقل حافظہ سے نسبتاً قوی ہوتا ہے کہ وہ درد سے آگاہ ہوتا ہے۔اگر درد سے آگاہ نہ ہوتا۔تو بچہ آگ کی جلن سے قطعاً آگاہ نہ ہوتا کیونکہ حواس خود آگاہ نہیں ہوتے۔بلکہ تعقل آگاہ ہوتا ہے۔جیسے ایک شخص جسکا تعقل کام نہ کرتا ہو۔اگر اسی طرح آگ سے جل جائے۔وہ جلن اور درد محسوس نہیں کرتا۔جس طرح ایک وہ شخص جسکا تعقل بے ہوش کر دیا جائے۔تو اسے (اپریشن میں) کاٹا جائے جب تک اسکا تعقل بے ہوش ہے۔وہ درد کو محسوس نہیں کرتا۔اور جب اسے ہوش آتا ہے تو وہ درد محسوس کرتا ہے۔یہی کیفیت بچے کی ہوتی ہے۔بچہ سن لیتا ہے۔دیکھ لیتا ہے۔لیکن حافظہ کی عدم صلاحیت کے باعث یہ علم حافظہ میں جمع نہیں رہتا۔اسلئے معلوم ہوتا ہے۔کہ بچے کا وجود اسکی پیدائش پر مکمل ہوتا ہے۔لیکن حافظہ اپنی مستقل حالت میں قوی نہیں ہوتا ہے۔اسکی مستقل قوت اسوقت تکمیل پذیر ہوتی ہے۔جب بچہ میں قوت گویائی ظاہر ہو جاتی ہے یعنی وہ اچھی طرح سے بول لیتا ہے۔ اسکی وجہ یہی ہوتی ہے۔کہ گزشتہ زمانہ (بچپن) میں جتنی باتیں اسکے کان سے حافظہ تک پہنچتی ہیں وہ حافظہ کے رفتہ رفتہ قوی ہونے پر حافظہ میں جمع ہونے لگتی ہیں۔اور جس زبان کے الفاظ زیادہ تر اسکے حافظہ میں جمع ہوں (تواتر کے ساتھ) وہی اسکی زبان بن جاتی ہے۔جب بچے میں قوتِ گویائی پیدا ہوتی ہے۔اسکے علم کی ابتدا اسی وقت سے ہونی شروع ہوتی ہے۔اور بچہ بغیر کسی مدد کے خود بخود بولنا شروع کر دیتا ہے۔اس کے بعد حافظہ میں جو کیفیت آجائے وہ جمع ہونے لگتی ہے۔یہ بات اکثر دیکھی

گئی ہے۔ کہ بچوں میں قوتِ گویائی اگرچہ ایک وقت معین (عمر کے تقریباً تیسرے سال) پر آتی ہے۔ لیکن بعض بچے کبھی پیشتر ہی بولنا شروع کرتے ہیں اور کبھی دیر سے بھی۔ اسکی وجہ یہی ہے۔ کہ بچے کی وجودی صحت وکمزوری کی بناپر یا دماغی کمزوری وصحت کی بناپر حافظہ یا تو جلد ہی قوی ہو جاتا ہے۔ یا دیر سے قوی ہوتا ہے۔ اور اس قوت کے لحاظ سے اکثر بچے ابتدائی زمانے کے واقعات اپنی طویل عمر تک یادرکھتے ہیں اور بعض بچے بھول جاتے ہیں اسکی وجہ بھی حافظہ کی صحت وکمزوری ہوتی ہے ــــــ حافظہ اگرچہ قوتِ گویائی کے ساتھ ساتھ برسرِ عمل ہو جاتا ہے لیکن اس کی مکمل قوت سنِ بلوغ کے قریب ہی تکمیل پذیر ہوتی ہے۔ یعنی جوں جوں انسان کو اپنی نشو وارتقا میں علم کی ضرورت پڑتی ہے۔ توں توں حافظہ میں قوت پیدا ہوتی جاتی ہے۔ جوں جوں حافظہ میں علم حاصل کرنے کی صلاحیت پیدا ہو جاتی ہے۔ توں توں تعقل کو حافظہ سے مواد حاصل ہوتا جاتا ہے۔ اسی کیفیت کو عقل کی پختگی سے تعبیر دیا جاتا ہے۔

انسان کو دو کیفیتیں اسکی زندگی کے ساتھ حاصل ہیں۔ ایک ''بیداری'' دوسرے ''خواب'' ان دونوں حالتوں میں حافظہ کے علم میں کچھ فرق نہیں ہوتا۔ صرف تعقل ہی ان دونوں کیفیتوں سے متاثر ہوتا ہے اسلئے انسانی علم میں خواب اور بیداری میں کوئی فرق نہیں ہوتا ــــ گویا انسانی زندگی کے نظامِ حیات میں علم وعمل اور اسکی نشو وارتقا کا دارومدار حافظہ پر ہی ہے۔ اور حافظہ ہی انسانی نظامِ حیات میں ایک ہیرو کا پارٹ ادا کرتا ہے۔

حافظہ کی قلب سے نسبت ورابطہ

دلی ارادہ: جہاں تک حواس کا تعلق ہے۔ حافظہ اپنی صحت کے مطابق حواس سے آسانی سے علم حاصل کر لیتا ہے۔ اور انسان اسی علم کے خزانہ کے مطابق عمل کرتا ہے۔ اگر حافظہ میں علم جمع نہ ہو تو انسان کوئی عمل نہیں کرسکتا۔ لیکن دیکھا گیا ہے۔ کہ ہر عمل کیلئے ایک ارادہ کام کرتا ہے۔ یہ ارادہ حیوانوں میں بھی پایا جاتا ہے۔ مثلاً جب انہیں بھوک لگتی ہے۔ یا پیاس لگتی ہے۔ تو یہ گھاس کھانا شروع کرتے ہیں یا پانی کے پاس جاتے ہیں۔ تو معلوم ہوتا ہے۔ کہ اعضٔے میں غذا (خون) کی کمی سے بھوک کی کیفیت (معدہ یا

آنتوں سے) پیدا ہوتی ہے۔ تو ارادہ سعی کی طرف مائل کرتا ہے۔ اگر حافظہ میں علم وعمل کا مواد جمع نہ ہو تو ارادہ تو ہوگا مگر علم نہ ہونے کی وجہ سے عمل پیدا نہ ہوگا۔ اسی طرح انسان جب کسی چیز کی کمی محسوس کرتا ہے۔ تو اس سے اسکے حصول کی تحریک پیدا ہوتی ہے۔ اور انسان علم وعمل سے ماسوا۔ ایک ارادہ کو کام میں لاتا ہے۔ اگر حافظہ میں علم ہو تب بھی ارادہ پایا جاتا ہے۔ اگر علم موجود نہ ہو تب بھی ارادہ پیدا ہوتا ہے۔ اسلئے علم کے ساتھ انسان میں ارادہ ایک دوسری چیز ہے۔ جو حافظہ کے علم کو عمل کی صورت میں لاتی ہے۔ اگر یہ ارادہ حافظہ میں نہیں تو اسکا مقام دل ہے۔ جہاں ارادہ خواہش کی شکل میں پیدا ہوتا ہے۔ یہ امر لازمی ہے۔ کہ جب تک حافظہ میں علم نہ ہو۔ تو خواہش بھی اسوقت تک پیدا نہیں ہوتی۔ مثال کے طور پر اگر ایک شخص نے ایک پھل (آم یا سیب) نہ دیکھا ہو۔ نہ اسکی لذت سے آشنا ہو۔ تو اسکے حصول کیلئے جب اسکے حافظہ میں کوئی سامان نہیں تو انسان میں کبھی پھل کی خواہش پیدا نہ ہوگی۔ نہ ہی اسے حاصل کرنے کیلئے اسکے دل میں تحریک پیدا ہوگی۔ تو اس سے معلوم ہوتا ہے۔ کہ ارادہ دل سے پیدا ہوتا ہے۔ مگر اب یہ ارادہ حافظہ کے علم سے ہی پیدا ہوتا ہے۔ سوال یہ ہے۔ اگر ارادہ دل سے پیدا ہوتا ہے اور اسکا مخزن حافظہ ہے۔ تو دل اور حافظہ کا رابطہ کس طرح قائم ہوتا ہے۔

یہاں اس ارادہ وعلم میں دل اور حافظہ کا رابطہ خصوصی ہے۔ مثال کے طور اگر انسان بھوک کی کیفیت سے متاثر ہو۔ تو اسے غذا کی ضرورت محسوس ہوتی ہے۔ اسلئے انسان غذا حاصل کرنے کا ارادہ کرے گا۔ یہاں ارادہ کی کیفیت کا پایا جانا انسانی فطری خاصیت سمجھی جاتی ہے۔ کہ وہ بغیر کسی علم کے خود بخود ارادہ کرتا ہے گویا اسکے حافظہ میں یہ کیفیت فطری طور جمع ہے۔ کہ بھوک کے وقت غذا مہیا کی جائے سو انسان غذا حاصل کرنے کا ارادہ کرتا ہے۔ یہ حقیقت ہے کہ اس فطری خاصیت کا پایا جانا بھی حافظہ کے علم کا نسل در نسل انتقال ہونے پر ہی منحصر ہے ورنہ اگر ابتدا میں انسان کو یہ علم ہی نہ ہو جاتا کہ بھوک کیا ہے۔ اور اسکے لیے کس کیفیت (غذا) کی ضرورت ہے۔ تو انسان لاعلمی میں نہ غذا کا ارادہ کرتا نہ ہی یہ کیفیت فطری طور نسل انسانی میں منتقل ہوتی۔ چونکہ انسان کی نشوو ارتقا ایک فطری چیز ہے۔ اسلئے ایسی کیفیتیں اسے القائی (ایک وجدانی تحریک کے ذریعہ) طور خود بخود حاصل ہو جاتی ہیں۔ یہی ارادہ۔

عمل کی قوت پیدا کرتا ہے۔اور یہی عمل حافظہ میں ایک علم پیدا کرنے کا سبب بن جاتا ہے۔ گویا ارادہ عمل پیدا کرتا ہے۔ یہ عمل اپنی ابتدا میں حافظہ کے علم کے بغیر ہوتا ہے۔ کیونکہ انسان کی ابتدا پہ غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے۔ کہ انسان اپنی ابتدائی پیدائش کے ساتھ ہی اپنی نشو وارتقا کیلئے بغیر کسی علم کے (جب کہ اسے کسی زمانہ یا ماحول سے گذرنا نہ پڑا) ایک ارادے کے ساتھ سامان زندگی حاصل کرنے لگا اسوقت اسکا حافظہ ہر علم سے خالی تھا۔لیکن ارادہ انسان کا حافظہ کے علم کے بغیر کام کرنے لگا اگر چہ وہ ابتدأ پتے یا پھل کھانے لگا۔تو اس سے قبل اسکے حافظہ میں ان کیفیتوں کا وجود موجود ہی نہ تھا۔ بلکہ دِلی ارادہ کیا اور جو چیز اسے ملی بغیر علم کے منہ میں ڈالی حالانکہ ابتدائی انسان اس بات سے بھی بے خبر تھا۔ کہ بھوک کیا ہے؟ کھایا کیسے جاتا ہے؟ اور اس کا اثر کیا ہوتا ہے؟ لیکن انسان کی تخلیق ایک احسن تقویم کے ساتھ ہوئی ہے۔اور اسکے لیے نشو وارتقا ایک ضروری چیز ہے۔ اسلئے انسان میں یہ قوت بھی فطری وجدان کے تابع ہے۔ کہ وہ بھوک کے وقت کچھ کھانے کی تمیز رکھ سکے۔ اور اس وقت جب حافظہ تمام علم سے خالی ہو انسان کا قلبی وجدان اسکی راہنمائی کرتا ہے اسی کیفیت کو دلی ارادہ سے تعبیر دیا جاتا ہے۔اور جب اس عمل سے علم جمع ہوتا ہے۔تو آئندہ یہی علم (حافظہ میں جمع ہوکر) عمل کی تحریک پیدا کرتا ہے۔ گویا ارادہ ابتدا میں خود علم پیدا کرتا ہے۔ اور بعد میں یہی علم خود ارادہ کیلئے عمل کا میدان وسیع کرتا ہے۔ مثال کے طور ابتدأ ایک انسان بھوک اور غذا سے ناواقف تھا۔ جب اسے بھوک کی کیفیت محسوس ہوئی۔ یعنی اسکے وجود میں کمزوری آنے لگی۔تو قلبی قوت نے اسکی راہنمائی کی تو انسان نے پتے کھانے شروع کئے اسوقت اسکا حافظہ ہر علم سے خالی سمجھا جاتا ہے۔لیکن ایک قلبی القا (جسکا تعلق روح جسمانی یا روح رحمانی سے ہے) میں یہ تاثر ضرور تھا کہ انسانی وجود نے اپنے خاکی وجود سے پہلے جسم خاکی میں آنے کیلئے اسکی نشو ونما حاصل کرنے کیلئے کیا ذرائع اختیار کئے۔ سو یہی قلبی (روحانی) تاثر قلب سے ارادہ کی صورت میں ابھرا۔ اور انسان نے بلا علم پتے کھانے شروع کئے جب اسکی قوت بحال ہوگئی تو یہ کیفیت حافظہ میں علم کی صورت میں جمع ہوگئی۔ اسکے بعد انسان کو ارادہ کیلئے القائی تحریک کی ضرورت نہ رہی کیونکہ اب بھوک اور اسکی کیفیت۔ ارادہ ___ اور عمل۔ عمل سے

حصول اور حصول سے ماحصل (یعنی خوراک کی ہیئت و رنگ وغیرہ) سب کیفیتیں حافظہ میں جمع ہو گئیں۔ جونہی بھوک محسوس ہوئی۔ بھوک کے ساتھ اسکے تمام لوازمات ابھر آئے ارادہ دل سے پیدا ہوا۔ حافظہ نے دل کے ارادہ کے ساتھ۔ خود ارادہ۔ بھوک۔ عمل (خوراک حاصل کرنا)۔ خوراک (پتوں کا وجود) تعقل کے سامنے کر دیا۔ ادھر تعقل نے حافظہ کے علم و عمل کے مطابق جسم کو حرکت دی۔ اور انسان نے خوراک مہیا کر لی۔ اس سے ثابت ہوتا ہے۔ کہ انسان کے پاس جب مادی حیثیت میں حافظہ میں علم جمع نہ ہو۔ تو عمل کی تحریک قلبی ارادہ سے ہوتی ہے۔ اور قلبی ارادہ ــــ قلبی القا سے پیدا ہوتا ہے۔ اور قلبی القا اسکے مادی وجود سے قبل کے نوری وجود (علّت) میں ہوتا ہے۔ جو اسکی روح جسمانی میں منتقل ہوتا ہے۔ اور روح جسمانی اپنی ابتدا میں جب بغیر مادی غذا کے قائم تھی تو وہ لطیف روح تھی یہ لطیف روح خود بخود نہیں بنی بلکہ علّت سے ہی بنی اسی طرح اسی علّت کے اسباب جب اپنی قوتوں میں لا انتہا قوت کے درجہ میں پائے جائیں تو آخری قوت خود ذاتِ احد کی ہوتی ہے۔ گویا یہ ارادہ جو مادی قلب میں القائی صورت میں عمل کی تحریک دیتا ہے۔ اسکی ابتدا بھی خود ذات احد سے ہوتی ہے۔ اور معلول در معلول منتقل ہو کر انسانی وجود میں ــــ روحِ جسمانی میں ودیعت ہوتی ہے۔ گویا حافظہ کے علم سے اول خود ارادہ کی کیفیت پیدا ہوتی ہے۔ بعد میں ارادہ سے جو عمل پیدا ہوتا ہے۔ وہی عمل علم کی اساس (حافظہ میں) بنتا ہے اور آئندہ یہی علم عمل کیلئے میدان وسیع کرتا جاتا ہے۔ چونکہ ارادہ کی تکمیل حافظہ سے ہوتی ہے۔ اسلئے ہمیں محسوس ہوتا ہے کہ ارادہ حافظہ کی پیداوار ہے۔ حالانکہ حافظہ صرف علم پیدا کرتا ہے۔ اور ارادہ جب کہ ابتداً قلب سے پیدا ہو تو ہمیشہ حافظہ کے علم کے ساتھ دل ہی ارادہ کا مالک ہوگا۔

الغرض یہ دونوں کیفیتیں فطری طور ایک دوسرے کی معاون اور محرک بن جاتی ہیں۔ یہی کیفیتِ ارادہ۔ عمل اور علم خود دل اور حافظہ میں رابطہ پیدا کرتی ہیں۔ دل اور حافظہ میں ایک فطری رابطہ قائم ہوتا ہے۔ کیونکہ ارادہ کی کیفیت قلب سے پیدا ہو کر حافظہ میں داخل ہو جاتی ہے۔ یہی ارادہ حافظہ کا ارادہ تصور کیا جاتا ہے۔ اسی قلبی ارادہ سے حافظہ کے علم کے مطابق عمل جاری ہوتا ہے۔ یہی صورت قلب و ذہن یا قلب و حافظہ کے رابطہ کی ہے۔ کہ جب حواس کے ذریعے کسی وجود کا تصور حافظہ میں نہ

پایا جائے۔تو ایک غیر مادی وجود کا تصور وعکس قلب سے غیر مادی ہیئت میں حاصل کیا جاتا ہے۔

تصور کی ترکیب دو طرح سے ہے۔ایک ذہنی تصور جسے تصور خیالی یا مجازی کہا جاتا ہے ۔دوسرا تصور قلبی جسے تصور حقیقی کہا جاتا ہے ____

تصور ذہنی یا خیالی ۔وہ کیفیت ہے ۔جو واہمہ اور حافظہ سے حاصل ہوتی ہے ۔حافظہ میں جو صورت حواس کے ذریعہ داخل ہوتی ہے ۔وہ حافظہ میں جمع رہتی ہے اور یکسوئی کے وقت انہیں کیفیات کو عقل یا شعور کے سامنے لاکر ایک کیفیت کا احساس یا تصور پانا ۔تصور خیالی سے تعبیر ہے ۔اور جب ایک کیفیت شعور کو حاصل ہو جسکا وجود حافظہ میں قطعاً موجود نہیں تو یہ کیفیت قلب سے حافظہ میں آتی ہے ۔اسے تصور حقیقی سے تعبیر دیا جاتا ہے۔

یہ کیفیتیں خواب اور بیداری میں ایک ہی ہیئت میں محسوس کی جاتی ہیں ۔ بیداری میں ایک صورت حواس کے ذریعہ مشاہدہ کی ہے ۔کہ آنکھ سے دیکھ کر ایک کیفیت کا دیکھنا یا مشاہدہ کرنا ۔دوسری کیفیت آنکھ بند کر کے حافظہ میں جمع شدہ کیفیت کا دیکھنا یا مشاہدہ کرنا اور خواب میں جبکہ آنکھ بند ہو تو بھی کیفیتیں دیکھنے میں آتی ہیں ۔

حافظہ چونکہ نیند میں بھی برسرعمل ہوتا ہے ۔اسلئے اسکا عمل مثل بیداری کے جاری رہتا ہے اور مثل بیداری خواب میں بھی حافظہ کی کوئی کیفیت (تصویر) شعور میں سے گذر کر ایک کیفیت کا مشاہدہ کراتی ہے ۔اسے خیالی خواب کہا جاتا ہے ۔اس سے ماسوٰی قلبی تصور بھی جاری رہتا ہے ۔اور یہی کیفیت حافظہ کو علم پہنچانے کا بھی ایک ذریعہ ہے ۔کہ جس شے کے علم کیلئے حافظہ کو حواس کا ذریعہ نہیں رہتا ۔وہاں دل ہی اپنی روح رحمانی کے ذریعہ علم حافظہ میں منتقل کرتا ہے ۔ جہاں آنکھ کے ذریعہ ایک صورت حافظہ کو تصور کیلئے مہیا ہو جاتی ہے ۔اور یہ صورت حافظہ میں غیر مادی ہیئت اختیار کر لیتی ہے ۔اسی طرح آنکھ کے دیکھنے کے بغیر جب تصور کیا جائے ۔تو یہی آنکھ سے دیکھی ہوئی تصویر حافظہ سے دوبارہ شعور کے سامنے آکر اس تصویر کا تصور قائم کرتی ہے ۔ جب حواس اور حافظہ کے تصور بند ہو جائیں ۔تو دل سے حاصل کردہ غیر جسمانی صورت حافظہ پر آجاتی ہے ۔ یہ صورت تصور حقیقی کہلاتی

ہے۔ جہاں تک انسانی جسم میں۔ حصولِ علم کیلئے قوتیں پائی جاتی ہیں۔ ان میں حواس خمسہ ــــــ قوتِ بصر (آنکھ) قوتِ سمع (کان) قوتِ ذائقہ (زبان) قوتِ شامہ (سونگھنا) قوتِ لامسہ (جسمانی اعضا میں پھیلی ہوئی شریانیں)۔ مختلف صورتوں میں علم حاصل کرتی ہیں۔ اور اس علم کی تکمیل کیلئے۔ دماغ۔ اور دل کی خصوصی قوت شامل ہے۔ دماغ اور دل کی خصوصیت انسان میں ودیعت شدہ روح پر منحصر ہے۔ دماغ کی روح۔ روح حیوانی سے موسوم ہوتی ہے۔ اور دل کی روح۔ روح رحمانی سے موسوم ہوتی ہے ــــ اصلاً ان قوتوں میں یہی دو روحیں اصل محرک ہیں۔ جن سے علم حاصل کیا جاتا ہے اور یہ واضح ہے کہ یہ علم تخلیق کائنات سے متعلق ہوتا ہے۔ کہ انسان کے ذمہ تخلیق کائنات میں۔ مخلوق اور خالق کی معرفت حاصل کرنا ایک اہم فریضہ ہے۔ لہٰذا اس تحقیق ومشاہدہ کی دونوعیتیں ہیں۔ اگرچہ جسم انسانی میں حواس خمسہ حصول علم کا ذریعہ ہیں۔ لیکن اسکے ساتھ ہی۔ دماغ اور دل بھی اس علم کے حصول میں معاون ہیں۔ بغیر ان قوتوں کے تعاون کے حصول علم کی تکمیل نہیں ہوسکتی۔

اللہ تعالیٰ نے انسانی حصولِ علم میں۔ انسان اور کائنات میں وسیع ذرائع (ذرائع علم) فراہم کیے ہیں۔ جن سے انسان کو کائنات کے علم ــــ معرفت میں ــــ کسی موقع پر محتاج نہیں۔ اسی حصولِ علم کے مدِّ نظر انسان میں۔ دماغ۔ اور دل کو ان دو روحوں کا مسکن بنایا۔ اول روح۔ روح حیوانی کہلاتی ہے۔ یہ روح جسم کے ذرہ ذرہ میں موجود۔ انسانی زندگی کو قائم رکھتی ہے۔ دوسرے کائنات کے مشاہدہ وعلم میں اسکا خصوصی کردار (رول) ہے کہ اس میں مشاہدہ۔ ظاہر و باطن کی صلاحیت پائی جاتی ہے ــــ اسکا مسکن خصوصی طور دماغ ہے۔ یا ایسا سمجھا جائے کہ دماغ میں علم حاصل کرنے والے ایک اہم قوت Organ شعور میں اسکا مسکن ہے۔ تحقیق کے مطابق۔ اس روح کو روح حیوانی سے موسوم کیا گیا ہے۔ اور اس کی ناری خاصیّت ہے ــــ کائنات کی بیشتر اشیاء۔ کیفیتیں بھی ناری اثر کی حامل ہیں۔ اسلئے ان ناری کیفیات پر اسی روح حیوانی سے ادراک واحاطہ کیا جاتا ہے۔ جہاں تک تحقیق ومشاہدہ کا تعلق ہے۔ فطری طور ہر کیفیت کی تحقیق ومشاہدہ کیلئے۔ انسانی

وجود میں بھی قوتیں موجود ہیں۔جن میں مادی ٹھوس کیفیات کیلئے۔ چونکہ یہ ٹھوس اشیاء ہیں۔انکی تحقیق ومشاہدہ کیلئے۔حواسِ خمسہ کواستعمال کیا جاتا ہے۔اور کائنات میں جہاں تک ناری کیفیتوں کا وجود پایا جاتا ہے۔اسکی تحقیق ومشاہدہ کیلئے اسی روح (روح حیوانی) کواستعمال کیا جاتا ہے۔ جو (جسکا وجود) انسانی ذرہ ذرہ میں موجود۔انسانی زندگی قائم رکھتی ہے۔اور اصل وجود۔دماغی شعور سے (صحت مند حالت میں) کائنات کا مشاہدہ وعلم حاصل کرتی ہے۔دوسری روح۔روح رحمانی سے موسوم ہے ــــ قرآن نے انسانی تخلیق میں اسکا حوالہ دیا ہے۔وَنَفَخْتُ فِيْهِ مِنْ رُّوْحِيْ ۔اورہم نے انسانی جسم بشری میں ایک نوری روح ودیعت کی۔ یہ روح محض حصولِ علم میں۔ کائنات کی نوری کیفیتوں کا مشاہدہ وعلم حاصل کرنے کیلئے انسانی جسم میں ودیعت کی ہے۔اور اسکا مقام ومسکن منصوبۂ الٰہی کے تحت انسانی قلب کومخصوص کیا گیا۔ــــ چونکہ جسم انسانی میں۔حصول علم کی تکمیل۔دماغ۔اور قلب سے ہوتی ہے۔تو اسکا مطلب یہ ہے کہ یہ تحقیق ومشاہدہ اصل میں۔انہیں دوقوتوں۔دماغ میں روح حیوانی سے۔اور دل میں روح رحمانی سے تکمیل پذیر ہوتی ہے۔اس سے ثابت ہوتا ہے۔کہ تصور حاصل کرنے کیلئے خصوصی تین ذرائع ہیں۔ایک تصور ظاہری۔ یہ تصور عینی مشاہدہ کا ٹھوس چیزوں کا ہوتا ہے۔کہ ادھر آنکھ نے دیکھ لیا ادھر حافظہ نے اسکی صورت (تصور کے ذریعہ) تعقل کے سامنے پیش کر دی۔دوسرا تصور خیالی۔ یہ صورت حافظہ کی جمع شدہ کیفیت (صورت) کا تصور ہے ادھر خیال کیا ادھر حافظہ میں صورت ابھر آئی باقی صورتیں پیچھے ہٹ گئیں۔ یہ تصور شعور کے سامنے آگیا۔ یہ تصور خیالی کہلاتا ہے۔ یہ تصور مبنی برحقیقت نہیں ہوتا۔کیونکہ آج سے دس برس قبل ایک شخص کوایک ہیئت ایک لباس میں دیکھ کر ایک صورت حافظہ میں قائم ہوگئی۔دس برس بعد جب کہ اس شخص کا وجود موجود نہیں۔ تو اتنی طویل مدت میں اسکی ہیئت اور لباس میں فرق ضرور آئے گا۔دس برس بعد جب اسکا تصور کیا تو اسکی دس برس قبل کی صورت اسی ہیئت میں شعور کے سامنے آئے گی۔جس ہیئت میں اسوقت آنکھ بند کرنے سے خیالی تصویر آتی تھی۔ یہ تصور اسکے وجود کی اصلی صورت کا نہ ہوگا۔ یہ تصور حقیقی نہیں ہوگا۔تیسرا تصور حقیقی یعنی اگرچہ ایک وجود سامنے موجود نہیں لیکن اسے پہلے دیکھا گیا ہے۔اور زمانہ کی تبدیلی کے ساتھ

وجود میں فرق آ گیا۔ اب اگر اس تبدیلی کے ساتھ تصور کرتے وقت حافظہ کی صورت اورنئی صورت میں فرق محسوس ہوا تو گویا یہ صورت اسی وقت کی صورت ہے جس وجود کیلئے ابھی تصور کیا گیا۔ یہ تصور حقیقی صورت کا تصور ہوگا۔ کہ ایک وجود یا ایک کیفیت جو قبل ازیں ہمارے علم تک نہ پہنچی ہو۔ لیکن سننے میں آئی ہو۔ اس وجود کی اصلی ہیئت کا حواس کے بغیر صرف دماغ (روح حیوانی) کے ذریعہ ادراک کرنے میں اصلی صورت کا ذہن میں آنا (یاد یکھنا) تصور حقیقی کہلاتا ہے۔ اس تصور کی نوعیت یہ ہے کہ اگر ایک کیفیت کا نام سننے میں آئے۔ تو جب اسکا تصور کیا جائے۔ تو ضروری ہے۔ کہ بغیر اسکی ہیئت کے دیکھنے کے حافظہ میں کوئی تصور نہیں آ سکتا۔ تو ہم ذہن (شعور) پر زور دیتے ہیں کہ اس کیفیت کا کوئی تصور ہمارے سامنے آ جائے۔ اسوقت اگر ہماری روح حیوانی لطیف وقوی ہو۔ تو خود بخود ایک کیفیت ہمارے شعور کے سامنے آ جائے گی اور یہ صورت اس حالت میں آئے گی جیسے ہم حواس کے ذریعہ ایک ان دیکھی کیفیت کو دیکھ کر ابتدائی طور اسکی صورت حافظہ میں جمع کر لیتے ہیں۔ یہی صورت۔ تصور حقیقی کی ہے جس میں ہمارا قلبی ارادہ۔ اور حافظہ کوئی شکل پیش کرنے سے عاجز ہوتا ہے۔ اور دماغ روح حیوانی کی وسعت کے ذریعہ مطلوب کا عکس حاصل کر کے۔ حافظہ کی طرف منتقل کرتا ہے۔ اور حافظہ شعور کے سامنے پیش کرتا ہے۔ تو ہمیں اصل صورت کا تصور حاصل ہوتا ہے۔

دوسری کیفیت یہ ہے۔ کہ ہم ایک کیفیت کو تصور میں پالیتے ہیں۔ لیکن یہ کیفیت اصلی کیفیت سے بالکل مختلف ہوتی ہے۔ مگر آتی ضرور ہے! تو اسکا مطلب یہ ہے۔ کہ یہ قلب کے ذریعہ حاصل نہیں ہوئی۔ بلکہ واہمہ کے ذریعہ حاصل ہوئی۔ یعنی واہمہ نے ایک خودساختہ کیفیت بنا کر حافظہ کے سامنے پیش کر دی۔ چونکہ حافظہ میں اس کیفیت کے اجزا مختلف موجود ہیں۔ اسلئے حافظہ اس کیفیت کو قبول کر لیتا ہے۔ وجہ اسکی یہ ہے کہ واہمہ وہی صورت نقلی بنا سکتا ہے۔ جو صورت واہمہ سے گزر کر حافظہ میں جمع ہو چکی ہو (یعنی بہت سی کیفیتوں کے اجزا جمع کر کے ایک کیفیت بناتا ہے)۔ حافظہ شعور کے سامنے پیش کرتا ہے۔ تو ایک کیفیت کا وہمی تصور قائم ہو جاتا ہے۔ ایسا تصور حقیقی نہیں بلکہ وہمی کہلائیگا۔ مثلاً ایک شخص نے ہاتھی نہیں دیکھا ہے۔ تو وہ اسکا نام اور جسمانیت سنکر ایک تصور قائم

کرتا ہے۔ کہ وہ ایک جسیم جانور ہے۔ تو اس کے حافظہ میں جانوروں کی شکلیں موجود ہیں۔ اب اسکا ہاتھی کیلئے تصور یہی ہوگا کہ حافظہ کے سب سے جسیم جانور کو بڑھا کر ایک شکل بنائیگا یہ شکل واہمہ ہی بنا کر حافظہ میں ڈالے گا۔ یہی شکل شعور کے سامنے گھومنے لگے گی اور ہاتھی کا غلط تصور قائم کرے گی۔ اور جب ہاتھی کے ساتھ اس شکل کا مقابلہ ہوگا تو غلط ثابت ہوگی۔ یہ تصور وہمی ہوگا۔ یہ شکل نہ قلب سے ہوگی نہ حافظہ کی تخلیق ہوگی۔ اسکے برعکس تصور حقیقی میں واہمہ۔ حافظہ اپنے تصور بند کریں گے اور قلبی تصور براہ راست حافظہ کے ذریعہ شعور پر آئیگا۔ یا جیسے ایک شخص واہمہ کی کمزوری کی وجہ سے یہ سمجھتا ہے۔ کہ میرے پھیپھڑوں سے خون آرہا ہے۔ حالانکہ خون حلق سے یا دانتوں سے آتا ہے۔ مگر انسان قلبی کمزوری اور واہمی کمزوری سے یہ یقین کر جاتا ہے۔ کہ خون پھیپھڑوں سے آتا ہے۔ تو یہ وہم شدید صورت اختیار کر جاتا ہے۔ حالانکہ اسکی کوئی اصلیت نہیں ہوتی۔ اگر یہ وہم شدت اختیار کر گیا تو انسان واقعی اس مرض[1] (پھیپھڑوں کا خون آنا) کا شکار ہو جاتا ہے۔ یہ کیفیت دراصل وہم کی کمزوری کی بنا پر ہوتی ہے۔ جسکی

---

[1] مرض کے حقیقی ہونے کی صورت یہ ہوتی ہے۔ کہ واہمہ اسوقت کمزور ہوتا ہے۔ جب باقی جسم کے ساتھ انسان کا دل و دماغ خصوصاً اعصاب (Nerves System) کمزور ہو جاتے ہیں۔ ہمارے جسمانی نظام میں خون کے ذرات کام کرتے ہیں۔ جسقدر یہ ذرات قوی ہوں تو انسان قوی رہتا ہے۔ جب ان میں کمزوری پیدا ہو تو یہ جسم میں صحیح قوت پیدا نہیں کر سکتے۔ یہی ذرات اعصاب میں پائے جاتے ہیں۔ حتٰی کہ قلب۔ واہمہ۔ حافظہ (دماغ) میں بھی یہی ذرات لطیف ہیئت میں ہوتے ہیں۔ جب واہمہ میں کمزوری پیدا ہوئی تو یہ ذرات بھی کمزور ہوتے ہیں۔ انہیں ذرات کی شکل میں واہمہ میں ایسی غیر حقیقی کیفیتیں بن جاتی ہیں۔ جو وہم کی شکل اختیار کر لیتی ہیں۔ اور جب یہ وہم شدت اختیار کر جاتا ہے۔ تو یہی ذرات لطیف کمزور حالت میں آکر اسی مرض کی ہیئت میں آجاتے ہیں جو مرض وہم میں انہیں ذرات کی وجہ سے پیدا ہوتے ہیں۔ اور یہی ذرات خون کے ساتھ ملکر پھیپھڑوں تک آجاتے ہیں۔ گویا یہی لطیف ذرات کمزور ہو کر دق کے ذرات میں تبدیل ہو کر خون میں ملتے ہیں۔ اور یہی ذرات وہم کی شدت کے ساتھ قوی ہو کر دق پیدا کرتے ہیں اور یہ سمجھا جاتا ہے۔ کہ جبکہ وجود میں دق کے ذرات موجود نہیں۔ تو دق کے جراثیم وہم ہونے سے کیسے پیدا ہوتے ہیں۔ اسے Psychic Effect کہتے ہیں۔

کوئی حقیقت نہیں ہوتی۔ یہ کیفیت تو حد درجہ کمزور ہوتی ہے۔ایسے شخص کو مریض کہا جاتا ہے۔لیکن واہمہ کی کمزوری عام آدمیوں میں پائی جاتی ہے۔جسکا اثر صرف علم کے مشاہدہ تک محدود ہوتا ہے۔کہ جسمانی حالت بہتر ہونے کے باوجود دماغی کمزوری کے باعث واہمہ کمزور ہوتا ہے۔اور انسان تصور کرنے میں ایک تصور وہمی پاتا ہے۔ایک صاحب مشاہدہ آدمی میں یہ کیفیت پائی جاسکتی ہے کہ وہ بعض مشاہدات میں واہمی تصور سے بھی کیفیات دیکھ لیتا ہے۔اس حالت میں واقعات ملے جلے ہوتے ہیں۔یعنی تصور حقیقی کے ذریعہ واقعات کے ساتھ تصور واہمی مل کر مشاہدہ میں آتے ہیں۔تو انسان اپنے مشاہدات کے ایسے واقعات کو ظاہراً صحیح نہیں پاتا۔اسکی وجہ؟ روح حیوانی مستقل طور قوی نہیں ہوتی۔وہ کیفیات کا عکس اسی حالت میں لاتی ہے۔جس طرح آنکھ ایک دور مقام کی ہیئت دیکھتی ہے۔جسے واہمہ خود غلط شکل دے کر حافظہ کے سامنے پیش کرتا ہے۔اگر روح حیوانی قوی ہو تو باوجود واہمہ کی کمزوری کے بھی انسان اصلی حقیقت کا مشاہدہ کرسکتا ہے۔اور اسے تصور حقیقی حاصل ہوسکتا ہے۔گویا اس تصور میں واہمی تصور ہونے کا قلب و دماغ کی کمزوری سے بھی تعلق ہوتا ہے۔اور تصور حقیقی اسی شخص کو حاصل ہو سکتا ہے۔جسکی روح حیوانی اور قلب لطیف اور قوی حالت میں ہوں۔

اسکی دوسری کیفیت یہ ہے۔کہ ایک شخص کو نہ دیکھا ہو نہ اسکا حلیہ معلوم ہو تو تصور میں (حافظہ میں) اسکی ایک صورت قائم ہوگئی جس میں اسی شخص کی ہیئت ولباس اچھی طرح محسوس ہوتا ہے تو اس تصور کی کیفیت وہی گی جو صورت ایک شخص کی موجودگی میں ہوتی ہے اور اس کے اصلی وجود اور تصور کے وجود میں کچھ فرق نہ ہو تو اسکا مطلب یہ ہوگا کہ دماغ (روح حیوانی) نے اس شخص اور اس مقام کا احاطہ کرلیا۔اور جس حالت میں وہ شخص ہوگا وہی کیفیت اس روح جسمانی سے دماغ کے ذریعہ حافظہ کو حاصل ہوگی یہی کیفیت شعور کے سامنے آئے گی۔تو اس شخص کی اصلی ہیئت کا مشاہدہ ہوگا۔گویا وہ اگرچہ آنکھ کے ذریعہ غائب ہے۔لیکن روح جسمانی کے ذریعہ حاضر ہوگیا۔اور جس طرح ایک انسان اپنے وجود کے ساتھ حاضر ہے۔اسی طرح روح حیوانی نے اس قرب وبُعد کو ختم کرکے باوجود دور اور غائب ہونے کے اسے موجود کی ہیئت میں لایا۔کیونکہ حافظہ کے مشاہدہ کرنے کا دونوں حالتوں

میں تصور غیر مادی جسم میں ہی ہوگا۔ لہذا یہ شخص روح جسمانی کے ذریعہ موجود ہے۔ موجود ہونے کی صفت [1] یہ ہے۔ کہ وہ سن بھی سکے۔ بول بھی سکے۔ ہر سوال کا جواب بھی دے سکے تو اگر یہ کیفیت ایک شخص کی غیر موجودگی میں اپنی حقیقت کے ساتھ پوری ہوگئی گویا یہ کیفیت قلبی القا کی قوت کے ذریعہ (روح جسمانی یا روح رحمانی کے ذریعہ) حاصل کی گئی ہے تو وہ شخص غائب نہیں حاضر ہے۔ اور یہ تصور بھی۔ تصور حقیقی کہلاتا ہے۔ اسی طرح تصور شیخ میں بھی شیخ کا ظاہری وجود حافظہ میں ایک خیالی صورت حاصل کر لیتا ہے۔ یعنی جب شیخ کا تصوّر کیا جاتا ہے تو ابتدائی طور (تصور کی آسانی کیلئے) طالب کو ایک نکتہ کی طرف متوجہ کیا جاتا ہے تاکہ اسے یکسوئی حاصل ہونے میں آسانی ہو۔ یہ یکسوئی حافظہ سے تعلق رکھتی ہے۔ یعنی جب ایک شخص حصول عرفان کے لیے تصور شیخ کرتا ہے۔ تو اسکی نوعیت ابتدائی یہ ہوتی ہے کہ طالب اپنے حافظہ کو ماسوٰی کے تفکرات سے خالی کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ یعنی جتنے روزمرہ کے تفکرات اور خواہشات نفسانی حواس اور قلب کے ذریعہ حافظہ میں جمع ہوتے رہتے ہیں انہیں ایک طرف کر کے صرف مقصود کا تصور لانے کیلئے پہلے حافظہ میں جگہ خالی کرنی پڑتی ہے۔ تو ہم

---

[1] اسکی تحقیق اسطرح ہوتی ہے۔ کہ مثال کے طور ہم ایک شخص سے سوال کرتے ہیں کہ بیمار کب اچھا ہوگا۔ صورت نے سن لیا اور جواب دیا ''تیسرے دن دس بجے!''۔ اگر تیسرے دن دس بجے بیمار صحت یاب ہوا۔ تو یہ امر یقین کی حد میں آ گیا کہ شخص حاضر ہے اور اسکا تصور حقیقی ہے۔ اگر تیسرے دن بیمار اچھا نہ ہوا یا مر گیا یا پانچویں دن اچھا ہوا تو یہ تصور تو حقیقی ہے۔ مگر جو کیفیت سننے میں آئی وہ خیالی تھی۔ اس تصور حقیقی کی حقیقت اسوقت حقیقی ہوجاتی ہے۔ جب حقیقی تصور میں خیال کا یا واہمہ کو دخل نہ ہو یعنی جب صورت سے ہم یہ سُن لیں کہ بیمار تین دن میں صحت یاب ہوگا۔ اور ساتھ ہی ہماری خواہش بھی ہو کہ بیمار جلد صحت یاب ہو۔ تو ہم روح جسمانی کے ذریعہ تیسرے دن کی آواز کو حاصل کر لیتے ہیں۔ لیکن۔ اس آواز کے ساتھ دل کی خواہش (جلدی صحت یاب ہونا) ساتھ آتی ہے۔ تو واہمہ میں ''پانچویں دن'' یا ''مر گیا'' کی آواز کو نہیں لیتے بلکہ دل کی خواہش ''تین دن میں صحت یاب ہوگا'' کو حافظہ میں لا کر شعور کے سامنے لاتے ہیں یہاں پھر واہمہ حافظہ کی کمزوری کے باعث تصور حقیقی تصور خیالی میں بدل جاتا ہے۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ موجود ہونے کیلئے۔ قلب و حافظہ اپنی صحت مند حالت میں ہو اور اسکے ساتھ ہی صورت بھی ایک قوی علم رکھنے والی ہوتا کہ جو علم اس سے حاصل ہو وہ صحیح نتیجہ پیدا کرے۔

حافظہ پر زور دیکر اسے ترتیب دینے کی کوشش کرتے ہیں۔لیکن یہ امر محال ہوتا ہے۔کہ بغیر کسی خصوصی تصور کے ہم ایک مقصود کے تصور کیلئے حافظہ میں جگہ خالی کریں۔ جب تک ہمارا حافظہ ایک تصور اپنے میں قائم نہ کرے۔تا کہ حافظہ اسی تصور کو بار بار دہرائے۔ اسلئے شیخ کا تصور جو حافظہ میں جمع ہوتا ہے۔اسی کو بار بار شعور کے سامنے لانے کی کوشش کرتے ہیں جسوقت حافظہ کے علم میں شیخ کا تصور سامنے آجاتا ہے۔ یہاں تک کہ تصور خیالی اس قدر پختہ ہوجاتا ہے۔کہ نہ دل سے کوئی نفسانی خواہش آتی ہے۔نہ حافظہ سے کوئی فالتو خیال شعور کے سامنے آتا ہے اسوقت صرف شیخ کی تصویر خیالی مستقل طور شعور کے سامنے رہتی ہے۔اور یہ تصور تصور خیالی کہلاتا ہے۔اس تصور کی ضرورت اسلئے ہوتی ہے۔ کہ حافظہ میں تفکرات کے ہجوم میں جو انتشار رہتا ہے۔اسے یکسوئی کے ذریعہ ترتیب دیکر حافظہ میں بیرونی واقعات (جو دل کے ذریعہ حاصل کئے جائیں) کیلئے جگہ خالی کی جائے۔تا کہ دل اور حافظہ کا رابطہ قائم ہو سکے اور جو عکس دل سے حافظہ میں آئے اسے شعور پالے۔اسے مراقبہ کہا جاتا ہے —— یہی کیفیت مسمریزم میں بھی پائی جاتی ہے۔

حقیقتاً ایک صحت مند انسان کیلئے اس مشق کی ضرورت نہیں ہوتی۔ایک صحت مند انسان اپنی ابتدائی حالت میں ہر حال میں صحت مند قوی قوتوں کا حامل ہوتا ہے۔ایسا صحت مند انسان اگر اسکی قوتیں خالص رہیں۔ ہر وقت تصور حقیقی حاصل کرسکتا ہے۔لیکن انسان کچھ تو وقتی ماحول کے اثر سے یہ قوی قوتیں کھو بیٹھتا ہے۔اور کچھ اپنی کوتاہی کی وجہ سے اپنی اصلیت کھو بیٹھتا ہے۔ جب انسان قوانین فطرت کے خلاف قدم اٹھاتا ہے۔تو اس میں آرام طلبی۔لذتوں کے پورا کرنے کیلئے ضرورتوں کی زیادتی۔اور ضرورتوں کی زیادتی میں حصول کیلئے ناجائز اقدام خود غرضی۔ نفس پرستی۔اور خلاف قانون فطرت اقدام کا مادہ بڑھ جاتا ہے۔خود غرضی۔اور نفس پرستی کی بنا پر وہ اپنی نفسانی خواہشات کا غلام بن جاتا ہے۔ اور اسکی قوتِ ارادی (جو حقیقت پر مبنی ہوتی ہے) سلب ہو جاتی ہے۔ ادھر ہر ضرورت کیلئے مختلف ضرورتوں اور لذتوں کا وجود حافظہ میں جمع ہو جاتا ہے اور یہی کیفیتیں اسقدر شدت کے ساتھ آتی ہیں کہ انسان انہیں خواہشات کی تکمیل کی فکروں میں حافظہ کی ترتیب کھو بیٹھتا ہے ——

نتیجہ یہ ہوتا ہے۔ کہ انسان کی یہ عادتیں فطرۃ ثانیہ بن جاتی ہیں۔ اوران سے چھٹکارا مشکل ہو جاتا ہے۔ انہیں خاصیتوں کے پیدا ہو جانے سے انسان بیمار کہلاتا ہے۔ دراصل ایک بیماری۔ بخار۔ یا سر درد کا ہونا حقیقی بیماری نہیں۔ ایک صحت مند انسان بھی بیمار ہو سکتا ہے۔ اسکی سالمیت میں فرق نہیں آسکتا اور وہ چند دنوں میں صحت یاب ہو جاتا ہے۔ لیکن یہ بیماری مستقل صورت اختیار کر لیتی ہے۔ اور یہی بیماری انسان کی اشرف المخلوقاتی خاصیت کو زائل کر دیتی ہے۔ ایسی حالت میں انسان حقیقت کی طرف رجوع کرنے سے عاری ہو جاتا ہے۔ انسان کا اپنی قوی قوتوں کے حاصل کرنے سے عاجز ہونا اور تنزل کی طرف مائل رہنا لا علاج بیماری ہے۔ اس بیماری سے سوائے روحانی علاج کے اور کوئی ذریعہ نہیں ہو سکتا۔ اگر اس بیماری سے نجات حاصل نہ ہوئی تو انسان مہلک بیماری کا شکار ہو کر حقیقی ہلاکت پا لیتا ہے۔ جس کیفیت سے انسان اپنے حقیقی ارادہ کی تکمیل کرنے سے عاجز ہو وہ شخص یقینی طور بیمار کہلاتا ہے۔ الغرض انسان اپنی ہوس پرستی اور خود غرضی سے جو اثر حاصل کرتا ہے۔ اسکا اثر دل اور حافظہ پر سب سے زیادہ ہوتا ہے۔ ادھر اسکی قوتِ ارادی ختم ہو جاتی ہے۔ ادھر حافظہ کمزور ہو کر اصل کے تصور کو نہیں پا سکتا ہے۔

حقیقت کی طرف رجوع کرنے کیلئے جب تصور شیخ کیا جاتا ہے۔ تو اس طریقہ سے قوتِ ارادی اور حافظہ کی ترتیب میں مدد ملتی ہے کہ بار بار ایک ہی تصور کرنے سے جب دل کی خواہش میں ایک ہی تصور کو ابھارا جائے اور حافظہ پر اسی تصور کو سامنے لایا جائے تو اسطرح مشق کرنے سے قوتِ ارادی مضبوط ہو جاتی ہے اور حافظہ کی ترتیب درست ہو کر ایک ہی تصور خیالی سامنے رہتا ہے۔

یہاں چونکہ حواسِ خمسہ کا دخل نہیں ہوتا ہے۔ اسلئے دل ہی سے حواس کا کام لیا جاتا ہے۔ جب قوت ارادی مضبوط ہو جائے تو ضروری ہے کہ انسانی دماغ کی ذاتی خاصیّت دوبارہ مضبوط ہو جاتی ہے۔ جب انسان تصور کے ساتھ شریعت وطریقت کی پابندی کرتا ہے۔ تو اس میں روحانی قوتِ ادراک قوی ہو جاتی ہے۔ وہ قوت ادراک بھی روح حیوانی اور روح رحمانی کے ذریعہ ہوتی ہے۔ اسلئے انسان جب اپنے تصور میں مکمل طور مشاق (ماہر) ہو جاتا ہے۔ تو یہ اپنی روح حیوانی کے ذریعہ کائنات کا عکس حاصل کرتا ہے یہ عکس دل پر آجاتا ہے۔ اور دل سے خواہش کی صورت میں حافظہ پر آجاتا

ہے۔تو حافظہ میں جگہ خالی ہوتی ہے۔اسلئے شعور اسے آسانی سے پالیتا ہے۔اور جب تصور شیخ ہی مشق میں زیادہ استعمال ہو۔تو تصور خیالی (ولی اکمل کی خیالی صورت) پختہ ہو جاتا ہے۔جسوقت قلب پر روح رحمانی یا روح حیوانی کے ذریعہ پیر کے وجود کا عکس آتا ہے تو وہ عکس اس حالت کا ہوتا ہے جو پیر اکمل کے جسمانی وجود کا ہوتا ہے اس وجود کی کیفیت وہی ہوتی ہے جو ولی اکمل کی تصور کرنے کے وقت ہوتی ہے۔یعنی یہ کیفیت ولی اکمل کے مادی جسم ولباس کی ہوتی ہے۔گویا وہی شخص جو ولی اکمل کی حیثیت میں اپنے گھر پر بیٹھا ہے۔وہ اپنے علم وکمال کو بھی حاصل کیے ہوتا ہے۔ایسی حالت میں جبکہ ولی اکمل کا تصور اس کی عملی ہیئت میں حاصل ہو جائے تو اس وجود کی کیفیت غائب سے حاضر میں آجاتی ہے یعنی تصور حقیقی ایک جسم کو ظاہراً محسوس نہ کرنے کے باوجود غائب کی تفریق مٹا دیتا ہے۔اور وہ کیفیت قطعاً حاضر صورت میں آجاتی ہے۔پھر اس تصور میں جسم کی قید نہیں رہتی۔کہ جسم ساتھ ہو تب ہی حاضر سمجھا جائے۔نہیں بلکہ اسکا جسم ساتھ نہ بھی ہو تب بھی ولی اکمل اپنی تمام خوبیوں کے ساتھ اسی طرح تصور میں آجاتا ہے۔جس طرح وجود کے ساتھ سامنے آتا ہے۔گویا دل سے عکس لینے میں نزدیک و دور کی قید ختم ہو جاتی ہے۔دور اور غائب وجود کو بھی دل حاضر ہیئت میں پالیتا ہے۔یہ عقیدہ فرضی نہیں کہ ولی اکمل حاضر و ناظر ہوتا ہے نہیں بلکہ یہ عمل اسے خود حاضر میں لاتا ہے۔کہ ولی اکمل کا تصور جب اپنی اصلی حالت میں آتا ہے۔تو اسکے پاس (حافظہ میں) جو علم ہوتا ہے۔وہ اسکے ساتھ سامنے حاضر ہو جاتا ہے گویا اس تصور اور اسکے ذاتی وجود میں کوئی فرق نہیں ہوتا۔سوائے اسکے کہ اسکا وجود ظاہراً سامنے نہیں ہوتا۔لیکن حافظہ میں وہ حاضر کی کیفیت میں ہی ہوتا ہے جب کہ ظاہر وجود کی کیفیت بھی حافظہ میں اسی صورت (تصویر) میں نظر آتی ہے۔یعنی حافظہ میں حاضر اور غائب (تصور) کی حالت میں تصویر ایک ہی ہیئت (قسم) کی آتی ہے۔شیخ سامنے حاضر نہیں ہوتا۔بلکہ یہ محسوس ہوتا ہے۔کہ وہ حاضر ہے۔وہ تو اپنے مقام پر ہوتا ہے۔صرف قلبی عکس اسکی صورت حافظہ میں حاضر کی ہیئت میں لاتا ہے تو اسوقت ولی اکمل اپنے حاضر ہونے کے اعتبار سے ہر علم وعمل کی تلقین کر سکتا ہے۔ اسی طرح اگر ایک ولی اکمل کے ہزاروں مرید ایک ہی وقت پر مراقب ہوں تو ہر شخص اسے حاضر کی

ہیئت میں محسوس کرے گا۔ یہاں حاضر کی حیثیت میں تو ہر شخص ہی ہو سکتا ہے۔ خواہ وہ ادنیٰ ہو یا اعلیٰ۔ ادنیٰ کے حاضر ہونے میں کوئی خصوصیت نہیں۔ خصوصیت اگر ہے تو علمی اکملیت کی ہے۔ کہ ادنیٰ کے حاضر ہونے میں کوئی فائدہ نہیں۔ لیکن پیر اکمل کو علم کی اکملیت کی خصوصیت حاصل ہے کہ ولی اکمل سے علم حاصل ہوتا ہے۔ یہ کیفیت ولی اکمل کی روح حیوانی کے ذریعہ اسکے مادی وجود کی ہوتی ہے۔ لیکن ولی اکمل کو جذب کے اعتبار سے ایک محیط وجود حاصل ہوتا ہے۔ وہ ولی اکمل کی روح رحمانی ہوتی ہے۔ یہ وجود ادنیٰ کو حاصل نہیں ہوتا ہے۔ اسلئے تصور حقیقی میں اسی ولی اکمل کی روح رحمانی کا تصور حاصل کرنا ہوتا ہے۔ وہ تصور روح حیوانی سے نہیں ہو سکتا کیونکہ روح حیوانی عالم ملکوت میں نہیں پہنچ سکتی ہے بلکہ روح رحمانی سے حاصل ہوتا ہے۔ یہ روح رحمانی انسان میں شریعت وطریقت کے عمل سے وسیع ہوتی ہے جب طالب اس روح رحمانی کے تصور میں مشغول ہوتا ہے۔ تو ابتدأ تصور خیالی کے بعد جب قلب کی قوت لطیف ہو جاتی ہے۔ اور انسان عالم ناسوت سے عالم ملکوت کی طرف مراتب حاصل کر لیتا ہے۔ تو ولی اکمل کی روح رحمانی کا تصور اسی مقام اسی ہیئت میں حاضر کی صورت میں آجاتا ہے جس ہیئت میں (جذب کی حالت میں) روح رحمانی کو عروج ہوتا ہے۔ چونکہ شریعت و طریقت کے عمل سے طالب کو بھی جذب کی کیفیت حاصل ہو جاتی ہے۔ جسوقت طالب کو اپنی محبت و عمل کے ذریعہ جذب ولی اکمل حاصل ہو جاتا ہے تو تصور میں وہی عکس تصور شیخ کی صورت میں حافظہ پر آجاتا ہے۔ جس میں ولی اکمل کی روح رحمانی کیفیاتِ نوری میں جذب ہوتی ہے اس طرح ولی اکمل روح رحمانی کے اعتبار سے تمام علمِ الٰہی سے واقف ہوتا ہے تو اسی علم سے طالب اکتساب کرنا شروع کرتا ہے۔ یہی کیفیت تصور سے حاصل ہوتی ہے اور یہی تصور طریقت میں طالب کا مقصود ہوتا ہے۔ اور جب طالب کے سامنے ایک ولی اکمل حاضر کی ہیئت میں آجاتا ہے۔ تو چونکہ ولی اکمل جذب کے اعتبار سے ابتداء عالم ناسوت سے ذاتِ احد تک جذب حاصل کر چکا ہوتا ہے۔ تو ایسی حالت میں ولی اکمل حقیقی طور حاضر و ناظر ہوتا ہے۔ چونکہ ولی اکمل جذب کی تکمیل میں اکمل ہو چکا ہوتا ہے۔ اسلئے اسکا وجود روحانی (روح رحمانی) دائم و قائم ہو جاتا ہے۔ پھر اسکے لیے ماضی حال و مستقبل کی قید نہیں رہتی

اگر اسکے نورانی وجود کا تصور اسکی موت کے بعد بھی کیا جائے۔ تو اسکی جسمانی موت اسکے حاضر و ناظر ہونے میں کوئی فرق پیدا نہیں کرسکتی کیونکہ موت مادہ کو ہوتی ہے۔ دائم روح کو نہیں ہوتی اسکی کمالیت علیٰ حالہٖ برقرار رہتی ہے اسلیئے موت کے بعد بھی ولی اکمل حاضر و ناظر کی کیفیت سے کلی طور متصف ہوتا ہے۔ یہاں شیخ طالب کے تصور میں بھی حاضر ہوتا ہے۔ اور ذاتی طور پر بھی بجائے خود ولی اکمل حاضر و ناظر ہوتا ہے۔ اور حقیقت یہ ہے۔ کہ کسی شخص کا حواس میں آنا ہی حاضر و ناظر نہیں کہلاتا۔ بلکہ حاضر و ناظر وہ کیفیت ہوتی ہے جو۔ طالب کے حافظہ میں دونوں صورتوں میں حاضر ہونے کی صلاحیت رکھتی ہو۔ اور کلی طور علم بھی بتاسکتی ہو۔ اور چونکہ روح مجسم زندگی ہوتی ہے۔ اور اعلیٰ مراتب حاصل کرنے والی روح میں زندگی۔ اختیار۔ عمل۔ ارادہ جسم کے مقابلہ میں قوی ہوتا ہے۔ اسلیئے ایک ولی اپنے مراتب۔ جاذبیت اور قوت کے اعتبار سے۔ اس زندگی اور وجود کے بغیر وہی عمل کرسکتا ہے۔ جو وجود کے ہوتے کرسکتا ہے۔ بلکہ اس سے بھی زیادہ قوت کے ساتھ روحانی قوت کے ساتھ ______ !اس لیے تصور شیخ کے ذریعہ انسان ایک ولی اکمل سے ہر نوعیت کا فیض حاصل کرسکتا ہے۔

دیکھنا یہ ہے۔ کہ تصور میں۔ جذب اور مشاہدہ کو کیسے محسوس کیا جاتا ہے۔ مشاہدہ کی کیفیت یہ ہے۔ کہ اگر انسان اپنی شرافت (اشرف المخلوقاتی خاصیت) میں سالم و تندرست ہو۔ ایسا شخص اگر شریعت و طریقت کے علم کے بغیر تصور کرے۔ تو وہ یکسوئی حاصل ہونے کے بعد اپنے دماغ کی روحِ حیوانی کے ذریعہ (قوتِ ارادی کے پختہ ہونے کے ساتھ) جب کائنات کے تفکر میں ایک تخلیق کا تصور کرے گا۔ تو اسے جس کیفیت کا مشاہدہ کرنا مقصود ہو اسی کیفیت کا اگرچہ غائب بھی ہو۔ اسی روح جسمانی کے ذریعہ عکس حاصل کرسکتا ہے۔ یہ کیفیت دل پر آئیگی دل کا ربط واہمہ سے ہوگا تو اسکا نام رنگ (ہیئت) واہمہ اخذ کریگا واہمہ سے حافظہ اخذ کریگا اور حافظہ سے شعور اخذ کریگا۔ جب حافظہ میں اس ہیئت کی کیفیت جمع ہوگئی تو جاگتی حالت میں شعور آگاہ ہوگا۔ یہی آگاہی اس کیفیت کا مشاہدہ کہلاتا ہے۔ اسی طرح انسان اپنی اشرف المخلوقاتی ہیئت میں اگر سورج یا سورج سے ماسوئے کیفیات کا مشاہدہ کرنا چاہے تو اُسے اس کائنات کی تمام کیفیتوں کا جو آسمان اول تک واقع ہیں مشاہدہ

حاصل ہوگا۔اوراسکے جذب کی کیفیت بھی اسی طرح ہوگی۔کہ جیسی قوت اشیاء میں ہوگی انسان اپنی روح حیوانی کوان قوتوں میں جذب کر کے انکا مشاہدہ حاصل کریگا۔لیکن اس مشاہدہ میں چونکہ شریعت وطریقت کودخل نہیں صرف انسان کی ذاتی خاصیت کودخل ہے۔اسلئے اس عالم ناسوتی کے مشاہدہ کو کچھ اہمیت حاصل نہ ہوگی۔کیونکہ ہرانسان فطری طور یہ شرف حاصل کئے ہوئے ہوتا ہے۔جس میں دین (شریعت) کودخل نہیں ہوتا ہے۔اسلئے۔ہروہ شخص جوشریعت وطریقت سے وابستگی نہ رکھے یہ مشاہدہ وجذب اپنے تصور میں حاصل کرسکتا ہے۔لیکن شریعت انسانی خاصیتوں کوایک پابند نظام میں محصور کرتی ہے۔اوراس کی خاصیتوں میں قوام (قائم رکھنا) اوردوام پیدا کرتی ہے۔اسلئے غیرشرعی آدمی بغیرشرعی قوانین کی پابندی کے اپنی حفاظت نہیں کرسکتا اسکی مادیت اسے مادہ کی طرف رجوع کر کے اپنے منصب سے گراسکتی ہے۔تو انسان میں کمزوریاں بھی پیدا ہو جاتی ہیں اور وہ ذاتی طور مشاہدہ کرنے سے رہ جاتا ہے۔نیز جب انسان کامقصودعرفان الٰہی ہو۔تو وہ شریعت کی پابندی کے بغیر عالم ملکوت میں داخل نہیں ہوسکتا اسلئے اسکا مشاہدہ وجذب اپنے کمال کوحاصل نہیں کرسکتا ہے۔لیکن چونکہ عالم ناسوت (کائنات) کے مشاہدہ کیلئے روح حیوانی بغیرشریعت کے اپنی قوت کے ساتھ مشاہدہ کر سکتی ہےاورروح حیوانی کی تقویت صرف انسانی جسم کی صحت اورقوت پرمنحصر ہےاسلئے ہروہ شخص جو شریعت سے باہر رہ کراپنی جسمانی قوت کومعمولی تزکیہ سے برقرار رکھ سکے کائنات کا مشاہدہ کرسکتا ہے۔اس مشاہدہ سے انسان ولی کامل کا درجہ حاصل نہیں کرسکتا۔کیونکہ ولی کامل عالم ملکوت کی پہلی منزل اول اجلاس محمدیؐ سے ہی ہوتا ہے۔جہاں روح حیوانی داخل نہیں ہوسکتی ہے۔ایسی حالت میں جسمانی صحت کے ہوتے ہوئے انسان ان کائناتی قوتوں کوزیادہ تر دنیوی اغراض حاصل کرنے میں استعمال کر سکتا ہے۔اگرانسان اپنی قوی قوتوں سے ادنٰی قسم کے انسانوں پرناجائز غلبہ بھی حاصل کرنا چاہےتو کرسکتا ہے۔یہ کیفیت انسانی مقصود میں نفع بخش نہیں بلکہ اکثرمواقع میں نقصان دہ بھی ہوسکتی ہے۔

ایک شخص جسکی اشرف المخلوقاتی قوتیں سالم نہ ہوں وہ بھی معمولی تزکیہ اور یکسوئی (مسمریزم) سے یہ قوت مشاہدہ حاصل کرسکتا ہے۔لیکن بغیرشریعت وطریقت کی راہنمائی اوراصل

مقصود مدنظر نہ ہونے کے باعث یہ دونوں کیفیتیں غیر حقیقی تصور کی جائیں گی اس حالت میں انسانی نصب العین کی تکمیل نہیں ہوسکتی۔ اور انسان حقیقی علم العرفان حاصل نہیں کرسکتا ہے۔

رہا وہ شخص جو شریعت کی پابندی کے ساتھ صراط اللہ کا مشاہدہ اور جذب کا مقصود رکھتا ہو۔ اسکے لئے شریعت کے تابع۔ علم طریقت کے اصول پر چلنا ضروری ہے۔ وہ علم کیلئے ایک راہنما ولی اکمل سے بیعت کرے۔ جس میں شریعت کے عمل کے ساتھ اسکے لیے ضروری ہے کہ وہ جذبِ حقیقت حاصل کرنے کیلئے اسی روح سے اکتسابِ نور حاصل کرے جسے اکمل طریقہ پر جذب حاصل ہو چکا ہو۔ اسکے لیے ولی اکمل سے بیعت کے نتیجہ میں۔ اسکی ہدایت کے مطابق عمل کرنا ہے۔ وہ ہدایت کیا ہے؟ شریعت کی پابندی۔ قیام لیل (یا وہ اختراع جو ولی اکمل سے حاصل ہو) قرأت میں ذکر تلاوت قرآن۔ تزکیہ میں ہر اس چیز سے پرہیز جس سے مادیت کا غلبہ ہو۔ اسکے علاوہ تصور شیخ ضروری ہے۔ تصور شیخ میں کیا محسوس ہوتا ہے؟ ــــــ ایک طرف تزکیہ مجاہدہ سے انسانی روح حیوانی لطیف ہوتی ہے۔ اور روح رحمانی کے مشابہ ہو جاتی ہے۔ ادھر روح رحمانی بھی وسیع ہو کر عالم ملکوت تک پہنچ کر شیخ کی روح کے قریب ہو جاتی ہے۔ وہ اس طرح کہ جب حُب کے ساتھ شیخ کا تصور کیا جائے۔ تو شیخ کا تصور اسکے قلب میں اسقدر موجزن ہو جاتا ہے۔ کہ سوائے ولی اکمل کے تصور کے تمام خواہشاتِ نفسانی اور تمام تفکرات مٹ جاتے ہیں اور انسان پر محویت طاری ہو جاتی ہے۔ جب اس محویت میں استقلال اور دوام پیدا ہوتا ہے۔ تو اسکا نتیجہ یہ ہوتا ہے۔ کہ انسان کی روح رحمانی قوی اور وسیع ہو جاتی ہے۔ وسیع ہونے سے جبکہ تصورات میں صرف ایک ہی پیر اکمل کا تصور قائم ہو تو روح رحمانی ولی اکمل کی روح رحمانی میں فنا ہو جاتی ہے۔ اور فنا حاصل ہونے سے ہی اسے جذب حاصل ہوتا ہے۔ جذب کی کیفیت روح رحمانی (قلب) سے دماغ (روح حیوانی) میں منتقل ہوتی ہے۔ یہی کیفیت مشاہدہ میں آتی ہے۔ یہ طریق تو ایک طالب کیلئے ضروری ہے۔ اب دیکھنا ہے۔ کہ ولی اکمل سے بیعت کرنے میں۔ ولی اکمل طالب کی اصلاح کیسے کرتا ہے ــــ یہ امر ضروری ہے۔ کہ ایک ولی کی اکملیت کے بعد اسکا منصب نائب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حیثیت سے ہوتا ہے۔ اسلئے اس

نے صرف راہنمائی کا کام کرنا ہوتا ہے۔ وہ علم بتاتا ہے۔ اور انسان کا تزکیہ کرتا ہے۔ علم میں وہ وہی عمل بتاتا ہے۔ جو اسے سینہ بسینہ سلسلہ کے ذریعہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے وحی خفی میں حاصل ہوتا ہے۔ وہ وہی علم ہوتا ہے۔ جسکا نتیجہ عمل صراط اللہ کے مراتب ہوتے ہیں اور جس سے انسان صراط مستقیم کو پالیتا ہے اسکے ساتھ ہی اسی علم سے مشاہدہ کی قوت بھی پیدا کرتا ہے۔ اور ساتھ ساتھ تزکیہ روحانی کرتا ہے۔ وہ تزکیہ روحانی اسطرح ہوتا ہے۔ کہ ولی اکمل روح کے ذریعہ اپنے مرید سے ہر لمحہ آگاہ رہتا ہے۔ اسکی تمام قلبی کمزوریوں کا معائنہ کرتا رہتا ہے اور باطنی طور اپنے نور کی توجہ اسکے قلب پر ڈالتا ہے۔ جس سے روح رحمانی۔ روح حیوانی میں تقویت ہوتی ہے۔ تقویت ہونے سے قلب میں روح رحمانی کے ذریعہ عکس حاصل کرنے کی صلاحیت پیدا ہوتی ہے۔ یہاں تک کہ قلب مجسم نورانی ہو جاتا ہے۔ جب مشاہدہ میں استقلال اور دوام پیدا ہوتا ہے۔ تو گویا قلب اپنی انتہائی نورانی قوت پر آ جاتا ہے۔ اسکے بعد جب انسان چاہے اپنی مرضی وارادہ سے مشاہدہ کرے تو وہ قلب اور حافظہ کا تصور کے ذریعہ رابطہ پیدا کرتا ہے۔ اور جہاں تک اسے مراتب جذب وفنا میں حاصل ہوں وہاں تک مشاہدہ کرتا ہے۔ یہاں تک کہ خود شریعت وطریقت کے عمل سے اور پیر اکمل کی توجہ وتزکیہ سے انسان مقصود حقیقی کو پالیتا ہے۔ جب مقصود پالیا تو پھر کسی مقصود کی حاجت نہیں رہتی پھر ولی مکمل ہو جاتا ہے۔ ولی مکمل ہونے کی صورت میں پھر اسکا صرف ایک ذات الٰہی کا مشاہدہ ہمیشہ کیلئے (جہاں تک کہ وہ زندہ ہے) قائم رہتا ہے۔ اور موت کے بعد بھی اسی کیفیت میں جذب وفنا کی حالت میں ابدالآباد رہتا ہے۔

انسان اس حالت میں جبکہ اسے اپنا مقصود حاصل ہو چکا۔ اب لازمی طور وہ اس عمل سے بھی فارغ ہوتا ہے، جس عمل سے اسے مقصود حاصل ہوتا ہے۔ یعنی شریعت کی پابندی اور طریقت کا عمل! کیونکہ یہ سب عمل صرف عرفان الٰہی حاصل کرنے کیلئے ہی ہے۔ لیکن یہ فراغت اس صورت میں ہوتی ہے۔ جبکہ انسان ہمہ وقت جذب واستغراق کی کیفیت میں رہتا ہو۔ مگر انسان مشاہدہ الٰہی میں ہر وقت نہیں رہتا بلکہ صرف اسوقت رہتا ہے۔ جب اپنی مرضی سے قلب وحافظہ کا رابطہ قائم کرتا ہے۔ اسکے بعد جب قلب وحافظہ کا رابطہ ختم ہوا۔ تو اس صورت میں انسان کا قلب اور حافظہ دنیوی معاملات کے

واقعات بھی حاصل کر لیتا ہے۔ جتنی دیر قلب و حافظہ دنیوی خواہشات حاصل کرتا ہے۔ اسکا مشاہدہ حقیقی بند رہتا ہے۔ گویا اسوقت وہ اگرچہ مراتب کے لحاظ سے مقصود حاصل کئے ہوتا ہے۔ لیکن مشاہدہ میں اسکی کیفیت عام انسانوں جیسی ہوتی ہے۔ ایسی حالت میں اگر شریعت کا پابند نہ رہے تو اسکی قوت مشاہدہ میں فرق آنا لازمی ہے۔ اور ساتھ ساتھ اگر شریعت کا پابند نہ رہے۔ تو اسکی جگہ اسے دنیوی معاملات میں مشغول رہنا ہوگا دنیوی معاملات کا پیہم ہجوم اس میں کسی وقت بھی مادہ کا غلبہ پیدا کرسکتا ہے۔ اور مادہ کا غلبہ ہونے سے لازمی اس سے خلاف شریعت عمل کا صدور ہوسکتا ہے۔ جب خلاف شریعت عمل اس سے صادر ہوں۔ تو اسکے نتیجہ میں اسکا مراتب سے تنزل کی طرف آنے کا احتمال ہے۔ اسلئے جب تک انسان ہوشمند ہے۔ اسے ایک خالص ماحول اور لطیف غذا کی ضرورت رہتی ہے۔ جسکے لیے شریعت کی پابندی لازمی ہے۔ یہ پابندی انسان کی موت تک برابر جاری رہتی ہے۔ مقصود حاصل ہونے کے بعد اگر ایک شخص شریعت کی پابندی نہ کرے تو اسکا عمل بھی اسی نوعیت کا ہو جائیگا۔ جس نوعیت کا ایک غیر شرعی مشاہد کا ہوتا ہے۔ اسلئے مقصود کے بعد بھی شریعت کی پابندی اتنی ہی ضروری ہے جتنی مقصود کی تکمیل سے قبل ہوتی ہے۔

الغرض طریقت میں مشاہدہ حاصل کرنے کیلئے ایک حقیقی علم۔ اور ایک حقیقی راہنما (ولی اکمل) کا ہونا ایک لازمی چیز ہے۔ جب تک علم حقیقی میسّر نہ ہو انسان کسی کیفیت کی حقیقت کا علم حاصل نہیں کرسکتا اور جب تک علم کے ساتھ ایک حقیقی راہنما میسّر نہ ہو۔ علم کی حقیقت سے پورے طور آگاہی نہیں ہوسکتی ہے۔ اسلئے مقصود حاصل کرنے کے لیے ہر شخص کو ایک راہنما کی ضرورت پڑتی ہے۔ اسی راہنما سے حقیقی علم بھی حاصل ہوتا ہے۔ شریعت کے علم ظاہری میں اگرچہ امام (عالم شریعت) کا ہونا بھی راہنمائی کیلئے کافی ہوتا ہے۔ مگر جہاں تک مقصود حقیقی۔ اور انسانی نصب العین کا تعلق ہے۔ انسانی مقصود کی تکمیل بغیر ولی اکمل کی راہنمائی کے نہیں ہوسکتی ہے۔

شریعت کا علم تمام قرآن کریم سے اخذ کیا جاتا ہے۔ سوائے قرآن کے اور کوئی ایسا علم نہیں جس سے انسان اپنے مقصود میں کامیابی حاصل کرسکتا ہو ــــ مگر دیکھنا یہ ہے۔ کہ کیا قرآن کریم کا علم

صرف نماز۔ روزہ۔ صدقات تک ہی محدود ہے یا اس سے بھی زیادہ اس میں علم ہے اور اس علم کو حاصل کرنے کیلئے کس عالم کی ضرورت ہے۔ چنانچہ اسکی وضاحت قرآن کی آیات سے ہی ہوتی ہے۔

إِنَّا جَعَلْنٰهُ قُرْءٰنًا عَرَبِيًّا لَّعَلَّكُمْ تَعْقِلُوْنَ ﴿ (پارہ ۲۵ سورۃ ۴۳ آیت ۳) تحقیق ہم نے قرآن کو عربی زبان میں اتارا تاکہ تم عقل سے سمجھ سکو۔

یہاں قرآنی مواد میں یہ چیز ظاہر ہوتی ہے۔ کہ یہ عربی زبان میں اتارا گیا ہے۔ اور اسکو عقل اور حواس کے ذریعہ سمجھا جاسکتا ہے۔ گویا اسکے علم کا تعلق عقل کے ذریعہ سمجھنے سے بھی ہے۔ اور ہر انسان بغیر کسی راہنمائی کے حواس کو کام میں لاکر اسکی آیات کا پتہ کرسکتا ہے۔ اسکا مطلب یہ ہے۔ کہ رسول نے جو کچھ احکام بتائے اس میں کسی اور شخص کی راہنمائی درکار نہیں۔ صرف رسول کا حکم وارشاد کافی ہے۔ یہی چیز شریعت کی اساس ہے۔ وہ چیز شریعت ظاہری[1]۔ نماز۔ روزہ۔ حج۔ زکوٰۃ ہیں اسکے لیے کسی شخص کی راہنمائی کی ضرورت نہیں کہ جب تک ولیِ اکمل نہ کہے تب تک نماز نہیں ہوسکتی۔ یا جسطرح ولی اکمل نماز پڑھنے کو کہے اسی طرح پڑھی جائے اور اگر ولی کوئی دوسرا طریق نماز ادا کرنے کا بتائے وہی طریق صحیح ہوسکتا ہے ___ اور جو عام لوگ نماز وغیرہ ادا کرتے ہیں۔ وہ صحیح نہیں ___ نہیں! بلکہ اس میں وہی طریق بہتر ہے۔ جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بتایا اور تواتر کے ساتھ ہر شخص اسی طرح نماز ادا کرتا ہے۔ اگر ولی کوئی دوسرا طریق شریعت کی نماز میں اختراع کرے۔ وہ جائز نہیں بلکہ لغو ہے۔ البتہ ان احکام کے علاوہ ایسی بھی آیتیں (علم) ہیں جنکے لیے ایک علیٰحدہ طریق کار ہے۔ وہ طریق وعلم شریعت کے خصوصی احکام سے علاوہ (زائد) ہے۔ جسکے لیے بھی رسول اللہ صلی

---

[1] شریعت ظاہری وہی چیز ہے۔ جس پر امت کا ہر شخص۔ قرآن وحدیث اور امامین کی فقہ کے مطابق عمل پیرا ہے۔ اس میں اگر راہنما کی ضرورت محسوس ہوتی ہے۔ وہ صرف اس لئے کہ قرآن کے معانی کو حدیث کے ذریعہ سمجھا جائے اور حدیث افعال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو امامین کی تفسیر کے ذریعہ سمجھا جائے۔ جس میں فرض۔ سنت۔ مستحب۔ واجب وغیرہ اور نماز۔ روزہ۔ حج۔ زکوٰۃ کو اسکی اصل حالت میں ادا کرنے کے طریقے حاصل ہوتے ہیں۔

اللہ علیہ وسلم نے ہی ایک قرآنی طریق بتایا ہے۔

هُوَالَّذِیۡۤ اَنۡزَلَ عَلَیۡكَ الۡكِتٰبَ مِنۡهُ اٰیٰتٌ مُّحۡكَمٰتٌ هُنَّ اُمُّ الۡكِتٰبِ وَاُخَرُ مُتَشٰبِهٰتٌ ؕ فَاَمَّا الَّذِیۡنَ فِیۡ قُلُوۡبِهِمۡ زَیۡغٌ فَیَتَّبِعُوۡنَ مَا تَشَابَهَ مِنۡهُ ابۡتِغَآءَ الۡفِتۡنَةِ وَابۡتِغَآءَ تَاۡوِیۡلِهٖ ۚ وَمَا یَعۡلَمُ تَاۡوِیۡلَهٗۤ اِلَّا اللّٰهُ ؔۘ وَالرّٰسِخُوۡنَ فِی الۡعِلۡمِ یَقُوۡلُوۡنَ اٰمَنَّا بِهٖ ۙ كُلٌّ مِّنۡ عِنۡدِ رَبِّنَا ۚ وَمَا یَذَّكَّرُ اِلَّاۤ اُولُوا الۡاَلۡبَابِ ۝ (پارہ ۳ سورۃ ۳ آیت ۷) اللہ ہی وہ ذات ہے جس نے آپ (رسولؐ) پر کتاب نازل کی بعض آیتیں واضح اور محکم (بغیر راہنمائی کے اور عقل کے ذریعہ) ہیں۔ یہی اس کتاب کا ٹھوس علم ہے جس پر ہر شخص بغیر کسی باریکی کے عمل کرسکتا ہے۔ اور اس کا عمل لازمی [1] ہے۔ اور بعض آیتیں متشابہات ہیں۔ یعنی تشبیہی۔ جن آیتوں کو تمثیلی شکل میں بیان کیا گیا۔ لیکن ان آیتوں کے نشان باطن میں ہیں۔ جو لوگ دین میں فتنہ پیدا کرنا چاہتے ہیں۔ وہ انہیں غیر جسمانی کیفیتوں پر حواس وعقل کے ذریعہ بحث کرتے ہیں اور جب انکی سمجھ میں یہ کیفیتیں عقل کے ذریعہ نہیں آتیں۔ تو بلا حجت قرآن کے علم پر نکتہ چینی کرتے ہیں۔ حالانکہ یہ علم انہیں عقل کے ذریعہ حاصل نہیں ہوسکتا۔ یہ علم صرف ان لوگوں کو حاصل ہوسکتا ہے۔ جو علم میں راسخ ہوں۔ یعنی جنہوں نے علمِ شریعت وطریقت کی تکمیل کر کے ان آیات کو عالم باطن میں مشاہدہ کیا ہو اور وہ گواہی دیتے ہیں کہ حقیقتاً یہ سب کچھ ہمارے رب کی طرف سے ہے۔ قرآنی وعظ نصیحت کو وہی لوگ حاصل کرتے ہیں جو صاحب بصیرت ہوں۔

اس آیت میں قرآنی علم کی دو نوعیتیں بتائی گئی ہیں۔ ایک علم کی وہ نوعیت جو صرف حواس تعقل سے تعلق رکھتی ہے۔ دوسری وہ جو عالم باطن سے تعلق رکھتی ہے۔ پہلی قسم میں۔ شریعت کے ٹھوس اور کھلے احکام ہیں۔ جن پر ہر شخص عمل کرسکتا ہے۔ یہ احکام انسانی ظاہری عمل (پابندی) کیلئے ہیں وہ امر (حکم) عمل کرنے کا حکم۔ اور نہی (منع) جس میں غیر شرعی عمل کرنے سے منع۔ مثلاً شراب۔ زنا۔ چوری۔ جھوٹ وغیرہ ہیں اس کے علاوہ تفکر کائنات میں ان اشیاء کے وجود کی تحقیق جو عقل وحواس کے

---

[1] یہی عمل نماز۔ روزہ۔ حج۔ زکوۃ ظاہر شریعت کے احکام ہیں۔ جو عقل کے ذریعہ سمجھے جاسکتے ہیں۔

احاطہ میں آتے ہیں۔ان اشیاء کی تحقیق سے ایک خالق کو معبود و مالک ماننے کے نشان پائے جاتے ہیں۔وہ آیتیں بھی قرآن خود بتاتا ہے۔

وَفِي الْأَرْضِ آيٰتٌ لِّلْمُوْقِنِيْنَ ۙ وَفِيْٓ اَنْفُسِكُمْ ۭ اَفَلَا تُبْصِرُوْنَ ○

(پارہ ۲۶ سورۃ ۵۱ آیت ۲۰۔۲۱) تحقیق زمین و آسمان کی تخلیق میں (اللہ کے خالق ہونے کے) نشان یقین کرنے والوں کیلئے موجود ہیں اور خود تمہارے وجود (کی تخلیق و بناوٹ) میں بھی (اللہ کے خالق ہونے کے) نشان موجود ہیں کیا تم آنکھوں (حواس) سے نہیں دیکھتے۔

یہ آیت انسان کو تفکر کرنے کی تحریک دیتی ہے۔کہ انسان تفکر کرے۔اور اپنی آنکھ اور تعقل سے حقیقت کا مشاہدہ کرے۔یہاں بتایا گیا ہے۔کہ مشاہدہ کرنے کے لیے حواس و تعقل کام کرتے ہیں ـــ حواس اور تعقل کے ربط کیلئے قرآن خود ایک واضح بیان دیتا ہے۔

وَمَثَلُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا كَمَثَلِ الَّذِيْ يَنْعِقُ بِمَا لَا يَسْمَعُ اِلَّا دُعَاۗءً وَّنِدَاۗءً ۭ صُمٌّۢ بُكْمٌ عُمْيٌ فَهُمْ لَا يَعْقِلُوْنَ ○ (پارہ ۲ سورۃ ۲ آیت ۱۷۱) مثال کافر کی مثال اس شخص جیسی ہے۔کہ جو پکارتا ہے۔(مثل چرواہے کے) کہ (حیوان) اس پکار سے سوائے بلانے اور پکارنے (ایک بے معنی آواز) کے کچھ نہیں سمجھتے۔یہ لوگ (آواز کی حقیقت کو سمجھنے کی کوشش نہیں کرتے) گویا بہرے ہیں۔گونگے ہیں۔اندھے ہیں (حواس کی خرابی کی وجہ سے) پس وہ (حقیقت کی آواز کو) عقل کے ذریعہ حاصل نہیں کرتے۔

یہ ایک مثال ہے ان لوگوں کی جو کافر ہیں۔جب قرآن کی آیتیں واضح طور (مبین) انہیں سناتے ہیں۔کہ اس کائنات کا خالق و معبود ایک اللہ ہے۔تو کان نہیں دھرتے۔آنکھوں سے آیات سماوات والارض پر تفکر کی نظر نہیں ڈالتے تو ان کی کیفیت بہرے گونگے اور اندھے کی سی ہو جاتی ہے۔جو کھلی نشانیوں کو اپنے حواس و تعقل سے قبول نہیں کرتے۔یہاں بہرا۔گونگا۔اندھا ہونا حواس کی خرابی ہے۔اور تعقل کا لفظ بیان کرنے سے حواس و تعقل کا ربط خود ظاہر ہوتا ہے۔

اِنَّ فِیۡ خَلۡقِ السَّمٰوٰتِ وَالۡاَرۡضِ وَاخۡتِلَافِ الَّیۡلِ وَالنَّهَارِ وَالۡفُلۡكِ الَّتِیۡ تَجۡرِیۡ فِی الۡبَحۡرِ بِمَا یَنۡفَعُ النَّاسَ وَمَاۤ اَنۡزَلَ اللّٰهُ مِنَ السَّمَآءِ مِنۡ مَّآءٍ فَاَحۡیَا بِهِ الۡاَرۡضَ بَعۡدَ مَوۡتِهَا وَبَثَّ فِیۡهَا مِنۡ كُلِّ دَآبَّةٍ ص وَّ تَصۡرِیۡفِ الرِّیٰحِ وَ السَّحَابِ الۡمُسَخَّرِ بَیۡنَ السَّمَآءِ وَالۡاَرۡضِ لَاٰیٰتٍ لِّقَوۡمٍ یَّعۡقِلُوۡنَ ○ (پارہ۲ سورۃ۲ آیت۱۶۴) تحقیق پیدائش آسمان اور زمین کے اور اختلاف رات اور دن کے اور کشتیوں (جہازوں) کے جو چلتی ہیں سمندر میں اس چیز کے ساتھ کہ نفع دیتی ہیں لوگوں کو (یعنی تجارت) اور جو کچھ اتارا اللہ نے آسمان سے پانی سے۔ پس زندہ کیا (روئیدگی پیدا کی) اس سے زمین کو بعد اسکی موت کے۔ اور پھیلائے اس میں تمام جانوروں سے اور پھیرنے ہواؤں کے۔ اور بادلوں کے۔ کہ باندھے ہوئے ہیں زمین و آسمان کے درمیان۔ البتہ (ان تمام چیزوں میں) نشانیاں ہیں واسطے قوم عقلمند کے۔

اس آیت میں وہ تمام کیفیتیں بیان کی گئی ہیں جو حواس میں آسکتی ہیں اور ان پر تفکر کرنے سے ایک حقیقت کے مشاہدہ میں اللہ کا خالق ہونا عقل کے ذریعہ تسلیم کیا جا سکتا ہے۔ اسلئے تعقل (یَعۡقِلُوۡنَ) کا لفظ استعمال کیا گیا ہے۔

وَفِی الۡاَرۡضِ قِطَعٌ مُّتَجٰوِرٰتٌ وَّ جَنّٰتٌ مِّنۡ اَعۡنَابٍ وَّزَرۡعٌ وَّنَخِیۡلٌ صِنۡوَانٌ وَّغَیۡرُ صِنۡوَانٍ یُّسۡقٰی بِمَآءٍ وَّاحِدٍ قف وَ نُفَضِّلُ بَعۡضَهَا عَلٰی بَعۡضٍ فِی الۡاُكُلِ ط اِنَّ فِیۡ ذٰلِكَ لَاٰیٰتٍ لِّقَوۡمٍ یَّعۡقِلُوۡنَ ○ (پارہ۱۳ سورۃ۱۳ آیت۴) اور بیچ زمین کے ٹکڑے ہیں نزدیک ایک دوسرے کے اور باغ ہیں انگوروں کے۔ اور کھیتیاں ہیں۔ اور کھجوریں ہیں ایک جڑ سے نکلی ہوئیں۔ اور جدا جدا جڑوں سے نکلی ہوئیں پلائی جاتی ہیں ایک ہی پانی سے۔ اور برتری دیتے ہیں ایک دوسرے پر میووں میں۔ تحقیق بیچ ان کے البتہ نشانیاں ہیں واسطے عقلمند قوم کے۔

وَسَخَّرَ لَكُمُ الَّیۡلَ وَالنَّهَارَ لا وَالشَّمۡسَ وَالۡقَمَرَ ط وَالنُّجُوۡمُ مُسَخَّرٰتٌ م بِاَمۡرِهٖ ط اِنَّ فِیۡ ذٰلِكَ لَاٰیٰتٍ لِّقَوۡمٍ یَّعۡقِلُوۡنَ ۙ○ (پارہ۱۴ سورۃ۱۶ آیت۱۲) اور مسخر کئے واسطے تمہارے (یعنی

فطری طور تمہاری ہی نشو و نما کیلئے یہ چیزیں کام آتی ہیں) رات ۔ دن ۔ سورج ۔ چاند ۔ ستارے (یہ چیزیں) مسخر ہیں اس کے (اللہ کے) حکم سے ۔ تحقیق بیچ اسکے نشانیاں ہیں واسطے قوم عقلمند کے ۔

ان آیات میں کیفیات ارضی و سماوی کا ذکر ہے اور انکے تفکر کیلئے صرف عقل (تعقل) کو استعمال کیا گیا ہے چنانچہ ان اشیاء میں تعقل سے صرف تفکر کرنا قرآنی بیان سے ظاہر ہوتا ہے ۔

يُنۡبِتُ لَكُمۡ بِهِ الزَّرۡعَ وَالزَّيۡتُوۡنَ وَالنَّخِيۡلَ وَالۡاَعۡنَابَ وَمِنۡ كُلِّ الثَّمَرٰتِ ؕ اِنَّ فِىۡ ذٰلِكَ لَاٰيَةً لِّـقَوۡمٍ يَّتَفَكَّرُوۡنَ ○ (پارہ ۱۴ سورۃ ۱۶ آیت ۱۱) اُگاتا ہے ساتھ اس کے (پانی کے) کھیتی ۔ زیتون ۔ کھجور اور انگور اور تمام میوے تحقیق اس میں بھی نشانی ہے (تفکر کیلئے) واسطے قوم تفکر کرنے والوں کے ۔

ان آیات میں خصوصی طور تخلیقِ کائنات پر تفکر حواس و عقل کے ذریعہ بتایا گیا ہے ۔ اسکے علاوہ شریعت کی تابعداری اور تسلیم کیلئے بھی آیات میں جو محکمات (عقل کی حد میں) آتی ہیں ۔

قُلۡ يٰۤاَهۡلَ الۡكِتٰبِ تَعَالَوۡا اِلٰى كَلِمَةٍ سَوَآءٍۢ بَيۡنَنَا وَبَيۡنَكُمۡ اَلَّا نَعۡبُدَ اِلَّا اللّٰهَ وَلَا نُشۡرِكَ بِهٖ شَيۡـئًا وَّلَا يَتَّخِذَ بَعۡضُنَا بَعۡضًا اَرۡبَابًا مِّنۡ دُوۡنِ اللّٰهِ ؕ فَاِنۡ تَوَلَّوۡا فَقُوۡلُوا اشۡهَدُوۡا بِاَنَّا مُسۡلِمُوۡنَ ○ يٰۤاَهۡلَ الۡكِتٰبِ لِمَ تُحَآجُّوۡنَ فِىۡۤ اِبۡرٰهِيۡمَ وَمَاۤ اُنۡزِلَتِ التَّوۡرٰةُ وَالۡاِنۡجِيۡلُ اِلَّا مِنۡۢ بَعۡدِهٖ ؕ اَفَلَا تَعۡقِلُوۡنَ ○ هٰۤاَنۡتُمۡ هٰٓؤُلَآءِ حَاجَجۡتُمۡ فِيۡمَا لَـكُمۡ بِهٖ عِلۡمٌ فَلِمَ تُحَآجُّوۡنَ فِيۡمَا لَـيۡسَ لَـكُمۡ بِهٖ عِلۡمٌ ؕ وَاللّٰهُ يَعۡلَمُ وَاَنۡتُمۡ لَا تَعۡلَمُوۡنَ ○ (پارہ ۳ سورۃ ۳ آیت ۶۴ تا ۶۶) کہہ دیجئے ۔ کہ اے اہل کتاب آؤ ایک بات (شریعت) پر جو ہمارے تمہارے درمیان یکساں ہے ۔ متفق ہو جائیں ۔ کہ ہم کسی اور کی اللہ کے سوا عبادت نہ کریں ۔ نہ اسکا کسی چیز کو شریک ٹھہرائیں ۔ اور نہ اللہ کو چھوڑ کر ایک دوسرے کو اپنا رب پکڑیں ۔ پھر اگر وہ (اس بات سے) منہ موڑیں تو کہہ دیں ۔ کہ شاہد رہو تم (ہمارے) کہ ہم اللہ کے فرمانبردار ہیں ۔ اے اہل کتاب تم (شریعت کو تسلیم کرنے میں) ابراہیمؑ کے (دین کے) بارے میں کیوں جھگڑتے ہو ۔ حالانکہ توراۃ و انجیل اسکے بعد اتاری گئی ۔ کیا تم (شریعت کے معاملہ میں) عقل سے

نہیں سمجھتے۔تم وہ لوگ ہو کہ جس بات کا تمہیں قدرے علم ہے اس میں بھی جھگڑتے ہو۔مگر جن باتوں کا تمہیں قطعی علم نہیں ان میں کیوں جھگڑتے ہو۔اللہ جانتا ہے (ہر کیفیت کو) اور تم نہیں جانتے۔

ان آیات میں شریعت کا ذکر ہے۔ کہ فروعی باتوں میں بحث و مباحثہ کر کے الجھاؤ پیدا کرتے ہو۔بہتر یہ ہے کہ آؤ اس بات پر اتفاق کریں جو تورات انجیل قرآن میں یکساں طور بیان کی گئی ہے۔وہ شریعت ہے۔ کہ ہر شریعت (کتاب) میں ایک ہی حکم ہے۔ کہ اللہ کو ایک معبود مانو اور اسی کی عبادت کرو۔اسکے ساتھ تعقل کو استعمال کیا گیا ہے۔اسکے ساتھ ہی تعقل کی حدود میں آنے والے احکام پر تسلیم کی طرف اشارہ ہے۔اور غیر عقلی علم پر فکر عقل سے کرنا جھگڑے سے تعبیر دیا گیا ہے۔

یہ پہلی قسم ہے جس میں تفکر کائنات اور محکم احکام شریعت پر خارجی علم (تعقل) سے عالم و عامل ہونے کا استدلال ہے ــــ اسکے بعد دوسری قسم ہے۔جس کا تعلق ماوراء تعقل سے ہے۔اسے متشابہات سے موسوم کیا گیا ہے۔یہ کیفیات شعور وقلب سے متعلق ہیں۔شعور وقلب سے علم حاصل کرنے والوں کو رَاسِخُوْنَ فِی الْعِلْمِ سے خطاب کیا گیا ہے۔

اَمْوَاتٌ غَیْرُ اَحْیَآءٍ ج وَمَا یَشْعُرُوْنَ لا اَیَّانَ یُبْعَثُوْنَ ○ (پارہ ۱۴ سورۃ ۱۶ آیت ۲۱)

مردے ہیں نہیں زندے اور نہیں جانتے کب اٹھائیں جائینگے۔

اس آیت میں بعثِ بعد الموت واقع قیامت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے۔اس کیفیت کے ادراک کو یَشْعُرُوْنَ شعور سے سمجھنے سے تعبیر دیا گیا ہے۔یہاں قیامت (بعد موت) کو اٹھنا متشابہات سے ہے۔اور اس کیفیت کو علم راسخ والے شعور کے ذریعہ مشاہدے میں لاسکتے ہیں۔

قُلْ لَّا یَعْلَمُ مَنْ فِی السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ الْغَیْبَ اِلَّا اللّٰہُ ط وَمَا یَشْعُرُوْنَ اَیَّانَ یُبْعَثُوْنَ ○ (پارہ ۲۰ سورۃ ۲۷ آیت ۶۵) کہہ دیجئے کہ نہیں جانتا کوئی بیچ آسمان اور زمین کے غیب کو سوائے اللہ کے۔اور نہیں جانتے کس وقت اٹھائے جائیں گے۔

اس آیت میں آسمان کی کیفیات اور کائنات کا باطن (عالم ناسوت) آسمان و زمین کی پوشیدہ (غیر جسمانی) کیفیات اَلْغَیْبَ بھی متشابہات میں شمار کی گئی ہیں۔کیونکہ اس بیان کے ساتھ

دوسرے متشابہ قیامت کا بھی ذکر کیا گیا ہے۔ان کیفیتوں کے علم میں یَشْعُرُوْنَ (شعور) کو استعمال کیا گیا۔گویا علم راسخ والے لوگ شعور کے ذریعہ ان کیفیاتِ غیب کا مشاہدہ کر سکتے ہیں۔اور اسکا علم خود مالک حقیقی کو کُلی طور حاصل ہے۔اوران کیفیتوں کو حواس وتعقل سے سمجھا نہیں جا سکتا۔

وَاَقْسَمُوْا بِاللّٰهِ جَهْدَ اَيْمَانِهِمْ لَئِنْ جَآءَتْهُمْ اٰيَةٌ لَّيُؤْمِنُنَّ بِهَا ط قُلْ اِنَّمَا الْاٰيٰتُ عِنْدَ اللّٰهِ وَمَا يُشْعِرُكُمْ لا اَنَّهَآ اِذَا جَآءَتْ لَا يُؤْمِنُوْنَ ○ وَنُقَلِّبُ اَفْئِدَتَهُمْ وَاَبْصَارَهُمْ كَمَا لَمْ يُؤْمِنُوْا بِهٖٓ اَوَّلَ مَرَّةٍ وَّنَذَرُهُمْ فِيْ طُغْيَانِهِمْ يَعْمَهُوْنَ ○ (پارہ۷سورۃ۶ آیت۱۰۹۔۱۱۰)اور قسم کھائی تھی انہوں (یہود ونصاریٰ) نے سخت قسموں کے ساتھ کہ اگر انکے پاس (اللہ کے خالق ومعبود ہونے کی) کوئی نشان آجائے تو وہ ضرور اس پر ایمان لائینگے۔کہہ دیجئے نشانات تو اللہ کے پاس ہیں اور تم ان نشانیوں کی کیفیت کا علم حاصل نہیں کر سکتے۔یہ کہ وہ جب آئیگی یہ ایمان نہیں لائینگے اور پھیر دینگے ان کے دل [1](یا دماغ) اور انکی آنکھیں۔جسطرح کہ وہ پہلی بار بھی اسکے (شریعت کی نشانیوں کے ساتھ یعنی موسیٰؑ وعیسیٰؑ کی شریعت ومعجزات کے ساتھ) ساتھ ایمان نہیں لائے تھے اور ہم انکو انکی سرکشی میں چھوڑ دیں گے۔بھٹکتے پھریں گے۔

ان آیات میں غالباً یہود ونصاریٰ کی طرف اشارہ ہے۔جنہوں نے قبل از وقت یہ قسم کھائی تھی۔کہ جب حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم آخر الزمان نبی آئینگے اور اپنے ساتھ نشان حق (قرآن) لائینگے۔تو ہم سب سے پہلے اس پر ایمان لائینگے۔یہاں قبل از وقت الغیب کی کیفیت اٰيَةٌ ہے۔اور اسکا علم نہ ہونے کی دلیل اِنَّمَا الْاٰيٰتُ عِنْدَ اللّٰهِ سے دی گئی ہے اور وَمَا يُشْعِرُكُمْ اس آیت کی کیفیت غیب کو مشاہدہ کرنے کا ذریعہ ہے اسلئے اس آیت میں آیات کی کیفیات متشابہات کا علم حاصل کرنے کیلئے شعور کا لفظ ادا کیا گیا ہے۔

---

[1] عربی میں فؤاد دل اور دماغ دونوں کیلئے بھی استعمال ہوتا ہے۔اس آیت میں دل اور آنکھوں کے ذریعہ علم کا مشاہدہ کرنا بتایا ہے کہ ظاہری واقعات آنکھ سے مشاہدہ کئے جاتے ہیں۔اور باطنی واقعات دل سے شعور تک پہنچائے جاتے ہیں۔

وَهُمْ يَنْهَوْنَ عَنْهُ وَيَنْئَوْنَ عَنْهُ ج وَاِنْ يُّهْلِكُوْنَ اِلَّآ اَنْفُسَهُمْ وَمَا يَشْعُرُوْنَ ○ (پارہ ۷ سورۃ ۶ آیت ۲۶) اور وہ لوگ لوگوں کو (ایمان لانے سے) منع کرتے ہیں۔ اور خود بھی اس سے دور رہتے ہیں۔ اور یہ کہ اپنی ہی جانوں کو ہلاک کرتے ہیں۔ مگر (اپنی ہلاکت کو) سمجھتے نہیں۔

اس آیت میں لوگوں کو حقیقت سے منع کرنا۔ اور خود نہ تسلیم کرنا۔ شریعت کی خلاف ورزی ہے۔ انکار کی صورت میں انکے عمل کے مطابق نتیجۂ عمل (باطن میں) بنتا جا رہا ہے۔ اس نتیجۂ عمل میں انکے لیے دائمی عذاب ہوگا۔ لیکن اس نتیجۂ عمل کو وہ شعور کے ذریعہ محسوس نہیں کر سکتے۔ اسلئے کہ انہیں اپنے نتیجۂ عمل کا مشاہدہ (شعوری) حاصل نہیں کہ اپنے عملوں کی کیفیت دیکھ سکیں۔

اس آیت کی تصدیق دوسری آیت سے ہوتی ہے۔ قَالُوْا يٰوَيْلَنَا مَنْ ؀ بَعَثَنَا مِنْ مَّرْقَدِنَا سکتہ ؀ هٰذَا مَاوَعَدَ الرَّحْمٰنُ وَصَدَقَ الْمُرْسَلُوْنَ ○ (پارہ ۲۳ سورۃ ۳۶ آیت ۵۲) قیامت کے دن جب اپنے انکارِ حقیقت اور انحراف کی بنا پر وہ اپنے لئے ایک بُرا نتیجۂ عمل حاصل کئے ہوئے اٹھیں گے۔ تو اسوقت انکا نتیجۂ عمل (جو زندگی میں وہ شعور سے نہ دیکھ سکے) سامنے آئیگا تو دیکھ کر کہیں گے۔ کہ یہ وہ دن ہے جس دن ہر شخص کو اپنے نتیجۂ عمل کے مطابق راحت و عذاب دیکھنا ہے۔ افسوس ہم نے زندگی میں اسے جھٹلایا جسکی تصدیق پیغمبر کرتے رہے اور اللہ نے اسکا وعدہ کیا تھا۔

اَفَلَمْ يَسِيْرُوْا فِى الْاَرْضِ فَتَكُوْنَ لَهُمْ قُلُوْبٌ يَّعْقِلُوْنَ بِهَآ اَوْ اٰذَانٌ يَّسْمَعُوْنَ بِهَا ج فَاِنَّهَا لَا تَعْمَى الْاَبْصَارُ وَلٰكِنْ تَعْمَى الْقُلُوْبُ الَّتِىْ فِى الصُّدُوْرِ ○ (پارہ ۱۷ سورۃ ۲۲ آیت ۴۶) کیا پس نہیں پھرتے زمین میں۔ پس ہوتے انکے واسطے دل کہ تعقل کرتے اس سے ــــ یا کان کہ سُنتے ان سے۔ پس تحقیق وہ نہیں آنکھوں کے اندھے۔ لیکن اندھے ہیں دل انکے جو انکے سینوں میں ہیں۔

اس آیت میں کائنات کی سیر میں کیفیات کے دیکھنے کیلئے۔ اور انکا علم حاصل کرنے کیلئے دل کا تعقل کرنا بتایا گیا ہے۔ کہ خَلْقَ الْاَرْضِ میں دلچسپی سے تفکر نہیں کرتے۔ تا کہ انہیں تخلیق کا

حقیقی علم دل کے ذریعہ معلوم ہو۔ اسلئے یہ لوگ اپنی عدم دل چسپی اور عدم توجہی کے باعث آنکھوں سے تو واقعات دیکھتے ہیں۔ مگر دل کی قوت سے ان کیفیات کی باریکی پر تفکر نہیں کرتے۔ اسلئے باوجود آنکھیں رکھنے کے انکا دل جو حقیقت کا علمِ حقیقی حاصل کرنے کا ذریعہ ہے۔ اندھا ہے۔ وہ دِل جو سینہ کے اندر ہوتا ہے۔

تُسَبِّحُ لَهُ السَّمٰوٰتُ السَّبْعُ وَالْاَرْضُ وَمَنْ فِيهِنَّ ط وَاِنْ مِّنْ شَیْءٍ اِلَّا يُسَبِّحُ بِحَمْدِهٖ وَلٰكِنْ لَّا تَفْقَهُوْنَ تَسْبِيحَهُمْ ط (پارہ ۱۵ سورۃ ۱۷ آیت ۴۴) تسبیح کرتے ہیں واسطے اسکے ساتوں آسمان۔ اور زمین اور جو کچھ ان میں ہے۔ اور نہیں کوئی چیز مگر تسبیح کرتی ہے اسکی حمد کے ساتھ۔ لیکن تم اس تسبیح کو قلب کے ذریعہ (القائی حالت میں) نہیں مشاہدہ کر سکتے (جب تک کہ قلب وشعور کے ذریعہ اس تسبیح کا مشاہدہ نہ کرسکو)۔

یہاں ایک غیر عقلی کیفیتِ حمد کا ذکر کیا گیا ہے۔ کہ ہر شے اللہ کی تسبیح کرتی ہے۔ انسان کی تسبیح کا تو علم ہو جاتا ہے۔ لیکن باقی مخلوق کو تسبیح کرتے محسوس نہیں کیا جاتا جبکہ انکی حالت میں کوئی عقلی حرکت محسوس نہیں ہوتی۔ تو اسکا ظاہر طور احساس کرنا قلب کے القایا شعور کے مشاہدہ سے ہی ہو سکتا ہے۔ اسلئے قلب کے مشاہدہ کو تَفْقَهُوْنَ سے ادا کیا گیا ہے۔

وَلَقَدْ ذَرَاْنَا لِجَهَنَّمَ كَثِيْرًا مِّنَ الْجِنِّ وَالْاِنْسِ ۞ لَهُمْ قُلُوْب "لَّا يَفْقَهُوْنَ بِهَا وَلَهُمْ اَعْيُن" لَّا يُبْصِرُوْنَ بِهَا وَلَهُمْ اٰذَان" لَّا يَسْمَعُوْنَ بِهَا ط اُولٰٓئِكَ كَالْاَنْعَامِ بَلْ هُمْ اَضَلُّ ط اُولٰٓئِكَ هُمُ الْغٰفِلُوْنَ ○ (پارہ ۹ سورۃ ۷ آیت ۱۷۹) اور البتہ تحقیق پیدا کئے ہم نے دوزخ کے بہت شخص جنوں اور انسانوں سے۔ کہ انکے دل ہیں اور اس سے فقہ نہیں کرتے۔ اُنکی آنکھیں ہیں (نشان کائنات میں) نہیں دیکھتے۔ انکے کان ہیں حقیقت کی بات نہیں سُنتے (یہی مادۂ تحقیق انکو حیوانوں سے ممتاز کرتا ہے)۔ اب اگر یہ اپنی قوتوں کو حقیقت کے پانے کیلئے استعمال نہیں کرتے۔ تو ان میں اور حیوانوں میں وجہ فوقیت نہیں رہتی بلکہ یہ ان سے بدتر ہیں اور یہی لوگ غافل کہلاتے ہیں۔

اس آیت میں حواس و دل کی کیفیات کا الگ الگ عمل بتایا گیا ہے۔ اور دل سے فقہ کرنا بتایا

گیا ہے گویا ہر انسان کیلئے اس خاصیّت کا پایا جانا مقرر کیا گیا ہے۔ کہ ہر شخص میں دل کے ذریعہ فقہ کرنے کا مادہ ہے۔

وَلَا تَقُوْلُوْا لِمَنْ یُّقْتَلُ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰہِ اَمْوَاتٌ ؕ بَلْ اَحْیَآءٌ وَّلٰکِنْ لَّا تَشْعُرُوْنَ ○

(پارہ ۲ سورۃ ۲ آیت ۱۵۴) اور مت کہو ان لوگوں کو جو اللہ کی راہ میں قتل ہوئے۔ ''مردہ''۔ بلکہ وہ زندہ ہیں لیکن تمہیں شعور کے ذریعہ مشاہدہ انکی زندگی کا نہیں۔

اس آیت میں شہیدوں کا ذکر ہے۔ جو جہاد میں قتل کئے جاتے ہیں اور مر جاتے ہیں۔ انکے لیے اس عقیدہ کی نفی کی گئی ہے۔ کہ انہیں عام انسانوں کی طرح مردہ نہ کہو۔ بلکہ یہ زندہ ہیں۔

بظاہر عقلی طور انسان کی زندگی اسکے خون (روح حیوانی) سے قائم ہے۔ اور ہر انسان پر جب الموت کا اطلاق ہوتا ہے۔ تو اسوقت اسکے جسم کا خون ہی بننے سے رہ جاتا ہے۔ یا ختم ہو جاتا ہے پھر اسکی جسمانی نشو ونما ختم ہو جاتی ہے۔ انسان کی حرکت و عمل کا نظام ختم ہو جاتا ہے۔ تو اسے مردہ تصور کیا جاتا ہے۔ اسکے مقابل انسان کی زندگی کیلئے اسکی ابتدائی حیات کا مقابلہ کیا جائے۔ تو قرآن الحیات کے تصور کیلئے اس کے وجود کی کیفیت کی ابتدائی ترکیب میں بھی۔ خون اور وجود کی ظاہری ترکیب کا حوالہ دیتا ہے۔ وَجَعَلْنَا مِنَ الْمَآءِ کُلَّ شَیْءٍ حَیٍّ ؕ (پارہ ۱۷ سورۃ ۲۱ آیت ۳۰) اور بنایا ہم نے ہر چیز کو پانی سے زندہ۔ یہاں کُلَّ شَیْءٍ میں انسان بھی شمار ہوتا ہے۔ دوسری ترکیب خَلَقَ سے ہے خَلَقَ الْاِنْسَانَ مِنْ صَلْصَالٍ کَالْفَخَّارِ ۙ○ بنایا انسان کو ٹھیکری کے مانند بجتی مٹی سے۔ اس کے علاوہ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ مِنْ حَمَاٍ مَّسْنُوْنٍ لیسد ار کیچڑ سے ثُمَّ جَعَلَ نَسْلَهٗ مِنْ سُلٰلَةٍ مِّنْ مَّآءٍ مَّهِیْنٍ ۚ پھر اسکی نسل کا سلسلہ حقیر پانی کے ذریعہ شروع کیا۔ یہ سب ترکیبیں زمین کے ابتدائی وجود کی کیفیتیں ہیں۔ پہلے جب یہ آگ کی ہیئت میں تھی اسوقت یہ ٹھیکری کے مانند بجتی مٹی کی طرح تھی۔ اسوقت اس میں مادی وجود کے آثار پائے نہیں جاتے تھے۔ لیکن اس مٹی میں آدم کا وجود موجود تھا۔۔۔ اسکے بعد زمین پر پانی برسا اور تمام زمین سیراب ہو گئی۔ پانی برسنے سے اسکی ناری کیفیت خاکی وجود میں ظاہر ہو گئی۔ اور اس میں روئیدگی کا مادہ ابھر آیا۔ پانی کی سیرابی اور بہتات

اسقدر تھی کہ زمین کا اکثر حصہ زیرِ آب رہا۔ یہ ایک حکمت کا اصول ہے۔ کہ جب تک کسی شے میں پانی کی قوت سے آگ کی قوت قوی ہو۔ تو پانی اپنی ہیئت (بھاپ کی صورت میں) کھو بیٹھتا ہے۔ اور بار بار پانی کے حملہ سے رفتہ رفتہ ناری قوتیں کمزور ہوتی جاتی ہیں۔ یہاں تک کہ پانی کی قوت آگ پر غالب آجاتی ہے۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے۔ کہ پانی کی طرح آگ بھی اپنی قوی ہیئت کھو بیٹھتی ہے۔ اور اسکی ہیئت خاکی بن جاتی ہے۔ اسکے بعد اگر پانی کی رفتار جاری رہے۔ تو پانی خاک کو اپنے میں جذب کرنے لگ جاتا ہے۔ اور اگر پانی کی رفتار بند ہو جائے تو پانی خاک میں جذب ہو جاتا ہے۔ یہی کیفیت ابتدائی زمین کی رہی۔ کہ زمین خود ناری تھی۔ اور پانی بھی اسی زمین سے پیدا ہوا۔ اور اسی پر برسا۔ جب پانی سے زمین کی ہیئت مٹی میں آگئی۔ تو پانی کے ذرّاتِ قوی زمین میں جذب ہو گئے۔ گویا پانی اور مٹی نے مل کر ایک نئے وجود خاکی کو جنم دیا۔۔۔۔ اس میں روئیدگی پیدا ہوئی جو ذرات اس میں سے اُگنے لگے۔ انہیں نبات کہا گیا اسلیئے قرآن ہرا گنے والی کیفیت کو وَ اَنْبَتْنَا نبا تًا سے تشبیہ دیتا ہے اسی طرح ایک مقام پر انسان کیلیئے بھی اسی کیفیت کا ذکر کرتا ہے۔ وَاللّٰـهُ اَنْبَتَكُمْ مِّنَ الْاَرْضِ نَبَاتًا ۔ وَاِلَيْهِ تُحْشَرُوْنَ ۔ اور باقی جانداروں حیوانوں اور انسان کیلیئے خَلَقَ کا لفظ استعمال کرتا ہے۔ اس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ وَجَعَلْنَا مِنَ الْمَآءِ كُلَّ شَىْءٍ حَيٍّ میں حیات سے مراد وہی کیفیت ہے جو زمین کی ابتدا میں پانی سے پہلے صَلْصَالٍ كَالْفَخَّارِ میں موجود تھی۔ یعنی انسانی وجود اسی مٹی سے بنا جو پہلے ٹھیکری کے مانند تھی۔ اور پانی برسنے کے بعد جب زمین پر پانی کا مسلسل طوفان مدتوں رہا تو ناری زمین کے اجزا اس میں تحلیل ہوتے رہے۔ اور انہیں اجزا نے ایک وجودی کیفیت حاصل کی اور انسان کی وجودی تخلیق بھی اسی پانی اور مٹی کے درمیان ہوئی جب پانی تمام خشک ہو کر ایک نشیبی مقام پر جمع ہو کر لیسدار دلدل کی صورت میں آیا اسی جگہ اسی دلدل سے انسان کا وجود ظاہر ہوا۔ وَلَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ مِنْ صَلْصَالٍ مِّنْ حَمَاٍ مَّسْنُوْنٍ ؏ تحقیق انسان کو بنایا بجتی مٹی۔ اور لیس دار گارے سے۔

اس میں شک نہیں کہ قرآن جس حیات کا بیان کرتا ہے۔ اَوَلَمۡ یَرَوۡا کَیۡفَ یُبۡدِئُ اللّٰہُ الۡخَلۡقَ ثُمَّ یُعِیۡدُہٗ ؕ اِنَّ ذٰلِکَ عَلَی اللّٰہِ یَسِیۡرٌ "O قُلۡ سِیۡرُوۡا فِی الۡاَرۡضِ فَانۡظُرُوۡا کَیۡفَ بَدَاَ الۡخَلۡقَ (پارہ ۲۰ سورۃ ۲۹ آیت ۱۹۔ ۲۰) کیا نہیں دیکھتے کہ پیدائش کی ابتدا کیسے کی پھر اسکو بار بار پیدا کرتا ہے یہ کچھ کرنا اللہ کے لیے آسان ہے۔ پھرو زمین میں اور دیکھو اللہ کیسے تخلیق کی ابتدا کرتا ہے یہ ایک بَدَعَ یعنی انسانی وجود کی ابتدا ہے۔ جس میں انسانی وجود میں خون کا دوران شروع ہو کر اسنے اپنی نشوو ارتقا کی طرف رجوع کیا۔ ایک فطری ابتدا کے بعد انسان کی پیدائش کا سلسلہ اسی ابتدائی کیفیت کے بدل میں (اعادہ) سلسلہ تناسل شروع ہوا گویا انسانی بدع اور سلسلہ تناسل میں کوئی فرق نہیں۔ وہ ایک انسان کو ایک ہیئت سے دوسری ہیئت میں لانے کیلئے تھا۔ تا کہ اس سے سلسلہ نسل کشی کا جاری ہو اور اسکی اسی ترکیب کے عین مطابق دوران خون کے ختم ہونے پر اس پر موت طاری ہو جاتی ہے۔ یعنی بَدَعَ وجود میں جو اسکی ترکیب وجودی قائم ہوتی ہے۔ وہ یہاں آ کر ختم ہو جاتی ہے۔ لیکن اس بَدَعَ سے حقیقی بَدَعَ مراد نہیں لی جاسکتی ــــ بلکہ انسانی زندگی کا ایک نیا مرحلہ ہے۔ جہاں سے انسان۔ خون۔ گوشت۔ ہڈی اور پوست کی شکل میں نمودار ہوتا ہے۔ ورنہ اسکی زندگی اس بَدَعَ سے قبل موجود تھی۔ یہاں پر یہ عدم سے موجود نہیں ہوتا۔ بلکہ ''موجود'' ایک نئی ہیئت عقلی میں آ جاتا ہے اسکی ماقبل کی زندگی غیر محسوس ہوتی ہے۔ اسلئے یہ زندگی غیر عقلی (غیر مادی) یعنی شعوری کہلاتی ہے۔ اسکا مطلب یہ ہے۔ کہ انسان کی زندگی کے دو پہلو ہیں۔ ایک شعوری اور ایک غیر شعوری (عقلی)۔ شعوری وہ ہے جو شعور سے محسوس کی جاسکتی ہے۔ عقلی وہ ہے۔ جو حواس سے محسوس کی جاتی ہے۔ اسکی دلیل یہ ہے کہ ہر شے کا وجود اور اسکی زندگی (خون۔ روح حیوانی) اسی زمین کی جز ہے یا پیدائش ہے۔ اگر یہ زندگی زمین کی پیدائش ہے۔ تو لازمی طور زمین میں اپنی علت کے اعتبار سے زندگی کا پایا جانا خود ثابت ہے۔ اگر زمین زندہ ہے۔ اور معلول اس میں پایا جاتا ہے۔ تو انسان کا زمین کی ناری حالت میں معلول کی صورت میں زندگی کا حامل ہونا لازمی ہے اور جب زمین زندہ سمجھی جائے تو اسکی علت میں بھی زندگی کا ہونا لازمی ہے۔ کیونکہ کوئی شے تب تک ایک ہیئت سے دوسری ہیئت میں تبدیل نہیں ہو سکتی جب تک

اس میں زندگی اور حرکت موجود نہ ہو۔

ایسی صورت میں انسانی زندگی کی ابتدا اسی ابتدا سے ہوتی ہے۔ جو زندگی ایک مجسم زندگی کی حامل ہو۔ علت و معلول کا تقاضا یہی ہے۔ کہ ہر معلول کی علت میں قوی زندگی پائی جائے۔ اور جو علت خود مستقل ہو اور کسی کی معلول نہ ہو گویا ہر زندگی اسی علّت سے وابستہ کی جائیگی۔ چونکہ مادہ سے ماسوا ہر علّت غیر عقلی (شعوری) ہے اسلئے یہ تمام زندگیاں جس میں انسانی زندگی بھی شمار کی جاتی ہے۔ شعوری ہوگی۔

اب یہ امر آسانی سے طے ہوسکتا ہے۔ کہ جہاں انسانی وجود میں موت واقع ہوتی ہے وہ دراصل اسکی زندگی کی موت نہیں بلکہ مادی طور صرف جسم (خون) کی موت ہے۔ اور یہ موت اسکی حقیقی زندگی سے تعلق نہیں رکھتی۔ بلکہ انسانی جسم کے فنا ہونے پر پھر غیر عقلی (شعوری) کیفیت میں آجاتی ہے۔ یعنی جسم کے عدم ہونے پر انسان پر وہی ابتدائی شعوری کیفیت طاری ہو جاتی ہے۔ جو وجود سے پہلے تھی۔ دیکھنا یہ ہے۔ کہ انسانی وجود خاکی سے پہلے انسانی زندگی کی کیفیت کیا تھی۔ وہ آسانی سے سمجھ میں آسکتی ہے۔ کہ اسکی زندگی کی وہی کیفیت تھی جو زمین کی ابتدائی (ناری) کیفیت اور زمین سے قبل اسکی علت کی نوری کیفیت تھی۔ اسلئے اسکی زندگی شعوری پہلو میں شمار کی جاتی ہے۔ وَهُوَ الَّذِیْ اَنْشَاَكُمْ مِّنْ نَّفْسٍ وَّاحِدَةٍ فَمُسْتَقَرٌّ وَّمُسْتَوْدَعٌ ؕ قَدْ فَصَّلْنَا الْاٰیٰتِ لِقَوْمٍ یَّفْقَهُوْنَ ○ (پارہ ۷ سورۃ ۶ آیت ۹۸) وہ اللہ وہ ہے جس نے تمہیں ایک نفسِ واحد (نوری زندگی) سے بنایا۔ پھر اسکا مستقر ماں کے رحم میں بنایا۔ پھر اسکا آخری مقام بھی (قبر) مقرر کیا۔ تحقیق ہم نے کھلے الفاظ میں انسانی حقیقت کو بیان کیا۔ لیکن ان کیفیات کو عقل کے ذریعہ نہیں بلکہ قلبی فقہ کے ذریعہ سمجھا جائے۔

سوال یہ پیدا ہوتا ہے۔ کہ یہ کیسے باور کیا جا سکتا ہے۔ کہ جب انسانی جسم میں خون ختم ہونے پر موت طاری ہوتی ہے۔ اور مادی ذرائع سے اسے خون حاصل نہیں ہوتا ہے۔ تو اسکا جسم جذبِ زمین ہوکر زمین کے اجزا میں شامل ہوتا ہے۔ تو باقی کون سی زندگی رہتی ہے جو مرنے کے بعد زندہ رہتی ہے۔ جبکہ اس کی تمام زندگی اسی جگہ پر ختم ہو جاتی ہے؟ ____ اسکے جواب میں ہمارا ابھی یہ

سوال ہے۔ کہ جب ایک ہیئت سے دوسری ہیئت میں تبدیل ہونے کیلئے ایک وجود کی ضرورت لازمی ہے۔تو انسان (آدم) کے وجود خاکی میں آنے کیلئے کونسا ابتدائی وجود تھا جس نے وجود خاکی کی ہیئت تبدیل کرنے میں خون کو پیدا کیا اور اسی خون سے اسکا جسم خاکی بنا؟۔

یہ امر مسلمہ ہے۔ کہ جب تک خون کا وجود نہ تھا۔ نہ ہی اسکا استعمال کیا گیا تھا۔ تو اس کیفیت کے ظاہر ہونے کیلئے ایک ایسے وجود کی ضرورت لازمی پیدا ہوتی ہے۔جس میں (خون وجسم کے وجود سے قبل) خون وو جود نہ پایا جائے۔ یہ وجود جب لازم ہوتا ہے۔تو خون وجسم نہ ہونے کی وجہ سے اسکا غیر مادی یعنی نوری وجود ہونا یقینی ہے۔تو اسکی دلیل خود انسانی وجود سے ملتی ہے۔ کہ جب انسان مادی غذا زیادہ استعمال کرتا ہے۔تو اسکا مادی وجود بڑھتا جاتا ہے۔اور جب مادی غذا حاصل نہیں کرتا تو اسکا وجود لطیف ہو جاتا ہے۔جس پر مادی غذا کا اثر نہیں ہوتا ہے۔ یہی مادی وجود جب لطیف ہو جائے تو شعوری کیفیت حاصل کر سکتا ہے۔ چونکہ اس وجود مادی کی ساخت ابتدائی طور پر مادی ہو چکی ہوتی ہے اور یہ مٹ نہیں سکتی اسلئے بظاہر یہ وجود عدم نہیں ہوسکتا لیکن اسکی خاصیتیں لطیف ہو جاتی ہیں۔ چونکہ موت وحیات ظاہری صرف وجود کی حرکت اور نشو ونما سے محسوس کی جاتی ہے۔اسلئے اسے موت واقع ہونے پر مردہ کہا جاتا ہے۔مگر اسکی بنیادی زندگی کے اعتبار سے دراصل اسکی موت واقع ہو ہی نہیں سکتی۔ اسلئے یہ زندگی ہر حال میں جیسے ابتدا میں تھی اسی حالت میں رہے (اگر لطیف ہو جائے) تو یہ زندگی (نوری) قائم رہتی ہے اسکا مطلب یہ ہے۔ کہ جب زندگی اپنی نوری کیفیت (غیر مادی غیر محسوس) میں ہوتی ہے۔مگر اس پر مادی (جسمانی) ہیئت نہیں ہوتی۔اس حالت میں بھی یہ نوری وجود ''انسان'' سے موسوم (تعبیر) ہوتا ہے ـــــ تب بھی یہ وجود ''انسان'' سے موسوم ہوتا ہے ـــــ گویا یہی نور مادہ میں رہ کر انسان کہلاتا ہے۔اس حال میں کہ اس تبدیلی سے اسکے وجود (اسم) میں تبدیلی ظاہر نہیں ہوتی۔ دونوں حالتوں میں انسان کہلاتا ہے ـــــ اور جسم کی فنا پر ـــــ موت سے مراد۔ ایک نوری کیفیت جسم سے علیحدہ ہو کر انسان پر موت واقع ہو جاتی ہے۔لیکن یاد رہے۔ کہ انسانی موت کے بعد ـــــ انسانی ہیئت میں اسکے عمل (نیک و بد) کے اثر کے نتیجہ میں۔نوری کیفیت (روح) اور

جسم کی ہیئت کا دارومدار عمل پر ہوتا ہے۔ وہ یہ ہے۔ انسانی نیک اعمال۔ تزکیہ۔ مجاہدہ سے انسان کے جسم میں نوری قوت پیدا ہو کر۔ انسانی خون جس سے انسانی وجود کی نشوونما ہوتی ہے ــــ یکسر نوری ہیئت اختیار کر جاتی ہے۔ یعنی انسان اپنے متعین کردہ اعمال نیک میں۔ عبادات۔ رات کی عبادات۔ تزکیہ مجاہدہ میں۔ تصور ومراقبہ میں نوری قوت سے رابطہ کرتا رہتا ہے۔ جسکے نتیجہ میں نوری رابطہ سے۔ جذب کی صورت میں۔ اسکے روحانی ــــ اور جسمانی (مادی) وجود میں نوری قوت جذب ہو کر مادی قوت (خون) میں نوری اثر (قوت) پیدا کر کے۔ مادی وجود بمنزلہ نور ہو جاتا ہے۔ اگر یہ رابطہ مسلسل قائم رہے۔ تو یہ وجود حقیقتاً مادی نشوونما کا محتاج نہیں رہتا۔ نور چونکہ ایک مستقل وجود ہے۔ اسلئے یہ وجود۔ بغیر مادی ذریعہ نشوونما کے دائم ــــ قائم ــــ زندہ رہنے کی خاصیت پاتا ہے۔ ایسی صورت میں اگر وقت معین پر انسانی روح (نوری ہیئت) اس جسم سے جدا ہو جائے۔ تو انسانی زندگی میں۔ بوجہ دوام۔ موت سے فرق نہیں آتا۔ بلکہ اس وجود میں زندگی کے آثار باقی رہتے ہیں ــــ سوائے اسکے کہ فطری تخلیق کے اصول کے مطابق انسان کی حرکت ظاہراً ختم ہو جاتی ہے ــــ ایسی صورت میں اگر اس جسم کی دائمی زندگی کا قائم رہنا مقصود ہو۔ تو جیسے انسانی وجود (زندگی) میں اسکے مادی جسم میں نوری قوت سے اسکی نشوونما جاری ہو۔ تو موت پر انسانی مادی زندگی کی ہیئت علیٰ حالہ میں برقرار رہ کر زندہ حیثیت جاری رہتی ہے۔ اور یہ جسم نوری قوت سے بعد موت اسی طرح قوت حاصل کرتا ہے۔ جس طرح زندگی میں (لطیف حالت میں) حاصل کرتا ہے ــــ یہی کیفیت ایک مجاہد کی ہوتی ہے۔ اسکی جسمانی حیثیت اس حادثہ (قتل) سے۔ انسانی جسم پر طاری ہوتی ہے۔ کہ محض اللہ اور دین الٰہی کے تحفظ کیلئے ایک شخص کا قتل ہو جائے۔ تو قتل کی واردات سے (خواہ آناً فاناً ہو)۔ اسکے مادی جسم کی نشوونما نوری قوت سے ہو کر اسے دائمی زندگی حاصل ہوتی ہے ــــ "بَلْ اَحْيَآءٌ" ــــ وہ جبکہ انسان میں عبادات کے رابطہ ــــ تصور ومراقبہ سے اسکے خون کو نوری قوت سے نشوونما حاصل نہیں ہوئی۔ روح (زندگی) اگر نوری ہو۔ اصولاً روح نوری جنس میں داخل ہو کر برزخ میں داخل کی جاتی ہے۔ جسم مادی اور غیر مستقل ہوتا ہے۔ اسلئے اسے اسکی جنس کو (جسمانی حیثیت میں) زمین کی مٹی میں دفن کیا جاتا ہے

اور شہید جو اللہ کی رضا مندی میں قتل ہوا۔ اسکا جسم نوری حیثیت اختیار کر جائے۔ تو اسے بَلْ اَحْیَآء" کے زمرہ میں شامل کیا جاتا ہے۔ چونکہ یہ بھی مادی جسم ہی کی حیثیت رکھتا ہے۔ کہ اسکی حرکت وعمل ساقط ہو جاتا ہے (ایسی حالت میں بے روح۔ بے جان محسوس کیا جاتا ہے۔) اسلئے ایسے وجود کو بھی زمین میں دفن کیا جاتا ہے۔ ہاں نورانی ہیئت کے اعتبار سے جسمانی ہیئت کا باقی رہنا فطرعی عمل ہے۔ اسلئے قبر میں بھی یہ جسمانی حالت میں نوری حیثیت میں باقی رہنا لازمی ہے۔ جو وَلٰکِنْ لَّا تَشْعُرُوْنَ زندگی ایک غیر محسوس (ادراک میں نہ آنے والی) کیفیت ہے۔ یہ بھی ایک غیر محسوس عمل ہے۔ جو ظاہری حواس (آنکھ) سے دیکھا۔ سمجھا نہیں جا سکتا۔

یہ امر قابلِ ذکر ہے۔ کہ جن لوگوں کی روح حیوانی لطیف ہو کر اپنی ابتدائی کیفیت کو برقرار رکھتی ہے ان لوگوں کے جسم بعد موت ساقط ہو جاتے ہیں۔ کیونکہ انکے جسم پر موت کا نشان۔ اسی حرکت و عمل کے ختم ہونے سے محسوس ہوتا ہے۔ جب انسان پر زندگی میں موت کی کیفیت طاری ہونے سے حرکت وعمل ختم ہو گیا۔ تو باوجود لطیف روح حیوانی ہونے کے بھی موت وارد ہونے کے بعد یہ حرکت و عمل دوبارہ پیدا نہیں کرتے۔ کیونکہ موت کی کیفیت تو حرکت وعمل کو ساقط کرنے سے ہی محسوس ہوتی ہے تو موت طاری ہونے کا مطلب ہی یہ ہے۔ کہ زندگی کا خاتمہ صرف حرکت وعمل کے ختم ہونے سے ہے اور حرکت وعمل خون سے پیدا ہوتی ہے۔ خون ہر ادنیٰ و اعلیٰ میں ایک ہی ہیئت میں دورہ کرتا ہے۔ لیکن ادنیٰ کا ابتدائی جوہر اپنی ہیئت مادہ میں جذب کر ڈالتا ہے۔ اسلئے اسکے جوہر اور خون میں کوئی فرق نہیں رہتا ہے۔ اور اعلیٰ (ایک تزکیہ مجاہدہ کرنے والا) کے جوہر کی کیفیت یہ ہوتی ہے۔ کہ ایک طرف یہ جوہر اپنی اصلی ہیئت میں قائم رہتا ہے دوسری طرف جب انسان اکثر غذا سے مزید خون حاصل کرتا رہتا ہے۔ تو یہ ابتدائی حالت میں خالص جوہر نہیں ہوتا ہے۔ بلکہ رفتہ رفتہ جوہر کی حالت میں آتا ہے۔ اگر درمیانی یا کمتر حالت میں ہو تو اسی قسم کا وجود بنتا ہے۔ اگر انسان تزکیہ کرے تو یہی خون خالص جوہر لطیف میں آجاتا ہے۔ یہ جوہر جب لطیف حالت میں آجائے تو مادہ سے اسکا تعلق نہیں رہتا بلکہ روح رحمانی کی طرح انسان کے وجود سے اسکی نسبت رہتی ہے۔ اسکا مطلب یہ ہے۔ کہ خون خود جوہر بنتا

ہے اسی جوہر سے وجود بنتا ہے یہاں تک کہ یہ جوہر بھی مادی ہیئت میں رہتا ہے۔لیکن تزکیہ سے اس جوہر میں زیادہ لطافت آجاتی ہے تو یہ اس حالت میں انسانی جسم میں بھی لطیف خاصیت پیدا کرتا ہے۔ اس لطیف خاصیت کا اثر یہ ہوتا ہے کہ جسم کی لطافت اسقدر ہو جاتی ہے۔ کہ اگر مزید خون جسم کو میّسر نہ ہوتو یہ بغیر خون کے اپنی لطیف حالت میں قائم رہنے کی صلاحیت رکھتا ہے۔ یہ خاصیت شعوری حالت میں آجاتی ہے۔اس حالت میں بھی دوران خون جاری رہتا ہے۔ یہی خون حرکت وعمل جاری رکھتا ہے باقی جوہر جسم کی ہیئت میں لطافت پیدا کرتا رہتا ہے۔ یہاں پر اس خون کی دو ہیئتیں ہو جاتی ہیں ایک خالص جوہر جو جسم میں لطافت پیدا کر کے اسکی حفاظت کرتا ہے۔اور خود لطیف ہیئت میں غیر مادی ہو جاتا ہے جیسے روح رحمانی۔ دوسری ہیئت وہ خون جو جسم میں دورہ کرتا ہے یہی خون حرکت وعمل جاری رکھتا ہے۔اسلئے قسم دوم خون ختم ہونے پر موت طاری ہوتی ہے۔ باقی جوہر جسم کے ساتھ لطیف نسبت کے ساتھ خود بھی باقی رہتا ہے۔اور لطیف جسم بھی گلنے سڑنے سے محفوظ رہتا ہے۔اسلئے جن لوگوں پر بَلْ اَحْيَاءٌ کا اطلاق ہوتا ہے۔گویا ــــ انکی جسمانی کیفیت ختم ہونے کے بعد انکی بھی حرکت وعمل ختم ہو جاتی ہے۔اب زمین میں یہ جسم کسی طرح بھی حرکت نہیں کرتا۔البتہ انکی لطیف روح حیوانی اس قدر قوی ہے۔ جسے زندہ ہونے سے تعبیر دیا جاتا ہے۔اور زندہ ہونے میں اسکا عمل جسم کو موت سے محفوظ رکھنا یعنی جسم کی نشوونما کرنا ہوتی ہے۔سو یہ کیفیت انسانی جسم میں باقی رہتی ہے۔ کہ جسم میں ایک طرف حرکت وعمل ختم ہوتا ہے۔لیکن دوسری طرف جسم اور زندگی ہمیشہ قوی وسالم رہتے ہیں۔اور زمین میں جذب نہیں ہوتے۔گویا جسم کا موت کے بعد جذب زمین نہ ہونا صرف اسکی زندگی (ابتدائی نوری زندگی) کی سالمیت کی وجہ سے ہوتا ہے۔اس زندگی میں عام انسانوں کے مقابلہ تفوق (برتری) اسکے مراتب کی برتری کو ظاہر کرتے ہیں ورنہ موت کے بعد انسان کا زندہ رہنا انسان کیلئے کچھ سودمند نہیں ہوتا۔یعنی موت کے بعد جسم کا دوبارہ حرکت وعمل میں آنا ضروری نہیں ہوتا ہے۔ کیونکہ انسان کی ابتدائی زندگی (روح حیوانی) کیلئے فطری طور ایک جسم حاصل کرنا۔اور وقت مقررہ تک اس جسمانی حالت میں رہنا۔معین ہوتا ہے۔اور اس کیفیت کا حاصل ہونا اسی غرض سے ہوتا ہے۔کہ انسان اس

معین معیاد میں۔ دنیا میں رہ کر اپنی اصلی کیفیتِ ابتدائی کو برقرار رکھے اور اپنی روح رحمانی کے ذریعہ اپنے منبع حقیقی (علت حقیقی) کا قرب و عرفان حاصل کرے۔ گویا اس ابتدائی زندگی کو جسمانی حالت میں آنے کیلئے یہ ایک شرط ہے۔ کہ وہ اپنی سالمیت کو تمام مقررہ عمر میں برقرار رکھے اور عرفان الٰہی حاصل کرے۔ ورنہ اس کے سوائے اسے جسمانی ہیئت حاصل کرنے میں اور کوئی مقصد نہیں ہوتا ہے۔ نِ الَّذِیْ خَلَقَ الْمَوْتَ وَالْحَیٰوۃَ لِیَبْلُوَکُمْ اَیُّکُمْ اَحْسَنُ عَمَلاً ط (پارہ ۲۹ سورۃ ۶۷ آیت ۲) وہ (اللہ) جس نے پیدا کیا موت اور زندگی کو تاکہ آزمائے کہ تم میں سے کون نیک عمل کرتا ہے۔

گویا انسانی زندگی میں موت اور حیات کو پیدا کیا گیا۔ اور اسلئے پیدا کیا گیا تاکہ دیکھا جائے اس وجودی زندگی میں کون اچھا عمل کر کے اپنے نصب العین عرفان وقرب (اِلَّا لِیَعْبُدُوْنِ) حاصل کرتا ہے اور اپنی سالمیت کو کلی طور برقرار رکھتا ہے۔ پس جس نے دنیا میں اپنی ابتدائی زندگی کی سالمیت کو برقرار رکھا اور عرفانِ الٰہی حاصل کیا اسنے بدرجہ اتم اپنے مقصد (شرط) کی تکمیل کی۔ اور جس نے اپنی سالمیت برقرار نہ رکھی مگر روح رحمانی سے مراتب حاصل کئے اسکی بھی شرط پوری ہوگئی۔ کیونکہ حقیقتاً اس ابتدائی زندگی کو جسم خاکی میں آنے کی اصل غرض و غایت روح رحمانی کے ذریعہ۔ جذب و عرفان حاصل کرنا ہی ہے اندریں اثنا اگر اسنے اپنی سالمیت کو بھی برقرار رکھا تو یہ اسکے لیے مزید وجہ فوقیت ہوگی۔ جسکا اثر یہ ہوگا کہ بعد موت کے بھی جب اسکا دنیا سے عالم برزخ میں انتقال ہوگا۔ تو اسکا تعلق دنیا سے قائم رہیگا۔ ورنہ بعد موت کے اسکا دنیا سے کوئی تعلق نہ رہیگا۔ دنیا سے دوبارہ تعلق قائم رہنے میں کیا مصلحت ہے۔ وہ یہ کہ۔ جسم حاصل کرنے کے بعد۔ یہ لذات دنیوی سے متاثر ہوتی ہے۔ یہاں۔ اسکی اولاد۔ ماں باپ عزیز و اقارب کے تعلقات اور دنیوی دلچسپی پوری ہوتی ہے۔ موت کے بعد ان دلچسپیوں کو اس سے چھینا جاتا ہے۔ اگر اسکی روح حیوانی اپنی سالمیت حاصل کرلے۔ تو یہ (شعوری) عالم ناسوت سے عقلی ہیئت میں بغیر جسمانی وجود کے ان دلچسپیوں سے ہمیشہ حظ اٹھا سکتا ہے۔ البتہ روح رحمانی سے متعلق مقصود حاصل کرنے کیلئے اسکے وجود جسمانی تک ہی شرط ہوتی ہے۔ کہ اسی مدت میں اپنا مقصود حاصل کیا جائے۔ اسلئے بعد موت کے انسان صرف اپنے تاثر

(دنیوی لذّات) کو اپنی روح حیوانی کے ذریعہ پا سکتا ہے لیکن جس غرض کے لیے خصوصی طور جسم میں حرکت و عمل کی ضرورت رہتی ہے۔ وہ غرض ساقط ہونے کی وجہ سے دوبارہ جسم میں روح حیوانی کے ذریعہ حرکت پیدا کرنے کی ضرورت نہیں رہتی۔ اسکی وجہ یہ ہے۔ کہ روح حیوانی مجسم زندگی ہوتی ہے۔ مجسم زندگی کے اعتبار سے جسطرح روح رحمانی اپنی روحانیت کے اعتبار سے قوت ادراک مکمل رکھتی ہے۔ اسی طرح روح حیوانی بھی قوت ادراک و مشاہدہ رکھتی ہے۔ چونکہ جسم میں علم حاصل کرنے کے لیے قوت ادراک موجود ہوتی ہے۔ اور اسی قوت کے ذریعہ علم حاصل کیا جاتا ہے۔ اسلئے علم حاصل کرنے کیلئے جسم کی قوت ادراک کی ضرورت رہتی ہے۔ لیکن اس کمی کو روح حیوانی اپنی لطیف قوت سے پورا کرتی ہے۔ اسلئے موت کے بعد اس وجود کو حرکت دینے کی ضرورت نہیں رہتی اور یہ تمام عمل روح حیوانی خود پورا کرتی ہے۔ یعنی جب اسکا مقام عالم ناسوت میں (یا عالمِ برزخ میں) ہوتا ہے۔ تو یہ روح انسان مجسم کی شعوری ہیئت حاصل کر کے تمام عالم کی سیر کرتی ہے۔ اپنے عزیز و اقربا کو دیکھتی۔ گھر میں آتی۔ بعض امور کا علم حاصل کرتی ہے اور جو بات اس نے بتانی ہو۔ اسکے لیے براہِ راست اپنے اقربا سے شعوری حالت میں مل نہیں سکتی نہ اقربا اسے اپنے تعقل و حواس سے اسکی شعوری حالت کو دیکھ سکتے ہیں۔ کیونکہ اقربا کی شعوری قوت پختہ نہیں ہوتی۔ البتہ خواب کی حالت میں جب حواس و تعقل ساقط ہوتے ہیں۔ یہ روح (مثل روح رحمانی کے) قلب پر توجہ دیکر کیفیت خواب میں شعور کے ذریعہ اپنی تمام کیفیت حالات سے آگاہ کر سکتی ہے۔ اور بعض قوتوں میں یہ بھی خصوصیت ہوتی ہے۔ کہ وہ مجسم انسان کی ہیئت میں ظاہر ہوتی ہیں۔ جس میں وجود (عقلی طور) محسوس ہوتا ہے لیکن یہ وجود وہ وجود نہیں ہوتا جو قبر میں ہوتا ہے۔ بلکہ یہ بھی وجود تمثیلی (شعوری) ہوتا ہے۔ چنانچہ ان واقعات کے متعلق بعض اخبارات کی تصدیق بھی ہوتی ہے۔ اسطرح کے واقعات سننے میں آتے ہیں۔ کہ دیکھا گیا ہے کہ ایک معصوم بچہ جو ابھی چل نہیں سکتا۔ ایسے محسوس ہوتا ہے۔ کہ کسی شخص نے اسکا ہاتھ پکڑا ہے اور وہ اسی ہاتھ کے سہارے چل رہا ہے۔ اور بچہ خود بھی کسی وجود کو محسوس کر رہا ہے۔ یہ امر واقع ہے۔ کہ بچے کی شعوری کیفیت سالم ہوتی ہے۔ اور وہ شعوری کیفیت کو محسوس کر لیتا ہے اسکا مطلب یہ ہے۔ کہ

اسکا کوئی قریبی عزیز مرنے کے بعد اسی شعوری کیفیت میں اپنے گھر پہنچتا ہے اور بچہ کے ساتھ کھیلتا ہے۔ یا اسے بہلاتا ہے۔ دوسری خبر سننے میں آئی ہے۔ کہ ایک ڈاکٹر کی بیوی فوت ہوگئی۔ ڈاکٹر کو اس سے کافی محبت تھی۔ عورت بیحد عابد و زاہد تھی۔ ڈاکٹر بیوی کے مرنے کے بعد اکثر اوقات مغموم رہتا۔ اسی اثنا میں ایک رات اسنے کسی شخص کو کمرے میں داخل ہوتے محسوس کیا۔ کمرے میں روشنی کرنے کے بعد اس نے دیکھا کہ اسکی عورت سامنے بیٹھی ہے۔ ڈاکٹر اس کیفیت سے گھبرا گیا کہ شاید یہ کوئی غیر انسانی وجود ہے۔ مگر عورت نے آواز دی اور کہا کہ میں تمہاری بیوی [1] ہوں گھبرانے کی ضرورت نہیں اطمینان سے بیٹھیں میں خود تمہاری حالت دیکھ کر تمہارے پاس آئی ہوں۔ میں ہر رات تمہارے پاس آؤں گی مگر شرط یہ ہے۔ کہ مجھے ہاتھ نہ لگانا اور عام انسانی وجود کی طرح مجھ سے سلوک نہ کرنا۔ اسی طرح کافی مدت ڈاکٹر کی بیوی رات کو آتی اور علی الصبح چلی جاتی۔ آخر اس تبدیلئے کیفیت سے ڈاکٹر کی صحت پر اثر پڑا۔ اس نے کسی شخص سے ذکر کیا۔ یہ صاحب مولوی صاحب یا درویش تھے۔ انہوں نے چند آیتیں پڑھنے کو بتائیں اسی رات اسکی بیوی نہایت مغموم حالت میں آئی۔ اور کہا میں تو صرف محبت کی بنا پر تم سے ملنے آتی تھی۔ مگر اس میں اب تمہارے لیے تکلیف کے اسباب پیدا ہو رہے ہیں آپ نے مولوی صاحب سے ذکر کیا۔ اسلئے یہ میری آخری ملاقات ہے۔ اب میں کبھی آپکے پاس نہ آ سکوں گی۔ اسکے بعد اپنے وقت پر چلی گئی اور دوبارہ نہ آئی۔

یہ واقعات ان کیفیات سے ملتے ہیں کہ انسان کی روح لطیف بعد موت کے اپنی جسمانی حالت جیسا معمول جاری رکھ سکتی ہے۔ مگر اس میں نہ وجود جسمانی ساتھ رہتا ہے۔ نہ اسکی ضرورت رہتی ہے۔ جو کیفیت اس حالت میں پیدا ہوتی ہے وہ مادہ سے خالی ہوتی ہے اور مادہ سے خالی ہونے کی وجہ سے شعوری کہلاتی ہے۔ گویا انسانی ابتدائی زندگی اپنی ابتدا میں نوری ہوتی ہے جسمانی حالت میں مادی ہو جاتی ہے اگر شریعت و طریقت کے عمل سے اپنی سالمیت (قوتِ نوری) کو برقرار رکھا تو

---

[1] اسکی تصدیق کیلئے ملاحظہ ہو حدیث صفحہ ۳۹۸

اسکی زندگی دائم و قائم ہو جاتی ہے۔ اور اسکی دنیوی زندگی میں صرف چند ساعت کیلئے درمیانی دور میں ایک قالب میں آنا ہوتا ہے۔ اور وقت مقررہ پر موت طاری ہونے کے بعد قالب فنا ہو جاتا ہے۔ مگر ابتدائی کیفیت بدستور برابر جاری رہتی ہے۔ اگر شریعت و طریقت پر عامل نہ رہا تو اسکی ابتدائی زندگی بھی ختم ہو جاتی ہے۔ گویا روح لطیف کی سالمیت برقرار رہنے میں انسانی مدارج میں ترقی ہوتی ہے اور اسے عظمت و برتری حاصل ہوتی ہے۔ چنانچہ قرآن اسکی خود شہادت دیتا ہے۔ کہ اِنَّ مَثَلَ عِیْسٰی عِنْدَ اللّٰهِ كَمَثَلِ اٰدَمَ ؕ خَلَقَهٗ مِنْ تُرَابٍ ثُمَّ قَالَ لَهٗ كُنْ فَيَكُوْنُ ○ تحقیق جسطرح عیسٰی کو ایک نوری کیفیت سے بنایا۔ یعنی یہی نوری ذرہ رحم مادر میں خون کی طرف متوجہ ہوا اسی خون کو اپنے میں جذب کر کے خونی وجود میں ظاہر ہوا۔ اسی طرح آدم کی مثال ہے کہ وہ مادہ کے عدم میں ایک نوری وجود (ذرہ) تھا جسے میں نے خصوصی طور خون جذب کرنے کا حکم دیا سو اس نوری[1] ذرہ نے خون[2] جذب کرنا شروع کیا اور رفتہ رفتہ ایک انسانی شکل میں نشو و نما کی طرف آیا۔ یہاں تک کہ یہ ذرّہ انسان کی ہیئت اختیار کر گیا۔ باقی مخلوق چونکہ زمینی اور آبی ذراتِ مادی سے بنیں اسلیئے انکی شکلیں انسانی نہ بن سکیں بلکہ اپنی ہیئت کے اعتبار سے۔ نباتات۔ جمادات۔ حیوانات (کیڑے مکوڑوں) کی شکل میں ظاہر ہوگئیں۔ اور انسان چونکہ قوی ذرہ نوری[1] تھا۔ اس نے وہ مادیت حاصل کی جس مادیت سے باقی مخلوق کی زندگی تھی۔ اسلیئے انسان بجائے خود ایک ذرۂ نوری سے ایک ہی انسان بنا۔ اور مدتوں نشو و ارتقا کی منزلیں طے کر کے آخر آدم[3] کی شکل میں ظاہر ہوا۔ اور جسطرح آدم مادیت سے پہلے ایک

---

[1] ناری ذرہ [2] خون سے مراد۔ زمینی ذراتِ مادی جو تحلیل ہونے کے بعد خون کی ہیئت اختیار کرتے ہیں۔

[3] یہی وجہ ہے۔ کہ محققین کو ابتداء کائنات سے طویل مدت تک انسان کے وجود کا نشان نہ مل سکا اور باقی حیوانات کا وجود ابتدا سے ملتا رہا۔ جس وجہ سے انہیں دھوکہ ہوا۔ کہ انسان حیوان سے بنا ہے۔ اور جس دور میں انہیں انسان کا نشان ملتا ہے۔ وہ دور حیوان کی ترقی کا دور سمجھا جاتا ہے۔ حالانکہ یہ وہ دور ہے۔ جب انسان مستقل ہیئت اختیار کر کے نسل کشی کی حد میں آچکا تھا۔ اور اس سے قبل ایک ہی انسان تھا جو اپنی ابتدائی منزلوں میں صرف ایک انسان کی حیثیت سے ترقی کرتے ہوئے اپنی تمام قوتوں کے ساتھ آدم کی شکل میں آرہا تھا۔

شعوری زندگی حاصل کیئے ہوئے تھا۔اسی طرح انسان کی موت کے بعد یہ کیفیت باقی رہ سکتی ہے۔ البتہ ہرانسان کی یہ کیفیت باقی نہیں رہ سکتی صرف اس شخص کی جو جہاد میں قتل کیا گیا ہو۔گویا جہاد میں قتل ہونے کے ساتھ کچھ فطری روحانی نظام واثر کے تحت اور کچھ قتل (خصوصاً جہاد کے جذبہ کے تحت) کے اثر کے تحت انسان میں یہ روحانی زندگی اپنی ہیئت کو دوبارہ مادیت سے نورانیت میں خالص کرلیتی ہے۔اور یہ زندگی مجسم زندگی اور شعوری ہو جاتی ہے۔اور اسکے علاوہ ان انسانوں کی ہوتی ہے۔جو خصوصی طور شریعت وطریقت پر عامل رہ کر تزکیہ ومجاہدہ کرتے ہیں ان میں انکی زندگی ہی میں یہ قوت نورانی دوبارہ نورانی کیفیت پالیتی ہے۔جس سے یہ لوگ اسی جسمانی زندگی میں مجسم زندگی پالیتے ہیں۔اوراپنی جسمانی موت پراپنے ارادے کے ساتھ جب چاہیں جسمانی موت واقع کریں۔نہ چاہیں تو جسمانی موت واقع نہیں ہوسکتی ہے۔اسی اعتبار سے قرآن نے شہید کی جسمانی موت کو حقیقی موت قرارنہیں دیا۔بلکہ اسے زندہ قراردیا۔اسکے ساتھ ہی وَلٰكِنۡ لَّا تَشۡعُرُوۡنَ کا حوالہ دیکر یہ ظاہر کردیا کہ اس زندگی کو عقلی موت سے کچھ وابستگی نہیں کہ خون ختم ہوااور مرگیا نہیں بلکہ یہ زندگی شعوری ہے۔اسلئے جب تک اسے شعور سے مشاہدہ نہ کیا جائے یہ محسوس نہیں کی جاسکتی یہ بھی متشابہات میں شمار ہوتی ہے۔

اب دیکھنا یہ ہے۔کہ انسانی وجوداورزندگی میں جو کیفیتیں عقلی اورشعوری پائی جاتی ہیں۔ ایک شاہدان کیفیتوں کو کس حالت میں مشاہدہ کرتا ہے؟۔اگر ایک شخص ایک انسانی وجود کو اسکے جسم کے ساتھ دیکھے تو وہ حواس کے ذریعہ دیکھتا ہے۔اسے عقلی وجود کہا جاتا ہے۔(محققین نے اس وجود کا نام''وجود حسی'' رکھا ہے)اور جب جسم ختم ہو جائے۔مگر زندگی باقی رہے۔اورموت کے بعد۔یا زندگی میں انسانی جسم کی عدم موجودگی میں۔انسان ایک وجود کو دیکھتا ہے۔تو وہ کیسا وجود ہے؟اورانسان کیا مانند وجود حسی کے اس جسم کو پاتا ہے؟اورحواس سے دیکھتا ہے؟یاشعوری حالت میں وجود شعوری ہوتا ہے؟اوراسے حواس سے نہیں بلکہ شعور سے مشاہدہ کرتا ہے؟

اس بارے میں گزشتہ بیان ہو چکا ہے۔اورقرآنی آیات کی روشنی میں واضح ہو چکا ہے۔ کہ ہر مادی شے کوحواس اور تعقل سے مشاہدہ کیا جاتا ہے۔اور مادہ سے خالی کیفیات کا مادی وجود نہیں

ہوتا ہے اسلئے اسے شعور سے مشاہدہ کیا جاتا ہے۔اس شعوری وجود کو تمثیلی کہا جاتا ہے۔یعنی انسان کے مرکب (وجود) میں دو قسمیں ہیں۔ایک مادی (حسی) جو حواس میں آئے۔اور ایک لطیف نورانی یا روحانی (شعوری یا تمثیلی) جو حواس سے نہ دیکھا جائے۔ بلکہ شعور و قلب سے دیکھا جائے۔انسان کا مادی وجود اسی وقت تک مادی کہلاتا ہے۔جب تک وہ ایک شاہد کیلئے مادی احاطہ میں رہے۔جس وجود کو ایک شاہد حواس و عقل سے محسوس کرتا ہے۔اور جب مادی وجود حواس کی حدود سے باہر ہوا ___ تو پھر ایک شاہد کیلئے اس حالت میں اسی وجود کا محسوس کرنا نہ وجود حسی کہلاتا ہے۔نہ مشاہدہ عقلی کہلاتا ہے اور جب انسان کا وجود موت کے بعد غائب ہو جائے۔تو پھر اسکی حسی قسم بالکل غائب ہو جاتی ہے۔ پھر اس وجود کا حاضر حالت میں عقلی وجود ثابت کرنا قطعاً ناممکن ہے۔

وجود تمثیلی کی بھی تین قسمیں ہیں۔(۱) تخیلی (۲) لطیف جسمانی (۳) رحمانی۔

(۱) تخیلی: جو حافظہ میں جمع ہوتی ہے۔اسکا وجود مادی نہیں ہوتا۔ بلکہ حافظہ میں اصل وجود کی ہیئت لطیف حالت میں قائم ہو کر جمع ہو جاتی ہے۔اس وجود کا مشاہدہ حواس سے نہیں ہوتا۔ بلکہ حافظہ سے شعور حاصل کرتا ہے۔اسلئے اسکا مشاہدہ شعوری کہلاتا ہے۔اور یہ مشاہدہ ہر شخص کو حاصل ہو سکتا ہے۔

(۲) لطیف جسمانی: یہ وجود وہی ابتدائی وجود ہوتا ہے۔جو اپنی ابتدا میں خون بننے سے پہلے نوری حالت میں ہوتا ہے۔اور موت کے بعد بھی اپنی ابتدائی کیفیت میں قائم رہتا ہے۔یہ وجود موت کے بعد ہر انسان کا نہیں بلکہ ایک ولی اور شہید کا ہوتا ہے۔جو تزکیہ و مجاہدہ سے ہی اس ابتدائی زندگی کو برقرار رکھتا ہے یہ وجود کہاں ہوتا ہے؟___ یہ وجود عالم ناسوت میں ہوتا ہے۔گویا اسکا وجود انسان کی موت کے بعد دنیا میں محسوس کیا جا سکتا ہے۔لیکن چونکہ یہ شعوری ہوتا ہے (اور اسکا وجودِ مادی قبر میں ہوتا ہے) اسلئے یہ وجود شعور سے محسوس کیا جاتا ہے۔اور ہر شخص اسے محسوس نہیں کر سکتا۔صرف وہ لوگ مشاہدہ کر سکتے ہیں جنکی قوتِ مشاہدہ (قلب و شعور کے ذریعہ) قوی ہو۔اسی لیے قرآن نے ایسی کیفیت عام نہ ہونے کے باعث وَلٰكِنْ لَّا تَشْعُرُوْنَ سے عام مشاہدۂ شعوری میں نہ آنے والی بتائی

ہے۔البتہ بعض حالتوں میں ایک شخص اس روحِ لطیف کو کھلی آنکھوں سے اسطرح مشاہدہ کرتا ہے۔کہ معلوم ہوتا ہے۔کہ وہ شخص (مردہ قبر میں دفنایا ہوا) بعینہٖ آنکھوں سے دیکھا جا رہا ہے۔دراصل یہ دونوں باتیں اس مشاہدہ میں نہیں۔کیوں؟ـــــ اسلیئے کہ انسان کا ایک ہی مادی وجود ہوتا ہے۔جو قبر میں دفنایا جاتا ہے۔اسکے بعد اسکا کوئی ایسا وجود پایا نہیں جاتا جو دو کی حالت میں دو مادی وجود رکھتا ہو ایک قبر میں ہو اور ایک دنیا میں حواس کے ذریعہ محسوس کیا جائے۔اور یہ بھی نہیں ہوسکتا۔کہ وہی وجود جو قبر میں دفن ہوا اُٹھ کر دنیا میں چلتا۔پھرتا۔کھاتا۔پیتا نظر آئے۔کیونکہ موت طاری ہونے کے بعد اس میں دوبارہ حرکت وعمل کی قوت باقی نہیں رہتی۔اسلیئے ایسا وجود جو موت کے بعد نظر آئے تمثیلی یا روحانی (ابتدائی زندگی کا حامل) اور شعوری ہوتا ہے۔اور دیکھنے والا دراصل قلب وشعور سے دیکھتا ہے ـــــ جاگتی حالت میں اسکی آنکھیں کھلی ہوتی ہیں۔اور اس حالت میں جب وہ روحانی وجود کی طرف متوجہ ہوتا ہے (جو دنیا میں پھرتا ہوتا ہے) تو اسے محسوس ہوتا ہے کہ آنکھوں سے دیکھا جا رہا ہے۔گویا یہ دیکھنا آنکھوں سے نہیں بلکہ دل سے ہوتا ہے۔البتہ ایک مشاہدہ کرنے والے کی قوت مشاہدہ (قلب وروح) اسقدر قوی ہوتی ہے۔کہ اسے مشاہدہ کیلیئے آنکھیں بند کرنے کی ضرورت نہیں رہتی۔کیونکہ قلبی مشاہدہ کیلیئے ضروری ہوتا ہے۔کہ حافظہ وشعور کو حواس (آنکھ) کے واقعات نہ پہنچیں تاکہ قلب کی کیفیت کا مشاہدہ صاف ہو۔یہی وجہ ہے۔کہ ایک مشاہدہ کرنے والا جب کسی روح کو شعوری حالت میں دیکھتا ہے۔تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ اسی مادی جسم کی مانند ہے۔اور اسے آنکھوں سے دیکھا جا رہا ہے۔دراصل ایک شاہد ایسا محسوس نہیں کرتا وہ مشاہدہ کے علم اور اسکی کیفیت سے اچھی طرح واقف ہوتا ہے۔البتہ اس واقعہ کی کیفیت بدلنے میں دوسرے شخص کا دخل ہوتا ہے۔جو خود اس واقعہ کو نہیں دیکھتا۔بلکہ خود سمجھتا ہے کہ ایک شخص کھلی آنکھوں سے دیکھ رہا تھا اسلیئے اسنے آنکھوں سے دیکھا۔اور آنکھوں سے دیکھنے کا وہم خود ایک وجود کے مادی ہونے کا وہمی تخیل پیدا کرتا ہے دوسری بات یہ ہے۔کہ اگر یہ کیفیت مادی ہوتی۔تو اسکا مشاہدہ ہر شخص کو حاصل ہوتا۔لیکن ان کیفیات کا مشاہدہ صاحب قوت ہی کرتے ہیں۔اور وہ اپنی قلبی اور شعوری قوت سے مشاہدہ کرتے ہیں۔

دوسری قسم لطیف ہیئت کے وجودوں سے متعلق قرآن کی آیات بھی ہیں۔ جن سے پتہ چلتا ہے۔ کہ ایسے وجود مادی نہیں بلکہ لطیف (شعوری) ہیں چنانچہ قصہٗ حضرت سلیمانؑ میں قرآن کا بیان ہے فَلَمَّا قَضَيْنَا عَلَيْهِ الْمَوْتَ مَادَلَّهُمْ عَلٰى مَوْتِهٖٓ اِلَّا دَآبَّةُ الْاَرْضِ تَاْكُلُ مِنْسَاَتَهٗ ج (پارہ ۲۲ سورۃ ۳۴ آیت ۱۴) پس جب ہم نے مقرر کیا اس (حضرت سلیمانؑ) پر موت کو۔ نہیں ظاہر کیا (انکی موت کو) اوپر (جنوں) اُنکے۔ مگر زمین کے کیڑے کھا گئے عصا اسکا یعنی حضرت سلیمانؑ پر اس حالت میں موت آئی کہ وہ ایک عصا کے سہارے کھڑے تھے۔ اور جنوں سے کام کرانے کی نگرانی کر رہے تھے۔ اسی حالت میں کافی عرصہ عصا کے سہارے کھڑے رہے۔ اسی اثنا میں عصا کو کیڑے کھانے لگے جب کھاتے کھاتے لکڑی کا سرا بودا ہو گیا۔ تو حضرت سلیمانؑ گر پڑے فَلَمَّا خَرَّ تَبَيَّنَتِ الْجِنُّ اَنْ لَّوْ كَانُوْا يَعْلَمُوْنَ الْغَيْبَ مَا لَبِثُوْا فِى الْعَذَابِ الْمُهِيْنِ ۞ پس جب (حضرت سلیمانؑ) گر پڑے۔ تو جانا جنوں نے کہ حضرت سلیمانؑ وفات پا چکے ہیں تو افسوس کیا کہ ہم اگر اس موت سے آگاہ ہوتے تو اتنی مدت اس عذاب میں نہ رہتے۔

اس آیت میں حضرت سلیمانؑ کی موت۔ کے بعد اپنی وجودی حالت میں سالم رہنا۔ غیر عقلی حالت (شعوری) میں ہے۔ کہ وجود زیادہ دیر رہ نہیں سکتا۔ اگر اسکی سالمیت برقرار ہے۔ تو وہ شعوری ہے۔ یعنی جسم کی روحِ لطیف ابھی وجود میں باقی ہے۔ جس نے وجود کو برقرار رکھا۔ البتہ خون نہ ہونے کے باعث وجود کی مزید ارتقا ختم ہو گئی۔ اور حرکت و عمل ختم ہو گیا۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ وجود کی سالمیت کا کوئی نفع انسان کو نہیں۔ صرف جسم سڑنے گلنے سے محفوظ رہتا ہے جسکی انسان کو ضرورت نہیں (البتہ یہ انسان کی برتری اور علو مراتب کا نشان ہے) دوسرے انسان موت کے بعد مادی کیفیت چھوڑ دیتا ہے۔ اسکی سالمیت غیر عقلی یعنی شعوری ہو جاتی ہے۔ جو دوسروں کے لیے غیب کا (ماوراء حواس) درجہ رکھتی ہے۔

دوسرا قصہ قرآن میں حضرت عزیرؑ کا ہے۔

اَوۡ كَالَّذِیۡ مَرَّ عَلٰی قَرۡیَةٍ وَّهِیَ خَاوِیَةٌ عَلٰی عُرُوۡشِهَا ج قَالَ اَنّٰی یُحۡیٖ هٰذِهِ اللّٰهُ بَعۡدَ مَوۡتِهَا ج فَاَمَاتَهُ اللّٰهُ مِائَةَ عَامٍ ثُمَّ بَعَثَهٗ ط (پارہ ۳ سورۃ ۲ آیت ۲۵۹) آپ نے اس شخص کے واقعہ پر غور نہیں کیا؟ جو ایک گاؤں کے پاس سے گزرا۔ جسکی دیواریں چھتوں پر گری ہوئی تھیں۔ اس گاؤں کی تباہی وہلاکت دیکھ کر کہنے لگا۔ اس گاؤں کی ہلاکت (موت) کے بعد اسے کیسے دوبارہ آباد کریگا (زندہ کریگا) یا اس آبادی کو نسیاً منسیا کرنے کے بعد کیسے دوبارہ زندہ کریگا۔ تو اللہ نے اسے ایک سو سال تک مردہ رکھا۔ اور (سو سال کے بعد) پھر زندہ کیا۔

اس واقعہ میں ایک شخص کو اَمَاتَہٗ بتایا۔ یعنی موت طاری کر دی اور سو سال تک! اس سے معلوم ہوتا ہے۔ کہ موت طاری ہونے سے مراد صرف انسانی ارادہ۔ اور حرکت وعمل ساقط ہو جاتا ہے۔ مگر سو سال کی تعداد کیوں ظاہر کی گئی۔ کہ سو سال میں انسان کا جسم گل سڑ جاتا ہے۔ مگر موت کی حالت میں اس شخص کا وجود محفوظ رہا۔ پھر موت کے بعد انسان اپنے ارادہ کو استعمال نہیں کر سکتا۔ مگر دوبارہ زندہ ہونا قدرت کاملہ کے ارادہ سے ہوا۔ اس واقعہ میں پہلی خصوصیت قدرت کاملہ کا اظہار ہے۔ کہ اللہ جس وقت جو چاہے کر سکتا ہے۔ وہ ہر واقعہ پیدا کرنے پر قادر ہے۔ ایک انسان کو اپنے ارادہ سے بغیر تعین عمر کے مار سکتا ہے۔ ایک آدمی کو بغیر تعین عمر ہزار سال اسکی حرکت وعمل کے ساتھ زندہ رکھ سکتا ہے۔ ایک بستی کو ہلاک کر کے پھر اُسی کو دوبارہ زندہ کر کے قائم کر سکتا ہے۔ دوسری چیز یہ ہے۔ کہ فطری طور بھی انسان کا وجود اسکی روح لطیف کے ذریعہ قائم رہ سکتا ہے۔ اسکے وجود کے محفوظ ہونے میں روح لطیف (ابتدائی زندگی) برسرِ عمل رہتی ہے۔ اور یہ زندگی شعوری ہوتی ہے۔ اس کا احساس شعور ہی سے ہوتا ہے یہاں حضرت عزیرؑ کا موت کے بعد سو سال زندہ رہنا خلافِ فطرۃ نہیں ۔ اور حضرت عزیرؑ کا سو سال بعد دوبارہ زندہ ہونا بھی خلاف فطرۃ نہیں۔ دوبارہ زندہ ہونا اگر چہ قدرتِ کاملہ سے ہے لیکن یہ کیفیت بھی خلافِ فطرۃ اور اسباب ۔ سے باہر نہیں۔ چونکہ حضرت عزیرؑ میں روح حیوانی لطیف حالت میں موجود تھی۔ تو اللہ تعالیٰ نے ابتدا میں بھی حکم کُن سے دوران خون کو روکا

(جیسے ایک شخص کی حرکت قلب بند ہونے سے موت واقع ہوتی ہے) اور سو سال بعد روح حیوانی سے حکم کن سے دوبارہ جسم میں حرکت پیدا کردی۔ یہ واقعہ اسباب کے اندر فطری ہے۔

اسکے ساتھ ہی واقعہ حضرت عیسیٰؑ میں بھی ایک کیفیت پائی جاتی ہے۔ کہ فَنَفَخْنَا فِيهِ مِنْ رُّوحِنَا۔ پھونک دی ہم نے اس میں اپنی روح اِنَّمَا الْمَسِيحُ عِيسَى ابْنُ مَرْيَمَ رَسُولُ اللّٰهِ وَكَلِمَتُهُ ج أَلْقَاهَا إِلَىٰ مَرْيَمَ وَرُوحٌ مِّنْهُ ز (پارہ ۶ سورۃ ۴ آیت ۱۷۱) تحقیق حضرت مسیح عیسیٰ ابن مریم رسول اللہ اور کلمہ ہے۔ اللہ کی روح (نور) سے ہے۔ جو القا کیا گیا (بھیجا گیا روحانی طور) طرف مریم کے۔

اس آیت میں حضرت عیسیٰؑ کی ابتدائی زندگی کا پتا چلتا ہے۔ کہ یہ زندگی ایک روح (نور) تھی اسی زندگی نے رحم مادر میں خون سے نشو ونما کی کیفیت جسمانی حاصل کی۔ حضرت عیسیٰؑ کی پیدائش میں دو کیفیتوں کا علم ہوتا ہے ایک یہ کہ انسان بغیر سلسلہ تناسل کے پیدا نہیں ہوسکتا۔ دوسرے اگر پیدا ہوتو اسکی ابتدا اسی نوری زندگی سے ہوتی ہے۔ جو اپنی ابتدا میں شعوری حالت میں۔ مجسم زندگی کی ہیئت میں ہوتی ہے۔ یہ کیفیت (طریق پیدائش) ایک حضرت آدمؑ کیلئے مخصوص تھی۔ اسکے بعد سلسلہ تناسل شروع ہوا۔ اسکے بعد حضرت عیسیٰؑ کا سلسلہ تناسل کے طریق کے بغیر ایک نور کے ذریعہ پیدا ہونا۔ گویا دوسرا طریق حضرت عیسیٰؑ کیلئے مخصوص تھا۔ وہاں نہ باپ تھا نہ ماں تھی۔ مگر ایک ابتدائی زندگی تھی۔ یعنی ایک نوری ذرّہ تھا۔ اُدھر زمین تھی جس میں اس نوری ذرہ نے جسمانی ہیئت حاصل کی۔ اور حضرت عیسیٰؑ کے واقعہ میں وہی ذرہ نوری تھا۔ مگر زمین کی جگہ رحمِ مادر تھا۔ جس میں اس نوری ذرہ نے جسمانی ہیئت حاصل کی۔

اسکے بعد حضرت عیسیٰؑ کا درمیانی واقعہ بھی قابل غور ہے جب حضرت عیسیٰؑ پیدا ہوئے۔ تو لوگوں نے حضرت مریمؑ سے کہا يَا أُخْتَ هَارُونَ مَا كَانَ أَبُوكِ امْرَأَ سَوْءٍ وَمَا كَانَتْ أُمُّكِ بَغِيًّا ۝ صلے اے ہارون کی بہن تمہارے باپ کوئی بُرے آدمی نہ تھے اور نہ تمہاری والدہ غیر شریف تھی۔ یہ لڑکا تم سے کیسے ہوا۔ حضرت مریمؑ نے حکم الٰہی سے کہا کہ اس بچہ سے پوچھو قَالُوا كَيْفَ نُكَلِّمُ مَنْ كَانَ فِي

الْمَهْدِ صَبِيًّا ○ انہوں نے کہا کہ گود کا بچہ کیسے کلام کرسکتا ہے ـــــ لوگوں نے اس غیر عقلی بات کو تسلیم نہیں کیا۔ کہ ایک بچہ کس طرح گود میں باتیں کرسکتا ہے۔ اسکو تسلیم نہ کرنے کا سبب صرف واقعات کا شعوری ہونا تھا ـــــ مگر اسکی تصدیق ہوگئی۔ اِنِّیْ عَبْدُ اللّٰهِ قف اٰتٰنِیَ الْکِتٰبَ وَجَعَلَنِیْ نَبِیًّا ○ لا حضرت عیسیٰؑ کا حواس و حافظہ کے مکمل نہ ہونے کے باوجود بولنا ـــــ اس امر کی دلیل ہے۔ کہ انسان کی ابتدائی زندگی اگر علیٰ حالہ اپنی اصلی حالت میں برقرار رہے۔ اس پر مادیت کا غلبہ نہ ہو۔ تو جسم حاصل کرنے کے بعد بھی یہ اپنی قوتِ نورانی کے اعتبار سے بغیر حواس و تعقل و حافظہ۔ سن سکتی ہے۔ بول سکتی ہے۔ علم حاصل کرسکتی ہے۔ ادراک کرسکتی ہے۔ اور ہر اس فعل پر قادر ہے۔ جو جسم انسانی سے ہر عضو کے مکمل ہونے پر صادر ہوتا ہے۔ لیکن یہ تمام کیفیتیں غیر عقلی (شعوری) حالت میں پائی جاتی ہیں۔ البتہ حضرت عیسیٰؑ کا شعوری کیفیتِ کـلام کو عقلی حالت میں لانا اسلئے تھا۔ کہ اسوقت وہ جسمانی حالت میں آچکے تھے۔ اور جب جسمانی حالت ختم ہو جائے تو ہر کیفیت غیر جسمانی ہو جاتی ہے۔ جسے دوسری جگہ قرآن بتاتا ہے۔ وَمَا قَتَلُوْهُ وَمَا صَلَبُوْهُ وَلٰكِنْ شُبِّهَ لَهُمْ ط۔ بَلْ رَّفَعَهُ اللّٰهُ اِلَيْهِ ط (پارہ ٦ سورۃ ۴ آیت ۱۵۷۔ ۱۵۸) یعنی حضرت عیسیٰؑ پر ابھی موت طاری نہیں کی گئی۔ بلکہ انکا جسم آسمان پر اٹھایا گیا۔ یہ حقیقت ہے۔ کہ جسم کا مادی حالت میں آسمانی کیفیتوں میں داخل ہونا۔ مبالغہ اور ناممکن ہے۔ لیکن حضرت عیسیٰؑ کا جسم کے ساتھ جانا اس امر کی دلیل ہے۔ کہ ایک روحانی (نوری) زندگی جب جسمانی حالت میں آکر اپنی سالمیت برقرار رکھے تو اسکی جسمانی کیفیت اپنے وجود کے اعتبار سے وہی رہتی ہے۔ جو ابتدا میں شعوری تھی گویا یہ نوری زندگی بدستور جاری رہتی ہے۔ صرف عام لوگوں میں جسمانی مادی کیفیت میں جذب ہو کر موت پر فنا ہو جاتی ہے اور مخصوص ہستیوں میں جن میں انبیا۔ شہید۔ صالح۔ صدیق (اولیاء کامل) شمار ہیں ان میں اپنی اصلی حالت میں برابر قائم و دائم رہتی ہے۔ صرف درمیانی دور میں (انسانی عمل کے مطابق) قوی یا کمزور ہو جاتی ہے۔ یہی وجہ ہے۔ کہ اس زندگی کی خصوصیت صرف انبیا۔ اولیا اور شہدا سے تعلق رکھتی ہے۔ باقی انسانوں سے نہیں۔

قرآنی آیت کے علاوہ حدیث رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم میں بھی حدیثیں پائی جاتی ہیں

جن میں اس روح لطیف کے متعلق واقعات بیان کیئے گئے ہیں۔ان میں ایک معراج کی حدیث ہے۔حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے فرمایا۔قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ قَدْ اَتَیْتُ مُوْسٰی لَیْلَۃَ اَسْرٰی بِہٖ عِنْدَ الْکَثِیْبِ الْاَ حْمَرِ وَھُوَ یُصَلِّیْ فِیْ قَبْرِہٖ ۔حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے فرمایا کہ ہم شب معراج (اسریٰ) حضرت موسیٰ علیہ السلام کے پاس سے (بیت المقدس میں) گزرے۔ آپ اپنی قبر میں لال ٹیلے کے قریب نماز ادا کر رہے تھے۔دوسری حدیث میں فرمایا اَلْاَ نْبِیَاءُ اَحْیَاءٌ فِیْ قُبُوْرِھِمْ یُصَلُّوْنَ انبیا قبروں میں زندہ ہیں۔عبادت کرتے ہیں۔ان احادیث میں حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے انبیاء کی زندگی کی خبر دی ہے۔کہ انبیاء زندہ ہیں۔اس زندگی کی ترکیب وہی ہے جو اوپر بیان ہو چکی ہے۔کہ انبیا کا وجود جسمانی زمین میں محفوظ ہے۔اور اسی وجود کے ساتھ انکی روحِ لطیف واقع ہے۔جو تمثیلی حالت میں (مردہ جسم کے ساتھ) ایک انسان کی شکل میں محسوس ہوتی ہے۔ اور وہ عبادت کرتی ہے۔اسکا مطلب یہ ہے۔کہ حضرت موسیٰؑ کا جسم مبارک جس حالت میں وفات حاصل کر چکا اسی حالت میں پایا جاتا ہے(اس میں حرکت وعمل ساقط ہے) اور وجود روحانی (جسکی تشریح اوپر ہوئی ہے) انسانی مجسمہ کی تمثیلی شکل میں زندہ ہے۔عبادت کر رہا ہے۔گویا حضرت موسیٰؑ کا ذاتی جسم عبادت نہیں کرتا۔ بلکہ روحانی جسم عبادت کر رہا ہے۔اور یہ زندگی تو انسان کی ابتدائی زندگی کا تسلسل (مسلسل قائم رہنا ہے) ہے اس میں مادی جسم کا ہونا کوئی خصوصیت نہیں۔ایک ہیئت کا اپنی حالت میں ہمیشہ قائم رہنا اسکی ابتدائی زندگی کے ساتھ ہی وابستہ ہے۔ درمیانی (جسمانی) کیفیت میں زندہ رہنا کوئی خصوصیت نہیں۔ بلکہ یہ درمیانی دور کا ایک قالب ہے۔جو وقت پر اتر جاتا ہے۔اور پھر حسب سابق زندگی جاری رہتی ہے۔اسلئے حضرت موسیٰؑ کا زندہ رہنا اور عبادت کرنا۔اس جسم کے ساتھ جس جسم کو اپنی دوامی زندگی سے علیٰحدہ کر دیا ہو۔کوئی خصوصیّت نہیں رکھتا۔ بلکہ خصوصیت یہ ہے۔ کہ عام انسانوں کے مقابلہ میں انبیاء کا وجود جسمانی زمین میں محفوظ رہتا ہے۔اسکے ساتھ روح لطیف (انسانی جسم کی تمثیلی حالت میں) ہمیشہ رہتی ہے۔ جو جسم میں حرکت وعمل پیدا نہیں کرتی بلکہ خود انسانی ہیئت میں شعوری طور محسوس ہوتی ہے۔یہی خصوصیّت پیغمبر میں ہوتی ہے۔ کہ اسکا عمل باوجود جسم کے فنا

ہونے کے موت کے بعد بھی روحانی حالت میں جاری رہتا ہے۔ یہ روحانی حالت روح رحمانی کی نہیں بلکہ روح حیوانی کی ہوتی ہے۔ جو کسی اور انسان کو سوائے اولیا کے حاصل نہیں ہوتی۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اس حدیث کا بغور مطالعہ کرنے سے یہ بات خود واضح ہوتی ہے۔ کہ آپ ؐ شبِ اسرا میں بجسد معراج میں تشریف لے گئے یہاں حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کے مشاہدہ کی خصوصیت کا مطالعہ کرنا ہے۔ کہ آپ کی ذاتِ مقدس عام انسانوں اور انبیاء سے مختلف ہے۔ وہ یہ کہ آپ خیر الرّسل اور امام الانبیاء ہیں۔ سید المرسلین ہیں (صلی اللہ علیہ وسلم)۔ آپکی اس خصوصیّت کے اعتبار سے آپکو ہر انسان۔ ہر نبی سے جسمانی۔ روحانی حالت میں علوشان ورفعت کا مقام حاصل ہے۔ اگر حضرت یوسفؑ تمام انسانوں میں حسین ہیں تو آپ ؐ بدرجہ اکمل حضرت یوسفؑ سے بھی حسین ہیں۔ اگر حضرت سلیمانؑ تمام عالم جن وانس پر حاکم وغالب ہیں۔ تو آپ ؐ بدرجہ اکمل تمام کائنات پر حکمران ہیں۔ جہاں کا ذرہ ذرہ آپ ؐ کی حمد کرتا ہے اور آپ ؐ کا مطیع ہے۔ اگر حضرت عیسٰیؑ روح اللہ ہیں۔ تو آپ بھی بدرجہ اکمل روح اللہ (محمد) اور حبیب اللہ ہیں۔ اگر حضرت عیسٰیؑ ایک مخصوص نور سے پیدا ہوئے۔ تو آپ ؐ کے لیے بھی اس مخصوص نور سے قوی وبرتر نور مخصوص ہے۔

مصطفٰےؐ زیں گفت کادمؑ وانبیاء　　　خلفِ من باشند در زیرِ لواء

حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے فرمایا کہ قیامت کے دن تمام انبیاء میرے لواء الحمد کے سایہ کے نیچے میرے پیچھے چلتے ہونگے۔

بہرِ ایں فرمودہ است آن ذوفنون　　　رمزِ نَحۡنُ الۡاٰخِرُوۡنَ السَّابِقُوۡنَ

اس کے لیے آپ ؐ نے فرمایا۔ کہ ہم سب سابقین سے پہلے ہیں۔

گر بصورت من زِ آدم زادہ ام　　　من بمعنی جَدِ جَد افتادہ ام

اگرچہ میں صورت میں بنی آدم ہوں۔ لیکن معنی (حقیقت) میں آدمؑ مجھ سے پیدا ہوئے۔

کز برائے من بدش سجدۂ ملک　　　وز پے من رفت بر ہفتم فلک

میرے ہی لیے فرشتوں نے آدم کو سجدہ کیا۔ اور آسمانِ ہفتم پر مجھے ہی فرشتوں نے دیکھا۔

پس زِمن زائید در معنی پدر　　　پس زِمیوہ زاد در معنی شجر

اس لیے باپ کا وجود بشری میرے ہی نور سے نکلا ہے۔ جیسے میوہ سے درخت اور درخت سے میوہ۔

ان اشعار میں یہ بات واضح طور عیاں ہے۔ کہ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کے جسمِ اطہر کیلئے ایک خصوصی و برتر نور مخصوص کیا گیا۔ اور اسی نور مقدس کی جز وہ نور ہیں۔ جو آدمؑ و عیسٰیؑ کے مجسمہ کیلئے مخصوص کئے گئے تھے۔ اور اس نور کی ابتدا۔ وجود حضرت آدمؑ سے ہی ہوتی ہے۔ کہ جب اللہ تعالیٰ نے فرشتوں کے سامنے انسانی عظمت کا چیلنج کیا۔ تو صرف آدم کیلئے ہی تھا۔ اور آدم ذاتی خصوصیت میں صرف انتقال نور محمدیؐ تھا۔ کہ آپکے وجود (پشت) میں نور محمدیؐ رکھا گیا۔ یہی نور ابراہیمؑ۔ اسماعیلؑ اور اولاد اسماعیلؑ میں خصوصی ہستیوں میں منتقل ہوتا ہوا پشت عبداللہ علیہ الصلوٰۃ والسلام میں منتقل ہوا۔ یہی نور مثل مریمؑ حضرت آمنہؑ میں منتقل ہوا۔ اسی نورِ اعلیٰ نے مثل آدمؑ و عیسٰیؑ ہیئت بشری اختیار کی۔ یہ نور۔ یہ جسم پاکیزہ جسم تھا۔ اس پر مادیت کا کوئی غلبہ نہ تھا اپنی ابتدائی حالت سے لے کر آخر عمر میں بجائے مادیت میں ملوث ہونے کے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے تزکیہ ومجاہدہ سے اس حقیقی اور ابتدائی زندگی (نور) نے اور بھی جلا پائی۔ اور یہ نور نور ہی تھا۔ مادّہ نہ تھا۔ گویا روح حیوانی اسقدر عروج پا چکی تھی کہ وہ روح رحمانی میں جذب ہو کر مجسم روح رحمانی بن چکی تھی اسکا مطلب یہ ہے کہ آپ کا وجود بظاہر بشری معلوم ہوتا تھا مگر اسکی خاصیت مجسم نوری تھی جیسے ایک فرشتہ مجسم نور ہوتا ہے مگر بشری شکل اختیار کرتا ہے۔ اور بشری شکل میں آنے سے اسے عقلی طور دیکھا جاتا ہے مگر اسکی خاصیت مجسم نوری ہوتی ہے جس میں مادیت ذرہ بھر بھی نہیں ہوتی۔ اسلئے جس نور کیلئے روحانی وجود ہونا یقینی ہے۔ اور روحانیت کے اعتبار سے اس وجود کا۔ آسمان وعرش۔ اور فَكَانَ قَابَ قَوْسَيْنِ اَوْ اَدْنٰى میں جسم کے ساتھ پہنچنا آپؐ کی ذاتِ مقدس کے لئے کوئی مبالغہ نہیں ــــ بلکہ حقیقت ہے۔ اسی نوری قوت کے اعتبار سے آپؐ کا ادراک بھی نوری تھا۔ گویا عام انسانوں کا روحانی جسم (جس سے وہ قلب وشعور سے ادراک کرتے ہیں) اور حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کا پیغمبرانہ جسم ایک ہی کیفیت کے ہیں۔ اسلئے جسطرح انسان روح رحمانی سے ادراک کرتا ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اپنے جسم کی روحانیت

کے اعتبار سے بشری جسم سے ویسا ہی ادراک ومشاہدہ کرتے ہیں۔ جیسا انسان کی روح رحمانی ایک انسان۔ انبیاء اور ولی۔ اپنی روح رحمانی سے غیر مادی کیفیات کا قلب کے ذریعہ مشاہدہ کرتے ہیں۔ مگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو وہ مشاہدہ بشری آنکھوں سے حاصل ہوتا ہے۔ اسکے علاوہ آپؐ کے قلب مبارک کی کیفیت یہ تھی کہ آپ کی روح (جسے ہم روح حیوانی کہتے ہیں مگر روح حیوانی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم میں نہیں تھی) اسقدر وسیع تھی کہ جاگتی حالت یا بیداری کی حالت میں ایک مجسم نوری زندگی کی حیثیت سے ادراک کرتی جہاں اسے تعقل وشعور سے آگاہی کی ضرورت نہ تھی۔ اسی لئے حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام رات اور دن میں مساوی دیکھتے۔ آگے اور پیچھے مساوی دیکھتے۔ اور اسی لیے حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے فرمایا کہ ہم نے اللہ کو اپنے جسم کی آنکھوں سے دیکھا۔ گویا یہ آنکھ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی آنکھ تھی۔ کسی نبی۔ کسی انسان کی آنکھ نہ تھی۔ اسی کیفیت سے آپؐ نے حضرت موسیٰؑ کو قبر میں دیکھا۔ حالانکہ حضرت موسیٰؑ (خواہ کسی حالت سے ہوں) قبر کی مٹی میں پوشیدہ تھے۔ مگر حضورؐ کے ادراک معراجی میں قبر کی مٹی حائل نہیں ہوسکتی تھی۔ گویا آپ کا دیکھنا ہمارے لئے بمنزلہ شعوری ہے۔ اور اگر عقلی ہوتا تو ہر انسان ہر وقت حضرت موسیٰؑ کو بجسم نماز پڑھتے دیکھتا۔ اس عقلی اور شعوری تمیز کے اعتبار سے کسی ہستی کا زندہ ہونا اپنے جسم (دنیاوی) سے نہیں بلکہ روحانی جسم سے ہے۔ البتہ عبادت کرنے سے مراد حب اور قرب ہے۔ کہ اس حالت میں بھی حب کے تحت جذبہ حب کو جاری رکھا گیا۔ کہ یہ اپنے جذبۂ حب سے بھی ہمیشہ لطف اندوز ہوں۔ ورنہ یہ عبادت۔ عام انسان کے عمل کے مطابق مراتب کیلئے نہیں۔ بلکہ ایک لطیف کیف اور لذّت کیلئے ہے۔

اسی طرح ایک اور حدیث ہے۔ کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عبدالرحمٰن بن عوفؓ کو جبکہ وہ زندہ اپنے گھر میں تھے۔ انکو دیکھا کہ وہ جنت میں جھک کر داخل ہوئے۔

رَأَیْتُ عَبْدُ الرَّحْمٰنِ بْنِ عَوْفٍ دَخَلَ الْجَنَّۃَ جَبْرًا

یہ حدیث خود اس امر کی دلیل ہے۔ کہ حضرت عبدالرحمٰن بن عوفؓ کا بشری (جسمانی وعقلی) وجود ایک ہی تھا۔ اور یہ وجود گھر میں موجود تھا۔ مگر ایک وجود جنت میں داخل ہو رہا تھا۔ گویا یہ وجود

مادی نہ تھا بلکہ روحانی تھا۔ یہ روحانی وجود روح رحمانی کا تھا۔ نہ جسمانی اور نہ روح حیوانی کا۔ کیونکہ حضرت عبدالرحمٰن بن عوفؓ کا زندگی میں جنت کا مرتبہ حاصل کرنا۔ آپکی شریعت اور روح رحمانی کا نتیجۂ عمل کے ذریعہ مرتبہ حاصل کرنے کی حیثیت سے تھا۔ اسلئے یہ کیفیت خالص روحانی (شعوری) کیفیت سے تھی۔ اور حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کا مشاہدہ کرنا۔ اگرچہ جسمانی حواس سے تھا۔ لیکن یہ کیفیت صرف رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کیلئے مخصوص تھی۔ عام ولی اسے روح رحمانی اور شعور کے ذریعہ ہی دیکھ سکتا۔ اور عام انسان اس کیفیت کو وَلٰكِنْ لَّا تَشْعُرُوْنَ کے تحت عقلی حیثیت میں مشاہدہ کر ہی نہیں سکتے۔ حضرت امام غزالی رحمتہ اللہ علیہ نے اس کیفیت کے متعلق خصوصیت کے ساتھ لکھا ہے۔ کہ یہ گمان نہ کیا جائے کہ یہ بات آپؐ نے خواب میں دیکھی۔ نہیں ـــــ بلکہ یہ واقعہ جاگتے میں اپنی آنکھ سے دیکھا۔ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کے مشاہدہ کیلئے خواب اور بیداری کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ جبکہ خواب اور بیداری کے مشاہدہ میں کوئی فرق ہی نہیں۔ فرق اگر ہے تو صرف تعقل کی خوابیدگی کا۔ ایسی حالت میں جیسا خواب کی حالت میں مشاہدہ ہوسکتا ہے۔ ویسا ہی جاگتی حالت میں بھی ہوتا ہے۔ فرق صرف اختیار وارادہ اور قوت مشاہدہ کا ہوتا ہے۔ اسلئے حضورؐ کا جاگتی حالت میں دیکھنا آپکی ذات مطہر کے اعتبار سے آپکی خصوصیت میں شامل نہیں بلکہ یہ دیکھنا ایسا ہی ہے جیسا آدمی جاگتی حالت میں حواس کے ذریعہ بغیر خصوصیت کے دیکھتا ہے۔ اور آنکھوں سے دیکھنا بھی صرف رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کیلئے ہے۔ باقی انسان نہیں دیکھ سکتے۔ اسلئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا آنکھ سے دیکھنا ایک وجود کیلئے مادی حالت میں ہونا دلیل نہیں البتہ اسے تمثیلی کہا جاسکتا ہے۔ اور تمثیلی کیفیت سے مراد جسکا مادی وجود نہ ہو۔ مگر یہ روحانی وجود ہمشکل مادی وجود ہو گویا ایک روحانی وجود سے اسکے جسمانی (مادی) وجود کا احساس کیا جاتا ہو۔

ایک اور حدیث بھی وارد ہے۔ کہ ایک دن اسماء بنت عمیسؓ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس بیٹھی تھیں تو آپؐ نے فرمایا ''وعلیکم السلام'' پھر حضرت اسماءؓ سے فرمایا۔ اگرچہ کوئی سلام دینے والا (حواس عقلی کے ذریعہ) نظر نہیں آتا ـــــ مگر بات یہ ہے۔ کہ حضرت جعفرؓ جبرائیلؑ اور میکائیلؑ کے ہمراہ یہاں سے گذرے۔ اور ہم کو ''السلام علیکم'' کہا۔ ہم نے انہیں کے جواب میں ''وعلیکم السلام''

کہا۔ اوراپنی شہادت کا سارا حال بتایا۔

اس واقعہ میں ایک وجود تمثیلی کی کیفیت عیاں ہے۔ کہ یہ جسم شہید ہونے کے بعد وہ جسم نہ تھا جوقتل ہوا۔ بلکہ وہی روحانی جسم (روح ابتدائی کا) روحانی ہیئت میں تھا۔ جوحواس میں نہ آتا تھا بلکہ غیر عقلی تھا۔ اوراپنے مراتب و برتری کے لحاظ سے عالمِ ناسوت کی سیر ملائکہ کے ساتھ کررہا تھا۔ اور حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام بھی شعوری حالت میں مشاہدہ کررہے تھے۔ آپکی عقلی حالت ہماری شعوری حالت کے برابر تھی۔ اسلئے آپؐ نے اپنی آنکھوں اور عقلی کیفیت جسمانی سے دیکھا یہ وجود تمثیلی کی دوسری قسم ہے۔

(۳) رحمانی: تیسری قسم یہ ہے۔ کہ روح حیوانی کے سوائے انسانی مرکب میں ایک اور روح بھی ہے جسے روح رحمانی سے تعبیر دیا جاتا ہے۔ یہ روح۔ روح حیوانی کے مانند وجود اور مادہ میں جذب نہیں ہوتی۔ نہ ہی اس روح سے زندگی کا کوئی تعلق ہے۔ بلکہ یہ روح انسان کی زندگی میں اسکی وجودی تکمیل کے بعد انسان میں ودیعت ہوتی ہے۔ چنانچہ قرآن اس روح کے متعلق انسانی تخلیق میں ایک معین و مخصوص انداز بتاتا ہے۔

اَلَّذِیْٓ اَحْسَنَ کُلَّ شَیْءٍ خَلَقَهٗ وَبَدَاَ خَلْقَ الْاِنْسَانِ مِنْ طِیْنٍ ۚ ثُمَّ جَعَلَ نَسْلَهٗ مِنْ سُلٰلَةٍ مِّنْ مَّآءٍ مَّهِیْنٍ ۚ ثُمَّ سَوّٰىهُ وَنَفَخَ فِیْهِ مِنْ رُّوْحِهٖ (پارہ ۲۱ سورۃ ۳۲ آیت ۷۔۹) وہ اللہ وہ ہے۔ کہ جس نے ایک بہتر نظامِ ترتیب اور بہتر صورت میں تمام چیزوں کو بنایا۔۔۔ اور انسان کی ابتدا مٹی سے کی (وجودی ابتداء) هُوَ الَّذِیْ خَلَقَكُمْ مِّنْ نَّفْسٍ[۱] وَّاحِدَةٍ (پارہ ۹ سورۃ ۷ آیت ۱۸۹) وہ ہے جس نے بنایا تم کو ایک نفسِ واحد سے۔ وَّجَعَلَ مِنْهَا زَوْجَهَا اور اسی نفس واحد سے (بہتر نظام ترتیب کے اصول کے تحت) اسکا جوڑا (نر و مادہ کی صورت میں) بنایا اور اسی جوڑے نے اپنی ارتقائی تکمیل پر وَبَثَّ مِنْهُمَا رِجَالًا كَثِیْرًا وَّنِسَآءً ۔ سلسلہ تناسل کو قائم کیا اور انہیں سے

---

[۱] یہ تخلیق بَدَعْ میں شمار ہوتی ہے۔

انسانوں کی پیدائش کا سلسلہ چلا۔ثُمَّ جَعَلَ نَسلَهٗ مِنۡ سُلٰلَةٍ مِّنۡ مَّآءٍ مَّهِیۡنٍ۔اور اسی سلسلہ نسل کشی میں انسانی پیدائش (مادۂ منویہ) حقیر پانی سے شروع ہوئی۔ اس مادہ منویہ میں بھی وہی کیفیت پائی جاتی ہے۔جو اوّل انسان کے وجود کیلئے اسکی بَدَءَ میں واقع ہے۔فرق صرف اتنا ہے۔وہاں ابتدائی زندگی کی صورت میں انسانِ اول کی شعوری زندگی کا احساس (شعوری طور) ہوتا ہے۔مگر سلسلہ تناسل میں اس کیفیت کا احساس نہیں ہوتا ہے۔مگر اس مادہ منویہ میں جو رحم مادر میں خون سے نشو ونما حاصل کرتا ہے۔ اس ابتدائی زندگی کا جوہر لازمی طور موجود ہوتا ہے۔کہ اگر اس جوہر کو تقویت دی جائے تو یہ اپنی ابتدائی (شعوری) ہیئت میں آسکتا ہے۔اور اگر اس پر مادیت کا غلبہ طاری کیا جائے تو یہ اپنی اصل کھو بیٹھتا ہے۔اسکی مثال ایسے ہو جاتی ہے۔جیسے زمین سے ابلنے والا چشمہ۔اگر چشمہ نے صحیح سمت اختیار کی تو نالہ۔دریا کی ہیئت میں آکر سمندر میں جذب ہو کر وسعت پذیر ہوتا ہے۔اگر صحیح سمت اختیار نہ کی تو تھوڑی سی مسافت کے بعد زمین میں جذب ہو جاتا ہے۔اور جب یہ جوہر نُطفہ کی صورت میں سلسلہ پیدائش شروع کرتا ہے تو رحم میں مختلف صورتوں میں آکر آخر ایک مستقل صورت اختیار کرتا ہے۔ثُمَّ جَعَلۡنٰهُ نُطۡفَةً فِیۡ قَرَارٍ مَّكِیۡنٍ ۝ ثُمَّ خَلَقۡنَا النُّطۡفَةَ عَلَقَةً فَخَلَقۡنَا الۡعَلَقَةَ مُضۡغَةً فَخَلَقۡنَا الۡمُضۡغَةَ عِظٰمًا فَكَسَوۡنَا الۡعِظٰمَ لَحۡمًا ق (پارہ ۱۸ سورۃ ۲۳ آیت ۱۳-۱۴) نطفہ۔علقہ۔مضغہ۔یہ ابتدائی دور میں رحم میں نطفہ کی ارتقائی کیفیتیں ہیں۔نطفہ سے بڑھتے بڑھتے گوشت کا لتھڑا بنتا ہے۔پھر دو حصوں میں ہو جاتا ہے۔پھر ایک ہی حصہ ہو جاتا ہے۔پھر اس حصہ میں ہڈیاں پیدا ہوتی ہیں ___ پھر ہڈیوں سمیت ایک وجود بن جاتا ہے۔جس میں ہر عضو کی شکل بن جاتی ہے پھر آخر میں ثُمَّ اَنۡشَاۡنٰهُ خَلۡقًا اٰخَرَ۔پھر اسکے آخری مرحلہ پر اسکی ارتقائی (وجودی) ترکیب پوری ہو کر اسکی آخری تخلیق میں ہر استخوان کی تکمیل ہو جاتی ہے اور یہ انسان کی شکل پر آجاتا ہے۔اسکی آخری ترکیب تخلیق میں انسان ہر استخوان میں سنوارا جاتا ہے۔ثُمَّ سَوّٰهُ اسکے بعد ایک آخری تخلیق ہوتی ہے وہ ترکیب اسکی تخلیق میں حصولِ علم

لے کیونکہ انسان ابتدا سے زندہ ہوتا ہے۔جب ہی یہ ہیئتیں تبدیل کرتا ہوا ارتقا کی طرف آتا ہے۔

کیلئے ہوتی ہے (زندگی کیلئے نہیں) وَنَفَخَ فِیْهِ مِنْ رُّوْحِهٖ یعنی ایک روح حیوانی اسکی وہ ہوتی ہے۔ جس سے اسکی ابتدا ہوتی ہے۔ ایک روح یہ ہوتی ہے۔ جو اسکی تخلیق تام پر نفخ (پھونک) کی جاتی ہے۔ یعنی پھر اس میں اسکی روح (جو علم کیلئے ازل میں اسکے لیے مقرر کی گئی ہوتی ہے) پھونک دی جاتی ہے۔ ثُمَّ اَنْشَاْنٰهُ خَلْقًا اٰخَرَ گویا یہ روح بھی اسکی تخلیق کا ایک جز ہے۔ اگر یہ روح اس میں نہ پھونکی جائے۔ تو انسانیت کے اعتبار سے اسکا وجود ادھورا رہے گا۔ اس روح کو روحِ رحمانی کے نام سے تعبیر دیا جاتا ہے۔ چونکہ یہ روح اپنی نوری ہیئت کے اعتبار سے ہر روح سے قوی ہوتی ہے۔ اسلئے اس مجسم زندگی کے اعتبار سے اس میں عقلِ کل (یعنی علم و ادراک کی تمام قوت موجود ہوتی ہے) کی پوری صلاحیت ہوتی ہے۔ یہ روح مجسم نور ہوتی ہے۔ اور اسکا مشاہدہ بھی شعوری طور ہوتا ہے۔ چونکہ یہ بھی انسانی تخلیق کی ایک جز ہوتی ہے۔ اسلئے مشاہدہ شعوری میں یہ ہیئت انسان کی تمثیلی شکل میں محسوس ہوتی ہے۔ چونکہ اس کا مقام انسانی وجود میں صرف علم کیلئے ہی ہوتا ہے اسلئے اسکی وسعت انسانی وجود (عالم ناسوت) میں قلبِ انسانی سے لے کر ذات الٰہی تک ہوتی ہے۔ علم کے اعتبار سے مشاہدہٗ باطن میں انسانی عمل (شریعت وطریقت) میں روح حیوانی اپنی ہیئت کے اعتبار سے صرف عالمِ ناسوت کی آخری (اکتالیسویں منزل) منزل تک ہی جا سکتی ہے۔ اسکے بعد روح رحمانی ہی اپنی ہیئت کے اعتبار سے عالمِ ملکوتی۔ عالمِ جبروتی۔ عالم لاہوتی میں جاسکتی ہے۔ اسے صراط اللہ کا مشاہدہ اسی روح کے ذریعہ ہوتا ہے۔ مشاہدہ میں چونکہ جذب کی کیفیت حاصل ہوتی ہے۔ سو یہی روح اپنی قوت کے اعتبار سے اپنی جنس میں جذب ہونے کی صلاحیت رکھتی ہے گویا صراط اللہ کے مراتب اسی روح کو حاصل ہوتے ہیں۔ اور ہر عالم کی کیفیت شعوری طور حاصل ہوتی ہے۔ کیونکہ اس روح میں مادیت کا اثر نہیں بلکہ مجسم نور ہے۔ اور مراتب میں بھی ملکوتی کیفیتیں (نوری کیفیتیں) پائی جاتی ہیں۔ اسلئے ایک ولی یا عارف ہر کیفیت کو شعوری حالت میں پاتا ہے۔

یہ امر مسلّمہ ہے۔ کہ روح بھی نوری ہے۔ مراتب بھی نوری ہیں۔ اسلئے ان مراتب کی ہر کیفیت انسان شعور کے ذریعہ مشاہدہ میں لاتا ہے۔ جس میں نہ اسکی مادیت پر اسکا کچھ اثر ہوتا ہے۔ نہ

مادی حیثیت میں انسان ان سے کچھ تعلق رکھتا ہے۔صرف علمی حیثیت میں روح جذب ہوتی ہے۔اور شعور علم حاصل کرتا ہے۔ یہ کیفیت انسان کی زندگی میں ہوتی ہے۔ کہ جو کچھ نتیجۂ عمل اس سے حاصل ہوتا ہے۔ وہی اسکے مراتب ہوتے ہیں اور یہی چیز اسکی موت کے بعد قائم رہتی ہے۔اس سے یہ امر ظاہر ہوتا ہے۔ کہ انسان کو جن کیفیاتِ باطن کے مراتب کا شعور کے ذریعہ علم ہوتا ہے۔ وہی اسکا نتیجۂ عمل ہے اور قرآنی ارشاد کے مطابق وَلَكُمْ مَّا كَسَبْتُمْ اور وَمَا تُقَدِّمُوا لِاَنْفُسِكُمْ ۔ تَجِدُوْهُ عِنْدَ اللّٰهِ ۔تمہارے لیے وہی کچھ تمہاری موت کے بعد راحت وعذاب کا سامان ہے جو تم عمل کرو گے۔اور جو کچھ تم نے اپنی زندگی میں مراتب حاصل کرنے کیلئے عمل کے ذریعہ پیدا کیا تم وہی عمل کے مراتب اپنی موت کے بعد پاؤ گے اس میں اتنی مقدار بھی ہے۔ کہ فَمَنْ يَّعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ خَيْرًا يَّرَهٗ ۝ وَمَنْ يَّعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ شَرًّا يَّرَهٗ ۝ع (پارہ ۳۰ سورۃ ۹۹ آیت ۷۔۸) اگر ذرہ بھر اچھا عمل کیا تو اسے بھی دیکھو گے (پاؤ گے) اگر ذرہ بھر برائی کی تو اسے بھی دیکھو گے (پاؤ گے) اور یہ تمام کیفیتیں انسان کو جذب۔ مشاہدہ (شعوری علم) اور مراتب کی صورت میں حاصل ہوں گی۔ زندگی میں انسان دنیوی کیفیاتِ وجودی کا اثر بھی پائیگا۔انسانی عظمت کے لحاظ سے اسکی زندگی میں اطمینان و راحتِ روحانی بھی حاصل ہوگی۔مگر ان مراتب کا زیادہ تر اثر اسکی موت کے بعد پورے طور محسوس ہوگا کیونکہ اس زندگی میں دنیاوی تاثرات (تکالیف جسمانی) موجود نہ ہونگے کیونکہ ان تکالیف کا تعلق جسم سے ہوگا جسکا روح سے کچھ تعلق نہ ہوگا ــــ اسلئے عاقبت کی زندگی میں اسی طرح محسوس کرنا ہوگا جس طرح انسان زندگی میں ان مراتب (کیفیات) کو محسوس کرتا ہوگا۔البتہ جسمانی کیفیت نہ ہونے کے باعث انسان روحانی زندگی میں ہر کیفیت کی لذت سے پورا پورا متاثر ہوگا۔اسی طرح جنت اور دیگر کیفیات نوری (یا ناری) کا اثر بھی روحانی طور اسے حاصل ہوگا۔ چونکہ مادہ کے مقابل نور میں زیادہ قوت و لطافت پائی جاتی ہے اسلئے مادی اشیاء و کیفیات کے مقابلہ میں نوری اشیاء میں لذت و اثر مادہ سے زیادہ ہوگا۔اور مراتب کے لحاظ سے بھی ہر رتبہ مادی رتبہ سے لاانتہا لذت و اثر رکھتا ہے۔اسلئے انسان کو اپنی موت کے بعد ہر بہتر سے بہتر ثمر دیا جائیگا۔مثال کے طور نور کے مقابلہ میں مادہ کمتر حیثیت رکھتا

ہے۔اگر اسے روحانی عالم میں۔دوبارہ مادی جسم دیا جائے اور وہی مادی اشیاءنوری مراتب کے بدل میں دی جائیں۔تو یہ امرغیر عقلی ہے۔کہ ایک شخص نے انتہائی لذیذ اور لطیف مراتب حاصل کئے جن کی لذت واثر مادہ سے کہیں زیادہ بہتر ہیں۔ان کیفیات کے بدل میں کمتر کیفیات اسے حاصل ہوں۔اگر جنت ایک غیر جسمانی عالم ہے۔(یہ بھی عرفان الٰہی کے مراتب سے ہے) اسکی کیفیتیں نوری اعتبار سے مادہ کے مقابلہ میں لطیف ہیں۔اور موت کے بعد انسان کو جبکہ وہ جذب یا بغیر جذب مراتب نورانی حاصل کر چکا ہو ___ اسے اس دائمی (مجسم) زندگی کے بدلے مادی حادث زندگی میں واپس کیا جائے اور بجائے نوری غذا (ثمرات۔انہار) کے مادی ثمرات دیئے جائیں۔تو اسے اسکے عمل کی پاداش میں ملے ہوئے مراتب سے گویا محروم رکھا گیا ___ اسی طرح ہر عالم کی کیفیت یہی ہو گی۔یعنی جسوقت انسان پر موت طاری ہوگی۔اسکا مطلب یہ ہوگا کہ اس دنیا سے متعلق زندگی (مادی وجود) جوصرف دنیا کیلئے ہی مقرر ہے۔اسکی نئی زندگی میں یہ زندگی ختم ہوگی۔اسکے بعد اسکی روحانی زندگی جسے مراتب حاصل ہو چکے ہیں۔اپنی روحانی ہیئت میں ہر کیفیت کو حاصل کریگی۔اور یہ سلسلہ موت کے ساتھ ہی شروع ہوگا۔یعنی انسان پر جب موت طاری ہوتی ہے۔تو اگر اسکی روح حیوانی اپنی اصلی حالت میں ہے۔تو وہ عالم ناسوت میں اپنی ہیئت کے مطابق ایک مقام[1] میں رہیگی جب تک اس کا وجود عالم ناسوت میں رہے گا (یعنی قیامت تک) تب تک اسکی روح حیوانی جسم سے متصل

---

[1] موت کے بعد انسان کا جسم زمین میں دفن کیا جاتا ہے۔جسے قبر کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے۔قبر عربی میں کھودے ہوئے گڑھے کو کہا جاتا ہے۔جسکی گہرائی تقریبا چھ سے آٹھ فٹ ہوتی ہے۔قبر کی گہرائی کا یہ تخمینہ اسلئے رکھا گیا ہے۔کہ انسان کے وجود کے گلنے سڑنے کا اثر اور اسکے وجودی ذرات زمین کی سطح پر نہ آسکیں۔تاکہ زمین کے رہنے والے انسان اس وجود کے اثرات سے متاثر نہ ہوں۔دوسری وجہ یہ ہے کہ انسانی اجسام مختلف خاصیتوں میں ہوتے ہیں۔یعنی انسان میں مختلف بیماریاں ہوتی ہیں۔کسی میں کوڑھ۔کسی میں دق وسل۔کسی میں اس سے بھی زیادہ یا کم شدت کی بیماریاں ہوتی ہیں۔ان بیماریوں کے ذرات اگر زمین کی سطح پر آجائیں۔ تو انسانوں میں ہوا۔اور غذا کے ذریعہ ان امراض کے پھیلنے کا احتمال ہوتا ہے۔مثال کے طور اگر ایک جگہ کوڑھ۔یا دق وسل کے مریض (باقی حاشیہ اگلے صفحہ پر)

رہے گی۔ اور مراتب کے لحاظ سے روح رحمانی جو مقام جذب و مشاہدہ میں حاصل کر چکی ہے۔ اسی مقام میں رہیگی۔ اسی طرح دوسرے انسانوں کی روح جو روحِ حیوانی کمتر حالت میں آ کر جز و بدن ہو گئی اور اس میں لطافت نہ آئی۔ اسی حالت میں بدن (جسم) کی کیفیت میں زمین میں جذب ہو گی۔

(بقیہ حاشیہ گزشتہ صفحہ) دفن ہوں۔ تو انکے وجود کے تاثرات زمین کے اوپر آ جائیں کچھ زمانہ گذرنے کے بعد یہ جگہ فصلوں کیلئے استعمال کی گئی۔ تو لازمی طور فصلوں میں اس قسم کے اثرات آ جائیں گے۔ کیونکہ فصل کو کھاد ان اجرام کے ذریعہ حاصل ہوتی ہے۔ جو زمین سے تقریباً تین فٹ نیچے کی زمین میں پائی جاتی ہے۔ یہ کھاد فصلوں کی نشو و نما کے لیے اشد ضروری ہوتی ہے۔ لیکن یہ اجرام چھ فٹ یا آٹھ فٹ زمین کے اثرات سے محفوظ ہوتے ہیں۔ تیسری وجہ ایک فطری القا کے اثر کے تحت ہے۔ کہ جہاں انسان کے جسم کو اسکی روح حیوانی۔ اسکی روح رحمانی کیلئے عمل اور اسکا نتیجہ حاصل کرنا ہے۔ سو اس نتیجہ کو پانے کیلئے اسکے وجود کی ہر کیفیت کو ایک وقت مقرر کیلئے محفوظ کیا جائے۔ سو یہ ایک فطری عمل ہے۔ کہ انسان کا وجود زمین میں محفوظ ہو جاتا ہے۔ یا جمع ہو جاتا ہے۔

یہ امر مسلمہ ہے۔ کہ فطری اصول کے تحت جو کچھ بھی موجود ہے۔ خواہ وہ نور ہو یا مادہ یہ سب ایک نور مطلق (نور الہٰی) سے ہے۔ نور الہٰی احد کی حالت میں سالم رہیگا۔ اسکے نور کی کیفیت کسی ہیٔت میں بھی آ جائے۔ مگر یہ وجود ہر حال میں موجود رہیگا۔ اسکے لیے عدم کا کوئی مقام نہیں۔ نہ وجود کسی طرح عدم ہو سکتا ہے۔ صرف ایک ہیٔت سے دوسری ہیٔت اختیار کر سکتا ہے۔ مگر اس وجود میں بھی ایک ہیٔت کا وجود موجود رہیگا۔ اسلئے انسانی وجود ہر حال میں زمین میں (موجود کی صورت میں) موجود رہیگا۔ سوال یہ پیدا ہوتا ہے۔ کہ اگر ایک زمین میں بے شمار انسان دفن کئے گئے ایک صدی کے بعد وہاں یا تو زمین کاشت کی گئی۔ یا دوبارہ اسی زمین میں چھ فٹ گہرائی پر بے شمار انسان دفن کئے گئے۔ اگر کاشت کی گئی۔ تو یہ انسانی اجزا پودوں میں جذب ہو کر غذا کی صورت میں آ جائینگے جس سے ایک نئے انسان کا جسم بنیگا۔ تو پھر ایک انسان میں دوسرے انسان کا وجود جذب ہو کر دوسرے انسان کا وجود عدم ہو جائیگا۔ یا اسطرح دو انسانوں کے وجودوں کی کیسے تمیز ہو سکے گی۔ دوسری بات ــــ اگر ایک ہی جگہ پر دو بار انسان دفن کئے گئے تو انکے وجودوں کے اجزا کا ایک دوسرے میں جذب ہونا لازمی ہے۔ تو پھر ایک جگہ دو انسانوں کا وجود کس طرح قائم رہ سکتا ہے۔

پہلے شبہ کا ازالہ: تو یہ ہے۔ کہ زمین کی کاشت سطح زمین پر تقریباً ایک فٹ گہرائی تک زیادہ سے زیادہ ہوتی ہے۔ اسکی کاشت کیلئے صرف زیادہ سے زیادہ تین فٹ زمین کی گہرائی کی حد تک ضرورت رہتی ہے۔ ایسی حالت میں اگر سو سال یا تین سو سال کے بعد زمین کاشت کی جائے۔ تو اس حالت میں انسانی وجود زمین کی سطح کے (باقی حاشیہ اگلے صفحہ پر)

اس حالت میں انسان کا وجود خود موجود نہیں رہیگا۔ بلکہ وجود اسکا جذب زمین (کائنات کی کمتر کیفیت) میں ہوگا۔ یعنی انسانی جسم کے مرکبات کو زمین کے مرکبات اپنے میں جذب کر لیں گے۔ یہ مرکبات بظاہر مادی حالت میں ہیں۔ لیکن انہیں بھی کثیف روح سے تعبیر دیا جائیگا۔ کیونکہ یہ مرکبات بھی حقیقتاً

(بقیہ حاشیہ گزشتہ صفحہ) تقریباً نوفٹ نیچے ہوتا ہے۔ جہاں سے انسانی وجود کا پودوں میں جذب ہونا ناممکن ہے۔

دوسرے شبہ کا ازالہ: اگر ایک زمانہ میں ایک جگہ انسان دفن کئے جائیں۔ یہ عام بات ہے۔ کہ اگر ایک جگہ ایک مکان بنایا جائے تو کم از کم ایک سو سال تک اس مکان کے آثار باقی رہتے ہیں۔ اور ایک سو سال سے زائد وقت میں یہ مکان کھنڈر بن جاتا ہے اور قبرستان تو آبادی میں زیادہ پائے جاتے ہیں۔ کہ شہر سے باہر لوگوں کو دفن کیا جائے۔ یہ امر لازمی ہے۔ کہ کم از کم ایک بستی اگر اجڑنے میں آئے تو اسے کم از کم ایک ہزار یا پانچ سو سال ضرور ایک حالت میں رہنے کا موقع ملتا ہے۔ جتنی دیر ایک مقام انسانوں میں آباد رہیگا اتنی دیر اسکا قبرستان بھی ایک ہی حالت میں رہیگا۔ یعنی اگر ایک جگہ قبروں سے بھر گئی تو اسکے ساتھ ہی دوبارہ ایک دوسرے پر انسان دفن نہیں کئے جاتے بلکہ دوسری جگہ دفن کئے جاتے ہیں۔ اسی طویل مدت کی مہلت میں زمین کی سطح پر اور مٹی جم جاتی ہے ___ گویا اگر ایک جگہ چھ فٹ زمین میں انسان دفن کیا گیا۔ تو ایک ہزار یا پانچ سو سال کے بعد وہ انسان زمین کی سطح سے تقریباً آٹھ فٹ یا سات فٹ نیچے ہوگا ___ کیونکہ کائنات کے تجربہ میں یہ ثابت ہو چکا ہے۔ کہ اس زمین میں کئی ہزار میلوں کی کھدائی میں لاکھوں سال پہلے کی نعشیں مل رہی ہیں۔ اور زمین میں پے در پے درجات پائے جاتے ہیں جو زمین کی ابتدائی سطح سے کئی میلوں کے حساب سے اوپر سمجھی جاتی ہے۔ اسلئے ضروری ہے کہ آج کے انسان کی جگہ اگر ایک ہزار سال کے بعد اسی جگہ انسان کو دفن کیا جائے تو زمین کی گہرائی میں ایک نیچے ہوگا۔ دوسرا اوپر رہیگا۔ یہ تبدیلی اکثر مقامات کے غیر آباد ہونے سے ہوتی ہے۔ مقامات کے غیر آباد ہونے کی یہ صورت ہوتی ہے کہ ایک زمانہ میں یا تو اچانک حادثات۔ زلزلے۔ سیلاب سے لوگ مر گئے اور جو بچا اس نے جگہ چھوڑ دی یا ایک جگہ سے سامان زندگی فراہم نہ ہونے کے باعث جگہ تبدیل کی جاتی ہے۔ اب اگر یہ تبدیل کی ہوئی جگہ دوبارہ آباد ہو جائے۔ تو اس دوبارہ آباد ہونے میں بھی ایک طویل زمانہ کا وقفہ ہوتا ہے۔ ایسی حالت میں لازمی طور ایک جگہ کی زمین کی سطح پہلی سطح سے نیچے ہو جاتی ہے۔ یا تو سیلاب سے۔ یا طوفان وزلزلہ سے قدرتی طور یہ ترکیب زمین کے ساتھ ہوتی رہتی ہے۔ مثال کے طور آج سے پانچ ہزار برس کا انسان سطح زمین سے چھ فٹ نیچے نہ ہوگا بلکہ کچھ زیادہ نیچے کھدائی میں ملے گا ___ اس طرح ایک انسان کے وجود کو دوسرے انسان کے اجزا میں شامل ہونے کا موقع نہیں ملتا۔ بلکہ ہر انسان ایک کیفیت زمین میں ضرور قائم رہتا ہے۔ جبکہ وجود کا عدم ہونا ممکن نہیں۔

ایک ابتدائی نور کا ہی وجود ہیں۔جس نے پہلے قوی حالت میں مادہ کو اپنے میں جذب کر کے خود مادی ہیئت اختیار کی اور آخر اسکی لطیف قوت عروج نہ کر سکی۔ برعکس اسکے اسکی خاصیت کثیف ہو گئی۔ یہی کثیف کیفیت اسکا موت کے بعد آخری وجود ہوگا۔یہی کثیف کیفیت کثیف روح کے نام سے زمین میں جذب ہو گی۔اور اسکا وجود بھی قیامت تک اجزاء زمین میں باقی رہیگا ــــــ لیکن یہ وجود اپنے مقام اسفل میں مقید رہیگا۔ یہ روحِ کثیف۔شہدا کی روحِ لطیف کی طرح عالم ناسوت میں پرواز (سیر) کرنے کی صلاحیت نہیں رکھتی اسلئے یہ دنیا کی مانند کسی طرف بھی سیر نہیں کر سکتی۔البتہ اگر یہ روح دنیا کی طرف رجوع کرے۔تو نہایت کثیف حالت میں ہوگی جسے بدروح کے نام سے تعبیر دیا جائیگا۔لیکن یہ کیفیتِ دنیوی بھی عالم ناسوت کی ہوگی کیونکہ یہ دنیا بھی عالم ناسوت کے احاطہ میں قائم ہے۔اسلئے اس روح کو بعض لوگ دیکھ سکیں گے بعض نہیں۔اگر دیکھا تو یا تو اسکی اسی شکل میں جو دنیا میں اسکی تھی یا بہت خراب حالت میں۔

موت سے لے کر قیامت تک ان ارواح کا مقام قبر (عالم ناسوت) ہی رہیگا۔جہاں پر یہ اپنی اعلیٰ وکمتر کیفیتوں میں رہیں گی۔اور انکی کیفیتوں کے مطابق ہی یہ عالمِ ناسوت کے علیین (اعلیٰ نوری مقام) اور سجین (اندھیرے اور گھناؤنے مقام) جیسے مقامات کے ماحول سے متاثر ہوں گے جس میں ایک ولی شہید کو انکی روحانی ہیئتوں کے مطابق رزق وانعام ملتے رہینگے۔اور ایک کثیف روح کو اسکی کثیف ہیئت کے مطابق تکلیف۔سانپ بچھو کے ڈسنے کی تکلیف محسوس ہوگی۔یہ سب اشیا مادی نہیں ہونگی۔بلکہ غیر مادی ہونگی۔شہدا کا وجودِ روحانی چونکہ غیر مادی (روحانی) ہوگا اسلئے اسے جو اشیاء دی جائیں گی وہ ان اشیاء سے اسی طرح لطف اندوز ہوگا جیسے ایک شخص خواب کی حالت میں غیر مادی اشیا سے لطف اندوز ہوتا ہے۔اور ایک شخص خواب کی حالت میں آگ سے جلنے یا سانپ بچھو کے ڈسنے کی تکلیف محسوس کرتا ہے ــــــ یہ روحیں قیامت تک اسی کیفیت سے متاثر ہوتی رہینگی۔اشیا کے نفع ونقصان کے تاثر میں احساسات کو بھی کافی دخل ہے۔یعنی جب تک انسان کو کسی بہتر چیز کے

پانے میں مسرت حاصل نہ ہو۔ وہ چیز اگرچہ اسکے وجود کو دو چند فائدہ بھی دے۔ مگر انسان کے احساسات میں اگر اسکا اثر خوش کن نہ ہو۔ گویا وہ چیز نفع بخش نہیں تصور کی جاتی۔ مثال کے طور اگر ایک شخص کو شدت کی سردی میں اسکے وجود کو تکلیف پہنچی ہو۔ تو اسے اس کے دشمن پکڑ کر ایک ایسے مقام پر پہنچا دیں۔ جہاں معتدل موسم ہو اور انسان کی تکلیف بدل جائے لیکن دشمن سے ہلاکت کے احساس کی وجہ سے باوجود۔ وجودی تکلیف رفع ہونے کے بھی خوش نہ ہوگا۔ بلکہ وہ اس حالت میں بھی شدید غم کی تکلیف محسوس کریگا۔ جو احساس اسے کسی آرام دہ صورت کو بھی قبول کرنے سے مانع ہوگا۔ اس سے معلوم ہوتا ہے۔ کہ مادی حالت میں۔ یا غیر مادی حالت میں جب تک ایک کیفیت کا اثر احساسات پر طاری نہ ہو۔ انسان۔ نہ خوشی کی لذت محسوس کرسکتا ہے۔ نہ غمی کی تکلیف محسوس کرسکتا ہے گویا ہر کیفیت کے بہتر و بدتر اثرات قبول کرنے میں احساسات کو زیادہ تر دخل ہے۔ اسی طرح اگر ایک شخص شدید مصیبت میں مبتلا ہے۔ یا اسکے جسم میں شدت کی تکلیف ہے۔ اسکے دل میں ضرور مصیبت سے نجات یا تکلیف دور ہونے کی خواہش رہیگی۔ اگر شدت غم و تکلیف سے اس پر نیند یا بے ہوشی طاری ہوگئی۔ اور اسی حالت میں خواہشات نے خواب کی صورت اختیار کی اور یہ خواب میں دیکھتا ہے کہ اسکا بیٹا (جسے قتل کا حکم ہو چکا ہے اور یہی مصیبت اس پر طاری ہے) آزاد ہو کر گھر آیا ہے۔ تو یقیناً خوشی کے جذبات خواب کی حالت میں اس پر طاری ہونگے۔ یا شدت درد کی تکلیف میں جب تعقل بے خبر ہو جائے۔ تو درد محسوس نہیں ہوتا۔ اسی حالت میں خواہش نفس کی کیفیت نے خواب کی صورت اختیار کی اور خواب میں دیکھتا ہے۔ کہ اسکا کٹا ہوا ہاتھ درست ہے اور وہ کام کر رہا ہے۔ تو یقیناً جذبات راحت اس پر طاری ہونگے۔ حالانکہ ابھی تک دونوں کیفیتیں اپنی حالت میں بدستور قائم ہیں۔ لیکن اسکے احساسات پر اثر طاری ہونے سے وہ خوشی اور آرام محسوس کرتا ہے۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ وجود کی عدم موجودگی میں جب اسکی روحانی کیفیت باقی ہے (اور اس میں اپنی ہیئت کے اعتبار سے ہر اثر (دیکھنا۔ سننا۔ محسوس کرنا) قبول کرنے کی صلاحیت باقی ہے) تو انسان موت کے بعد بھی لذتوں کا احساس کرسکے گا۔ لیکن ان کیفیتوں میں باعتبار وجودِ روحانی مادیت کا اثر نہ ہوگا بلکہ تمثیلی (مثل خواب) ہوگا جس سے اسکی روح مسرت

حاصل کریگی۔ یہی اثر ایک انسان کے لیے اسکے نفع ونقصان میں ایک اصل ہے۔ جو اصل انسان کو آرام و راحت پہنچاتی ہے۔ اسی طرح روح حیوانی پر عالم ناسوت میں جو اثر طاری ہوگا اس اثر سے وہ ضرور متاثر رہیگی۔ اور انسانی جسم کی مانند وہ لذت وغم سے متاثر ہوگی۔

عالم ناسوت کا یہ مقام دنیا اور عالم ملکوت کے درمیان ایک ماحول (غیر مادی) کی مانند ہے جس میں انسانی روح حیوانی نہ دنیا میں داخل ہو کر وجود حاصل کر سکتی ہے۔ نہ عالمِ ملکوت میں داخل ہو کر (جذب ہو کر) اپنی ہیئت ملکوتی بنا سکتی ہے۔ اسلئے اس عالم میں روح حیوانی کے اس مقام کو عالم برزخ سے تعبیر دیا جاتا ہے۔ برزخ کے معنی پردہ یا ایک عالم جو دو کیفیتوں (عالم اجسام مادی اور عالم ملکوت) کے درمیان حائل ہو۔

انسان کا مقصود چونکہ عرفانِ الٰہی میں ذاتِ الٰہی کا قرب (جذب) اور مشاہدہ ہوتا ہے۔ اور اسکے لیے انسان کو ایک مادی وجود حاصل ہوتا ہے۔ تا کہ انسان ارادۂ ازلی کے تحت (وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْاِنْسَ اِلَّا لِيَعْبُدُوْنِ ۔نہیں بنایا گیا اس ابتدائی زندگی کو انسانی ہیئت میں۔ مگر اس غرض کیلئے کہ یہ اس ہیئت میں آکر عبادت سے عرفان حاصل کرے) انسانی حالت میں قرب (جذب) الٰہی حاصل کرے۔ یہ مقصود چونکہ ازلی ہے۔ اسلئے ازلی ہونے کی حیثیت سے یہ مقصود ابدی حیثیت سے باقی رہیگا۔ خواہ موت طاری ہو۔ یا موت سے قبل۔ یا موت سے بعد۔ یہ حیثیتِ مقصود باقی رہیگی۔ اور موت کے بعد بھی اس مقصود کی تکمیل ہونی لازمی ہے۔ انسان کے ساتھ۔ راحت وعذاب کی جو کیفیتیں طاری ہوتی ہیں۔ وہ مقصودِ الٰہی (جذب وعرفان) کے مراحل ہوتے ہیں۔ جو انسان ـــــ انسانی حیثیت میں اپنے عمل سے حاصل کرتا ہے۔ ورنہ راحت وعذاب کوئی شے دیگر یا مقصود سے باہر کی چیز نہیں ـــــ موت کے بعد بھی یہی مراتب کا اثر انسان پر (جو اسنے اپنی مادی زندگی میں حاصل کیا ہے) برابر جاری رہیگا۔ اسی طرح ایک ولی چونکہ روح رحمانی کے ذریعہ عالم ملکوت میں مقام حاصل کر چکا ہے۔ ایک ولی مکمل قرب الٰہی حاصل کر چکا ہے۔ اور ایک ولی اکمل اپنے عرفان کی بدرجہ اتم تکمیل کر چکا ہے۔ یہ تکمیل روح رحمانی سے حاصل کی گئی ہے۔ اسلئے موت سے قبل یا موت سے بعد اسکا وہی

مقام ہوگا۔ جو اسے حاصل ہو چکا ہو اور موت واقع ہونے سے اسکے مراتب کے قیام میں کوئی فرق نہیں آئیگا۔ (کیونکہ ہم پہلے کہہ چکے ہیں کہ انسانی مقصود ہی اسکی ماقبل اور مابعد کی زندگی میں روحانی مراتب ہی ہے) اسی طرح ایک ذلیل انسان کی روح رحمانی کو بھی وہی درجہ حاصل ہوگا۔ جو اسے اسکی زندگی میں (ظلمت اور تکلیف) حاصل ہو چکے ہیں۔ واضح ہو کہ ارواح کی ابتدائی منزل خود انسان کے وجود میں اسکے قلب (یعنی روح حیوانی کے اتصال) سے ہی ہوتی ہے۔ اور اسکی آخری منزل وہی ہوگی جو اسے مراتب میں حاصل ہے گویا انسان کی روح رحمانی اور روح حیوانی میں بھی آپس میں ملاپ (جذب) ہوتا ہے۔ یعنی جو اثر روحِ رحمانی پر آتا ہے۔ قلب میں اسکا اثر روح حیوانی کے ذریعہ ہی حاصل ہوتا ہے۔ اسکا مطلب یہ ہے۔ کہ روح رحمانی اور روح حیوانی کا آپس میں اتصال ہو کر دونوں روحیں مراتبِ باطنی میں پے در پے (مسلسل) مدارج کی ہیئت میں آجاتی ہیں۔ مثلاً ہر شخص میں روح حیوانی ایک مستقل حالت میں ہوتی ہے۔ جب ایک شخص کی روح حیوانی کثیف ہو جاتی ہے۔ تو اسکا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ انسان کے نتیجۂ عمل میں (عالم باطن میں) اسے مراتب حاصل نہیں ہوتے۔ اس صورت میں انسان کی روح رحمانی انسان کی روح حیوانی کے قریب عالم ناسوت میں ہی رہتی ہے اور دونوں روحوں پر وہی تاثر آجاتا ہے۔ جو نتیجۂ عمل میں سفلی قوتوں کا ہوتا ہے۔ یعنی دونوں روحیں ظلمت میں رہتی ہیں۔ اسکے برعکس اگر انسان نے شریعت پر عمل کیا اور مراتب حاصل کئے تو اسکا نتیجہ یہ ہوتا ہے۔ کہ ایک طرف روح حیوانی لطیف ہو جاتی ہے۔ اتنی لطیف کہ یہ روح رحمانی سے بمنزلہ جذب کے متصل (قریب) ہو جاتی ہے۔ دوسری طرف روح رحمانی مراتب میں مدارج حاصل کرتی ہے۔ ہر مرتبہ میں جذب کے اعتبار سے ایک درجہ حاصل کرتی ہے۔ یہ درجہ اسکی وسعت کے اعتبار سے ہوتا ہے۔ گویا ایک طرف روح حیوانی سے اسکا اتصال (Connection) بھی ہے دوسری طرف ہر درجہ میں وسیع ہوتے ہوتے اتنی وسیع ہوتی ہے۔ کہ وسعت میں روح حیوانی سے لے کر اپنے آخری مرتبہ تک وسیع ہو جاتی ہے۔ یہی کیفیت موت کے بعد بھی بدستور جاری رہتی ہے ــــ اسکا مطلب یہ ہے۔ کہ موت کے بعد مراتب و مشاہدہ (مابین روح رحمانی و روح حیوانی) کا تاثر برابر جاری رہتا ہے

ــــ صرف عقل و شعور کے نہ ہونے کا فرق ہوتا ہے۔ کہ موت کے بعد انسانی علم وعمل ساقط ہو جاتا ہے۔ مگر کیفیتِ علم وعمل باقی رہتی ہے (جو مقصود ہوتا ہے) اسلئے موت کے بعد عمل ساقط ہونے سے انسان کی ترقی وعروج ایک حد پر آ کر رک جاتا ہے۔ لیکن روح رحمانی پر اپنے مراتب کا مشاہدہ (جذب) ہمیشہ طاری رہتا ہے۔ اور جہاں عالمِ برزخ میں انسان کا جسم (زمین میں) دفن ہوتا ہے۔ وہیں روح حیوانی کا مقام ہوتا ہے۔

موت کی کیفیت میں۔ انسان کے وجود کے تمام قویٰ (اعضاء) جو خون بناتے ہیں ان میں خون بنانے کی صلاحیت نہیں رہتی۔ یا نظام زندگی (دوران خون) قائم رکھنے کی صلاحیت نہیں رہتی۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ قلب کو خون حاصل نہیں ہوتا۔ جس وقت قلب (دل) کو خون کی مقدار حاصل نہیں ہوتی۔ تو نظامِ زندگی میں خلل واقع ہوتا ہے۔ ہر عضو دل کے ذریعہ خون نہ ملنے کے باعث اپنا فعل اپنی حرکت چھوڑ بیٹھتا ہے۔ اور دل بھی رفتہ رفتہ حرکت چھوڑ بیٹھتا ہے۔ اس آہستگی میں نقاہت کے باعث (جبکہ تعقل بھی کام چھوڑ دیتا ہے) انسان پر سکر (غنودگی) نیم بے ہوشی کی حالت طاری ہو جاتی ہے۔ تعقل کے بے ہوش ہونے کے ساتھ شعور کچھ عرصہ کام کرتا رہتا ہے۔ اور اس حالتِ بے ہوشی میں سکر کی حالت میں انسان پر اس عالم کا مشاہدہ (انکشاف) ہوتا ہے۔ جو کچھ اسے اپنے مراتب میں حاصل ہوتا ہے۔ لیکن اگر اس غنودگی میں قوتِ گویائی موجود ہو۔ اور ابھی تعقل میں بھی بار بار ہوش میں آنے کی صلاحیت باقی ہو۔ تو انسان کبھی ہوش کی حالت میں۔ کبھی نیم بے ہوشی کی حالت میں عالمِ باطن کے واقعات بتا بھی دیتا ہے۔ اور بعض (کمزوری کی) حالتوں میں بتا نہیں سکتا۔ البتہ اس کے بشرے سے ۔لذت اور تکلیف کے اثرات عالم لوگ محسوس کر لیتے ہیں۔ یہاں تک کہ موت قطعی اس پر طاری ہو جاتی ہے۔ چونکہ انسان میں۔ روح رحمانی اور روح حیوانی کے ذریعہ مشاہدہ باقی رہتا ہے۔ اسلئے موت کے بعد جب تعقل و شعور بے کار ہو جاتے ہیں۔ یہ مشاہدہ باقی رہتا ہے کیونکہ روح رحمانی جب ابتداء میں انسان میں کسی تعین زمانہ کے بغیر صرف انسانی وجود کی تکمیل پر اس سے منسلک ہو جاتی ہے۔ اسی طرح یہ روح موت کے بعد جسم سے علیٰحدہ نہیں ہوتی۔ بلکہ اسکا تعلق روح حیوانی کے ساتھ بدستور

رہتا ہے۔اور جہاں جسم قبر میں داخل ہوتا ہے۔روح حیوانی بھی اسکے ساتھ متعلق رہتی ہے۔اور روح حیوانی کے ذریعہ روح رحمانی بھی ساتھ ہی رہتی ہے۔اس حالت میں روح رحمانی اور روح حیوانی اپنی قوت (عقل کل) کے اعتبار سے ہر کیفیتِ مادی وغیر مادی کا مشاہدہ اسطرح کرتی ہے۔گویا انسان خود مشاہدہ کر رہا ہے۔اس حالت میں انسان اپنے گھر کی حالت اور عالم ناسوت کی کیفیت بھی مشاہدہ کرتا ہے۔مگر حرکت نہ ہونے کے باعث بیان نہیں کرسکتا ہے۔یہاں تک کہ اسے غسل وکفن دینے اور قبر میں دفن کرنے کا بھی مشاہدہ ہوتا ہے۔یہاں تک کہ اسکے لواحقین اسے دفن کر کے واپس ہوتے ہیں۔ اور یہ اپنے عزیزوں کے واپسی پر قدموں کی چاپ[1] بھی سُن لیتا ہے۔جب دنیا سے اسکا تعلق ٹوٹ جاتا ہے۔اور عالمِ برزخ میں اسکا قطعی مقام ہو جاتا ہے۔تو دنیا کے واقعات اسکے مشاہدہ سے ہٹ جاتے ہیں۔بالالفاظ دیگر بند ہو جاتے ہیں۔

قبر میں داخل ہونے سے اسکی زندگی کا نیا باب شروع ہوتا ہے۔اس عالم کے واقعات میں اسکی زندگی کا پہلا واقعہ یہ ہوتا ہے۔کہ نو وارد کی شخصیت پوچھی جاتی ہے۔جیسے کسی شخص کے ایک حکومت سے دوسری حکومت میں (نو وارد حیثیت سے) داخل ہونے پر عمال حکومت (کارندے یا پولیس) نو وارد سے پوچھتے ہیں۔کہ تو کس فرقہ سے تعلق رکھتا ہے؟ تیرا قانونِ اتباع کیا ہے؟ (یعنی کیا تو مجرم ہے؟ یا ایک قانون کا احترام کرنے والا ہے؟ کیا تو بادشاہ کا باغی ہے یا تابع ہے) تیرا بادشاہ کون ہے۔ تو کس جماعت سے تعلق رکھتا ہے۔تیرا لیڈر راہنما کون ہے؟۔وغیرہ ـــــ اسی طرح عالم ناسوت کے اس نو وارد سے پوچھا جاتا ہے۔مَنۡ دِیۡنُكَ تیرا دین کیا ہے؟ چونکہ اس عالم میں صرف اللہ تعالیٰ کی حکومت ہوتی ہے اور اسی کا قانون واجب الاحترام تصور ہوتا ہے۔اگر انسان دین الٰہی کا تابع ہوا ہو۔ تو روح رحمانی اور روح حیوانی (باعتبار اتصال) کے مشاہدات وعمل کے تاثرات کے تحت انسان کہتا ہے اَلۡاِسۡلَامُ دِیۡنِیۡ ۔میرا دین اللہ تعالیٰ کی شریعت کی پابندی ہے۔پھر پوچھا جاتا ہے۔مَنۡ رَّبُّكَ تیرا

---

[1] اگر یہ کیفیتیں غیر مادی (شعوری یا روحانی) کہلاتی ہیں۔

معبود (بادشاہ) کون ہے۔ تو کہتا ہے کہ رَبِّیَ اللّٰهُ ۔ اللہ میرا معبود ہے۔ اسکے بعد پوچھتے ہیں مَاتَقُوْلُ لِھٰذَا الرَّجُلُ کیا جب تیرا مقصود و نصب العین عرفان الٰہی تھا۔ تو کیا تو نے عالم ملکوت کا مقام حاصل کیا ہے۔ (جہاں سے عرفان کا باب شروع ہوتا ہے) اور حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کے اجلاسِ اول سے نور محمدیؐ ا (وجود محمدیؐ) اسے دکھاتے ہیں اگر اسے روح رحمانی کے ذریعہ مراتب حاصل ہوں۔ تو چونکہ یہ واقعہ روح رحمانی اور روح حیوانی سے ہی متعلق ہے۔ تو روح رحمانی (اگر چہ وہ عالم ناسوت کے مقام ہی حاصل کر چکی ہو۔ البتہ شرط یہ ہے کہ شریعت پر ـــــ قرأت قرآن اور درود شریف کا عامل ہو) اپنے مراتب۔ مشاہدہ ۲ کے ذریعہ پہچان لے گی۔ تو کہے گی ھٰذَا مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰهِ ـــــ جب عمال شریعت (ملائکہ) سوال سے جواب باصواب حاصل کریں گے تو اس پر عالم برزخ میں اس کے مراتب (جنت یا حاصل کردہ مقام) جو روحِ رحمانی کو حاصل ہیں کشادہ کر دیں گے۔ جسے انسان پہلی بار مشاہدہ کر کے مسرور ہوگا۔ اور ایک جذب و سرور کی کیفیت اس پر طاری ہوگی تو فرشتے اسی کیفیت میں چھوڑ کر کہیں گے نَـوْمُكَ نَـوْمَةُ الْعُرُوْسِ ۔ یعنی اس سرور میں تو مثل دلہن کے سو جا۔ اور انسان اپنی روح رحمانی کے ذریعہ اس کیفیت میں مستغرق رہے گا۔ اُدھر روح رحمانی انوار میں مصروف رہے گی۔ ادھر اسکی

ا چونکہ یہ مقام عالم ناسوت میں ہوتا ہے۔ جہاں اجلاس اول سے حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کی شبیہہ مقدس کی تجلی روحانی۔ روح رحمانی وحیوانی کے سامنے آجاتی ہے کیونکہ نور وسیع ہوتا ہے۔ عالم باطن میں قرب وبعد (دوری ونزدیکی) کی کوئی حد قائم نہیں ہوتی۔ اسلئے حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام اپنی وسعت کے اعتبار سے (تجلی کی صورت میں) سامنے نظر آتے ہیں۔ اس کیفیت کا تقاضا یہ ہے کہ اگر ایک ہی وقت میں ایک ہزار انسان دفن ہوں اور ایک ہی وقت میں یہ کیفیت سامنے کی جائے۔ تو اسکا مطلب یہ ہے۔ کہ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کا مقام وہی اجلاس اول ہے۔ مگر مشاہدہ کرنے والے اسی پرتو کو ایک ہی بار کسی حد وتعین کے بغیر مشاہدہ کریں گے۔

۲ پہلے بیان ہو چکا ہے۔ کہ مراتب پانا لازمی ہے۔ مشاہدہ صرف عارف کو ہوتا ہے۔ اسلئے غیر عارف کو بھی روح رحمانی کے ذریعہ واقعات کا مشاہدہ (علم) جذب کے تحت حاصل ہوتا ہے۔ اسلئے چونکہ یہ امر مقصود سے تعلق رکھتا ہے۔ اور ہر شخص مقصود میں یہ مراتب حاصل کر لیتا ہے۔ اسلئے یہ سوال غیر حقیقی نہیں ہوتا۔ بلکہ حقیقی ہوتا ہے۔

روح حیوانی اپنی قوتِ لطیف کے اعتبار سے گزشتہ بیان کی گئی کیفیات کو بھی حاصل کرتی رہے گی۔

اس کے برعکس ایک ایسے شخص کا بھی یہی حال ہوگا۔ جسکی روح رحمانی اور روح حیوانی نے مراتب میں ظلمت (اندھیرا) حاصل کیا ہوا سی طرح کیفیتیں محسوس کرے گا۔ اور قبر میں۔ جب نو وارد کی حیثیت سے پوچھا جائے گا مَنْ دِیْنُکَ تو چونکہ اسے دین (شریعت) سے مس نہ ہوگا۔ اور اسے علم حاصل نہ ہوا ہوگا۔ تو کہے گا ھَاہُ ھَاہُ لَا اَدْرِیْ۔ افسوس کہ میں کچھ نہیں جانتا۔ پھر سوال ہوگا مَنْ رَّبُّکَ۔ تیرا معبود کون ہے۔ کہے گا ھَاہُ ھَاہُ لَا اَدْرِیْ۔ افسوس کہ میں نہیں جانتا۔ اسکے بعد اول اجلاس محمدیؐ سے حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کی شبیہ سامنے ہوگی اور پوچھا جائیگا مَا تَقُوْلُ لِھٰذَا الرَّجُلُ تو کہے گا ھَاہُ ھَاہُ لَا اَدْرِیْ میں انہیں نہیں پہچانتا۔ کیونکہ یہ کیفیتیں اسکی روح رحمانی کو حاصل نہیں ہوئی ہوں گی۔ اسکے بعد وہی مقام اس پر کھولا جائے گا جو اسکی روح رحمانی کو حاصل ہوگا۔ اور انسان پر یہی خوفناک اور عذاب دہ کیفیت ہمیشہ طاری رہے گی۔

یہ واقعات قیامت تک برابر جاری رہیں گے۔ یہاں تک کہ قیامت [1] آ جائیگی۔ الغرض

---

[1] قیامت کے معنیٰ قیام سے ہیں۔ کھڑا ہونا۔ یا ٹھہراؤ ــــ یعنی جس دن تخلیقِ کائنات کا نظام اپنی آخری منزل پر پہنچ کر اپنے تخلیقی مواد کو ختم کردے گا ــــ اسکے بعد اس کائنات میں کوئی ایسے آثار نہ پائے جائیں گے جن میں کوئی وجود پیدا ہو سکتا ہو۔ یہ کیفیت (کائنات) اسوقت اپنی قوتیں ختم کر چکی ہوگی۔ سورج۔ چاند۔ ستاروں کی کشش میں شدت کے ساتھ کمی واقع ہوگی ــــ اور ایک دن ایسا ہوگا کہ کائنات کی ہر شے میں ایک دوسرے کی کشش سے علیحدگی کے باعث اس نظام کائنات میں برہمی پیدا ہو جائیگی اس برہمی کی ابتدا ایک اچانک حادثہ کی مانند ہوگی۔ اور اسکی کیفیت زلزلہ کی جیسی ہو گی۔ قرآن بھی قیامت کے متعلق کیفیتیں بتاتا ہے۔ اِذَا زُلْزِلَتِ الْاَرْضُ زِلْزَالَھَا ۙ وَاَخْرَجَتِ الْاَرْضُ اَثْقَالَھَا ۙ وَقَالَ الْاِنْسَانُ مَالَھَا ۚ (پارہ ۳۰ سورۃ ۹۹ آیت ۱ تا ۳) جب زمین کو بھونچال سے ہلایا جائیگا۔ یہ وہی کیفیت ہے۔ کہ جب کشش سے باہر ہو کر فضائے بسیط میں زمین مثل روئی کے گالے کے تیرنے لگے گی۔ اور اس حالت میں ریزہ ریزہ ہو کر فضا میں جذب ہو جائیگی۔ کَلَّآ اِذَا دُکَّتِ الْاَرْضُ دَکًّا دَکًّا ۙ (پارہ ۳۰ سورۃ ۸۹ آیت ۲۱) ہاں جب زمین (دھنکی ہوئی روئی کی طرح) ریزہ ریزہ ہو جائیگی ــــ اسکی تمام مخلوق کا بھی یہی حال ہوگا۔ (باقی حاشیہ اگلے صفحہ پر)

قرآن واقعات قیامت میں۔ دنیا کی تباہی۔ منظر قیامت۔ ماحولِ قیامت اور پاداشِ عمل اور انسان سے قیامت کا تعلق اور اسکی خصوصیّت واضح طور بیان کرتا ہے۔ اور یہ واقعات مدلل اور قوانین فطرۃ کے مطابق ثابت ہوتے ہیں۔ لیکن یہ یاد رکھنا ضروری ہے کہ یہ تمام واقعات متشابہات سے تعلق رکھتے ہیں۔ اسلئے یہ سب کیفیتیں شعوری ہونگی۔ قیامت متشابہات سے ہے۔ اسلئے اسکے واقعات متشابہات میں شمار ہونگے۔ قیامت واقع ہونے کے ساتھ چونکہ خصوصی طور انسان کا ہی تعلق ہوگا اسلئے۔ انسان

(بقیہ حاشیہ گزشتہ صفحہ) کہ وہ زمین کے ساتھ منتشر ہوکر فضا میں اسی طرح ریزہ ریزہ ہوکر جذب ہوجائیں گے۔ يَوْمَ يَكُونُ النَّاسُ كَالْفَرَاشِ الْمَبْثُوثِ ۙ وَتَكُونُ الْجِبَالُ كَالْعِهْنِ الْمَنْفُوشِ ۗ (پارہ ۳۰ سورۃ ۱۰۱ آیت ۴-۵) جس دن لوگ بکھرے ہوئے پتنگوں کی طرح ہوجائیں گے۔ اور پہاڑ دھنکی ہوئی روئی کے گالوں کی طرح ہو جائیں گے۔ اس زمین کے ساتھ چاند۔ تارے۔ سورج۔ آسمان کی بھی یہی کیفیت ہوجائیگی۔ اِذَا السَّمَآءُ انْفَطَرَتْ ۙ وَاِذَا الْكَوَاكِبُ انْتَثَرَتْ ۙ وَاِذَا الْبِحَارُ فُجِّرَتْ ۙ وَاِذَا الْقُبُوْرُ بُعْثِرَتْ ۙ (پارہ ۳۰ سورۃ ۸۲ آیت ۱-۴) جب آسمان پھٹ جائے۔ اور جب تارے جھڑ جائیں۔ اور جب دریا چیرے جائیں۔ اور جب قبریں اکھاڑی جائیں (آسمان پھٹ جانا۔ تارے جھڑ جانا۔ دریا چیرا جانا۔ قبریں اکھاڑنا۔ یہ استعاراتِ قرآنی ہیں۔ یعنی آسمانوں کا فنا ہونا۔ تاروں کا کشش سے علیحدہ ہوکر فضائے بسیط میں تیرنا۔ اور زمین کا ریزہ ریزہ ہوکر۔ اپنی تمام کیفیتوں پہاڑ۔ دریا۔ درخت۔ حیوان۔ انسان اور زمین کے بیچ کے جمادات وغیرہ سب کا باہر ہونا۔ اور قبروں میں سے مردوں کا زمین سے علیحدہ ہونا)۔ یہ تو اسکی ابتدائی کیفیت ہوگی۔ اسکے بعد اس زلزلہ اور فنا کی دوسری کیفیت پیدا ہوگی۔ يَسْـَٔلُ اَيَّانَ يَوْمُ الْقِيٰمَةِ ۗ پوچھتا ہے۔ قیامت کب ہوگی؟ فَاِذَا بَرِقَ الْبَصَرُ ۙ وَخَسَفَ الْقَمَرُ ۙ وَجُمِعَ الشَّمْسُ وَالْقَمَرُ ۙ (پارہ ۲۹ سورۃ ۷۵ آیت ۷-۹) پس جب آنکھیں خوف اور موت سے پتھرا جائیں گی۔ اور چاند بے نور ہوجائے گا۔ سورج اور چاند اکٹھے ہوجائیں گے (یہ کیفیت اس وقت کی ہے۔ کہ تمام۔ اجرام فلکی جو آسمان اول میں سمائے ہوئے ہیں برہم ہوکر مثل گرد وغبار ہوجائیں گے۔ یہ تمام سورج۔ اور تمام چاند اور تمام ستارے غبار کی صورت میں ایک ہی وجود میں آجائینگے اور جسقدر ان میں تپش اور روشنی ہے۔ یہ بھی سب ایک جا جمع ہوکر تمام قوتوں کا ایک مجموعہ ہوگی اسی مجموعہ میں زمین کے تمام اجزا بھی جذب ہوجائینگے) گویا یہ تمام قوتیں منتشر ہوکر پھر ایک ہی کیفیت میں آجائینگی۔ اور اس تمام ماحول کی مجموعی کیفیت میں۔ زمین اور چاند۔ ستاروں۔ سورج کی گرمی اور روشنی سے (باقی حاشیہ اگلے صفحہ پر)

کے جسم ۔روح حیوانی ۔اورروح رحمانی تینوں ہیئتوں کا وجود یہاں بھی قائم رہیگا۔

مِنْ اَیِّ شَیْءٍ خَلَقَہٗ ؕ مِنْ نُّطْفَۃٍ ط خَلَقَہٗ فَقَدَّرَہٗ ۙ ثُمَّ السَّبِیْلَ یَسَّرَہٗ ۙ ثُمَّ اَمَاتَہٗ فَاَقْبَرَہٗ ۙ ثُمَّ اِذَا شَآءَ اَنْشَرَہٗ ؕ (پارہ ۳۰ سورۃ ۸۰ آیت ۱۸ تا ۲۲) کس چیز سے (انسان کو) بنایا؟۔ ایک نُطفہ سے بنایا اسکو۔ پھر اسکے وجود کو سنوارا۔ پھر اسکے لیے اسکے مقصود کی راہیں آسان کر دیں۔ پھر اسکو موت دی اور زمین میں گاڑ دیا۔ پھر جب چاہے گا اسکے اجزا کو اکٹھا کر کے کھڑا کر دیگا۔

(بقیہ حاشیہ گزشتہ صفحہ) بھی زیادہ گرمی اور روشنی پیدا ہوگی یہی ماحول جہاں ایک نورانی مقام محسوس کیا جائے گا۔ میدان حشر کہلائے گا۔

یَوْمَ تَرْجُفُ الرَّاجِفَۃُ ۙ تَتْبَعُھَا الرَّادِفَۃُ ؕ قُلُوْبٌ یَّوْمَئِذٍ وَّاجِفَۃٌ ۙ اَبْصَارُھَا خَاشِعَۃٌ ۘ یَقُوْلُوْنَ ءَاِنَّا لَمَرْدُوْدُوْنَ فِی الْحَافِرَۃِ ؕ ءَاِذَا کُنَّا عِظَامًا نَّخِرَۃً ؕ قَالُوْا تِلْکَ اِذًا کَرَّۃٌ خَاسِرَۃٌ ۘ فَاِنَّمَا ھِیَ زَجْرَۃٌ وَّاحِدَۃٌ ۙ فَاِذَا ھُمْ بِالسَّاھِرَۃِ ؕ (پارہ ۳۰ سورۃ ۷۹ آیت ۶ تا ۱۴) جس دن لرز جائیگی۔ لرز جانے والی۔ اور اسکے پیچھے آئے دوسرا زلزلہ۔ اس دن کتنے ہی دل (خوفِ قیامت سے) دھڑکیں گے۔ ان کی آنکھیں جھکی ہوئی ہونگی (کافر) پوچھتے ہیں کیا ہم (مرنے کے بعد) پھیرے جائینگے۔ پہلی حالت (جسمانی) میں؟۔ کیا جب ہم ہڈیاں بوسیدہ ہو جائینگے (تب بھی اٹھائے جائینگے؟) کہا انہوں نے اگر ایسا ہوا۔ تو یہ بڑا نقصان دہ واقع ہوگا ـــــ وہ تو محض ایک ڈانٹ ہوگی! اور بس (یعنی یہ زلزلہ اور اچانک ہر شے کا ریزہ ریزہ ہونا تو قیامت کا فروعی نشان ہے) یکا یک وہ میدان میں آموجود ہوں گے۔ یہ میدان دراصل مادی نہ ہوگا کیونکہ مادی کیفیت کو فنا (حادثہ) ہو چکی ہوگی۔ اور یہ مادہ سے قبل عالم کی سی کیفیتِ نوری ہوگی (کیونکہ تمام معلول ایک ہی علت کی شکل میں رجوع کر کے پھر مادہ سے قبل کی غیر مادی ہیئت اختیار کرینگے) اور اس ماحول کی مخلوق جو ابتدا سے انتہا تک اس میں سمائی ہوئی رہی ہر شے ایک ماحول کی کیفیت میں تبدیل ہو جائے گی۔ سوائے انسان کے ـــــ کیونکہ قیامت کا واقع ہونا صرف انسان کے لیے ہی مخصوص ہے۔ ورنہ جہاں یہ تمام کائناتِ ارض وسمٰوٰت بنتی آئی تھی اور اگر اسکے بننے کا کچھ مقصد نہ ہوتا۔ تو لازمی طور ہر شے فنا ہو کر علت در علت اپنی علتوں میں بازگشت کرتے ہوئے ایک ہی علتِ واحد میں منتقل ہو جاتیں ـــــ مگر ایک علتِ واحد سے ایک مخصوص نظام ترتیب کے ساتھ ان علتوں کا پیدا ہونا۔ اور آخری علت زمین کا پیدا ہونا۔ اور پھر زمین کی علت میں باقی اجرام کے مقابلہ میں روئیدگی کا پیدا ہونا۔ اور اس روئیدگی میں ایک خصوصی (باقی حاشیہ اگلے صفحہ پر)

ان آیات میں قیامت میں اٹھنے کی کیفیت کی ابتدا نطفہ سے شروع کر کے انسان کی تخلیقی ترکیب۔ پھر اسکا مقصودِ عمل۔ اور پھر زندگی (دنیوی) کا انجام موت پھر نئی زندگی کا حاصل ہونا اس امر پر دلالت کرتا ہے کہ انسان کو اسکی ابتدائی زندگی کے بعد جسمانی وجود حاصل کرنا ہے۔ عمل کرنا ہے۔ مقصود پانا ہے۔ موت حاصل کرنی ہے۔ اور موت کے بعد (خواہ وہ شعوری حالت میں ہی ہو) ایک وجود حاصل ضرور کرنا ہے۔ جس وجود نے نتیجۂ عمل کے اثرات حاصل کرنے ہیں۔

سو گزشتہ بیان ہو چکا ہے۔ کہ انسان کے وجود میں سے۔ جسم۔ روح حیوانی۔ روح رحمانی

(بقیہ حاشیہ گزشتہ صفحہ) انسان کی تخلیقی ترکیب میں۔ حواس۔ تعقل۔ شعور۔ قلب۔ روح کا مجموعہ ہونا اس امر پر دلالت کرتا ہے۔ کہ اس تمام کائنات ارض وسمٰوٰت میں مقصودِ ازلی۔ ارادۂ ازلی میں صرف ایک انسان کی ہی تخلیق مخصوص تھی۔ گویا اگر انسان پیدا ہونا نہ مقصود ہوتا۔ تو ان کیفیتوں کے پیدا ہونے کی ضرورت نہ رہتی۔ اور انسان کی تخلیق کا کیا مقصد تھا؟ ــــ وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْاِنْسَ اِلَّا لِيَعْبُدُوْنِ ○ اسے۔ حواس وعقل دیکر دنیا پر حکمران بنایا۔ اور قلب۔ شعور وروح دیکر اسکے ذمہ عرفان مقرر کیا سو دنیا میں رہ کر اسنے اپنے مقصد کی تکمیل کرنی ہے۔ اور یہ کارگاہِ عالم (دنیا) اور اسکا وجود صرف اسی ارادۂ ازلی کی تکمیل کیلئے ایک آزمائش گاہ مقرر ہوئی۔ جب انسانی مقصد کی تکمیل ہوئی تو اب انسان کی کارکردگی کیلئے اسکے کردار کا فیصلہ اس کائنات کے خاتمہ پر ہی لازمی ہے۔ سو جب یہ عالمِ عمل ختم ہوگا۔ تو انسانی وجود کا اپنے نتائج پانے کیلئے برقرار رہنا لازمی ہے۔ سو قیامت میں جب ہر شے اپنے اصل وعلّت میں جذب ہوگی۔ تو اسوقت انسانی اعمال کا محاسبہ ہونے کی خاطر ایک عالم حشر قائم ہوگا جہاں صرف انسان کا وجود حاضر کیا جائیگا۔ اور جو کچھ جس انسان نے اپنے نصب العین کی تکمیل میں حاصل کیا ہے۔ وہی مراتب ہر انسان کو ملیں گے۔ کیونکہ اس کائنات میں ہر شے غیر ارادی طور پر اپنا کام جاری کیئے ہوئے ہے۔ ملائکہ۔ آسمان۔ سورج۔ چاند۔ ستارے۔ زمین۔ اور انکی تمام مخلوق بغیر کسی ذاتی ارادے کے برسرِ عمل ہے۔ اسلیئے غیر اختیاری حالت میں انکے ذمہ جب کوئی ذمہ داری نہیں تو انسان کے مقابلہ میں انکی کوئی حیثیت نہیں اور انکا نتیجہ بھی کوئی پیدا نہ ہوگا۔ جس کیفیت کے عمل میں کوئی مستقل اور پائیدار (قائم رہنے والا) نتیجہ حاصل نہیں۔ اسکا قائم رہنا بھی غیر ضروری ہے۔ ایک انسان ہی ہے۔ جسکا عمل اختیاری (ذمہ دارانہ) اور نتیجہ مستقل موجود ہے۔ اسلیئے قیامت میں اسے نتیجۂ عمل حاصل کرنے کیلئے ہستی (انسان) کا پیدا ہونا۔ اسکے ساتھ ہی انسان اور صرف انسان کا ان تمام کیفیتوں سے مفاد حاصل کرنا۔ مزید برآں (باقی حاشیہ اگلے صفحہ پر)

اپنے عمل کے مطابق مدارج میں قائم رہیں گے اور مقامِ برزخ میں قیامت تک رہیں گے۔ زمین کے فنا ہونے کے بعد جب یہ تمام اجرام فلکی کے ساتھ مل کر ایک نئی ہیئت اختیار کرے گی تو اسکی تمام مخلوق بھی اسی ہیئت میں آ جائیگی۔ اور انسانی اجزا میں بھی یہی کیفیت پیدا ہوگی۔ گویا صورت میں یہ ایک نئی ہیئت اختیار کریں گے۔ مگر اِنکی خصوصیت کے اعتبار سے یہ ایک جسم میں نمایاں ہوں گی۔ چونکہ روح حیوانی اور روح رحمانی ان اجسام کے متصل ہوں گی اسلئے ان کا از سرِ نو اتصال ہوگا۔ جس طرح روح

(بقیہ حاشیہ گزشتہ صفحہ) دوبارہ ایک وجود حاصل کرنا ہوگا۔ جو اپنے اعمال کے نتائج کا اچھا بُرا اثر قبول کرے۔ فَالْمُلْقِيٰتِ ذِكْرًا ۝ عُذْرًا اَوْنُذْرًا ۝ اِنَّمَا تُوْعَدُوْنَ لَوَاقِعٌ ۝ فَاِذَا النُّجُوْمُ طُمِسَتْ ۝ وَاِذَا السَّمَآءُ فُرِجَتْ ۝ وَاِذَاالْجِبَالُ نُسِفَتْ ۝ وَاِذَا الرُّسُلُ اُقِّتَتْ ۝ لِاَيِّ يَوْمٍ اُجِّلَتْ ۝ لِيَوْمِ الْفَصْلِ ۝ وَمَآ اَدْرٰكَ مَايَوْمُ الْفَصْلِ ۝ وَيْلٌ يَّوْمَئِذٍ لِّلْمُكَذِّبِيْنَ ۝ اَلَمْ نُهْلِكِ الْاَوَّلِيْنَ ۝ ثُمَّ نُتْبِعُهُمُ الْاٰخِرِيْنَ ۝ (پارہ ۲۹ سورۃ ۷۷ آیت ۵ تا ۱۷) پس ان فرشتوں کی قسم جو وحی (نصیحت) لاتے ہیں۔ تاکہ (انسان پر) حجت تمام ہو۔ یا ڈر سنایا جائے۔ تم سے جو وعدہ کیا گیا ہے۔ وہ ضرور واقع ہونے والا ہے۔ پس جب ستارے ماند پڑ جائینگے۔ اور آسمان پھٹ جائینگے۔ اور پہاڑ اڑا دیئے جائینگے۔ اور (قیامت میں) جب رسول وقت مقررہ پر جمع کئے جائینگے۔ کس دن کے واسطے! ان چیزوں میں تاخیر کی گئی؟ ایک فیصلہ کن دن (یوم الجزاء) کے لیے (جب ہر ایک چیز کا بدل دیا جائیگا) اور تمہیں اسکا ادراک ہے۔ کہ فیصلہ کنُ دن کیسا ہوگا؟ جس دن شریعت کو جھٹلانے والوں اور حقیقت سے انکار کرنے والوں کیلئے ایک درد ناک عذاب (ویل) ہوگا۔ کیا تم اس امر سے نہیں سمجھتے کہ ہم نے پہلے لوگوں کو جنہوں نے فساد و انحراف کیا۔ بھونچال اور شدید طوفان کے ذریعہ ہلاک کیا۔ اور ان کی جگہ دوسری آبادی تیار کی۔ اَلْحَآقَّةُ ۝ مَا الْحَآقَّةُ ۝ وَمَآ اَدْرٰكَ مَا الْحَآقَّةُ ۝ كَذَّبَتْ ثَمُوْدُ وَعَادٌ ۢ بِالْقَارِعَةِ ۝ فَاَمَّا ثَمُوْدُ فَاُهْلِكُوْا بِالطَّاغِيَةِ ۝ وَاَمَّا عَادٌ فَاُهْلِكُوْا بِرِيْحٍ صَرْصَرٍ عَاتِيَةٍ ۝ (پارہ ۲۹ سورۃ ۶۹ آیت ۱ تا ۶) وہ ثابت ہو کر رہنے والی۔ کیا ہے وہ ثابت ہو کر رہنے والی؟ اور آپکو کیا معلوم کیا ہے وہ ثابت ہو کر رہنے والی؟ (وہ ایک طوفانی دن ہے۔ جس دن لرزا دینے والا زلزلہ اور طوفان اُمڈ آئیگا اور اس شدت سے آئیگا کہ زمین و آسمان ہلاک ہونگے۔ اسکا اندازہ اس واقعہ سے ہوگا) قومِ ثمود ایک مہیب آواز سے ہلاک کر دیئے گئے۔ یعنی قدرت کاملہ سے ایک مہیب آواز پیدا ہوئی جس آواز کی شدت سے زمین دہل گئی بستیاں الٹ گئیں اور لوگ پریشان ہو گئے اور اس شدت کی تاب نہ لا کر ہلاک ہو گئے۔ قیامت کا (باقی حاشیہ اگلے صفحہ پر)

رحمانی اپنے مراتب سے لے کر روح حیوانی تک وسعت میں متصل ہوگی۔اسی طرح روح حیوانی بھی اس نئے وجود کے ساتھ چونکہ ابتدائی طور اتصال (قرب) رکھتی ہے۔یہ صورت اس کی برابر قائم ہوگی اور روح حیوانی اس نئے قسم کے جسم سے متصل ہوگی یہ جسم دراصل وہی جسم ہوگا جو دنیا میں مادی ہیئت میں واقع تھا۔اور دنیا کے فنا ہونے کے بعد اسی ہیئت غیر مادی میں منتقل ہوا جس ہیئت میں زمین سورج چاند تمام اجرام فلکی۔آسمان فنا ہو کر ایک ہیئت میں آ گئے بالفاظ دیگر اپنی علت کی ہیئت میں قائم ہوگا۔ اور یہ وجود مثل روح حیوانی کے ہوگا۔یہاں قدرت کاملہ کے ذریعہ اسے ایک مکمل جسم کی ہیئت حاصل

(بقیہ حاشیہ گزشتہ صفحہ) ادراک کرنے کیلئے یہ مہیب آواز (صور) اور زلزلہ سے ہلاکت کا واقع ہونا ایک مثال یا نمونہ ہے ــــ اور وہ جو قوم عاد تھی۔ان کو تیز و تند آندھی سے پتنگوں کی طرح اڑا کر ہلاک کر دیا۔یہ سب کیفیتیں قیامت کی ہیں۔اور انکا تعلق صرف انسان سے ہے۔(یہ ایک فطری نظام ہے۔کہ دنیا پر ہوا چلتی ہے۔خوش آئند اور فرحت بخش ہوتی ہے۔جب یہ ہوا شدت اختیار کرتی ہے۔تو ہلاکت کا باعث بن جاتی ہے۔اور جب قدرت کاملہ سے۔طوفان اور زلزلہ واقع ہو تو پھر ہلاکت یقینی ہے۔اور یہ بھی یقینی ہے۔کہ یہ دونوں کیفیتیں دنیا پر واقع ہوتی رہتی ہیں۔جب ان میں شدت واقع ہوگی تو لازمی طور نظام کائنات درہم برہم ہو جائے گا۔اَیَحۡسَبُ الۡاِنۡسَانُ اَلَّنۡ نَّجۡمَعَ عِظَامَهٗ ؕ بَلٰی قٰدِرِیۡنَ عَلٰۤی اَنۡ نُّسَوِّیَ بَنَانَهٗ ۝ (پارہ ۲۹ سورۃ ۷۵ آیت ۳-۴) کیا انسان یہ خیال کرتا ہے۔کہ ہم اس کی ہڈیاں جمع نہ کرینگے؟ نہیں نہیں۔بلکہ ہم اس بات پر بھی قادر ہیں کہ اس کے پور پور درست کریں)

یٰۤاَیُّهَا الۡاِنۡسَانُ اِنَّکَ کَادِحٌ اِلٰی رَبِّکَ کَدۡحًا فَمُلٰقِیۡهِ ۚ۝ فَاَمَّا مَنۡ اُوۡتِیَ کِتٰبَهٗ بِیَمِیۡنِهٖ ۙ۝ فَسَوۡفَ یُحَاسَبُ حِسَابًا یَّسِیۡرًا ۙ۝ وَّ یَنۡقَلِبُ اِلٰۤی اَهۡلِهٖ مَسۡرُوۡرًا ؕ۝ وَ اَمَّا مَنۡ اُوۡتِیَ کِتٰبَهٗ وَرَآءَ ظَهۡرِهٖ ۙ۝ فَسَوۡفَ یَدۡعُوۡا ثُبُوۡرًا ۙ۝ وَّ یَصۡلٰی سَعِیۡرًا ؕ (پارہ ۳۰ سورۃ ۸۴ آیت ۶ تا ۱۲) اے انسان تحقیق تو مجسم محنت ہے۔اپنے رب کی طرف محنت کرنے کیلئے۔پس تو نے ہر حال میں اس سے ملاقی ہونا ہے (ملنا ہے) پس ہر انسان کے دنیوی عمل میں جس نے اپنے مقصود کی تکمیل کی۔شریعت کی پابندی کی اسے قیامت کے دن اپنا نامۂ اعمال دائیں ہاتھ میں ملے گا۔یعنی وہ اپنے مقصد کو پا لیگا۔پس اسے حساب دینے میں آسانی ہوگی۔اور اپنے لوگوں سے خوشی خوشی جا ملے گا۔اور جنہیں اپنا اعمال نامہ پیٹھ سے دیا جائیگا۔یعنی اسکا اعمال نامہ سیاہ ہوگا ــــ اسکا نتیجہ عمل ظلمت ہی ظلمت ہوگا۔پس وہ اس وحشت ناک تصور سے چاہے گا کہ اسے موت آ جائے۔تا کہ اس تکلیف دہ تصور کا احساس نہ رہے۔اور اسے جہنم واصل کیا جائیگا۔

ہو جائے گی۔ گویا۔ ان تینوں ہیئتوں کا ایک ترکیبی اتصال ہوگا۔ اسی ہیئت میں قیامت کے دن یہ وجود ظاہر ہوں گے۔ اور ان پر وہی کیفیت طاری ہوگی۔ جو انکے اعمال کے نتائج میں دنیا میں ان پر وارد ہو چکی ہوں گی۔ ایک وہ شخص جس نے شریعت کی پابندی نہیں کی۔ اپنے مقصود کو نہیں پایا۔ بلکہ اپنے جسم کو بھی سالم نہ رکھا ــــ روح حیوانی میں بھی سالمیت نہ آئی۔ روح رحمانی کو بھی مراتب نہ حاصل ہوئے۔ یہ شخص اس نئے قوی ماحول سے اسقدر متاثر ہوگا جیسے ایک مادی انسان کو یکلخت سورج میں ڈالا جائے۔ اس پر موت بھی طاری نہ ہو۔ اور سورج کی تپش سے ایک دردناک عذاب محسوس کرے۔ اسی طرح یہ شخص قیامت کے دن تزکیہ نہ ہونے کے باعث ایک قوی ماحول میں شدت کی تکلیف محسوس کریگا۔ اور روح رحمانی کے ذریعہ جو مراتب اسے حاصل ہوں گے وہ جہنم اور دوزخ کی کیفیت میں اس پر اثر انداز ہوں گے۔ اسکے برعکس جس شخص نے شریعت پر عمل کیا اور مراتب پائے وہ اپنی جسمانی۔ روح حیوانی کی ہیئت کے مطابق قیامت کے ماحول سے متاثر ہوگا۔ اور اگر روح رحمانی کو ملکوتی مراتب حاصل ہو چکے ہوں گے تو اسے یہ کیفیتیں جنت کی صورت میں محسوس ہوں گی اور وہ اسی میں داخل ہو کر قیامت کی شدت سے محفوظ ہو جائیگا۔ یعنی اسکی جسمانی کیفیت روح حیوانی میں جذب ہوگی اور روح حیوانی روح رحمانی میں جذب ہو کر اپنے مرتبہ میں ہمیشہ کیلئے مقام کریں گے۔ اسی طرح وہ شخص جو ولی ہوگا روح رحمانی کے اپنے مراتب میں پہلے سے قائم ہوگا۔ صرف جسم لطیف اور روح حیوانی پر قیامت کے تاثرات نمایاں ہوں گے اور فیصلہ کن (یَوْمُ الْفَصْلِ) وقت پر ایک فیصلہ حاصل کر کے اپنے ان وجودوں کے ساتھ روح رحمانی میں جذب ہو کر دائمی مراتب میں جذب ہو کر بقا حاصل کریگا۔ اسی طرح شہید کی بھی یہی حالت ہوگی۔ کہ اسکا جسم۔ روح حیوانی۔ روح رحمانی میں جذب ہو چکے ہوں گے بَلْ اَحْيَآءٌ وَّلٰكِنْ لَّا تَشْعُرُوْنَ۔ یہ براہ راست قیامت کے ماحول سے تاثر لئے بغیر اپنے حاصل کردہ مراتب میں برابر قائم رہیں گے۔ نہ ان پر قیامت کا محاسبہ ہوگا۔ نہ ان پر قیامت کی تپش کا کوئی اثر ہوگا۔ کیونکہ انکا وجود اس تپش سے زیادہ (اپنے جذب مراتب کے اعتبار سے) قوی ہوگا۔ ان تمام گزشتہ دلائل سے ثابت ہوتا ہے۔ کہ موت کے بعد انسان کی جسمانی۔ روح

حیوانی اور روح رحمانی کی کیفیت اپنی لطافت کے اعتبار سے شعوری ہوگی۔

ان تمام گزشتہ آیات قرآنی سے ظاہر ہوتا ہے۔ کہ قرآن میں ماسوائے امر و نہی۔ ٹھوس احکامِ شریعت (نماز۔ روزہ۔ حج وغیرہ) کے اس میں دو قسم کا علم ہے ایک مادی علم جس سے مادی اشیاء و کیفیات کی تحقیقات کا علم۔ کائنات کی ہر شے کی اصل و فرع۔ اسکی وجودی کیفیتیں (خواہ وہ مادی ہوں یا لطیف[1]) انکی تحقیقات کے ذرائع۔ حواس و تعقل۔ اور دیگر مادی (دور بینی اور تحقیقاتی) ذرائع سے انکے علم کے حصول کا مواد بھی موجود ہے۔ اسکے علاوہ متشابہات ایک لطیف روحانی کائنات کی تمام کیفیات (اسرار الٰہی۔ یعنی آسمان ملائکہ اور دیگر اسرار الٰہی) اور انکے علم کے حصول (قلبی فقہ۔ روح۔ شعور) کے ذرائع بھی پائے جاتے ہیں۔ یہ سب آیات صرف انسانی علم و عمل کے لیے بیان کی گئی ہیں۔ تاکہ انسان ان آیاتِ قرآنی سے اپنے نصب العین اور مقصود (دنیوی اور روحانی عروج) کو حاصل کرنے میں آسانی پا سکے۔ جہاں تک مادی اشیاء کا تعلق ہے۔ یہ کیفیتیں انسان میں صرف مقصود حاصل کرنے کیلئے ایک تحریک کا کام دیتی ہیں۔ اور اسکے عرفان کیلئے ایک ابتدائی منزل کی صورت میں راہ ہموار کرتی ہیں۔ لیکن انسان نے اس راہ سے گذر کر عالم باطن (ماورائے ادراکِ عالم) کی سیر کرنی ہے۔ جہاں صراط اللہ کے حقیقی نشان پائے جاتے ہیں۔ جسکے لیے انسان کی روح رحمانی قلب اور شعور ہی کام کر سکتے ہیں اور شعوری حالت میں انسان کی تمام ہیئتوں کی سردار روح رحمانی ہے۔ جسکا وجود ازل سے ابد تک برابر قائم رہیگا۔ یہی روح انسان کے تمام مراتب اور اعلےٰ مقاماتِ ذات الٰہی کے عرفان میں علم و عرفان حاصل کرنے کے لیے ایک خصوصی روحانی وجود ہوتا ہے۔ چنانچہ ایک ولی اکمل کو اسی روحِ رحمانی کی عظمت اور انتہائی عروج حاصل ہونے کی خصوصیت حاصل ہوتی ہے۔ اور ولی اکمل بجائے خود ایک بشر کی حیثیت سے ہوتا ہے۔ لیکن اسکی بیعت۔ اسکا تصور اور اس سے حب کرنا دراصل اسی روح رحمانی کی عظمت کی وجہ سے ہوتا ہے۔ کہ ولی اکمل کو

---

[1] اس میں مٹی کے ایک ذرہ سے لیکر ایٹم و ایتھر اور ایتھر سے ماسویٰ لطیف کیفیتیں پائی جاتی ہیں۔

روحانی عرفان حاصل ہوتا ہے۔ اوراسی عرفان میں صراط اللہ کا جذب روحِ رحمانی کو حاصل ہوتا ہے اوراسی روح رحمانی کا علم قلب کے ذریعہ ولی اکمل کے حافظہ میں جمع رہتا ہے۔ جس سے طالبِ حقیقت علم حاصل کرتا ہے۔ باالفاظ دیگر ولی اکمل جسمانی حیثیت سے صرف علم سکھاتا ہے۔ یَتْلُوْا عَلَیْهِمْ اٰیٰتِهٖ وَیُزَکِّیْهِمْ وَیُعَلِّمُهُمُ الْکِتٰبَ وَالْحِکْمَةَ۔ اسکے لیے صرف انسانی حیثیت سے طالب حقیقت اس سے علم کی غرض سے رجوع کرتا ہے۔ اور جہاں۔ حُب۔ بیعت۔ تصور کا تعلق ہے۔ وہاں ولی اکمل سے اسکی روحانی ہیّت کے ساتھ رجوع کیا جاتا ہے۔ ولی اکمل ظاہری طور شریعت وطریقت کا علم بتاتا ہے اور باطنی طور اسکی روح حُب اور بیعت کے عوض طالب کی روح کو اپنے میں جذب کر کے عرفان کراتی ہے۔ اسی نوعیت کا تصور ولی اکمل کیلئے کیا جاتا ہے۔ کہ طالب اسکی روح کے قریب ہوکر اپنی روح کو اس میں جذب کر لے۔ اور جس کیفیت میں یہ روح رحمانی ہوتی ہے۔ اسی ہیّت کا تصور ولی اکمل کی تشبیہی [1] صورت میں مشاہدہ میں آتا ہے ___ اور جو کچھ ولی کی روح رحمانی کو جذب و عرفان میں علم حاصل ہو۔ ظاہر میں اسکی تشریح ولی اکمل کرتا ہے۔ المختصر ولی اکمل اپنے وجود کے مادی اور روحانی مرکب کے ساتھ ہر خاصیت سے طالب حقیقی کو عرفان حاصل کراتا ہے۔

اب دیکھنا یہ ہے کہ ولی اکمل کے پاس شریعت وطریقت میں سے کیا علم حاصل ہوتا ہے۔ جس سے وہ ایک طالب کو عرفانِ الٰہی کراتا ہے؟___ فی زمانہ جبکہ اسلام میں باوجود علم الٰہی کے محفوظ ہونے کے بھی، نہ خلیفۂ اسلام کا وجود اسکی جامع صفات [2] کے ساتھ باقی ہے۔ نہ عالم شریعت کا وجود سنتِ نبوی [3] کے تحت باقی ہے۔ نہ ہی ولی اکمل اور حقیقی علم کا نشان پایا جاتا ہے۔ تاکہ انسان آسانی

---

[1] تمثیلی صورت میں۔ یہاں نور اور روح رحمانی خود ایک حقیقی وجود ہے۔ اور مادی وجود بمنزلہ تمثیلی وجود کے تصور کیا جاتا ہے۔

[2] جامع صفات سے مراد یہ ہے۔ کہ اسلام میں ایک خلیفہ کا مقام شریعت وطریقت کی تمام خوبیوں کے ساتھ قائم ہوتا ہے۔ جو انسان کو علم القرآن۔ علم طریقت۔ علم معاشرت کی تمام خصوصیات سے آراستہ کرے۔

[3] یَتْلُوْا عَلَیْهِمْ اٰیٰتِهٖ وَیُزَکِّیْهِمْ وَیُعَلِّمُهُمُ الْکِتٰبَ وَالْحِکْمَةَ کی خوبیوں کے ساتھ۔

سے ایک شرعی ماحول پا سکے اور عالم شریعت سے ایک اصل قانون کا سراغ مل سکے۔ اور ولی اکمل سے عرفان الٰہی کی صحیح راہ اور علم حاصل کر سکے۔ اسلئے ضروری ہے کہ علم۔ عالم۔ اور مقصد حقیقی کے حصول کے آسان اور مختصر نشانات کو واضح کیا جائے۔ تا کہ یہ اندازہ ہو سکے کہ شریعت وطریقت کیلئے کس علم کی ضرورت ہے۔ اور اسکے لیے ایک ولی اکمل کی خصوصیات اور اسکے ظاہری نشان کیا ہیں؟

گزشتہ ابواب میں شریعت وطریقت۔ علم۔ عالم۔ بیعت۔ تصور۔ مشاہدہ اور حقیقت و معرفت۔ ان تمام کیفیات کو وضاحت سے بیان کیا گیا ہے ــــ اب مختصراً طریقت کے سلسلہ میں چند ضروری باتیں بیان کی جاتی ہیں۔ ان کیفیتوں کو گزشتہ بیان کی گئی کیفیتوں کے مطابق ہی دہرایا جائیگا۔

(۱) علم کی کیفیت (۲) ولی اکمل (۳) بیعت کی کیفیت (۴) تصور (۵) اور تزکیہ کی جگہ مشاہدہ۔

چنانچہ علم کی کیفیت میں بتایا گیا ہے۔ کہ جس وقت ایک علم الٰہی تین مختلف کیفیتوں (خلافت۔ شریعت۔ طریقت) میں بٹ کر ہر کیفیت ایک علٰیحدہ چیز بن کر رہ گئی۔ اور خلافت ملوکیت (شہنشاہیت) میں بدل گئی۔ عالمِ شریعت اپنی اغراض، وخود پرستی کی بناء پر عالمِ سوء بن گیا۔ اور ولی اکمل کی جگہ نقلی درویش نے لے لی۔ تو علم الٰہی کا حاصل ہونا انسان کیلئے دشوار ہو گیا۔ یعنی علم الٰہی کی اصلی ہیئت کا ملنا مشکل ہو گیا۔ ایسے وقت میں فطری طور علم کی تجدید ہوئی اور زمانہ میں ایسے اولیا کا وجود ظاہر ہوا جنہوں نے حقیقی علم کو ظاہر کر کے دوبارہ عرفان الٰہی کی راہیں نمایاں کر دیں۔ انہوں نے اپنے علم و مجاہدہ سے ایسے وقت میں حقیقی عرفان اور عظمت حاصل کی۔ چنانچہ انکے بعد انہیں اولیا کے نام سے انکے پیروؤں (خلفا) کی جماعت منسوب ہونے لگی جن میں چار مشہور سلسلے پائے جاتے ہیں۔

(۱) سلسلہ قادریہ: حضرت محی الدین شیخ عبدالقادر جیلانیؒ سے منسوب ہے۔ قادر سے قادری بنا۔ چونکہ انہوں نے علم شریعت اور طریقت کو اپنی پوری شان سے ظاہر کر دیا اسلئے یہ سلسلہ قابلِ تقلید سمجھا گیا۔ یہ سلسلہ آج تک چلا آتا ہے۔

(۲) سلسلہ چشتیہ: یہ سلسلہ حضرت ابو اسحٰق شامی چشتیؒ سے منسوب ہے۔ چشتی سے چشتیہ بنا۔ برصغیر

میں حضرت معین الدین چشتی اجمیریؒ نے اس سلسلے کی ترویج کی۔ اور لوگوں کو حقیقی علم وعرفان سے شناسا کرایا اسلئے یہ سلسلہ بھی قابلِ تقلید سمجھا گیا۔

(۳) سلسلہ نقشبندیہ: یہ سلسلہ حضرت بہاؤ الدینؒ (بخاری) سے منسوب ہے۔ انہوں نے علم طریقت کو اپنی تمام کمالیت کے ساتھ ظاہر کر دیا اسلئے (تصور ومشاہدہ کی کمالیت کے تحت) انہیں نقشبند کہا گیا اور یہ سلسلہ اسی صفت نقشبندی سے منسوب ہے۔ اور نقشبند سے نقشبندی بنا۔ اسلئے یہ سلسلہ بھی قابلِ تقلید سمجھا گیا۔

(۴) سلسلہ سہروردیہ: یہ سلسلہ حضرت شہاب الدین سہروردیؒ سے منسوب ہے۔ انہوں نے علم شریعت وطریقت کی پوری تحقیقات بالعمل کی اور عرفان کے لیے ایک صحیح راہ ظاہر کر دی۔ اسلئے یہ سلسلہ بھی قابلِ عمل سمجھا گیا۔

(۵) اسکے علاوہ اور بھی کئی اولیا پائے گئے جو زمانہ کی اکمل ہستیاں تھیں اور مشہور زمانہ ہستیاں تسلیم کی گئیں۔ اسلئے اس علم کے ساتھ ایک ایک سلسلہ جاری ہوا۔ لیکن یہ سلسلے دراصل سلسلہ قادریہ کی جز ہیں۔ وہ اسلئے کہ زمانہ کی رفتار کے ساتھ طریقت کے علم کے ساتھ وہی سلوک ہوا جو پیشتر ہوتا رہا۔ اور اسی طرح ہر زمانہ میں ایک اکمل ولی کا وجود پیدا ہوتا رہا اسکے بعد اسکے پیروؤں کی جماعت اور وقت کے ولی کی نسبت سے ایک ایک سلسلہ قائم ہوتا رہا۔

(۶) سلسلہ اویسیہ: یہ سلسلہ حضرت خواجہ اویس قرنی رضی اللہ عنہ سے منسوب ہے۔ اویس سے اویسی بنا۔۔۔ یہ سلسلہ ابتدائی ہے۔ اور ابتداء سے علیٰ حالہ چلا آتا ہے۔ باقی چار سلسلوں کا شجرہ حضرت علیؓ اور حضرت ابوبکر صدیقؓ سے جاملتا ہے۔ لیکن سلسلہ اویسیہ کا شجرہ براہ راست حضرت خوجہ اویس قرنیؓ سے جا ملتا ہے۔ حضرت خواجہ اویس قرنیؓ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کے زمانہ مقدس میں موجود تھے۔ لیکن حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کی صحبت حاصل نہ ہو سکی۔۔۔ یہ ضروری ہے۔ کہ جب تک حضورؐ سے وحی خفی سے طریقت کے ارشاد حاصل نہ ہوں۔ تب تک بغیر ارشاد نبویؐ کے عمل کے ولی بن نہیں سکتا۔ لیکن احادیث صحیحہ سے یہ

امر ثابت ہے کہ حضرت خواجہ اویس قرنیؒ اپنے علم وعرفان میں یکتائے زمانہ تھے۔ تو اسکا مطلب یہ ہوا۔ کہ حضرت اویسؓ کو باطنی طور حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام سے فیض وارشاد حاصل تھا۔ اور آپکا علم وعرفان بھی کسی پر ظاہر نہ ہوا بلکہ مخفی رہا۔ اور آپکے بعد آپکا سلسلہ اسی مخفی طریق پر ہی جاری رہا۔ چنانچہ ہر زمانہ میں اس سلسلہ کی اصلیت کسی کو معلوم نہ ہو سکی۔ اس سلسلہ سے منسوب کئی فرقے پائے جاتے ہیں۔ لیکن ان میں یہ تخصیص نہیں ہو سکتی کہ ان میں حقیقی سلسلہ کون سا ہے (اس کی مفصل تشریح آئندہ کی جائیگی)۔

جہاں تک علم الٰہی کا تعلق ہے۔ وہ ہر سلسلہ کیلئے وہی ہونا چاہیے جو قرآن نے اپنی شریعت میں پیش کیا ہے۔ صرف ایک ولی کی اختراع اس علم شریعت میں زائد معلوم ہوتی ہے۔ لیکن یہ اختراع بھی علم طریقت کی جز ہے۔ صرف زمانہ کی حالت اور انسانی وجودوں کی کیفیت کے اختلاف کی وجہ سے ان اختراعات میں بیگانگی محسوس ہوتی ہے۔ طریق عرفان کیلئے سب سے پہلی چیز احکام شریعت نماز۔ روزہ۔ حج۔ زکوٰۃ لازمی احکام ہیں۔ بغیر انکے علم طریقت حاصل نہیں ہو سکتا (اس کی تشریح گزشتہ ہو چکی ہے) اسکے بعد زائد عبادت میں۔ قرأت قرآن۔ قیام لیل ہیں۔ انہیں احکام میں اختراع کی گئی ہے۔

یعنی جسقدر طالب کے وجود میں تزکیہ ومجاہدہ کرنے کی سہل طریقہ پر استطاعت ہو۔ اسی قدر قرأت اور قیام لیل میں سے عمل بتایا جائے۔ اسکا طریق یہ ہے۔ جو ہر سلسلہ میں رائج ہے۔ قرآنی آیات کے وظائف بغیر تعداد یا تعداد کے تعین کے ساتھ۔ رات کے کسی حصہ میں جتنی قیام لیل کیلئے انسان میں مستعدی پائی جائے بتانا۔ ورنہ دن رات کے کسی حصہ میں یکسوئی کے ساتھ مراقب ہونا۔ تصور کرنا ـــــ قرأت کو تصور میں لانا۔ یا شیخ کو تصور میں لانا۔ اسکے علاوہ تزکیہ نفس کیلئے ہر اس شے سے پرہیز کرنا جو شہوانی قوتوں میں غلبہ پیدا کرے۔ روزہ (نفلی) رکھنا۔ یہی طریق ہر سلسلہ میں پایا جاتا ہے۔ فرق اتنا ہے کہ کسی سلسلہ میں قرأت میں ایک آیت یا سورۃ ہے۔ کسی میں کوئی دوسری آیت یا سورۃ ہے۔ کسی میں تعداد میں کم کسی میں زیادہ پائی جاتی ہے۔

اسکے علاوہ بعض سلسلوں میں ذکر لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ یا اَللّٰہ ھُوْ یا حروف کلام الٰہی کے تصورات قائم کرنا ہے یہ بھی اولیا کی ذاتی اختراع ہے۔ اسکے علاوہ حبس نفس میں لَآ اِلٰـہَ اِلَّا اللّٰہُ کا سانس بند کر

کے قلب سے پڑھنا۔ یہ بھی تصورات میں شامل ہے۔ اوران اختراعوں کی کئی قسمیں ہیں۔ مثلاً ذکر میں یک ضرب۔ دوضرب۔ سہ ضرب۔ چہار ضرب۔ ذکر ارہ۔ ذکر ہفت در بند۔ ذکر نفی اثبات وغیرہ ۔۔۔ اسی طرح حبس نفس میں بھی سانس بند کر کے پڑھنا اور سانس کے بند کرنے پر اسقدر قدرت حاصل کرنا۔ کہ طویل مدت تک چوبیس گھنٹے سے زیادہ مدت بلکہ اپنے اختیار سے جب چاہے سانس چھوڑے اور اس عرصہ میں زندگی کے آثار میں کوئی خلل واقع نہ ہو بلکہ روحانی قوت تیز تر ہو جائے یہ طریق زیادہ تر طریق قادریہ میں استعمال ہوتا ہے ــــ چشتیہ۔ نقشبندیہ میں۔ خالص قرأتِ قرآن۔ اور مراقبہ (تصور) کیا جاتا ہے۔ اور اسکے ساتھ درود شریف کا بھی خصوصی طور ورد لازمی رکھا گیا ہے۔ ان تمام طریقوں سے ایک طالب کو مشاہدہ و مراتب حاصل ہوتے ہیں۔

واضح ہو۔ کہ یہ علم کی ایک خصوصی حیثیت ہے۔ اور علم تحریر میں بھی موجود ہوتا ہے۔ اگر کوئی شخص بغیر عالم کی راہنمائی کے اس علم کو عمل میں لائے۔ تو اس پر بھی اسکے نتائج وارد ہوتے ہیں۔ مگر یہ نتائج اسی حد تک پائے جاسکتے ہیں جہاں تک روح حیوانی کی وسعت ہے۔ کیونکہ اس علم میں بغیر راہنما کے ایک ولی اکمل کی روح رحمانی کا جذب حاصل نہیں ہوتا ــــ جو اسے روح رحمانی کے ذریعہ عالم ملکوت میں داخل کرے۔ اسلیئے ضروری ہے۔ کہ علم کے ساتھ ایک ولی اکمل کی راہنمائی بھی حاصل ہو۔ ورنہ یہ طریق علم و مشاہدہ۔ استدراج (حیوانی قوت) میں شمار ہوگا۔ اور ایک راہنما حاصل ہونے کیلیئے بھی یہ ضروری ہے۔ کہ راہنما ولی اکمل ہی ہو۔ اگر ولی اکمل حاصل نہ ہو۔ بجائے اسکے ولی مکمل حاصل ہو تو بھی یہ علم اگر چہ ایک شریعت و حقیقت کی حد میں داخل ہوتا ہے۔ مگر اسکی تکمیل ادھوری رہتی ہے جب تک ولی اکمل کے علم اور نور سے اکتساب نہ کیا جائے۔ نہ ایک طالب اپنی جستجو میں حق بجانب سمجھا جائیگا۔ نہ اسے کلی طور عرفان حاصل ہونے کی سند حاصل ہوسکتی ہے۔

اسلیئے ضروری ہے۔ کہ طریقت کیلیئے ایک ولی اکمل کی راہنمائی حاصل کی جائے۔ ولی اکمل وہ ہوتا ہے جسے بدرجہ اکمل عرفان الٰہی حاصل ہو اور ولی بنانے کی صلاحیت بھی اس میں پائی جائے۔

بظاہر اسکے اعمال شریعت کے احکام کے عین مطابق ہوں۔ علم کلی طور حاصل ہو۔ نماز۔ روزہ۔ زکوٰۃ کا عامل ہو۔ بعض لوگ ایسے بھی ہوتے ہیں جو شریعت کے پابند ہوتے ہیں۔ لیکن انکی پابندی ان عام لوگوں کے مانند ہوتی ہے۔ جو شریعتِ ظاہری (ماسوٰے طریقت) کے عامل ہوتے ہیں۔ اسکے ساتھ لوگ قرآت قرآن اور قیام لیل کے بھی حامل ہوتے ہیں۔ ایسے لوگوں پر ولی ہونے کا شبہ ہو جاتا ہے۔ لیکن قرأت و قیام لیل اسوقت تک طریقت میں شامل نہیں کئے جاتے جب تک ایک شخص کو ایک ولی اکمل کی طرف سے ولایت کی سند حاصل نہ ہو۔ وہ سند کیا ہے۔ کہ ایسے شخص کے مریدوں میں کم از کم دس فیصدی ایسے لوگ ہونے چاہیں جو یہ دعویٰ کریں کہ ہمیں ذاتِ الٰہی کا مشاہدہ حاصل ہے۔ اور یہ لوگ بھی شریعت و طریقت کے عامل ہوں۔ اور گزشتہ علم کے متعلق جو بیان ہوا ان کیفیات کے جاننے والے ہوں اگر صاحب مشاہدہ ہونے کا دعویٰ کریں۔ تو اگر عالم ملکوت کی خبر نہیں تو کم از کم عالم ناسوت کی خبر ضرور دے سکتے ہوں۔ وہ خبر یہ ہے۔ کہ انکے مستقبل کے مشاہدات حال میں حقیقی ثابت ہوں۔ اس میں شک نہیں کہ ایک ولی کیلئے یہ شرط نہیں کہ وہ مشاہدہ کو ہی اپنی دلیل میں پیش کرے۔ لیکن یہ بھی ضروری ہے۔ کہ ایک ولی اکمل کے مریدوں میں سے دس فیصد یا ایک فیصد صحیح مشاہدہ حاصل کئے ہوئے ہوں۔ یا خود ولی اکمل صاحبِ مشاہدہ ہو۔ اسکے علاوہ ایک ایسے شخص میں جو شریعت کا پابند ہو اور طریقت کا دعویٰ کرتا ہو وہ سنتِ نبویؐ کے تحت نائب رسول اللہ کے مقام پر فائز ہو اور اس میں یَتْلُوا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِهٖ وَيُزَكِّيْهِمْ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ کی خصوصیات ظاہر طور پائی جاتی ہوں۔ اس کا علم مبنی بر حقیقت ہو۔ اسکا تزکیہ نتیجہ خیز ہو۔ اور اسکے علم سے حکمت و اسرار ہر شخص پر آشکارا ہوتے ہوں ـــــ اور حکمت کے مشاہدہ کرنے میں ایک ولی اکمل کی صفت یہ ہے۔ کہ علم کی ابتدا میں اول اجلاسِ محمدیؐ عالم ملکوت کے پہلے باب میں ایک آن میں داخل کرا سکتا ہو۔ ورنہ ولی اکمل کی صفت تو یہ ہے۔ کہ وہ ایک طالب کو اپنے ابتدائی عمل میں اپنے جیسا ولی اکمل بنا سکے۔ لیکن یہ امر مشکل اور بعید از قوت ہے۔ کیونکہ انسان ایک وقت میں بغیر تزکیہ مجاہدہ و استطاعت قلب و شعور کے اس مشاہدہ کا متحمل نہیں ہو سکتا۔ یا تو تجلی نور سے جسم تحلیل ہو کر انسان ہلاک ہو جاتا ہے۔ یا قوت شعور و تعقل کھو کر

مجذوب ہو جاتا ہے۔اور یہ امر قانون شریعت کے خلاف قرار دیا جاتا ہے۔

اسکے ساتھ ہی ایک طالب صادق کو شریعت وطریقت میں کیا حاصل کرنا ہے اور کیا حاصل ہوتا ہے؟ــــــ طالب صادق سے مراد حقیقت کی طرف رجوع کرنے والا ہے۔یعنی ایک انسان۔ جب کائنات اور اپنے وجود پر نظر ڈالتا ہے۔معاً اسکے دل میں یہ احساس پیدا ہوتا ہے۔کہ یہ کائنات کیسے بنی؟ اور اسکا بنانے والا کون ہے؟ یہ ایک حقیقت ہے۔کہ کائنات کی مخلوق میں یہ تفکر کا مادہ صرف انسان میں ہی پایا جاتا ہے۔کہ باقی مخلوق کے مقابلہ میں انسان فطری طور ہر کیفیت پر سوچنے لگ جاتا ہے یہ مادہ اسلئے انسان میں پایا جاتا ہے۔کہ اسکی زندگی کا مقصد باقی مخلوق کے مقابلہ میں صرف تفکر ہی کرنا ہے۔یہی وجہ ہے۔کہ انسان میں باقی مخلوق کے مقابلہ میں حواس۔ذہن۔شعور۔قلب وروح رحمانی ایک مستقل ہیئت میں پائے جاتے ہیں۔اور باقی خواص میں حیوان اور انسان مساوی حیثیت رکھتا ہے اسلئے انسان کیلئے یہ لازمی ہے۔کہ کائنات اور ذاتی وجود پر تفکر کرے اسکی اصل کیفیت و حقیقت کا علم حاصل کرے۔اور ایک خالق کا پتہ لگائے۔وَفِی الْاَرْضِ اٰیٰتٌ لِّلْمُوْقِنِیْنَ ۙ وَفِیْٓ اَنْفُسِكُمْ ۭ اَفَلَا تُبْصِرُوْنَ ۝۔یہ آیتِ قرآنی خود اس امر کی شاہد ہے۔کہ انسان پر ابتدائی طور ایک تفکر کا ارادہ کرنا لازمی ہے۔اور اس کی ابتدا خود اس مادی دنیا سے ہی ہوتی ہے۔کہ انسان کائنات کا مشاہدہ کرے۔اور یہ فیصلہ کرلے کہ اس کائنات اور خالق کی حقیقت کا راز پانا میرے لئے ضروری ہے یہ کیفیتِ ابتدائی جسے بصر وتعقل سے حاصل کیا جاتا ہے صرف تفکر کیلئے ایک ابتدائی تحریک ہے۔اگر انسان ایک فرد کی حیثیت سے تفکر کرنا شروع کرے۔تو یقینی طور اس میں وہ قویٰ اور خاصیتیں موجود ہیں جن سے انسان مادی حیثیت میں ہر شے کی کیفیت کو پا سکتا ہے۔اور جہاں تک انکے باطن کا تعلق ہے۔اسکے لیے بھی انسان میں روح حیوانی ـــ اور روح رحمانی موجود ہے۔جس سے کائنات کے غَیْبَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ کا ادراک وعلم حاصل کرسکتا ہے ــــ مادی اشیا کا علم حواس وتعقل کے ذریعہ ہوتا ہے۔اور غیر مادی اشیا کی کیفیت کا علم روح اور شعور سے ہوتا ہے ــــ روح اور شعور سے

کام لینے کیلئے یہ ضروری ہے۔ کہ انسان کو تفکر کیلئے ایک حقیقی جذبہ پیدا کرنا ہے۔ اسکے ساتھ ہی انسان پر یہ فرض بھی عائد ہوتا ہے۔ کہ وہ اپنی اشرف المخلوقاتی خاصیتوں کو اپنی اصلی حالت میں رکھے۔ یعنی۔ وہ قوانین فطرت کے مطابق چلے۔ وہ قانون کیا ہے؟ اپنے وجود پر مادی آلائشوں کا زیادہ غلبہ نہ ہونے دے۔ اور انسان ہونے کی حیثیت سے دائرہ انسانیت میں رہے۔ انسان کائنات میں اسی قدر حاصل کرے۔ جس قدر دنیا پر اسکے حقوق قائم ہیں اور انسان ہونے کی حیثیت سے وہ وہی عمل کرے۔ جو باقی مخلوق کے مقابلہ میں انسان کیلئے مقرر ہیں۔ اسطرح اسکی مادی اور روحانی فوقیت برقرار رہیگی۔ اور اگر اس میں کسی قسم کا نقص واقع ہو تو اسکی اصلاح کرے۔ اسکے نقائص صرف یہ ہیں۔ کہ علم کے لحاظ سے قوائے ادراکی قوی نہیں ہوتے ہیں۔ اسکا واہمہ۔ حافظہ۔ تعقل صحت یاب نہیں ہوتے ہیں۔ انکی کمزوری کا باعث صرف یہ ہے۔ کہ انسان اپنے لئے اپنے حقوق سے زیادہ حصول کی خواہش رکھتا ہے۔ اور برخلاف انسانی فطرۃ کے حیوانی خاصیتوں پر مائل رہتا ہے۔ جس سے۔ انسانی وجود کے اُن قویٰ پر اثر پڑتا ہے۔ جو انسان کی روح حیوانی (خون) کو بناتے اور اسے تحلیل کر کے لطیف حالت میں لاتے ہیں۔ وہ خصوصی طور پر اسکے اعضاءِ رئیسہ۔ رگ و پٹھے غدود وغیرہ ہیں ان میں شریانیں (Nerves System) زیادہ خصوصیت رکھتی ہیں۔ جب انسان کی شریانیں کمزور ہو جائیں۔ تو انسانی اعضاءِ لطیفہ کو خون صالح حاصل نہیں ہوتا۔ اور یہ قویٰ کمزور ہو کر اپنی خاصیتوں کو صحیح معنوں میں کام میں نہیں لا سکتے۔ مثلاً۔ قلب و دماغ کی کمزوری کا سب سے بڑا سبب Nerves کی کمزوری ہوتی ہے جسوجہ سے واہمہ۔ حافظہ۔ تعقل۔ قلب پورا کام نہیں کر سکتے۔

اس کے طریق علاج دو طرح کے ہیں۔ ایک ادویات کے استعمال سے انسانی صحت کو برقرار رکھنا۔ یہی وجہ ہے۔ کہ انسان کی زندگی میں حکمت (طب) اس کی صحت مندی کا سبب بنتی ہے۔ حکماً نے اس مقصد کو پورا کرنے کیلئے حکمت کے علم کو مرتب کیا ہے۔ کہ جب انسان اپنی لطیف قوت کو خلافِ فطرۃ اقدام سے تنزل کی طرف لائے۔ تو دوبارہ انسانی خصائص میں روحانی قوت پیدا کرنے کیلئے۔ اسکے قویٰ میں قوت پیدا کی جائے تاکہ انسانی علم و ادراک کی قوتیں علیٰ حالہ قائم ہو کر حقیقی علم

حاصل کرنے کی صلاحیت پاسکیں۔ ورنہ انسان اپنی زندگی کو ہر حالت میں خواہ وہ بیمار ہو۔ یا صحت مند ایک وقت مقررہ تک چلا ہی لیتا ہے۔ اکثر دیکھنے میں آیا ہے۔ کہ انسان بیمار ہوتا ہے۔ دن گزارتا ہے۔ اگر صحت مند ہوا۔ اور پھر اپنے مقصد کی طرف رجوع نہ کیا۔ تو اسکا صحت یاب ہونا کوئی معنی نہیں رکھتا۔ اسکے مقابل اگر ایک شخص طویل بیماری میں مبتلا رہ کر زندگی ختم کر لیتا ہے۔ تو اس حالت میں دونوں کی حالت مساوی ہے۔ ایک بھی وقت گزار دیتا ہے۔ دوسرا بھی وقت گزار دیتا ہے بلکہ ان حالتوں میں دونوں انسانوں میں وہی بہتر ہوسکتا ہے۔ جو بیماری کی حالت میں بھی اپنے مقصود کا خیال رکھتا ہے۔ اسلئے حکمت کو صرف ذاتی وجود کی صحت بلا مقصد کیلئے استعمال کرنا ایک غیر فطری طریقہ ہے۔ جب تک کہ انسان کا نظریہ یہ نہ ہو۔ کہ جسم کی صحت مندی کے ساتھ ساتھ میری قوتِ علمی و عملی صحت مند ہو۔ ورنہ دوسری حالت میں حیوان کو بھی۔ صحت مند ہونے کی ضرورت رہتی ہے۔ کہ وہ اپنے جسم کی نشو و نما کو برقرار رکھ سکے۔ اس حالت میں بغیر مقصود انسان اور حیوان میں کوئی فرق نہیں پایا جاتا۔

چنانچہ ایک چلتے پھرتے انسان میں جب اسکے قوائے علمی کمزور ہوں تو اسے جسمانی علاج کے ساتھ قلبی اور دماغی علاج کیلئے خون صالح پیدا کرنے کیلئے اعضاء رئیسہ کی طرف توجہ رکھنی چاہیے جب Nerves System درست ہوا۔ تو واہمہ۔ حافظہ۔ تعقل قلب بھی درست ہونگے۔ انکی درستی کی علامت یہ ہے۔ کہ یہ علم حاصل کرنے کی پوری صلاحیت پاسکیں۔ مثال کے طور اگر ایک لڑکا علم حاصل کرنے میں کمزور ہوتا ہے۔ تو اسے کہا جاتا ہے۔ کہ اسکی دماغی قابلیت کمزور ہے۔ اسکا مطلب یہ ہوتا ہے۔ کہ یہ بتائے ہوئے علم کو حافظہ میں محفوظ نہیں رکھ سکتا۔ حافظہ کے کمزور ہونے سے نہ علم حافظہ میں جمع رہ سکتا ہے۔ نہ اسکی ترتیب صحیح رہ سکتی ہے۔ اسکی وجہ دماغی قویٰ کی کمزوری ہوتی ہے۔ اگر دماغ میں صلاحیت موجود ہو تو علاج سے اسکی صحت یقینی ہو جاتی ہے۔ گویا علم کا دارومدار دماغ (حافظہ) پر ہوتا ہے۔ اور اسکی کمزوری سے علم کی تکمیل میں خامی واقع ہوتی ہے۔ اور اسکے علاج کرنے سے جب اسے صحت حاصل ہوتی ہے۔ تو یہ علم حاصل کرنے میں اپنا کام اچھی طرح کرتا ہے۔ یہی کیفیت تفکر میں علم حاصل کرنے کی ہے۔ کہ انسان ظاہری علاج سے قلب۔ حافظہ۔ تعقل کی (روحانی) قوتِ ادراکی کو

ازسرِ نو کام میں لاتا ہے۔ جہاں تک مادی علم کا تعلق ہے۔ انسان ہر کیفیت کی اصلیت کو آسانی سے پا سکتا ہے۔ جسے عام اصطلاح میں عقل کی رسائی کہتے ہیں اور جب حافظہ کی قوتِ ترتیب اپنے عروج پر آجاتی ہے۔ تو ایسا شخص یاداشت[1] میں قوی۔ مخترع[2]۔ موجد بنتا ہے۔ اسکے بعد یہی حافظہ کی صلاحیت ایک منطقی۔ فلسفی میں خیالات کا حقیقی ربط پیدا کر کے مسائل کے حل کرنے میں مواد پیدا کرتی ہے۔ اور اسکا آخری درجہ۔ یکسوئی ہے۔ جس میں قلب کی روح حیوانی کا حافظہ سے ربط پیدا کر کے غیب کا انکشاف[3] شعور کو حاصل ہوتا ہے گویا۔ منطق۔ فلسفہ۔ کشف اسی استدراجی قوت کی پیداوار ہوتی ہیں۔

دوسرا طریق علاج یہ ہے۔ کہ خواہ انسان جسمانی حالت میں صحت مند ہو۔ یا بیمار۔ اسکے قویٰ ادراکی صحت مند نہ ہوں تو اسکے علاج کیلئے ایک پرہیز کی ضرورت ہوتی ہے۔ وہ یہی کہ جن کیفیتوں سے اسکے قلب وروح حیوانی پر مادیت کا غلبہ ہو جائے۔ انکے دفعیہ کیلئے۔ مادی غذا کا کم کرنا ــــ حافظہ کو بیرونی اور اندرونی تفکرات کے ہجوم سے فرصت دینی۔ اسکے لیے غذا کی صفائی۔ اور مقدار میں تعین کرنا۔ یعنی اتنی غذا کھانی جو جسم کی نشوونما کیلئے صحیح اثر پیدا کر سکے۔ کم غذا کھانی تاکہ کم غذا کو معدہ آسانی سے تحلیل کرے اور شریانیں ایک کم مقدار کو آسانی سے خون بنانے اور تحلیل کرنے میں آسانی پائیں۔ اسطرح اگرچہ کم مقدار میں بھی خون پیدا ہوگا۔ مگر اس میں خون کے مرکبات اپنی اصلی حالت میں ہونگے۔ یہی خون روح حیوانی میں لطافت کا موجب ہوگا۔ اسطرح پابندی کے ساتھ عمل کرنے سے قوتِ ارادی بھی بڑھنی شروع ہوگی۔ اگر اپنے ارادہ میں اسکی بے راہ روی میں پابندی عائد کر دی یعنی ہر اس عادت کے خلاف عمل کیا جائے جو انسانی فطرۃ کی عادت ثانیہ بن چکی ہو۔ یہ وہ

---

[1] بعض لوگوں میں اسی صلاحیت کی بنا پر عمر بھر کا ایک ایک واقعہ ازبر یاد ہوتا ہے۔

[2] ترتیبی قوت کی صلاحیت پر ہی ایک موجد مختلف اجزائے علمی کو ایک ہیئت میں لا کر اختراع وایجاد پیدا کرتا ہے۔

[3] مسمریزم اسی کیفیت کی ادنیٰ جُز ہے کہ قلب کی قوت (روح حیوانی) عروج کر کے مافوق الفطرت واقعات کا ظہور کرتی ہے۔ اور اسی کیفیت سے غیر مادی واقعات کا علم ہو جاتا ہے۔ جسے استدراج کہتے ہیں۔

عادات ہیں۔ جوانسان محسوس کرتا ہے کہ یہ عادت اصول کے مطابق نا قابل عمل ہے۔ مثال کے طور اگر انسان اپنے معمولات زندگی میں اپنی عادت کے پورا کرنے میں مجبوراً عمل پیرا ہوتا ہے۔ مثلاً تمباکو پیتا ہے۔ یا شراب پیتا ہے۔ یا زیادہ کھانے کی چیزوں کی خواہش کرتا ہے وغیرہ تو انہیں اپنی عادت کے مطابق اوقات میں تبدیلی کر دے۔ جب خواہش ہواسوقت ٹال دے۔ اگر اس بات پر قادر نہیں کہ وہ اپنی عادت کوٹال دے تو اسکا علاج (واحد علاج) یہ ہے۔ کہ یا تو روزہ رکھے۔ اگر روزہ نہیں رکھ سکتا۔ تو رات کے کسی حصہ میں نیند سے جاگ کر یکسوئی شروع کر دے۔ چونکہ نیند بھی انسان کی عادت ثانیہ میں ہوتی ہے۔ نیند میں خلل ڈالنے سے ہر قسم کی عادت میں خود بخود خلل واقع ہوتا ہے۔ اسی بیداری (قیام لیل) سے قوت ارادی بیحد مضبوط ہو جاتی ہے۔ اور جب رات کے وقت یا اپنی مصروفیت کے اوقات میں تنہائی میں بیٹھ کر یکسوئی کی جائے تو اسطرح قلب۔ روح حیوانی اور حافظہ میں فطری قوت پیدا ہوتی ہے ـــــ یہ امر مسلمہ ہے۔ کہ انسان میں فطری طور قوت دفاع موجود ہے۔ جو بغیر کسی دوائی۔ یا علاج کے انسانی نشو ونما میں خصوصی کام کرتی ہے۔ یہ حقیقت ہے۔ کہ انسان میں اتنی قوت موجود ہے۔ کہ اگر اسکے وجود میں بیرونی قوتیں داخل ہو کر اسکی وجودی قوتوں میں خلل (کمی یا زیادتی) نہ پیدا کریں۔ تو انسانی قوتِ دفاع۔ انسانی وجود کی نشو وارتقا کی قوت کو بحال رکھ سکتی ہے۔ اسی طرح اگر قلب و دماغ کی کمزوری کا ادویات سے علاج نہ کیا جائے۔ صرف بیرونی غیر فطری قوتوں کو جسم میں داخل ا نہ ہونے دیا جائے۔ تو یہ قویٰ خود بخود فرصت حاصل کرنے سے رو بہ اصلاح ہو

ا ادر اصل حکمت کی رو سے ادویات کے استعمال سے مرض دور نہیں ہوتا۔ بلکہ حقیقت یہ ہے کہ انسانی وجود کے صحت مند ذرات (قوتِ دفاع) بیرونی کثیف ذرات کے غلبہ سے کمزور ہو جاتے ہیں اوران صحت مند ذرات کی کمزوری ہی ایک انسان کی بیماری کہلاتی ہے۔ ادویات میں چونکہ خالص انسانی ذرات پائے جاتے ہیں۔ اسلئے یہ ادویاتی ذرات تازہ حالت میں جسم میں داخل ہو کر کثیف ذرات کو بڑھنے سے روکتے ہیں۔ جس سے صحت مند ذرات کو دوبارہ قوی ہونے کا موقع مل جاتا ہے۔ اور یہی قوتِ دفاع کثیف ذرات کو ضائع کر کے انسانی جسم کو دوبارہ صحت مند بناتے ہیں۔

جاتے ہیں۔اسے پرہیز (تقویٰ) کہا جاتا ہے۔یہ طریقِ علاج۔روحانی علاج سے تعبیر دیا جاتا ہے۔ اس علاج میں۔کم خوری۔قیام لیل یا تنہائی میں حافظہ کو تفکرات سے فرصت دیئی قلب (روح حیوانی) اور حافظہ کی سالمیت کو قائم رکھ کر ان میں رابطہ پیدا کر دیتی ہے۔اور اسکے نتیجہ میں تفکر (غیر مادی قوتوں کے انکشاف وعلم) میں کامیابی ہوتی ہے۔

الغرض ایک طالب صادق کیلئے۔یہ ضروری ہے۔کہ وہ ایک حقیقی خالق کا عرفان حاصل کرنے کی نیت سے اپنی انہیں (اوپر بیان کی ہوئی) قوتوں سے ایک تصور قائم کرے۔یعنی تنہائی میں۔استغراق وانہماک کے ساتھ یکسوئی کرے۔رفتہ رفتہ جب قلب وحافظہ وشعور کا رابطہ ہو جائیگا۔تو ابتدائی طور اسے کائنات کی قوتوں کا انکشاف ہوگا۔جس میں زمین کے ایک قلیل ذرہ سے لے کر آسمانی فضاؤں کے تمام اجرام فلکی کی قوتوں کا مشاہدہ ہوگا۔جب تک یہ کیفیتیں اپنے مادی وجود میں ظاہر ہونگی۔اسے عالم اسباب سے تعبیر دیا جائیگا۔اور جب ہر کیفیت کی ایک لطیف ہیٔت کا مشاہدہ ہونا شروع ہوگا۔تو ان میں اپنی لطافت کے اعتبار سے ان مادی قوتوں کے مقابلہ میں قوت میں زیادہ روشنی۔زیادہ خوبصورتی محسوس ہوگی۔یہ عالم عالمِ ناسوت سے تعبیر ہوگا۔یہ انکشاف اس حد تک ہوتا رہیگا جہاں تک ان کیفیات کا تعلق مادہ سے ہوگا۔کیونکہ مشاہدہ کرنے والی قوت بھی مادی اور روحانی (روح حیوانی) ہیٔت میں ہوگی۔اسلئے اسکا ادراک بھی مادی حدود تک محدود رہیگا۔جب کیفیات میں مستقل نورانیت پائی جائیگی۔تو ان کیفیات کو روح حیوانی ادراک نہ کر سکے گی۔

یہ امر لازمی ہے۔کہ ہر اس کیفیت کیلئے جو حافظہ میں جمع نہ ہو اور واہمہ بھی اس کیفیت کا ایک نام ایک رنگ بتانے سے عاجز ہو۔تو اسکے علم کیلئے ایک راہنما کی ضرورت رہتی ہے۔ورنہ انسانی واہمہ اسکی ہیٔت بتانے میں غلط ہیٔت کا نام دیگا۔اسلئے انسان ایک ہیٔت کی اصلی حقیقت کو غلط رنگ میں حافظہ میں جمع کرتا رہیگا۔اور حافظہ میں غلط علم جمع ہونے سے انسانی علم میں نقص واقع ہوگا۔اور حقیقت سے آگاہی کا صحیح علم حاصل نہ ہوگا۔اسلئے ضروری ہے۔کہ اپنے ابتدائی تفکر میں اس بات کا ضرور خیال رکھا جائے۔

انسان صرف مقصود حقیقی کا متلاشی رہے۔اگر اسے کائنات کی تخلیق کا راز معلوم بھی ہو۔اس پر نظر نہ رکھے جب تک عالمِ ملکوت میں (جو کہ عرفان الٰہی کا ابتدائی باب ہے) اوّل اجلاسِ محمدیؐ کا مشاہدہ حاصل نہ کیا جائے۔اسلئے طالب حقیقی کیلئے۔اول ایک ولی اکمل کی طرف رجوع کرنا۔ولی اکمل سے بیعت کرنا۔ولی اکمل کا تصور کرنا۔اور ولی اکمل کے علم ونور سے ہی فیض حاصل کرنا۔اور تصور میں یکسوئی وتنہائی کے ساتھ پہلے جذب کیلئے ولی اکمل کے روحانی وجود (روح رحمانی) کا تصور کرنا۔اور ابتدائی مقصود صرف اول اجلاس محمدیؐ اور زیارتِ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام رکھنا لازمی ہے۔ورنہ (اوپر بیان کی ہوئی کیفیتیں) سوائے طریق تزکیہ اور مجاہدہ کے بغیر ولی اکمل اور مقصود نور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نفع بخش نہیں ہوسکتی۔

اسی نظریہ کے تحت ایک طالب صادق کو چاہیے۔کہ وہ بغیر ولی اکمل کے کسی عامل۔کسی درویش۔کسی گدی نشین۔کسی ایسے عالم سے جو صرف علم جانتا ہو۔مگر اسے ولایت کی سند حاصل نہ ہو۔کسی ملنگ (جو مزارات پر آگ جلا کر صرف نشہ پی کر مستی اور استغراق کا مصنوعی دعویٰ کرتے ہیں) یا کسی ایسے شخص کا جو صرف بیعت ہی بیعت کرانا جانتا ہو اور اس میں ولی اکمل کی صفات موجود نہ ہوں۔یا ولی کامل۔یا ولی مکمل کی طرف نہ رجوع کرے۔نہ ہی بیعت کرے اور نہ ہی اس سے فیض حاصل کرنے کی سعی کرے۔البتہ اگر ولی اکمل کو نہ پائے تو ولی مکمل کی طرف رجوع کرنا جائز ہے۔کیونکہ علم کے اعتبار سے وہ مکمل ہے۔صرف تزکیہ بغیر سند نہیں کرسکتا ہاں باطن میں وہ اپنے ولی اکمل کے سپرد کرسکتا ہے۔جہاں باطنی طور ولی اکمل ایک طالب حقیقی کا تزکیہ کرسکتا ہے۔ولی مکمل سے صرف فیض (قرأت) حاصل کرسکتا ہے۔بیعت بغیر ولی اکمل کے کسی سے نہیں کرسکتا۔اگر ولی مکمل بھی میّسر نہ ہوتو صرف ایک مستقل سلسلہ کا (جو کہ قابل تقلید تسلیم کیا گیا ہو) فیض ولی کامل سے بھی لے سکتا ہے۔اسکی دلیل یہ ہے۔کہ ولی کامل سند یافتہ فقیر (ولی) ہوتا ہے۔اسکی رسائی دربار رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم میں ہوتی ہے۔جہاں یہ ولی اکمل۔اور حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام سے براہِ راست علم وہدایت حاصل کرسکتا ہے۔اسلئے ایک ولی کامل ایک طالب حقیقت کو دربارِ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم میں پیش کرکے اپنے ولی اکمل کے سپرد کر

کے تزکیہ کرا سکتا ہے (اسے توجہ دینا کہتے ہیں) دوسرے ان دونوں قسم کے اولیا کے پاس ولی اکمل کا ہی علم ہوتا ہے۔ جو یہ ایک طالب حقیقت کو بتاتے ہیں۔ اس لئے ولی کامل سے بھی فیض (قرأت) لے سکتا ہے۔ مگر بیعت کرسکتا ہے نہ اسکے وجود روحانی میں جذب کیلئے اسکا تصور کرسکتا ہے۔ البتہ تصور میں آسانی کیلئے یہ ترکیب ہوسکتی ہے۔ کہ چونکہ ولی کامل اور ولی مکمل کو ولی اکمل کی روح سے جذب حاصل ہوتا ہے۔ اسلئے وسیلہ کے طور انکا تصور کیا جائے اس صورت میں نتیجہ یہ ہوگا۔ کہ جب ولی کامل یا مکمل کا تصور آجائے تو اسی وقت ولی اکمل کا تصور بھی آجائیگا لیکن ان تصورات میں مقصودِ نظر نہ ولی کامل یا مکمل کا تصور رکھنا ہے نہ ان سے جذبہ حب کو وابستہ رکھنا ہے۔ بلکہ ولی اکمل کا مقصود ہی رکھنا لازم ہے ــــ

اگر ولی کامل بھی میسر نہ ہوسکے۔ تو اسکے لیے اوپر بیان کیا گیا طریق روحانی پر کاربند رہنا چاہیے۔ کہ خود ہی شریعت وطریقت کی پابندی کرے۔ اور قرآنی عمل کے مطابق یا اَفْضَلُ الذِّكْرِ لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ کا ورد بغیر کسی ذکری ترکیب کے صرف قرأت کے ساتھ بغیر تعداد کے پڑھتا رہے۔ یا اَللّٰہ ھُوْ . صرف خالص طریقہ پر سانس کے ساتھ پڑھتا رہے۔ اس طرح قلب میں صفائی آئیگی اور مشاہدہ کی قوت پیدا ہوگی۔ جب مشاہدہ کی قوت پیدا ہوگئی تو پھر درود شریف (جو نماز میں پڑھا جاتا ہے اور مُسند ہے) کا ورد یکسوئی۔ استغراق۔ محبت کے ساتھ کرتا رہے۔ اور تصور میں صرف مقصود حقیقی عرفان (دیدار) الٰہی کا خیال رکھے ــــ یا خیالی تصور روضہ مدینہ شریف کا رکھے ــــ کیونکہ قولہٗ تعالیٰ قُلْ اِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّوْنَ اللّٰهَ فَاتَّبِعُوْنِىْ يُحْبِبْكُمُ اللّٰهُ کے تحت اگر مقصود اللہ ہی ہو۔ مگر مقصود حاصل کرنے کا طریق بغیر حب واتباع رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم حاصل نہیں ہوسکتا۔ اسلئے طالب حقیقت کو جب بھی مشاہدہ حاصل ہوگا وہ خود بخود صراط اللہ کے ابتدائی باب عالم ملکوت کے اول اجلاس محمدیؐ پر پہنچ جائے گا۔ اول اجلاس محمدیؐ میں چونکہ عالم وراہنما کی حیثیت سے ولی اکمل موجود ہوتا ہے۔ اس طرح طالبِ حقیقت کو خود بخود باطنی طور ولی اکمل کی راہنمائی حاصل ہوگی پھر اسے ظاہری حیثیت میں ولی اکمل کے مقام کا علم ہو جائیگا جہاں ایک طالب ولی اکمل سے ظاہری طور فیض وراہنمائی اور بیعت حاصل کرے گا۔ اگر ظاہری طور ولی اکمل کو نہ پاسکے تو بھی ایسا شخص ہر وقت باطنی طور ولی اکمل سے

فیض وہدایت پاسکے گا۔ایسا شخص اویسی کہلاتا ہے۔ان مشاہدات میں ابتدائی طور طالب حقیقت کو کیا مشاہدہ ہوتا ہے؟

ابتدائی طور پر چونکہ ہر شخص کے قلب ۔واہمہ۔حافظہ۔شعور۔روح کمزور حالت میں ہوتے ہیں۔اگر طالب بغیر کسی ولی کے ایک عمل جاری رکھے تو سب سے پہلے ایک خالص نیت سے صرف عرفان الٰہی کا مقصود دل میں رکھے۔اور قرآنی علم کے ماتحت شریعت کی پابندی (نماز۔روزہ وغیرہ) کرے۔اسکے ساتھ طریق تزکیہ میں۔کم کھانا (روزہ) قیام لیل (رات کو جاگنا) اور ہر خلافِ فطرۃ اقدام سے پرہیز۔اور قرأتِ قرآن میں ذکر اور درود (مَا تَيَسَّرَ مِنْهُ) جتنا میسر ہو کرتا رہے۔ اور ساتھ ہی اکثر اوقات میں خصوصاً رات کے کسی حصہ میں سنتِ نبویؐ کے تحت۔یکسوئی اور استغراق کی کوشش کرے۔اس ترکیب سے مشاہدہ حاصل ہوگا اور عالم ناسوت کے مقامات کا مشاہدہ شروع ہو گا۔یہ امر واضح ہو کہ ایسے شخص کو جب تک اجلاسِ محمدیؐ کے ساتھ ایک ولی کا مشاہدہ نہ ہو۔اپنے مشاہدہ کی کسی کیفیت کی طرف محو نظارہ نہ ہو۔مشاہدہ کرتا رہے اور مقصود حقیقی کی تلاش میں آگے بڑھنے کی طرف مائل رہے۔یہاں تک کہ روضہ مدینہ منورہ یا اجلاسِ محمدیؐ مشاہدہ میں آئے۔جب یہ کیفیت ظہور میں آئی۔تو انسان اپنے مقصد کے قریب پہنچ گیا۔جہاں خود ہی ولی اکمل کی راہنمائی حاصل ہو گی۔اور اس کی پوزیشن وہی ہوگی جو ایک ایسے طالب کی ہوتی ہے جسے ابتدا میں ہی ایک ولی کی راہنمائی حاصل ہوتی ہے۔یہاں اس بات کا خیال رکھنا ضروری ہے کہ جب انسان جستجو میں قدم اٹھاتا ہے۔تو صبر واستقلال کے ساتھ اس وقت تک عمل جاری رکھے جب تک اسے مشاہدہ حاصل نہ ہو خواہ اس کیفیت میں اسے ایک طویل مدت صرف ہو۔جو شخص ولی اکمل کی راہنمائی میں آجاتا ہے۔تو ولی اکمل پر یہ ذمہ ہو جاتا ہے۔کہ وہ مبتدی کا تزکیہ کرے۔تزکیہ کا طریق یہ ہوتا ہے۔کہ ولی اکمل بیعت کے بعد طالب کو شریعت وطریقت (اور اختراعی طریق قرأت ومجاہدہ)۔اور سفلی قوتوں سے پرہیز بتاتا ہے۔اور ساتھ ساتھ باطنی طور۔انسانی قلب کی نوری توجہ سے صفائی کرتا ہے۔یعنی انسانی روح حیوانی پر (مثل الیکٹرک کرنٹ یا برقی شعاع) اپنی روح رحمانی سے عکس ڈالتا ہے۔جس سے روح

حیوانی کو روح رحمانی سے عکس لینے اور اسکے ساتھ وابستہ ہونے کی صلاحیت[1] پیدا ہوتی ہے۔ ادھر طالب کی روح رحمانی بھی مراتب حاصل کر کے ولی کی روح رحمانی میں جذب ہو جاتی ہے۔ اسطرح ولی کی روح رحمانی ـــــ میں طالب کی روح رحمانی مل جاتی ہے دوسری طرف طالب کی روح حیوانی میں صلاحیت پیدا ہو کر اسکی روح رحمانی سے قریبی مناسبت پیدا ہوتی ہے۔ اور قلب سے لیکر ولی اکمل کی روح رحمانی تک ایک مستقل رابطہ قائم ہو جاتا ہے اور جو کیفیت ولی اکمل کی روح رحمانی میں (جذب کے اعتبار سے) طاری ہو جاتی ہے وہی کیفیت طالب کی روح رحمانی (جذب کی حالت میں) حاصل کرتی ہے۔ ادھر کیفیت طاری ہوئی ادھر مثل آئینہ کے قلب میں روح حیوانی پر وہ کیفیت عکس پذیر ہو جاتی ہے۔ اور جب انسان قلب و حافظہ کا رابطہ کر لیتا ہے۔ تو اس وقت یہ کیفیت شعور کے مشاہدے میں آ جاتی ہے۔

ابتدائی حالت میں ایک طالب حقیقت۔ جب طریقت کے تحت عمل کرتا ہے۔ یعنی قرأت شروع کرتا ہے اور مجاہدہ و ریاضت میں۔ فاقہ۔ شب بیداری۔ اور اپنی عادات کے خلاف اقدام پر عامل ہو جاتا ہے۔ تو اس عمل سے انسانی قلب میں اسکی روح حیوانی کی کثافت دور ہونی شروع ہو جاتی ہے ـــــ ادھر ولی اکمل کی نوری توجہ سے بھی روح حیوانی میں لطافت آنی شروع ہو جاتی ہے۔ تو طالب ان کیفیات کو بھی مشاہدہ میں لاتا ہے۔ اسکی کثیف کیفیتوں کا رنگ ظلمت (سیاہ اندھیرے) سے مشابہ ہوتا ہے۔ جب یہ کیفیت قلب سے ہٹنا شروع ہوتی ہے۔ تو مشاہدہ میں سیاہ بادلوں کی شکل میں محسوس ہوتے ہیں۔ جیسے قلب سے سیاہ بادل اٹھ رہے ہیں۔ اور رفتہ رفتہ بادلوں کا رنگ سفیدی کی طرف آنے لگ جاتا ہے۔ بالآخر بالکل سفید رنگ کا چمکتا ہوا ابر محسوس ہوتا ہے۔ اس آخری کیفیت کے بعد فضا صاف ہو جاتی ہے۔ اسکے بعد ایک مدہم سفید نور۔ یا تارے۔ سورج کے مشابہ نور نظر آتے

---

[1] یاد رہے کہ دل کے ذریعہ مشاہدہ کرنے میں روح حیوانی ہی قلب میں روح رحمانی سے متصل ہو کر رابطہ پیدا کر کے عکس کو حاصل کرتی ہے۔ یہی قلبی مشاہدہ کہلاتا ہے۔

ہیں۔ یہ سب کیفیتیں قلب اور روح حیوانی کی کثافت (ظلمت مائل بہ سیاہی) اور لطافت (نور خالص) کی شکلیں ہوتی ہیں۔ اسکے بعد اچانک کبھی سبز رنگ۔ کبھی سُرخ رنگ۔ کبھی آسمانی رنگ کے انوار آتے جاتے نظر آتے ہیں یہ کیفیتیں بھی اسی روح حیوانی کے لطائف کی ہوتی ہیں۔ یعنی اس روح حیوانی کا رنگ انہیں چار لطائف (سبز۔ نیلگوں یا سرخ۔ سفید۔ سیاہ) کا مرکب ہوتا ہے۔ اسکے بعد جب قلب و حافظہ۔ شعور و تعقل میں انوار کے متحمل ہونے کی صلاحیت پیدا ہو جاتی ہے۔ تو اچانک سورج کے مانند تیز انوار کبھی محدود ہیئت میں اور کبھی وسیع ہیئت میں محسوس ہوتے ہیں۔ ان انوار میں قرار ہوتا ہے۔ دیر تک مشاہدے میں ٹھہرتے ہیں۔ اور انہیں انوار میں مختلف مقامات۔ باغات۔ گلزاروں۔ دریاؤں۔ وسیع اور خوش نما عمارتوں کی تمثیلی شکلوں میں سامنے آتے ہیں یہ عالم ناسوت کے مقامات ہوتے ہیں۔ ان مقامات کے انوار جب مبتدی اپنی ابتدا میں دیکھتا ہے۔ اگر اسے کسی راہنما کی راہنمائی حاصل نہ ہو۔ تو انکی وسعت قوت اور خوشنمائی کو دیکھ کر انسان بعض اوقات یہ محسوس کرنے لگ جاتا ہے۔ کہ میں اللہ کے نور کو دیکھتا ہوں۔ کیونکہ یہ انوار دنیوی انوار کے مقابلہ میں بیحد روشن اور قوی ہوتے ہیں۔ ولی اکمل ساتھ ساتھ ان مشاہدات کی تشریح کرتا ہے۔ اس طرح انسان کو صحیح علم حاصل ہوتا جاتا ہے۔ اسی طرح طالب عالمِ ناسوت کے مراحل میں مختلف وسیع سے وسیع تر کیفیات کا مشاہدہ کرتا ہے۔

یہ امر قابلِ ذکر ہے۔ یہ مشاہدات طالبِ حقیقت کو جذب کی حیثیت میں صرف روح حیوانی کے ذریعہ مشاہدہ میں آتے ہیں۔ کیونکہ اسکی روح حیوانی کی وسعت قلب سے لیکر عالم ناسوت کی اکتالیسویں منزل تک ہوتی ہے۔ اور عالم ملکوت کی پہلی منزل میں روح رحمانی کا دخل ہوتا ہے۔ اسلئے یہاں پر ہی (ایک ولی اکمل کی راہنمائی میں) ایک طالب کی روح رحمانی پہنچ کر ولی اکمل کی روح رحمانی میں جذب حاصل کر لیتی ہے ــــ اس سے قبل جب طالب ولی اکمل سے خالی ہوتا ہے۔ تو بغیر ولی اکمل کی راہنمائی کے ایک شخص کی دونوں روحیں ایک ساتھ رہتی ہیں۔ اگر یہ عمل خود بخود جاری رکھے تو دونوں روحیں بغیر ولی اکمل کی روح رحمانی کے جذب کے اول اجلاسِ محمدیؐ میں داخل نہیں ہو سکتیں۔ البتہ اگر ایک شخص بغیر راہنما کے اپنے لیے حقیقی مقصود کے تحت عرفان کا خواہاں ہو تو پھر

حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کی اجازت سے اسے اول اجلاسِ محمدیؐ میں داخل کیا جاتا ہے جہاں پر ولی اکمل خود اسے حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کے سامنے اپنی روح رحمانی میں جذب کی حالت میں پیش کرتا ہے۔ یہ امر بھی ضروری ہے اگر ولی اکمل اسے اپنی روح میں جذب کر کے پیش نہ کرے اور اس حالت میں اول اجلاس محمدیؐ میں داخل ہو جائے۔ تو طالب نور محمدی کو بغیر جذب کے ادراک نہیں کر سکتا۔ یا اسکی تجلی اگر قلب و حافظہ پر براہ راست آجائے تو انسان پر محویت طاری ہو جاتی ہے۔ اور اسکی کیفیت مجذوب کی سی ہو جاتی ہے اسلئے ضروری ہوتا ہے۔ کہ ولی اکمل کی روح رحمانی کا جذب حاصل ہو۔ اور جو شخص ابتدائً ولی اکمل کی معیت میں سیر کرتا جاتا ہے۔ تو عالمِ ناسوت میں ولی اکمل کی روح حیوانی میں (اپنی روح حیوانی کے ساتھ) جذب رہتا ہے۔ اور ولی اکمل کی روح رحمانی بھی اول اجلاسِ محمدیؐ سے شروع ہو جاتی ہے۔ جہاں دونوں (طالب وولی) روحوں کا اتصال ہو جاتا ہے۔

چونکہ ولی کی کمالیت کا درجہ عالم ملکوت کی ابتدائی منزل اول اجلاس محمدیؐ سے ہی شروع ہوتا ہے اسلئے ولی اکمل اپنی ابتدائی بیعت میں طالب کی روح رحمانی کو اپنی روح رحمانی میں جذب کر کے اول اجلاسِ محمدیؐ میں پیش کرتا ہے۔ اور یہ کیفیت ابتدا سے ہی قائم ہو جاتی ہے۔ اگر ولی اکمل اپنی کمالیت میں افضل[1] واعلےٰ ہو۔ تو طالب کو اپنے ابتدائی مشاہدے میں پہلے ہی اول اجلاس محمدیؐ اور

---

[1] افضل واعلےٰ سے مراد اولیا میں مختلف کیفیتیں پائی جاتی ہیں۔ اور انکے مختلف مراتب ہوتے ہیں۔ کوئی ولی۔ ولی مکمل ہوتا ہے۔ جسے ہدایت کیلئے مامور کیا جاتا ہے۔ کبھی ولی کامل کو بھی اگر اس میں شریعتِ ظاہری کی علمی استعداد پائی جائے تو اسے بھی تبلیغ و ہدایت پر مامور کیا جاتا ہے۔ دوسری نوعیت حُب کی ہوتی ہے۔ بعض ولی صرف شریعت و طریقت کے اصولوں پر کاربند رہ کر مراتب حاصل کرتے ہیں۔ انہیں عالمِ شریعت کے مقابلہ میں۔ مقبولیت و رضا میں افضل درجہ حاصل ہوتا ہے۔ اسی طرح دوسرے عارف جو حب میں اور زیادہ قوی ہوتے ہیں۔ یعنی وہ دنیوی معاملات میں توکل تقویٰ زیادہ اختیار کر کے صرف اللہ اور اسکے رسول کی رضا و خوشنودی کو مدنظر رکھ کر دنیا کی تکلیف (جو انہیں توکل۔ قناعت۔ صبر۔ فاقہ۔ ریاضت میں) برداشت کرتے ہیں۔ انہیں دوسرے اولیا کے مقابلہ میں مقبولیت کا درجہ اولیٰ حاصل ہوتا ہے۔ یعنی بارگاہِ رسالت اور بارگاہِ الٰہی میں انکی ہر التجا ہر استدعا منظور کی جاتی ہے۔ (باقی حاشیہ اگلے صفحہ پر)

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زیارت نصیب ہوتی ہے۔ اگر طالب میں استعداد نہ ہو۔ اور ساتھ ہی ساتھ ولی اکمل کی جگہ ولی مکمل ہو تو اسے ابتداً عالمِ ناسوت کی اکتالیس منزلوں سے گذر کر رفتہ رفتہ قدم بقدم منازل طے کر کے پہنچنا پڑتا ہے۔ عالمِ ناسوت کی ان منزلوں میں اگر ایک شخص مکمل طور تزکیہ نفس

(بقیہ حاشیہ گزشتہ صفحہ) ان خوبیوں کے باعث ان میں نوری قوت بھی قوی ہوتی ہے۔ کہ اگر کسی طالب کے قلب پر توجہ ڈالیں۔ تو اسکے قلب و روح حیوانی میں اسقدر قوت آجاتی ہے۔ کہ وہ اسی آن اول اجلاس محمدیؐ میں پیش ہو کر مشاہدہ کر لیتا ہے۔ گویا ایسے اولیا کیلئے۔ عالم ناسوت کا مشاہدہ ضروری نہیں رہتا بلکہ انکی پہلی منزل اول اجلاس محمدیؐ ہی سے شروع ہوتی ہے۔ دوسرے مقبولیت کے لحاظ سے ان میں یہ افضلیت ہوتی ہے۔ کہ اول اجلاس محمدیؐ میں بغیر اجازت حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کوئی داخل ہو سکتا ہے نہ کسی ولی کے ذریعہ بغیر اجازت داخل کیا جا سکتا ہے۔ لیکن ایک مقبول ولی کیلئے اجازت لینے کی ضرورت نہیں رہتی جسے لائے جس وقت لائے اسے اجازت کے بغیر داخلہ مل جاتا ہے۔

بیان ہو چکا ہے۔ کہ ان فضائل اور قبولیت کے اسباب دو ہوتے ہیں۔ ایک ولی کا علم باطنی کے ساتھ علم ظاہری میں بدرجہ کمال (اپنی عقل و فقہ کے ساتھ) عالم ہونا ـــــ دوسرے حُب میں بھی بدرجہ کمال متصف ہونا ـــــ ان دونوں صفتوں کے لحاظ سے ہر ولی کو مدارج حاصل ہوتے ہیں۔ جو ان مدارج روحانی (صراط اللّٰہ) کے علاوہ ہوتے ہیں۔ ان مدارج میں انہیں قطب کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے۔ چنانچہ سابقہ اولیائے کاملین کو اپنے مدارج میں جو منصب ملے ہیں۔ وہ سات درجوں میں پائے ہیں۔

(۱) ابدال (۲) اوتاد (۳) قطب الابدال (۴) قطب الاوتاد (۵) قطب شاہ (یا قطب سلاطین)
(۶) قطب المدار (۷) قطب الارشاد (۸) قطب العالم (۹) قطب الاقطاب

محی الدین ابن عربی رحمتہ اللہ علیہ نے بارہ (۱۲) بتائے ہیں ـــــ وہ اسطرح کہ قطب الاوتاد چار ہوتے ہیں اور ایک قطب القلندر کے نام سے موسوم کیا گیا ہے۔ اس حساب سے نمبر ا ابدال اور نمبر ۲ اوتاد (چونکہ قطبوں میں شمار نہیں) دو منصب وضع کر کے تین قطب الاوتاد اور ایک قطب القلندر (قطب القلندر وہ سردار ہوتا ہے جو مجذوب محافظوں (اوتاد۔ ابدال) کیلئے مقرر کیا جاتا ہے۔ یہ محافظ اپنی ڈیوٹیوں پر مامور ہوتے ہیں۔ لیکن مجذوب حالت میں ہوتے ہیں۔ اسلئے انکا ایک سردار (قطب) بھی مجذوب ہوتا ہے۔ اسکی حیثیت قطب الابدال کی سی ہوتی ہے) کے اضافہ سے بارہ (۱۲) کی تعداد پوری ہو جاتی ہے۔

ان اقطاب میں ہر قطب ایک دوسرے کے ماتحت ہوتے ہیں (یعنی ایک کو (باقی حاشیہ اگلے صفحہ پر)

کرے یعنی انسان اگر اپنی مادی غذا رفتہ رفتہ کم کرتا جائے۔ یہاں تک کہ اسکی روح حیوانی میں اسقدر قوت آجائے کہ وجودِ مادی کے ہوتے ہوئے اس میں لطافت پیدا ہو جائے۔ تو جسم بھی لطیف ہو جاتا ہے۔ اسے پھر مادی غذا سے نشو ونما حاصل کرنے کی ضرورت نہیں رہتی۔ اور انسان بغیر غذا کے بھی

(بقیہ حاشیہ گزشتہ صفحہ) دوسرے پر فوقیت ہوتی ہے) ان سب کا حاکم و سردار قطب الاقطاب ہوتا ہے۔ یعنی تمام قطبوں کا قطب (تمام اقطاب کا سردار)۔

اس میں شک نہیں کہ خالق ہونے کی حیثیت سے کارگاہِ کائنات کا نظام تمام اللہ کی قدرت کاملہ کے تحت چلتا آیا۔ اور چلتا جا رہا ہے۔ چونکہ اللہ کے ارادۂ ازلی میں صرف اَلْاَرْض کے نظام کو ہی خصوصیت کے ساتھ چلانا تھا۔ اور اس زمین میں شب و روز کے واقعات میں کثرت سے تبدیلیاں واقع ہوتی ہیں۔ مثلاً دینی اور دنیاوی زندگی میں عروج و زوال کا پایا جانا مختلف اوقات میں مختلف صورتوں میں پایا جاتا ہے۔ مثال کے طور ایک وقت انسانی قوم ایک صحیح فطری قانون کے تحت چلتی ہے۔ ظاہری طور ایک خالص ماحول قائم رہتا ہے۔ رفتہ رفتہ نظام اور ماحول میں خلل واقع ہونا شروع ہو جاتا ہے۔ ایک قوم مختلف قوموں میں بٹ جاتی ہے۔ فرقے بن جاتے ہیں۔ حکومتیں بن جاتی ہیں۔ اور دنیوی امور کے عروج میں پھر بھی انسان کو نشو و ارتقا کی ضرورت رہتی ہے۔ اسکے لیے ایک قانون ایک نظام و انتظام کی ضرورت رہتی ہے۔ یہ امر فطری ہوتا ہے۔ جبکہ فطرۃ نے انسان کیلئے ہی کائنات کا تمام مواد اسکی ضرورتوں کو پورا کرنے کیلئے پیدا کیا ہے۔ کہ ہر حال میں انسان کی ضرورتیں بھی فطری طور مہیا ہوتی رہیں۔ اور جب انسان اس فطری خاصہ ربوبیت کو اپنے قبضہ میں لاتا ہے۔ تو اس نظام کائنات کے سنبھالنے کی استعداد نہ پانے کے باعث دنیا میں فتنہ و فساد رونما ہو جاتا ہے۔ انقلاب آتے ہیں۔ طوفان۔ بیماریاں۔ خونریز لڑائیاں پیدا ہوتی ہیں۔ جس وجہ سے عام انسان خواہ وہ فتنہ پرور ہو یا گوشہ نشین ہر ایک انسان ان انقلابی اثرات سے متاثر ہو جاتا ہے۔ ایسے وقت میں دونوں کیفیتوں کی اصلاح کی ضرورت ہوتی ہے۔ ایک طرف فطری قانون کا ازسرِ نو نفاذ و استحکام۔ دوسری طرف انسانیت اور اسکی نشو و ارتقا کی حفاظت۔ یہ دونوں کام سوائے پیغمبر کے انسانوں میں سے کسی سے نہیں ہو سکتے۔ اسلئے جسطرح فطرت نے انسانوں میں سے ہی ایک انسان کو دینی اصلاح کے لیے منتخب کیا قُلْ اِنَّمَآ اَنَا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ يُوْحٰٓى اِلَيَّ۔ یعنی پیغمبر انہی کا ایک انسان ہوتا ہے۔ جسے ایک نظام (قانون) الٰہی دیکر بھیجا جاتا ہے تاکہ اسکا نفاذ کر کے انسانیت کی دینی دنیاوی حفاظت کا سامان پیدا کرے۔ سو دین کے لیے پیغمبر يَتْلُوْا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِهٖ قرآن کا نفاذ کرتا ہے۔ وَيُزَكِّيْهِمْ اور انکے دلوں میں روحانی توجہ سے۔ آمادگی کی قوت عطا کرتا ہے۔ اسی طرح دنیوی نظام میں بھی (باقی حاشیہ اگلے صفحہ پر)

مدتوں زندہ رہ سکتا ہے۔اس قوت کا اثر مجسم روحانیت میں ہوتا ہے۔اس کیفیت کے طاری ہونے پر انسانی جسم میں بھی وہی خاصیت پیدا ہو جاتی ہے۔ کہ بظاہر مادی وجود (حسی) نظر آتا ہے۔مگر اسکی قوت بمنزلہ روح حیوانی کے ہو جاتی ہے ـــــ پھر انسان حقیقی طور اس آیت کی تفسیر ہو جاتا ہے۔اِنَّ

(بقیہ حاشیہ گزشتہ صفحہ) حقیقی سپرٹ اور درستگی پیدا کی جائے ـــــ یہ کام بھی پیغمبر کے ذریعہ ہوتا ہے۔گویا دین کی طرف رجوع کرنے کے سامان۔اور دنیوی نظام میں بھی بہتری کا نفاذ قائم ہوتا ہے۔یہی کام پیغمبر۔اللہ کی قدرتِ کاملہ اور امر کے ذریعہ حاصل کرتا ہے۔اورانہی اقطاب کے ذریعہ ان احکام واوامر کا نفاذ کیا جاتا ہے۔جملہ اقطاب انہیں امور پر فائز ہوتے ہیں۔اور چونکہ ان کیفیات کا تعلق باطن سے ہوتا ہے۔اسلئے یہ امور باطنی طور ہی طے پاتے ہیں۔

(ا) ابدال: سات فرد ہوتے ہیں۔یہ ولی کامل ہوتے ہیں۔ان کا شمار اول اجلاس محمدیؐ میں ہوتا ہے۔انکے ذمہ سات اقلیم دنیا کے نظام کی دیکھ بھال اور احکام کا نفاذ کرنا ہوتا ہے۔کسی جگہ بیماری۔وبا طاعون۔فساد کا پیدا ہونا اور دفع ہونا۔انہیں کی توجہ وامر سے ہوتا ہے۔ہر رات کو انکی ڈیوٹی بدلتی رہتی ہے۔اسلئے انہیں (بدلنے والے) ابدال کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے۔یہ ڈیوٹی ظاہر طور نہیں بلکہ روحانی ہوتی ہے کہ جس مقام پر انہیں مقرر کیا جاتا ہے۔اس مقام کے تمام حالات کا انہیں مشاہدہ رہتا ہے۔

(ب) اوتاد: یہ بھی مثل ابدال کے جماعت ہوتی ہے۔جو دنیا کے چار اطراف میں (یعنی دنیا کو چار حصوں میں منقسم کر کے شمالاً جنوباً شرقاً غرباً) محافظ ہوتے ہیں۔ان میں کثیر جماعت بھی ہوتی ہے۔جنکے مختلف نام نجیب۔نقیب۔رجال الغیب وغیرہ ہیں۔غرضیکہ ایک محلہ ایک مکان کیلئے بھی ایک ایک محافظ ہوتا ہے جو بمثل خفیہ پولیس کے ہر انسان کے روز کے اعمال کارکردگی نوٹ کرتے ہیں اور ہر مخصوص شخص کی نگرانی کرتے ہیں۔

(۱) قطب الابدال: یہ سات ابدال کے افسر اعلیٰ ہوتے ہیں۔انہیں سات ابدال پر حکم نافذ کرنے اور ان سے روز کی کاروائی وصول کرنی ہوتی ہے ـــــ انکے منصب کا لباس خاکی رنگ چمڑے کا (مثل فوجی افسر) ہوتا ہے کمر میں ایک خنجر ہوتا ہے۔

(۲) قطب الاوتاد: چار ہوتے ہیں۔دنیا کے چار اطراف میں تمام اوتاد کے اوپر افسر ہوتے ہیں۔محافظین۔اوتاد وغیرہ پر ہی قطب الاوتاد احکام صادر کرتے ہیں۔یہ چار قطب ہوتے ہیں۔لیکن ان میں ایک سردار کی حیثیت رکھتا ہے۔اسلئے بجائے چار کے ان میں ایک ہی قطب الاوتاد نمایاں رہتا ہے۔

(۳) قطب شاہ۔یا قطب سلاطین: تمام امور سلاطین کے نظام پر متعین ہوتے ہیں۔یعنی (باقی حاشیہ اگلے صفحہ پر)

"نَاشِئَةَ الَّيْلِ هِيَ اَشَدُّ وَطْأً وَّ اَقْوَمُ قِيْلًا ۝ تحقیق رات کا جاگنا جو کہ تزکیہ نفس کیلئے اکسیرِ اعظم کا درجہ رکھتا ہے۔ فاقہ کے ساتھ اسکی نفسانی قوتوں کو کچل کر رکھدیتا ہے۔ گویا فنا کر دیتا ہے۔ پھر انسان مجسم روح حیوانی بن جاتا ہے ـــــ روح حیوانی کی تاثیر اپنی ابتدائی قوت کے اعتبار سے ایٹم وایتھر

(بقیہ حاشیہ گزشتہ صفحہ) باطن (اجلاس رسول اللہؐ) سے تمام سلطنتوں کے خیر وشر کیلئے باطنی احکام مقرر کئے جاتے ہیں۔ انہیں احکام کے مطابق اکثر امور دنیا پر بھی رونما ہوتے ہیں۔ مثلاً کسی سلطنت کی وسعت اور عروج کے ذرائع کا پیدا ہونا۔ یہ اسطرح ہوتا ہے۔ کہ اوتاد۔ ابدال۔ قطب الابدال۔ قطب الاوتاد۔ قطب شاہ۔ لوگوں پر توجہ ڈالتے ہیں۔ انکے دلوں میں اس قسم کے خیالات پیدا ہوتے ہیں عمال حکومت کو بھی ترکیبیں سوجھتی ہیں انہیں خیالات پر بحث کی جاتی ہے۔ آخر انہیں خیالات کے تحت ملک میں ترقی کی راہیں پیدا ہوتی ہیں۔ اسی طرح دین کے معاملہ میں لوگوں میں دین سے دلچسپی علماء میں جوش اسی توجہ کے ذریعہ پیدا ہوتا ہے۔ اور علماء دین کی ترقی کی تدبیر شروع کرتے ہیں اور ملک میں دین کا چرچا شروع ہو جاتا ہے۔ یا کسی جگہ بیماریوں کا زور پیدا کیا جاتا ہے۔ لوگوں میں اسی توجہ سے بیماری کے آثار قوی ہو جاتے ہیں۔ اور اسکے اسباب بھی پیدا کئے جاتے ہیں تو بیماری کا زور پھیل جاتا ہے۔ جب اسکی معیاد ختم ہو جاتی ہے۔ تو پھر بیماری کے دفعیہ کے اسباب پیدا کرتے ہیں۔ تو بیماری دور ہو جاتی ہے۔ وغیرہ۔ جملہ امور مملکت ـــــ جو احکام اجلاسِ محمدیؐ سے کسی مملکت کیلئے صادر ہوں وہ قطب سلاطین (قطب شاہ) کو دیئے جاتے ہیں۔ قطب شاہ قطب الاوتاد و قطب الابدال کو دیتا ہے۔ قطب الاوتاد۔ قطب الابدال اوتادوں۔ محافظوں اور دیگر محلہ وار محافظوں کو دیتا ہے۔ اور اسکا نفاذ ہو جاتا ہے۔

جب کسی مملکت کی شکست کا فیصلہ اور کسی سلطنت کی فتح کا فیصلہ بارگاہِ ایزدی سے ہو جاتا ہے۔ تو یہ حکم آسمان سوم پر ایک ملائکہ کے پاس جس کا نام بکُوْن ہے۔ آتا ہے۔ اس ملائکہ کے پاس ایک نوری لوح (رجسٹر) ہوتی ہے۔ جس پر تمام سال کے طے شدہ امور درج ہوتے ہیں یہ امور تَنْزِيْلٌ مِّنْ رَّبِّ الْعٰلَمِيْنَ کے تحت لَيْلَةُ الْبَرَاءَ ۃ (شب برأت شعبان کی پندرھویں شب) میں مقرر کئے جاتے ہیں۔ اور انہیں امور سے احکام رب العٰلمین لَيْـــلَةُ الْقَدْرِ میں تَنَزَّلُ الْمَلٰٓئِكَةُ وَالرُّوْحُ فِيْهَا کی آیت کے تحت بیت اللہ کے دوسرے اجلاس محمدیؐ میں نازل ہوتے ہیں۔ یہاں سے احکام بین الاقطاب صادر کئے جاتے ہیں۔ اور سال بھر دنیا پر رائج ہوتے رہتے ہیں۔ اسکے علاوہ بعض اوقات دنیا میں لوگوں کے اعمال و کردار کے اثرات کا مشاہدہ کرنے پر اولیا (قطب) اپنی نئی سکیمیں پیش کرتے ہیں کہ زمانہ کے حالات کے مطابق اسوقت اِس قسم کے احکامات کی ضرورت ہے۔ تو یہ سکیم اقطاب (باقی حاشیہ اگلے صفحہ پر)

سے بھی قوی ہوتی ہے۔انسانی وجود میں ان قوتوں کی طرح وسیع قوت پیدا ہو جاتی ہے۔اس قوت کے اثر کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اگر انسان ہوا میں اڑنا چاہے۔تو بغیر کسی روکاوٹ کے اڑ سکتا ہے۔ایک آن میں بمعہ جسم ایک جگہ سے دوسری جگہ (مشرق سے مغرب) تک پہنچ سکتا ہے۔اگر کسی پہاڑ پر نظر

(بقیہ حاشیہ گزشتہ صفحہ) کے ذریعہ مجلس رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم میں حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کے سامنے پیش ہوتی ہے۔ اسوقت تمام اقطاب مجلس رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم میں پیش ہوتے ہیں۔اور ہر قطب کی سکیم پر مدلل بحث ہوتی ہے۔ دراصل یہ سکیمیں اقطاب کے مشاہدہ میں اپنی عقلی رائے پر جو علم شریعت (قانون شریعت) کی روشنی میں تیار کرتے ہیں قائم کی جاتی ہیں۔اسلئے ان پر بحث لازمی ہوتی ہے۔کہ اس سکیم کے نفاذ کے بعد جو نتائج پیدا ہوں انکے حقیقی تاثرات بھی پیدا ہوں اور ان تاثرات میں خامی واقع نہ ہو (کیونکہ یہ سکیم اجتہادی ہوتی ہے) ان سکیموں پر بحث کرنے کیلئے مجلس رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم میں انہیں اقطاب پر مشتمل ایک مجلسِ مشاورت قائم کی جاتی ہے۔ یہ مجلس (کمیٹی) منتخب شدہ اولیا کی ہوتی ہے۔اس میں قطب ہوتے ہیں۔جو علم کے اعتبار سے ولی مکمل بھی ہوتے ہیں اور بعض جنہیں شرعی علم میں بھی کمال ہوتا ہے۔ولی کامل بھی شامل کئے جاتے ہیں۔اس مجلس میں امور طے ہونے کے بعد حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کی تصدیق ومنظوری کے بعد احکام صادر کئے جاتے ہیں۔یہ احکام حسب دستور اقطاب کو دیئے جاتے ہیں اور انکا نفاذ دنیا پر ہوتا ہے۔اسی طرح قطب الاوتاد تک اس قسم کے احکام پہنچتے ہیں جن میں ایک سلطنت کی شکست اور دوسری کی فتح واقع ہوتی ہے۔تو قطب الاوتاد جسکے ہاتھ میں نیزہ (پیمائشی) اور ترازو ہوتا ہے۔زمین نیزہ سے ماپ کر ترازو میں تول کر دوسری سلطنت میں شامل کر دیتا ہے۔تو ایک فاتح حکومت کے لیے فتح یقینی ہو جاتی ہے۔ مثال کے طور یہ مقدر ہو چکا ہے کہ جنگ عظیم ہو اب ایک حکومت اپنے پورے اقتدار کے ساتھ حملہ آور ہو جاتی ہے۔اور اسکی فتح کے آثار (نشان) یقینی پائے جاتے ہیں۔اور اس جنگ کے واقعات لحہ بہ لحہ مجلس محمدیؐ میں پیش ہوتے ہیں۔ اگر اقطاب کے مشاہدہ میں ایسے واقعات آئیں جن میں اس حکمران کی کامیابی۔مفتوح قوتوں کے مقابلہ میں عامتہ الناس کیلئے زیادہ (انکے دینی دنیاوی معاملات میں) نقصان دہ ہوں تو وہ دوبارہ اس بارے میں اپنے مطالبات اور آرا پیش کرینگے۔بحث وتمحیص کے بعد یہ فیصلہ ہوگا۔کہ مفتوح قوموں کی قوتوں کو بھی کمزور کیا جائے۔اور فاتح کو بھی شکست ہو۔تو اقطاب کی توجہ سے دفعتاً واقعات کا رُخ بدل جائیگا۔فاتح حکومت کیلئے شکست کے اسباب پیدا ہونگے اور آخر کار ایک فاتح کی یقینی فتح شکست سے بدل جائیگی۔

(۴) **قطب المدار:** یہ قطب باقی اقطاب سے منصب میں اعلیٰ ہوتا ہے ___ کائنات کا نظام (باقی حاشیہ اگلے صفحہ پر)

ڈالے تو پہاڑ اسکی (افضل) ایٹمی قوت کے اثر سے ریزہ ریزہ ہوسکتا ہے۔ (چونکہ ایسی کیفیت سے نظام کائنات میں خلل واقع ہونے کا احتمال ہے اسلئے ولی ایسی حرکت نہیں کرتا۔ اسلئے ایسی کیفیتیں عام انسانوں کے مشاہدے میں نہیں آتیں) اگر یہی اثر چاند پر ڈالے تو چاند بھی ٹکڑے ہوسکتا ہے۔

(بقیہ حاشیہ گزشتہ صفحہ) باطنی برقرار رکھنے کے لیے جہاں اس کائنات کے نظام میں ایک خوبصورت تنظیم پائی جاتی ہے۔ لیکن جب تک ایک قدرت کاملہ کا دست قدرت شامل نہ ہو۔ ایک تبدیل ہونے والے نظام میں کسی وقت خلل آنے کا احتمال بھی ہوسکتا ہے جیسے دنیا میں واقعات تبدیل ہوتے رہتے ہیں۔ اس نظام کو برقرار رکھنے کیلئے قدرت نے باطنی نظام بھی مقرر کیا ہے۔ چنانچہ قطب المدار کا مقام یہ ہوتا ہے۔ کہ عالم باطن میں جہاں اللہ کے نور کا احاطہ ہوتا ہے اس عالم میں تحت الثریٰ سے عرش تک ایک نوری ستون واقع ہوتا ہے۔ یہ ستون قطب مدار کے روحانی وجود سے گذرتا ہوا جاتا ہے۔ باالفاظ دیگر قطب مدار کا یہی مقام اسکے منصب کے لحاظ سے ہوتا ہے کہ وہ اس منصب کے ملنے پر اسی مقام پر آجاتا ہے۔ اور اس نوری ستون کی حرکت کو اپنے قبضہ میں رکھتا ہے۔ اسکی نظر تمام جہان پر رہتی ہے۔ اور تمام جہان کی حرکت اسکے قبضہ میں ہوتی ہے اسی سے تمام جہان کا نظام قائم رہتا ہے۔ یہی قطب مدار دنیا کے لوگوں پر زمانہ کے مطابق دین کی طرف رجوع کرنے کی توجہ دیتا ہے ــــ جس توجہ سے زمانہ میں دین کو ترقی ہوتی ہے۔

<u>(۵) قطب الارشاد:</u> یہ قطب قطب المدار سے افضل ہوتا ہے ــــ باقی تمام اقطاب کا سردار ہوتا ہے۔ ان اقطاب کو قطب الارشاد کے ذریعہ ہی احکام حاصل ہوتے ہیں۔ یہ قطب بھی دین (شریعت) کے نفاذ کیلئے حکم صادر کرتا ہے۔ جس وقت یہ حکم دیتا ہے۔ اسوقت دین ترقی پر ہوتا ہے۔ اور اسکی توجہ کے بغیر لوگ اپنے ارادہ سے شریعت و ہدایت قبول کرنے میں کوتاہی کرتے ہیں۔ یعنی جب مقصود ہو کہ لوگ ہدایت یافتہ ہوں تو قطب الارشاد کی توجہ لوگوں کے قلب پر پڑتی ہے۔ لوگوں کا رجوع دین کی طرف ہونے لگ جاتا ہے۔ یہی قطب الارشاد اگر علم شریعت میں پورا کمال رکھتا ہو۔ تو اسے ظاہری طور تبلیغ و ہدایت پر مامور کیا جاتا ہے۔ ایسا شخص لوگوں میں تبلیغ دین کر کے لوگوں کے دلوں میں دین کو تازہ کرتا ہے۔ ایسا قطب جب علم شریعت کے ساتھ تبلیغ بھی کرے غوث کہلاتا ہے جیسے گزشتہ زمانوں میں حضرت محی الدین عبدالقادر جیلانیؒ۔ معین الدین چشتیؒ۔ مجدد الف ثانیؒ۔ وغیرہ ــــ قطب الارشاد حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کے اجلاس محمدیؐ میں تیسرے درجہ کا قطب ہوتا ہے۔

<u>(۶) قطب العالم:</u> تمام عالموں کا سردار تمام عالم کی خیر و شر اور ہر قسم کے نظام کے اختیارات قطب العالم کے ہاتھ ہوتے ہیں یہ قطب تمام اقطاب پر فوقیت رکھتا ہے۔

(باقی حاشیہ اگلے صفحہ پر)

(مگر یہ انسان کی انتہائی قوت سے تعلق رکھتا ہے۔اسلئے ایسا واقع ہونے میں نہیں آسکتا البتہ تاثیر کا پایا جانا یقینی ہے)انسان زمین میں مدت تک دفن رہ سکتا ہے اور پھر زندہ نکل سکتا ہے۔اسکی زبان میں یہ تاثیر پائی جاتی ہے کہ جو کہے ہوسکتا ہے۔بیمار ایک آن میں تندرست ہوسکتا ہے۔مردے میں اس توجہ سے زندگی کے آثار پیدا ہوسکتے ہیں(کیونکہ یہی روح انسانی جسم کیلئے وجہ زندگی ہوتی ہے)اسی طرح انسان سے ہر مافوق الفطرت واقعہ کا صدور ہوسکتا ہے۔یہ امر قابل ذکر ہے۔کہ اس کیفیت کو انسان

(بقیہ حاشیہ گزشتہ صفحہ)

(۷) <u>قطب الاقطاب:</u> یہ آخری درجہ کا قطب ہوتا ہے۔اور تمام اقطاب کا افسر اعلیٰ ہوتا ہے۔اسی لئے اسے قطب الاقطاب کے خطاب سے پکارا جاتا ہے۔اس کا مرتبہ منزل صدیقی میں ہوتا ہے۔یعنی حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کے بعد طریقت میں نائب رسول اللہ۔ولی اکمل یہی ہوتا ہے۔تمام احکام جو بیت اللہ کے اجلاس دوم (دریائے توحید میں) اور جملہ احکام اول اجلاسِ محمدیؐ سے اجرا ہوتے ہیں۔رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم قطب الاقطاب کو حوالے کرتے ہیں۔قطب الاقطاب قطب العالم کو سپرد کرتے ہیں۔قطب العالم قطب الارشاد کو حوالہ کرتے ہیں۔قطب الارشاد۔قطب مدار کو۔قطب مدار قطب سلاطین کو۔قطب سلاطین قطب الاوتاد۔قطب الابدال کے حوالے کرتا ہے ـــــ اسی طرح تمام عالم کی ہفتہ وار کارکردگی بھی قطب الاقطاب کے ذریعہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پیش ہوتی ہے۔اسی میں آپکی امت کے اعمال بھی ہفتہ وار (یعنی جمعہ کی رات کو) پیش ہوتے ہیں۔ہفتہ کے ہر جمعہ کی شب کو جمعرات کی عصر سے لیکر جمعہ کی ظہر خطبہ تک اول اجلاس محمدیؐ میں پیشیاں (حاضری) ہوتی ہیں۔اور ہفتہ کے لیے احکام صادر ہوتے ہیں۔یہی وجہ ہے۔کہ جمعہ کی شب اور جمعہ کو درود پڑھنے کا زیادہ سے زیادہ حکم دیا گیا ہے۔

قطب الاقطاب۔ولی اکمل ہونے کی حیثیت سے۔نائب رسول اللہ ہوتا ہے۔اور اجلاس محمدیؐ میں۔جہاں حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام تخت سنہری پر جلوہ افروز ہوتے ہیں۔ولی اکمل حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کی دائیں طرف ہر وقت کرسی نشین ہوتا ہے۔اور اسکے فیض کا طریقہ یہ ہوتا ہے۔کہ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کی توجہ نوری قطب الاقطاب کے قلب پر ہوتی ہے۔اور تمام اقطاب اسی قطب الاقطاب کے ذریعہ (ولی اکمل کے قلب سے) توجہ حاصل کرتے ہیں ـــــ اور تمام اقطاب کے منصب اسی قطب الاقطاب کے ذریعہ ہر شخص کو حاصل ہوتے ہیں۔گویا قطب بنانا قطب الاقطاب کی مرضی اور حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کی تصدیق سے ہی ہوتا ہے۔

بغیر شرعی تعمیل کے بھی حاصل کرسکتا ہے۔ کیونکہ اسکا تعلق روح حیوانی سے ہوتا ہے۔ اسلئے ایسے واقعات کا صدور۔ شریعت وطریقت میں جب تک عامل نہ ہو درجہ مقبولیت اور ولایت میں کچھ وقعت نہیں رکھتا بلکہ ایسی قوت کو بھی استدراجی قوت سے تعبیر دیا جاتا ہے۔ اور جب انسان شریعت کے قانون کی پابندی میں نظام فطرۃ کی حدود میں پابند نہ رہے۔ ایسے انسان سے اکثر مواقع میں ان قوتوں کے ہوتے ہوئے عامتہ الناس کے لیے وجہ مغلوبیت اور شر وفساد بھی ہوتا ہے ـــــ اور جب انسان شریعت کی پابندی میں یہ قوت حاصل کرے تو بجائے نقصان کے یہ قوتیں نفع بخش ہوتی ہیں۔ لیکن اس قوت کے ہوتے ہوئے بھی جب تک ولی اکمل کی روح رحمانی کے ذریعہ جذب حاصل کرکے عالم ملکوت کے اول اجلاس محمدیؐ میں داخل نہ ہو ایک عامل ولی نہیں کہلاسکتا۔ نہ اسکی بیعت کی جاسکتی ہے۔ اگر ان قوتوں کے ساتھ ولی اکمل ہو جائے تو ایسا شخص بھی اپنی ان قوتوں کے ذریعہ مخلوق کی دستگیری کرسکتا ہے۔ ایک گمراہ کو اپنے وجود کے ساتھ حاضر ہو کر راہ دکھا سکتا ہے۔ ایک کمزور شخص کو دشمنوں کے نرغہ سے بچا کر محفوظ کرسکتا ہے۔ ایک مجبور شخص کی ہر حالت میں اپنی قوتِ روحانی کی مدد سے ہر قسم کی مدد کرسکتا ہے۔ روح حیوانی اور جسم کی قوت کے ساتھ اسے تمام کائنات کا مشاہدہ رہتا ہے۔ یہ شخص مشرق میں رہ کر مغرب کے ایک انسان کی دستگیری[1] کرسکتا ہے۔ ایسی حالت میں

---

[1] گزشتہ روح حیوانی کے متعلق بحث میں قرآنی آیات اور حدیث قدسی کی روشنی میں یہ دلیل دی جاچکی ہے۔ کہ انبیاء۔ اولیاء۔ شہدا کی روح حیوانی اپنی ابتدائی نوری حالت میں باقی رہتی ہے۔ اس روح حیوانی اور روح رحمانی میں بغیر مادی حواس اور وجود کے بھی۔ ادراک اور ارادہ موجود ہوتا ہے ـــــ مثال کے طور انسان خواب میں ایک واقعہ دیکھتا ہے۔ کہ وہ گھر سے کسی سفر پر جاتا ہے۔ دوسرے ملک میں وہ کسی آدمی سے ملتا ہے۔ وہ شخص اسے کسی کارخانہ میں ملازم کرادیتا ہے۔ وہاں یہ کام کرتا ہے۔ خود ارادہ سے حرکت کرتا ہے۔ سنتا ہے۔ بولتا ہے۔ دیکھتا ہے اور ایک کام کی تکمیل بھی کرتا ہے۔ تو اس خواب کی کیفیت خواہ وہ نفسانی خواہشات کا نقشہ ہو۔ یا خیالی۔ یا واہمی یہ ضروری ہے۔ کہ انسان بغیر مادی وجود کی حرکت کے ایک مجسم کو حرکت کرتے دیکھتا ہے۔ اگر چہ یہ تمام کیفیت ایک موہوم انداز میں ہے۔ جسکا کوئی وجود نہیں۔ نہ روحانی اور نہ جسمانی۔ لیکن یہ ضروری ہے۔ کہ وہ نفسانی خواہشات یا تخیلی (باقی حاشیہ اگلے صفحہ پر)

اسکے لیے ماضی حال و مستقبل کی کوئی قید نہیں رہتی۔ البتہ ان کیفیات کا حاصل کرنا انتہائی تزکیہ ومجاہدہ سے تعلق رکھتا ہے۔ یہ کیفیت بہت کم لوگوں کو حاصل ہوتی ہے۔ یہی وجہ ہے۔ کہ ایسے واقعات دیکھنے میں نہیں آتے۔ دیکھنے میں آیا ہے زمانہ کے حالات یکساں طور پر موافق نہیں رہتے اسلئے ہر شخص کیلئے ایسی قوت کا حاصل کرنا ممکن نہیں ہوسکتا۔ بلکہ ایسے اشخاص بہت کم پائے جاسکتے ہیں۔ عام انسانوں کو ان کیفیات کا مشاہدہ عام نہیں ہوسکتا ـــــ عرفان و مشاہدہ کیلئے بھی ہر شخص جاگتی حالت میں مشاہدہ نہیں کرسکتا۔ بلکہ اکثر مشاہدات خواب ہی کی حالت میں مشاہدے میں آتے ہیں۔ البتہ اس کیفیت مشاہدہ میں ایک راہنما۔ ولی مکمل اور ولی اکمل کی مقبولیت اور خوشنودی کو دخل ہوتا ہے۔ کہ وہ (ولی اکمل) اپنے جذب اور اختیار سے طالب حقیقت کا تزکیہ کر کے اس قابل بنادیتا ہے۔ کہ وہ اپنی ابتدائی

(بقیہ حاشیہ گزشتہ صفحہ) عکس انسان کے جسم میں ذرات یا برقی لہروں کی ہیئت میں موجود ہیں۔ اگر انکا کوئی وجود نہ ہوتو یہ نفسانی خواہشات نہ پیدا ہوسکتی ہیں۔ نہ انکی کوئی خواب آور کیفیت پیدا ہوسکتی ہے۔ اگر یہ برقی لہروں کی مانند وجود رکھتی ہیں۔ تو ایسی نفسانی خواہشات جنکو ہم بے معنی سمجھتے ہیں۔ اپنے میں اتنی قوت رکھتی ہیں۔ کہ اپنے حرکت وعمل سے ایک مکمل کیفیت اور واقعہ پیدا کرتی ہیں۔ جس میں انکے ارادہ کا مادہ۔ حرکت کا مادہ۔ حواس کا مادہ پایا جاتا ہے۔ تو وہ قوتیں جو انسان میں اپنی روحانیت میں خالص ہوں اسی طرح ایک مکمل کیفیت پیدا کرسکتی ہیں۔ اور جب انبیاء اولیا وشہدا کی روح حیوانی اور روح رحمانی اس حالت میں پائی جائیں کہ انسان کی موت کے بعد بھی یہ اپنی نورانی ہیئت کے اعتبار سے ارادہ وحواس (روحانی) ایک مادی وجود کی ہیئت میں ظاہر ہوسکیں تو جسطرح ایک انسان اپنی زندگی میں ایک شخص کی امداد میں دشمنوں سے بچاتا ہے۔ اسکی ہر طرح مدد کرسکتا ہے۔ ایک مقام سے دوسرے مقام تک جاسکتا ہے۔ اسی طرح موت کے بعد اپنی قوی قوت کے ذریعہ (ملکوتی قوت) ایک شخص کی اپنی ہیئت کے اعتبار سے امداد کرسکتی ہے۔ اور ہر فعل کرسکتی ہے جو یہ اپنی انسانی زندگی میں کرسکتی تھی۔ اسکے لیے انسانی ہیئت میں آنا ایسا ہی ہوگا جیسا (فَتَمَثَّلَ لَهَا بَشَرًا سَوِيًّا) ملائکہ حضرت مریمؑ کے پاس بشر کی صورت میں آیا۔ یا قوم لوط کے پاس بشر کی حالت میں آکر اسکو تباہ کیا۔ اور لوطؑ اور آل لوط کی حفاظت کی ـــــ یہی طریق دستگیری ان اولیاء کو حاصل ہوتا ہے۔ جنکی روح حیوانی سالم نورانی ہو۔ اور روح رحمانی ذات الٰہی کے نور میں جذب ہو۔ جہاں وہ مثل مجسم زندگی کے عالم مادی وغیر مادی کی ہر کیفیت سے ہمیشہ (خواہ زندگی ہو یا موت کے بعد کی زندگی ہو) آگاہ رہنے کی قدرت رکھتے ہیں۔

منزل میں اول اجلاس محمدی ﷺ کا مشاہدہ کرسکتا ہے۔اور جاگتی حالت میں مشاہدہ کرسکتا ہے۔یہی وجہ ہے کہ ان چار سلسلوں کو وجہ شرف وافضلیت حاصل ہوتی ہے۔کہ ان اولیاء اکملین کو درجہ مقبولیت حاصل ہے۔اور ان کے پیروؤں کا دعویٰ ہوتا ہے۔کہ ہمیں ایک مقبول ومقرب ولی اکمل کا علم وتوجہ حاصل ہے۔اس میں شک نہیں کہ انکا علم وقبول مسلّم ہوتا ہے۔مگر ہر شخص اس نور سے اس وقت تک مکمل فیض حاصل نہیں کرسکتا جب تک اسی ولی اکمل کی طرح حُب اور عمل کا جذبہ قائم نہ کرے۔اسلئے ضروری نتیجہ یہ ہوتا ہے۔کہ انسان سلسلہ سے نسبت رکھتا ہے مگر وہ خصوصی قوتیں علم وراہنمائی کی اس میں پائی نہیں جاتیں۔اور جیسے ابتدائی طور ایک طریق میں نقص آجاتا ہے۔ولی اکمل کے بعد یہی کیفیت سلسلہ میں پیدا ہوتی ہے۔کہ نفس کی لذت کی خاطر ایک مصنوعی ولی اپنی اغراض پوری کرنے کیلئے صرف ولی کا لبادہ پہنتا ہے۔جسکا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ نہ طالب کو حقیقی علم کی شناخت رہتی ہے۔نہ اسے مکمل عرفان حاصل ہوتا ہے۔نہ ہی سلسلہ اور بانئے سلسلہ کی خصوصیت باقی خلفا کو حاصل ہوتی ہے۔

ان چار سلسلوں کی نسبت میں اگرچہ انکے بانیوں کو درجہ کمالیت حاصل ہے۔مگر سب سے زیادہ مقبولیت سلسلہ قادریہ کی پائی جاتی ہے۔کیونکہ حضرت محی الدین شیخ عبدالقادر جیلانی رضی اللہ عنہ نے حب۔عمل۔تزکیہ علم وراہنمائی کا سب سے اعلیٰ مرتبہ حاصل کیا ہے۔آپکی تصانیف سے علم اور تزکیہ کا بہترین مواد حاصل ہوتا ہے۔تواریخ سے آپ کی تمام زندگی کے کردار پر مطالعہ کرنے سے معلوم ہوتا ہے۔کہ آپ کی ابتدا (پیدائش) بھی ایک ولی کی حیثیت سے ہوئی گویا آپ ایک منتخب ولی کی حیثیت سے مادرزاد ولی پیدا ہوئے۔چنانچہ آپکی ظاہری پیدائش کے واقعات بھی ایک مافوق الفطرت وقوعہ ہیں۔

پیغمبر کے بعد احکام شریعتِ محمدی ﷺ کی اشاعت امت کے ایک عالم کے ذمہ ہوتی ہے۔جو قرآنی علم کی اشاعت بہ طریق نبوت پوری کرتا ہے۔فرق صرف یہ ہوتا ہے۔کہ پیغمبر پر وحی (کلام الٰہی) نازل ہوتی ہے۔اور اس وحی کے نزول کے باعث علم پیغمبر سے منسوب ہوتا ہے۔گویا علم کی تعمیل کا اصل مقصد اور نمونۂ عمل پیغمبر سے ہی حاصل ہوتا ہے۔اسکے مقابل ولی پر وحی نازل نہیں ہوتی۔کیونکہ اس وحی (علم الٰہی) کی تکمیل پیغمبر پر ہو جاتی ہے۔دوسرے ولی بھی پیغمبر کے علم وعمل کی تقلید کرتا

ہے۔ اسکا نہ اپنا علم ہوتا ہے۔ نہ عمل ہوتا ہے۔ لیکن قرآنی علم دونوں حیثیتوں میں ایک ہی ہوتا ہے۔ اسکا نتیجہ بھی ایک ہی (عرفان) ہوتا ہے۔ پیغمبر اپنے انتہائی حُب اور جہد سے انتہائی کمال حاصل کرتا ہے۔ ولی میں نہ اتنی استطاعت ہوتی ہے۔ کہ پیغمبر جیسی حُب اور مجاہدہ کر سکے اسلئے ہر ولی اپنی قوتِ جہاد اور حب کے تحت ہی قرب و مقبولیت حاصل کرتا ہے اور جسقدر جسکا قرب و مقبولیت وسیع ہو اسی قدر ایک ولی کی راہنمائی قابلِ تقلید اور مقبول ہوتی ہے۔

ولی کی خصوصیت سنتِ نبوی کے تحت یہ ہوتی ہے۔ کہ وہ علم و راہنمائی (تجدید) کے لیے ازل سے منتخب ہوتا ہے جیسے ایک رسول ازل سے وحی کے لیے منتخب ہوتا ہے۔ اور جسطرح پیغمبر کی پیدائش القائے ربانی کے ذریعہ کلمۃ اللہ۔ روح اللہ۔ کلیم اللہ۔ حبیب اللہ کی شکل میں ہوتی ہے۔ اسی طرح ولی کی پیدائش بھی القائے ربانی کے تحت کلمۂ رسول اللہ۔ روح رسول اللہ کی شکل میں واقع ہوتی ہے۔ اور ہر ولی کی راہنمائی اور ارادت میں آنے والے ولی کی بھی اسی طرح ولی اکمل سے معنوی نسبت ہوتی ہے یہی نسبتِ اللہ و رسول وجہِ انتخاب و خصوصیت ہوتی ہے۔ چنانچہ مثنوی مولانا روم کے اس شعر میں اسی کیفیت کی طرف اشارہ ہے۔

گر بصورت مَن زِ آدمؑ زادہ ام　　　من بمعنی جدِّ جد افتادہ ام

اگر چہ صورت کے لحاظ سے میں اولاد آدم میں شمار ہوتا ہوں۔ مگر معنی (حقیقت) میں آدم کی روح میرے ہی ازلی وجود سے نکلی ہے جس نے آدم کی صورت اختیار کی۔

پس زِ من زائیدہ در معنی پدر　　　پس زِ میوہ زاد در معنی شجر

اسلئے باپ کا وجود بشری میرے ہی نور سے نکلا ہے۔ جیسے میوہ سے درخت اور درخت سے میوہ۔ اسکی ترکیب فطری ہوتی ہے۔ کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے اردۂ ازلی میں کائنات بنانے کا تصور رکھا۔ تو کائنات میں انسان کی پیدائش کا انتخاب کیا۔ انسان کے لیے صرف علم۔ عمل اور نتیجہ (عرفان) کا انتخاب کیا۔ علم و عمل کیلئے اپنے نور سے پیغمبر کی روح بنائی اسطرح ایک پیغمبر کا انتخاب کیا۔ تا کہ کائنات کی تخلیق

کے مقصد کی تکمیل اسی سے کرائی جائے۔ مگر ہر شخص کیلئے پیغمبر ہونا ضروری نہیں اسلئے اس نسبت کو قائم کرنے کیلئے پیغمبر کے نور (بطن معنوی) سے اولیائے اکملین کی روح بنائی اسطرح ایک ولی اکمل کا انتخاب کیا۔ اب ضرورت تھی کہ مقصود کائنات کی تکمیل ہو۔ سو ولی اکمل کی روح (بطن معنوی) سے بے شمار مخصوص روحیں (انکے ارادت مندوں اور پیروؤں کی) بنائیں۔ انہیں ارادت مندوں سے ایک طرف مقصود کی تکمیل ہوئی۔ دوسری طرف علم کو دوام عطا کیا۔ اور ہر شخص تک ایک عالم کے ذریعہ علم پہنچانے میں تبلیغ کا کام پورا کیا[1]۔ سو ــــ ولی کی خصوصیت بھی اسی نوعیت کی ہوتی ہے ــــ چنانچہ حضرت شیخ عبدالقادر جیلانی رضی اللہ عنہ۔ کی ذاتِ گرامی کو بھی یہ نسبت وخصوصیت بدرجہ اولیٰ حاصل تھی۔

حضرت شیخ عبدالقادر جیلانیؒ: ظاہری طور آپ صحیح نسب خاندان سادات سے (سیّد) ہیں۔ آپکی نسبت حسنی (امام حسنؑ) حسینی (امام حسینؑ) ہے۔ اور حضرت علی کرم اللہ وجہہ کے توسل سے حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام سے یہ نسبت ملتی ہے۔ اور روحانی طور بھی آپکا وجود مبارک کلمۂ رسول اللہ سے خصوصی نسبت رکھتا ہے۔ جیسے حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے۔ حضرت علی۔ حضرت امام حسن۔ حضرت امام حسین علیہم السلام کے لئے فرمایا دَمُّکَ دَمِّیْ ۔ لَحْمُکَ لَحْمِیْ۔ آپکا خون میرا خون۔ آپکا گوشت

---

[1] یہاں پر ایک غلطی کا احتمال ہوتا ہے۔ کہ اگر ایک پیغمبر سے ولی کا وجود ہوا۔ اور ولی سے اسکے پیروؤں کا وجود ہوا۔ تو یہ کیفیت مقدر ہو جاتی ہے۔ کہ وہی شخص ولی ہو سکتا ہے۔ جو پیغمبر اور ولی کے وجود سے بنا۔ باقی چونکہ اس وجود سے نہیں تو یہ لوگ مقدر نہ ہونے کی وجہ سے ہدایت نہیں پاتے۔ ایسا سمجھنا غلطی ہے۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ نے ہر انسان کو ازل سے اشرف المخلوقات بنا کر بھیجا گویا ہر شخص کیلئے ہدایت یافتہ ہونا مقدر کیا گیا۔ اب انہوں نے خود انحراف کیا۔ اور ذلت میں آگئے۔ اب ایسے لوگ جو پیغمبر اور اولیاء کے وجود میں مقدر کئے گئے انکے مقدر کی خصوصیت یہ ہے۔ کہ انہیں وہ علم دیا جاتا ہے۔ جس سے وہ تمام انسانوں کو بلا تخصیص مذہب اپنے مقدر کئے گئے اشرف المخلوقاتی منصب پر لانے کیلئے راہنمائی کر کے انہیں اپنے اعلیٰ مقدر کی طرف لوٹا دیں۔ جب انہیں وہ مقام حاصل ہوا۔ تو انہیں بھی وہی عظمت حاصل ہوگی۔ جو ایک ولی کو حاصل ہوتی ہے کیونکہ ولی میں بھی وہی کیفیت ہوتی ہے جو عَلَّمَ اٰدَمَ الْاَسْمَآءَ کُلَّهَا میں ہر انسان کو عطا کی جاتی ہے۔ اس صورت میں ہر ایک کا مقدر یکساں حیثیت حاصل کر لیتا ہے۔

میرا گوشت۔ اس کیفیت سے دونوں ظاہری باطنی نسبتیں مستقل ہو جاتی ہیں۔

یہی کیفیت سلسلہ نسب اور اولاد معنوی ہونے کی حیثیت میں حضرت غوث الثقلین حضرت شیخ محی الدین عبدالقادر جیلانیؒ سے نسبت رکھتی ہے۔ کہ آپ کا وجود ظاہری باطنی حضرت امام حسنؓ و حسینؓ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے وجود سے ہے اور آپ اپنی پیدائش میں ایک منتخب ولی کی حیثیت سے مادرزاد ولی پیدا ہوئے۔ چنانچہ آپکی والدہ ماجدہ کا قول (صحیح اسناد سے) ہے۔ کہ آپ نے پیدا ہونے کے بعد ماہ رمضان میں روزے کے وقت دودھ نہیں پیا۔ آپکا ایک اور واقعہ بھی مشہور ہے۔ کہ ایک سال ماہ رمضان کا چاند ابر کی وجہ سے دیکھا نہیں گیا۔ رویت ہلال کی صحیح روایت نہ مل سکی۔ تو آپکی والدہ سے پوچھا گیا۔ تو انہوں نے فرمایا۔ کہ آج بچے نے دودھ نہیں پیا اسلئے آج رمضان کی پہلی تاریخ ہے۔ بعد میں رویت ہلال پر معلوم ہوا کہ واقعی وہ دن رمضان کا پہلا دن تھا۔ اسی طرح آپ سے کسی نے پوچھا کہ آپکو اپنی ولایت کا علم کب ہوا۔ تو آپ نے فرمایا۔ دس سال کی عمر میں۔ جب میں مدرسہ جایا کرتا تھا۔ تو مجھے فرشتے اپنے اردگرد نظر آتے۔ اسی طرح آپکی زندگی کا مطالعہ کرنے سے معلوم ہوگا کہ آپکی زندگی مافوق الفطرت واقعات کا مجسمہ تھی۔

آپ نے اپنی کم سنی کی عمر میں علم حاصل کرنے کیلئے ہجرت اختیار کی۔ غریب الوطنی میں آپکی حالت یہ رہی کہ مہینوں آپکو کھانے کیلئے روٹی کا ایک ٹکڑا نہ ملتا۔ لیکن آپکے صبر و قناعت میں استقلال کی یہ حالت تھی۔ کہ کبھی بھوک کی شدت سے مانگ کر نہ کھایا۔ نہ ہی اس تکلیف دہ کیفیت سے آپکے جہد و ثبات میں فرق آیا۔۔۔ یہ بھی ایک رسولی نسبت کی کیفیت تھی۔ کہ آپ نے اپنی زندگی میں حصولِ رزق میں سنتِ نبویؐ کے مطابق نفس کا تزکیہ کیا۔ آپ کے صادق [1] ہونے کا ایک مشہور واقعہ ہے۔ کہ چوروں کے سامنے اپنی متاع لٹ جانے کے خیال سے بھی صدق کو نہ چھوڑا اور بتا دیا کہ

---

[1] آپکے کمالات اسقدر بے حساب ہیں۔ کہ انکا ذکر یہاں باعث طوالت ہے۔ آپکی زندگی کے حالات سوانح اور آپکی تصانیف کے مطالعہ سے حاصل ہو سکتے ہیں یہاں مختصراً چند پر اکتفا کیا جاتا ہے۔

میری گدڑی میں دینار سلے ہوئے ہیں۔ایک اور واقعہ آپکے امین ہونے کی شہادت ہے۔کہ ایک دن ایک مسجد میں تشریف فرماتھے بھوک کی شدت نا قابلِ برداشت تھی۔اسی اثنا میں ایک مسافر اجنبی مسجد میں داخل ہوا۔اور روٹی کھانے لگا۔حضرت شیخ عبدالقادر جیلانیؒ کی حالت یہ تھی۔کہ مسافر کے لقمہ منہ میں ڈالنے سے منہ کھل جاتا۔۔۔۔ آخر مسافر نے آپکی کیفیت دیکھ کر روٹی کھلائی۔بعد میں مسافر نے آپ سے پوچھا کہ مجھے ایک لڑکے کی تلاش ہے جسکا نام عبدالقادر ہے۔اسکی والدہ نے انکے لیے کچھ رقم بھیجی ہے۔ابھی تک وہ لڑکا مجھے۔نہ ملا۔اور آج میرے پاس بھی اپنا سرمایہ ختم ہے۔یہ روٹی اسی رقم سے خریدی ہے۔وہ لڑکا مجھے ملتا تو یہ رقم اسے دیتا اور اپنی خیانت اس سے معاف کراتا۔تو آپ نے بتایا میں ہی عبدالقادر ہوں اور میں نے تجھے معاف کر دیا۔اور یہ رقم بھی لے کر راہ خدا میں خیرات کر ڈالی۔یہ بھی امانت کی ایک حقیقی کیفیت ہے۔

آپکے زہد و ریاضت و مجاہدہ کا یہ حال تھا۔کہ اس غریب الوطنی کی اذیتیں کبھی آپکے عمل میں حائل نہ ہوسکیں۔رات بھر جاگتے اور عبادت کرتے۔آپکی سوانح سے معلوم ہوتا ہے۔کہ تقریباً اپنی تمام عمر قیام لیل کو (تمام رات) جاری رکھا یہاں تک کہ عشاء کے وضو سے صبح کی نماز ادا کرتے۔ سردی کے زمانہ میں۔کپکپی لگ جاتی مگر جذبہ حُب کی گرمی اسقدر تھی کہ شدّت کی سردی کو کبھی خاطر میں نہ لایا۔برعکس اسکے اگر کبھی طبیعت میں تساہل پاتے تو یخ بستہ (درجہ انجماد کو پہنچی ہوئی) سردی میں بیٹھ جاتے۔تاکہ نیند کا غلبہ طاری نہ ہو۔یہ تمام طریق کار سنت نبویؐ کے مطابق زندگی کے ابتدائی دور میں تھا۔اور اسی کیفیت حب نے آپ میں ان تمام خصوصیتوں کو جلا دی جو آپکے وجود میں پنہاں تھیں۔ چنانچہ آپ نے اپنے بچپن کے زمانہ میں ہی علم کی تکمیل کی۔اور آپ کے حب نے انہیں ابوالخیر ابوسعید مبارک مخزومیؒ۔حضرت شیخ حماد بن مسلم دباسؒ جیسی راہنما ہستیاں عطا کیں جنہوں نے آپکے مادۂ عرفان کا صرف سمت کی طرف رُخ پھیرا ورنہ جو کمال آپکو حاصل ہے۔اس میں اگر چہ راہنما ولی اکمل کی توجہ لازمی ہے۔لیکن اس میں شک نہیں جو کچھ مراتب و کمالات آپکو حاصل ہوئے۔وہ آپکے ذاتی جہد و تزکیہ کی خصوصیات سے تھے ۔۔۔۔ اور جب آپ اپنے کمالات میں انتہا کو پہنچے تو آپ نے

وہ مرتبہ حاصل کیا جو کسی ولی اکمل کو مقبولیت کے اعتبار سے کم ہی ملا ہو۔

قصیدہ غوثیہ: حضرت شیخ عبدالقادر جیلانیؒ کی تصانیف میں قصیدہ غوثیہ ایک مشہور قصیدہ ہے۔ یہ قصیدہ فخریہ ہے۔ کیونکہ یہ قصیدہ کسی اور نے نہیں لکھا۔ بلکہ اپنے کمالات کا خود اظہار کیا ہے۔ اس خصوصیت کا پایا جانا صرف ایک واحد ہستی حضرت شیخ عبدالقادر جیلانی رضی اللہ عنہ کیلئے ہی مختص ہے۔ کہ کوئی ولی اس پایہ کا فخریہ دعویٰ کرنے کی جرأت نہیں کرسکا۔ اور آپ نے اپنے کمالات لا انتہا کی بنیاد صرف ''حُب'' پر ہی رکھی ہے۔ فرماتے ہیں۔

سَقَانِی الْحُبُّ كَاسَاتِ الْوِصَالِ　　　فَقُلْتُ لِخَمْرَتِیْ نَحْوِیْ تَعَالِ

حُب نے جب مجھے جذبِ الٰہی میں اپنے انتہا کی تجلیات میں جذب کرنا شروع کیا۔ تو میرا جذبۂ شوق اسقدر وسیع اور تیز تھا کہ ہر تجلی پر میں ایک اور تجلی کیلئے پے در پے تجلیات کا مطالبہ کرنے لگ جاتا۔

سَعَتْ وَمَشَتْ لِنَحْوِیْ فِیْ كُئُوسٍ　　　فَهِمْتُ بِسُكْرَتِیْ بَیْنَ الْمَوَالِ

میری وسعت اور طلب کا یہ تقاضا ہوا کہ تجلیات رواں دواں مجھ پر طاری ہونے لگیں۔ اور میں انکی لذت و سرور میں مست بے ساختہ ان تجلیات میں جذب ہو کر انکے عبور کرنے میں پرواز کرنے لگا۔ جب تجلیات الٰہی کی انتہا میں میں نے اکملیت کا مرتبہ حاصل کیا تو میں ولی اکمل بن گیا۔ تو میرے ماتحت تمام اقطاب میرے حکم کے تحت کام کرنے لگے اور مجھے انکا افسر اعلیٰ مقرر کر کے ___ تمام اقطاب کی فیض رسانی میرے اختیار میں دے دی گئی اور میں نے اپنے مریدوں کو مراتب طے کرانے میں فیاضی سے کام لیا۔

فَقُلْتُ لِسَائِرِ الْاَقْطَابِ لُمُّوْا　　　بِحَالِیْ وَادْخُلُوْا اَنْتُمْ رِجَالِ

میں نے تمام اقطاب پر اپنے احکام نازل کئے کہ سب میرے ماتحتوں میں شمار ہو جاؤ اور میرے نورِ بقائی سے (جذب سے) فیض حاصل کرتے جاؤ۔

وَهُمُّوْا وَاشْرَبُوْا اَنْتُمْ جُنُوْدِیْ　　　فَسَاقِی الْقَوْمِ بِالْوَافِیْ مَلَالِ

آپکی وفات کے بعد بھی اپنی سابقہ حالت میں رہیگا۔ کہ اگر کوئی ولی آپکے وجودِ روحانی کی طرف رجوع کرے۔ تو اُسے فیض عطا کرینگے۔ یہ وجہ تفوق ہے۔ کہ آپ ابدالآباد باقی ہیں اور آپکا فیض بھی باقی ہے۔ اور ہر زمانہ میں اپنی روح حیوانی اور روح رحمانی کے کمالِ جذب میں۔ زندہ ہیں۔ جیسا اثر روح حیوانی کو حاصل ہے۔ اس اثر کے تحت آپ اپنی زندگی کے بعد بھی تمثّل کی حالت میں اپنے پکارنے والے کے سامنے فَتَمَثَّلَ لَهَا بَشَرًا سَوِيًّا کی خاصیتوں میں محسوس ہونگے اور جو قوتِ مقبولیت آپکو حاصل ہے اسی قوت کے ساتھ ہُم۔ حصول دین اور دنیاوی مصائب میں امداد و راہنمائی کرینگے۔ اور اپنی روح رحمانی کے اثر سے جو جذب میں بقا حاصل کر چکی ہے۔ اور مقبولیت تام حاصل ہونے کی وجہ سے ہر شخص کو معرفت حاصل کرنے میں بھی مدد دینگے۔ یہ کیفیت حُب کے تحت ایک طالب کو اسوقت حاصل ہوگی جب وہ آپکی طرف اپنی امداد کیلئے متوجہ ہوگا۔ باقی سابقین اقطاب کیلئے ایک قطب الاقطاب کی راہنمائی میں جائز نہیں کہ قطب الاقطاب کے جذب کے ساتھ کسی دوسرے کو تصور میں لایا جائے۔ مگر آپ سے امداد حاصل کرنا آپکے علومراتب کے لحاظ سے جائز ہے۔ جبکہ کوئی ولی آپکے مراتبِ مقبولیت کو نہیں پاسکتا۔

اَنَافِیْ حَضْرَةِ التَّقْرِیْبِ وَحْدِیْ ۔۔۔ یُصَرِّفُنِیْ وَحَسْبِیْ ذُوالْجَلَالِ

میں قرب و بقائے وحدت میں یکتا ہوں۔ میرے مراتبِ مقبولیت تک کوئی ولی نہیں پہنچ سکتا۔ یہ قرب و مقبولیت میں نے کسی ولی سے حاصل نہیں کیا۔ بلکہ یہ میری ذاتی خصوصیت میں شمار ہے۔ کہ اللہ تعالیٰ نے خود مجھے منتخب کیا۔ اور خود مجھے یہ کمال عطا کیا۔

اَنَا الْبَازِیُّ[1] اَشْهَبُ كُلِّ شَیْخٍ ۔۔۔ وَمَنْ ذَافِی الرِّجَالِ اَعْطِیْ مِثَالٖ

---

[1] اس شعر کی تفسیر مولائی حضرت سیدی۔ مولانا سید نور الزمان شاہ صاحب قطب الاقطاب سلسلہ اویسیہ نے فرمائی ہے "انا البازی میں تجرید بعضے ارکان تشبیہ محذوف ہے۔ بمعنے میں مثل شاہین بہ نسبت کل ولی کے آدمیوں میں کس کو میری مثل انعام ہوا ـــــ دوسری وجہ فوقیت اور اشارہ منزل شہبازی کے جو ولایت کبریٰ ایک بازو۔ اور ولایت علیا دوسرا بازو ہو کر سالکِ احدیت پرواز پیدا کرتا ہے" (از شرح قصیدہ غوثیہ تصنیف حضرت ممدوح)

شیخ اکمل کی خصوصیت خاص اس فخریہ شعر میں مترشح (ظاہر ہوتی ہے) ہے کہ میں عرفان ذاتِ الٰہی میں مانند شاہین بمقابلہ طائر اشہب ہوں (بلند پرواز طائر ہوں)۔کون ایسا ولی ہے جو میرے مراتب تک پہنچنے کا دعویٰ کرسکتا ہے!

کَسَانِیْ خِلْعَةً بِطَرَازِ عَزْمٍ وَ تَوَّجَنِیْ بِتِیْجَانِ الْکَمَالِ

باری تعالیٰ نے ازل سے مجھے منتخب کر کے اولیاءٔ میں سرداری کا خلعت پہنایا ــــ جسطرح پیغمبروں میں حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام سردار انبیاء منتخب ازل سے ہیں۔اسی طرح جملہ عالم کے اولیاءٔ میں مجھے سردار اولیاءٔ کا خطاب عطا کر کے مجھے سرداری کا لباس عطا کیا۔

واضح ہو کہ قطبیت کے مراتب انکے لباس اور انعاماتِ خلعت سے ظاہر ہوتا ہے۔ابدال۔ اوتاد کو خاکی رنگ چمڑے کی پوشاک ہوتی ہے۔اقطاب میں روپہلی منقش سبز چوغہ عمامہ۔چادر سفید۔ کرنجی (نسواری) رنگ سنہری منقش چوغہ۔عمامہ (عربی رومال یا دستار) چادر ہوتی ہے۔اسکے علاوہ بعض کو خنجر۔تلوار۔نیزہ۔ہوتا ہے۔قطب الاقطاب کو سیاہ رنگ سنہری منقش چوغہ۔دستار۔سیاہ چادر اور تاج سنہری ہوتا ہے۔اسکے علاوہ اقطاب کی خصوصی علامت انکے تمغہ جات سنہری بھی ہوتے ہیں۔ یہ سب انعامات حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام عطا کرتے ہیں۔یہاں حضرت شیخ نے ان انعاماتِ گوناگوں کا ذکر فرمایا ہے۔جو اللہ تعالیٰ نے اپنے دست قدرت سے تاج اور ننگی تلوار عطا فرمائے۔یہ انعام حضرت امام مہدیؑ کو عطا فرمائے گویا آپ مثل مہدی ہیں۔حضرت امام مہدیؑ بھی سردار اولیاءٔ ہونگے۔آپ کے دور مہدیت میں زمانہ میں ایک قطب الاقطاب کی جگہ سات قطب الاقطاب آپکی ماتحتی میں تجدید دین وہدایت کرینگے۔

وَاَطْلَعَنِیْ عَلٰی سِرٍّ قَدِیْمٍ وَ قَلَّدَنِیْ وَاَعْطَانِیْ سُؤَالِ

مجھے اپنے تمام اسرار قدیمیت سے آگاہ کیا۔اور مجھ کو تمام مخلوق کا پیشوا بنا کر میرے طریق کو پسندیدہ فرمایا۔مجھے مقبولیت کا وہ درجہ عطا کیا۔کہ جو کچھ میں خواہش کروں وہ پوری ہو جاتی ہے۔اسی اطلاع اور عطا کے تحت آپکے سلسلہ کو بھی یہ فوقیت حاصل ہے۔کہ جو شخص راہ حقیقت کو حاصل کرنے

کیلئے طریق قادری کو اختیار کرے وہ آسانی سے مقصود کو پہنچ جاتا ہے۔

وَوَلَّانِیْ عَلَی الْاَقْطَابِ جَمْعًا فَحُکْمِیْ نَافِذٌ فِیْ کُلِّ حَالٍ

مجھے تمام اقطاب (چھ اقطاب) پر حکمران بنایا۔ یعنی مجھے قطب الاقطاب بنایا۔ اور کارگاہِ کائنات میں جو حکم باری تعالیٰ نافذ ہوتا ہے وہ میرے ہی ذریعہ نافذ ہوتا ہے۔ اسکے علاوہ۔ جہاں تک ایک ولی اکمل کے جذب وفنا کا تعلق ہے۔ ایک ولی فنا کی حالت میں ذات باری میں فنا ہو کر ذات باری کا ہی ارادہ وحکم جاری کرتا ہے۔ یعنی ولی کا ارادہ اور ذات باری تعالیٰ کا ارادہ جذب وفنا کی حالت میں ایک ہی ہوتا ہے۔ یہ کیفیت صرف روح رحمانی سے متعلق ہے۔ یہاں فنا کی حالت میں قلب وتعقل کا ارادہ نہیں ہوتا بلکہ روح کا ارادہ ہوتا ہے۔ یہ ارادہ اسوقت عمل میں آتا ہے جب انسان کی روح رحمانی فنا وبقا حاصل کر کے ذات الٰہی میں سما کر اپنی ہیئت کھو ڈالے اسوقت انسان پر جذب و استغراق طاری ہوتا ہے۔ اور انسانی تعقل اور قلب سے بوجہ محویت کے کوئی ارادہ پیدا نہیں ہوتا اسلئے اس حالتِ استغراق میں اگر کسی مافوق الفطرت واقعہ کو انسان سے نسبت دی جائے تو گویا وہ انسان کا ذاتی فعل نہیں ہوتا ہے۔ بلکہ خود ذاتِ الٰہی کا ہوتا ہے۔ البتہ انسانی شعور صرف اپنی روح رحمانی کی کیفیتوں کا اس عالمِ استغراق میں مشاہدہ کرتا ہے۔ اسکی دوسری کیفیت عالمِ ہوش میں جب انسان کے قلب وشعور کا رابطہ منقطع ہو جاتا ہے۔ اس وقت بھی اسکی روح رحمانی جذب میں ہوتی ہے۔ لیکن جو کیفیت اس روح رحمانی پر طاری ہوتی ہے۔ اسکا ولی کو مشاہدہ نہیں ہوتا ہے۔ ہاں یہ بھی ہوتا ہے کہ خود بخود (Automatically) قلب وشعور کا رابطہ ہو جاتا ہے تو ولی پر خود بخود اچانک کیفیت استغراق طاری ہو جاتی ہے۔ اسوقت ولی اپنے تعقل میں بھی محویت پاتا ہے۔ اور اسکے ارادے ساقط ہو جاتے ہیں ـــــ اس دوسری کیفیت میں جب ولی اپنے ہوش وحواس میں ہو اس وقت بھی ولی اپنے قلبی ارادہ سے ایک مافوق الفطرت واقعہ کیلئے حکم دیتا ہے۔ مثلاً بیمار کو حکم دیتا ہے کہ تندرست ہو جا۔ تو یہ ارادہ اگرچہ قلبی ہوتا ہے مگر عمل اسکی جسمانی قوت کا نہیں ہوتا ہے۔ بلکہ اسی قوت کا ہوتا ہے۔ جو اسے مراتب میں جذب وفنا کی حالت میں حاصل ہوتی ہے۔ گویا اسطرح اسکا حکم جاری ہو جاتا ہے۔ اور روح

رحمانی سے اس حکم کی تکمیل ہو جاتی ہے۔ یہی کیفیت اَعۡطَانِیۡ سُؤَال اور اَطۡلَعۡنِیۡ سِرِّ قَدِیۡم کی ہے۔ کہ حضرت شیخ علیہ رحمتہ کو ایک طرف جذب و بقا میں مشاہدہ قدیم حاصل تھا یعنی آپکا جذب وراء الوراء ذات باری میں تھا۔ اسکا مشاہدہ شعور سے بھی ہوتا تھا۔ اور جو حکم تعقل کی حالت میں کرتے یہاں تک کہ اگر مردہ کو زندہ کرنے کا حکم بھی دیتے تو وہ بھی روح رحمانی کی جذب و بقا کی صورت میں زندہ ہو جاتا کیونکہ یہ حکم ذات باری تعالیٰ کی فنا کے ساتھ خود ذات باری تعالیٰ کے حکم سے تعبیر دیا جاتا ہے۔ وجہ فوقیت یہ ہے۔ کہ آپکو مقبولیت اور جذب میں مقام عالی حاصل تھا۔ ورنہ ایک وہ شخص جسے جذب حاصل نہ ہو اپنی کسی طاقت سے مافوق الفطرت قوت کا اظہار نہیں کرسکتا ــــ اور اسی قوتِ جذب اور ذاتی حکم کے تحت یہ لازمی ہے کہ جب ایک ولی قطب الاقطاب کے مقام پر فائز ہو تو وہ ذاتی طور اپنا حکم بھی چلا سکتا ہے۔ یہ کوئی غیر شرعی امر نہیں جبکہ باری تعالیٰ خود ایک ولی میں یہ قوتیں عطا کرتا ہے۔

وَلَوۡ اَلۡقَیۡتُ سِرِّیۡ فِیۡ بِحَارٍ لَصَارَ الۡکُلُّ غَوۡرًا فِی الزَّوَالِ

یہ نتیجہ لازمی ہے۔ کہ سمندر انسان کے مقابلہ میں بظاہر قوی قوت محسوس ہوتے ہیں۔ مگر جب آپ اپنی قوتِ بقائی سے سمندروں پر نظر ڈالیں تو انکا تمازت کی وجہ سے زمین میں جذب ہونا لازمی تھا۔

وَلَوۡ اَلۡقَیۡتُ سِرِّیۡ فِیۡ جِبَالٍ لَدُکَّتۡ وَاخۡتَفَتۡ بَیۡنَ الرِّمَالِ

یہ امر بھی مصدقہ ہے۔ کہ اگر ایٹم کا اثر پہاڑوں پر ڈالا جائے تو پہاڑ بھی ریزہ ریزہ ہو جائیں چہ جائیکہ وہ سرّ وہ نور جو ایٹمی قوتوں سے بھی بالاتر قوت کا حامل ہو یقینی طور اگر آپ کی روح جسمانی کی قوت کا اثر پہاڑوں پر (صرف آنکھ کے ذریعہ) پڑ جائے تو انکا ریزہ ریزہ ہونا یقینی ہے۔

وَلَوۡ اَلۡقَیۡتُ سِرِّیۡ فَوۡقَ نَارٍ لَخَمِدَتۡ وَانۡطَفَتۡ مِنۡ سِرِّ حَالِ

اگر میں آگ پر اپنی توجہ ڈالوں تو آگ بھی اپنی ہیئت کھو بیٹھے اور ٹھنڈی ہو جائے۔

وَلَوۡ اَلۡقَیۡتُ سِرِّیۡ فَوۡقَ مَیِّتٍ لَقَامَ بِقُدۡرَۃِ الۡمَوۡلٰی تَعَالٰی

اگر میں اپنی توجہ مردہ پر ڈالوں تو وہ بھی قدرت الٰہی سے زندہ ہو کر کھڑا ہو جائے۔

یہ امر مسلمہ ہے۔ کہ جب ایک ولی کو جذبِ الٰہی میں بقا حاصل ہو جائے۔ اگر چہ اسکا ظاہری وجود محسوس ہوتا ہے۔ لیکن اس کی قوتوں میں ارادہ الٰہی ہی کام کرتا ہے۔ قوت وارادہ سے جو نتیجہ پیدا ہوگا وہ ارادۂ الٰہی سے ہی نسبت رکھتا ہے۔ ورنہ انسان اپنی مادی قوتوں کے ساتھ ایسے نتائج کا حامل نہیں ہوسکتا۔ اسی حالت میں شیخ فرماتے ہیں اگر ہم اپنے قلبی ارادہ سے ایک مردہ پر اپنی الٰہی قوتوں کی توجہ ڈالیں تو وہ بھی دوبارہ زندہ ہوگا۔ اسکا مطلب یہ ہے۔ کہ توجہ میں نور ہوتا ہے۔ جو مردہ جسم میں (روح حیوانی کی شکل میں) سرایت کر جائیگا۔ اور مردہ میں زندگی کے آثار پیدا ہونگے۔ اس ارادہ میں ایک انسان کی خصوصیت اسکے جذب حاصل ہونے سے ہے گویا انسان نے خود زندہ کیا جبکہ وہ اپنے ارادہ میں بھی تکمیل کی قوت رکھتا ہے۔ اور یہ جو اس حالت میں بھی قدرتِ اللہ تعالیٰ کو شامل رکھا گیا دو وجوہات سے ہے۔ ایک تو انسان میں یہ جذبہ پیدا نہ ہونے پائے کہ مجھ میں (انسان میں) بھی قدرت الٰہی کی استعداد پائی جاتی ہے۔ گویا یہ کیفیت کفر وشرک کی ہوگی جس سے انسان ایک آن میں اپنے مراتب کھو کر ذلیل ہو جائیگا۔ دوسری وجہ یہ ہے۔ کہ چونکہ اس قوت وارادہ کی مصدر ذات الٰہی ہی ہے۔ اسلئے انسان کا فعل نہیں بلکہ قدرت الٰہی سے ہی ہے ـــــ اس اشارہ میں لطیفۂ عیسوی کے جذب کا حاصل ہونا ہے۔ کہ جو حکم حضرت عیسیٰؑ کو حاصل تھا وہ مجھے بھی حاصل ہے۔ اسی کیفیت کی طرف حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کا اشارہ ہے۔ کہ اَلْعُلَمَاءُ اُمَّتِیْ کَاَنْبِیَآءِ بَنِیْ اِسْرَائِیْلَ میری امت کے عالم (عالمِ حقیقی) بنی اسرائیل کے پیغمبروں کی مانند ہیں۔ یہ مقام بھی حضرت شیخ محی الدین عبدالقادر جیلانی رضی اللہ عنہ کو حاصل تھا ـــــ یہ کوئی مبالغہ نہیں جبکہ قرآن خود اس امر کی شہادت دیتا ہے۔ کہ حضرت عیسیٰؑ بھی بشری حالت میں پائے جاتے تھے مگر آپکی خصوصیات میں قرآن خود شہادت دیتا ہے۔

اَنِّیْ اَخْلُقُ لَکُمْ مِّنَ الطِّیْنِ کَھَیْئَةِ الطَّیْرِ فَاَنْفُخُ فِیْهِ فَیَکُوْنُ طَیْرًام بِاِذْنِ اللّٰهِ ج وَاُبْرِیءُ الْاَکْمَهَ وَالْاَبْرَصَ وَ اُحْیِ الْمَوْتٰی بِاِذْنِ اللّٰهِ ج (پارہ ۳ سورۃ ۳ آیت ۴۹) میں تمہارے لیے مٹی سے پرندے کی شکل بنا کر پھر اس میں پھونک مار دیتا ہوں تو وہ اللہ کے حکم سے اڑنے لگ جاتا

ہے۔ اللہ کے حکم سے اندھوں اور کوڑھیوں کو شفا دیتا ہوں اور اللہ کے حکم سے مردے زندہ کرتا ہوں۔

حضرت عیسیٰؑ کوڑھ اور برص والے مریضوں کو اچھا کرتے اور اللہ کی قدرت سے مردوں کو زندہ کرتے۔ یہ کیفیت علماء امتی کو بھی جذب میں حاصل ہوتی ہے۔ اور یہی کیفیت (زندہ کرنے کی) انہیں بھی حاصل ہوتی ہے۔

وَمَـامِنُهَـا شَهُوُر" اَوُدَهُوُر" تَـمُـرُّوَ تَـنُـقَـضِیُ اِلَّا آتَـالِ

وَتُـخُبِـرُنِیُ بِمَا یَاتِیُ وَ یَجُرِیُ وَتُـعُلِـمُـنِیُ فَاَقُصِرُ عَنُ جِدَالِ

ماہ اور زمانہ نہیں اپنا دور گزارتے جب تک کہ میرے سامنے پیش نہ ہوں۔ یعنی ماہ اور زمانہ ــــ ماضی حال و مستقبل کو ایک تمثیلی کیفیت دی گئی ہے۔ جو کچھ زمانہ میں واقعات رونما ہونے والے ہوتے ہیں قطب الاقطاب کی حیثیت سے جب تک میری اجازت ان واقعات و احکام کو جاری کرنے کیلئے حاصل نہ ہو۔ تب تک یہ احکام جاری نہیں ہو سکتے۔ یہ وجہ فوقیت اور مقبولیت ہے۔ کہ احکام بین الاقطاب کے اجرا کیلئے قطب الاقطاب کی منظوری کے بعد دیئے جاتے ہیں جن پر حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کی مہر ہوتی ہے مگر حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کے بعد جب تک قطب الاقطاب کی حیثیت سے حضرت شیخ کی مہر نہ ثبت ہو یہ احکام جاری ہونے کیلئے تقسیم نہیں ہوتے آپ مہر کر دیتے پھر تقسیم ہوتے۔ یہ کیفیت آپکی زندگی کے وقت جب آپ قطب الاقطاب تھے تعلق رکھتی ہے۔ بعد میں ایک نئے قطب الاقطاب کے عہدہ سنبھالنے پر احکام کا نفاذ نئے قطب الاقطاب سے ہی تعلق رکھتا ہے۔ البتہ حضرت شیخ علیہ الرحمتہ کی یہ کیفیت آپکے بعد اس حالت میں باقی ہے۔ کہ اگر کسی ولی نے کسی غرض کیلئے درخواست کی اور اس کی منظوری کا خواستگار ہو۔ اور یہ غرض ایسی ہو جو نا قابل اجابت متصور ہوتی ہو۔ تو حضرت شیخ عبدالقادر جیلانی رضی اللہ عنہ کے روحانی توسل کے ذریعہ بارگاہ نبوت میں (اجلاسِ محمدیؐ میں) پیش ہونے سے اسے درجہ قبولیت حاصل ہوگا اور یہ کام پورا ہو جائیگا۔ جیسے ایک قضائے مقررہ (مبرم) کا اٹل ہونے کی حالت میں لازمی طور واقع ہو جانا لازمی ہے۔ اسکے لئے کوئی استدعا قابل قبول نہیں ہوسکتی مگر حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے فرمایا کہ دعا سے قضائے مبرم بھی بدل جاتی

ہے۔ وہ دعا آپکو حاصل ہے۔ اور اَعۡطَانِیۡ سُؤَالِ کا اثر ہمیشہ قائم رہیگا۔ اور اسی اثر کے تحت آپکے وسیلہ سے ہر نا قابلِ قبول التجا بھی قبول کی جائیگی۔

مُرِیۡدِیۡ هِمۡ وَ طِبۡ وَ اشۡطَحۡ وَغَنِّیۡ وَافۡعَلۡ مَا تَشَاءُ فَالۡاِ سۡمُ عَالِ

مُرِیۡدِیۡ لَا تَخَفۡ اَللّٰهُ رَبِّیۡ عَطَانِیۡ رِفۡعَةً نِلۡتُ الۡمَنَالِ

اے میرے مرید تو خوش ہو اور بے نیاز ہو جا غم سے اور جو چاہے کر اور میرا نام یاد رکھ۔ مرید کیلئے۔ یہ ایک کیفیت تصور ہے کہ تو ہر حال میں میرا تصور (جذب) قائم رکھ تصور کے بعد اگر تجھ سے شدید گناہ بھی سرزد ہو۔ تو تو اسکا فکر نہ کر کیونکہ اللہ تعالیٰ نے مجھے عزت و مقبولیت میں اپنے اعلیٰ انعامات سے نوازا ہے اور مجھے اختیار بھی دے رکھا ہے۔ جب تو میری بیعت میں آئیگا۔ تو تُو اپنے عمل سے اتنا حاصل نہیں کر سکتا جتنا میں تجھے جذب میں مراتب عطا کر سکتا ہوں۔ مراتب عطا کرنا۔ میرا کام ہے۔ میرے اختیار میں پھر تیری خطا میرے ارادے میں حائل نہیں ہوسکتی میں چاہوں تو تُو اپنی خطا کے باوجود اپنے مراتب سے نہیں گر سکتا بلکہ علیٰ حالہ اپنے مراتب پر تجھے قائم رکھونگا۔ یہ ایک حقیقت ہے۔ کہ ولی اکمل کی یہ ایک صفت ہوتی ہے۔ کہ وہ اپنی توجہ سے مرید کی روح رحمانی کو اپنے نور میں جذب کر کے تمامی مراتب ایک آن میں طے کرا سکتا ہے۔ کیونکہ اس میں جسم کا تعلق نہیں۔ بلکہ روح رحمانی کا ہے۔ ولی اکمل کیلئے یہ امر مانع نہیں ہوسکتا کہ جب تک جسم کا تزکیہ نہ ہو تب تک مراتب حاصل نہیں ہو سکتے۔ بلکہ اصل بات تو یہ ہے کہ جسمانی تزکیہ صرف علم حاصل کرنے کیلئے ہے۔ اس میں شک نہیں کہ جسمانی حالت میں عمل ہی مراتب (نتیجہ) پیدا کرتے ہیں۔ لیکن ایک ولی اکمل کی بیعت کے ساتھ ایک طالب کو حُب (تصور) اور جذب سے اپنے اعمال سے زیادہ مراتب صرف ولی اکمل کی مرضی و ارادہ سے حاصل ہو جاتے ہیں۔ ایسی حالت میں اگر ولی اکمل ایک طالب کی روح رحمانی کو جذب کر لے تو اسکی جسمانی کیفیت کے تاثرات یعنی گناہ یا خطا اسکی روح رحمانی پر ولی اکمل کے جذب میں اثر انداز نہیں ہو سکتے اسطرح ایک طالب کو ولی اکمل اپنی حالت میں قائم رکھتا ہے۔ مگر یہ مقام صرف انتہائی حب میں درجہ مقبولیت حاصل کرنے سے ہی ہوتا ہے۔ کہ ولی اکمل کی روحانی

شخصیت اپنے اختیار کو استعمال کر کے طالب کے گناہ کے نتیجہ کو اپنی توجہ سے مٹا دیتی ہے۔ یہی کیفیت حضرت شیخ عبدالقادر جیلانیؒ کی اس شعر سے ظاہر ہوتی ہے کہ اللہ اور اسکے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی بارگاہ میں آپکو وہ عزت ورفعت حاصل ہے۔ کہ آپکے مرید کو آپکے طفیل کوئی باز پرس نہیں ہوتی نہ ہی مراتب سے گرایا جاتا ہے بلکہ خطا معاف اور نتیجہ زائل کر دیا جاتا ہے۔ اسی بشارت کو آپ نے بیان کیا ہے۔ تُو اپنے تنزل کا خوف نہ کر خواہ تجھ سے خطائیں ہی ہوتی رہیں۔ میں تیری ہدایت وعرفان کا ضامن ہوں کیونکہ اللہ تعالیٰ نے مجھے رفعت وانعام عطا کیا ہے۔ میری ہر بات مانی جاتی ہے۔ میرا بہت لحاظ رکھا جاتا ہے۔ یہی فوقیت آپکو اور آپکے سلسلہ کو حاصل ہے۔

طَبُوْلِیْ فِی السَّمَاءِ وَالْاَرْضِ دُقَّتْ وَشَاءُ وُ سُ السَّعَادَةِ قَدْ بَدَالِیْ

یہ کیفیت آپکے حُب کی تاثیر ہے۔ کہ میری رفعت وسرداری کی تمام زمین وآسمان میں منادی کر دی گئی اور میری سعادت کی منادی کرنے والے ہر جگہ منادی کر رہے ہیں۔ کہ عبدالقادر مُحیُّ الدِّیْن کی رفعت ہر شخص تسلیم کرے اور ہر جگہ محی الدین جیلانی کا حکم جاری رہیگا۔

جس طرح حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام سردار انبیاء ہیں اور کائنات میں آپکی حمد کی جاتی ہے۔ اسی طرح غوث الاعظم اولیاء کے سردار ہیں۔ آپ نے حب کی انتہائی تکمیل کی۔ اس حب کا تقاضا یہ ہے۔ کہ جن فرشتوں نے انسان کی تخلیق پر نکتہ چینی کی تھی۔ انہیں بھی یہ معلوم کرایا جائے کہ خلیفہ کی تکمیل حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کی امت میں شیخ عبدالقادر جیلانیؒ نے کی۔ لہذا تم اپنے تسلیم میں کاربند رہو۔ اور حضرت غوث الثقلین رضی اللہ عنہ کی عزت وتکریم تم بھی کرو۔ اور زمین پر تمام اقطاب اور جُملہ مخلوق کو یہ منادی کرائی گئی۔ کہ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کی نبوت کو تسلیم کرو اور آپؐ پر درود بھیجو۔ اسی طرح تجدید دین وعرفان میں حضرت محی الدین جیلانی نے غوثیت کا مرتبہ حاصل کیا ہوا ہے۔ اور عرفان میں بھی کمال حاصل کیا ہوا ہے۔ اور مقبولیت ورفعت میں ملائکہ میں بھی قابلِ تعریف ہیں۔ اسلئے تم بھی انہیں اپنا امام تسلیم کرو۔ اور اسکی محبت پیدا کرو اور اس سے فیض حاصل کرو۔ کیونکہ مقبولیت میں ہم نے انہیں اَعْطَانِیْ سُؤَالِیْ کی بشارت بھی دی ہے۔ یہ بڑی برگزیدہ ہستی ہے۔

بِلَادُ اللّٰهِ مُلْکِیْ تَحْتَ حُکْمِیْ وَوَقْتِیْ قَبْلَ قَلْبِیْ قَدْ صَفَالِیْ

اللہ کی تمام کائنات جس پر اللہ کی حکمرانی ہے۔اس حکمرانی میں حکم الٰہی کا اجرا میرے ذریعہ ہوتا ہے۔ یہ وہی احکام ہیں جو دنیا کی خیر وشر کیلئے قطب الاقطاب اور جملہ اقطاب کے ذریعہ نافذ ہوتے ہیں مگر آپکے دورِ حکومت میں آپکے اختیار کو بھی ان احکام میں دخل ہے۔ کہ جسکی بھلائی کے خواستگار ہوں اسے بھلائی دی جائیگی۔ اگر کسی قوم پر عتاب نازل کیا جانا منظور ہو تو شیخ عبدالقادر جیلانی کی دعا وسوال سے امت پر عفو بھی کیا جائیگا۔

بلاد اللہ کو میرے حکم میں دینے میں یہ راز بھی ہے۔ کہ میرا قلب نفسانی آلائشوں سے پاک ہے۔ کہ اپنے اختیار سے کسی پر غصہ ہونے سے غضب کا ارادہ کروں۔تو اس پر غضب نازل ہو۔ یا خوش ہو کر کسی کو عطا کروں۔نہیں بلکہ میرا نفس مادی آلائشوں سے صاف ہو کر مجسم نورانی ہو چکا ہے۔ اب میرا قلب مادی خصائص سے پاک ہے۔ نہ غصہ کی حالت میں غصہ ہو کر غصہ کرتا ہے۔ نہ راحت کی حالت میں خوش ہو کر مہر کرتا ہے۔ بلکہ اللہ تعالیٰ نے اس وجہ سے مجھے اپنے ملک سونپ دیئے کہ میں اس کی عین مرضی کے مطابق حکم چلانے کی صلاحیت رکھتا ہوں ـــــ آپکا ایک واقعہ مثالی طور پر قلم بند کیا جاتا ہے۔ چاہے یہ واقعہ افسانہ ہی تصور کیا جائے۔ پھر بھی اس واقعہ میں ایک حقیقت کا اظہار ہوتا ہے۔ کہتے ہیں ایک دفعہ آپکا مال تجارت کیلئے کسی دوسرے ملک میں فروخت کیلئے گیا۔ قافلہ بحری راستہ سے گزرنا تھا۔ قافلہ روانہ ہونے کے کچھ مدت بعد خبر آئی کہ عبدالقادر جیلانی رضی اللہ عنہ کا جہاز غرق ہو گیا ہے۔ آپ نے خبر سُن کر سر نیچے کر لیا۔ کچھ دیر خاموش رہنے کے بعد اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ کہہ کر اپنے شغل میں مشغول ہو گئے ـــــ چند دن گذرنے کے بعد خبر آئی کہ آپ کا جہاز منزل تک پہنچ گیا۔ کسی اور تاجر کا جہاز غرق ہو گیا تھا۔ آپ نے پھر اسی حالت میں سر نیچے کر لیا۔ کچھ دیر خاموش رہنے کے بعد اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ کہا۔ طالبانِ حقیقت نے پوچھا آپ کے دونوں حالتوں میں اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ کہنے میں کیا مقصد تھا۔ آپ نے فرمایا۔ مجھے مال کے نقصان ہونے یا بچ جانے کا فکر نہ تھا۔ میں نے مراقبہ میں اپنے قلب کی کیفیت کا مشاہدہ کیا دونوں حالتوں میں اسے ایک ہی بے فکری کی کیفیت میں پایا۔ تو میں نے شکر بجا

لایا۔ کہ میرا قلب مال کے نفع ونقصان سے متاثر نہیں بلکہ حُب کا اثر اس پر طاری ہے۔ اور ماسویٰ کی خواہش واثر سے بے نیاز ہے۔ یہی کیفیت آپ کی وَوَقْتِیْ قَبْلَ قَلْبِیْ قَدْ صَفَالِ میں ظاہر ہے۔

نَظَرْتُ اِلٰی بِلَادِ اللّٰہِ جَمْعًا   کَخَرْدَلَۃٍ عَلٰی حُکْمِ اتِّصَالِ

جب میں نے اللہ کے ملک پر نظر ڈالی تو مجھے اس ملک کے اعمال و کیفیات اسطرح مشاہدہ میں آئے جیسے ہتھیلی پر رائی کا دانہ ـــــ یہ امر ضروری ہے۔ کہ جب ایک ہستی کو اللہ کے ملک کی حکمرانی سونپی گئی تو اُسے تمام غیب وظہور سَمٰوٰتِ وَالْاَرْض کا مشاہدہ اسی طرح ہونا چاہئے کہ اسکے علم سے کوئی شے باہر نہ ہو۔ ورنہ احکام وانتظام میں خلل ہونے کا احتمال ہوگا۔ یہ دلیل ہے۔ اوپر کے شعر کی یا اوپر کا شعر اسکی دلیل ہے۔ جب ایک ولی اکمل فنا میں اکمل مرتبہ حاصل کرتا ہے۔ تو جذب کی حالت میں جبکہ اللہ تعالیٰ لطیف وخبیر ہے۔ اس کیفیت کا حاصل ہونا ولی کیلئے بھی یقینی ہوتا ہے۔ جب ولی جذب کی حالت میں ہو جب کہ جذب کی حالت میں یہ بھی واسع ہو چکا ہو۔ یعنی تمام عالم اسی نورِ حقیقی میں سمایا ہوا ہو تو اسکی کیفیت یہ ہوگی کہ سمائی ہوئی شے پر احاطہ کے اعتبار سے کلی ادراک ومشاہدہ حاصل ہو۔ یہاں ادراک قوت کے اعتبار سے ہوگا۔ آنکھ (بصر) اپنی قوت کے مطابق جس شے کا احاطہ کرسکتی ہے۔ وہ شے اسکے ادراک میں اسی ہیئت میں آجاتی ہے۔ اگر آنکھ خوردبین کے ذریعہ ایک غیر محسوس شے کو دیکھتی ہے۔ تو وہ ایک زائد قوت ہوگی جس سے وہ ہوا یا خون کے قطرہ میں نہ محسوس ہونے والی کیفیات کا ادراک کرتی ہے۔ گویا لطیف قوت کا ادراک کرنا قوت کے اعتبار سے ہے۔ اسی طرح اگر یہ تصور کیا جائے کہ ایک شخص سورج میں رہ کر ایک وسیع (طاقتور) دوربین سے اس زمین کا مشاہدہ اسطرح کرے کہ زمین دوربین کے احاطہ میں آجائے۔ تو اس کیفیت کا احساس ہمیں ایسا ہوگا کہ ہم سورج کو نہیں دیکھ سکتے مگر سورج میں رہنے والا آدمی ایک آنکھ سے تمام زمین کو احاطہ میں لیے ہوئے ہر ملک کی کیفیت کا مشاہدہ کررہا ہے۔ تو اس کیفیتِ مشاہدہ کو ہم اپنے تصور میں لا نہیں سکتے یعنی سمجھ نہ سکیں گے۔ کہ ایک انسان کس طرح ساری دنیا کو دیکھ رہا ہے۔ یہ ایک لطیف قوت ہی تصور کی جائیگی۔ ورنہ آنکھ کے دیکھنے میں یہ کیفیت مبالغہ تصور کی جائیگی۔ اسی طرح ایک لا انتہا قوتِ خالقیت

جسکا تصور قرآن نے ایک لطیف قوت میں بتایا ہے۔ لَا تُدْرِكُهُ الْاَبْصَارُ ز وَهُوَ يُدْرِكُ الْاَبْصَارَ ج وَهُوَ اللَّطِيْفُ الْخَبِيْرُ ○ (پارہ ۷ سورۃ ۶ آیت ۱۰۴) اسے آنکھیں نہیں دیکھ سکتیں۔ مگر وہ تمہیں (آنکھوں کو) ادراک کر لیتا ہے۔ کیونکہ اس کا ادراک لطیف قوت سے ہے۔ لطیف۔ الخبیر اور خالق و حاکم کی خبر و نظام کا یہ تقاضا ہے۔ کہ اسکے علم سے ہر آن کوئی شے باہر نہیں رہ سکتی۔ وہ ہر وقت ہر کیفیت کے ظاہر و باطن سے اسطرح باخبر ہے جسطرح ہتھیلی میں رائی کا دانہ۔ اور حضرت شیخ نے اپنے روح رحمانی کے جذب کے تحت اسی کیفیتِ مشاہدہ و ادراک کی کیفیت کو ظاہر کیا ہے۔ کہ جب باری تعالیٰ نے مجھے قطب الاقطاب بنا کر میرے ذریعے احکام کو جاری کیا تو جب میں اس نظام کائنات پر نظر ڈالتا ہوں تو مجھے اسکے ظہور و غیب سے اسطرح آگاہی ہوتی ہے جسطرح رائی کا دانہ ہتھیلی پر نظر آتا ہے۔

دَرَسْتُ الْعِلْمَ حَتّٰى صِرْتُ قُطْبًا　　وَنِلْتُ السَّعْدَ مِنْ مَوْلَى الْمَوَالِ

میں نے علمُ العرفان کی یہاں تک بدرجہ اکمل تکمیل کی کہ قطب الاقطاب کا منصب حاصل کیا۔ کیونکہ قطب الاقطاب وہی شخص ہوتا ہے۔ جسے عرفانِ الٰہی کے تمامی اسرار و آثار کا علم حاصل ہو۔ اور یہ سعادت خود باری تعالیٰ نے بوجہ منتخب ہونے کے مجھے عطا کی۔

وَ مَنْ فِيْ اَوْلِيَآءَ اللّٰهِ مِثْلِيْ　　وَمَنْ فِي الْعِلْمِ وَالتَّصْرِيْفِ حَالِ

اس حالت میں کون ہے جو میرے مثل علم و کمال میں ہو سکتا ہے (یہ وقت کے اقطاب کی طرف اور جملہ اولیاء سلسلہ کی طرف خطاب ہے) اگر کوئی شخص اس منصب کا دعویدار ہو تو (فَاْتُوْا بِسُوْرَةٍ مِّنْ مِّثْلِهٖ) میرے کمال کے مقابلہ میں اپنا دعویٰ اور دلیل پیش کرے اور یہ کبھی ہو نہیں سکتا۔ کہ ایک قطب الاقطاب کے ساتھ دوسرا شخص بھی قطب الاقطاب کا دعویٰ کرے۔

رِجَالِيْ فِيْ هَوَاجِرِهِمْ صِيَامٌ　　وَ فِيْ ظُلَمِ اللَّيَالِيْ كَاللَّآلِ

میرے مرید گرمی کی شدت میں بھی روزہ دار ہوتے ہیں۔ اور رات کے اندھیرے میں روشن ستاروں کی طرح (شب بیدار) چمکتے رہتے ہیں۔ یہ اپنے دعوے کی خود ایک دلیل پیش کرتے ہیں۔

ایک اللہ کے خالق ومعبود ہونے کیلئے خود اس کا قانون (شریعت) دلیل ہوتی ہے۔ جس کا اسے دعوےٰ ہے هُوَا اللّٰهُ الْخَالِقُ الْبَارِئُ الْمُصَوِّرُ لَهُ الْاَسْمَآءُ الْحُسْنٰى ط (پارہ ۲۸ سورۃ ۵۹ آیت ۲۴) وہ اللہ ہی ہے۔ جو مالکِ حقیقی۔ پیدا کرنے والا۔ کائنات کی ابتدا کرنے والا اور خوبصورت نظام میں مخلوق کا بنانے والا ہے۔ اور یہ سب کچھ جو (ظاہری باطنی) محسوسات میں آتا ہے۔ اسی کے نور سے بنا ہے۔ اسکی پہلی دلیل خوبصورت نظام ترتیب ہے اور ہر شے مخلوق میں بہتر ونفع کے آثار پائے جاتے ہیں۔ پھر اسکی دوسری دلیل یہ ہے۔ ذٰلِكَ الْكِتٰبُ لَارَيْبَ ۛ فِيْهِ ۛ هُدًى لِّلْمُتَّقِيْنَ ۙ اس نے انسانی پابندی محکومی (اس حاکم اعلیٰ کی حاکمیت) تسلیم کرنے کیلئے ایک نتیجہ خیز اور نفع بخش شریعت پیش کی کہ۔ انسانی مقصود عرفان (اللہ کو معبود ماننا ہے) ہے۔ سو اسکی حکومت تسلیم کرو اسکی شریعت۔ بیعت تسلیم کرو۔۔۔ تو تم مقصود حاصل کرو گے۔ یہ دعویٰ بھی ہے دلیل بھی ہے۔ فَاْتُوْا بِسُوْرَةٍ مِّنْ مِّثْلِهٖ ص وَادْعُوْا شُهَدَآءَكُمْ تم اپنے معبودوں اور انکے قانون کو ہمارے مقابل پیش کرو اور ایک شق بھی ایسی پیش کرو جس سے مقصود حاصل ہو سکتا ہو؟ مگر نہیں۔ اب ہم ہی پیش کرتے ہیں۔ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم میرے رَجُلٌ پیغمبر ہیں جنہوں نے میری متابعت کی آپؐ حد درجہ محنت عبادت کرتے ہیں اور رات جاگتے ہیں تو اسکا نتیجہ یہ ہے کہ وہ نُوْرٌ مُّبِيْن ہیں مُحَمَّدؐ ہیں احمدؐ ہیں اور انہیں یہ صفت بھی حاصل ہے اَكْمَلْتُ لَكُمْ دِيْنَكُمْ وَاَتْمَمْتُ عَلَيْكُمْ نِعْمَتِيْ۔ اور آپؐ نے اسطرح مقصود کا مشاہدہ کیا ثُمَّ دَنَا فَتَدَلّٰى ۙ فَكَانَ قَابَ قَوْسَيْنِ اَوْ اَدْنٰى ۚ ___ انکی خصوصیت یہ ہے کہ یہ يَتْلُوْا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِهٖ پر خالقیت کے بالدّلیل نشان بتاتے ہیں کوئی ہے جھٹلانے والا! اور يُزَكِّيْهِمْ یہ انسانوں کی مادی آلائشوں کو پاک کر کے خالص نورانی بناتے ہیں وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ اور اسرار الٰہی کے صحیح نشان کا مشاہدہ کراتے ہیں اور وَالْحِكْمَةَ غیب کا بھی مشاہدہ کراتے ہیں۔ ایک دعویٰ کنندہ کے دعویٰ کیلئے اسکا مبنی برحقیقت اور نتیجہ خیز علم اور ایک طالب جو حقیقت پا چکا ہو۔ یہ قرآن اور محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہیں۔ اسی طرح محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے دعویٰ

کی دلیل آپکا علم اور اسکی تکمیل اور آپکی متابعت میں چلنے والوں کا گروہ اِنَّ رَبَّکَ یَعۡلَمُ اَنَّکَ تَقُوۡمُ اَدۡنٰی مِنۡ ثُلُثَیِ الَّیۡلِ وَنِصۡفَہٗ وَثُلُثَہٗ وَطَآئِفَۃٌ مِّنَ الَّذِیۡنَ مَعَکَ ۔آپ عرفان وعلم کی تکمیل میں رات جاگتے ہیں (قیام لیل) اور آپکے رجال ۔رفیق ۔پیرو ۔مطیع ۔بھی اس پر عمل کرتے ہیں ۔اور اسکا نتیجہ یہ ہے ۔کہ یہ سب لوگ نجات یافتہ ہیں ۔اِنَّ الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا وَ عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ کَانَتۡ لَہُمۡ جَنّٰتُ الۡفِرۡدَوۡسِ نُزُلًا ۙ۝ خٰلِدِیۡنَ فِیۡہَا لَا یَبۡغُوۡنَ عَنۡہَا حِوَلًا ۝ (پارہ ۱۶ سورۃ ۱۸ آیت ۱۰۷۔۱۰۸)۔جنہوں نے آپکی رسالت وراہنمائی کو تسلیم کیا اور آپکے حکم کے مطابق عمل کیا وہ ہمیشہ جنتوں میں رہیں گے ۔یہ دلیل رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پیغمبر اور راہنما ہونے کی ہے ۔اسی طرح آپؐ کے بعد نائب رسول اللہ اور ولی اکمل کیلئے آپؐ کے مبنی بر حقیقت علم کی جو نفع بخش اور نتیجہ خیز مقصود حاصل کرنے میں ثابت ہو اسکی دلیل خود ولی کی ذاتی شخصیت اور اسکی ذاتی شخصیت کی دلیل اسکے رجال مرید ہوتے ہیں جنہیں عرفان الٰہی حاصل ہوتا ہے ۔انکا نشان معرفت کیا ہوتا ہے؟

رِجَالِیۡ فِیۡ ھَوَا جِرِھِمۡ صِیَام ٌ وَفِیۡ ظُلَمِ اللَّیَالِیۡ کَالّلاٰلِ

وہ کم کھاتے ہیں جس سے ان پر مادہ کا غلبہ نہیں ہوتا ۔انکی روحانی قوتیں وسیع ہیں ۔وہ خاموش رہتے ہیں زیادہ تر انکی زبان یادحق میں مشغول رہتی ہے ۔وہ خلوت (تنہائی) پسند ہیں جس سے انکے تصورات میں انوار واسرار الٰہی کا مشاہدہ رہتا ہے ۔اور وہ اپنے جذبۂ حب کو قیام لیل سے زیادہ تیز کرتے ہیں تاکہ شراب وصل کے پیالے پے در پے انہیں حاصل ہوں ۔یعنی انوار وتجلیات کا نزول پے در پے ان پر طاری ہو۔

وَکُلُّ وَّلِیٍّ لَّہٗ قَدَمٌ وَّ اِنِّیۡ عَلٰی قَدَمِ النَّبِیِّ بَدۡرِ الۡکَمَالِ

تمام ولی جب تک میری بیعت نہ کریں میری تقلید نہ کریں تو انہیں مقصود حاصل نہیں ہو سکتا ۔کیونکہ میں حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام اور تمام اولیاء کے درمیان ایک ولی اکمل کی حیثیت سے واسطہ ہوں ۔یہاں ولی اکمل کی خصوصیت اور طالب کیلئے عرفان حاصل کرنے ۔کے ایک خصوصی طریق کی طرف اشارہ ہے ۔کہ بغیر ولی اکمل کی بیعت وراہنمائی کے طالب کسی ولی کے ذریعہ مقصود حاصل

نہیں کرسکتا۔ چونکہ میں ہی ولی اکمل ہوں۔ اسلئے ہر شخص ہر ولی کو میری تابعداری اور حکم کے تحت راہ روی کرنی چاہیے۔ چونکہ عرفانِ الٰہی کا باب اوّل۔ اوّل اجلاس محمدیؐ ہے۔ اسلئے یہ مقام بغیر میری راہنمائی کے کسی ولی سے حاصل نہیں ہوسکتا۔ دوسرے معنی یہ ہیں۔ کہ ہر ولی کیلئے میرے قدم کے مطابق چلنا ضروری ہے۔ اور میں حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کے اسوۂ حسنہ کے عین مطابق چلتا ہوں۔

مُرِیْدِیْ لَا تَخَفْ وَاشٍ فَاِنِّیْ عُزُوْمٌ قَاتِلٌ عِنْدَ الْقِتَالِ

اے مرید تو دشمن کے شر سے نہ ڈر۔ کیونکہ میں تیرا محافظ تیرے دشمنوں کیلئے ایک بہادر جنگجو قاتل کی حیثیت رکھتا ہوں۔ اس شعر میں آپکی جملہ خصوصیات شامل ہیں۔ کہ آپکو روح جسمانی کی دائمی زندگی حاصل ہے۔ آپکے قول کے مطابق وَشَمْسُنَا اَبَدًا عَلٰی اُفُقِ الْعُلٰی لَا تَغْرِبُ۔ آپکی روحانیت اور اختیار ہمیشہ دائم رہیگا۔ اسلئے مرید کے پکارنے پر یَا شَیْخ عَبْدُ الْقَادِرِ جِیْلَانِیُ اَلْمَدَدُ! چونکہ آپکو دونوں حیثیتوں (روح رحمانی کے انتہائی جذب وسعت اور روح جسمانی کے اختیار و ادراک) میں قوت حاصل ہے اسلئے آپ ہر مرید کی آواز پر لبیک کہہ کر روح رحمانی کے تصرفِ غیر جسمانی اور روح جسمانی کے تصریف تمثیلی (جسمانی) سے اپنے مرید کی پکار پر حاضر ہو کر ظاہری باطنی (نفس وشر شیطان) دشمن سے نجات دلاتے ہیں ــــ یہ کیفیت آپکی زندگی میں بھی آپکو حاصل تھی اور وصال کے بعد بھی چونکہ آپ کو بقائے روحانی حاصل ہے۔ اس اعتبار سے موت کے بعد بھی یہ کیفیت علیٰ حالہٖ قائم ہے۔

اَنَا الْجِیْلِیُ مُحِیُّ الدِّیْنِ اِسْمِیْ وَاَعْلَامِیْ عَلٰی رَأْسِ الْجِبَالِ

میں جیلان کا رہنے والا ہوں۔ اور میرا نام محی الدین ہے۔ اور میری حکومت کا جھنڈا تمام پہاڑوں پر نصب ہے۔ ظاہر طور اپنی شناخت ظاہر کرنا تھی۔ کہ آپ جیلان میں خاندان سادات سے منسوب تھے اور سادات خاندان کے بچے کی بچپن کی کرامتیں بھی مشہور تھیں کہ سادات کا بچہ رمضان میں دودھ نہیں پیتا (اسکے علاوہ بچپن کی بے شمار کرامتیں مشہور ہیں) چنانچہ آپکے بچپن کی شہرت سن کر حضرت بہاؤ الدین نقشبند رحمتہ اللہ علیہ بھی آپکو دیکھنے آئے اور مافوق الفطرت واقعات کا آپ سے

مشاہدہ کیا۔ اور محی الدین آپ بحکم الٰہی مشہور تھے۔ اور حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کی طرف سے بھی آپکے غوثیت کے زمانہ میں آپکو محی الدین (دین زندہ کرنے والا) لقب عطا ہوا تھا۔ یہ نام چونکہ عطیہ الٰہی تھا۔ اور القائے ربانی سے ہر شخص نے آپکو محی الدین کے نام سے پکارا اسلئے یہاں اپنا نام مبارک محی الدین ہی لیا۔ اور چونکہ یہ خطاب غوثیت کا تھا۔ اسلئے آپکی تجدید شریعت میں۔ دین کو اسقدر عروج ہوا۔ کہ ہر طرف دین پھیلا۔ اور دین کی حقانیت واضح و مسلم ہوگئی۔ چونکہ یہ ترقی آپکے ذریعہ ہوئی اور آپکا ہی حکم قطبیت کے اعتبار سے جاری تھا۔ یہاں جبال سے مراد بھی رفعتِ شان اور عروج دین ہے۔

واضح ہو کہ ہر ولی کو اپنی مقبولیت اور تجدید دین میں القاب ملتے رہے۔ جیسے سراج الاولیاء۔ قدوۃ السالکین۔ زبدۃ العارفین۔ یا منصب قطبیت مثلاً قطب الارشاد۔ قطب زماں۔ قطب عالم۔ قطب الاقطاب وغیرہ۔ یہ منصب وخطابات وغیرہ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام سے ہی ایک ولی کو حاصل ہوتے ہیں۔ ولی اس خطاب کو پاتا ہے۔ اسے لباس ملتا ہے۔ تمغہ جات ملتے ہیں۔ اسی لباسِ منصب سے ایک ولی کا منصب پہچانا جاتا ہے۔ اگر ولی کو یہ منصب بارگاہ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم سے حاصل نہ ہوں۔ تو اسے یہ حق حاصل نہیں کہ وہ زبدۃ العارفین۔ قدوۃ السالکین۔ قطب الارشاد یا قطب عالم وغیرہ اپنے آپکو کہلائے۔ یا کسی مرید کو بھی یہ حق حاصل نہیں کہ حُب یا عقیدہ کی وجہ سے بغیر مشاہدہ یا بغیر منصب حاصل ہونے کے ایک ولی کو ایسے القاب سے خطاب کرے۔ اکثر دیکھنے میں آیا ہے۔ کہ لوگ خواہ وہ ولی ہوں یا نہ ہوں۔ ایک پیر یا گدی نشین ان مراتب وخطابات سے پکارے جاتے ہیں۔ یہ طریق خلاف شریعت وطریقت ہے۔ اس قسم کے جذبات وعقائد غلط فہمی پیدا کرتے ہیں۔

اَنَا الْحَسَنِیُّ وَالْمَخْدَعُ مَقَامِیُ وَ اَقْدَامِیُ عَلٰی عُنُقِ الرِّجَالٖ

میں حضرت امام حسن علیہ الصلوٰۃ والسلام کے نسب سے ہوں۔ میرا مقام مخدع ہے اور میرا قدم ہر ولی کی گردن پر ہے۔

آپکی وجہ فوقیت نسب حضرت امام حسن علیہ السلام سے ہونا ہے۔ کہ آپ سیّد اشباب اہل الجنتہ ہیں محبوب ونور چشم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہیں۔ دوش سوارِ آنحضرتؐ ہیں سردار شہدا ہیں۔

سادات کی عالی نسبی آپکی ذاتِ عالی سے متصور ہوتی ہے۔اور سادات دنیا کی تمام قوموں میں نسلی فضیلت میں ممتاز ہیں۔ یہ فوق کسی کو حاصل نہیں ـــــ بغداد چونکہ مخزنِ علم اور اسلامی عملداری میں دارالخلافت کی حیثیت رکھتا ہے۔اسلئے اسکی وجہ فضیلت یہ ہے۔کہ بغداد آپکے زمانہ میں ہر آفات و خطرات سے محفوظ تھا۔

دوسرے مخدع کہتے ہیں جہاں ایک شے ایسے مقام پر پوشیدہ کی جائے جہاں کسی کا ادراک پہنچ نہ سکے۔جب کسی شخص کوایک شے کا علم ہی نہ ہوتو وہ جگہ مقام محفوظ کہلاتی ہے۔یہ مقام آپکو باطنی حیثیت سے بقاءِ الٰہی میں حاصل ہے۔کہ بقاءفنا کے اس مقام کا مشاہدہ کسی ولی کوحاصل نہیں۔نہ ہی آپکے مقام کو پایا جاسکتا ہے۔

مَـقَـامُـكُمُ الْعُلٰى جَمْعًا وَلٰكِنْ مَقَامِىْ فَوْقَكُمْ مَّا زَالَ عَالٍ میں اسی مقام کی طرف اشارہ ہے۔یہ مقام بقاءِ الٰہی میں وہ مقام ہے۔جہاں ولی ہر شیطانی خطرہ سے محفوظ ہوجاتا ہے۔اور شیطان بھی اس مقام میں ولی پرحملہ آور نہیں ہوسکتا۔

مقام مخدع ولی کیلئے ایک ایسی کمین گاہ ہے۔جہاں پر ایک ولی پہنچ کراس کیفیت سے محفوظ ہوجاتا ہے۔کہ اسے مراتب سے تنزل کی طرف گرنے کا احتمال باقی رہے۔

واضح ہوکہ ولی جب تک زندہ ہوتا ہے۔اسکی جسمانی کیفیت وخواص اسکے ساتھ قائم رہتے ہیں۔جہاں تک نفسانی خواہشات اور مادی خصائل کا تعلق ہے۔یہ کیفیتیں ولی کے ساتھ اسکی زندگی تک برابر رہتی ہیں۔اس میں مادہ کی طلب۔شہوت۔غصہ۔حسد۔کینہ۔بغض۔وغیرہ اسکی مادی ہیئتوں کے اعتبار سے پایا جانا لازمی ہیں۔اور فرق مابین ولی اور عامی یہ ہوتا ہے۔کہ ولی کے یہ خصائل اس کے قبضہ میں ہوتی ہیں۔مثال کے طور۔اسکے حافظہ میں جمع شدہ واقعات میں دنیوی واقعات کا علم۔اسکے واہمہ۔حافظہ۔تعقل۔قلب کی ساخت تو مادی ہی ہوتی ہے۔جب ایک ولی اپنی انتہائی۔ منازل عبور کرتا ہے۔تو یہ خاصیتیں مادی حالت میں بدستور ہوتی ہیں اور دنیوی معاملات میں انہماک سے کبھی ان خصائص میں ترقی بھی ہوتی ہے۔ایسی حالت میں ایک ولی سے غصہ بھی ہوتا ہے۔لُطف

بھی ہوتا ہے۔ شہوت کا استعمال بھی ہوتا ہے۔ یہ کیفیت ایک سالک کی ہوتی ہے۔ کہ وہ دنیا دار بھی ہوتا ہے۔ اور اسے رجوع الی اللہ بھی ہوتا ہے۔ کبھی وہ دنیا کی طرف رجوع ہوتا ہے۔ کبھی اسکے قلب کا حافظہ سے رابطہ ہو کر استغراق و مشاہدہ بھی ہوتا ہے۔ بعض حالتوں میں دنیوی معاملات میں الجھن یا زیادہ توجہ میں اِس سے خطا بھی ہو سکتی ہے۔ کیونکہ اس حالت میں وہ حافظہ و تعقل سے بھی کام لیتا ہے۔ اس حالت میں انسان بھول جاتا ہے۔ یہ خاصیت آدم سے ہی اسے ورثہ میں ملی ہے۔ تو ولی سے خطا سرزد ہونے کا احتمال ضرور رہتا ہے۔ شیطان ایک ولی کی تاک میں رہتا ہے۔ کہ کونسا موقع ملے کہ اسے مراتب سے گرا کر تنزل میں لاؤں۔ یہ حالت ولی کے ساتھ اسکی موت واقع ہونے تک برابر جاری رہتی ہے۔ اسلئے وہ کسی وقت بھی خطرے کی زد میں آ سکتا ہے مگر ولی اکمل کی خصوصیت یہی ہے۔ کہ وہ اپنی زندگی میں اپنی وجودی خاصیتوں کو روح کے قبضہ میں کر کے مجسم روح بن جائے۔ تا کہ اسکی وجودی کیفیتوں میں کوئی کیفیت اپنی تاثیر ظاہر نہ کر سکے۔ یہ کیفیت پیغمبرانہ ہوتی ہے۔ جسکے متعلق قرآن وضاحت کرتا ہے۔ مَاضَلَّ صَاحِبُکُمْ وَمَا غَوٰی ۚ۔ اِنْ ھُوَ اِلَّا وَحْیٌ یُّوْحٰی ۙ (پارہ ۲۷ سورۃ ۵۳ آیت ۲-۴) یعنی انسان جب اپنے مادی خواص پر قبضہ رکھتا ہے۔ تو ہر دنیوی کام میں بھی اپنے قلبی القاء کو ہی ہر امور میں استعمال کرتا ہے۔ تو اسے پھر کسی غلطی کا احتمال نہیں رہتا۔ گو وہ پھر تعقل و حافظہ سے کام نہیں لیتا۔ تعقل و حافظہ کا کام صرف جسمانی نشو و نما کی نگرانی رہتی ہے۔ اسکی جگہ ہر وقت استغراق و ہوش میں قلب و شعور ہی کام کرتے ہیں۔ جیسے حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کے متعلق حضرت عائشہ صدیقہؓ کی یہ حدیث وارد ہے۔ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ اِنَّ عَیْنِیْ تَنَامَانِ وَلَا یَنَامُ قَلْبِیْ ۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہماری آنکھیں سوتی ہیں اور دل نہیں سوتا۔ اسکی تفسیر یہی ہے کہ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام قلبی القاء اور وحی کے ذریعہ ہی دنیا کے تمام امور طے فرماتے تھے۔ اسلئے قرآن نے بھی اسکی تائید کر دی کہ مَاضَلَّ صَاحِبُکُمْ وَمَاغَوٰی۔ تمہارے رسولؐ سے کبھی خطا نہیں ہو سکتی۔ اور ہر ولی کیلئے جذب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم میں اس کیفیت کا حاصل کرنا لازمی ہے۔ تا کہ اسکی راہنمائی میں کسی قسم کی کمزوری واقع نہ ہو ـــــ چنانچہ حضرت شیخ میں یہ کیفیت موجود تھی کہ آپکے وجود پر روح کا

مکمل تسلط تھا۔ جس میں کسی خطا کا احتمال نہ تھا۔ جب خطا کا احتمال نہ رہا تو آپکے لیے دائمی ولایت۔ مراتب کا استحکام ہمیشہ کیلئے مقرر ہوا۔ جہاں انہیں تنزل کا خطرہ نہ رہا۔ اسکے علاوہ آپکی ولایت اس قدر مخفی تھی کہ اس ولایت کو کوئی نہیں پا سکتا گویا آپکو وہ انتہائی اور قوی نور حاصل تھا۔ اگر کوئی ولی اسکا مشاہدہ کرنے کی جرأت کرے تو آپکے مقام کو پا نہ سکے بلکہ ان تجلیات سے اسکی روح پر جذب کا ایسا کیف طاری ہو جائے۔ جسکا ولی مشاہدہ نہ کر سکے۔ تیسری کیفیت یہ تھی کہ ذات الٰہی کی فنا میں بقا کا وہ مقام آپکو حاصل تھا۔ جس مقام میں ولی کو سعادت کی بشارت زندگی میں ہی ملتی ہے۔ جیسے عشرہ مبشرین کو عطا کی گئی کہ وہ عمل کریں یا نہ کریں ان کے حق میں نجات لکھی گئی ہے ـــــ یہ وہ مقام مخدع ہے۔ جہاں نہ شیطان کا گذر ہو سکتا ہے۔ نہ کسی ولی کا گذر ہو سکتا ہے۔ صرف اللہ اور اس کا رسولؐ اور حضرت شیخ عبدالقادر جیلانی ہی جانتے ہیں۔ یہ کمال۔ کمال نبوت اور ملکۂ ولایت یا کمال ولایت ہے۔ اسلئے جس طرح ایک ولی کی ولایت کے لیے حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کی مہرِ تصدیق سندِ ولایت ہے۔ اسی طرح آپکے بعد ولی کو حضرت شیخ عبدالقادر جیلانی رضی اللہ عنہ کی سند حاصل کرنا ضروری ہے۔ گویا جب تک حضرت شیخ عبدالقادر قطب الاقطاب کی سند ولی کو حاصل نہ ہو تب تک حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کی مہر تصدیق حاصل نہیں ہوتی۔ اس اعتبار سے آپ کے اختیار اور حکم۔ فَحُکْمِیْ نَافِذ" فِیْ کُلِّ حَالٍ کو ہر ولی کے لیے تسلیم کرنا ضروری ہے۔ فَحُکْمِیْ نَافِذ" فِیْ کُلِّ حَالٍ میرا حکم ہر حال و ہر دیار میں جاری رہیگا۔ قطب الاقطاب کی حیثیت سے آپکی زندگی میں یہ حکم جاری تھا۔ مگر آپکے بعد بھی آپکے مریدوں کیلئے یہ حکم جاری رہیگا۔ کہ وقت کے قطب الاقطاب کے حکم کے ساتھ حضرت عبدالقادر جیلانیؒ کے حکم کی عظمت و رفعت کو تسلیم کرایا جائیگا یہی کیفیت وَاَقْدَامِیْ عَلٰی عُنُقِ الرِّجَالِ میں اولیاء کی گردنوں پر آپ کا قدم رکھنے سے مشابہ ہے۔

وَعَبْدُ الْقَادِرِ الْمَشْهُوْرُ اِسْمِیْ　　　وَجَدِّیْ صَاحِبُ الْعَیْنُ الْکَمَالٖ

عبدالقادر نام سے مشہور زمانہ ہوں۔ کیونکہ آپ عبدالقادر کے نام سے زمانہ میں اپنی اکملیت وغوثیت وکرامت کے ساتھ مشہور تھے۔ زمانہ میں آپکے کمالات کی شہرت ہے۔ اور عبدالقادر

نام ذاتی شخصیت سے متعلق تھا۔سو آپکی ذاتی شخصیت کی عظمت نسبتِ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے بھی عظیم المرتبت تھی۔ جیسے ایک واقعہ میں آپؐ کی ازواج مطہرات میں حضرت صفیہؓ کو یہودی کی لڑکی کہہ کر باقی ازواج مطہراتؓ مذاقاً طعنہ دیتیں۔تو آپؐ رنجیدہ ہوتیں۔تو حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے فرمایا کہ تم تو زوجۂ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہواور سلیمانؑ۔داؤدؑ۔موسیٰؑ کے نسب سے ہو۔گویا ذاتی شخصیت میں نسبتِ انبیاء و محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم وجہ عظمت قرار پائی۔

گزشتہ بیان ہو چکا ہے۔کہ ایک حقیقت کی دلیل کیلئے۔ذاتی شخصیت کی قوت اسکا علم۔اورعلم کا عامل۔اور عامل کے علم وعمل کا نتیجہ۔ہی خود دلیل ہوتا ہے۔چنانچہ اس دلیل کیلئے ایک انتخاب ہوتا ہے۔کہ خصوصی علم وضع کیا جائے۔جو ہر حال میں نفع بخش ہو۔!اسکا نفع بخش ہونا۔ایک انتخاب اور دلیل اسکی صداقت و حقیقت کی ہے۔ایک عامل پیغمبر کا۔مصطفےٰ ومنتخب ہونا۔خود اسکی شریعت کا نفاذ۔اسکا ذاتی عمل۔اورعمل کے نتیجہ میں ایک حقانی جماعت کا پیدا ہونا اور نتائج میں مقصودِ حقیقی کا پانا۔پیغمبر کیلئے دلیل ہے۔سو حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے دین شریعت وطریقت کی صداقت کی دلیل آپکی خلافتِ ارضی۔آپکے اصحاب۔تابعین۔تبع تابعین ہیں۔جنہوں نے عرفان حاصل کیا اور کائنات کو اپنے علم وعمل سے روشن کر دیا ـــــ انکی رفعتِ شان اور مقبولیت کو کوئی بشر پا نہیں سکتا۔کیونکہ انہیں ایک منبع حقیقی۔منبع طریقت کی توجہ قریبی حاصل تھی۔یہ رفعت یہ شان ایک علیحدہ چیز ہے۔ویسے عرفانِ الٰہی تو ہر شخص صـراط الـلّٰـہ میں یکساں طور حاصل کرتا ہے۔مگر مقبولیت کا مقام ایک مخصوص مقام ہے۔جہاں عرفان کی بھی ضرورت نہیں رہتی۔عرفان خود ایسے مقبول کے پیچھے چلا آتا ہے۔جیسے خود حضرت شیخ عبدالقادر جیلانی نے فرمایا۔

سَعَتْ وَمَشَتْ لِنَحْوِیْ فِیْ کُئُوْسٍ   فَھِمْتُ بِسُکْرَتِیْ بَیْنَ الْمَوَالِ

اصحاب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد اس مقام مقبولیت کا پایا جانا حضرت شیخ عبدالقادر جیلانی رضی اللہ عنہ کے لئے مختص تھا۔اورآپکی امت میں آپکی ذاتِ گرامی۔دعویٰ الٰہی۔دعویٰ پیغمبری حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے ایک روشن دلیل ہے ـــــ اس لیے سلسلہ

طریقت کے چار سلسلوں میں طریقۂ قادری حضرت شیخ عبدالقادر جیلانیؒ کی نسبت سے احسن طریق شمار کیا جاتا ہے اور اسکے احسن طریق ہونے کی دلیل رِجَالِ قادریہ (مرید اور خلفاء طریقت قادریہ) میں مشہور زمانہ اور منتخب ہستیاں۔ حضرت علاؤ الدین علی احمد صابرؒ۔ حضرت فریدالدین گنج شکرؒ۔ حضرت قطب الدین بختیار کاکیؒ۔ حضرت معین الدین چشتیؒ۔ حضرت شاہ نورالحق رودلوی زندان پیرؒ۔ حضرت شاہ عبدالقدوس گنگوہیؒ وغیرہ ہیں۔

آپ سے مختلف شاخیں جاری ہوئیں جن میں خصوصی سلسلے مصطفائیہ قادریہ۔ قادریہ عظیمیہ۔ نظامیہ۔ مجددیہ۔ رسول نمائیہ۔ مسعودیہ۔ قدوسیہ۔ سہروردیہ۔ صادقیہ۔ اصغریہ۔ مجددیہ حسینیہ۔ حسینیہ اصغریہ۔ حسینیہ عملیہ اور چشتیہ ہیں۔ اسی طرح ہر سلسلہ میں کئی شاخیں جاری ہوتی ہیں جو بسبب طوالت تحریر میں نہیں آسکتی ہیں۔

حضرت شیخ عبدالقادر جیلانیؒ حسنی حسینی کا شجرہ نسب معنوی وصوری دونوں طرف سے حضرت امام حسن علیہ السلام سے جاملتا ہے۔ شجرہ پدری اس طرح ہے۔

(۱) حضرت عبدالقادر جیلانیؒ (۲) بن حضرت سید ابو صالحؒ (۳) بن حضرت سید عبداللہؒ (۴) بن حضرت سید یحییٰؒ (۵) بن حضرت سید محمدؒ (۶) بن حضرت سید داؤدؒ (۷) بن حضرت سید موسیٰؒ (۸) بن حضرت سید عبداللہؒ (۹) بن سید حسن مثنیٰؒ (۱۰) بن امام حسن علیہ السلام (۱۱) بن حضرت علی کرم اللہ وجہہ۔

حضرت شیخ عبدالقادر جیلانیؒ کا شجرہ طریقت حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام سے یوں ملتا ہے۔

حضرت شیخ عبدالقادر جیلانیؒ نے حضرت ابوسعید مبارک ابن علی مخزومیؒ سے فیض باطنی حاصل کیا۔ حضرت ابوسعیدؒ نے۔ حضرت ابوالحسن علی بن یوسف الھنکاریؒ سے اور انہوں نے حضرت شیخ ابوالفرح طرطوسیؒ سے۔ انہوں نے حضرت ابوالفضل عبدالواحد بن عبدالعزیز یمیمیؒ سے۔ انہوں نے حضرت شیخ ابوبکر شبلیؒ سے۔ انہوں نے حضرت سید ابوالقاسم جنید بغدادیؒ سے۔ انہوں نے حضرت ابوالحسن سری سقطیؒ سے۔ انہوں نے حضرت خواجہ اسدالدین معروف کرخیؒ سے۔ انہوں نے حضرت امام موسیٰ علی رضاؒ سے۔

انہوں نے حضرت امام موسیٰ کاظمؒ سے۔انہوں نے حضرت امام جعفر صادقؒ سے۔انہوں نے حضرت امام محمد باقرؒ سے۔انہوں نے حضرت امام زین العابدینؒ سے۔انہوں نے امام حسن و حسین علیہا السلام سے۔ انہوں نے حضرت علی کرم اللہ وجہہ سے۔اور آپ نے حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام سے فیض حاصل کیا۔

حضرت علیؓ۔ حضرت ابو بکر صدیقؓ سے بھی سلاسل جاری ہوئے۔حضرت ابو بکر صدیقؓ سے سلسلہ نقشبندیہ نسبت رکھتا ہے۔ اس سلسلہ میں بھی صاحبِ کمال اور مشہور زمانہ ہستیاں پیدا ہوئیں۔ جن سے مختلف سلسلے بنتے گئے۔لیکن حضرت شیخ عبدالقادر جیلانیؒ سے ایک خصوصی طریق جاری ہوا۔جس سلسلہ میں آپ سے بعد حقیقی فیض ملتا رہا۔اس سلسلہ کی مشہور ہستیوں کا ذکر اوپر ہو چکا ہے۔ان اولیاء میں حضرت علاؤ الدین علی احمد صابر رحمتہ اللہ علیہ کا مقام۔حضرت شیخ عبدالقادر جیلانیؒ کی نسبت سے مقام فنا و بقا اور جذب۔مقبولیت میں آپکے قائم مقام ہے۔

حضرت علاؤ الدین علی احمد صابر کلیریؒ: حضرت علاؤ الدین علی احمد صابرؒ کے حالات زندگی حضرت شیخ کی زندگی سے ملتے جلتے ہیں۔آپکا شجرۂ حضرت امام حسن بصریؒ سے جاملتا ہے۔شجرہ آپکا یوں ہے۔ حضرت علاؤ الدین علی احمد صابرؒ نے حضرت فرید گنج شکرؒ سے فیض حاصل کیا اور انہوں نے حضرت بختیار کاکیؒ سے۔انہوں نے حضرت معین الدین چشتی اجمیریؒ سے۔انہوں نے حضرت عثمان ہارونیؒ سے۔انہوں نے حضرت خواجہ شریف زندنیؒ سے۔انہوں نے حضرت خواجہ قطب الدین مودود چشتیؒ سے انہوں نے حضرت خواجہ ناصر الدین ابو یوسف چشتی سرمدیؒ سے۔انہوں نے حضرت خواجہ محمد زاہدؒ سے۔انہوں نے حضرت خواجہ ابو احمدؒ سے۔انہوں نے حضرت خواجہ ابو اسحاق شامیؒ سے۔انہوں نے حضرت خواجہ علو ممشاد دینوریؒ سے۔انہوں نے حضرت خواجہ امین الدین بصریؒ سے۔انہوں نے حضرت خواجہ سدید الدین حذیفتہ المرعشیؒ سے۔انہوں نے حضرت ابراھیم ادھمؒ سے۔انہوں نے حضرت فضل بن عیاضؒ سے۔انہوں نے حضرت خواجہ عبدالواحد بن زیدؒ سے۔انہوں نے حضرت امام حسن بصریؒ سے اور انہوں نے حضرت علی کرم اللہ وجہہ سے اور آپ نے حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام سے فیض حاصل کیا۔

حضرت علاؤالدین علی احمد صابرؒ کی پیدائش بھی مافوق الفطرت تھی۔آپ مادرزاد ولی پیدا ہوئے۔شیر خوارگی کے عالم میں بھی آپ سے مافوق الفطرت کرامات کا صدور ہوتا رہا۔اور ہوش سنبھالنے پر گویا آپ مکمل ولی تھے۔آپکی ذات میں بھی کمالاتِ نبوت کے عکس موجود تھے۔آپ نے اپنی ابتدائی عمر سے کھانے پینے سے رغبت نہ رکھی بلکہ نہ کھانے کے برابر رہا۔رمضان کے تیس دن (ایک ماہ پورا) آپ نے کسی وقت بھی دودھ نہیں پیا اور بچپن میں تین سال کی عمر کے بعد بھی آپ ہفتہ یا ایک ماہ میں شاید ایک یا دو وقت اوسطاً کھانا کھاتے۔اس کیفیت کا یہ نتیجہ لازمی تھا۔کہ آپکی روح جسمانی (حیوانی) ابتدا سے ہی اپنی نورانی کیفیت میں سالم رہی اور آپکے وجود کی نشوونما کو مادہ کی ضرورت نہ رہی۔گویا اس ابتدائی زندگی نے صرف جسم کی ہیئت قبول کی اور خاصیّت نورانی میں کچھ فرق نہ آیا۔یہی وجہ تھی کہ آپکو نشوونما کیلئے غذا کی ضرورت نہ رہی۔آپکی والدہ ماجدہ بھی ولی تھیں۔آپ نے جب بچے کے طورِ ملکوتی کا جائزہ لیا۔تو انہیں ایک اکمل راہنما کی تربیت وتحویل میں لانے کیلئے حضرت بابا فرید گنج شکرؒ کی خدمت میں پیش کیا۔یہ آپکے بھائی تھے۔آپ نے بچے کے کمالات کا معائنہ کیا۔اور اپنی تربیت میں لیا۔آپ نے انہیں لنگر تقسیم کرنے کا حکم دیا۔حضرت علاؤالدین علی احمد صابر رحمتہ اللہ علیہ کا طریق اس عرصہ میں یہ رہا کہ آپ ایک حجرہ میں رہتے تھے۔صبح لنگر میں کھانا تقسیم کرنے کیلئے باہر آجاتے۔کھانا تقسیم کرتے اور خود کچھ نہ کھاتے۔فراغت کے بعد پھر حجرہ نشین ہو جاتے۔شام کو پھر کھانا تقسیم کرنے کے لیے نکلتے۔فارغ ہو کر پھر حجرہ میں چلے جاتے یہی کیفیت کئی سال رہی۔اس عرصہ میں آپ نے لنگر سے ایک دانہ بھی نہ کھایا۔۔۔۔ عقل تو کہتی ہے۔کہ انسان زیادہ سے زیادہ چالیس دن بغیر کھانا کھانے کے زندہ رہ سکتا ہے۔مگر یہاں تو سالہا سال آپ زندہ رہے۔تو یہ ثبوت اس امر کا ہے۔کہ انسانی روح حیوانی ایک مجسم زندگی ہے۔جو غذا سے نشوونما حاصل کرنے کی محتاج نہیں۔بلکہ انسانی وجود کو جسمانی حالت میں زندہ رکھ سکتی ہے۔اور پھر جب کئی سال تک تزکیہ و استغراق اور حب کا عمل جاری رہا تو لازمی طور روح رحمانی اور روح حیوانی میں اتصال و جذب حاصل ہو کر ایک ہی وجود روح رحمانی قائم ہو جاتا ہے یہی کیفیت آپکی رہی۔جب آپکی والدہ اپنے بچے کو

دیکھنے آئیں تو بچے کی جسمانی حالت کمزور نظر آئی تو بھائی سے شدت کے ساتھ شکایت کی کہ آپ نے میرے بچے کو بھوکوں مارا۔آپ نے اس کا خیال نہیں رکھا تو آپ نے حضرت علاؤ الدین علی احمد صابر کو بلا کر پوچھا کہ آپ کو لنگر پر مقرر کیا تھا۔کیا آپ کھانا نہیں کھاتے تھے۔تو انہوں نے کہا کہ میں نے حکم کی تعمیل کی۔آپ نے کہا تھا لنگر تقسیم کرو کھانے کیلئے تو نہیں کہا تھا۔تو حضرت بابا فرید گنج شکرؒ نے بہن کو تسلی دی کہ علی احمدؒ کو انسانی حالت میں نہ دیکھو بلکہ یہ ملکوتی صفات کا حامل ہے۔انکی رغبت کھانے کی طرف نہیں بلکہ اپنے منبع حقیقی سے ہی غذا حاصل کر رہے ہیں۔

جب حضرت علی احمد صابر رحمتہ اللہ علیہ کے مقامات عُلیا تکمیل پذیر ہوئے۔تو اسوقت شدت کا استغراق آپ پر طاری تھا۔گویا ایک نوری پیکر تھا جو ہر آن تجلی الہٰ میں جذب وغرق تھا۔آپکی تکمیل کے بعد آپکو بابا فرید کی طرف سے امام کی حیثیت سے کلیر شریف جانے کا حکم ہوا۔چنانچہ آپ کلیر شریف تشریف لائے۔یہاں اسوقت علماءِ سو کا بڑا زور اور اقتدار تھا۔ایک نئے امام کی امامت سے انکے حصولِ ناجائز کا خاتمہ ہو رہا تھا۔چنانچہ انہوں نے شدّت کے ساتھ آپکی مخالفت کی۔آپکی مخالفت کرنا کوئی آسان کام نہ تھا۔یہ تو علماء کی شقاوتِ قلبی کے باعث انکا ایک ولی سے مخالفت کرنا تھی۔چنانچہ نتیجہ یہ ہوا کہ جب جمعہ کے روز آپ مسجد جامع میں امامت کے لئے کھڑے ہوئے تو علماء نے آپ کو امامت پر کھڑا نہ ہونے دیا۔تو آپ نے قہر آلود نگاہ مسجد کی طرف اٹھائی۔آناً فاناً مسجد بمع تمام لوگوں کے زمین میں دھنس گئی۔اور کلیر کا تمام علاقہ چالیس میل تک ایک شعلہ آتش بن گیا۔اس حالت میں اگر کوئی جاندار بھی اس بقعہ آتش کی حدود میں داخل ہوتا تو جل کر راکھ ہو جاتا۔مسجد کے دھنس جانے کے وقت ایک عورت (جس کے ہاں حضرت علاؤ الدین کلیر میں داخل ہونے پر مقیم رہے) بھی ساتھ تھی اسکے دو لڑکے بھی مسجد کے نیچے دب گئے عورت نے آپکے سامنے التجا کی کہ میرے لڑکے بھی دب گئے تو آپ نے فرمایا دہلیز کے نیچے پڑے ہیں انہیں نکالو وہ دونوں لڑکے صحیح سالم نکل آئے۔باقی تمام لوگ جن میں چند ایک ولی بھی موجود تھے سب کے سب زمین میں دب گئے۔آپ سے ان فقرا نے التجا کی ہم تو ولی ہیں آپکے حامی ہیں۔مگر آپ نے جلال کی حالت میں فرمایا۔ولی کے

قہر کے آگے کوئی محفوظ نہیں رہ سکتا۔ اسکے بعد آپ ایک گولر کے درخت کے پاس آ کر کھڑے ہو گئے اور استغراق کی کیفیت جلالی اسقدر طاری ہوئی کہ ہمیشہ کھڑے رہے۔ پھر اپنی تمام عمر اسی حالت میں کھانے پینے سونے سے بے نیاز کھڑے رہے۔ اس عالمِ استغراق میں آپکے پاس دو ہستیاں موجود رہیں ایک ہستی کا اسم گرامی علیم اللہ ابدالؒ ہے۔ یہ ہستی ہر وقت خدمت میں رہتی۔ انکے علاوہ اس مقام پر کوئی شے وارد نہیں ہوسکتی تھی۔ کیونکہ کلیر کا علاقہ جہاں علاؤ الدین علی احمد صابر رحمتہ اللہ علیہ استغراق میں کھڑے تھے چالیس میل کے علاقہ میں فضا آتشی بن چکی تھی جہاں کوئی ذی روح داخل نہ ہوسکتا۔ اگر داخل ہوتا تو اُسکے وجود کو آگ لگ جاتی سوائے خود حضرت صابر کی اجازت کے کوئی شخص اس میں داخل نہ ہوسکتا۔ اس دوران میں جو ولی آپ سے ملاقات کو آتے وہ بھی آپ سے ملاقات کی اجازت طلب کر کے باریابی حاصل کرتے۔ سوائے علیم اللہ ابدال کے اس آتشیں فضا میں کوئی شخص بھی نہ ٹھہر سکتا تھا۔

کچھ عرصہ بعد حضرت شمس الدین پانی پتی آپکی خدمت میں حاضر ہوئے۔ یہ صرف آپ سے فیض باطنی حاصل کرنے کیلئے حاضر ہوئے۔ چنانچہ حضرت صابر رحمتہ اللہ علیہ نے آپکو چھ سال حبس کبیر کا حکم دیا۔ اور حضرت شمس الدین پانی پتی زمین میں قبر کھود کر آپکے قریب ہی چلہ کش ہوئے۔ آپ نے اپنے ہمراہ صرف دو روٹیاں اور ایک کوزہ پانی کا رکھا۔ چھ سال گذرنے کے بعد حضرت علاؤ الدین علی احمد صابر رحمتہ اللہ علیہ نے علیم اللہ ابدال کو حکم دیا۔ کہ وقت پورا ہو چکا اب شمس الدین کو باہر لاؤ۔ حضرت علیم اللہ ابدال نے حضرت شمس الدین کو پکارا۔ تو استغراق میں انکی یہ کیفیت تھی۔ کہ آپ نے جواب میں کہا کون شمس الدین؟ ـــــ اور کسے پکار رہے ہو۔ حالت استغراق میں مافیہا سے بے خبر ہو کر یکسر ذات احدیت میں فنا ہو چکے تھے۔ آخر حضرت علاؤ الدین صابرؒ کی باطنی توجہ سے آپکو ہوش آیا۔ اور آپ اپنے رہبر کامل کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ تو حضرت علاؤ الدین علی احمد صابر رحمتہ اللہ علیہ نے آپ کو شمس الارض کا خطاب دیا۔ اور انہیں حضرت سے آپکا سلسلہ صابر یہ جاری ہوا ـــــ سلسلہ صابر یہ کی بے شمار شاخیں جاری ہوئی ہیں۔ جن میں ہر شاخ کی نسبت ایک خلیفہ اکبر سے ہوتی ہے۔ ان میں آپ کا ایک سلسلہ حضرت شمس الدین پانی پتیؒ۔ حضرت شاہ جلال الدین پانی پتیؒ۔ حضرت شاہ

عبدالحق رودلوی زندان پیرؒ۔حضرت شاہ مصطفیٰ عارف حقؒ۔حضرت شاہ شیخ کمال الدین محمدؒ (محمد جیو عیسیٰ روحیؒ) حضرت مشکلکشا بندگیؒ۔حضرت شاہ عبدالقدوس گنگوہیؒ۔حضرت شاہ جلال الدین تھانیسریؒ۔ حضرت شاہ نظام الدین بلخیؒ۔حضرت شاہ ابوسعید گنگوہیؒ۔حضرت شاہ شیخ محمد صادق گنگوہیؒ۔حضرت شاہ شیخ داؤد گنگوہیؒ۔حضرت شاہ ابوالمعالیؒ۔حضرت میر محمد سعید عرف میراں سید شاہ بھیکؒ۔حضرت شاہ عنایت جیوؒ۔حضرت شاہ عبدالکریمؒ عرف ملافقیرا خون۔حضرت میاں غلام شاہ معصومؒ۔حضرت شاہ محمد امیر حقؒ۔حضرت شاہ محمد حسن صابریؒ (مصنف آئینہ تصوف صابری) اس کے علاوہ صابریہ سلسلہ کی شاخیں صابریہ مجددیہ۔سنجریہ۔قدوسیہ۔نعمتیہ۔کریمیہ۔نیازیہ۔حنفیہ۔غلامیہ بھی ہیں۔

نقشبندیہ سلسلہ بھی ایک مخصوص سلسلہ ہے۔جس کی نسبت حضرت ابوبکر صدیقؓ سے ہے۔ سہروردیہ۔چشتیہ تو سلسلہ قادریہ کی ہی شاخیں ہیں۔

ان تمام سلاسل سے علاوہ ایک سلسلہ خصوصی اویسیہ بھی ہے ـــــ اس سلسلہ کے متعلق معلومات بہت کم ملتی ہیں ـــــ لیکن یہ حقیقت مسلمہ ہے کہ اس سلسلہ کی نسبت حضرت خواجہ اویس قرنیؓ سے ہے۔

حضرت خواجہ اویس قرنیؓ: آپ وہبی ولی ہوئے ہیں۔آپ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کے عہد رسالت میں یمن کے ایک قصبہ قرن میں رہتے تھے۔آپکی ایک عمر رسیدہ والدہ تھیں۔جنکی خدمت آپکے سپرد تھی۔آپ جنگل سے لکڑیاں کاٹ کر فروخت کر کے دو درہم حاصل کرتے۔اور اسی سرمایہ سے اپنی گذر بسر کرتے۔والدہ کی خدمت میں مصروف رہنے کی وجہ سے آپکو گھر سے باہر جانے کی مہلت نہ ملتی۔آپکی طبیعت ابتدا سے ہی تلاشِ حق کی طرف مائل تھی۔اسلئے اکثر اوقات تنہائی و بے خودی و استغراق میں گذارتے۔اس جذب وعمل کا نتیجہ یہ ہوا۔کہ آپ پر باطنی آثار کا انکشاف ہوتا رہا ـــــ چونکہ یہ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کے دور جہاں بانی کا زمانہ تھا۔اور آپ تک بھی حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کے ارشادات شریعت (علماء اسلام کے ذریعہ) پہنچتے۔اور آپ پر ان ارشادات کے سننے سے عشقِ

رسول اللہ کا جذبہ بڑھتا جاتا۔ چونکہ والدہ کی خدمت کا اور کوئی ذریعہ موجود نہ تھا۔ کہ انہیں تنہا چھوڑ کر خدمتِ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم میں حاضر ہوتے۔ اس فراق نے آپکے جذبہ محبت میں اور بھی اضافہ کیا۔ اور آپ پر اس قدر جذب محبت طاری ہوا۔ کہ خود حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے آپکو باطنی طور زیارت سے مشرف فرما کر فیض باطنی عطا کیا۔۔۔۔ چنانچہ حدیث صحیح اسکی شاہد ہے کہ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام حضرت خواجہ اویسؓ کی اکثر اپنے اصحابؓ میں خوبیاں بیان فرماتے۔ اور فرماتے کہ یمن میں ایک اللہ کا بندہ اویسؓ میرا دوست ہے۔ اصحابؓ نے پوچھا۔ کہ اویسؓ کبھی آپ کی خدمت میں حاضر نہیں ہوئے؟ آپ نے فرمایا[1] کہ ان کی والدہ ضعیف العمر ہیں۔ ان کی خدمت انہیں یہاں آنے سے مانع ہے۔

اسی دور فراق میں حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام انتقال فرما گئے اور حضرت خواجہ اویس قرنیؒ کو ظاہر طور شرف باریابی دربار۔ رسولؐ میں نہ ہو سکا۔ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کے بعد حضرت ابو بکر صدیق۔ حضرت عمر فاروق۔ اور حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہم کے دورِ خلافت میں بھی حضرت اویسؓ مدینہ میں تشریف نہ لائے۔ اس عرصہ میں آپکی والدہ ماجدہ کا بھی انتقال ہو چکا تھا۔ غالباً خلافت حضرت ابو بکر صدیقؓ میں یا عمرؓ کی خلافت میں۔ حضرت عمر فاروق اور حضرت علی رضی اللہ عنہما یمن تشریف لے گئے۔ واقعہ یوں ہے۔ کہ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے وصیت فرمائی تھی کہ آپکے بعد آپکا ردائے مبارک (چوغہ) حضرت اویس قرنی رضی اللہ عنہ کو پہنچا دینا۔ اور ہماری امت کی دعا کیلئے کہنا۔ چنانچہ حضرت عمر اور حضرت علی رضی اللہ عنہما نے یمن جا کر حضرت خواجہ اویس قرنیؒ کو تلاش کیا۔ یمن میں

---

[1] اس حدیث سے معلوم ہوتا ہے۔ کہ نہ اویسؓ نے حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کو دیکھا تھا۔ نہ آپؐ نے اویسؓ کو اور انکے حالات کو دیکھا تھا۔ لیکن آپؐ نے اویسؓ کے حالات کی آگاہی دی۔ اس سے ثابت ہوتا ہے۔ کہ اویسؓ اور حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کا باطنی رابطہ قائم تھا۔ جس رابطہ کے تحت حضرت خواجہ اویس قرنیؒ کو براہ راست نسبت باطنی حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام سے تھی اور آپ کا فیض جیسے اصحاب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو حاصل تھا اسی طرح حضرت خواجہ اویس قرنیؒ کو بھی حاصل تھا۔ اسی فیض سے حضرت خواجہ اویس قرنیؒ کو عرفان الٰہی حاصل ہوا۔

عام لوگ حضرت خواجہ اویس قرنیؒ سے شناسانہ تھے۔ قرن میں بھی جہاں انکی سکونت تھی بہت کم لوگ آپکی خصوصیت سے آگاہ تھے۔ بالآخر حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کی نشان دہی پر انہوں نے حضرت خواجہ اویس قرنی رضی اللہ عنہ کو جنگل میں پالیا۔ حضرت عمر و حضرت علی رضی اللہ عنہما نے آپ کو ردائے مبارک حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام اور آپ کا پیغام دیا۔ حضرت خواجہ اویس قرنی رضی اللہ عنہ نے ردائے مبارک لے کر بارگاہ الٰہی میں دعا کی۔ کہ "یا الٰہ العالمین تیرے محبوب کا تحفہ مجھے ملا ہے۔ اور انکا پیغام امت کی نجات کیلئے تیری بارگاہ میں دعا مانگنے کا ہے۔ اے اللہ! میں یہ جبہ مبارک اس وقت تک نہ پہنوں گا جب تک تو امت محمدیہ کو بخش نہ دے"۔ انہیں سجدہ میں زیادہ دیر ہوگئی تو اصحاب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو تشویش ہوئی کہ شاید وصال نہ کر گئے ہوں۔ وہ قریب پہنچے تو آپ نے سر سجدہ سے اٹھایا اور کہا اگر آپ ادھر نہ آتے تو میں تب تک سر سجدہ سے نہ اٹھاتا جب تک مجھے ساری امت کی بخشش کا مژدہ نہ سُنا دیا جاتا۔ بہر حال اب بھی کافی امت (قبیلہ ربیعہ و مضر کی بکریوں کے بالوں کے برابر) کی ہدایت و نجات کی بشارت ملی۔

حضرت خواجہ اویس قرنیؒ حضرت علی کرم اللہ وجہہ کے زمانہ میں مدینہ تشریف لائے۔ اُسوقت حضرت علیؓ اور حضرت امیر معاویہؓ کے درمیان نزاع پیدا ہو چکا تھا۔ چنانچہ حضرت خواجہ اویس قرنیؒ نے حضرت علی کرم اللہ وجہہ کو خلیفہ اسلام تسلیم کیا۔ اور آپکے ہاتھ پر بیعت خلافت کی۔ تواریخ سے معلوم ہوتا ہے۔ کہ حضرت خواجہ اویس قرنی رضی اللہ عنہ جنگ صفین میں بھی شامل ہوئے۔ اسکے بعد تواریخ سے آپکے متعلق حالات کا کچھ پتہ نہیں چلتا۔

جہاں تک حضرت خواجہ اویس قرنیؒ کی ولایت و عرفان کا تعلق ہے۔ آپ نے اپنے عرفانِ الٰہی میں بدرجہ اکمل تکمیل کی تھی اس امر کے لیے اتنی شہادت کافی ہے۔ کہ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے اپنے عہد حیات میں آپکی خوبیاں بیان فرمائیں۔ یہ خوبیاں صرف آپکی افضلیت۔ قرب الٰہی اور آپکے کمال عمل کی بنا پر ہی تھیں۔ اس امر کی شہادت بھی حضور کا ردائے مبارک تحفۃً عطا کرنا اور امت کی دعا کے لیے فرمائش کرنی کافی ہے۔ جس طرح حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کے بعد آپکے اصحاب۔ حضرت ابو بکر صدیقؓ سے سلسلہ نقشبند کی اور حضرت علی کرم اللہ وجہہ سے باقی سلاسل کی نسبت ہے۔

اسی طرح حضرت خواجہ اویس قرنیؓ سے سلسلہ اویسیہ کی نسبت ہے۔

باقی سلاسل میں حضرت ابوبکر صدیق اور حضرت علی رضی اللہ عنہما سے سلسلہ کی کڑیاں تواتر کے ساتھ چلی آتی ہیں۔لیکن حضرت خواجہ اویس قرنی رضی اللہ عنہ کے ابتدائی واقعاتِ زندگی سے دنیا بے خبر رہی اسلئے اس سلسلہ کی کڑی آپکے دورِ حیات سے حال تک مسلسل اور تواتر کے ساتھ نہیں ملتی۔ اور واقعہ بھی یہی ہے۔کہ ابتداءً آپ والدہ کی خدمت میں مصروف رہے۔باقی زمانہ مخلوق سے کنارہ کشی میں گذارا اور حضرت علی کرم اللہ وجہہ کے زمانہ میں بھی آپکی کیفیتِ جذب وفراق رسولؐ میں انتہا کو پہنچ چکی تھی۔اسلئے آپ کا کوئی خلیفہ ظاہری نہ ہوسکا۔حضرت علیؓ کے زمانہ میں تو خود حضرت علیؓ نائب رسول کی حیثیت سے قائم مقام تھے۔اسلئے اس زمانہ میں بھی آپکا کوئی خلیفہ نہ ہوسکتا تھا۔

یہ امر مسلمہ ہے۔کہ جب تک تواتر کے ساتھ سلسلہ آپ سے جاری نہ ہوتو پھر سلسلہ اویسیہ ظاہراً کوئی پایانہیں جا سکتا۔البتہ جسطرح حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام سے آپکو باطنی فیض حاصل ہوا ــــ اور آپ وہبی ولی تھے۔اسی طرح ایک وہبی فقیر (ولی) کی آپ سے نسبت دی جاتی ہے۔یعنی جو شخص مادرزاد ولی ہواُسے اویسی کہا جاتا ہے۔کہ اسے بھی حضرت خواجہ اویس قرنیؓ کی مانند حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام سے فیض حاصل ہوتا ہے۔اسکا کوئی مرشد نہیں ہوتاــــ دوسرا طریق اویسیہ یہ ہے۔کہ براہ راست نسبت باطنی حضرت خواجہ اویس قرنیؓ سے ہو۔اور ایک شخص کو باطن میں حضرت خواجہ اویس قرنیؓ سے فیض حاصل ہوا ہو۔اول الذکر ولی صرف مثالاً اویسی کہلاتا ہے۔اور دوسرا شخص خالص اویسی کہلاتا ہے۔بس یہی دو فریق اویسی کہلاتے ہیں۔ان میں دوسری قسم ولی کی خالص اویسی کہلاتی ہے۔

حضرت شاہ عبداللطیف بھٹائیؒ:- حضرت خواجہ اویس قرنیؓ کے بعد تواریخ اور دیگر اسناد سے سلسلہ اویسیہ کا پتہ نہیں چلتا کہ کوئی شخص اویسی کہلایا گیا ہو۔البتہ آپ سے تقریباً گیارہ سو سال بعد علاقہ سندھ میں ہالا حویلی کے مقام پر ۱۶۸۹ء میں مٹیاری کے سید کاظمی خاندان میں ایک ہستی پیدا ہوئی جنہیں شاہ عبداللطیف بھٹائیؒ (المعروف لال لطیف) کے نام سے پکارا جاتا ہے۔یہ ہستی زمانہ کے

اولوالعزم اولیاءٔ میں شمار ہوتی ہے۔

یہ وہ زمانہ تھا جب سندھ میں سلطنت مغلیہ زوال پذیر ہو چکی تھی۔ اور سلطنت مغلیہ کے آخری حکمران اورنگ زیب کا انتقال ہو چکا تھا۔ اس وقت شاہ عبدالطیف بھٹائیؒ کی عمر اٹھارہ سال کی تھی۔ آپکے زمانہ حیات میں سندھ پر مغلیہ زوال کے بعد کلہوڑوں کا تسلط ہو چکا تھا۔ کسی برسر اقتدار قوت کے زوال کے آثار اس وقت نمایاں ہو جاتے ہیں۔ جب حکمران قوم فراوانیِ دولت کے سبب قوانین فطرت سے کوتاہی پر آمادہ ہو کر آرام طلبی اور غرض پرستی کی طرف مائل ہو جائے۔ ہوس مادہ سے ہر شخص مال و اقتدار کو اپنے قبضہ میں لانا چاہتا ہے۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے۔ کہ ایک طرف حکمران طبقہ میں باہمی جنگ و جدل سے قوت پارہ پارہ ہو کر تنزل کے آثار پیدا ہوتے ہیں۔ اور مخالف قوتیں ان کمزوریوں سے فائدہ اٹھا کر اقتدار کو اپنے ہاتھ میں لینے کیلئے ایک ملک کے نظام کو درہم برہم کر دیتی ہیں۔ جسکا اثر عوام پر بھی پڑتا ہے۔ کہ ایک صحیح قانونی نظام نہ ہونے کے باعث عوام کے عقائد و اعمال میں اختلاف اور بناوٹ پیدا ہو جاتی ہے۔ اسی طرح اس وقت جب کہ مغلیہ خاندان میں صرف حصول اقتدار کیلئے لوگوں میں جنگ و جدال رہا قوم کی مذہبی۔ سیاسی۔ تمدنی حالت ابتر ہو گئی تھی۔ شاہ عبداللطیفؒ کے زمانہ میں مغلوں کے بعد کلہوڑوں کا خروج بھی قوم کیلئے کوئی نفع بخش دور نہ تھا۔ آپکے دورِ حیات میں ہندوستان میں پے در پے انقلابات طاری رہے۔ جس وقت نادر شاہ نے سندھ کو ایرانی حکومت کا غلام بنایا اور دلی کو لوٹا اس وقت آپ کی عمر پچاس سال کی تھی۔ احمد شاہ ابدالی نے مغلیہ حکومت پر حملہ کر کے افغانستان کی بنیاد ڈالی اور سندھ کو کابل کی حکومت میں شامل کر لیا۔ اور جس وقت شاہ صاحب نے انتقال کیا تو ایسٹ انڈیا کمپنی نے ہندوستان پر اپنے قدم جمائے۔ ایسی حالت میں لازمی طور عوام میں انتشار پایا جانا ضروری تھا۔ عوام پر صحیح راہنمائی حاصل نہ ہونے کے باعث اور پے در پے حکمرانوں کے تسلّط کے باعث ایک عالم اضطراب طاری تھا۔

گزشتہ صدیوں میں ہندوستان میں اسلام کا خروج سندھ کے راستہ ہی ہوتا رہا۔ لیکن پے در پے انقلابی حملوں کے باعث سندھ میں اسلامی شریعت اپنی اصلی ہیئت میں نہ رہ سکی اور مسلمانوں

میں اسلامی عقائد مختلف رسومات کی صورت پکڑ گئے تھے۔ چنانچہ یہاں خاندانی نسبت کے لحاظ سے تین سلسلے موجود تھے۔ جنکی طرف عوام کا زیادہ تر رجوع تھا۔ ان میں (۱) سادات (۲) قریشی (۳) عباسی۔ واجب التعظیم خاندان تصور کئے جاتے۔ عوام میں تو ہم پرستی غالب ہو چکی تھی۔ اسلئے لوگوں میں انکی تعظیم وعقیدت ایک ہندوانہ رنگ میں پائی جاتی تھی۔ ان میں زیادہ تر سیدوں کی تعظیم زیادہ کی جاتی اور عوام کی عقیدت نے انہیں دیوتاؤں کی سی حیثیت دی ہوئی تھی۔ حضرت شاہ عبدالطیفؒ کے زمانہ میں عوام کے مذہبی عقائد کا یہی حال تھا۔

شاہ عبدالطیفؒ بھی کاظمی سیدوں کے گھرانے میں پیدا ہوئے۔ لیکن آپکو اپنی ابتدائی زندگی میں ہی فطرت سے لگاؤ اور دنیوی مشاغل سے تنفر کا جذبہ حاصل تھا۔ باوجود خاندانی وقار اور عوام کی سید پرستی کے بھی آپ نے اپنے آپکو ان اثرات سے علیٰحدہ رکھا۔ آپ اکثر تنہا اور خاموش زندگی بسر کرتے۔ جوں جوں آپ بلوغت کی حدتک پہنچے آپ زیادہ تر فقیر سیرت لوگوں سے صحبت رکھنے لگے۔ اور بلوغت کے بعد آپ سندھ کے ملحقہ علاقوں۔ ملتان۔ جیسلمیر۔ کاٹھیاوار۔ لسبیلہ اور مکران میں اکثر صوفیا اور ہندو سادھوؤں کی صحبت میں رہے۔ جس سے آپ نے ہر طبقہ کے لوگوں کا جائزہ لیا۔ اسی طرح عوام کی زندگی کا بھی مطالعہ کرتے رہے۔ قدرت نے آپکو جہد وفکر کا مادہ فطری طور عطا کیا تھا۔ اسلئے آپ نے اسی جذبہ کو اپنا راہنما بنا کر تفکر واستغراق میں تلاشِ حقیقت شروع کر دی۔ آپ فطری شاعر تھے۔ لیکن یہ امر مسلمہ ہے۔ کہ آپکو کوئی ایسا عالم سوائے اپنے خاندان کے افراد کے میسر نہ ہوا جو آپکی راہنمائی کے قابل ہوتا۔ اس سلسلہ میں آپکو جو کچھ علم حاصل ہوا وہ اپنے بزرگوں سے حاصل ہوا۔ یعنی آپکے پردادا شاہ عبدالکریم بلہڑیؒ اور انکے لڑکے شاہ عبدالقدوسؒ اور انکے لڑکے شاہ حبیبؒ (شاہ عبداللطیفؒ صاحب کے والد) یہ سب سلسلہ قادریہ کے باکمال ولی تھے۔ جن کی صحبت میں شاہ عبداللطیفؒ کے فطری وجدان میں جوش پیدا ہوا ____ اور آپ نے لوگوں کے حالات زندگی کا معائنہ کرنے کے بعد شاعرانہ رنگ میں اصلاح شروع کی۔

حضرت شاہ عبداللطیف بھٹائیؒ کے اشعار سے عام طور یہ اندازہ لگایا جاتا ہے۔ کہ آپ

ایک صوفی شاعر تھے۔اور آپ نے قوم کی ظاہری اصلاح کیلئے ایک راہنمایانہ حیثیت سے قدم اٹھایا۔ لیکن زمانہ کی تاریکی نے آپکے اصلی کمالات کو بھی تاریکی میں پوشیدہ رکھا۔اور شاہ صاحب کی زندگی کے مستند حالات نہ ملنے کے باعث انکی عظمت لوگوں پر ظاہر نہ ہوسکی۔اسکی سب سے بڑی وجہ یہ تھی۔ کہ حضرت شاہ صاحبؒ کو قدرت کی طرف سے جو بھی قوت عطا ہوئی تھی وہ کمال صرف شاہ صاحب تک ہی رہا۔اور آپکی روحانی اثاث قبول کرنے کیلئے کوئی ہستی ایسی میسر نہ ہوسکی جو اس روحانی امانت کی امانت دار ہو۔چونکہ روحانیت کا تعلق قلب سے ہوتا ہے۔اسلئے آپکی سب سے بڑی عظمت کا نشان آپکے سینہ میں ہی امانت کے طور دفن ہوا۔اور اس عظمت سے کوئی واقف نہ ہوسکا۔

خاندانی نسبت سے آپ اپنے والد کے سلسلہ قادریہ سے متعلق ہیں۔گویا ظاہری طور آپکو اپنے والد حضرت سیّد شاہ حبیب اللہؒ سے بیعت حاصل تھی اور آپ ہی سے توجہ اور فیض بھی پاتے رہے۔لیکن یہ سب کچھ ایک اصلاحی عمل تھا۔کہ آپکے جہد و تفکر میں ایک کامل راہنما کی توجہ حاصل ہوئی۔اور جو مرتبہ مصطفوی (انتخابی) آپکو قدرت سے پیدائشی حاصل تھا وہ براہ راست حضرت خواجہ اویس قرنیؓ سے حاصل تھا۔چنانچہ اسکی تائید آپ کے اشعار سے ہوتی ہے۔

ء ویجھو ونج مَ واٹ کھے ۔ کھج ڏنهُ کُواٽ

اُجھی منجھاں آٹ ۔ او یسی تھی آؤتوں

ترجمہ: شاہراہ کے نزدیک نہ جاتو۔الٹی راہ کی طرف چلو

تکالیف سے لال ہوکر۔اویسی بن کر آتو

اس شعر میں شاہ صاحبؒ نے حقیقی جذبِ محبت اور دائمی استغراق و مشاہدہ کی طرف اشارہ کیا ہے۔کہ اس میں شک نہیں کہ راہ سلوک میں ایک ولی سالک کو ظاہری (دنیوی) باطنی (اُخروی) پہلو یکساں طور پر لازم رکھنے ہوتے ہیں۔کہ شریعت کی حدود کے اندر رہ کر دنیا کے امور بھی سرانجام دے۔اور حقیقت کی راہ کی طرف گامزن ہو۔یہی طریق انسان کو صراط اللّٰہ ۔یا صراطِ مستقیم کی طرف لے جاتا ہے۔اسی راہ کو شاہراہ سے مراد لیا گیا ہے۔کہ شریعت کی تابعداری اور دنیوی امور

کی انجام دہی کے ساتھ شاہراہ حقیقی پر چلنا۔انسان کو اللہ تک پہنچاتا ہے۔ یہاں انسانی مقصود صرف اللہ کو پانا ہوتا ہے۔لیکن شاہ صاحب اسی طریق کے ساتھ انسانی قلب میں ایک جذب بیخودی طاری کرنا چاہتے ہیں۔کہ تو مقصود سے خالی ہو ___ تو اپنی جستجو صرف اپنی غرض کو پوری کرنے کیلئے نہ رکھ بلکہ اپنی جستجو میں جذب بیخودی طاری کر کہ تجھے اپنا مقصد بھی بھول جائے۔تیری محبت میں شوق وصل نہ ہو۔تو محبوب کی طرف سے منہ پھیر کر الٹی راہ چل کہ تو اپنے ہر قدم پر محبوب سے دور ___ فراق میں پڑ جائے۔کیونکہ تیری محبت کا انجام اگر وصل محبوب پر ہوا۔تو تیری محبت کی موت واقع ہوگی۔اور جو تو محبوب سے دور۔فراق۔درد وکرب میں پڑا رہے۔تو لازمی طور۔نہ محبوب سے ہمکنار ہوگا۔نہ تیری محبت ختم ہوگی۔بلکہ ہجر و فراق کی لذت تیری محبت میں ایک کیف بے خودی و سرمستی پیدا کرے گی۔جس بیخودی ولذت پر ہزار جان قربان کہ جذبہ محبت میں حیاتِ ابدی پیدا ہوتی ہے۔تو اس کا سبق حضرت خواجہ اویس قرنیؒ سے سیکھ کہ اپنی عمر میں حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام سے قرب حاصل نہ کیا۔اور فراق یار کی لذت نے اسقدر بیخودی و سرمستی پیدا کر دی۔کہ اپنا کوئی مقصود ہی نہ رکھا ___ اور جذبِ محبت نے اسقدر فنا کر دیا کہ دندان مبارک توڑ کر من کل الوجود فنا و بقا حاصل کی اور یہی بقا ازلی ابدی کیفیت میں آپکو حاصل رہی۔حضرت شاہ صاحبؒ کا اشارہ اسی سلسلہ کی طرف ہے۔کہ طریق اویسی اختیار کرتا کہ تو اپنے نصب العین کی کلی طور تکمیل کر سکے۔لہٰذا حضرت شاہ صاحب کا مسلک بھی اویسی رہا۔اور اسکا لازمی نتیجہ یہی ہے۔کہ مثل حضرت خواجہ اویسؒ آپکو بھی باطنی نسبت سے حضرت خواجہ سے ہی فیض مراتب حاصل ہوا۔گویا۔حضرت شاہ عبداللطیف بھٹائی رحمتہ اللہ علیہ کی نسبت براہ راست حضرت خواجہ اویس قرنیؒ سے تھی اور حضرت خواجہ کے بعد آپکی امانت[1] براہ راست حضرت شاہ

[1] قدیم فقراء کا قول ہے۔کہ سلسلہ اویسیہ عنقا ہے۔یہ سلسلہ کسی کو حاصل نہیں اسکی وجہ یہی تھی کہ حضرت خواجہ اویس قرنی رضی اللہ عنہ اور حضرت شاہ عبداللطیف بھٹائیؒ کے درمیان کوئی واسطہ (سلسلہ) درمیانی نہ ہونے کے باعث یہ طریق معدوم ہی رہا۔

عبداللطیف صاحب بھٹائیؒ کو حاصل ہوئی۔

خاندانی نسب حضرت شاہ عبداللطیف صاحبؒ کا حضرت امام موسیٰ کاظمؒ[1] رضی اللہ عنہ سے جا ملتا ہے۔ اور سلسلہ قادریہ کی نسبت بھی اسی طرح حضرت امام موسیٰ کاظم رضی اللہ عنہ سے جا ملتی ہے۔ شجرہ قادریہ۔ شاہ عبداللطیف صاحب سے یوں ہے۔

(۱) شاہ عبداللطیف بھٹائیؒ (۲) شاہ حبیب اللہؒ (آپکے والد) (۳) شاہ عبدالقدوسؒ (آپکے دادا) (۴) شاہ جمالؒ (۵) شاہ عبدالکریم بلھڑیؒ (آپکے پردادا) (۶) سلطان ابراہیم بہاریؒ (۷) شیخ احمدؒ (۸) شاہ علی احمدؒ (۹) شاہ شرف الدینؒ (۱۰) شاہ شہاب الدین قاسمؒ (۱۱) شاہ بدرالدینؒ (۱۲) شاہ نورالدینؒ (۱۳) شاہ شمس الدینؒ (۱۴) سیف الدین بن یحییٰؒ (۱۵) شاہ ظہیرالدین احمدؒ (۱۶) ابو صالحؒ (۱۷) سید عبدالرزاقؒ (فرزند شیخ عبدالقادر جیلانیؒ) (۱۸) حضرت شیخ عبدالقادر جیلانیؒ (بانیءِ سلسلہ قادریہ) (۱۹) ابوسعیدؒ (۲۰) شاہ ابوالحسن ابن علیؒ (۲۱) محمد یوسف قرشیؒ (۲۲) شیخ ابو الفرح طرطوسیؒ (۲۳) ابو الفضل یمینیؒ (۲۴) حضرت ابو بکر شبلیؒ (۲۵) حضرت جنید بغدادیؒ (۲۶) حضرت ابوالحسن سری سقطیؒ (۲۷) حضرت خواجہ معروف کرخیؒ (۲۸) حضرت امام علی رضاؒ (۲۹) حضرت امام موسیٰ کاظمؒ (۳۰) حضرت امام جعفر صادقؒ (۳۱) حضرت امام باقرؒ (۳۲) حضرت امام زین العابدینؒ (۳۳) حضرت امام حسین علیہ السلام (۳۴) حضرت علی کرم اللہ وجہہ (۳۵) حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم۔

---

[1] امام موسیٰ کاظمؒ کی اولاد "سید" ہونے کی وجہ سے ہر زمانہ میں زیادہ تر شیعہ لوگ آپ سے زیادہ عقیدت رکھتے رہے۔ رفتار زمانہ کے ساتھ ساتھ جب عقائد اصلی۔ رسومات میں تبدیل ہوجاتے ہیں۔ تو عوام میں مزارات پرستی شروع ہوجاتی ہے۔ اور جس فرقہ کے لوگوں کا غلبہ پایا جائے وہی عقیدہ مستقل صورت اختیار کر جاتا ہے۔ چنانچہ آپکے عقیدت مندوں میں فرقہ شیعہ بھی اپنی نسبت شاہ عبداللطیفؒ سے ظاہر کرتے ہیں۔ اور اکثر مواقع میں اپنے عقائد کے مطابق عرس کرتے ہیں۔ اور اہل السنۃ بھی عرس سالانہ کرتے ہیں۔

سلسلہ اویسیہ کی نسبت مختصر ہے (۱) حضرت شاہ عبداللطیفؒ (۲) حضرت خواجہ اویس قرنی رضی اللہ عنہ (۳) حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم۔ اس سلسلہ میں حضرت خواجہ اویس قرنیؓ کی نسبت حضرت علی کرم اللہ وجہہ سے ظاہر کی جاتی ہے۔ کہ آپ نے آپکے عہد خلافت میں آپ سے بیعت کی ہے۔ لیکن یہ بیعت۔ بیعتِ خلافت ہے۔ بیعتِ طریقت نہیں۔ اس میں شک نہیں کہ حضرت علی کرم اللہ وجہہ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کے قائم مقام ـــــ نائب رسول (خلیفۂ اکبر) ہیں۔ اسلئے اصول طریقت کی رو سے۔ قائم مقام کی بیعتِ طریقت (تجدیدِ بیعت) کرنی ضروری ہوتی ہے۔ تاکہ فیض جاری قائم مقام کے ذریعہ حاصل ہو۔ لیکن یہ بیعت اس شخص کیلئے ضروری ہوتی ہے۔ جو اپنے راہنمائے اکمل کی موجودگی میں اپنے عرفان ومراتب کی تکمیل نہ کر چکا ہو۔ تاکہ قائم مقام اسکی تکمیل کر دے۔ اور جو شخص ایک ولی اکمل کی موجودگی میں اپنے مقصود کی تکمیل کر چکا ہو۔ اسے پھر راہنمائی کی ضرورت نہیں رہتی اور آئندہ بھی اکتسابِ علم وفیض اپنے ہی پیر سے عالم باطن میں کر لیتا ہے۔

یہ امر مسلمہ ہے۔ کہ قائم مقام خلیفہ اپنے پیر (قطب الاقطاب یا رسول) کی جگہ علم و ارادت جاری کرتا ہے۔ اور وہ اپنے پیر کی جگہ پر ہی قائم ہوتا ہے۔ مگر یہاں حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام خود مرتبۂ نبوت پر قائم ہیں۔ حضرت علیؓ مرتبہ ولایت میں مرتبۂ صدیقی (اجلاسِ محمدیؐ میں دائیں طرف نائب رسول کی حیثیت سے) پر قائم تھے۔ جیسے حضرت علیؓ۔ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام سے بعد انتقال بھی اکتساب نور کرتے اسی طرح حضرت خواجہ اویس قرنیؓ بھی حضورؐ سے ہی اکتساب کرتے اور حضرت خواجہ اویسؓ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کی حیات میں ہی اپنے مراتب کی تکمیل کر چکے تھے۔ چنانچہ یہ امر اسکا ثبوت ہے کہ حضرت علی اور حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہما حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کے بعد یمن میں حضرت خواجہ اویسؓ سے ملے تھے۔ اسوقت بھی طریقت میں حضرت علیؓ نائب رسول ہو چکے تھے اگر بیعت کی ضرورت ہوتی تو اسوقت خواجہ اویس قرنی رضی اللہ عنہ حضرت علیؓ سے بیعت کر لیتے۔ اسکے بعد جہاں ایک ولی اور اسکے خلیفہ قائم مقام کا تعلق ہے۔ وہاں خلیفہ کے قائم مقام ہونے کے بعد جب ولی کا انتقال ہو۔ تو اجلاسِ محمدیؐ میں۔ وہی مقام خلیفہ کو حاصل ہوتا ہے۔ جو اسکے پیر اکمل

کا ہوتا ہے۔اور وہ خود ہر امر میں با اختیار ہوتا ہے۔لیکن ایسی حالت میں اگر ولی اکمل (قائم مقام خلیفہ) کو کسی امر میں علم واجتہاد کی ضرورت ہو۔تو وہ یا تو براہ راست حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام سے علم حاصل کرتا ہے۔یا اپنے پیر اکمل سے کرلیتا ہے۔اسوقت پیر اکمل اپنے مقامِ برزخ سے اجلاسِ محمدیؐ میں حاضر ہو جاتا ہے۔اور باقی طالب بھی۔عالم باطن میں اپنے پیر سے (خواہ وہ عالم برزخ میں ہی ہو) علم حاصل کر سکتے ہیں۔البتہ مراتب پیر سے حاصل نہیں ہوتے۔ بلکہ قائم مقام خلیفہ (جو بحثیت ولی اکمل مرتبۂ صدیقی پر فائز ہوتا ہے) سے ہی حاصل ہوتے ہیں۔لیکن جنکے مراتب کی تکمیل ہو چکی ہو انکی نسبت اپنے ہی پیر سے ہوتی ہے اور قائم مقام سے بھی ہوتی ہے۔لیکن انہیں تجدید بیعت کی ضرورت نہیں ہوتی۔ یہی کیفیت حضرت خواجہ اویس قرنی رضی اللہ عنہ کی تھی۔ کہ آپکے مراتب کی تکمیل حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کے عہد میں ہی آپکی باطنی توجہ سے ہو چکی تھی۔ جہاں بیعت کی ضرورت نہیں ہوتی۔اور اسکے بعد آپکی نسبت حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام سے ہی براہِ راست رہی۔

یہی نوعیت حضرت شاہ عبداللطیف صاحب رحمتہ اللہ علیہ کی تھی۔ کہ آپکی نسبت براہ راست حضرت خواجہ اویس قرنی رضی اللہ عنہ سے تھی۔ جہاں بیعت ظاہری کی ضرورت نہ تھی۔اور ظاہری طور شریعت کی پابندی امر بالمعروف ونہی عن المنکر کیلئے طریق قادری میں اپنے والد سے بیعت حاصل تھی اور اس سلسلہ کی نسبت سے تو بیعت کی رو سے صرف اصلاح نفس کی ضرورت تھی۔ ورنہ آپکو وہبی طور مراتب حضرت اویس قرنیؓ سے ہی حاصل تھے۔

حضرت شاہ عبدالطیف بھٹائیؒ کے بھی بظاہر کوئی خلیفہ (قائم مقام) نہیں پایا گیا۔ چنانچہ آپکے اسم گرامی میں بھٹائی لفظ سے یہ امر ظاہر ہوتا ہے۔ کہ ''امانت دار'' سندھی میں بھٹائی امانت والے کو کہتے ہیں۔ بھٹائی اونچے مقام والے کو بھی کہتے ہیں سو باطنی طور آپ کا مقام اونچا تھا۔اور ظاہر طور اس کیفیت کو آپکے مقام سکونت سے نسبت دی گئی کہ آپ ایک ایسے مقام پر سکونت پذیر تھے جہاں اونچے اونچے ٹیلے تھے۔اور ایک اونچے ٹیلے پر آپ کا مزار۱ بھی واقع ہے۔مگر حضرت شاہ عبداللطیف

---

۱ سندھی زبان میں بھٹ۔ ریت کے اونچے ٹیلے والے مقام کو کہتے ہیں۔ بھٹ شاہ لطیف (باقی حاشیہ اگلے صفحہ پر)

بھٹائیؒ کے ایک شعر میں اسکی تصریح موجود ہے۔ترجمہ۔میرے پاس ایک امانت ہے جو میرے بعد ایک شخص ''لونگ'' کو ملے گی۔ یہ امانت آپکا فیض نبوت تھا۔جسکے لیے آپکو اپنے وقت میں کوئی اہل ہستی میسر نہ ہوسکی۔اور یہ فیض امانت آپکے پاس رہی۔آخر کافی عرصہ بعد ایک ہستی ''لونگ'' نام سے پیدا ہوئی۔جن کے لیے یہ امانت مختص تھی۔

حضرت شاہ لونگ سندھیؒ: حضرت شاہ لونگ سندھیؒ شاہ لونگ فقیر کے نام سے بھی مشہور ہیں۔آپ

(بقیہ حاشیہ گزشتہ صفحہ) مقام کی وجہ سے مشہور ہے اور لال لطیف (ایک تزکیہ مجاہدہ کرنے والے صوفی) کے نام سے بھی پکارے جاتے ہیں۔آپکا مزار علاقہ سندھ بھٹ شاہ میں واقع ہے۔۱۷۵۲ء میں آپ نے انتقال فرمایا اور کلہوڑا خاندان کے حکمران غلام شاہ والئی سندھ نے ۱۷۵۴ء میں آپکا مزار پختہ تعمیر کرایا۔ جہاں آپکے مزار پر تمام سندھ کے علاقہ کے لوگ زیارت کو آیا کرتے اور یہ طریق ہمیشہ جاری رہا اور ہر جمعہ کو آپکے عقیدت مند مزار پر جمع ہو کر فاتحہ خوانی کرتے۔ رفتہ رفتہ مختلف عقائد کے لوگوں نے رسمی انداز میں آپکا عرس سالانہ منانا شروع کیا۔جو اب تک جاری ہے۔آپکے جانشینوں میں اگر چہ آپکی روحانی وراثت منتقل نہ ہوسکی پھر بھی آپکے بعد آپکے تعلقدار سید خاندان کے لوگ سجادہ نشین ہوتے رہے۔جنہوں نے مزار سے متعلق۔عرس اور زائرین کیلئے ضروری انتظامات اور تعمیر سے متعلق امور کو جاری رکھا انہیں لوگوں میں پشت در پشت سجادہ نشین اب تک چلے آتے ہیں۔اگر چہ ان سے حضرت شاہ عبداللطیفؒ کی روحانی اثاث کا اجرا نہیں ہوتا ہے تاہم سجادہ نشین سلسلہ طریقت سے مس رکھتے ہیں۔اور عوام ان سے بھی عام سجادہ نشینوں کی طرح پوری عقیدت رکھتے ہیں۔آپکے سالانہ عرس پر۔دور دور کے علاقوں سے لوگ زیارت کیلئے آتے ہیں۔اور مختلف جماعتیں اپنے عقیدوں کے مطابق عرس مناتے ہیں۔عرس میں زیادہ تر ایک خصوصی جماعت آپکے شعر گاتے ہیں۔اور مختلف جماعتیں بھی ٹولیوں کی شکل میں آپ کے کہے ہوئے گیت گاتے ہیں۔آپ نے اپنے زمانہ میں انسانی زندگی کے ہر شعبہ میں عوام کے حالات کو شاعرانہ انداز میں پیش کیا۔مجازی عشقیہ داستانیں جن میں سسی پنوں۔عمر اور ماروی۔لیلاں اور چنیر۔مومل اور رانو۔سورتھ اور رائے ڈیاچ مشہور داستانیں ہیں۔اسکے علاوہ تصوف سے متعلق محبت اور جذب کی کیفیات بھی پائی جاتی ہیں۔چونکہ آپکے اشعار میں ہر عقیدہ کے لوگوں کے نظریات ملتے ہیں۔اسلئے عوام ان گیتوں کو بہت پسند کرتے ہیں۔آپکی نظمیں اور لوک گیت اکثر راگ کی سروں کے ہموزن ہیں۔اسلئے آپکے اشعار زیادہ دلچسپی پیدا کرتے ہیں۔اس سے ماسوئی۔اب طریق طریقت کا کوئی پرچار نہیں پایا جاتا ہے۔

موضع خیر پور میرس میں ایک عام خاندان کے فرد تھے۔ آپ کی طبیعت بھی ابتداء سے مائل بہ فطرة تھی۔ آپکے متعلق قبل از وقت شاہ عبداللطیفؒ کی پیشگوئی کے مطابق آپکو بھی ایک فطری وجدان حاصل تھا۔ اور اکثر یاد حق میں جہد و فکر میں مستغرق رہتے۔ گو زمانہ کی عدم توجہی۔ اور عوام میں فطری لگاؤ نہ ہونے کے باعث ان حضرات کے صحیح حالاتِ زندگی کا پتہ نہیں چل سکتا۔ تاہم ان سے قریبی تعلق رکھنے والوں میں سینہ بسینہ جو روایات چلی آئی ہیں۔ ان سے قدرے مٹے ہوئے نقوش کا نشان ملتا ہے۔ ان میں بھی مختلف عقائد۔ اور صحیح عمل نہ ہونے کی وجہ سے اصل حالات کی شکل تبدیل ہوگئی ہے۔ لیکن ان متبدل نقوش سے بھی آپکے حقیقی رجحانات کا قدرے اندازہ لگ جاتا ہے۔ حضرت شاہ لونگ فقیرؒ کے بہت کم حالات کا پتہ چلتا ہے۔ کیونکہ آپکی زندگی گمنام حالت میں گذری۔ جو کچھ ملتا ہے۔ وہ صرف شاہ عبداللطیف بھٹائیؒ کی پیشگوئی سے اور کچھ آپ کے سجادہ نشینوں کی روایات سے۔ آپ اپنے علاقہ میں گمنام زندگی بسر کرتے رہے۔ آپ اتنے عالم بھی نہ تھے کہ تبلیغی سلسلہ میں آپ کی شہرت ہوتی۔ نہ ہی ظاہری طور آپ میں فقیرانہ نشان پائے جاتے تھے۔ جس سے عقیدت مندوں کا ہجوم ہوتا۔ ویسے آپ کے والد نے ان کی اندرونی کیفیت کا اندازہ کرلیا کہ آپکے قلب میں ایک حقیقی جذب کے آثار پائے جاتے ہیں۔ آپ لونگ صاحب کو لے کر پیر پگاڑا[1] کے پاس بیعت کرنے کیلئے لے گئے۔ لیکن انہوں نے بیعت کرنے سے انکار کردیا کہ اس لڑکے کیلئے میرے پاس فیض نہیں۔ بلکہ انہیں باطنی طور شاہ عبداللطیفؒ سے فیض حاصل ہوگا۔ آخر آپکے والد آپ کو واپس گھر لے آئے۔ آپکے والد بھی عام طبقہ کے لوگوں میں سے تھے۔ اسلئے شاہ لونگ صاحب کی تعلیم کا کوئی سلسلہ نہ چل سکا۔ اور آپ اپنے گھر کے کام کاج میں ہی مصروف رہے۔ کچھ عرصہ بعد آپکے والد کا انتقال ہوگیا۔ آپکے بھائی بھی تھے۔ والد کی وفات کے بعد آپ سے بھائیوں کا سلوک اچھا نہ رہا۔ آخر گھر چھوڑ کر بھٹ شاہ کے علاقہ میں آئے۔ یہاں محنت مزدوری کرنے لگے۔ آپ اکثر شاہ عبداللطیف صاحبؒ کی زیارت پر ہی رہتے۔ اور یہیں پر آستانہ کی جاروب کشی

---

[1] پیر پگاڑا کے اجداد میں سے جو اس وقت موجود تھے۔

کرتے اور پانی بھرتے رہتے۔ آخر یہی معمول آپکا مدتوں رہا۔ کہ زیارت پر مستقل قیام رکھا۔ صبح وشام پانی بھرنا اور جھاڑو دینا آپکا کام تھا ـــــ روٹی ملی کھالی ورنہ فاقہ کشی میں ہی گذر جاتا۔ یہاں تک کہ چھ سال کا عرصہ گزرا۔ اس زمانہ میں آپ پورے تزکیہ مجاہدہ میں رہے۔ آخر جب آپکا مجاہدہ اور جذب انتہا کو پہنچا۔ تو شاہ عبداللطیفؒ کی روحانی توجہ سے آپ پر روحانی انکشافات کا باب کھلا۔ یہاں تک کہ براہ راست شاہ عبداللطیفؒ نے باطنی طور آپکو بیعت کرلیا اور اپنی امانت آپکے سپرد کردی۔ روایت ہے ۔ کہ شاہ صاحبؒ کے مزار پر اسوقت ایک صاحب حال ولی موجود تھا۔ شاہ لونگ صاحبؒ کے آنے کے بعد جبکہ آپ نے اپنا رجوع شاہ صاحب کی طرف کیا اور کافی مدت تزکیہ ومجاہدہ میں مصروف رہے تو شاہ صاحب نے اسی صاحب حال فقیر کے ذریعہ۔ آپکی آزمائش کی اور ان سے کہا کہ اسے مسجد کے قریب لے جا کر کہدو یہاں تمہارا مقصد حل ہوگا۔ چنانچہ جب زمین کھودی تو ایک خزانہ برآمد ہوا۔ لیکن لونگ صاحب نے خزانہ حاصل کرنے کی خواہش نہ کی۔ دوسری بار اسی طرح شاہ صاحب نے اپنے سجادہ نشین سے باطنی طور کہا۔ کہ اسے لے جاؤ اور اپنی تمام مرید مستورات دکھا کر کہو۔ کہ ان میں سے جسے تم نکاح میں لانا چاہتے ہو۔ لو اور خزانہ بھی لے کر یہاں سے چلے جاؤ۔ لیکن لونگ صاحب نے ان سے بھی لاتعلقی ظاہر کی۔ کہتے ہیں کہ بار بار سوال وجواب سے سجادہ نشین صاحب تنگ آگئے اور لونگ صاحب کو لے کر شاہ صاحب کے مزار کے اندر دھکیل کر کہہ دیا کہ ''لو اب خود اسے پوچھو کہ کیا

۱یہ روایت سجادہ نشین شاہ لونگ سندھی صاحب کی ہے۔ لیکن شاہ عبداللطیف صاحبؒ کے سجادہ نشین کی روایت میں صرف اتنا اختلاف ہے کہ آپ (لونگ) ہمیشہ آستانہ پر جھاڑو دیا کرتے ایک دن سجادہ نشین صاحب نے کہا۔ کہ جاؤ ہمارے اصطبل میں گھوڑوں کی لید صاف کرو۔ تو لونگ صاحب نے انکار کیا۔ اور کہا۔ کہ میں نے صرف ایک ہی آستانہ کی خدمت لی ہے۔ یہاں سے فرصت نہیں کہ دوسری طرف رُخ کروں۔ تو سجادہ نشین صاحب نے تھپڑ مارا۔ لونگ صاحب نے تھپڑ کھا کر سیدھے مزار کے اندر نہایت کرب واضطراب سے فریاد کی۔ آپکی فریاد میں شدت کا درد تھا۔ اس فریاد کا اثر یہ ہوا۔ کہ شاہ صاحب تمثیلی جسم کے ساتھ لونگ صاحبؒ کے سامنے ظاہر ہوگئے اور اسی وقت توجہ دے کر تمام مراتب عبور کر کے صاحب مشاہدہ کردیا۔ بیعت کی اور ظاہری طور سند لکھ کردے دی اور حکم دیا اپنے مقام خیرپور جا کر خلافت چلاؤ۔

چاہتا ہے۔ میں اس پیغام بری سے باز آیا''۔۔۔۔ شاہ لونگ صاحبؒ کا جذب بھی اب حد کو پہنچ چکا تھا۔ تو آپ وجود تمثیلی (روح حیوانی) کے ساتھ ظاہر ہوئے۔ اور آپ پر توجہ ڈالی۔ جس سے شاہ لونگ صاحب کا قلب کھل گیا اور مکاشفہ شروع ہوا۔ شاہ عبداللطیف صاحبؒ نے اسی وقت تمام مراتب عبور کرا کے۔ خلافت کی سند لکھدی بیعت کی اور واپس خیر پور میرس جانے کا حکم دیا۔ کہ وہاں جا کر منصب خلافت پر بیٹھ جاؤ۔ آخر اسی عالم میں آپ خیر پور واپس تشریف لائے۔ یہاں آپ نے سلسلہ طریقت کا اجرا کیا ۔اور آپ اردگرد کے ماحول میں لوگوں میں مقبول ہو گئے۔ اور سلسلہ اویسیہ کا ظاہری طور اجرا اسطرح آپ سے شروع ہوا۔۔۔۔ اور سلسلہ اویسیہ خالص کا فیض عام لوگوں کو حاصل ہونے لگا۔ آپکے خلفا کی تعداد کا علم نہیں ہو سکا۔ معلوم ہوا۔ کہ اوچ بلوچ کے مقام میں آپکا ایک خلیفہ ہوا ہے۔ اور ایک خلیفہ اکبر آپکے قائم مقام روڑی (سندھ) سے جنوب مشرق کی طرف آٹھ میل دور شاہ شکر گنج سے دو میل کے فاصلہ پر ایک پہاڑی علاقہ اروڑ میں۔ کالکا مندر کے عین مقابل۔ حافظ قاری شاہ محمد عارفؒ ہوئے ہیں۔

حضرت شاہ محمد عارف اروڑویؒ: حضرت شاہ محمد عارف قاریؒ شاہ لونگ رحمتہ اللہ علیہ کی زندگی میں آپ کی شہرت سُن کر خدمت میں حاضر ہوئے۔ خود حافظ صاحب ایک برگزیدہ عالم خاندان سے تعلق رکھتے تھے۔ آپ کے خاندان کے اکثر بزرگ عالم تھے۔ چنانچہ آپ نے بھی اپنے خاندانی ورثہ سے کلی علم حاصل کیا۔ آپ بھی ایک بلند پایہ عالم۔ حافظ اور بہترین قاری تھے۔ حقیقی علم حاصل ہونے کے ساتھ آپکو حقیقت سے بھی انتہائی لگاؤ رہا۔ اور اکثر وقت آپکا تبلیغ سے ماسوے عبادت۔ ذکر و شغل میں بھی گذرتا۔ شاہ لونگ صاحبؒ کی شہرت سن کر آپ انکی خدمت میں حاضر ہوئے۔ اور تلاشِ حق میں راہنمائی کیلیئے۔ شاہ لونگ صاحب کے حلقۂ ارادت میں پیش ہو گئے۔ شاہ لونگ صاحب نے آپکی قلبی نورانیت کا معائنہ کیا۔ تو آپ کے قلب کو جذبہ محبت میں ذات حق کی یاد کیلیئے وقف پایا۔ چنانچہ آپ نے بیعت کی اور توجہ فرمائی اور قلیل عرصہ میں عرفان کی انتہائی منازل عبور کرا کر خلافت عطا کی۔ حافظ قاری صاحبؒ کافی عرصہ شاہ لونگ صاحبؒ کی خدمت میں رہے۔ اس عرصہ میں شاہ لونگ

صاحب نے اپنے دور حیات میں جگہ جگہ مسجدیں بنوائیں اور راہِ ہدایت کی تبلیغ کے سامان لوگوں کے لیے عام کردیئے۔ اسی دوران آپ بیت اللہ حج کیلئے بھی تشریف لے گئے۔ بعد میں حافظ قاری شاہ محمد عارف صاحبؒ کو حج بیت اللہ کے لئے جانے کا حکم دیا۔ اسوقت شاہ صاحبؒ (لونگ) کو قدرت نے دنیوی جاہ بھی عطا کیا تھا۔ آپ کے پاس بے شمار دولت تھی۔ چنانچہ حافظ صاحب کے ہمراہ تقریباً دس افراد کی ایک جماعت دے کر تقریباً ایک لاکھ روپیہ نقد دیا۔ کہ مدینہ منورہ میں زائرین کیلئے مکان تعمیر کریں ـــــ چنانچہ حافظ صاحب نے حج سے فراغت کے بعد مدینہ منورہ میں مکان تعمیر کرایا۔ اس انتظام میں آپکو چھ سات سال کا عرصہ لگا۔ قضائے الٰہی سے آپکی جماعت میں سے ایک آدمی مدینہ منورہ میں وفات پا گیا ـــــ بالآخر تعمیری کام مکمل کر کے حافظ صاحبؒ واپس خیر پور میرس شاہ لونگ صاحبؒ کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ شاہ صاحب کو معلوم ہوا۔ کہ مدینہ منورہ میں حافظ صاحب کی جماعت کے ساتھ رہنے والوں میں سے ایک آدمی فوت ہوا۔ تو شاہ صاحب نے فرمایا۔ حافظ صاحب کیا لوگوں کو روٹی نہیں ملتی تھی جو فاقہ سے ہمارا آدمی مرگیا ـــــ حافظ صاحب اس بات کا کچھ جواب نہ دے سکے۔ شاہ صاحب نے جلالی حالت میں آپ سے فرمایا۔ ''دور ہو یہاں سے'' اس جلالی حکم کو سُن کر حافظ صاحب آپکے آستانہ سے کچھ دور جا کر بیٹھ گئے۔ اسکے بعد نہ شاہ لونگ صاحب نے آپ سے التفات کیا۔ نہ حافظ صاحب اپنے مقام سے اٹھے۔ تین سال لگاتار آپ اسی مقام پر بیٹھے رہے۔ آخر ایک دن خود شاہ لونگ صاحبؒ نے اٹھا کر سینہ سے لگالیا۔ سینہ سے لگنا ہی تھا۔ کہ آپ پر عرفان الٰہی کے تمام دروازے کھُل گئے۔ اور آپکے مقصود کی تکمیل ہوگئی۔ اسکے بعد شاہ لونگ صاحبؒ نے آپکو حکم دیا۔ کہ اروڑ کے مقام میں کالکا مندر کے پجاریوں کا تسلط ہے۔ اسکے مقابلہ میں آپ اپنا مسکن بنائیں۔ اور یہاں سے ہی حقیقی دین کا اجرا کریں۔ چنانچہ حافظ صاحب حکم پاتے ہی اروڑ پہنچے اور کالکا مندر کے سامنے ڈیرہ جمایا۔

سندھ میں باوجود انتہائی گرم علاقہ ہونے کے۔ جب قصبہ اروڑ میں داخل ہوتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے۔ کہ یہ علاقہ فطری طور ایک نئی اور نرالی فضا حاصل کئے ہوئے ہے ـــــ چاروں طرف

پہاڑوں کی دیوار اور درمیان میں ایک مختصر پر رونق وادی ہے۔ یہاں سرسبز شاداب درخت اور نہروں کی روانی میں یہ جگہ مثل جنت محسوس ہوتی ہے ـــ اسکے باوجود یہ علاقہ آبادی سے خالی ایک خاموش اور پُرسکون مقام ہے۔ اسی مقام پر حافظ قاری شاہ محمد عارف صاحبؒ کا مزار ہے ـــ شاہ محمد عارف صاحبؒ اپنی عمر میں اسی مقام پر سکونت پذیر رہے۔ کچھ عرصہ بعد حضرت شاہ لونگ سندھیؒ (لونگ فقیر) کا انتقال ہوا۔ اور آپکا مزار خیر پور میرس میں ایک دیہات میں بنا ـــ یہ علاقہ بھی غیر آباد ہے۔ یہاں پر صرف آپکا مزار اور مزار سے ملحقہ چند مکان سجادہ نشینوں کے ہیں۔

شاہ لونگ سندھیؒ کے بعد آپکے خلیفہ اکبر قائم مقام مشہور زمانہ شاہ محمد عارف صاحب قاری اروڑ ویؒ ہوئے اور سلسلہ اویسیہ کی خلافت آپکو حاصل ہوئی۔ یہاں سے کلی طور سلسلہ اویسیہ اخفا سے ظاہر میں آیا۔ اور ظاہراً ایک خلیفہ کا ظہور ہونے لگا ـــ آپکے خلفا کی بھی کوئی تفصیل معلوم نہیں۔ آپکے مزار پر بھی پشت در پشت سجادہ نشین ہوتے رہے۔ آپکے مزار کے ساتھ ایک مسجد بھی ہے۔ جہاں قرآن وحدیث کا درس آپکے سجادہ نشین دیتے ہیں۔ علمی لحاظ سے دین کا اجرا اچھے انداز سے ہوتا ہے۔ شاہ محمد عارف صاحب قاریؒ کے خلفا میں حضرت سید نور الزمان شاہ صاحبؒ آپ کے خلیفہ اکبر ہوئے ہیں۔

اگرچہ اس سلسلہ اویسیہ کے ان اولیا میں بظاہر کوئی وہبی آثار نہیں محسوس کئے جاتے ہیں لیکن ان حضرات کا قدرتی طور ایک حقیقت کے مرکز پر پہنچ جانا بھی ایک وہبی کیفیت کے زیر اثر ہوا ہے۔ شاہ لونگؒ اور شاہ محمد عارف صاحبؒ ایک فطری تحریک کے اثر سے ہی اپنے مقصود و مرکز کی طرف پہنچے۔ اسی طرح حضرت سید نور الزمان شاہ صاحبؒ کو بھی ایک فطری راہنمائی کے ذریعہ شاہ محمد عارفؒ تک رسائی ہوئی۔

حضرت مولانا سیّد نور الزمان شاہؒ: آپ کی ولادت بروز جمعہ ۱۲۷۸ھ بمقام کوٹ چاندنہ متصل کالا باغ ضلع میانوالی ہوئی۔ آپکے والد صاحب (حضرت سید نظام الدینؒ) نے آپکو ابتدائی تعلیم دینی حاصل کرنے کیلئے حافظ عالم شیر کی درس گاہ میں داخل کرایا۔ ابھی قرآن کریم ختم بھی نہ کر پائے تھے۔

کہ آپکے والد ماجد کا انتقال ہوگیا۔ آپکی والدہ ماجدہ بقیدِ حیات تھیں۔ان کے علاوہ ایک بھائی اور ہمشیرہ تھیں۔ آپکوفطری طور علم حاصل کرنے کا بے حد شوق تھا۔ چنانچہ اسی بے بسی کے عالم میں آپ اپنے بھائی اور ہمشیرہ کووالدہ کی خدمت میں چھوڑ کر۔ تعلیم حاصل کرنے کے لیے بمقام کلور تحصیل عیسیٰ خیل تشریف لے گئے۔ یہاں آپ نے قرآن کریم ختم کرنے کے ساتھ چند فارسی کتابیں پڑھیں۔ وہاں سے قصبہ چودھواں ڈیرہ غازی خاں تحصیل شاہ جمال میں ایک مجذوب عالم مولانا نصیر بخش سے تمام نحو کی کتابیں پڑھیں۔نحو سے فراغت کے بعد دیو بند تشریف لے گئے۔ وہاں کچھ عرصہ قیام کے بعد کانپور میں مولانا احمد حسن کی خدمت میں۔ مدرسہ فیض عام میں رسائل۔ منطق۔ معقول۔ فلسفہ کی تکمیل کی۔ مولانا احمد حسن صاحب حج کو تشریف لے گئے۔ایک سال بیت اللہ میں رہے۔اس عرصہ میں شاہ صاحب نے علی گڑھ میں مولانا لطف اللہ صاحب سے علم ریاضی پڑھا۔ پھر دوسرے سال دورہ حدیث ختم کر کے ۱۳۱۰ھ میں فارغ التحصیل ہوئے۔ تحصیل علم کے بعد آپ نے کچھ دن کانپور میں قیام کیا۔ کانپور میں ایک صائم الدہر۔ صاحب کمال درویش ایک جنگل میں رہتے تھے۔شاہ صاحب ایک دن انکی خدمت میں چلے گئے۔اسوقت تحصیل علم کے بعد آپکو اپنی اور گھریلو ضروریات زندگی کا فکر ہو رہا تھا۔ کہ کوئی ذریعہ معاش حاصل ہو۔ چنانچہ درویش صاحب کی خدمت میں تین دن ٹھہرے رہے۔ تیسرے دن درویش صاحب نے آنے کا سبب پوچھا تو آپ نے اپنی کسمپرسی اور تفکرات کے اسباب بیان کیے۔ فقیر صاحب نے کھانا کھلایا۔ اور کچھ کپڑے سی کر دیئے۔اور فرمایا ”جاؤ آج سے آپکے تمام مصائب کا خاتمہ ہوگیا“ ــــ چنانچہ اس بشارت کو لے کر مولانا احمد حسن کانپوری کی خدمت میں آئے۔ یہاں مولانا احمد حسن امروہی نے دیکھتے ہی فرمایا کہ آپ ہی کا انتظار تھا۔ہم آپ ہی کی غرض سے یہاں آئے ہیں۔ کہ آپکو مدرس بنا کر امروہہ لے جائیں۔ چنانچہ استاد کے تعمیل ارشاد میں آپ مدرسہ امروہہ میں مدرس کی حیثیت سے مقرر ہوگئے۔اور آپکی ذات سے درس و تدریس کا سلسلہ جاری ہوا۔ مولانا احمد حسن امروہی کا انتقال ہوگیا۔تو آپکو مدرسہ اسلامیہ کی صدارت پر مامور کیا گیا۔ کچھ عرصہ بعد اراکین مدرسہ نے آپکے ذمہ مزید خدمات مدرسہ پیش کیں۔ لیکن آپ نے ایک طویل

ذمہ داری کی انجام دہی پر معذرت چاہی۔ جس کیلئے انہوں نے شیخ الہند مولانا محمود الحسن دیوبندی کو صدارت کے لیے بلایا۔ لیکن جب آپکو علم ہوا کہ یہاں صدارت پر مولانا سید نورالزمان شاہ صاحبؒ ہیں۔ تو آپ نے صدارت لینے سے انکار کیا۔ اور واپس تشریف لے گئے ـــــ اسکے بعد مولانا سید نورالزمان شاہ صاحبؒ بھی صدارت سے استعفٰی دیکر اپنے وطن مالوف واپس تشریف لائے۔ اور کوٹ چاندنہ میں ہی درس وتدریس کا سلسلہ جاری کیا۔ اسکے بعد ضلع مظفرگڑھ قریہ قضات کے لوگ آپکا شہرہ سُن کر آپکو لے گئے۔ اور ایک نیا مدرسہ اسلامیہ کھول کر اس کی صدارت آپکے سپرد کردی مولانا محمود گنجوی نے آپ کو صدارت کے لیے مجبور کیا۔ آپ نے صدارت قبول کی کچھ عرصہ وہاں درس وتدریس کا سلسلہ جاری رکھا۔ اسکے بعد چکی شیخ صاحب میں ایک بزرگ نے مجبور کیا۔ کہ انکی قیام گاہ پر بھی درس وتدریس کا سلسلہ جاری کریں۔ چنانچہ یہاں بھی کافی عرصہ دین حق کی تعلیم سے لوگوں کو سرفراز کرتے رہے۔ آخر غائبانہ فطری تحریک نے پھر انہیں اپنے وطن کی طرف لوٹا دیا۔ مقولہ ہے۔ کہ اَلْعِلْمُ حِجَابُ الْاَکْبَرِ۔ لیکن یہ مقولہ ان لوگوں پر صادق آتا ہے۔ جو لوگ ایک حقیقی علم کو جس میں ماوراء ادراک آثار پائے جاتے ہوں۔ اسے صرف عقل کی راہنمائی میں تحقیق کرنے کے عادی ہوں۔ مگر علم۔ صرف علم نہیں بلکہ یہ علم ایک مکمل قرآنی کیفیت کا مجموعہ ہے۔ کہ عالم کیلئے ضروری ہے۔ کہ وہ علم کے ساتھ۔ اس آیت کی روشنی میں۔ یَتْلُوا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِهٖ۔ وَيُزَكِّيْهِمْ۔ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ۔ تلاوت کے ساتھ تزکیہ کا عامل ہو۔ اسکے قلب میں القائی قوت کے ساتھ حقیقت کے اسرار ومعانی اخذ کرنے کی صلاحیت ہو۔ اور ظاہری نشانات میں قلبی فقہ والقا سے باطنی معانی اخذ کرسکتا ہو۔ ایسی ہستی کیلئے علم حجاب نہیں بلکہ ایک مشعل ہے۔ جو حقیقی راہ کے نشانات نمایاں کردیتی ہے۔

حضرت مولانا سید نورالزمان شاہ صاحبؒ اگرچہ بظاہر ایک ظاہری عالم تھے۔ لیکن قدرت نے انکے قلب میں رجوع الی اللہ کا نور بھی مخفی رکھا تھا۔ آپ اکثر اپنے علم کے آخری نتیجہ کے خواہاں رہتے کہ علم سے صرف درس وتدریس ہی نہیں بلکہ عرفان الٰہی مقصود ہے۔ سو آپ اس جستجو اور فکر میں رہتے کہ آپ کو اس راہ کے نشانات کیسے ملیں۔ آپ نے قدیم اولیا کے مکتوبات اور طریقت سے متعلق

علم کا مطالعہ بھی کیا۔ بالآخر آپ نے اس راہ پر پہنچنے کے لیے وہی طریق نبویؐ اختیار کیا۔ کہ آپ اکثر خاموش اور استغراق کی حالت میں یکسو ہو جاتے اس طرح ایک طرف آپ میں استغراقی قوت تیز ہونے لگی دوسری طرف قلبی قوتِ جذب و محبت میں بھی برانگیختگی پیدا ہونے لگی۔ نتیجہ یہ ہوا۔ کہ آپکی طبیعت (روح حیوانی) میں لطافت پیدا ہوگئی اور رفتہ رفتہ آپ پر ابتدائی مقامات ناسوتی کے انکشافات ظاہر ہونے لگے۔ چونکہ دل میں فطری جذبۂ محبت ازلی ودیعت ہو چکا تھا۔ اسکے ساتھ علمی صلاحیت۔ اور طریق تصور نے مل کر ایک حقیقی نتیجہ پیدا کر دیا۔ کہ آپ عالمِ ناسوت کے مراحل خود بخود طے کرتے گئے۔ اسکا نتیجہ یہ لازمی تھا کہ آپ ایک وقت پر عالم ناسوت سے طے مراحل کرتے ہوئے۔ عالم ملکوت کے ابتدائی باب میں داخل ہو گئے۔ اور اوّل اجلاس محمدیؐ میں حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کے حضور میں پیش ہو گئے۔ چونکہ آپ ازلی انتخاب میں آ ہی چکے تھے۔ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے مرحبا فرمائی اور حکم فرمایا۔ کہ آپ شاہ مظفر صاحبؒ مجذوب ولی کے پاس جائیں۔ شاہ مظفر صاحبؒ مجذوب فقیر تھے۔ آپ کسی سے بات نہیں کرتے تھے ہمیشہ خاموش ایک تنہا مقام پر رہتے۔ خاموشی کی وجہ سے آپ چپ فقیر کے نام سے مشہور تھے۔ کالا باغ میں آپ دریا کے کنارے ایک اونچے ٹیلے پر ایک جھونپڑی میں رہتے تھے۔ چنانچہ بتعمیلِ ارشاد حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام آپ مجذوب شاہ مظفر صاحب دہلویؒ کے پاس پہنچے آپ انکی آمد کے منتظر تھے۔ آتے ہی استقبال کیا اور فرمایا کہ ہمیں حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کی طرف سے آپکے بارے میں حکم ہوا ہے۔ چنانچہ آپ نے توجہ دی اور قلب میں وسعت نورانی پیدا کر دی۔ اسکے ساتھ ہی حکم دیا۔ کہ ہمارا طریق قلندرانہ ہے۔ آپ عالم ہیں اور امت کو آپکی ضرورت ہے۔ اسلئے آپ اروڑ (روڑی) میں شاہ محمد عارف صاحبؒ کے پاس جا کر سلسلہ اویسیہ میں آپ سے بیعت کریں۔ وہ بھی ایک عالم اور صاحب سلوک سالک ولی ہیں۔ جو خلیفۂ عربی حافظ قاری محمد عارفؒ کے نام سے مشہور ہیں۔ چنانچہ آپ بلا تاخیر شاہ محمد عارف صاحب کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ اروڑ پہنچتے ہی شاہ محمد عارف صاحبؒ نے استقبال کیا اور فرمایا۔ کافی مدت سے ہمیں حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے آپکے متعلق اطلاع فرمائی تھی۔ میں آپکے انتظار میں تھا۔ سبحان اللہ انسان کو حق

کی تلاش وجستجو کیلئے پیدا کیا۔ مگر خوش نصیب ہیں وہ مقدس ہستیاں۔ جنہیں حق کی راہنمائی حاصل ہو اور حقیقت خود انکی تلاش میں ہو۔ یہی کیفیت مصطفوی انسان کی عظمت کا نشان ہے۔

شاہ محمد عارف صاحبؒ نے آپکو اپنے حلقہ ارادت میں لے کر بیعت کیا۔ اور تمام اصول طریقت اور تعلیم طریقت سے آگاہ فرمایا ـــــ اور آپ اللہ تعالیٰ اور حضور محمد رسول اللہ ﷺ کی عنایت کردہ عظمتوں کو ساتھ لے کر اپنے گھر تشریف لائے۔ اور امت محمدی کو جوق در جوق صراط مستقیم۔ صراط اللہ پر دھکیلتے ہوئے لے جاتے رہے۔ آپکی حالت استغراق میں اضافہ ہوتا رہا اور آپ اکثر استغراق کی حالت میں رہتے۔ اسکے باوجود طریق سلوک میں کچھ فرق نہ آیا۔ آپ ہمہ وقت درس و تدریس میں ہزاروں طالبانِ علم کو علم سکھاتے اور ساتھ تزکیہ ومجاہدہ کر کے عرفان الٰہی کے مراحل طے کراتے رہے۔ شاہ محمد عارفؒ (المعروف خلیفہ عربی) اروڑی نے انتقال فرمایا۔ تو خلافت کلّی طور حضرت سید مولانا نور الزمان شاہ صاحبؒ کو عطا ہوئی۔ اور آپ قائم مقام کی حیثیت سے سلسلہ اویسیہ کے ولی اکمل ہوئے۔

حضرت سید مولانا نور الزمان شاہ صاحبؒ چونکہ قریبی زمانہ کے ولی تھے۔ آپکے تمام حالاتِ زندگی تفصیلاً جمع کئے گئے ہیں۔ لیکن اس مقام پر آپکی بے شمار خوبیاں بیان کرنا باعث طوالت ہوگا۔ لہٰذا اختصار سے ہی کام لیا جاتا ہے۔ یوں تو آپ نے ہزاروں بندگانِ خدا کو حقیقی راہ سے روشناس کرایا۔ اور ایسے لوگوں کو ولی بنایا۔ جن کیلئے یہ کہنا بھی مبالغہ تھا۔ کہ وہ ظاہری احکام الٰہی کی بھی پابندی کرتے ہوں۔ ایسے لوگ جو بھولے سے بھی نماز نہ پڑھتے تھے۔ آپکی خدمت میں حاضر ہو کر قلیل مدت میں زیارت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے مشرف ہوتے رہے۔ ایک دفعہ کا ذکر ہے۔ کہ علاقہ پھوار میں ایک پیر صاحب ہوتے تھے۔ آپکے کئی مرید تھے۔ انہوں نے سُنا تھا۔ کہ کالا باغ ضلع میانوالی میں ایک شخص چند دنوں میں مریدوں کو حضوری اجلاس محمدی کرتے ہیں۔ ایک مرید نے پیر صاحب سے عرض کی کہ آپ بھی اللہ کے دوست ہیں۔ مجھے بھی آپ اجلاس محمدیؐ کی زیارت کرائیں۔ پیر صاحب نے کہا۔ کوئی بات نہیں ہم بھی حضوری کرا سکتے ہیں۔ مرید کو حکم دیا۔ کہ ایک تنہا جگہ چالیس یوم چلہ کش ہو جاؤ۔ چنانچہ مرید ایک حجرہ میں چالیس یوم تک خلوت میں بیٹھا۔ لیکن

چالیس یوم گزرے اوراس پر کوئی انکشاف نہ ہوا۔پیر صاحب کی خدمت میں حاضر ہو کر عرض کی تو انہوں نے فرمایا۔تم سے کوئی غلطی سرزد ہوئی ہے۔اور خلوت صحیح نہ ہو سکی۔اسلئے مزید چالیس یوم خلوت کرو ـــــ مرید دوبارہ چالیس یوم خلوت نشین ہوا۔لیکن پھر بھی کوئی انکشاف نہ ہوا۔تیسری بار پھر پیر صاحب کے حکم سے خلوت کی لیکن تیسری بار بھی کامیابی نہ ہو سکی۔آخر مرید نے مجبوراً اجازت مانگی کہ حضرت مجھے اجازت دیں۔کہ میں بھی انہیں حضرت کی خدمت میں جاؤں۔جو چند دنوں میں۔حضوریِ اجلاس محمدی کرتے ہیں۔پیر صاحب نے اجازت دیدی اور آپ حضرت سید مولانا نور الزمان شاہ صاحبؒ کی خدمت میں حاضر ہوئے۔یہ صاحب صبح کے وقت آپکے آستانہ پر پہنچے اسوقت آپ محویت میں تھے۔کچھ دیر بعد درس شروع ہوا۔درس سے فارغ ہو کر چاشت (تقریباً دس بجے) کا وقت ہوا۔آپ نے نووارد سے پوچھا آپ کیسے آئے؟ اس نے اپنی تمام کیفیت بیان کی۔آپ نے پوچھا کہ خلوت میں کیا وظیفہ پڑھتے تھے۔اس نے کہا کہ درود شریف جو نماز میں پڑھتے ہیں۔آپ نے فرمایا۔اچھا یہی درود شریف پڑھتے رہو۔اور مسجد میں بیٹھ جاؤ۔مرید صاحب مسجد میں گئے اور مراقبہ شروع کیا۔ابھی عصر نہ ہونے پائی تھی کہ آپ خلوت سے باہر آئے اور عرض کی کہ حضرت مجھے بیعت کیجئے۔میں اتنے ہی عرصہ میں حضوری ہوا۔اور جاگتے ہوئے حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کی زیارت سے مشرف ہوا۔یہ تو ایک ادنیٰ تمثیل تھی آپکے کمالات کی ـــــ آپکے مریدوں میں اکثر لوگ ایسے بھی تھے جو ہمہ وقت دیدارالٰہی میں محو رہتے ـــــ آپکے مریدوں کو آپ سے لاانتہا محبت تھی۔اور آپ بھی ان سے اسقدر شفقت فرماتے کہ ہر شخص یہی گمان کرتا کہ آپ سب سے زیادہ مجھ سے ہی محبت وشفقت رکھتے ہیں۔آپکے کئی خلفاء ہوئے ہیں۔ان میں دو خلیفہ اکبر تھے۔ایک آپکے صاحبزادہ صاحب جناب مولانا سید فخر الزمان شاہ صاحبؒ تھے۔یہ آپکے فرزند تھے اور انہوں نے ہوش سنبھالنے سے آخر عمر تک آپکے ہی نوری سایہ میں پرورش پائی۔تمام علم دینیات۔قرآن۔حدیث۔فقہ۔منقول ومعقول اور دیگر جُملہ علوم کی تکمیل حضرت سید نور الزمان شاہ صاحبؒ سے ہی کی۔ساتھ ساتھ علم طریقت میں تزکیہ ومجاہدہ۔مشاہدہ اور اعلےٰ مراتب آپکو اپنے والد کی توجہ سے حاصل ہوئے ـــــ حضرت سید

مولانا نورالزمان شاہ صاحبؒ نے آپ کو عرفان الٰہی کی اعلیٰ منازل طے کرائیں۔ یہاں تک کہ آپ ولی مکمل ہوئے۔ اور حضرت شاہ نورالزمان صاحبؒ کے بعد آپکے سجادہ نشین آپ ہی مقرر ہوئے۔ آپ نے اپنے وقت میں بے شمار بندگان خدا کو حقیقت کی راہ پر چلایا۔ آپکے مریدوں کا شمار نہیں کیا جا سکتا۔ آپکے مریدوں میں بھی اکثر ایسے لوگ پائے جاتے ہیں جو ذاتِ الٰہی کے عرفان کی تکمیل کر چکے ہیں۔ آپکے مریدوں کی وسعت۔ یو۔ پی (ہندوستان) مراد آباد امروہہ سے لے کر کوئٹہ بلوچستان۔ سندھ کراچی تک ہے۔ ان میں اکثر عالم۔ بلند پایہ شاعر۔ صاحب طریقت اور صاحب حال لوگ ہیں۔ ان میں سے ہر شخص مرتبۂ ولایت پر فائز ہے۔ اکثر جب آپ دورے پر تشریف لے جاتے تو ہزاروں آدمی آپ سے بیعت کرتے اور حضوری ہوتے مگر وائے قسمت! ابھی آپکی عمر اس حد کو نہ پہنچی تھی کہ آپ اپنے جانثاروں سے جدا ہوتے۔ لیکن ہر امر مصلحت ایزدی کے تابع ہے۔ اور یہ امر بھی ایک سنت کے تابع تھا۔ کہ حضرت خواجہ اویس قرنی رضی اللہ عنہ نے حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کے ارشاد کے مطابق تمام امت کے بخشوانے کیلئے سجدہ کیا تھا۔ مگر سنت الٰہی کو ملحوظ رکھتے ہوئے ہی۔ اللہ سے راضی ہوئے۔ سو جن لوگوں کی نجات کی بشارت ملی۔ وہ لوگ آپکے خلفا کے ہاتھ نجات پاتے رہینگے۔ اور بس یہ ایک مقررہ تعداد آپکے ذمہ تھی سو رستگار ہوئی۔ اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّآ اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ ۔ حضرت مولانا سیّد فخر الزمان شاہ صاحبؒ کے مریدوں میں آپکے دو فرزند ارجمند ہیں۔ جو حال میں بقید حیاتِ[1] موضع کوٹ چاندنہ کالا باغ ضلع میانوالی میں اپنے اجداد کے مسکن پر سکونت پذیر ہیں۔ یہ دونوں صاحبزادے آپکے خلیفۂ اکبر و اصغر ہیں۔ بڑے صاحبزادے حضرت مولانا سید شمس الزمان خان صاحب سجادہ نشین خلیفۂ اکبر ہیں۔ آپ نے اپنے والد ماجد سے تمامی علم دینیات کی تکمیل کی اور ساتھ ہی علم طریقت میں عالی مراتب آپکو حاصل ہیں۔ آپ اپنے والد ماجد کے قائم مقام خلیفۂ ہیں۔ اور بیعت کرتے ہیں۔ آپ سے بھی اسی طرح مثل اپنے اجداد کے فیض عام جاری ہے۔ درس و تدریس کا سلسلہ بھی جاری رکھا ہے۔ دوسرے صاحبزادہ

---

[1] متذکرہ ہر دو صاحبزادگان حضرت فخر الزمان شاہؒ وفات پا چکے ہیں۔ اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّآ اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ۔ (ناشر)

حضرت مولانا سید بدر الزمان شاہ صاحب خلیفہ اصغر ہیں۔ آپ بھی اپنے والد کے قائم مقام خلیفہ ہیں۔ اور بیعت کرتے ہیں۔ آپ سے بھی فیض جاری ہے۔ اور لوگ عرفان الٰہی میں اعلیٰ مراتب پاتے ہیں۔

حضرت مولانا سید نور الزمان شاہ صاحبؒ کے دوسرے خلیفہ اکبر حضرت مولانا محمد امین صاحب الحاج کاشمیریؒ تھے۔ یہ صاحب بھی بچپن سے ہی آپکے سایہ عاطفت میں پرورش پاتے رہے۔ چنانچہ صاحبزادہ صاحب جناب مولانا فخر الزمان شاہ صاحب اور کاشمیری صاحب اکٹھے یکجا تعلیم حاصل کرتے رہے اور حضرت شاہ صاحب کے انتقال سے قبل جبکہ ابھی کشمیری صاحب سن بلوغ کی ابتدائی منزلیں طے کر رہے تھے۔ علم عرفان کی تکمیل کر کے حضور شاہ صاحب سے سند لے کر فارغ ہوئے۔

حضرت الحاج مولوی محمد امینؒ: حضرت مولانا محمد امین صاحب کاشمیریؒ کی پیدائش تقریباً ۱۹۱۰ء موضع شاردا تحصیل کرناہ میں ہوئی۔ ابھی بچپن ہی تھا کہ آپکے والدین کا سایہ سر سے اُٹھ گیا۔ آپکے دو بھائی تھے۔ جن کے سر آپکی پرورش کا بار رہا ــــ آپکے والد جناب رحیم الدین وقت کی صاحب کمال ہستی تھے۔ اور عالم بھی تھے۔ اسی فطری اثر کے تابع آپکو بھی بچپن میں ہی علم حاصل کرنے کا شوق دامن گیر ہوا۔ لیکن ذرائع نہ ہونے کے باعث آپ اپنے وطن میں علم حاصل کرنے میں کامیاب نہ ہو سکے۔ آخر اسی عالم یتیمی اور بیکسی میں صرف علم کی خاطر وطن کو خیر باد کہہ کر ہجرت کی اور طویل مسافت طے کرتے۔ بے حد مصائب جھیلتے پنجاب کے علاقہ میں وارد ہوئے۔ یہاں اس زمانہ میں درس و تدریس کیلئے عام جگہوں میں یتیم خانے کھلے ہوئے تھے۔ جہاں ایسے طالب علموں کو خیراتی اداروں میں تعلیم ملتی تھی۔ چنانچہ انہیں اداروں میں آپ نے قرآن شریف اور فارسی کی چند کتابیں پڑھیں۔ اسکے بعد ــــ نحو۔ حدیث وغیرہ کی کتابیں پڑھنے کیلئے وقت کے کامل اساتذہ کی خدمت میں رہ کر فرداً فرداً تعلیم حاصل کرتے رہے۔ اور اس ترغیب نے انہیں ہندوستان کے سفر پر بھی آمادہ کیا۔ آپ نے کانپور۔ دیوبند میں بھی تعلیم حاصل کی اور دیوبند سے فارغ التحصیل کی سند بھی حاصل کی۔ اسی زمانہ میں جبکہ حضرت سید مولانا نور الزمان شاہ صاحبؒ امروہہ میں مدرسہ اسلامیہ میں بحیثیت صدر مقرر

تھے۔آپکی خدمت میں حاضر ہوئے اور آپ سے اپنے علم کی تکمیل کرنے لگے۔ یہ وہ زمانہ تھا جب حضرت شاہ صاحب مرحوم اپنی ولایت کی تکمیل کے بعد دوبارہ امروہہ میں مدرسہ اسلامیہ کے صدر مقرر ہوئے۔ چنانچہ حضرت ممدوح نے علم ظاہری کے ساتھ علم باطنی کی تعلیم بھی دی۔اس چنگاری کا پڑنا گویا بارود میں آگ لگنی تھی۔حضرت کاشمیری صاحبؒ ہمہ وقت ذکر ومراقبہ میں مشغول رہنے لگے۔ اور عشق کی یہ کیفیت ہوئی۔ کہ آپ ایک ساعت بھی اپنے شیخ جناب حضرت مولانا نورالزمان شاہ صاحبؒ سے علیحدہ رہنا برداشت نہ کرتے۔نتیجہ یہ ہوا۔کہ قریبی توجہ سے۔جذب آپکی رگ رگ سے پھوٹنے لگا۔حضرت کاشمیری صاحبؒ کوہستانی علاقہ کے رہنے والے تھے۔ان میں فطری طورا علیٰ دماغی قابلیت تھی۔ بہت ذہین تھے۔اور آپ میں ابتدائی طور وسعت قلب پائی جاتی تھی۔آپکے بشرے سے کبھی آپکی علمی قابلیت کومحسوس نہ کیا گیا۔لیکن جب کبھی مناظرہ میں یا امتحاناً آپ سے کسی مسئلہ پر بحث کرتے تو آپکی فقہ پر علما حیران رہ جاتے۔ چنانچہ اسی ذہنی قابلیت پر آپکو تحصیل علم میں بہت سی سہولتیں یعنی مفت کتابیں۔رہائش اور خورد ونوش کی سہولتیں ہر تعلیمی ادارے میں ملتی رہیں۔بعد کے زمانہ میں آپکے حضرت شیخ آپکی فطری ذہانت وقابلیت کی وجہ سے بیحد شفقت فرماتے رہے۔ زمانہ گذرتا گیا اور آپ بھی علم کی انتہائی منزلوں کو طے کرتے رہے۔اس دور میں آپ ہمیشہ حضرت شاہ ممدوح کی خدمت میں رہتے۔ ایک دفعہ کا ذکر ہے کہ حضرت مولانا نورالزمان شاہ صاحبؒ دہلی تشریف لے گئے۔دہلی میں ایک جیّد عالم سے ملاقات ہوئی۔اور حضرت کاشمیری صاحبؒ سے فرمایا ۔کہ تم یہاں رہو اور ان عالم صاحب سے اپنی کتاب کا درس لو۔کیونکہ ان دنوں ہم بہت مصروف ہیں۔ ان سے کتاب کی تکمیل کرو۔ فارغ ہوکر ہمارے پاس آجانا۔ہم واپس امروہہ جاتے ہیں۔حضرت ممدوح امروہہ تشریف لے گئے۔ ہفتہ بھر بمشکل آپ نے فراقِ یار کو برداشت کیا۔لیکن نہ ہوسکا۔بے اختیار ہو گئے۔تعلیم چھوڑ کر سراسیمگی کی حالت میں امروہہ کی طرف چل پڑے۔راستہ میں ایک مقام پر مسجد میں ٹھہرے تھے۔کہ جذبہ عشق نے اسقدر جوش مارا کہ آپکو وجود کے پھٹ جانے کا خطرہ محسوس ہوا۔آپ نے فوراً اپنی دستار اتار کر ٹکڑے کر لئے اور اپنا سینہ۔بازو۔سر باندھ لیے۔وفور جذب سے

بیخودی طاری ہو رہی تھی۔ اسی حالت میں اٹھے اور دیار یار کی طرف چلنا شروع کیا۔ آخر طوالت سفر کو دیکھ کر مجبور ہو گئے اور بغیر کرایہ ریل میں بیٹھ گئے۔ کرایہ موجود نہ تھا۔ چلتے وقت جیب میں صرف ڈیڑھ آنہ تھا جسکے کھانے کیلئے چنے مول لے لئے تھے۔ بالآخر بخیر و عافیت حضرت شاہ نور الزمان صاحبؒ کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ آپ نے اپنی حالت شاہ صاحب پر ظاہر کی۔ ابھی کچھ دیر بیٹھے ہی تھے۔ کہ شاہ صاحب نے حکم دیا۔ کہ جاؤ قریب کے اس جنگل میں خلوت میں بیٹھ جاؤ۔ آپ تعمیل ارشاد کرتے ہوئے اسی وقت جنگل کی طرف چل پڑے چونکہ سفر اور فراق کی شدت قدرے کم ہو گئی تھی۔ اسوقت تھکان اور بھوک بھی شدت سے محسوس ہو رہی تھی۔ قبلہ عالم کے حکم کو مقدم سمجھا۔ لیکن دل میں یہ محسوس کیا۔ کہ اتنے طویل سفر کی تکلیف اور فاقہ! کے بعد حضرت ممدوح نے روٹی بھی نہ کھلائی۔ اور کچھ وقت آرام کیلئے نہ دیا۔ آخر جنگل کے وسط میں ایک مقبرے پر پہنچے جس میں قبر کے ساتھ صرف التحیات میں بیٹھنے کی جگہ تھی۔ آخر اسی حالت گرسنگی میں روزے میں بیٹھ کر مراقب ہوئے۔ شام ہوئی پانی سے افطار کیا۔ دو دن دو راتیں مراقبہ میں گذریں۔ تیسرے دن وجود میں کچھ سکت باقی نہ رہی اور شام ہونے کے ساتھ نقاہت اور بے ہوشی شدت کے ساتھ طاری ہونے لگی افطار کیا مغرب کی نماز بمشکل ہوش میں ادا کی۔ قریب عشا کے آپ پر قطعی سکر اور کمزوری کی کیفیت غالب ہوئی۔ آپ ایسا محسوس کرنے لگے کہ شاید جان نکلی ___ لیکن حق ہے۔ مُوْ تُوْا قَبْلَ اَنْتَ مُوْتُوْا۔ طریق عرفان میں انسان جسد کی موت پا کر ہی حقیقی راہ تک پہنچ سکتا ہے۔ یکلخت آپ بے ساختہ ہو کر غش کی حالت میں لیٹ گئے۔ اور دنیا سے بے خبر ہو گئے۔ عالم بیہوشی طاری ہوتے ہی۔ ایک نئے عالم کا انکشاف ہونے لگا۔ اسی عالم بیہوشی میں آپ نے ایک نئے نورانی عالم میں اپنے آپ کو پایا۔ جہاں کا ذرہ ذرہ نورانی تھا۔ اسی عالم نورانی میں آپ نے۔ حضرت خواجہ اویس قرنی رضی اللہ عنہ کو دیکھا ۔۔ آپ سے ملے گلے لگایا مرحبا فرمائی تشریف لے گئے۔ اسکے بعد بہت سی ہستیاں تشریف لائیں۔ مرحبا کہی اور چلے گئے۔ اسکے بعد خود حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام تشریف لائے سر پر ہاتھ پھیرا۔ مرحبا کہی اور فرمایا اب تمہاری ولایت تکمیل پذیر ہوئی۔ جایئے۔ اب اپنے مرشد اکمل کی خدمت میں حاضر ہو جائیں۔ کچھ

عرصہ بعد آپ کو ہوش آیا۔تو ظاہری عالم کو محسوس کیا۔ یہ وقت دوسرے دن چاشت کا تھا۔اٹھے اور حضرت مولانا نورالزمان شاہ صاحبؒ کی خدمت میں پیش ہوئے۔آپ شفقت سے پیش آئے۔اور اپنے پاس ٹھہرالیا۔ابتداءً ہلکی غذائیں استعمال کرائیں۔جب دوبارہ وجود میں قوت آئی۔تو کاشمیری صاحب نے عرض کی۔کہ حضور اجازت ہوتو میں اپنی کتاب کی تکمیل کرنے کے لیے دہلی جاؤں۔لیکن حضور نے فرمایا۔اب وہاں جانے کی ضرورت نہیں۔اب ہم تمہاری ظاہری و باطنی تعلیم کی تکمیل کر دیں گے۔مگر آپ مصر ہوئے کہ ہم دہلی جائیں گے۔تو آپ نے فرمایا۔کہ اچھا تمہاری مرضی۔ کاشمیری صاحب دہلی روانہ ہو گئے۔جب دہلی کے سٹیشن پر پہنچ کر اترنے لگے۔تو کیفیت استغراق طاری ہوئی۔اسی استغراق میں حضرت شاہ صاحب اور حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کو قریب پایا۔ حضورؐ نے سخت لہجے میں فرمایا۔محمد امین! تمہیں شاہ صاحب نے اپنے پاس ٹھہرنے کو حکم دیا تھا۔تم کیوں یہاں چلے آئے۔فوراً اسی طرح واپس اِنکی خدمت میں حاضر ہو جاؤ غنودگی ہٹ گئی اور آپ گھبرائے۔اسی طرح واپس حضور شاہ صاحبؒ کی خدمت میں لوٹے۔اور بغیر تاخیر شاہ صاحب کی خدمت میں پہنچے۔آپ نے آتے ہی فرمایا۔کاشمیری ہم نے پہلے ہی تم سے کہا تھا۔یہاں ٹھہر جاؤ۔ لیکن تمہیں شکایت یہ تھی کہ تکان میں فرصت نہ دی اور روٹی نہ کھلائی ___ ہم نے سمجھا تھا۔کہ اسوقت نفس مردہ ہے۔اورتم جلد کامیاب ہو گے۔فقیر فاقہ اور جسم کی تکلیف کو محسوس نہیں کرتے۔آپ قدموں پر گرے۔اور عفو چاہی۔آخر تادمِ آخر کاشمیری صاحبؒ حضرت شاہ ممدوح کی خدمت میں رہے۔آپکا جناب مولانا فخر الزمان شاہ صاحبؒ کے ساتھ تعلیم حاصل کرنا۔درس سے فارغ ہو کر حضرت شاہ ممدوح کی خدمت گزاری میں ہرلحہ رہنا۔رات مراقبہ میں گزارنی معمول رہا۔آخر ۱۳۴۲ھ میں حضرت سید مولانا نورالزمان شاہ صاحبؒ کی طبیعت کچھ علیل ہونی شروع ہوئی رفتہ رفتہ بیماری مستقل ہونے لگی۔حضرت کاشمیری صاحبؒ ہر وقت آپکی تیمارداری میں مصروف رہتے۔اس دورانِ علالت شاہ صاحبؒ ہر وقت استغراق میں رہتے۔ایک دن جب آپ تنہا شاہ صاحب کی خدمت میں حاضر تھے۔شاہ صاحب نے آواز دے کر۔فرمایا۔کاشمیری! تمہاری قمیض میلی ہو چکی ہے۔اسے

اتار دو ــــــ آپ نے تعمیل ارشاد کی اور قمیض اتار دی۔ حضور شاہ صاحبؒ نے اپنی قمیض اتار کر پہنا دی۔ اور فرمایا اب جاؤ تمہارے ظاہری و باطنی علم کی تکمیل ہو چکی۔ جاؤ اب لوگوں تک علم وفیض پہنچاؤ۔ تمہارے تین پھل ہونگے (یعنی تین پھل سے مراد تین خلیفہ اکبر ہونگے) کاشمیری صاحب سمجھے کہ اب فراقِ دائمی کا وقت شاید قریب ہے۔ رو دیئے اور عرض کی کہ حضور آپ کے بعد میں کیسے جیوں گا۔ آپ نے روئے مبارک پر ہاتھ پھیر کر فرمایا۔ جب تک یہ چہرہ تمہارے تصور میں ہے۔ میں تمہارے قریب ہوں۔ جو کچھ ضرورت ہو اس سے لینا۔ بس۔ اس کے بعد آناً فاناً آپکی طبیعت خراب تر ہونے لگی آخر ۲۸ شوال یوم دوشنبہ بعد نماز عشا آپ اس دار ظاہری سے فراغت حاصل کر کے اپنے منبع حقیقی سے واصل ہوئے۔ اِنَّـا لِلّٰهِ وَاِنَّآ اِلَيْهِ رَاجِعُوْنَ ۔ آپکا مزار مقدس آپکی پیشتر منتخب کردہ جگہ پر بنایا گیا۔ جو کہ اسوقت آپکے صاحبزادگان کے مسکن کے بالکل قریب ہے۔ یہاں پر ہی جناب محترمہ مائی صاحبہؒ کی تربت اور جناب سید مولانا فخر الزمان شاہ صاحبؒ کی تربت شریف ہے۔

حضرت مولانا محمد امین صاحب کاشمیریؒ جملہ رسوم تجہیز و تکفین ادا کرنے کے بعد بحال زار گریہ کناں اپنے وطن مالوف کی طرف روانہ ہوئے۔ یہ وہ زمانہ تھا کہ آپکی داڑھی نہیں آئی تھی اور آپ نے علم دین۔ اور علم مشاہدہ (شریعت وطریقت) کی تکمیل کی تھی۔ کشمیر میں داخل ہوئے تو اپنے گھر علاقہ شاردا قصبہ سُرگن تحصیل کرناہ جاتے ہوئے ایک گاؤں میں پہنچے۔ تو یہاں ایک شخص ارسلان خان نامی آپ سے ملا۔ اور اپنے ہاں ٹھہرنے کیلئے درخواست کی آپ اس شخص کے ساتھ گئے گھر پہنچے تو وہاں عجیب سماں تھا۔ ایک فقیر قریب المرگ بیمار پڑا ہوا دروازہ کی طرف دیکھ رہا تھا۔ گویا اسے کسی کا انتظار ہے۔ جونہی حضرت کاشمیری صاحبؒ اندر پہنچے تو فقیر کے چہرہ پر ایک عجیب چمک پیدا ہوئی۔ اور سہارا دیکر بیٹھ گئے۔ حضرت مولانا صاحب بھی قریب بیٹھے اور ارسلان خان بھی قریب ہو کر بیٹھے۔ فقیر نے کہا۔ میں آپکے انتظار میں تھا۔ اب میرا وقت قریب ہے۔ لہذا آپ میرا جنازہ پڑھا کر ہی یہاں سے تشریف لے جائیں۔ اسکے بعد چند باتیں حقیقت واسرار کی کہہ کر جاں بحق ہو گئے۔ حضرت مولانا محمد امین صاحبؒ نے نماز جنازہ ادا کی۔ تجہیز و تکفین کے بعد جانے کا ارادہ کیا۔ تو ارسلان خاں نے

عرض کی کہ حضرت مجھے بیعت کیجئے۔آپ نے فرمایا۔کہ تمہیں کیسے معلوم ہوا کہ میں بیعت کرنے والا فقیر ہوں۔ میں تو ایک بچہ ہوں!۔اس نے عرض کی کہ حضرت مجھ سے اس مرحوم فقیر نے پیشتر ہی پیشگوئی کی تھی۔کہ ایک فقیر آنے والا ہے۔وہ اس بستی میں داخل ہوگا تو میں چل بسوں گا۔اسکے بعد تم اس سے بیعت کرنا۔آخر آپ نے ارسلان خان کو بیعت کیا اور سلسلہ اویسیہ میں داخل کیا۔یہ پہلا شخص آپکا مُرید ہوا۔یہاں سے چل کر آپ اپنے گھر تشریف لائے۔بہت مدت بعد آپ گھر تشریف لائے تھے۔آپکے عزیز واقربا کو آپکے متعلق کچھ علم نہ تھا کہ کہاں ہیں۔کچھ عرصہ بعد دوبارہ آپ نے کوٹ چاند نہ جانے کا ارادہ کیا۔اور کوٹ چاند نہ کی طرف سفر اختیار کیا۔اسی دوران سفر میں علاقہ ہندواڑہ جو کہ کشمیر کے دارالخلافہ سری نگر سے تقریباً ساٹھ میل پر واقع ہے۔قصبہ سوپور سے گزر رہے تھے۔کہ راستہ میں ایک شخص خواجہ عبدالکریم زرگر نامی ملا۔اس نے راستہ میں روک کر عرض کی کہ حضور آج رات آپ میرے گھر تشریف لائیں اور میرے مہمان رہیں چونکہ راستہ میں کوئی جگہ ایسی نہ تھی جہاں آپ قیام فرماتے۔خواجہ صاحب کے گھر تشریف لے گئے۔گھر پہنچے تو وہاں ایک خاصی دعوت کا اہتمام ہو رہا تھا۔آپ گھر میں داخل ہو گئے۔تو خواجہ صاحب انہیں ایک سجے ہوئے کمرے میں جہاں مسند بچھی تھی لائے آپ ایک کنارے بیٹھ گئے۔خواجہ صاحب نے ہاتھ پکڑ کر مسند پر بٹھایا۔کہ یہ جگہ آپکے لیے رکھی ہے۔آپ مسند پر بیٹھ گئے کہ شاید یہاں کا یہی دستور ہوگا۔رفتہ رفتہ کمرہ اور مہمانوں سے بھر گیا۔کھانا کھالیا اور کچھ لوگ رخصت ہو کر چلے گئے چند ایک وہاں رہ گئے۔آخر خواجہ صاحب نے کچھ مٹھائی (شرینی) ایک سفید لوئی (اونی کمبل)۔حضرت مولانا کو پیش کی اور دوزانو ہو کر بیٹھ گئے۔اور عرض کی کہ مجھے بیعت کیجئے۔آپ نے کسر نفسی[1] سے کام لیا۔لیکن خواجہ صاحب نے اصرار کیا۔کہ حضرت مجھے اس سے قبل باطنی طور مطلع کیا گیا ہے۔اور میں نے مشاہدہ کی مدد سے آپ کا

---

[1] کسر نفسی سے مراد یہ ہے۔کہ فقیر خود اپنا آپ ظاہر نہیں کرتا۔بلکہ فقیر کی یہ صفت ہوتی ہے۔کہ جتنا مراتب میں اعلیٰ مقام اسے حاصل ہو۔اتنا ہی اس پر خوف طاری رہتا ہے۔اور اپنے آپ کو کمتر سمجھتا ہے۔

حلیہ پہچانا۔ میں آپ کا انتظار کئی دن سے کر رہا تھا۔ اور آج مجھ پر صاف طور پر ظاہر ہوا کہ آج آپ یہاں تشریف لائیں گے۔ حضرت مولانا نے آپکو بیعت کیا۔ یہ آپکے دوسرے مرید ہیں۔ یہ آپ کے خلیفہ اکبر ہوئے ہیں۔ انہوں نے تھوڑی مدت میں تمام مقامات عرفان تا ذاتِ الٰہی طے کر لئے۔ وہ آپ کی حیات میں قائم مقام خلیفہ تھے اور انہیں بھی بیعت کرنے کی اجازت تھی۔ یہاں سے رخصت ہو کر حضرت مولانا کاشمیری صاحبؒ پنجاب ضلع میانوالی (کوٹ چاندنہ شریف) کا سفر کرنے کے بعد دوبارہ کشمیر تشریف لائے۔ اور علاقہ ہندواڑہ میں اپنے مرید خواجہ عبدالکریم صاحبؒ کے یہاں کچھ عرصہ ٹھہرے۔ اس اثناء میں اس علاقہ کے کئی لوگوں نے آپ سے فیض حاصل کیا اور بیعت کی۔ اسی علاقہ ہندواڑہ کے ایک قصبہ کپواڑہ میں ایک گاؤں موضع کاشیراہ میں آپ تشریف لے گئے۔ یہاں سے چھ سات میل دور کوہستانی علاقہ میں آپکے قریبی عزیز رہتے تھے۔ موضع کاشیراہ میں آپ نے ایک جگہ پسند فرمائی۔ خیال ہوا۔ کہ یہاں پر ہی اب اپنا گھر بنائیں۔ یہ خیال آپ نے ظاہر فرمایا۔ اور پھر وہاں سے دوبارہ گھر تشریف لے گئے۔ گھر پہنچے تو آپکے بھائیوں نے آپکی مستقل سکونت کا انتظام کرنا چاہا۔ اس سلسلہ میں والد ماجد کی وراثت کی تقسیم ہوئی۔ اور آپکو کچھ حصہ جائیداد کا ملا۔ لیکن یہ تمام آپ نے اپنے بھائیوں کے سپرد کر دیا اور ارادہ ظاہر کیا کہ ہم علاقہ ہندواڑہ (لولاب) میں جگہ لینا چاہتے ہیں۔ بہر حال آپ نے اپنے ضروری امور سے فراغت حاصل کی اور پھر لولاب تشریف لائے۔ یہاں موضع کاشیراہ میں کچھ زمین خرید کر ایک مکان تعمیر کیا۔ اور اس عرصہ میں آپ نے اپنے خاندان سے رشتہ بھی کر لیا۔ رفتہ رفتہ اور زمینیں خرید لیں۔ جس سے آپ کے اہل وعیال کے لئے اتنا فصل مہیا ہو سکتا تھا کہ آپ اپنے خورد ونوش کی فراہمی سے مطمئن ہو گئے۔ اسی اثناء بیع وشریٰ میں ایک بار آپکو اپنے اصل وطن سرگن جانے کی ضرورت پڑی کہ وہاں کے تحصیل دار سے باشندہ ریاست سرٹیفیکیٹ (سٹیٹ سبجیکٹ) حاصل کرنا تھا۔ آپ سرگن تشریف لے گئے۔ اثناء راہ سرگن سے کچھ فاصلہ پر ایک نمبر دار آپکا مرید ہو چکا تھا۔ یہاں پر قیام فرمایا۔ عجب واقع ہے۔ کہ نمبر دار کے ہاں جنگلات کے ایک افسر ٹھہرے ہوئے تھے۔ یہ صاحب عیسائی تھے۔ ڈی ایف او صاحب جب ڈیرہ پر

پہنچے تو نمبردار سے پوچھا کہ یہ کون مہمان ہمارے کمرے میں بیٹھے ہیں۔ نمبردار نے کہا۔ کہ یہ میرے پیر ہیں۔ افسر صاحب نے نہایت درشت لہجے میں کہا۔ کہ یہ پیر لوگ ٹھگ ہوتے ہیں۔ نمبردار کو یہ الفاظ ناگوار گذرے۔ لیکن حضرت مولانا نے اشارہ سے خاموش رہنے کو کہا۔ شام کھانے سے فراغت حاصل کی تو جنگلات کے افسر نے حضرت مولانا سے بحث شروع کی۔ افسر صاحب ویسے بھی عیسائی مبلغ تھے۔ حضرت مولانا بحث کرنا نہیں چاہتے تھے۔ آخر مختصر الفاظ میں فرمایا۔ صاحب ہم بحث کرنا نہیں جانتے۔ ہم تو سیدھے سادھے فقیر ہیں۔ آپکا دین آپکو پسند ہے۔ تو آپکو مبارک ہو۔ جب آپ ہمارے دین کو پسند ہی نہیں کرتے تو بحث کا کیا نتیجہ ہوسکتا ہے۔ نہ آپ نے ماننا۔ نہ ہم نے ماننا۔ البتہ ایک بات سے فیصلہ ہوسکتا ہے۔ اگر آپ مانیں تو میں پہلے آپ سے چند سوال پوچھتا ہوں۔ انکے جواب کے بعد فیصلہ ہوسکتا ہے۔ کہ کون صحیح ہے۔ کون غلط۔ افسر صاحب نے پوچھا۔ کہ آپ کیا سوال کرنا چاہتے ہیں؟ حضرت مولانا نے فرمایا۔ آپکا دین تو سچا ہے۔ آپ بھی سچے ہیں۔ اس نے کہا۔ بے شک ہمارا دین سچا ہے۔ اور ہم بھی سچے ہیں۔ ہم کسی کو دھوکہ نہیں دیتے۔ ہمارے دین کی خوبی یہ ہے۔ کہ حضرت عیسٰیؑ نے سولی چڑھ کر ہمارے گناہوں کا کفارہ دیا۔ اب ہم نجات یافتہ ہیں۔ آپ نے سوال کیا۔ کہ کیا آپکو بھی ان سے محبت ہے؟ اس نے کہا ہاں ہمیں سب سے زیادہ ان سے محبت ہے۔ تو آپ نے پوچھا حضرت عیسٰیؑ کو بھی آپ سے محبت ہونی چاہیئے۔ اس نے کہا۔ ہاں انہیں بھی جو انکے دین میں داخل ہوگا اس سے محبت ہوگی۔ آپ نے پوچھا اس محبت کے نتیجہ میں کبھی آپ نے حضرت عیسٰیؑ کو دیکھا بھی ہے؟ تو افسر صاحب خاموش ہو گئے۔ آپ نے کہا اگر آپ نے نہیں دیکھا تو خیر۔ ہمارے بہت سے مرید ہیں۔ اگر آپ یہ کر سکیں کہ حضرت عیسٰیؑ خواب میں آکر ہمیں کہہ دیں۔ کہ ہمارا دین سچا ہے تو میں بمعہ سب مریدوں کے عیسائی دین قبول کرلوں گا۔ اور اگر یہ نہ ہوا۔ تو پھر آپ یہ شرط مان لیں کہ اگر حضرت عیسٰیؑ آپ سے کہہ دیں یہ کہ اسلام (دین محمدیؐ) سچا ہے۔ تو آپ اسلام میں داخل ہوں۔ جنگلات کے افسر صاحب کچھ جواب نہ دے سکے۔ آخر کچھ دیر توقف کے بعد کہا۔ کہ یہ ناممکن ہے۔ کہ حضرت عیسٰیؑ آکر ایسا کہہ دیں۔ اچھا ہمیں منظور ہے ____ بس بحث ختم ہوئی۔ افسر

صاحب پر حضرت مولانا کا کچھ رعب جلال طاری ہوا۔اب وہ آپ کا احترام کرنے لگے۔رات دیر تک گفتگو جاری رہی۔اس عرصہ میں افسر صاحب کا قلب نہایت متاثر ہوا ___ صبح ہوتے ہی حضرت مولانا تحصیل دار کے پاس چلے گئے۔عجب اتفاق ہوا۔کہ افسر صاحب کو فوری طور دورے پر جانا پڑا۔ حضرت مولانا تحصیلدار سے فارغ ہو کر واپس آئے تو معلوم ہوا۔کہ ڈی۔ایف۔او صاحب دورے پر چلے گئے۔اور سوا روپیہ نذرانہ نمبردار کو دے کر کہہ گئے کہ پیر صاحب سے معذرت چاہیں۔کہ میں آپ سے نہ مل سکا۔میرے لئے دعا فرمائیں۔پیر صاحب نے نذرانہ قبول کیا۔اور افسر صاحب کیلئے ہدایت کی دعا فرمائی۔یہاں سے حضرت مولانا گھر تشریف لائے۔اور موقع نہ مل سکا کہ ڈی ایف او صاحب کی شرط پوری ہو سکے۔

ایک دفعہ آپ کو کسی ضروری کام سے اپنے خلیفہ خواجہ عبدالکریمؒ کے ہاں جانا پڑا۔وہاں کچھ دن قیام فرمایا۔حسن اتفاق جنگلات کے افسر صاحب بھی تبدیل ہو کر اسی علاقے میں آئے تھے۔ انہوں نے سُنا کہ پیر صاحب یہاں تشریف لائے ہیں تو خوش ہوئے۔ملاقات کو حاضر ہوئے۔اور ساتھ ہی عرض کیا کہ حضرت میری شرط ابھی پوری نہ ہوئی۔میں کہتا تھا کہ یہ ناممکن ہے ایک سال کا عرصہ گذر چکا میں نے حضرت عیسیٰؑ کو نہیں دیکھا۔نہ انہوں نے مجھے کہا کہ یہ دین سچا ہے لہذا اب آپکو عیسائی ہونا ہوگا۔آپ نے فرمایا۔اچھا آج آپکی شرط پوری ہوگی۔لیکن جسطرح ہم کہیں کرنا ہوگا۔ انہوں نے منظور کر لیا۔آپ نے فرمایا۔کہ یہاں ساتھ مسجد میں آپ چلیں۔یہاں وضو کروایا۔اور درود شریف یاد کرا کر حکم دیا کہ بس یکسوئی کے ساتھ آنکھیں بند کر کے پڑھتے رہو۔اور خیال رکھو کہ کیا واقعات پیش آتے ہیں۔افسر صاحب نے مسجد میں بیٹھ کر مراقبہ کی حالت میں درود شریف پڑھنا شروع کیا۔حضرت مولانا ڈیرہ پر تشریف لے آئے۔صبح دس بجے کے قریب افسر صاحب مسجد میں داخل ہوئے تھے۔ابھی عصر کا وقت نہ ہوا تھا۔کہ افسر صاحب مسجد سے نکل کر حضرت مولانا کی خدمت میں عاجزانہ انداز میں قدموں پر گر پڑے۔اور عرض کی۔گستاخی معاف مجھ سے خطا ہوئی۔میں نے جاگتی حالت میں مشاہدہ کیا۔کہ حضور علیہ الصلوۃ والسلام (حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم) کے

ساتھ حضرت عیسٰی علیہ السلام بھی تشریف لائے اور فرمایا سخی ولایت ان کا (حضور صلعم کی طرف اشارہ کرتے ہوئے) دین سچا ہے۔تم بھی اس دین میں داخل ہو جاؤ۔ حضرت مولانا کو ازحد خوشی حاصل ہوئی۔مجلس میں بہت سے لوگ جمع تھے۔آپ نے افسر صاحب کو کلمہ پڑھایا۔اور بیعت کیا۔اسوقت بہت سے لوگوں نے بھی آپ کے دست حق پرست پر بیعت کی اور آپ کا شہرہ تمام علاقہ میں ہوا۔ اسکے بعد بے شمار لوگوں نے آپ سے فیض حاصل کیا۔یہاں تک کہ کشمیر کے اکثر مقامات سے لوگ آکر آپ سے فیض حاصل کرنے لگے ـــــ آپ کشمیر کے شمالی علاقہ موضع کا شیراہ۔قصبہ کپواڑہ تحصیل ہندواڑہ کشمیر کے دارالخلافہ سری نگر سے تقریباً ساٹھ میل کے فاصلہ پر کوہستانی علاقہ میں سکونت پذیر تھے۔سخی ولایت خانؒ علاقہ میر پور کشمیر کے رہنے والے تھے۔آپ کے والد ابتداءً مسلمان تھے۔لیکن بعد میں اپنا وطن میر پور چھوڑ کر سرینگر دارالخلافہ میں بمعہ خاندان کے سکونت اختیار کی۔یہاں اپنے لڑکوں کو جن میں سخی ولایت خان صاحب کے ساتھ ان کے دو چھوٹے بھائی بھی تھے مشن سکول میں داخل کیا۔اس اثناء میں عیسائی مشنری سے کچھ رابطہ پیدا ہوا۔انہوں نے تمام خاندان کو عیسائی کر دیا۔اور سخی ولایت خان صاحب بچپن میں ہی عیسائی ہو گئے تھے۔انکے والد عیسائی مبلغ تھے۔اور ایف اے (بارہویں جماعت) پاس کرنے کے بعد سخی ولایت خان صاحب نے ملازمت اختیار کی۔ جنگلات میں فارسٹ افسر لگ گئے۔عیسائی مذہب کے از حد معتقد اور انجیل سے بخوبی واقف تھے۔اور تبلیغ بھی کرتے رہتے تھے۔لیکن قدرت نے انہیں ازلی سعادت عطا کی تھی مثل موسٰیؑ آگ کی تلاش میں عظمت ملی ـــــ اور آپ کی ولایت انتہا کو پہنچی۔یہ حضرت مولانا کے دوسرے خلیفہ اکبر تھے۔آپکی حالت اس قدر قوی تھی کہ بعض اوقات صرف ایک بار توجہ دینے سے ایک شخص پر مشاہدہ عیاں ہو کر اول اجلاس محمدیؐ میں حضورؐ کی زیارت صرف چند منٹ میں ہو جاتی تھی۔آپکو اپنے حضرت شیخ سے بے حد محبت تھی۔بعض اوقات یہ کیفیت ہوگئی کہ بیوی کو طلاق دینے پر آمادہ ہو گئے کہ جب قبلہ پیر صاحب ہمارے گھر تشریف لاتے ہیں تو میری بیوی میرے اور پیر صاحب کے درمیان حائل ہو جاتی ہے۔میں اس پردہ کو ہٹانا چاہتا ہوں۔کہ میرے اور پیر کے درمیان کوئی دوسری شے

حائل نہ ہو۔لیکن پیر صاحب کی توجہ پھرانکی کیفیت کواعتدال پر لے آتی۔پھر بھی جذب محبت انکے قلبی تاثرات پر اثر انداز ہوا۔اورآپ اکثر دنیا سے زیادہ تر کنارہ کش رہے۔آخر ۱۹۵۶ء میں ملازمت سے استعفیٰ دے دیا___اور تنہائی واستغراق میں رہنے لگے آپ نے بہت سے لوگوں کومعرفت سے فیض یاب کیا۔آخر اسی استغراق وسرور کی حالت میں ماہ ذوالحجہ ۱۳۷۶ھ میں کلی طور دنیا سے کنارہ کش ہوکر حقیقی وجود ذات الٰہی میں مقام فرما کر اس دنیا سے چل بسے۔حضرت مولانا محمد امین کاشمیریؒ کو آپ کی وفات سے از حد صدمہ پہنچا۔لیکن فقیر رضائے الٰہی پر راضی ہوتا ہے۔

حضرت مولانا محمد امین صاحبؒ کے آپکی حیات میں دوخلیفہ اکبر حضرت خواجہ عبدالکریم صاحبؒ۔حضرت سخی ولایت خاں صاحبؒ ہوئے ہیں۔اسکے علاوہ آپکے مریدوں میں ملک بھر میں اور بھی صاحب کمال لوگ ہیں۔جوخود ولی ہیں اورلوگوں کو بھی فیض دیتے ہیں۔ان لوگوں میں کوئی شخص بیعت نہیں کرسکتا۔لیکن ان میں اکثر لوگ ایسے ہیں جوایک طالب کوابتدائی طور پر اول اجلاسِ محمدیؐ میں زیارتِ رسولؐ سے مشرف کراتے ہیں۔ان میں عورتیں بھی شامل ہیں۔عورتوں میں ایک خاتون۔محترمہ گلنساء صاحبہؒ کوانتہائی مقامات ولایت وعرفان حاصل تھے۔اورآپکو بیعت کرنے کی اجازت تھی۔آپ کشمیر کے ایک اعلیٰ خاندان (راجپوت) سے تعلق رکھتی تھیں۔اورآپ کے والد راجہ علی اکبر خاں صاحب کشمیر میں علاقہ چکار (مظفرآباد) کے ایک علاقہ دار تھے۔یہ تمام خاندان اورعلاقہ کے بہت سے لوگ حضرت مولانا کے مرید ہیں۔

حضرت مولانا الحاج محمد امین کشمیری اویسی قادری نقشبندی قطب الاقطاب رحمتہ اللہ علیہ مورخہ ۷اذی الحج ۱۳۸۸ھ بمطابق ۷امارچ ۱۹۶۸ءکورات نو بج کر ۵۵منٹ پر داعی اجل کو لبیک کہہ گئے۔اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّآ اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ۔اس شر کے زمانہ میں آپ کی ذات والاصفات ایک روشن ستارے کی مانند حق کی راہنمائی کرتی رہی۔آپ کی ذات سے دعائے اویسیہ کی قبولیت کے اظہار میں عوام الناس کوہدایت ومغفرتِ حق کا سامان میسر آتا رہا۔

اس اولوالعزم ولی اکمل۔صاحب علم وعمل۔صاحب شریعت وطریقت۔صاحب تقویٰ اور

صاحب تدبر وفہم مجاہد نے اپنی تربیت ظاہری سے۔ایسی کامل اکمل جماعت ترتیب دیکر مخلوق خدا کی راہنمائی کیلئے چھوڑ دی۔جس کا سلسلہ دعائے اویسی اور مقام محمود کی تکمیل میں چار دانگِ عالم میں تا قیامت چلتا رہے گا۔سلسلہ اویسیہ تا قیامت روشن طریقہ پر قائم رہے گا۔اور ہر زمانہ میں طالبانِ حق کو اس سلسلہ کا فیض میسر آتا رہے گا۔

سلسلہ اویسیہ کا مختصر شجرہ اویسیہ انہیں حضرات پر مشتمل ہے اس کا نقشہ شجرہ ہم یہاں درج کرنا ضروری سمجھتے ہیں۔

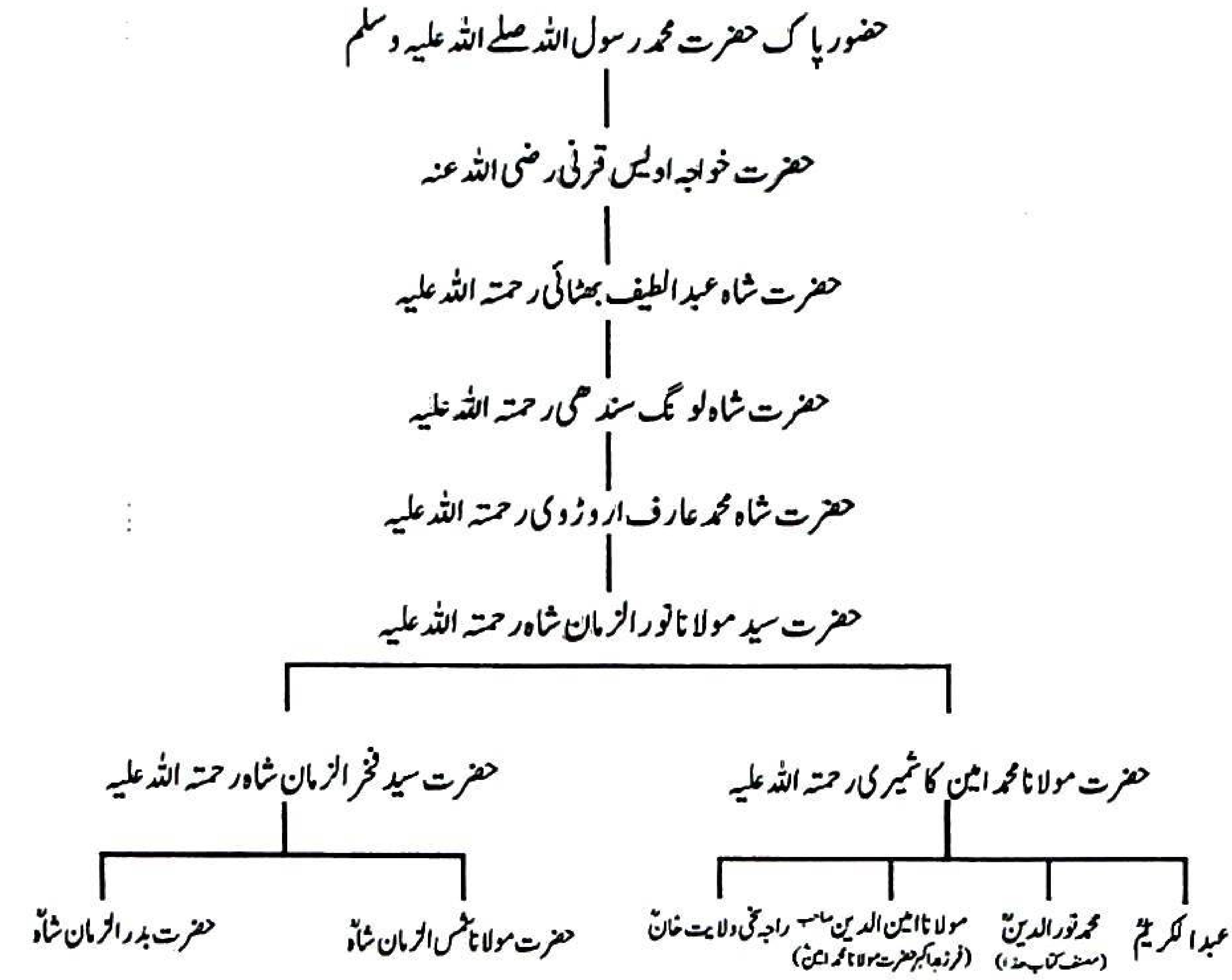

واضح ہو کہ طریقت کا علم انہیں سلاسل کے ذریعہ ہر زمانہ میں جاری ہوا ہے۔ ہر سلسلہ میں ایک خلیفہ قائم مقام کے ساتھ ایک ایک شاخ کا علیحدہ علیحدہ سلسلہ چلتا ہے۔ان سلاسل کی کیفیت ایسے واقع ہے۔جسطرح ایک منبع سے چشمہ جاری ہو اور اسکی شاخیں تمام دنیا میں نہروں کی صورت میں پھیلتی گئی ہوں۔ان سلاسل میں حقیقی فیض جاری ہوتا رہا۔لیکن جوں جوں زمانہ گذرتا گیا۔شاخیں بڑھتی گئیں۔زمانہ کی طوالت کے ساتھ بعض شاخوں میں اصل مواد قائم نہ رہ سکا۔اس میں بناوٹ اور

نقل بھی پیدا ہوتی رہی۔ اب ایسی شاخیں بھی قادری۔ چشتی۔ اویسی پائی جاتی ہیں۔ جن میں نہ وہ حقیقی تعلیم ہے۔ نہ وہ اصلی طریقت کے اصول موجود ہیں۔ بلکہ نقلی فقرا نے خودساختہ اصول اور بے معنی تعلیمات داخل کر کے اصل حقیقت کو مسخ کر ڈالا ہے۔

علم طریقت کی اصل اور مستند اثاث سینہ بسینہ چلی آتی ہے۔ کیونکہ طریقت میں عمل کے نتائج مشاہدۂ باطنی سے تعلق رکھتے ہیں۔ اسلئے اس علم کا پتہ کتابوں کے ذریعہ نہیں بلکہ قلب کے خزانہ سے مل سکتا ہے ـــــ اور یہ علم اسی قلبی خزانہ سے مل سکتا ہے۔ جو اصولِ شریعت وطریقت کا پورا عامل ہو۔ انہیں علماء طریقت سے جو علم حاصل ہو وہ حقیقت پر مبنی ہے۔ اس میں شک نہیں کہ سابقہ علماء طریقت نے زمانہ اورلوگوں کی قلبی کیفیتوں کے بدل جانے پر حسب ضرورت اختراعیں کی ہوں۔ لیکن یہ اختراعیں بھی اصل تعلیم طریقت (جو علم حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام سے جاری ہوا) کے احاطہ میں آتی ہیں۔

عام طور ان سلاسل میں جو عمل طریقت کے علم سے جاری ہوا۔ وہ سب سے اوّل شریعت کی پابندی۔ (پانچ احکام کلمہ۔ نماز۔ روزہ۔ حج۔ زکوٰۃ) پر شدت سے کاربند رہنا ہے۔ اسکے بعد وحی خفی کی تعلیم (تعلیم طریقت) قرأت قرآن میں حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کی طرف سے ارشاد کردہ تعلیم (وظائف) ہے۔ اسکے متعلق ظاہر طور کوئی تواریخ نہیں مل سکتی کہ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے حضرت علیؓ کو کیا وظیفہ (تعلیم طریقت میں) بتایا۔ یا حضرت علی کرم اللہ وجہہ نے حضرت امام حسن و حسین۔ حضرت حسن بصری رضی اللہ عنہم کو کیا تعلیم ارشاد کی۔ یہ تعلیم سینہ بسینہ ایک کامل کے قلبی خزانہ سے ہی مل سکتی ہے۔ اس بات سے انکار نہیں کیا جاسکتا۔ کہ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے سوائے قرآن کی تعلیم۔ رات کا جاگنا۔ نوافل اور قرأت قرآن میں سے آیات قرآنی یا درود شریف کے اور کچھ نہ بتایا ہوگا ـــــ ہاں یہ بات قابلِ تسلیم ہے۔ کہ قرآن سے باہر کوئی ایسا علم حضورؐ کے پاس نہ تھا جو وہ کسی کو بتاتے۔ لیکن قرآن کی آیات میں بعض آیات افضل بھی ہیں۔ جن میں بے شمار فضیلتیں پائی جاتی ہیں۔ جیسے سورۃ فاتحہ۔ آیت الکرسی۔ سورۃ یٰسین۔ سورۃ مزمل۔ سورۃ سجدہ۔ سورۃ حٰمٓ السجدۃ۔ تبارک الذی۔

وغیرہ۔اسی طرح بعض مخصوص آیتیں بھی ہیں جنکے فضائل اورانوار بے شمار پائے جاتے ہیں۔ان میں یہ تخصیص نہیں کی جاسکتی کہ کون سی آیت میں کیا انوار وفضائل مشاہدہ کئے جاتے ہیں سوائے ان لوگوں کے جن کو جو آیت یا سورۃ بتائی گئی ہو۔کہ وہ انکے انوار کا مشاہدہ رکھتے ہیں۔یہ سب مواد قرآنی علم کے احاطہ میں ہی ہے۔

بظاہر صاحب طریقت علما جو علم پیش کرتے ہیں ان میں قرآنی آیات میں طریقہ چشتیہ۔ نقشبندیہ۔سہروردیہ اور بعض دیگر سلاسل میں صاحب طریقت لوگ سورۃ قرآنی۔مثلاً سورۃ یٰسین۔ سورۃ مزمل یا اور چند سورتوں کا ورد بتاتے ہیں۔آیات میں سورۃ فاتحہ۔الم نشرح۔آیت الکرسی۔اور چند مختلف آیتیں بتاتے ہیں۔اسماءالٰہی میں۔ یَا رَحِیْم۔ یا صمد ۔یاحی یا قیوم وغیرہ بہت سے اسماء کا ورد بتاتے ہیں۔اسکے ساتھ درود شریف کا ورد بھی بتاتے ہیں۔اس درود شریف میں بمطابق حدیث شریف کہ درود میں صرف وہ درود شریف حضورؐ نے بتایا ہے۔جو نماز میں پڑھا جاتا ہے ــــــ اسکے علاوہ اور بھی درود شریف ہیں۔جو اس درود شریف سے علیحدہ ہیں۔یہ درود شریف کچھ تو وحی خفی میں حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کی طرف سے ارشاد فرمائے گئے ہیں اور کچھ صاحبِ علم علماءِ طریقت نے (جو اپنی منتہا کو پا چکے ہیں) از روئے محبت اختراع کئے ہیں۔مثلاً درود تاج۔درود لکھی یہ نام ان درود کے کیفیات سے ہی اخذ کئے گئے ہیں۔کہ کسی صاحب علم نے جذبہ محبت میں حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کی محبت میں بیخودی میں کہا ہو۔کہ صَاحِبِ التَّاجِ وَالْمِعْرَاجِ ۔ وَالْعَلَمِ۔ دَافِعِ الْبَلَآءِ وَالْوَبَآءِ وَالْقَحْطِ وَالْمَرَضِ وَالْاَلَمِ۔صَاحِبِ الْجُوْدِ وَ الْکَرَمِ ۔مُحِبِّ الْفُقَرَآءِ وَالْغُرَبَآءِ وغیرہ۔یہ الفاظ آپکی کمال صفت سے متعلق ہیں کہ جب ایک عاشقِ رسولؐ آپکی محبت میں سرشار یہ قصیدہ خوانی کرتا ہے۔تو لازمی طور اس پر انوار (نور محمدیؐ) خوشنودی کے ساتھ طاری ہو جاتے ہیں۔یہ ایک طریق بن جاتا ہے۔جب ایک ولی اپنے مرید (طالب) میں جذبۂ محبت کو جوش دینا چاہتا ہے۔تو وہ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کی حمد میں انتہائی محبت کے الفاظ پیش کرتا ہے۔تو اس پر انوار کی بارش ہو جاتی ہے۔ تو یہ ایک سنت کی صورت اختیار کر جاتا ہے۔اسی طرح طالب پر بھی انوار جلوہ گر ہوتے ہیں۔یہی

مراتب یہی مشاہدہ طریقت کی اصل ہوتی ہے۔ تو ایسے درود بھی تعلیم طریقت میں شامل ہوتے ہیں۔ یہ تعلیم بھی چونکہ حمدِ محمد صلی اللہ علیہ وسلم میں شامل ہے۔ اسلئے یہ بھی درود کہلاتا ہے۔ درود سے مراد ہی حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کی حمد کرنا ہے۔ اسلئے ایسے درود اولیائے کاملین کی اختراع کہلاتے ہیں۔ اور یہ درود شرعاً جائز ہیں کہ انتہائی درجہ کی حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کی حمد کی جائے۔

طریق قادریہ میں بھی آیاتِ قرآنی اور درود بتایا جاتا ہے۔ اسکے علاوہ عام تعلیم میں ذکر بھی شامل ہے جیسے اَفْضَلُ الذِّكْرِ لَآاِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ۔ یہ ورد صرف قرأت کے ساتھ ہوتا ہے۔ اور اصول طریقت کے مطابق تصور شیخ کے ساتھ ہوتا ہے تو تصور شیخ کے ساتھ انوار بھی مشاہدہ میں آتے ہیں۔ اب اس قرأت میں چند اور طریق اختراع کئے گئے ہیں۔ وہ ذکر کے ساتھ جسمانی تزکیہ کیلئے جسم پر ایک کیفیت کا طاری کرنا اسے ضرب کہتے ہیں۔ یعنی مارنا۔ ضرب اسلئے کہ تصور میں جو کلمہ پڑھا جائے اسکے باطنی نور کو تصور میں قلب پر مارنا۔۔۔ جیسے ایک لٹھ کی چوٹ ماری جاتی ہے۔ اس میں حکمت یہ ہے کہ جب نور کی چوٹ قلب کی مادیت پر ماری جائے تو اسکا اثر قلب پر پڑتا ہے۔ جیسے ایک آگ کا شعلہ کسی کے منہ پر مارنے سے چہرہ جھلس جاتا ہے۔ اسی طرح نور سے قلب کی مادی کیفیت کمزور ہو کر زائل ہونا شروع ہو جاتی ہے۔ یہ اختراع ایک صاحب علم ولی کی زائد اختراع ہے۔ اس سے مقصود صرف تزکیہ ہوتا ہے۔ کہ قلبی مادیت زائل ہو کر روح حیوانی قوت پذیر ہو کر مشاہدہ حاصل کرے۔ اسی طرح اَللّٰهُ هُوَ کی بھی کیفیت ہے۔ کہ سانس کے ساتھ پڑھا جاتا ہے۔ سانس کے اس اتار چڑھاؤ سے بھی قلب متاثر ہوتا ہے۔ اور روح حیوانی قوی ہوتی ہے۔ جس سے عالم ناسوت کا مشاہدہ ہوتا ہے۔ لیکن یہ طریق تزکیہ کیلئے ہوتا ہے۔ مراتب کیلئے وہی طریق قرآنی (قرأت) اور جذبِ محبت میں روحانی عظمت کا حاصل کرنا ہوتا ہے۔ اس میں اگرچہ مراتب کیلئے قرآنی آیات وجہ حصولِ مراتب ہیں۔ لیکن ایک پیر اکمل کی سپردگی میں جبکہ طالب کے تمام نیک و بد کا ذمہ دار صرف پیر اکمل ہی ہوتا ہے۔ پیر اکمل خود یہ قوت رکھتا ہے۔ کہ ایک طالبِ حقیقت کے جذبہ محبت کو ہی نظر میں لا کر اپنی روح رحمانی میں جذب کر کے جہاں چاہے مرتبۂ ولایت پر پہنچا سکتا ہے۔ پیر اکمل میں یہ قوت و صلاحیت

ضرور ہوتی ہے۔ کہ وہ ایک طالبِ حقیقت کو ادنیٰ حالت میں بھی مراتب عطا کر سکتا ہے۔

طریقہ قادریہ میں۔ یہ زائد اختراعات کسی وقت میں اختراع ہوئی ہیں۔ جن میں کلمہ کا ورد ضرب کے ساتھ ـــــ ضرب کے طریق مختلف ہیں یک ضرب۔ دوضرب۔ سہ ضرب۔ چہار ضرب۔ ذکر ارہ۔ ذکر ہفت در بند۔ اس ذکر میں سانس بند کیا جاتا ہے جسے حبس نفس کہا جاتا ہے۔ لیکن ان ضرباتِ ذکر اور حبس نفس کیلئے یہ ضروری نہیں کہ ہر مرید کو یہ تعلیم دی جائے یہ تعلیم صرف اس شخص کیلئے ہوتی ہے۔ جسکے لیے اسکی خاص ضرورت ہو۔ ورنہ قرأت و درود کافی ہوسکتا ہے۔ اسکے لیے ولی مکمل یا اکمل کا ہونا ضروری ہے۔ ورنہ عام لوگ جو ولی بھی نہ ہوں۔ انہیں طالب کی کیفیات قلبی کی تشخیص بھی نہ ہو ـــــ وہ مرید کو ایسے سبق دیں تو گمراہی کا اندیشہ لاحق ہوگا۔

ان سلاسل میں ایک طالب کو ذاتی عمل و تزکیہ کی ضرورت ہوتی ہے۔ کہ جب تک اس کا جہد و عمل شدت کے ساتھ نہ ہو شیخ اس پر مشاہدہ کے دروازے نہیں کھولتا ـــــ ان سلاسل میں ایک ولی اکمل یا ولی مکمل طالب کو عرفان حاصل کرا سکتا ہے۔ ان سلاسل میں جب ایک طالب پر عالمِ باطن کھل جاتا ہے ـــــ تو پہلے اسے عالمِ ناسوت کی ابتدائی منزل کا مشاہدہ اول خواب میں ہوتا ہے۔ اور جب اسکا تزکیہ مکمل ہو جائے تو جاگتی حالت میں بھی مشاہدہ کرنا شروع کرتا ہے۔ اور رفتہ رفتہ مراحل طے کرتا جاتا ہے۔ دورانِ عمل انسان پر مختلف کیفیتیں طاری رہتی ہیں۔ بعض اوقات دنیوی معاملات میں انہماک اور فکر سے قلب و ذہن متاثر ہو جاتا ہے۔ تو انسان قلب و ذہن کا رابطہ قائم نہیں رکھ سکتا تو اس پر قبض کی حالت طاری ہو جاتی ہے۔ قبض سے مراد اسکا مشاہدہ بند ہو جاتا ہے۔ بعض اوقات قدرتی طور انسان پُر سرور اور مطمئن کیفیت میں رہتا ہے تو بسط کی حالت طاری رہتی ہے۔ یعنی اسکا مشاہدہ ہر وقت جاری رہتا ہے ـــــ عالم ناسوت کے مشاہدے میں۔ ایک طرف کائنات کے باطن کا مشاہدہ (روح حیوانی اور روح رحمانی سے) کرتا رہتا ہے۔ اس عالم کے مشاہدہ کے ساتھ ظاہری عالم کا بھی مشرق مغرب شمال وجنوب ہر مقام کا اسے مشاہدہ حاصل ہوتا ہے ـــــ زمینوں کے خزانے۔ قبروں کے حالات (کشف القبور) اور دنیا سے متعلق تمام واقعات و کیفیات کا اسے علم ہو

جاتا ہے ـــــ یہاں تک کہ تمام ستاروں۔ سیاروں۔ چاند۔ سورج کی کیفیات سے بھی آگاہی حاصل کرسکتا ہے۔ انہیں مراحل ناسوتی میں اگر ایک طالب کا تزکیہ نفس مکمل ہو۔ تو اسکا جسم بھی لطیف ہوجاتا ہے۔ یہاں تک کہ اس لطافتِ جسمانی کی وسعت ہوجاتی ہے۔ کہ بمنزلہ روح حیوانی ہوجاتا ہے۔ اس کیفیت کے حاصل ہونے پر اگر ایک انسان ذکر یا حبس نفس کا عامل ہو تو یہ اپنے سانس کو جب تک چاہے بند رکھ سکتا ہے۔ ایک طویل مدت تک زمین میں دفن ہوسکتا ہے۔ اور اسکی جسمانی حالت میں کوئی تغیر واقع نہیں ہوتا۔ اور زندگی کے تمام آثار اس میں قائم رہتے ہیں۔ اس لطیف حالت میں انسان اگر مشرق میں مغرب کا تصور کرے تو جس مقام کا تصور کیا اسی مقام پر جسم کے ساتھ (ایٹمی ہیئت میں) موجود ہوسکتا ہے۔ اسے اصطلاح طریقت میں طے مقام سے تعبیر دیا جاتا ہے۔ ان خوبیوں کے باوجود یہ شخص ولی کہلانے[1] کا مستحق نہیں ہوسکتا ہے۔ کیونکہ ولی کا مقام اول اجلاس محمدیؐ ہوتا ہے۔ جہاں روح حیوانی داخل نہیں ہوتی بلکہ روح رحمانی داخل ہوسکتی ہے۔ روح حیوانی سے ہر

---

[1] واضح ہو کہ طریقت میں۔ ولائت ـــــ مراتبِ عرفان حاصل کرنے کا ایک ضابطہ مرتب ہوا ہے کہ انسان۔ جہاں تک زمین میں ٹھوس مادی کیفیات واقع ہیں۔ انکا مشاہدہ وعلم حواسِ خمسہ ـــــ آنکھ۔ کان۔ سونگھنے۔ چکھنے اور مس کرنے سے ہوتا ہے۔ اسکے ساتھ زمین کے ساتھ ملحق عالمِ سیارگان۔ ستارے واقع ہیں۔ یہ کیفیتیں آسمانِ اول کے مرکز میں واقع ہیں یعنی (تخلیق کائنات ''منازل فقر'' میں درج ہے) آسمان اول ایک نوری عالم ہے۔ ایک نوری کیفیت ہے۔ جسکے مرکز میں یہ تمام ستارے واقع ہیں۔ اور آسمان اول ان ستاروں کے گرد۔ ہر طرف (گول دائرے میں) احاطہ کئے ہے ـــــ ویسے آسمان ـــــ اور آسمان اول ایک نوری کیفیت۔ نوری عالم۔ نوری ہیئت ہے۔ اور ستارے اسکے مرکز میں۔ نوری قوت سے کم کیفیت ناری ہیئت میں واقع ہیں ـــــ یہ عالم ناری سے تعبیر ہے۔ جہاں تک ان کی وسعت ہے انہیں عالم ناری سے موسوم کیا جاتا ہے۔ ان ستاروں سے آگے۔ سات آسمان واقع ہیں۔ جو یکسر نوری کہلاتے ہیں۔ انہیں عالمِ نوری سے تعبیر دیا جاتا ہے۔ یہ عالمِ نوری آسمان اول سے لے کر ذاتِ الٰہی خالق کی ذات تک وسیع ہے۔ اس امر سے واضح ہے کہ ذاتِ الٰہی کے وجود سے لے کر زمین تک یہ کائنات تین کیفیتوں خاک۔ نار۔ اور نور سے مرکب ہے۔ اور اسی کائنات میں انسان پیدا ہوا۔ اور اسی انسان کے ذمہ اس (باقی حاشیہ اگلے صفحہ پر)

انسان بغیر شریعت کی پابندی کے عالم ناسوت کی تمام کیفیات کا مشاہدہ کرسکتا ہے۔ اور تزکیہ نفس کے ساتھ جسم لطیف کر سکتا ہے۔ لیکن اس حالت میں بھی جبکہ وہ عالمِ ناسوت کے مراحل سے گزر رہا ہو۔ اول اجلاس محمدیؐ میں داخل نہیں ہوسکتا ــــــ اسلئے ولی نہیں کہلا سکتا۔ البتہ جب عالمِ ناسوت کی آخری منازل میں ہو۔ اور طالب کا تقویٰ (شریعت کی پابندی میں انتہائی پرہیز) اور جذب محبت و تزکیہ نفس مکمل ہو اور ساتھ ہی درود شریف کا وردرکھتا ہو۔ تو درود شریف کے حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کی خدمت میں پہنچنے پر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی توجہ طالب پر ہوتی ہے۔ تو قریب ہونے کی وجہ سے اسے شبیہ مبارک کا مشاہدہ عالم ناسوت میں ہو جاتا ہے۔ ایسا شخص عامل کہلاتا ہے۔ اور محبوبیت کا مستحق ہو جاتا ہے۔ ایسے شخص سے مافوق الفطرت کرامات کا صدور بھی ہوسکتا ہے۔ لیکن اس حالت میں ولی کا اطلاق اس پر نہیں ہوتا۔

ہر سلسلہ کے صاحب طریقت لوگوں کو عالمِ ناسوت کی ان اکتالیس منازل سے گزرنا ہوتا

(بقیہ حاشیہ گزشتہ صفحہ) کائنات اور اسکے خالق کی پہچان و معرفت ہے۔ لہذا۔ ان کیفیتوں کی ہیئتوں کے مطابق انسان میں تین کیفیتیں۔ خاک (خاکی جسم) نار (ناری مرکب) نور (نوری مرکب) ہونا لازمی ہے۔

چنانچہ محققین۔ اور علمائے طریقت نے انسان کو تین مرکب سے تخلیق ہونا ثابت کیا ہے۔ اور انہیں تین مرکبات کی قوت پر انسان کی قوتِ مشاہدہ مقرر ہے۔ جس میں مرکب خاکی میں حواسِ خمسہ سے عالم خاکی کا مشاہدہ و رسائی منحصر کیا گیا ہے۔ اور قوتِ ناری۔ اسے روح حیوانی سے موسوم کیا گیا۔ جس سے عالم سیارگان۔ عالم ناری کا مشاہدہ و رسائی ہوتی ہے۔ تیسرے۔ انسانی وجود میں اللہ تعالیٰ نے براہِ راست انسانی تخلیق میں ایک روح پھونک دی۔ جسکا ذکر قرآن میں آتا ہے۔ اسے وَنَفَخْتُ فِیْهِ مِنْ رُّوْحِیْ کے بیان میں۔ انسانی وجود میں نفخ کیا۔ یہ روح ــــــ روح رحمانی سے موسوم ہے۔ یہ محض مشاہدہ و معرفت کائنات کیلئے مخصوص ہے۔

جہاں تک کائنات اور خالقِ کائنات کے وجود کا تعلق ہے۔ انسان کی یہ تین قوتیں خاکی قوت میں حواس خمسہ۔ اور قوت دماغی۔ اور ناری قوت میں۔ قوتِ دماغی میں روح حیوانی برسرِ عمل رہتی ہے۔ انسانی وجود میں اسکا مقام ــــــ انسانی دماغ ــــــ شعور۔ اس روح حیوانی کا مسکن ہے۔ یہ روح عالم خاکی زمین سے۔ (باقی حاشیہ اگلے صفحہ پر)

ہے۔ یہاں تک کہ عالم ملکوت کے اول اجلاس محمدیؐ میں داخل ہوتا ہے۔ اور جب اوّل اجلاس محمدی کے قریب ہو جائے۔ تو اسے ہر بار پیش ہونے کیلئے دربار نبویؐ سے اجازت حاصل کرنے پر ہی داخلہ ملتا ہے۔ البتہ قادری سلسلہ میں حضرت محبوب سبحانی غوث صمدانی شیخ عبدالقادر جیلانی رضی اللہ عنہ کے مریدوں کو حاضر ہونے کے ساتھ ہی بمقابلہ دیگر سلاسل کے مریدوں کے اجازت مل جاتی ہے۔ ان سلاسل میں ایک طالب کو شدید مجاہدہ کی ضرورت ہوتی ہے۔ اگر کسی وقت بھی مادیت کے غلبہ کے ساتھ کوئی حرکت خلاف شریعت سرزد ہوئی۔ تو مشاہدہ رہتا ہے۔ لیکن مراتب سے گر جاتا ہے ــــ اس حالت میں ایک طالب کو طویل مدت صرف کرنا پڑتی ہے۔

سلسلہ اویسیہ میں مختلف فرقے پائے جاتے ہیں۔ ان کے طریق عمل مختلف ہیں کوئی فرقہ ذکر اور حبسِ نفس بھی کرتا ہے۔ کوئی آیات قرآنی کی قرأت بھی کرتا ہے۔ انکا عرفان بھی باقی سلاسل کی طرح عالم ناسوت سے شروع ہوتے ہوئے اول اجلاس محمدی تک پہنچتا ہے۔ لیکن خالص سلسلہ اویسیہ جس کا ذکر اوپر ہو چکا ہے۔ انکے طریق عمل میں صرف درود شریف کثرت سے قرأت کرنا ہے۔ اور ان

(بقیہ حاشیہ گزشتہ صفحہ) عالم ناری۔ ستاروں کی دنیا تک رسائی وعلم حاصل کرتی ہے۔ عالمِ ناری سے آگے آسمان اور ماوراء ادراک سب نوری تجلیں ہیں۔ یہاں قوت کے اعتبار سے ناری روح داخل نہیں ہوسکتی۔ اسلئے ناری روح کی پرواز اور رسائی عالم ناری تک محدود ہے۔ اسکے بعد انسان میں نوری قوت۔ روح رحمانی برسرِ عمل ہوتی ہے۔ جسکی حد پرواز ــــ مشاہدہ۔ ورسائی آسمان سے لے کر ذاتِ الٰہی تک ہے۔

علمائے طریقت نے زمین سے لے کر۔ ذاتِ الٰہی کے نور تک کائنات کے الگ الگ طبقے متعین کئے ہیں۔ انہیں "عالم" کے نام سے تقسیم کیا ہے۔ ان میں اول۔ عالمِ ناسوت ــــ دوم۔ عالمِ ملکوت ــــ سوئم۔ عالمِ جبروت ــــ چہارم۔ عالم لاہوت سے موسوم ہیں۔ انسان طریق معرفت میں مراتب حاصل کر کے انہیں مراتب میں رسائی ومشاہدہ حاصل کر کے معرفت کی تکمیل کرتا ہے۔

ان مراتب میں اول عالم اجسام ہے۔ جو ظاہر دنیا کہلاتی ہے۔ جہاں کی اشیاء ظاہر مشاہدے میں آتی ہیں۔ انکی حواس خمسہ سے تحقیق کی جاتی ہے۔ اسکے ساتھ عالمِ ناسوت۔ عالم ناسوت سے مراد۔ عالم ناس ہے۔

اولیا نے ایک معین تعداد مقرر کر کے کثرت کے تعدّد کو احاطہ میں کرلیا ہے۔یعنی اگر ایک شخص چوبیس گھنٹوں میں گیارہ سو بار درود شریف پڑھے گویا اس نے کثرت کے تعین کو پالیا یا اگر ایک شخص چوبیس گھنٹوں میں پانچ ہزار بار درود شریف پڑھے تو گویا اس نے اس دن میں کثرت سے درود پورا کیا۔

گیارہ سو کی تعداد میں جو درود شریف پڑھا جاتا ہے وہ یہ ہے۔

اَللّٰھُمَّ صَلِّ عَلٰی سَیِّدِنَا وَ مَوْلٰنَا یَا مُحَمَّدُ[1] النَّبِیُّ الْاُمِّیُّ وَاٰلِہٖ وَسَلِّمْ اور پانچ ہزار کی تعداد میں صَلَّی اللّٰہُ عَلٰی حَبِیْبِہٖ مُحَمَّدٍ وَّاٰلِہٖ وَسَلَّمْ ۔پڑھا جاتا ہے۔

سلسلہ اویسیہ خالص میں درود کی قرأت میں گیارہ سو یا پانچ ہزار درود شریف تنہائی میں مراقبہ کی حالت میں تصور شیخ یا تصور روضہ مدینہ شریف کر کے پڑھا جاتا ہے۔اس سلسلہ کی خصوصیت یہ ہے۔ کہ جب ایک طالب سلسلہ اویسیہ کے ولی سے درود شریف کی اجازت طلب کرتا ہے۔اور بیعت کرتا ہے۔تو ولی اکمل طالب کو حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کی خدمت میں اول اجلاسِ محمدیؐ میں پیش کرتا ہے۔تو اس وقت سے طالب کی روح رحمانی اجلاسِ محمدیؐ میں پیش رہتی ہے۔اگر طالب نے بیعت نہ کی ہو۔ صرف عقیدت کے ساتھ اپنے آپ سلسلہ اویسیہ میں داخل ہوکر درود اویسیہ کی قرأت کرے۔یا سلسلہ اویسیہ کے کسی مرید سے اجازت لے کر درود شریف کی قرأت کرے۔تب بھی سلسلہ کا ولی اکمل (اس مرید کے ذریعہ جس سے اجازت حاصل کی ہو) طالب کو حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کے پیش کرتا ہے۔ (یعنی مرید طالب کو پیر کے پیش کرتا ہے اور پیر حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کے پیش کرتا ہے) جب سے طالب کی روح رحمانی اجلاسِ محمدیؐ میں ہر وقت پیش رہتی ہے۔مراقبہ کی حالت میں اگر ایک طالب

---

[1] یَا مُحَمَّدُ اشارہ ہے۔یعنی اس میں شہادت کی انگلی سے اشارہ بھی کیا جاتا ہے۔جسکا مطلب اے محمد صلی اللہ علیہ وسلم جو کہ میرے سامنے یا جن کے سامنے حضور میں میں ہوں۔کیونکہ اس درود شریف کے ورد کے وقت براہ راست حضور کی توجہ طالب پر ہوتی ہے۔گویا یہ کیفیت حاضر کی حالت میں ہوجاتی ہے۔اسلئے حاضر کو یا محمدؐ کہا جاتا ہے۔

کے قلب وذہن کا رابطہ ہو جائے اور اسے مشاہدہ کی کیفیت حاصل ہو۔ تو یہ اپنی اسی حالت کا مشاہدہ کرتا ہے۔ جو کیفیت اسکی روح رحمانی پر طاری ہے۔ یعنی وہ اپنے ابتدائی مشاہدہ میں اوّل اجلاس محمدیؐ میں حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کو دیکھتا ہے۔ یہ نوری کیفیت اکثر کو حاصل ہوتی ہے۔ اور بعض کو نہیں۔ انہیں اولاً انوار سبز۔ نیلگوں۔ سرخ۔ سفید۔ یا انوار مانند سورج کے مشاہدہ میں آتے ہیں۔ اور جوں جوں یکسوئی میں حافظہ پر سکون اور ترتیب پیدا ہو جاتی ہے۔ یہ انوار مستقل حالت میں متجلّی ہوتے ہیں۔ آخر ایک نور سفید رنگ کا مستقل حالت میں قائم رہتا ہے۔ اور اسی نورانی کیفیت میں روضہ مدینہ منورہ اور روضہ شریف میں شیخ کا تصور حاصل ہوتا ہے۔ تو شیخ کے ساتھ طالب اول اجلاس محمدیؐ میں داخل ہو کر زیارتِ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے مشرف ہوتا ہے۔ اور ابتدائی عالمِ ناسوت کی منازل پس پشت رہ جاتی ہیں۔ گویا طالب ایک ہی جست میں ان اکتالیس منازل کو عبور کر کے داخل اجلاس محمدیؐ (عالم ملکوت) ہو جاتا ہے۔ اس صورت میں ایک طالب ایک ساعت یا ایک لحہ میں بھی مشاہدہ کے ساتھ اول اجلاس محمدیؐ میں داخل ہو جاتا ہے۔ اسے عالمِ ناسوت کی منازل طے کرنے کی ضرورت نہیں رہتی۔ اسکے بعد ایک طالب جب مراقبہ کی حالت میں اجلاس محمدیؐ کا مشاہدہ کرنا چاہے۔ اسی وقت مشاہدہ ہو جاتا ہے۔ اسے اجازت حاصل کرنے کی ضرورت نہیں رہتی۔

اگر ایک طالب پر فوری طور کیفیات طاری نہ ہوں۔ یعنی اسکے قلب و حافظہ میں کمزوری ہو یا روحِ رحمانی اور روحِ حیوانی میں انوار کی تجلی برداشت کرنے کی قوت نہ ہو۔ تو اسے کم سے کم ایک دن۔ یا تین دن۔ اور زیادہ سے زیادہ سات دن خلوت نشین رہنا پڑتا ہے۔ تو سات دن کے اندر اندر اول اجلاس محمدیؐ میں مشاہدہ کے ساتھ داخل ہو جاتا ہے۔ ورنہ اکثر لوگ بغیر خلوت کے بھی پہلی ہی مجلس میں مشاہدہ کے ساتھ اول اجلاس محمدیؐ میں داخل ہو جاتے ہیں۔ اس کیفیت کے حاصل ہونے کی نوعیت یہ ہے۔ کہ یہ کیفیات بغیر تزکیہ مجاہدہ (صرف شیخ اکمل کی توجہ سے) فوراً حاصل ہوتی ہیں۔ یہ امر ضروری ہے۔ کہ ہر شخص کا تزکیہ خالص نہیں ہوتا ہے۔ لیکن اجلاسِ محمدیؐ میں روح رحمانی کے داخل ہونے سے مرتبۂ ولایت حاصل کر لیتا ہے۔ بعد میں جس قدر تزکیہ ومجاہدہ کرے اسے

مشاہدہ بھی ہوتا ہے۔لیکن ایسا بھی ہوتا ہے۔کہ ایک طالب ابھی طریقت کی طرف اپنی کمزوریوں کے ساتھ رجوع کرتا ہے۔تو ایسا شخص بھی چند دنوں میں مشاہدہ کے ساتھ اول اجلاس محمدیؐ میں داخل ہو جاتا ہے۔البتہ یہ ضروری ہے۔کہ مادی آلائشوں کے موجود ہونے سے اس پر اکثر قبض وبسط کی کیفیت بھی طاری رہتی ہے۔اور بعض لوگ ایسے بھی ہوتے ہیں۔جو باوجود محنت شاقہ کے بھی مشاہدہ نہیں کر سکتے۔اسکی وجہ یہ ہوتی ہے۔کہ ایسے لوگوں کی قلبی کیفیت قوی نہیں ہوتی۔اگر ان پر انوار محمدیؐ کی کوئی تجلی ظاہر ہو جائے۔تو قلب کے برداشت نہ کرنے کی وجہ سے جسم متاثر ہوتا ہے۔یا اکثر کسی عارضہ میں مبتلا ہو جاتا ہے۔یا اختلاج قلب ہو جاتا ہے۔یا مجذوب ہو جاتا ہے۔اسلئے ان پر تب تک آثار ظاہر نہیں ہوتے جب تک کہ انوار محمدیؐ کی تجلیات کیلئے قلب و ذہن قوی نہ ہو پائے۔انہیں مجاہدہ و تزکیہ کی زیادہ ضرورت رہتی ہے۔اسی قسم کے لوگوں میں اگر کسی شخص کو کیفیات کا مشاہدہ حاصل ہوا بھی تو تھوڑی دیر کیلئے۔انوار مشاہدہ میں آتے ہیں مگر اچانک ان پر ایک سیاہ نور طاری ہو جاتا ہے۔جو ایک طویل مدت تک طاری رہتا ہے۔یہاں تک کہ قلب و ذہن قوی نہ ہو یہ سیاہ نور طاری رہتا ہے۔یہ حالت بعض صاحب مشاہدہ لوگوں پر بھی وارد ہوتی ہے کہ وہ صاف مشاہدہ کرتے ہیں۔ لیکن ان میں بھی پورا تزکیہ نفس نہیں ہوتا۔عالم باطن میں شیخ اکمل کی حب یا محبتِ رسولؐ انکے قلب پر زیادہ طاری ہوتی ہے۔تو اس حب کے تاثر سے ان پر تجلیاتِ انوار محمدیؐ زیادہ ضوفگن ہو جاتی ہیں۔ لیکن ان انوار کے برداشت کی قوت نہیں ہوتی۔تو حفظِ ماتقدم میں درمیان میں ایک سیاہ نور حائل ہو جاتا ہے۔تو سیاہ نور طاری ہونے پر اور کوئی نور مشاہدہ میں نہیں آتا۔اسے لطیفۂ محمدیؐ یا لطیفۂ اخفاء سے تعبیر دیا جاتا ہے۔

سلسلہ اویسیہ کا ولی عالم ناسوت کی منازل کا مشاہدہ نہیں کرتا۔ بلکہ انہیں ایک ہی جست میں عبور کر کے سیدھا اجلاسِ محمدیؐ میں داخل ہو جاتا ہے۔اسلئے اس سلسلہ اویسیہ کو اویسی قلندری بھی کہا جاتا ہے۔اویسی فقیر عالمِ ناسوت کی منازل سے بوجہ مشاہدہ نہ کرنے کے واقف نہیں ہوتا۔مگر بعد میں اگر چاہے تو ایک ہی وقت میں سب منازل کا مشاہدہ کر کے واقف ہوسکتا ہے۔اسی طرح ظاہری عالم

کے حالات کا بھی مشاہدہ نہیں کرتا۔لیکن اگر چاہے۔تو یہ روح رحمانی کے ساتھ ہر مقام کی اصل حقیقت سے آگاہ ہو جاتا ہے۔اسی طرح کشفِ قبور کا بھی اسے علم ہو سکتا ہے۔لیکن جب اویسی فقیر اجلاس محمدیؐ میں داخل ہوتا ہے۔تو اسے ان منازل و کیفیات کے مشاہدہ کی ضرورت نہیں رہتی۔کیونکہ اصل مقصود کی راہ پر پہنچ جاتا ہے اور فرع کی طرف توجہ نہیں کرتا۔

جاننا چاہیے کہ عالم ناسوت اور عالم ظاہر کے واقعات کا مشاہدہ روح حیوانی کے ذریعہ قلب حاصل کرتا ہے۔اور عالم ملکوت کے واقعات روح رحمانی کے جذب سے حاصل ہوتے ہیں۔ جب ایک طالب کو روح رحمانی کا جذب حاصل ہو گیا تو بغیر روح حیوانی کی مدد کے عالمِ ناسوت کا مشاہدہ اسکے لیے آسان اور ادنیٰ حالت میں ہوتا ہے ـــــ لیکن اجلاسِ محمدیؐ میں داخل ہونے کے بعد جب بھی ایک طالب مراقب ہوتا ہے۔تو پہلے اس پر عالم ملکوت کے انوار سامنے ہو جاتے ہیں۔ جنکا مشاہدہ اسکے لئے لازم ہوتا ہے۔ایسی حالت میں کم تر کیفیت کی طرف رجوع کرنا قانونی حیثیت میں جائز نہیں ہوتا۔اسلئے ایک طالب کو ایک ملکوتی قانون کا پابند رہنا پڑتا ہے۔اسی طرح وہ شخص جو ذات الٰہی کے انوار کا مشاہدہ کرتا ہے۔جب بھی آنکھ بند کرتا ہے۔تو قلب پر ہر وقت انوار الٰہی ضَو فگن رہتے ہیں تو اسے انہیں انوار کا مشاہدہ رہتا ہے۔اور یہ عالم ناسوت کا مشاہدہ کر نہیں سکتا۔اکثر ایسا ہی ہوتا ہے۔کہ ایسے معاملات کے مشاہدہ کیلئے ایک ولی اپنے مریدوں سے واقعات طلب کرتا ہے کہ ''فلاں معاملہ کے متعلق معلوم کرو'' اسکا مطلب یہ ہوتا ہے۔کہ ولی خود انتہائی مقامات میں انوارِ الٰہی کے مشاہدہ میں ہوتا ہے۔اور مرید باقی معاملات کا مشاہدہ کر لیتا ہے۔ورنہ اگر ایک ولی اپنے ارادہ سے حالات و کیفیات دیکھنا چاہے تو دیکھ سکتا ہے۔اور دیکھے کیوں نہ جبکہ وہ اپنی ابتدا میں دیکھ چکا ہو۔

سلسلہ اویسیہ کا ولی عرفانِ الٰہی کی منازل طے کرنے میں جسطرح اول اجلاسِ محمدیؐ میں چند ساعت میں پہنچ جاتا ہے۔باقی مراحل و منازل بھی اسی طرح قلیل مدت میں طے کر لیتا ہے۔ اسطرح ایک طالب کو عرفان الٰہی حاصل کرنے میں اویسیہ سلسلہ اور اویسی ولی سے احسن راہنمائی حاصل ہوتی ہے۔

ان تمام سلاسل میں جو کچھ تعلیم وعمل کا مواد پایا جاتا ہے۔ وہ قرآنی احکام سے ہی اخذ کیا گیا ہے۔ جس میں سب سے اول شریعت کی پابندی لازمی اور ضروری ہوتی ہے۔ ورنہ بغیر شریعت کی پابندی کے کوئی علم وعمل قابلِ قبول نہیں ہوسکتا۔ اور قرآن کریم کا علم ایک ایسا علم ہے۔ جس سے ہر انسان خواہ وہ کسی ملت سے نسبت رکھتا ہو۔ اگر قرآن کی طرف رجوع کرے۔ تو وہ حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اتباع۔ اور آپؐ کی امت کے علما و اولیا سے جو صحیح معنوں میں حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کی سنت نبوی یَتْلُوْا عَلَیْہِمْ اٰیٰتِہٖ وَیُزَکِّیْہِمْ وَیُعَلِّمُہُمُ الْکِتٰبَ وَالْحِکْمَۃَ پر پورے طور عامل ہوں خواہ عالمِ شریعت ہوں یا عالمِ طریقت ان سے علم۔ عرفان حاصل کرسکتا ہے۔ ورنہ بغیر قرآن۔ بغیر اتباعِ حضرت محمد رسول اللہ ﷺ اور اتباعِ علماءِ امت (شریعت وطریقت) انسانی علم کی تکمیل کسی اور دین کسی اور پیغمبر کسی اور عالم سے قطعی ناممکن ہے ـــــ وَالسَّلَامُ عَلٰی مَنِ اتَّبَعَ الْھُدٰی۔

تمت بالخیر

سلسلہ اویسیہ پبلیکیشنز کی مطبوعات

۱۔ نور العرفان از جناب محمد نور الدین اویسی رحمۃ اللہ علیہ
۲۔ منازل فقر مع شرح ایضاً
۳۔ تاریخ طریقت وحقیقت تصوف ایضاً
۴۔ راہ حقیقت ایضاً
۵۔ علم العرفان ایضاً
۶۔ فتنہ مرزائیت ایک تجزیہ ایضاً
۷۔ تاریخ خلافت اسلامی ایضاً
۸۔ سیرۃ النبی صلی اللہ علیہ وسلم ایضاً
۹۔ روح البیان ایضاً
۱۰۔ عرفان حقیقت از ریاض احمد خیال اویسی
۱۱۔ نور بصیرت مرتبہ ایضاً
۱۲۔ صراط المستقیم مرتبہ ایضاً

﴿برائے رابطہ وحصول مطبوعات﴾

(۱) محمد بشیر اویسی بلیک برن انگلینڈ فون: 00441254671126
(۲) ریاض احمد خیال اویسی بھمبر آزاد کشمیر فون: 03007424574,03451566483
(۳) محمود احمد طائر پلاہل کلاں ضلع کوٹلی آزاد کشمیر فون: 03465259352